تحریکِ پاکستان اور پرویزؒ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ

10 AURANGZEB ROAD
NEW DELHI

14th June, 1947.

Dear Mr. Parvez,

I thank you for your letter of of 13th June. Will you please send me the names of those who, you think, will be the real servants of our future Secretariat?

Yours sincerely,

M A Jinnah

G. A. Parvez, Esq.,
37, Turkman Road,
NEW DELHI.

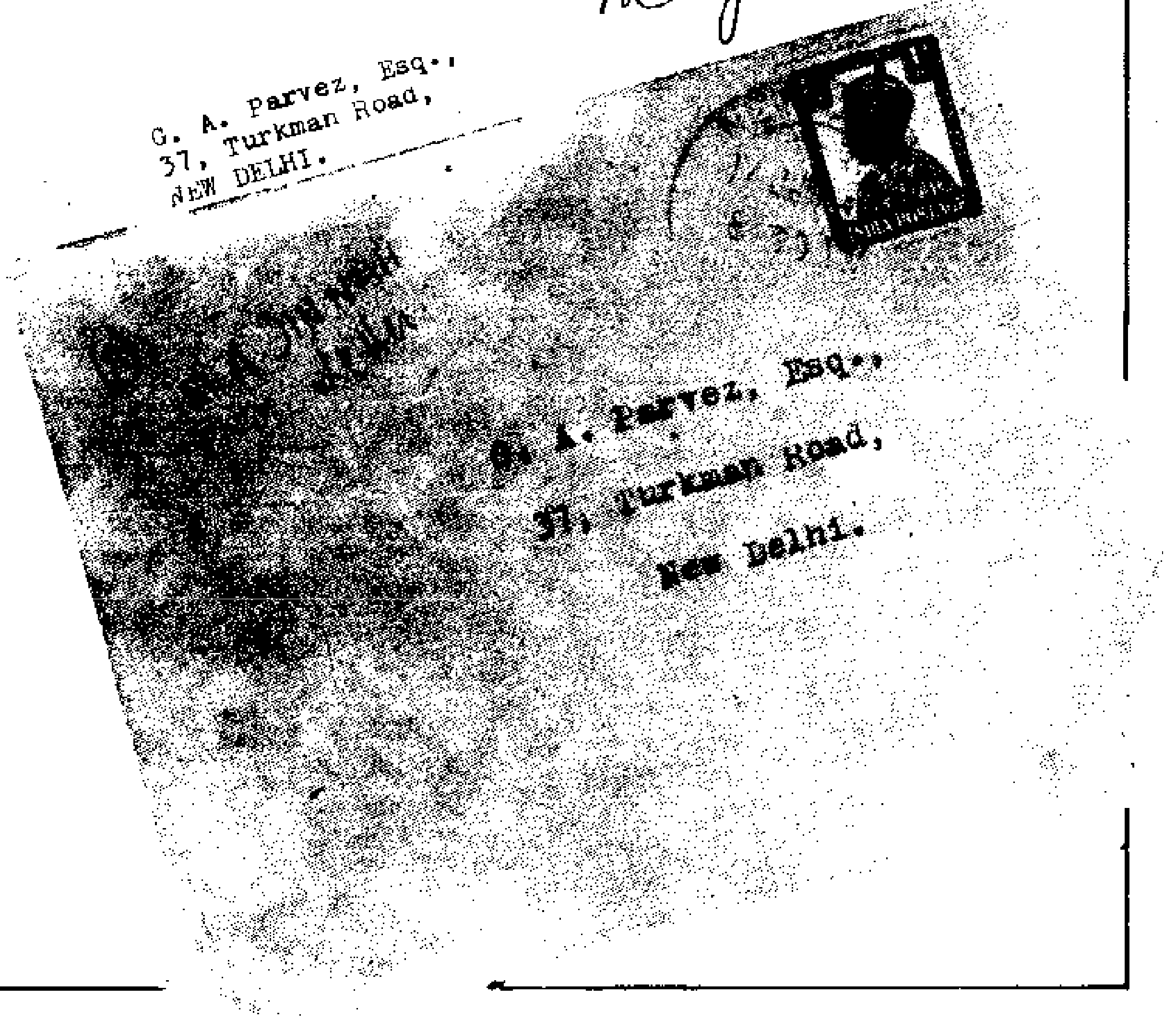
G. A. Parvez, Esq.,
37, Turkman Road,
New Delhi.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

(طبعِ اوّل)

محسنینِ ملّتِ اسلامیہ ہندیہ میں سرِفہرست سرسیّد احمد خانؒ کا اسمِ گرامی آتا ہے جنھوں نے مسلمانانِ ہند کو بالاستمرار یہ باور کرایا کہ تمھاری خواری و زبوں حالی کا واحد سبب یہ ہے کہ تم نے اُس حیات بخش ضابطۂ زندگی کو، جسے خالقِ کائنات نے اپنے آخری رسُول حضرت محمد مصطفٰے احمدِ مجتبٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے یہ کہہ کر نازل فرمایا تھا کہ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (۱۷/۹) (یہ حقیقت ہے کہ یہ قرآن کاروانِ انسانیت کو، سفرِ زندگی میں وہ راہ دکھاتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی اور توازن بدوش ہے)، ریشمی غلافوں میں لپیٹ کر، اپنے گھروں کے اندر طاقوں میں سجا رکھا ہے اور اس سے صرف مُردے بخشوانے کا کام لیتے ہو۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے اس نقیبِ اوّلیٰ نے للکار کر قوم سے کہا کہ جو جی چاہے کر کے دیکھ لو، جب تک تم پھر سے اُسی کتابِ عظیم (قرآن) کو اپنا راہ نمائے حیات نہیں بناتے، زمانے میں اپنا مقام نہیں پا سکو گے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُس نے نوجوانانِ قوم کو جدید علوم سے آراستہ کرنے کے لیے ایک مثالی درس گاہ (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) قائم کی جس کے متعلق بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ جس دن (۲۴ مئی ۱۸۷۵ء) یہ قائم ہوئی، اُسی دن مملکتِ پاکستان کی بُنیاد کی پہلی اینٹ عملاً رکھ دی گئی۔

سرسیّد احمد خانؒ کے بعد، قوم کے اُفقِ مقدر پر جو ستارے نمودار ہوئے اُن میں علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ، قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ اور مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ سب سے زیادہ تابناک نظر آتے ہیں۔ علامہ محمد اقبالؒ قوم کے سامنے ترجمانِ قرآن بن کر آتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی مساعی سے، اس (بظاہر) مردہ قوم کی رگوں سے زندگی کے شرارے اُبلنے لگتے ہیں۔ خوابیدہ قوم کو اس طرح جگانے کے بعد حضرتِ علامہؒ نے اُن کی

منزلِ مقصود کی نشاندہی اپنے اُس خطبہ میں کی جسے اُنھوں نے ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مُسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد کی آخری نشست میں ارزاں فرمایا۔ اس تاریخی خطبہ کے بعد مسلمانانِ ہند کی جنگِ آزادی کی قیادت کے لیے اُنھوں نے حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ جیسا دیدہ ور سپہ سالار منتخب کیا۔ حضرت علامہ اقبالؒ کا ملتِ پاکستانیہ پر یہ ایک ایسا عظیم احسان ہے جس نے مُسلمانوں کی اس ملی جنگ میں فتح اور کامرانی کو یقینی بنا دیا۔

حضرت قائدِ اعظمؒ نے قوم کی اس رزمِ موت و حیات میں جس مشاق اور حُسنِ تدبّر سے رہبری کی اور جس جانفشانی (جس میں اُن کا خونِ جگر بھی شامل ہے) سے یہ جوکھی لڑائی لڑی، اس کے نتیجہ میں قوم کا سفینۂ حیات ایک حسین بط کی طرح تیرتا ہُوا ساحلِ مُراد پہ آلگا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی صُبح ہماری حیاتِ ملی کی وہ درخشندہ صبح ہے کہ اس دن جب آفتابِ جہاں تاب نے اپنی چشمِ خوابیدہ وا کی تو اُس نے دُنیا کے نقشے پر ایک ایسی نئی مملکت کو اُبھرتے دیکھا جس کی بُنیادیں ان حسین دعاوی کے ساتھ رکھی جارہی تھیں کہ اس میں صرف اور صرف اللہ کی حاکمیت قائم کی جائے گی۔

حضرت قائدِ اعظمؒ نے حصُولِ پاکستان کی جنگ کی ابتدار کی تو خلافِ توقع اُنھیں ایک ایسے محاذ پر بھی شدید مُخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا جو اُن کا دائرۂ عمل نہ تھا۔ یہ محاذ تھا نیشنلسٹ عُلماء کا، جو ہندو کانگریس کے وظیفہ خور ہونے کا حق ادا کرنے میں، قوم کو اُس کے ہاتھ بیچ ڈالنے تک تیار تھے۔ چونکہ، جیسا کہ ابھی ابھی بتایا گیا ہے کہ یہ محاذ قائدِ اعظمؒ کے اپنے دوائرِ عمل سے باہر تھا، اس لیے اُنھوں نے اس محاذ کی ذمہ داری مفکرِ پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ کے ایماء پر (اُس وقت کے) چوہدری غلام احمد پرویزؒ کے سپُرد کی۔

مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ نے جس طرح اس محاذ کو سنبھالا اور جس طرح اپنے قائدؒ کو انگریز اور ہندو سے نپٹنے کے لیے فرصت مہیا کی، اُس پر ۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۲ء کے ماہ نامہ طلوعِ اسلام کے فائل شاہد ہیں، جس کا اجراء اسی مقصد کے حصُول کے لیے کیا گیا تھا۔

واضح رہے کہ محترم پرویز صاحب نے یہ سب کچھ اپنی ملازمتی مصرُوفیتوں اور تصنیفی کاوشوں کے ساتھ ساتھ کیا۔ اس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اُنھوں نے کس طرح شبانہ روز بھرپُور جدوجُہد کی ہوگی۔ جون ۱۹۴۲ء کے بعد نامساعدتِ حالات کی بناء پر ماہ نامہ طلوعِ اسلام کی اشاعت رُک گئی، لیکن اس سے اُن کی تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں سرگرمیوں میں چنداں کمی واقع نہیں ہوئی، بلکہ اس سے اُن کو موقع ملا کہ وہ حضرت قائدِ اعظمؒ کے نسبتاً زیادہ قریب ہوگئے اور دینی معاملات میں اُن کے ذاتی مشیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے حضرت

قائدِاعظمؒ کے اُس زمانے کے خطابات میں ایک حقیقت واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ اُنھوں نے ہر جگہ اور ہر موقع پر قرآنِ کریم اور صرف قرآنِ کریم سے رہنمائی حاصل کرنے پر زور دیا ہے۔ یہ درحقیقت قومی یک جہتی کی وہ واحد اساس ہے جو قائدِاعظمؒ کی زبان سے قوم تک پہنچتی رہی اور جو مُفکرِ قرآن کا اصل سرمایۂ حیات ہے۔ مُفکرِ قرآن علیہ الرحمتہ کی تحریکِ حصُولِ پاکستان کے دوراں اِن گراں قدر خدمات کو ایک منصُوبے کے تحت منظرِعام پر آنے نہیں دیا گیا۔ دو سال پہلے حکومتِ پاکستان نے کارکنانِ تحریکِ پاکستان کی خدمات کے اعتراف کی غرض سے ایک الگ شعبہ (شعبۂ تحریکِ پاکستان) قائم کیا اور اس طرح قومی تاریخ کے ان عظیم مجاہدوں کی خدمات کا اعتراف سرکاری سطح پر کرنے کا اہتمام ہوا۔ اندریں حالات' یہ احساس شدت اختیار کر گیا کہ محترم پرویزؒ صاحب کی اس مثالی جدوجہد کو ایک خود مکتفی کتاب کی شکل میں شائع کر دیا جائے تاکہ افرادِ ملت کا یہ سرمایہ، جو اَب تک اُن کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہے، اُن تک پہنچ بھی جائے اور قارئین کو ماہنامہ طلوعِ اسلام کے متعلقہ شماروں اور دیگر علمی مواد سے مستغنی بھی کر دیا جائے۔

فلہٰذا، محترم پرویزؒ صاحب کی تحریکِ حصُولِ پاکستان میں عملی جدوجہد کی تفاصیل پر مبنی کتاب ——— "تحریکِ پاکستان اور پرویزؒ" ——— کے نام سے پیشِ خدمت ہے کہ اس عظیم و منفرد مفکرؒ کی بھی عمر بھر یہی پکار رہی ہے کہ ؎

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من
کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

۱۴ اگست ۱۹۸۹ء

طلوعِ اسلام ٹرسٹ لاہور

آئینۂ مشمولات

۱	پیش لفظ۔		۳
۲	فہرست۔		۶
۳	حضرت علامہ محمد اقبال علیہ الرحمۃ کی وفات پر لمعات۔	جون ۱۹۳۸ء	۹
۴	سوراجی اسلام۔ "مسلمان نیشنلسٹ علماء کا بدلتا ہوا اسلام" کا مفہوم	جون ۱۹۳۸ء	۱۶
۵	گفتگوئے مصالحت۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں کن بنیادوں پر صلح ہو سکتی ہے۔	جولائی ۱۹۳۸ء	۴۱
۶	واردھا کی تعلیمی اسکیم۔ مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو اسلام سے یکسر بیگانہ بنا دینے کی گہری لیکن خاموش سازش۔	اگست ۱۹۳۸ء	۵۶
۷	زبان کا مسئلہ۔ اُردو کی بجائے "ہندی یا ہندوستانی" کو رائج کر کے مسلمانوں کو ان کی متاعِ علمی کی وراثت سے محروم کرنے کی سازش۔	اکتوبر ۱۹۳۸ء	۹۶
۸	متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد مدنی۔ مدنی صاحب کے عجمی نظریہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" کا بطلان کتاب و سنت کی روشنی میں۔	جنوری ۱۹۳۹ء	۱۳۳
۹	عرضداشت بحضور علمائے کرام و بزرگانِ عظام۔ اسلامی مرکزیت کو چھوڑ کر قومیت پرستی کا مسلک کس طرح اسلام کی روح کے منافی ہے۔	مارچ ۱۹۳۹ء	۱۹۴
۱۰	خُطبہ صدارت حضرت علامہ محمد اقبالؒ کا آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (۱۹۳۰ء) الہ آباد کا خطبہ۔	"	۲۱۸

۱۱	متبادل دستورِ ہند۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف حیدرآبادی کی منطقوں کی تقسیم کی مشہور سکیم۔	جون ۱۹۳۹ء	۲۵۳
۱۲	سوشلزم اور اسلام۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی جداگانہ ہستی کو مٹانے کی سازش کا میسرہ۔ جواہرلال نہرو کی قیادت میں۔	جولائی ۱۹۳۸ء	۲۷۱
۱۳	کفار سے دوستی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات کی صحیح نوعیت اسلام کی رُو سے۔	اگست ۱۹۳۹ء	۳۴۸
۱۴	کانگریس بے نقاب۔ کانگریس کے چہرہ کا نظر فریب نقاب اتارنے کے بعد اس کے اصلی خدوخال۔	ستمبر ۱۹۳۹ء	۳۷۳
۱۵	اسلام اور جمہوریت۔ مغربی انداز جمہوریت کس طرح اسلام کے خلاف ہے اور حقیقی جمہوریت کیا ہے؟	دسمبر ۱۹۳۹ء	۳۹۷
۱۶	یوم نجات۔ قائداعظمؒ کا حسنِ تدبر اور اس دن کی اہمیت۔	جنوری ۱۹۴۰ء	۴۱۰
۱۷	کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کانگرسی بساطِ سیاست کا ایک خطرناک مُہرہ۔	فروری ۱۹۴۰ء	۴۲۳
۱۸	سپاسنامہ بحضور قائداعظم محمد علی جناحؒ "پاکستان کا ریزولیشن پاس کرنے والے اجلاس ۱۹۴۰ء لاہور میں	مارچ ۱۹۴۰ء	۴۴۶
۱۹	صبح اُمید	مارچ ۱۹۴۰ء	۴۵۱
۲۰	نظر بر خطبۂ صدارت راشٹرپتی مولانا ابوالکلام آزاد۔ کانگریس کے سالانہ اجلاس میں مولانا ابوالکلام آزاد کی طویل خاموشی کے بعد لب کشائی۔	اپریل ۱۹۴۰ء	۴۵۶
۲۱	جہانِ نو۔ علیحدگی کی اسکیم قرآنی روشنی میں۔	جون ۱۹۴۰ء	۴۹۲
۲۲	قیاس کن تو کجائی و ما کجا واعظ! قومیت پرست حضرات کے مسلک کا تجزیہ اور ان کی غلطی کی وضاحت۔	فروری ۱۹۴۱ء	۵۷۲
۲۳	لمحۂ فکریہ آنے والے خطرات سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا۔	ستمبر ۱۹۴۱ء	۵۸۴
۲۴	قائداعظمؒ "اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند" مسلمانانِ ہند کے اس عظیم قائد کی دین فہمی۔	اپریل مئی ۱۹۴۲ء	۵۹۵
۲۵	اپنی آنکھ اور قرآن کریم کی روشنی	//	۵۹۹
۲۶	جمعیت العلماء قومیت پرست علمائے کرام کو ملتِ اسلامیہ ہندیہ کے کارواں میں	//	۶۱۱

	واپس لوٹنے کی دعوت ۔		
۲۷	لمعات ؛ طلوعِ اسلام جون ۱۹۴۲ء ۔	جون ۱۹۴۲ء	۶۳۱
	حصولِ پاکستان کے امکانات کی روشنی، قومی تحفظ کے لئے کوششوں کی اپیل اور طلوعِ اسلام کا سلسلۂ اشاعت بند ہونے کی دلشکن اطلاع۔		
۲۸	ہندو کیا ہے؟ اور کیا کرنا چاہتا ہے؟	اگست ۱۹۶۰ء	۶۴۲
۲۹	اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش!	اکتوبر ۱۹۷۶ء	۶۸۹
	مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کی چالیسؔ سال کی تاریخ خود مودودی صاحب کے الفاظ میں۔		
۳۰	THE GENESIS AND IDEOLOGY OF PAKISTAN		۷۶۵

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب .... تحریکِ پاکستان اور پرویزؒ

تالیف .... محمد عمر دراز

ناشر .... طلوعِ اسلام ٹرسٹ

۲۵/بی گلبرگ ۲، لاہور ۱۱، پاکستان

طابع .... خالد منصور نسیم

پریس .... النور پرنٹرز و پبلشرز

۳/۲ فیصل نگر، ملتان روڈ

پوسٹ بکس ۴۱۹۰۔ لاہور ۲۵

ایڈیشن .... اوّل (اگست ۱۹۸۹ء)

صفحات ۷۷۲

قیمت ....

لمعات

کیا خبر تھی کہ "طلوعِ اسلام" جس اسلامی مفکر کے فلسفۂ حیات کا صُور پھونکنے، اور مُسلمانوں کو صحیح اِسلام سے روشناس کرانے کے لیئے میدان میں نکلنے والا ہے، وہ علم و عرفان کی دُنیا کو یتیم اور غمزدہ چھوڑ کر خدائے کون و مکان کی لقا کے لیئے بے تاب بیٹھا ہے اور مادی قبا کو تنِ نورانی سے اُتار پھینکنے پر تُلا ہوا ہے! سچ یہ ہے کہ علامہ محمد اقبالؒ مرحوم و مغفور کو فان اجل اللّٰہ لآت کی لے اتنی پیاری لگی کہ پیاسی دُنیا کو سیراب کرنے کا خیال ہی نہ رہا اور شیفتگی اور وارفتگی کے عالم میں اتنے تیز قدم اُٹھائے کہ علم و فکر کی آبادی اس نقیبِ زندگی کو دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ گئی۔ مرحوم کو خیال ہی نہ رہا کہ فطرت کی بخشائشیں کن اُمور کی منتظر ہیں اور علم و حکمت کو ابھی اُنکی کس قدر ضرورت ہے۔ حقیقت میں یہ عاشقِ رسولؐ، یہ حکیمِ اسلام، یہ علم و معرفت کا بحرِ قلزم اور اسلام کا یہ بے مثال فلسفی من کان یرجوا لقاء اللّٰہ فان اجل اللّٰہ لآت کی صبر شکن صدا کو سُنکر کب تک صبر کرتا؟ اُسنے غیب سے یہ صدا سُنی، لبیک کہا، اور علم و حکمت کو روتا ہوا اور خود مُسکراتا ہوا اپنے محبوب کے پاس جل دیا!

مرحوم نے اپنے غریب خانہ پر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو ۵½ بجے انتقال فرمایا اور جس خوف سے ساری عمر مسلمانوں کو بے خوف کرتے رہے اُس سے یہ کہہ کر۔

"مَیں مسلمان ہوں اِس لیئے خوشی سے موت کا استقبال کرتا ہوں"

بغلگیر ہوگئے اور اپنے آخری وقت میں بھی دُنیا کو اِسلام کی تفسیر بتا دی!

آپ کی وفات سے نہ صرف مشرق کی تابندہ و پایندہ شاعری کو نقصان پہونچا ہے۔ نہ صرف علم و حکمت کی دُنیا یتیم ہوگئی ہے نہ صرف اجتماعی زندگی کی شمع گُل ہوئی ہے بلکہ انسانی ضمیر کا

طلوعِ اسلام ۶ ماہ جون ۱۹۳۸ء

وہ احساس گم ہوگیا ہے جو وحدۃ انسانی کی بنیاد رجائیت و عمل کی اساس اور فکر و حیات کا سرچشمہ تھا۔

مرحوم و مغفور اقبالؔ نہیں ہیں عزائم و خودداری کے پیکر نورانی اُردو و شاعری کے باعث ہندوستان میں اور فارسی کلام کے باعث دُنیا کے گوشہ گوشہ میں متعارف ہیں اور ہر شخص اُنکے خیالات و نظریات سے اُنکے کمالات علمی کا اندازہ لگا سکتا ہے اور گو اُنھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصّہ لاہور میں گزارا اور ہندوستان میں رہ کر ہندوستانی کہلائے مگر حقیقت میں وہ کسی ایک ملک کسی ایک قوم اور کسی ایک دَور کی شخصیت اور ملکیت نہ تھے بلکہ وہ دَورِ حاضرہ کی انسانیت کے امانت تھے وہ حکیم تھے اُن کی تشخیص درست تھی اور بیماری کے اسباب کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور اُنھوں نے انسان کی مصیبتوں کا جو علاج تجویز کیا تھا اُس کی بنیاد بھی انسانیت اور ضمیر کی آواز تھی۔

اقبالؔ کا خزانہ علم و حکمت عام ہے۔ دُنیا تیس سال سے اُنکے موتیوں سے اپنے دامن بھرتی رہی ہے اور خدا جانے کتنی سعید روحیں ہیں۔ جنھوں نے اقبالؔ کے پیام کو سُنا اور اُنکے نظریاتِ اسلام کے اس سانچہ میں ڈھل گئے جس سے بہتر فطرت نے کوئی دوسرا سانچہ تیار نہیں کیا ہے گو شاعری کا اعلیٰ سے اعلیٰ تصوّر اور بہتر سے بہتر تخیل بھی مرحوم کے مخصوص علم کلام کا آئینہ دار نہیں ہو سکتا تاہم اُنکی بے مثال شاعری نے جس طرح اسلامی ضمیر کی تشکیل کی ہے اور موجودہ مذہبی اور سیاسی ماحول میں اسلام کے فلسفہ کو جس بلندی پر پہونچایا ہے اس کی مثال موجودہ صدی میں ملنی محال ہے۔

اقبالؔ ہمیشہ مذہبی بنیادوں پر مسلمانوں کے حقوق کے علمبردار رہے۔ انکا ایمان تھا کہ جب تک مُسلمان دورِ اوّل کی زندگی کو اختیار نہیں کرینگے اور کتاب و سُنّت کو اپنے عمل و فکر کی بنیاد قرار نہیں دینگے۔ اسوقت تک انکو نہ مغرب پرستی تباہی سے بچا سکتی ہے اور نہ یورپ زدگی انکے درد کی دوا ہو سکتی ہے چنانچہ وہ ساری عمر اسی فلسفہ حیات کا درس دیتے رہے اور یہی سرچشمہ ان کو مسلم کی زندگی میں نظر آتا رہا۔ اسی لیے وہ مسلم بنکر جیئے۔ مسلم بن کر میدان میں آئے اور مسلم بن کر

واصل بحق ہوئے انکے نزدیک زندگی کا راز فلسفۂ حیات کا نکتہ اور عظمت و کامرانی کا جوہر کتابِ الٰہی کے صرف اس ٹکڑہ میں پوشیدہ تھا

رب توفنی مسلما والحقنی بالصالحین

اے پروردگار! مجھے مسلم بنا کر اٹھا اور صالحین کی معیت نصیب کر!

مرحوم کا دائرہ خدمت سب سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر تھا۔ انھوں نے دنیا کو اجتماعی زندگی کا درس عمل دیا۔ رجائیت اور خودداری پر اپنے فلسفہ کی بنیاد رکھی، زندگی کے جذبات میں تلاطم پیدا کیا، دماغوں کو رفعت اور بلندی بخشی، قوم کی ذہنیت اور مزاج میں ایسا انقلاب پیدا کیا جو آئندہ ایک عرصہ تک ہر اصلاحی تحریک میں بنیادی عنصر کا کام دیتا رہے گا،

اقبال کا عقیدہ تھا اور کون اسلام کا عارف اور حکیم ہے جو اس کا قائل نہ ہو کہ اسلام میں اتنی وسعت، اتنی ہمہ گیری اور اتنی صلاحیت موجود ہے کہ جو قوم اپنے نظامِ حیات کو قرآن حکیم کے سپرد کر دے گی قرآن زندگی کے قدم قدم پر اس کی رہنمائی کرے گا اور قوم کا مزاج عقلی اس سے تقویم پاتا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مرحوم زندگی کے کسی نظام سے مطمئن نہ تھے اور دنیا کی کوئی غلط تحریک انکے دماغ کو متأثر نہ کر سکی۔ انکے نزدیک زندگی کا مکمل نظام اور ضابطۂ حیات صرف اسلام ہے اور بلاشبہ جو شخص بھی مرحوم کی سی گہری نظر رکھے گا وہ ہزار ٹھوکریں کھانے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے گا۔

مثل مشہور ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی قدر ہوتی ہے مگر مرحوم اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں آپ کو اپنی زندگی میں رفعت وعظمت کا وہ بلند مقام حاصل ہوا جو صرف آپ ہی کے لیے مقدر تھا آپکا کلام نہ صرف انگریزی میں بلکہ یورپ کی دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا گیا اور اس سے مغرب کے دانش فروشوں نے انسانیت، عزم، خودداری اور رجائیت کے سبق سیکھے۔ اگرچہ مغرب کو معلوم تھا کہ

اقبال مغرب کے مادی رُجحانات کے سخت مخالف ہیں اور وہ اسلام کے علی نظریہ کے مطابق رُوحانیت اور مادیت کا صحیح امتزاج چاہتے ہیں تاہم اُنکے فلسفہ حیات کی تشریح نے مغربی مفکرین کے فکر و نظر کو جلا بخشی اور اُنکو کلام اقبال کے صدقہ میں زندگی کا راز معلوم ہوا۔

اقبال کبھی اپنی زندگی میں کسی سے مرعوب نہیں ہوئے، ہاں اسلامزم کے خلاف فرانس کا پروپیگنڈہ آپ کے اسلامی جسم میں وحدۃ اسلامی کی نئی اور تازہ روح پھونک دیتا ہے۔ وطنیت اور قومیت کا وہ فرنگی تصور جسنے اسلامی ممالک کے بڑے بڑے اسلامی مفکرین تک کو اپنے چنگل میں پھنسایا ہے وہ اس سے ذرہ برابر بھی متاثر نہ ہوئے بلکہ ساری عمر ان بتوں کو توڑنے میں گزاری یہاں تک کہ مردِ مسلم یورپ کا سفر کرتا ہے اور وہاں سے اسلامی حرارت لے کر واپس ہوتا ہے حالانکہ یورپ ہی وہ مقام ہے جہاں جاکر بڑے سے بڑے متقی کا قلب و دماغ کمزور ہو جایا کرتا ہے، مگر اقبال اس امتحان میں بھی ثابت قدم رہتا ہے اور یورپ کے طوفان سے اس کا اسلامی دماغ اور پختہ ہو جاتا ہے۔

غرض علامہ اقبال مرحوم و مغفور اقوامِ مشرق کے لیے اپنے کلام میں فکر و حیات کی وہ آگ سلگتی چھوڑ گئے ہیں جس سے قومیں زندگی اور قوت کی حرارت حاصل کرتی رہیں گی کیونکہ وہ ایک معلم و مفکر ہی نہ تھے، بلکہ انسانی ضمیر کے محرک بھی تھے اور ہمارا ایمان ہے کہ جب تک علم و حکمت باقی رہے گا جب تک انسانیت کے احترام کا جذبہ سینوں سے اُبلتا رہے گا جب تک ملوکیت اور حکمرانی کی اصلاحی تحریکیں جاری رہیں گی اسوقت تک اس حکیم اسلام اور مصلح اعظم کی یاد بھی تازہ رہے گی!

بقول اخبار "انسکیمن" اقبال کے نقدان سے ہم فقیر ہو گئے ہیں مگر اُنکے زندہ کلام نے ہم کو اس قدر غنی کر دیا ہے کہ ہم ہمیشہ دارائی اور سکندری کرتے رہینگے۔

اے خدا مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازئے اور اپنے بندوں کے اس محبوب بندہ کو اپنی محبوبیت

طلوعِ اسلام 9 ماہ جون ۱۹۳۸ء

اور مغفرت کی چادر میں ڈھانک لے اور جملہ متعلقین کے قلبِ حزین پر صبرِ جمیل کا القا فرما آمین ٭

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
(اقبالؒ)

مئی کا طلوعِ اسلام انتظامی سہولتوں کے خیال سے اپریل کے وسط میں ہی شائع ہو چکا تھا کچھ پرچے باہر جا چکے تھے اور کچھ باقی تھے کہ مرحوم کے انتقال کی خبر پہنچی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس خبر سے قلوب پر کیا گزری اور کیا کیا خیالات پیدا ہوئے مگر دل کو تھام کر "نالۂ یتیم" کے عنوان سے مرحوم کے انتقال کی خبر علیحدہ چھپوائی گئی اور مئی کے جو پرچے دفتر میں موجود تھے اُنکے ساتھ لگا دی گئی ٭

اس سلسلہ میں بعض احباب کا خیال تھا کہ طلوعِ اسلام کا آئندہ پرچہ یعنی جون کا موجودہ پرچہ اقبال نمبر ہونا چاہیئے مگر چونکہ طلوعِ اسلام آپ ہی کی یادگار ہے اسلیئے اسکا ہر پرچہ گویا اقبال نمبر ہے اور اسوقت کسی خاص نمبر کی ضرورت نہیں ہے گو حضرت علامہؒ کے متعلق ساری عمر لکھا جائیگا مگر پرچے انتظام کے ساتھ جو خاص نمبر نکالیں گے وہ انشاء اللہ اقبال نمبر ہی ہوگا۔

اگر مسلمانوں نے علامہؒ کی مستقل اور پائیدار یادگار قایم کرنے میں عجلت نہ کی اور اُن کی شایانِ شان کوئی نشانی آئندہ نسلوں کے لیئے نہ چھوڑی تو طلوعِ اسلام کے اقبال نمبر سے کچھ نہ بنے گا اور یہ مسلمانوں کی نہیں علم و حکمت کی سب سے بڑی بدقسمتی ہوگی۔ اگر اسلام کے اس حکیم یگانہ کی کوئی یادگار قائم نہ ہوئی ٭

اقبالؒ کی یادگار کے سلسلہ میں ..... جو کمیٹی لاہور میں قایم کی گئی ہے اس میں نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو، سکھ، عیسائی، انگریز سب ہی شامل ہیں جس سے مرحوم کی مقبولیت اور محبوبیت

کا پتہ چلتا ہے۔ اس کام کا آغاز پنجاب سے ہونا چاہیئے اگر صوبہ کے وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں اور پنجاب کے دیگر علم دوست اس کام کو انجام تک پہنچانے کا تہیہ کر لیں تو یقیناً ہندوستان میں مرحوم کی ایک بے مثل یادگار قائم ہو سکتی ہے ہم انشاء اللہ اس سلسلہ میں آیندہ مفصل گفتگو کریں گے

ذرا تصور میں لائیے اس کیفیت کو کہ آپ کسی بیابان صحرا میں راہ گم کردہ کھڑے ہوں منزل کا کہیں نشان نہ ملے چاروں طرف کوسوں تک کسی ذی روح کا پتہ نہ چلے۔ شام کا سناٹا آنیوالی شب تیرہ و تار کی بھیانک سیاہی کو دامن صحرا پر پھیلا رہا ہو۔ واہمہ کے عفریت چھلاوے ہر طرف سے ڈرا رہے ہوں ایسے میں کہیں دور سے کسی انسان کی ایک مبہم سی آواز آپکے کانوں میں آ پہونچے۔ جو کیفیت آپ کے قلب کی اسوقت ہو گی کچھ اسی قسم کی اضطرابی کیفیت کے آئینہ دار وہ خطوط اور پیغامات ہیں جو ہمیں قارئین کرام کیطرف سے طلوع اسلام کے پہلے ہی پرچے کے مطالعہ کے بعد موصول ہو رہے ہیں کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ملت اسلامیہ کا یہ راہ گم کردہ۔ مایوس قافلہ ہر اس آواز کے لیے ہمہ تن گوش ہونے کے لیے بیتاب ہے جس میں کچھ بھی امید کی جھلک نظر آئے۔ یہ علامات بڑی جرأت افزا ہیں۔ اس سے پیشتر تو یہ حالت تھی کہ متاعِ کارواں لٹ جانے کے بعد کارواں کے دل سے احساس زیاں بھی جاتا رہا تھا۔ لیکن اب اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ احساس زیاں پھر سے پیدا ہو رہا ہے اور یہی احساس ہے جو ایک قوم کے اجزائے پریشاں کو ایک مرکز پر لانے کا اولین ذریعہ ہوتا ہے اس اضطرابی کیفیت کا اس سے اندازہ فرمایئے کہ کسی نے پوچھا ہے کہ صاحب اِسب باتوں کو چھوڑ یئے اور یہ بتایئے کہ ہمارے لیئے راہ عمل کونسی ہے؟ کسی نے دریافت کیا ہے کہ یہ کہیئے کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مسلمانوں کی اقلیت ایک اتنی بڑی غیر مسلم اکثریت میں گھیری ہوئی ہے مسلمانوں کا طرز عمل دوسروں کے ساتھ کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ کسی نے سوال کیا ہے کہ اگر غیر مسلموں کے ساتھ ہمارا تولی جائز نہیں تو پھر باہمی تعاون و اتحاد کی کونسی شکل ہے۔ کسی کا استفسار ہے کہ جب دین فطرت یوں بھی افسانوں کی وجہ سے ایک چیستاں بن چکا ہے تو حقیقی اسلام کا اب کیسے پتہ چلے گا

غرضیکہ اسی قسم کے گوناگوں سوالات ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قوم کے دل میں صحیح راستہ کی تلاش کے لیے کتنی بڑی تڑپ اور خلش موجود ہے۔ ہمیں ان مستفسرین حضرات کی بیتابیٔ تمنا کا پُورا پورا احساس ہے لیکن ہم گزارش کرینگے کہ وہ اپنے فورِ شوق کو تھوڑی سی زحمتِ انتظار اور دیں۔ طلوعِ اسلام کا نصب العین ان تمام سوالات کا حل کتاب و سُنت کی روشنی میں پیش کرنا ہے۔ آپ اگر اسے شرفِ نظر بخشتے رہے تو تھوڑے ہی عرصے کے بعد آپ محسوس کرینگے کہ آپکے وہ تمام شکوک و شبہات جو آپکے دل کی گہرائیوں سے اُبھرتے بھی نہیں ہیں، خود بخود رفع ہوتے جائینگے اور آپکا یہ تمام اضطراب تردد جو آپکے سینے میں آتشِ خاموش کی طرح سُلگ رہا ہے مبدّل بہ سکون و طمانیت ہو جائیگا۔ بعونہٖ تعالےٰ سب کچھ ہوگا لیکن آہستہ آہستہ، کہ کانٹوں میں اُلجھے ہوئے دامن کو جھٹکے چھڑانا دانشمندی نہیں ہوتی۔

موجودہ اشاعت میں کتاب ”معارف القرآن“ کا دیباچہ شائع ہو رہا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب کیا ہے۔ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس کے ذریعہ مسلمان حقائقِ قرآن تک کس طرح رسائی حاصل کر سکتے ہیں اور نتائج کے لحاظ سے کتاب کی قدر و قیمت کیا ہے۔ یہ وہی کتاب ہے جس کا اعلان مئی کے طلوعِ اسلام میں کیا گیا تھا اور جو اس رسالہ میں مسلسل شائع ہوتی رہے گی۔ کتاب معارف القرآن رسالہ کے آخری جزو سے شروع ہو گی اور اس کے صفحات مسلسل اور علیحدہ ہوں گے تاکہ قارئین کرام ہر ماہ اس جزو کو علیحدہ کر کے کتاب کی شکل میں لے آئیں اور ان کو رسالہ کے ساتھ ایک مستقل کتاب مل جائے۔

معارف القرآن کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا دیباچہ غور و تدبر کے ساتھ پڑھ لیا جائے۔ یہ دیباچہ اسی اشاعت میں شائع ہو رہا ہے اور آیندہ نمبروں کے تسلسل کے ساتھ اصل کتاب بھی برابر شائع ہوتی رہیگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ

طلوعِ اسلام ۲۷ ماہ جون ۱۹۳۸ء

سوراجی اسلام

رازیؔ

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جب کانگریس کے دستورِ اساسی میں یہ بات موجود ہے کہ سوراج حاصل ہونے کے بعد ہندوستان کی مختلف اقوام کی مذہبی آزادی برقرار رکھی جائیگی تو پھر مسلمان اپنے مذہب کے تحفظ کے لیئے اور کیا ضمانت چاہتے ہیں۔ یہ دلیل ایسی نظر فریب اور خوش آئند ہے کہ اچھے اچھے سمجھدار اسکے دامِ تزویر میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور عوام جو بالکل سطح بیں ہوتے ہیں انکے پاس تو اسکا جواب ہی کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن آیئے تو ذرا دیکھیں کہ قرائن سے جو کچھ پتہ چلتا ہے اسکی رُو سے سوراج حاصل ہونے کے بعد جس مذہب کی آزادی مسلمانوں کو حاصل ہوگی وہ کونسا مذہب ہوگا کیا وہ اسلام ہی ہوگا یا کسی اور چیز کا نام اسلام رکھدیا جائیگا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ سوراج کے بعد ہندوستان کی "متحدہ قومیت" کا نظامِ حکومت جمہوری ہوگا اور اس متحدہ قوم کی تقدیروں کے مالک مختلف خیالات کے نمائندوں کی جماعت کے افراد ہونگے جنکی کثرتِ آراء سے تمام معاملات کا فیصلہ ہوا کریگا اور جو معاملہ اکثریت کی رائے سے طے ہو جائیگا وہ مُلک کا قانون بن جائیگا جسکی خلاف ورزی جرم ہوگی۔ لہذا ہمیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ وہ مختلف سیاسی معتقدات کی جماعتیں جنکے ہاتھ میں زمامِ حکومت ہوگی، مذہب سے مفہوم کیا لیتی ہیں۔ اس لئے کہ جب مذہبی آزادی یا مذہبی معاملات میں دخل اندازی کا سوال پیدا ہوگا تو سب سے پہلے تو یہی سوال اُٹھے گا کہ وہ مذہب جسکی آزادی کا حکومت نے وعدہ دیا ہوا ہے اسکی تعریف کیا ہے کون کون سے معاملات مذہب کی حدود کے اندر ہیں اور کون کون سے اسکے باہر۔

سب سے پہلے قدامت پسند ہندوؤں کی اس جماعت کو لیجئے جسکے نمائندے مہاتما گاندھی ہیں

ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ یہ جماعت اپنے اس اعلان میں مخلص ہے کہ سوراج کے بعد مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ اس جماعت کے نزدیک مذہب نام ہے چند رسومات کا اور چند عبادات کا اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ عقائد یا عبادات میں بھی کسی کا اشتراک یا اتحاد ہو ایک فرقہ کرشن بھگت ہے اور دوسرا رام اوپاسک۔ سناتن دھرم والے مورتی پوجا کرتے ہیں لیکن آریہ سماج والے مورتی کھنڈن (بت شکنی) کے قائل ہیں۔ ویدانت کے قائل مادہ کو مایا (سراب) سمجھتے ہیں۔ اور آریہ سماجی روح مادہ دونوں کو ازلی اور ابدی مانتے ہیں بنگال کے ہندو کالی ماتا کی پوجا کرتے ہیں اور ستیارتھ پرکاش اس دیوی کو ڈائن قرار دیتی ہے۔ سناتن دھرمی ورنوں کی تقسیم پیدائش کے لحاظ سے کرتے ہیں اس لئے اچھوت اُن کے نزدیک پیدائشی اچھوت ہیں لیکن آج خود مہاتماجی اس بات کے لئے پران تیاگنے کو تیار ہو جاتے ہیں کہ اچھوت کو اچھوت کیوں سمجھا جاتا ہے۔ ان تمام اختلافات کے باوجود یہ سب ہندو ہیں اور ان میں سے کوئی بات بھی ہندو دھرم کے خلاف نہیں ہوتی کہ پنڈت جواہر لال نہرو جو ناستک ہیں خدا کے بھی منکر ہیں وہ بھی ہندو ہیں اس لئے اس جماعت کے نزدیک تو مذہب محض کسی ذہنی نظریہ کا نام ہے جس کی کوئی تعریف ہی نہیں کی جاسکتی۔ باقی رہے معاشرتی معاشی سیاسی معاملات تو وہ مذہب کے احاطہ سے باہر ہیں انکا حل ارباب سیاست کے ذمہ ہے۔ مذہب سے متعلق یہی نظریہ آج انگریزوں کے سامنے ہے۔ انکے سامنے بھی کلیسا اور سلطنت دو الگ الگ شعبے ہیں ملکہ وکٹوریہ کے منشور کی رُو سے آج بھی مسلمانوں کو مذہبی معاملات میں کامل آزادی" حاصل ہے۔ اور حکومت مذہبی معاملات میں دخل انداز نہیں ہوتی لیکن یہ مذہب ہے کیا جو حکومت کی دخل اندازی سے باہر ہے۔ وہی چند رسومات اور عبادات آپ دن رات قرآنِ کریم کا درس دیتے رہئے کوئی مزاحم نہیں ہوگا لیکن اگر آیت کی تفسیر حکومتِ وقت کے قانون سے ٹکرا جائے تو اس مذہبی آزادی کا جو حشر ہوتا ہے اسکا حال مقدمہ کراچی کے اسیران اور مالٹا کے نظر بندوں سے پوچھئے۔ اس لئے کہ

قرآن کی تلاوت تو مذہب میں داخل ہے لیکن ملکی اور سیاسی معاملات میں تو آپکو مُلک کے قانون کے تحت رہنا ہوگا۔ مذہب "ثواب" حاصل کرنے کے لیے ہے نہ کہ زندگی کے معاملات کا عملی حل تلاش کرنے کے لیے۔ اب آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ اس نظریہ کے ماتحت آپ کو جس قسم کی مذہبی "آزادی" حاصل ہوگی وہ آج کی "غلامی" سے کتنی بہتر ہوگی۔

قدامت پرستوں کی دوسری جماعت وہ ہے جسکی نمائندگی کا شرف ہندو مہاسبھا کو حاصل ہے اور یہی وہ جماعت ہے جسکی ملک میں اکثریت ہے کچھ وقت ہوا کہ ابھی اکثریت میں کچھ شبہ ہونے لگا تھا جبکہ اچھوتوں نے تقاضا کیا تھا کہ ہمیں جداگانہ نیابت حاصل ہونی چاہیئے۔ اسوقت ان مظلوموں کی ہمدردی کے جذبہ نے جوش کھایا بڑے بڑے مہاتمائش ہندوؤں نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ بونہ میں مرن تپاگ برت رکھے گئے بڑے بڑے اونچ گوت کے ہندوؤں نے اپنے آپ کو ہریجن کہلانا شروع کر دیا۔

اور اس مظلوم طبقہ کی زبوں حالی کے احساس نے اسوقت تک چین نہ لینے دیا جبتک یقین نہ ہو گیا کہ ہندو مہا سبھا کی اکثریت خطرے میں نہیں ہے مہاتما جی نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ اب زندگی کا مقصد اسی اکثریت کے تحفظ کو قرار دے لیا ہے۔ اس طبقہ کے جو خیالات مسلمانوں کے مذہب سے متعلق ہیں اس کے لئے دیوتا سروپ بھائی پرمانند۔ ڈاکٹر مونجے اور مسٹر ساورکر کے شبھ نام کافی ہیں ظاہر ہے کہ جس حکومت کے نظام میں اکثریت اس جماعت کی ہوگی اسمیں اقلیت کے مذہب کا کیا حشر ہوگا۔ اکثریت کی تو آج بھی یہ حالت ہے کہ سناتنی بیچارے لاکھ چلا رہے ہیں کہ سارداایکٹ ہمارے دھرم کے خلاف ہے کوئی ایک نہیں سنتا وہ چیخ رہے ہیں کہ اچھوتوں کے لیئے مندروں کے دروازے کھول دینا یکسر ہندو دھرم کو اپوتر کر دینا ہے لیکن سیاست کی مصلحت کوشیاں اکثریت کے کان بند کئے ہوئے ہیں جب ابھی خود اپنے ہاں یہ حالت ہے کہ مہا سبھائیوں کی اکثریت سناتن دھرمیوں کے مذہبی احساسات کی کچھ پرواہ نہیں کرتی تو یہی اکثریت ملیکش مسلمانوں کے مذہب کا جسقدر پاس کرے گی ظاہر ہے۔

اب اس جماعت کو لیجئے جو روشن خیال جدت پسند (ADVANCED)

طبقہ کہلاتا ہے اور جسکی قیادت پنڈت جواہرلال نہرو کو حاصل ہے یہ اشتراکی خیالات کے حامی ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اشتراکیت میں خدا اور آخرت پر ایمان کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں اس میں اسلام ہی نہیں بلکہ خود عیسائیت کا جو حشر ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ ہمارا نوجوان طبقہ جوان خیالات سے متأثر کیا جارہا ہے۔ ایمانیات سے اسکا استہزاء خود بتا رہا ہے کہ مذہب سے متعلق انکا زاویۂ نگاہ کیا ہے۔ پنڈت جی اور انکے رفقائے کار کی یہ کوشش ہے کہ اشتراکیت آنیوالے ہندوستان کا سیاسی مذہب بن جائے اس نظریہ کی عملی اشاعت میں بعض سیاسی مصالح ابھی انکے راستہ میں حائل ہیں لیکن بایں ہمہ جس سرعت کے ساتھ اس کو عام کیا جارہا ہے اسکا نتیجہ ظاہر ہے اسلام خود سرمایہ داری کا دشمن اور اشتراکیت کا حامی ہے لیکن اس اشتراکیت کا نہیں جسکی تخلیق اس انقلاب پسند طبقہ کے اس انتقامی جذبہ کی رہینِ منت ہے جو زار کی حکومت کے خلاف اسکے دل میں موجزن تھا اور جسکا اصول صرف یہ تھا کہ ہر وہ چیز جو زار کے وقت میں دنیا میں موجود تھی۔ تباہ کر دینے کی لائق ہے۔ یہی وہ اشتراکیت ہے جو ہندوستان کے انقلاب پسند طبقہ میں مقبولیت حاصل کر رہی ہے اور جو محض روس کی نقالی ہے۔ غلام نژاد قوم ہمیشہ مقلد ہوا کرتی ہے طواف اندر سرشتِ برہمن است۔ رسالہ کلیم اس مسلک کی نشر و اشاعت میں بڑا سرگرم رہتا ہے کہ اس سے نوجوانوں میں مقبولیت بڑھ جاتی ہے چنانچہ اسکا کوئی پرچہ ایسا ہوتا ہوگا جسمیں خدا اور آخرت پر ایمان کی تضحیک نہ کیجاتی ہو مثلاً مارچ کے پرچہ میں ناظر کے نام سے ایک مضمون چھپا ہے جسمیں وہ تحریر فرماتے ہیں۔

> خدا کے تصور کی ابتدا انسان کے اس دور سے شروع ہوئی جبکہ ذہنِ انسانی عالمِ طفولیت میں تھا وہ فطرت کے عظیم الشان مظاہر کی توجیہہ کر سکتا تھا سوائے اس کے کہ انکو فوق العادت ہستی سے منسوب کر دے ..... مذہب کا توہم پرستی کے ساتھ ہونیکا ثبوت یہ ہے کہ آج تک بھی جہاں جہاں جہالت زیادہ ہے اور علم کی روشنی کم ہے وہاں مذہب کا دور دورہ ہے مذہب ایک غیبی چیز ہے اور غیبی چیزوں کو تاریکی میں زیادہ فروغ ہوتا ہے

طلوعِ اسلام ۳۱ ماہ جون ۱۹۳۸ء

اسکے بعد حیات بعد الممات کے عقیدہ کی مخالفت کی گئی ہے آخیر میں رقمطراز ہیں کہ ہندوستان چونکہ علوم وفنون اور تہذیب تمدن میں بہت پیچھے ہے اس لئے یہاں فی الحال مذہب کو رہنے دیا جائے لیکن "مذہب کو اجتماعی حیثیت نہ دیجائے اسکو خالص شخصی یا انفرادی چیز سمجھنا چاہیئے اسطرح اسکی پبلک حیثیت رفع ہو کر خالص پرائیویٹ یا نجی حیثیت باقی رہے گی۔

یہ تو تھے غیر مسلم حضرات کے مختلف طبقے یا مسلمان کہلانے والوں میں سے وہ طبقہ جسے متشددین کہا جا سکتا ہے لیکن آنے والے اسلام کے متعلق جو نظریہ عام "قوم پرست" مسلم حضرات پیش کر رہے ہیں وہ ان سے بھی زیادہ افسوسناک اور مایوس کن ہے ان حضرات کی تحریروں اور تقریروں سے واقف ہونے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس قسم کا اسلام وہ پیش کر رہے ہیں وہ خود انکے اپنے ہی دماغوں کی ساخت ہے کتاب و سنّت کے اسلام سے اسکو کچھ علاقہ نہیں انکے نزدیک بھی مذہب چند رسومات و عبادات کا ہی نام ہے۔ اس کے بعد عام معاشرتی، معاشی، سیاسی معاملات سب "دُنیاوی" امور ہیں جنکا مذہب سے کچھ واسطہ نہیں۔ مثال کے طور پر دو ایک مشہور "قوم پرست" مُسلم حضرات کے خیالات ملاحظہ فرمائیے ڈاکٹر سید محمود سابق سکرٹری آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور کانگریسی حکومت صوبہ بہار کے وزیر کا ایک مضمون رسالہ جامعہ بابت اکتوبر ۱۹۳۶ء میں چھپا تھا۔ اس میں انھوں نے اس امر کی تلقین کی تھی کہ ہندوستان جیسے ملک میں مذہب اس قسم کا ہونا چاہیئے جس قسم کا دینِ اکبر نے ایجاد کیا تھا۔ اکبر جیسوں کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ

> "بعض نے اپنے ولولہ و جوش سے مجبور ہو کر ہندوستان میں متحدہ قومیت کی آفرینش کے پیشِ نظر ایک ایسے جدید مذہبی نظام کی نشوونما کرنی چاہی جو ہندوستان میں سب کے مناسبِ حال ہو۔ یہ ان لوگوں کی معمولی خدمات نہیں کہی جا سکتیں" آنے والے نظام حکومت کے ماتحت اس نئے "دینِ الٰہی" کے ماننے والوں کا نام کیا ہو گا۔

طلوعِ اسلام ۳۲ ماہ جون ۱۹۳۸ء

اس کے متعلق ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

لفظ ہندی کو زبان کے لیے نہیں بلکہ اہل ہند کے لیے اختیار کرنا چاہیئے۔ دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں مختلف لوگ مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں، صرف اسکا اظہار ہی ہماری دماغی کیفیت کا آئینہ بنجاتا ہے اور ہمارے متعلق یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ہم اس برِاعظم کی علیحدہ علیحدہ مذہبی اقوام" ہیں اس لیے اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب ایک مشترک نام اختیار کر لیں۔[1]

کانگریس کے شعبۂ اسلامیات کے معتمد ڈاکٹر اشرف صاحب کا ایک مضمون جمعیۃ العلماء ہند کے آرگن الجمعیۃ بابت رجب ۱۳۵۶ھ میں شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں میں پہلے کونسی بات میں یگانگت اور وحدت تھی جو وہ اب اپنی الگ وحدتِ قومی کے لیے چلا رہے ہیں۔ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ

اس اعتبار سے ہم آج ایک نئے اور زندہ تمدن کی تعمیر میں مصروف ہیں ہماری سیاسی اور سماجی جدوجہد اس نئے تمدن کا پیش خیمہ ہے"

اسی شعبۂ اسلامیات کے ایک رکن جناب منظر رضوی کا ایک مضمون "مسٹر جناح کی کھوکھلی قیادت" کے عنوان سے اخبار مدینہ بابت یکم نومبر ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ

مسٹر جناح نے پکار کر کہا ہے "ہندوستان بھر کے مسلمانوں ملجاؤ" سوال یہ ہے کہ ہندوستان بھر کا مسلمان آپس میں کیوں ملے اس اتحاد کی ضرورت کیا ہے۔ اسکا

---

[1] یعنی خدا نے تو یہ فرمایا تھا کہ هو سمّٰكم المسلمين - اس نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے۔ اور یہ کہ

ومن احسن قولا ...... یعنی کہ اس سے بہتر بات کرنے والا کون ہے جو اللہ کی طرف بلائے۔ عمل صالح کرے اور کہے کہ میں مسلمان ہوں لیکن مسلمانوں کے یہ نمائندہ حضرات ہیں کہ ان کو اس بات سے شرم محسوس ہوتی ہے کہ کوئی اپنے آپ کو مسلمان کہے۔ یہ ہے سوراجی اسلام کی ایک خفیف سی جھلک۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ (رازی)

مقصد کیا ہے جہانتک توحید رسالت مذہبی معتقدات اور مذہبی حرکت وعمل کا
تعلق ہے وہ آپس میں ملے ہوئے ہیں بالکل متحد ہیں انمیں کوئی اختلاف نہیں
اور ہم مسٹر جناح کو یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ بھی کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ لیکن سیاسی
اور اقتصادی اغراض ومفاد کے لئے مسلمانوں کا آپس میں ملنا ناممکن ہے وہ ہرگز
متحد نہیں ہو سکتے۔ اور نہ انکو متحد ہونا چاہیئے (اقتباسات بحوالہ ترجمان القرآن)

رسالہ کلیم کے مدیر جناب جوش ملیح آبادی دسمبر ۱۹۳۷ء کے پرچہ کے اشارات میں فرماتے ہیں

اس کے علاوہ اپنے کو مسلم یا ہندو پہلے اور ہندوستانی بعد کو کہنا جغرافی
صداقت اور فطری قانون کے بھی خلاف ہے۔ مذہب زیادہ سے زیادہ ایک
ذہنی لباس ہے لیکن قومیت اور وطنیت تو ہمارے بدن کی جلد ہے۔ بدن کی جلد کیسی
قومیت تو ہمارا گوشت پوست اور ہمارا خمیر ہے۔ لباس تو ہر وقت بدلا جا سکتا ہے
لیکن پوست اور خمیر کو کون بدل سکتا ہے! ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ قومیت و
وطنیت ایک ایسی قدرتی چیز ہے جسکا تبدیل کر دینا طاقت بشری سے باہر ہے۔[1]

ایک اور "قوم پرست" بزرگ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ہیں وہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے
مشہور نظریۂ قومیت سے متعلق بیان کے جواب میں اپنے اخبار "ہند" بابتہ ۱۲ مارچ ۱۹۳۸ء میں تحریر فرماتے ہیں کہ

ہمارے مدعیانِ علم نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ اسلام اسلامی سوسائٹی کا ایک
ایسا نظام بنایا ہے جو ہمہ گیر اور اٹل ہے مگر یہ کہتے ہوئے ان لوگوں کو یہ یاد نہیں
رہا کہ وہ اپنے اس قول سے اسلام کی عالمگیری کو توڑ رہے ہیں۔"

یعنی ان کے نزدیک اسلام کی عالمگیری یہ ہے کہ اسے چند عقائد کا مجموعہ تصور کر لیا جائے
باقی رہا نظام سو وہ تو ایک وقتی چیز تھی جو اسلام نے عربوں کے سامنے پیش کی تھی فرماتے ہیں کہ

اس حقیقت سے عام طور پر چشم پوشی کیجاتی ہے کہ اسلام عربی دین ہے اسکی روح
عربی ہے اور عربوں ہی نے سب سے زیادہ اس سے فائدہ اٹھایا میرے کہنے کا یہ مطلب

[1] جی ہاں۔ بالکل طاقت بشری سے باہر۔ کل تک بلبل بریتا "ہندوستانی تھے۔ اور آج سیاسی مدبرین کی ایک جنبش قلم سے "برمی" ہو گئے۔ (ط۔ا)

نہیں کہ عجمی قومیں اسلام میں داخل نہیں ہو سکتیں وہ داخل ہوئیں اور مسلمان بنیں مگر یہ واقعہ ہے کہ اسلام ہے عربی دین ہی جسکی شہادتیں خود قرآن مجید میں موجود ہیں (مثلاً ؟ راز ی)

یہ چند تصریحات محض نمونتہً پیش کی گئی ہیں ورنہ اگر ان حضرات کی تمام و کمال تحریریں آپکے سامنے ہوں تو آپ حیران رہجائیں کہ یہ کس قسم کا اسلام ہے جسے پیش کیا جا رہا ہے۔ ماحصل ان سب کے نظریوں کا یہ ہے کہ مذہب ایک پرائیویٹ عقیدہ کا نام ہے جسکا عملی سیاسیات او معاشی اقتصادی۔ عمرانی معاشرتی معاملات سے کوئی واسطہ نہیں وہی چیز جسکا نام مولانا ابو الکلام آزاد نے "خدا پرستی اور نیک عملی" کی زندگی رکھا ہے اور جسمیں اس متحدہ قومیت کا مشترکہ مذہب بننے کی صلاحیت موجود ہے جسکی بنا بقول حضرت مولانا حسین احمد "اوطان" پر ہے یہ ہے وہ مذہب جسکی آزادی کا اعلان بھارت ماتا کے مندر کے دروازہ پر لٹکایا جا رہا ہے اب آپ خود فیصلہ فرمالیجئے کہ اس قسم کے مذہب کی کیا فی الواقعہ "آزادی" ہوگی۔

یاد رکھئے۔ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات کا نام ہے جو نظام زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی ہیئت پر چھایا ہوا ہے بقول حضرت علامہ علیہ الرحمۃ

> اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے ..... اور ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں بلکہ اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو نامعقول و مردود ہے۔

اس اجمال کی تفصیل طلوعِ اسلام کے مسلسل مطالعہ سے آپکی نگاہوں کے سامنے آجائے گی جب تک مسلمانوں کو اس قسم کے مذہب کی آزادی حاصل ہو۔ وہ اپنے آپکو مذہبی حیثیت سے آزاد نہیں سمجھ سکتے۔ یہی وہ مذہبی آزادی ہے جسکے تحفظ کے لئے

آج مسلمانوں کا ہر سوچنے والا دماغ غور و فکر کر رہا ہے اور اسی کا نام آج "فرقہ پرستی" رکھا جاتا ہے اور یا للعجب! کہ خود مسلمانوں کے ایک گروہ کی طرف سے رکھا جاتا ہے!!

از باغبان شد است کہ صیاد آن نکرد

گزشتہ صفحات کے مطالعہ سے یہ حقیقت آپ(۲) پر واضح ہو گئی ہو گی کہ ہمارا "قوم پرست" فرقہ اپنی پوری قوت اس نظریہ کے استحکام میں صرف کر رہا ہے کہ مذہب ایک نجی اور ذاتی عقیدہ ہے (PRIVATE AFFAIR S) جماعتی زندگی سے اسے کوئی علاقہ نہیں اجتماعی زندگی سے متعلقہ معاملات سیاسی اور تمدنی مسائل ہیں جن کا حل اور تصفیہ اس نظامِ حکومت کی رُو سے ہونا چاہیئے جو ہندوستان کی "متحدہ قومیت" پر مشتمل ہو گا۔ اسکا نام ہے سوراج۔ اس کے برعکس ہم نے ابھی ابھی چند سطور میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اسلام ایک پرائیویٹ عقیدہ کا نام نہیں بلکہ ایک جماعتی مذہب ہے۔ (ORGANISED RELIGION) جس میں دین اور دنیا مذہب اور سیاست گرہست آشرم اور سنیاس آشرم الگ الگ شعبے نہیں ہیں بلکہ انسانی زندگی سے متعلق کوئی مسئلہ ہو اور دنیا اسے اپنی تقسیم کے اعتبار سے کسی ذیل میں لے آئے اسلام کی رُو سے وہ خالص مذہبی مسئلہ ہوتا ہے۔ اسلام کی رُو سے فرد کوئی ہستی نہیں رکھتا اس لیئے اسکے انفرادی اور ذاتی اعمال بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے وہ ایک جماعت کا رکن ہے اور اسکی ہستی اس جماعت کے وجود سے ہے لہذا اسکے اعمال بھی وہی صالحہ ہیں جو اس جماعتی نظام کے اندر رہتے ہوئے کیئے جائیں "پرائیویٹ مذہب" زیادہ سے زیادہ چند اخلاقیات کے مجموعہ کا نام ہوتا ہے اور یہ سطحی مجموعہ اخلاقیات وہ ہے جو قریب قریب دنیا کے ہر مذہب میں مشترک ہے۔ کون سا مذہب ہے جو یہ نہیں کہتا کہ جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو زنا نہ کرو۔ اگر مذہب اتنی ہی چیز ہے تو پھر اسلام میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی رُو سے اسکا دعویٰ ہے کہ یہ خدا کا آخری دین ہے اور اس سے پیشتر کے تمام ادیان اب

اِس لیئے ناقابلِ قبول ہیں کہ وہ اپنی اصل شکل میں دُنیا کے پاس نہیں ہیں جو لوگ اسلام کی روح سے کچھ بھی واقف ہیں انھیں اس خصوصیت کا معلوم کر لینا کچھ زیادہ دشوار نہیں جس خصوصیت کی رُو سے اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ خدا کا سچّا دین ہے۔ آپ اسلام کے سوا کسی مذہب کو دیکھئے وہ ایک پرائیویٹ حیثیت رکھتا ہوگا۔ وہ انفرادیّت کی زندگی بسر کرنا سکھائیگا۔ ہندوؤں کے پجاری ہوں یا سنیاسی عیسائیوں کے پادری ہوں یا راہب وہ "دُنیا داروں" کے طبقہ سے الگ ہونگے دُنیا داروں میں سے جو شخص خدا پرست" ہو تا جائیگا وہ ان سے کٹ کر الگ ہوتا جائیگا۔ اسے پھر جماعتی زندگی سے کوئی علاقہ نہیں رہیگا۔ اسکا مطمحِ نگاہ پھر اپنی مکتی حاصل کرنا ہو گا۔ اسلام نے جب رہبانیت کو ناجائز قرار دیا تو اس لیئے نہیں کہ لوگوں کے گیروے رنگ کے کپڑے پہننے اسے پسند نہ تھے ان کپڑوں میں کیا رکھا ہے! اسلام نے رہبانیت کی اس لیئے مخالفت کی کہ رہبانیت اس نظریۂ زندگی کا نام ہے جس میں انسان انفرادیّت کی زندگی بسر کرتا ہے جس میں اسے صرف اپنی نجات کی فکر دامنگیر رہتی ہے جس میں دین اور دُنیا دو الگ الگ شعبے بن جاتے ہیں جس میں مذہب ایک ذاتی اور پرائیویٹ عقیدہ کا نام رہ جاتا ہے جس میں خدا پرستوں کے طبقہ کو اجتماعی معاملات سے کچھ علاقہ نہیں رہتا۔ یہ ہے بنیادی فرق اسلام اور دیگر ادیان میں اس خصوصیت کو مٹا ڈالئے۔ اسلام بھی دوسرے مذاہب کی طرح رہ جائیگا اور اسی بنیادی فرق کے مٹا ڈالنے کا نتیجہ ہے کہ قوم پرست حضرات کا یہ عقیدہ ہو جاتا ہے کہ دُنیا کے سب مذاہب سچّے ہیں البتہ ان مذاہب کے پیرؤں میں خرابیاں آگئی ہیں اگر ہر مذہب کے پیرو اپنے اپنے مذہب کی سچائی پر عمل پیرا ہو جائیں تو پھر کسی میں کوئی فرق نہیں رہتا (تفصیل کے لیئے ملاحظہ ہو ترجمان القرآن جلد اوّل از مولانا ابو الکلام آزاد) ہم اپنے اس دعوے کو کہ اسلام پرائیویٹ عقیدہ نہیں بلکہ ایک جماعتی مذہب ہے بتوفیقِ الٰہی کتاب و سُنّت آثار و تاریخ سے پوری طرح ثابت کر سکتے ہیں

طلوعِ اسلام کا وجود ہی اس غرض کے لئے ہے لیکن اسوقت ہم اس دعوے کے اثبات میں ایک دوسری روش اختیار کریں گے۔ حصّہ اول میں ہم نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا بلکہ قوم پرست طبقہ کے اپنے الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ وہ مذہب کو کیا سمجھتے ہیں اب ہم اس مسلم قوم پرست طبقہ کے امام مولانا آزاد کے الفاظ میں اس بات کو ثابت کریں گے کہ مذہبِ اسلام پرائیویٹ عقیدہ کا نام نہیں بلکہ وہ ایک منظم مذہبی جماعتی مذہب ہے فرق صرف اتنا ہے کہ مولانا آزاد کی یہ تحریریں اُسوقت کی ہیں جب انھوں نے ہنوز "قوم پرستی" کا مسلک اختیار نہیں کیا تھا۔

سنہ ۱۹۱۳ کا ذکر ہے کہ انجمنِ اسلامیہ لاہور نے ایک ریزولیشن پاس کر دیا کہ شاہی مسجد میں "سیاسی" تقریریں کرنے کی اجازت نہیں اسپر مولانا آزاد نے اپنے رسالہ الہلال میں چار مبسوط اور مفصّل افتتاحی مقالے تحریر فرمائے جس میں اُس جوش اور ولولے کے ساتھ جو زمانہ قومیت پرستی سے پیشتر انکی نمایاں خصوصیت تھی انہوں نے کتاب و سُنّت سے ثابت کیا کہ مذہب کو سیاست سے الگ سمجھنا کُفر ہے شرک ہے۔ جہالت ہے۔ فرماتے ہیں

میں اگر انکو کفر پرست کہوں تو تم کہوگے کہ یہ ایمان و کفر کی بحث ہی میں اگر انکو شرک کہوں تو تم پکاروگے کہ یہ بہت ہی بڑی جسارت ہے۔ ہاں یہ جسارت ہے لیکن جن ظالموں نے اللہ کے آگے جسارت کی ہے کیوں نہ ہم بھی انکے لئے جسارت کریں۔ وہ نہ مومن ہیں نہ مُسلم انکا حال یہ ہے جو کہا گیا۔ نؤمن ببعض و نکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذلک سبیلا ان لوگوں کی اصطلاح میں جس چیز کو سیاست اور پالیٹکس کہتے ہیں اسلام کے نزدیک عین دین و مذہب ہے۔ اور جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ..... (الہلال بابت ۲۹ اکتوبر سنہ ۱۹۱۳ء ا صفحہ)

اس لئے کہ۔

حضرت ختم المرسلین علیہ الصّلاۃ والسّلام نے تمام عالم کی ضلالتوں اور تاریکیوں کو دُور کرنا چاہا

اور اپنی پوری جماعتِ مقدس کی زندگی اس راہ میں صرف کر دی، یہ محض اصلاحِ اقوام و زمین کا کوئی خاص شعبہ نہ تھا جسکو تم نے پالیٹکس تمدن اخلاق اور مذہب کے نام سے تقسیم کر دیا ہے بلکہ انکی دعوت عام اور انکی صلاح عالمگیر تھی (ایضاً)

اسی زمانہ کے الہلال میں ایک سلسلہ بعنوان الحریت فی الاسلام شروع کیا گیا تھا اسکی تمہید میں تحریر ہے:

اسلام خود اپنے بیان کے مطابق رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْآخِرَۃِ حَسَنَۃً۔ دین و دنیا کی اصلاح کیلئے آیا تھا اور اسی لئے دونوں جہان کی برکات اسکے ساتھ تھیں پھر اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اسلام کے خزانہ میں حسنات سیاست دنیاوی کا وجود نہیں تو اس کے معنی ہونگے کہ نصف خدمتِ انسانی کی سرانجام دہی سے وہ قاصر رہا جسکا تخیل بھی کوئی مسلمان نہیں کر سکتا..... (الہلال بابت ۲ جولائی ۱۹۱۲ء ص ۹)

اس زمانہ میں مولانا صاحب نے مسلمانوں کے مصائب کا حل ایک ایسی جماعت کے قیام میں تلاش فرمایا تھا جسکا نام تھا حزب اللہ۔ اس جماعت کے اغراض و مقاصد کے ضمن میں انھوں نے الہلال کی متعدد اشاعتوں میں مقالات تحریر فرمائے جنمیں شروع سے اخیر تک صرف ایک چیز کو پوری قوت کیساتھ نمایاں کیا تھا کہ اسلام ایک جماعتی مذہب ہے اگر مسلمانوں کی الگ جماعتی زندگی مفقود ہے تو اسلام بھی مفقود ہے یہ مقالات اس قابل ہیں کہ یہاں تمام و کمال نقل کیے جاتے لیکن اس سے یہ مضمون ایک کتابی شکل اختیار کر لیگا اس لئے انکے جستہ جستہ اقتباسات پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"پس میں کہتا ہوں اور از فرق تا بقدم ایک صدائے ربانی بنکر کہتا ہوں جبکہ یقین کی وہ لازوال طاقت میرے ساتھ ہے جسکے لئے کبھی فنا نہیں جبکہ وہ بصیرتِ الٰہی میرے دل کے اندر موجود ہے جس میں کبھی تذلل و تذبذب نہیں اور جبکہ وہ شہادتِ ایقانی میرے سامنے ہے جسکی رویت میں کبھی دھوکا اور فریب نہیں۔ کہ زندگیوں اور کامیابیوں کا وہ تخمِ مقدس کوئی انجمن۔ کوئی اسکیم۔ کوئی بے شمار خزانہ۔ کوئی عہدِ حفاظت۔ کوئی اقرارِ خدمت۔ غرضیکہ دنیا کی کوئی آواز اور انسانوں کی کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی۔ مگر وہ صرف ایک ہی تحریکِ حق و صداقت جو مسلمانوں کو ان کی حیات (الہلال)

انفرادی وملّی کی ہر شاخ میں "مسلمان" بننے کی دعوت دے۔ (الہلال ، ص ۸)

ہم حضرت مولانا سے باادب استادریافت کرنیکی جسارت کرتے ہیں کہ آج وہ صدائے ربّانی وہ یقین کی لازوال طاقت وبصیرتِ الٰہی۔ وہ شہادتِ ایقانی کیا ہوئی جو صرف اس تحریک کو حق وصداقت کی تحریک قرار دیتی تھی جو مسلمانوں کی حیاتِ انفرادی وملّی کی ہر شاخ میں انھیں "مسلمان" بننے کی دعوت دے' کیا وہ تحریک یہی تحریک کانگرس ہے جو مسلمانوں کا الگ نام بھی سننا پسند نہیں کرتی اور کہتی ہے کہ مسلمان مت کہلاؤ۔ ہندی کہلاو۔ جو مسلمانوں کی "حیاتِ ملّی" کو تسلیم ہی نہیں کرتی اور کہتی ہے کہ ملک میں دو ہی جماعتیں ہیں ایک حکومت اور دوسری کانگریس۔ لیکن ٹھہریئے۔ خود حضرت مولانا کی زبانی ہی سنئے کہ وہ تحریک جس کے اندر آج وہ خود شامل ہیں اور جس کی شمولیت مسلمانوں کے لئے "فریضہ مذہبی" قرار دیتے ہیں، اس قسم کی تحریک کے متعلّق اسلام کی کیا شہادت ہے۔ فرماتے ہیں۔

"پھر جب آپ ایک انجمن قائم کرتے ہیں جس کے مقاصد و اعمال کی فہرست بیسوں دفعات پر مشتمل ہے۔ لیکن نہ تو اس میں کہیں احیاء دعوت اسلامی کی دفعہ ہے نہ کہیں اسلام کے احکام و اوامر پر عمل کرنے کی قید ہے۔ نہ کوئی صورتِ عمل و طریق کار پیشِ نظر ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو مسلمان بنانا ہو اور اُن کی مجاہدانہ روحِ عمل کو واپس لانا ہو۔ تو پھر فرمایئے۔ آپ کا مقصد تو ضروری اور آپکے کام یقیناً اچھے اور مستحقِ اعانت و شرکت جمیع مسلمین لیکن ہمارے اصلی مرض کے لئے آپنے کیا کیا اور اس کے لئے کہاں جائیں؟" (الہلال بابت ۳۰ جولائی ۱۹۱۳ء ص ۸)

کیا حضرت مولانا فرمائیں گے کہ کانگریس کی دفعات میں وہ کون سی دفعہ ہے جس کی رُو سے احیاء دعوتِ اسلامی ضروری اور اسلام کے احکام و اوامر پر عمل کرنے کی قید ہو۔ کانگریس کے دستورِ اساسی میں وہ کون سی صورتِ عمل اور طریق کار پیشِ نظر ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو مسلمان بنانا ہو! اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر فرمایئے کہ آپ کا مقصد تو ضروری (یعنی انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا) اور آپکے کام یقیناً اچھے (یعنی ہندوستان میں ایک

متحدہ قومیت پیدا کرنا) اور مستحقِ اعانت و شرکتِ جمیع مسلمین (جسے پنڈت جواہر لال نہرو MUSLIM MASS CONTACT سے تعبیر کرتے ہیں) لیکن ہمارے اصلی مرض کے لئے تجویز کیا گیا! اور اس کے لئے کہاں جائیں! کیا حق و صداقت کی تحریک یہی ہے جس کا نام کانگریس کا شعبۂ اسلامیات ہے۔ اور جس کے انچارج ڈاکٹر اشرف اور ایک ذمہ دار رکن جناب منظور علی کے خیالات ابھی ابھی پیش کئے جا چکے ہیں! مولانا! خدا کے لئے سوچئے کہ جس قسم کی تحریک کو ۱۹۱۳ء میں، اس حتم و یقین، اس بصیرت و ایقان کے ساتھ مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کے سامان قرار دیتے تھے۔ اُسی تحریک کو آپ آج "عین کتاب و سنت" اور "صراطِ مستقیم" قرار دے رہے ہیں کیا آج قرآن بدل گیا یا مسلمانوں کے کعبہ کی سمت تبدیل ہو گئی! اس کا جواب بھی مولانا ہی سے سنئے

> "اسلام ایک آخری دینِ الٰہی تھا جس نے نہ صرف احکامِ شریعت ہی میں بلکہ حیاتِ قومی کی ہر شاخ میں ہم کو سب سے آخر اور سب سے بہتر اصول دیدئے۔ اور دنیا خواہ کتنی ہی بدل جائے لیکن آزمالیا جا سکتا ہے کہ ان اصولوں کی صداقت کو بدلنے کی ضرورت نہیں.....
>
> تکمیلِ دین کے لئے ضروری تھا کہ ہمیشہ کے لئے اس کے پیرو اپنی تمام اصولی ضروریات میں مستغنی اور بے پرواہ ہو جائیں اور ان کو کسی نئی تلاش اور نئے اصولوں کی جستجو باقی نہ رہے
>
> .... میرا عقیدہ ہے کہ آج حیاتِ ملت و حصولِ عظمت ملی کے لئے مسلمانوں کو اپنے اعمال کی کسی شاخ میں بھی "تاسیس" کی ضرورت نہیں بلکہ صرف "تجدید" کی ضرورت ہے کہ جن اصولوں کو ہم نے بھلا دیا ہے اُن کو دوبارہ زندہ کریں اور جس متاع کو حاصل کر کے گم کر دیا ہے اس کے سراغ میں پھر نکلیں۔ ہمارا جیب و دامن آج کی طرح ہمیشہ خالی نہ تھا۔ اگر آج اوروں کے پاس لعل و جواہر ہیں تو ہمارے پاس بھی اس کی کانیں تھیں۔ آج اگر ہم مفلس ہیں تو دوسروں کے لعل و جواہر کو نظرِ حسرت و طمع سے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہم کو اپنی گم کردہ کانوں کے سراغ میں نکلنا چاہئے جن کی دولت لازوال تھی اور ہمیشہ لازوال تھی" (ایضاً صہ)

طلوعِ اسلام ۱۴۱ ماہ جون ۱۹۳۸ء

اس کے بعد انہوں نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی جماعتی زندگی کی تنظیم اپنی مساجد سے شروع کرنی چاہئے۔ اس کے علاوہ اور کوئی تقلیدی رنگ کی تحریک مسلمانوں کے لئے مفید نہیں ہوسکتی (ایضاً صـ۹)

کیا ہم حضرت مولانا سے اتنا دریافت کرنے کی جرأت کرسکتے ہیں کہ کانگریس کی تحریک مسلمانوں کے لئے "تجدید" ہے یا "تاسیس"! کیا یہ تحریک مسلمانوں کی "حیاتِ ملت اور حصولِ عظمتِ ملی" کے لئے ہی عمل میں لائی گئی ہے! کیا وہ لعل وجواہرات کی کانیں وہی تو نہیں جن کا آج اس تحریک کے علمبرداران کھلے بندوں تمسخر و استہزاء اڑاتے ہیں! کیا وہ آپکے اٹل اور غیر متبدل اصول وہی تو نہیں جن کے مٹانے کی آرزو تحریکِ آزادی کے قائدِ اعظم کے دل میں دن رات موجزن ہے! (اس کا ثبوت ابھی آگے آئیگا)۔ کیا کانگریس میں شامل ہونے والے مسلمان "دوسروں کے لعل وجواہر کو نظرِ حسرت وطمع" سے نہیں دیکھ رہے ہیں؟ اس تحریک سے آپ کو "اپنی گم کردہ کانوں کا سراغ" مل رہا ہے! کیا اس سے وہ تنظیم ملی عمل میں آرہی ہے جس کی ابتدا مساجد سے ہونی تھی!!

اللہ اکبر! انسان بھی ایک تماشہ ہے! جب اس کے مصالح اور رجحانات اس کی نگاہ کا ایک زاویہ بدل دیں تو وہ پھر کس قدر تضاد کا مجموعہ بن جاتا ہے اور کس طرح زہر کو آبِ حیات بنا کر پیش کرتا ہے۔ اور کتنی جلدی بھول جاتا ہے کہ جب اس کی آنکھوں پر مصلحت کوشی کے رنگین چشمے تھے تو سامنے کی چیزوں کے اصلی رنگ کیا تھے! یخٰدعون اللہ والذین آمنوا۔ وما یخدعون الا انفسہم۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ جس چیز نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا تھا۔ وہ کیا تھی۔ فرماتے ہیں۔

"ایک بہت بڑی چیز جس کی ہم میں کمی ہے۔ تنظیماتِ عمل (آرگنائزیشن) ہے اور اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ایک مقصد مشترک سامنے ہو اور سب میں اس کے نام سے ایک رشتہ باہمی قائم ہو جائے" (ایضاً صـ۶)

آج اسی تنظیماتِ عمل (آرگنائزیشن) کا نام ہے "فرقہ پرستی" (COMMUNALISM) جو حضرت مولانا اور دیگر "قوم پرست" حضرات کے نزدیک اتنا بڑا جرم ہے کہ جس کی معافی

نہ یہاں مل سکتی ہے نہ خدا کے حضور۔ پھر اُس وقت مقصد مشترک "حیاتِ ملت اور عظمتِ ملی" تھا۔ اور آج وہ مقصد تمام اہلِ ہند کی ایک متحدہ قومیت'' کی تشکیل ہے!

پھر ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ اسلام کی رُو سے مسلمانوں کے لئے صحیح نظامِ زندگی یہ ہے کہ ان کی اپنی جماعت ہو اور اس جماعت کا مرکز اُن کا اپنا امیر ہو۔ یہی جماعتی نظام مسلمانوں کے تمام "دینی اور دنیاوی'' مسائلِ حیات کا فیصلہ کرے۔ اسلام کسی مخلوط جماعت کا قائل ہی نہیں۔ اس کے نزدیک ایمان اور کفر دو مستقل بالذات الگ الگ نظریۂ زندگی ہیں جن میں باہمی امتزاج ہو ہی نہیں سکتا۔ اب دیکھئے کہ حضرت مولانا کا اس اپنی جماعت کے متعلق کیا خیال تھا۔ ذرا غور سے سنئے۔ فرماتے ہیں

> اور اسی بنا پر شارع نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام "جماعت" رکھا ہے اور جماعت سے علیحدگی کو "جاہلیت" اور "حیاتِ جاہلی" سے تعبیر کیا ہے۔ جیسا کہ آگے بتفصیل آئیگا۔ (مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب از مولانا آزاد)

اس کے بعد حضرت مولانا نے متعدد احادیث سے ثابت کیا ہے کہ جو شخص اپنی جماعت سے ایک بالشت بھر بھی الگ ہو گیا سیدھا جہنم میں پہنچا۔ اس کے بعد ارشاد ہے۔

> "قرآن کے نزدیک فرد اور فرد کی ہستی کوئی شے نہیں ہے ہستی صرف اجتماع اور جماعت کی ہے۔ اور فرد کا وجود اور اعمال بھی اس لئے ہیں تاکہ ان کے اجتماع و تالیف سے ہیئتِ اجتماعیہ پیدا ہو۔'' (ایضاً)۔

اس سے ذرا آگے ہے۔

> " اور پھر یہ حقیقت کس قدر واضح ہو جاتی ہے جب ان تمام مشہور احادیث پر غور کیا جائے جن میں مسلمانوں کی متحدہ قومیت کی تصویر کھینچی گئی ہے۔۔۔۔۔ سو ان تمام تصریحات میں بھی اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ اسلام کی قومیت متفرق اینٹوں کا نام نہیں ہے، دیوار کا نام ہے۔" (ایضاً)۔

طلوعِ اسلام — ماہ جون ۱۹۴۳ء

۳۴

کیا حضرت مولانا اتنا ارشاد فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ مسلمانوں کی اِس اجتماعی زندگی کا تصور آج کہاں چلا گیا! ان کی الگ جماعت کے اسلامی نظریہ کو آج کیا ہوا! یہ اسلامی "متحدہ قومیت" آج ہندی "متحدہ قومیت" سے کس طرح بدل گئی کہ جس کی اساس اسلام پر نہیں بلکہ وطن پر رکھی جا رہی ہے! یہ اجتماع کی بجائے افراد کی الگ الگ زندگی۔ جو کل تک قرآن و سنت کی رُو سے "جاہلیت" کی زندگی تھی۔ آج کس طرح عین اسلامی زندگی بن گئی! یہ اسلامی "اینٹیں"، کہ جنہیں باہمی اتحاد و اتفاق کے سیمنٹ سے مل کر ایک ایسی مستحکم دیوار، ایک ایسی "بنیانِ مرصوص" بننا تھا جو کفر کی ہر بڑھتی ہوئی رَو کا مقابلہ کر سکے۔ آج یہی اینٹیں۔ ایک ایک کر کے اُس دیوار میں کیوں چُنی جا رہی ہیں کہ جس کی بنیاد ہی یکسر غیر اسلامی ہے! کیا حضرت مولانا۔ مع اپنے تمام رفقاء کار کے۔ کوئی ایک آیت۔ کوئی ایک حدیث ایسی پیش کر سکتے ہیں جس میں یہ لکھا ہو کہ ملتِ اسلامیہ کی یہ اینٹیں کسی دوسری ملت کی اینٹوں کے ساتھ مل کر ایک مخلوط دیوار بھی قائم کر سکتی ہیں! اس میں شبہ نہیں کہ ہم حضرت مولانا۔ یا اُن کے دوسرے ہم مسلک مسلم قوم پرست حضرات کو کسی طرح بھی مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ ہمارے ان استفسارات کا جواب دیں۔ لیکن اگر انہیں ذرا سا بھی احساس ہے کہ قرآن و سنت کا بھی بالآخر کوئی حق ان پر واجب آتا ہے تو خدا کے لئے ذرا اس بے پناہ خاموشی کی مہر کو توڑیں اور ایک مرتبہ اتنا تو بتا دیں کہ اس تبدیلیٔ مسلک کی تائید میں کون سی سند اُن کے پاس ہے! اس مسلک کی تبدیلی کے جواز میں جس کے متعلق اُن کا ارشاد تھا کہ۔

> "احادیثِ صحیحہ سے اس کی مزید توضیح ہوتی ہے۔ اس بارہ میں اس کثرت کے ساتھ حدیثیں موجود ہیں۔ اور عہدِ صحابہؓ سے لیکر عہدِ تدوینِ کتب تک مختلف طبقات رواۃ و حفاظ میں اس قدر ان کی شہرت رہ چکی ہے کہ اسلام کے عقیدۂ توحید و رسالت کے بعد شاید ہی کوئی چیز اس درجہ تواتر و یقین تک پہنچی ہوگی۔ سب سے پہلے میں مسند امام احمد وغیرہ کی ایک روایت نقل کرونگا جس میں بالترتیب اسلام کا نظامِ عمل بیان کیا گیا ہے۔

قال صلی اللہ علیہ وسلم۔ انی آمرکم بخمس اللہ امرنی بھن۔ الجماعة۔ والسمع۔ والطاعة۔ والھجرة۔ والجھاد فی سبیل اللہ۔ انہ من خرج من الجماعة قید شبر فقد خلع ربقة الاسلام من عنقه الا ان یراجع۔ ومن دعا بدعوی جاھلیة فھو من جھنم۔ قالوا یا رسول اللہ وان صام وان صلی۔ قال وان صلی وصام وزعم انہ مسلم۔

یعنی فرمایا میں تم کو پانچ باتوں کے لئے حکم دیتا ہوں جن کا حکم اللہ نے مجھے دیا ہے۔ جماعت۔ سمع۔ طاعت۔ ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد۔ یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا۔ اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بےقیدی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ (حضور!) کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا خواہ وہ نماز پڑھتا ہو۔ اور روزہ رکھتا ہو! فرمایا۔ ہاں۔ اگرچہ نماز پڑھتا ہو۔ اور روزہ رکھتا ہو اور بزعم خویش اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو"۔

اس کی تشریح میں فرماتے ہیں۔

"پہلی چیز جماعت ہے۔ یعنی تمام اُمت کو ایک خلیفہ و امام پر جمع ہو کر اور اپنے مرکزِ قومی سے جُڑ کر رہنا چاہئے۔ الگ الگ نہیں رہنا چاہئے۔ آگے چل کر شہرت کے ساتھ وہ حدیثیں ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ جماعت سے الگ ہو کر رہنے کو یا ایسی منتشر زندگی کو جو ایک بندھی سمٹی ہوئی جماعت کی شکل نہ رکھتی ہو اور کسی امیر کے تابع نہ ہو۔ اسلام نے غیر اسلامی اور ابلیسی راہ قرار دیا ہے۔ انفرادی زندگی کو وہ زندگی ہی نہیں مانتا۔ اسلامی زندگی جماعت ہے" (ایضاً)

کیا حضرت مولانا کبھی رات کی تنہائیوں میں۔ دماغی مصلحت کوشیوں کو یکسر الگ رکھ کر۔ اتنا سوچیں گے کہ آج جس روش پر وہ خود گامزن ہیں اور جس پر چلنے کی وہ مسلمانوں کو دعوت دے رہے ہیں۔ وہ اُن کے اپنے ہی الفاظ میں کس قسم کی روش ہے! مسلمانوں کا اپنی جماعت کی تنظیم کرنا۔ اُن کا اپنے

طلوعِ اسلام ۴۵ ۱۰ جون ۱۹۴۳ء

مرکزِ قومی سے جُڑ کر رہنا - یہ اسلامی زندگی ہے - یا ان کا ایک ایک کر کے ایک ایسی مخلوط جماعت میں جا کر جذب ہوتے جانا جس کے عناصرِ ترکیبی میں کوئی عنصر بھی اسلامی نہیں! کیا یہی مسلمانوں کا "اپنا مرکزِ قومی" ہے! ہم جانتے ہیں کہ آج بیچاری کمزور و ناتوان ملّتِ اسلامیہ کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے وہ ان حضرات کی مُہرِ سکوت کو توڑ سکے - لیکن بالآخر ایک دن ایسا بھی تو آنے والا ہے جبکہ زبانیں خاموش ہونگی لیکن جسم کا ایک ایک حصّہ گواہی دیگا کہ حق کیا تھا اور باطل کیا! یہ قرآن و سنّت کی تصریحات ہم اپنی طرف سے نہیں پیش کر رہے - یہ تو خود انہی حضرات کی پیش فرمودہ ہیں! کیا آپ سمجھتے ہیں ان سے قطعاً اس چیز کی باز پرس نہ ہوگی کہ ان تمام تصریحات کو خود ہی بیان کرنے کے بعد تم لوگ کس راستے پر چل پڑے اور دوسرے لوگ اس خیال سے کہ تم قرآن و سنّت کے جاننے والے ہو - تمہارے تتبع میں تمہارے پیچھے ہو لئے - کیا ان سب کی ذمہ داری بھی انہی پر عائد نہ ہوگی - ذرا قرآن کریم کو کھول کر دیکھئے کہ اس باب میں احکم الحاکمین کا کیا فیصلہ ہے! نہیں انہی حضرات کی زبانی سنئے - فرماتے ہیں -

"پس جاہلیت کا دوسرا نام تفرقہ ہوا اور اسلام کا دوسرا نام جماعت اور التزامِ جماعت یہی وجہ ہے کہ تمام احادیث میں یہ حقیقت واضح کی گئی اور اعلان کیا گیا کہ جو شخص جماعت اور اطاعتِ امام سے الگ ہوگیا - گویا وہ اسلام سے خارج ہوگیا - اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی - اگرچہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو - اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو" (ایضاً)

ہم اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے کہ یہ ان حضرات کی شان میں سوء ادبی ہو جائیگی - جب خدا اور اس کا رسولؐ یہ کچھ فیصلہ کر رہا ہو تو ہمیں کسی اضافہ کی کیا ضرورت ہے - اب یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ مسلمانوں کے لئے راہِ عمل کیا ہے - فرماتے ہیں -

"مسلمانوں کے لئے راہِ عمل" ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اور ہمیشہ کی طرح اب بھی ایک ہی ہے - یعنی ہندوستان کے مسلمان اپنی جماعتی زندگی کی اس معصیت سے باز آجائیں - جس میں وہ

طلوعِ اسلام ۴۶ ماہ جون ۱۹۳۸ء

ایک عرصہ سے مبتلا ہیں اور جس کی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے ان پر بند ہوگئے ہیں۔ جماعتی زندگی کی معصیت سے مقصود یہ ہے کہ ان میں ایک "جماعت" بنکر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہوگیا ہے۔ وہ بالکل اُس گلّے کی طرح ہیں جس کا انبوہ جنگل کی جھاڑیوں میں منتشر ہوکر گم ہوگیا ہو۔" (ایضاً)

ایسی غیر اسلامی زندگی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ اس کے متعلق ارشاد ہے۔

"قرآن و سنت نے بتلایا ہے کہ شخصی زندگی کے معاصی کسی قوم کو یکایک برباد نہیں کر دیتے۔ اشخاص کی معصیت کا زہر آہستہ آہستہ کام کرتا ہے۔ لیکن جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (دینی نظام جماعتی کا نہ ہونا) ایسا تخمِ ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے اور پوری قوم کی قوم تباہ ہوجاتی ہے۔" (ایضاً)

ہمیں بالعموم بتایا یہ جاتا ہے کہ صاحب! مسلمانانِ ہند کے سامنے دو چیزیں ہیں۔ ایک تو اپنی جماعتی تنظیم اور دوسرا ہندوستان سے انگریزوں کا نکالدینا۔ چونکہ انگریزوں کی غلامی بہت بڑی لعنت ہے اس لئے مقدم یہ مسئلہ ہے۔ جب یہ حل ہوجائیگا تو پھر مسلمانوں کی جماعتی زندگی کا سوال ہاتھ میں لے لیا جائیگا۔ آج یہ دلیل دی جاتی ہے اور یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ یہ دلیل بڑی محکم ہے۔ لیکن۔ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے۔ خود حضرت مولانا کو اقرار ہے کہ جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (دینی نظام جماعتی کا نہ ہونا) ایسا تخمِ ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے۔ اور پوری قوم کی قوم تباہ ہوجاتی ہے اب فرمائیے کہ مقدم جماعتی زندگی کی تنظیم ہوئی یا انگریزوں کا ہندوستان سے نکالنا۔ ہم مانے لیتے ہیں کہ کانگریس کے ساتھ مل کر آپ انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوجائیں گے لیکن جب آپ آزاد ہونگے تو اُس وقت ملتِ اسلامیہ کہاں ہوگی! وہ تخمِ ہلاکت جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے۔ "پوری قوم کی قوم" تباہ نہ کرچکا ہوگا۔ اُس وقت کی آزادی سے آپ کو خوشی کیا ہوگی! پچھلے دنوں لندن کے ایک بہت بڑے ڈاکٹر نے ایک معرکۃ الآراء اپریشن کیا۔ اپریشن بڑا نازک تھا۔ تمام دنیا کے اہلِ فن حضرات کی آنکھیں نتیجہ کی طرف لگ رہی تھیں۔ وہ اپریشن سے فارغ ہوا تو ساری دنیا میں مسرت کے نارے

کہ اپریشن بڑا کامیاب رہا۔ نہایت صفائی سے نازک ترین مراحل طے ہو گئے۔ البتہ صرف اتنا ہوا کہ مریض چل بسا۔ اسی قسم کے اپریشن میں یہ حضرات مصروف ہیں اور پھر متمنی ہیں کہ قوم ان کی خدماتِ جلیلہ کی شکر گذار ہو۔ کیا ان حضرات کو اتنا بھی علم نہیں کہ انگریزوں کی غلامی میں مسلمان اسی لئے آگئے تھے کہ ان میں جماعتی زندگی کا فقدان ہو چکا تھا۔ اور اب "مسلمان" غلامی سے نکل بھی اسی وقت سکیں گے جب ان میں نظامِ جماعتی پیدا ہو گا۔ "ہندوستان کی آزادی" اور "مسلمانوں کی زندگی" مرادف الفاظ نہیں ہیں۔ اس لئے کہ جس تشتت وافتراق۔ جس "جماعتی زندگی کی میّت" کے دور سے مسلمان آج گذر رہے ہیں۔ اس کا تو لازمی نتیجہ بقول حضرت مولانا۔ پوری کی پوری قوم کی تباہی ہے۔ جب قوم ہی نہ ہوگی تو آزاد کون ہوگا! مسلمانوں کی آزادی کا مفہوم تو یہ ہے جو خود حضرت مولانا نے اپنے مسلکِ قومیت پرستی سے پیشتر ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا۔

> "اسلام میں حقِ امر و حکم کسی کو نہیں۔ وہ دنیوی انتظام و حکومت میں جب کسی ایک فرد کے استبداد کو تسلیم نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ "ان الحکم الا للہ" تو اس کے احکامِ دینیہ کیونکر تابع آراء اشخاص و جماعتِ مخصوصہ ہو سکتے ہیں! اس نے یہ حق صرف قرآن کو دیا ہے۔ یا پھر دنیوی امور میں اس اجماع کو جو تمام مسلمانوں کی اکثریت رائے سے عبارت ہے۔" (الہلال۔ ۸ر اکتوبر ۱۹۱۳ء)

اور اسی کا نام ہے "اسلامی نظامِ اجتماعی"۔

---

(۳)

یہاں پہنچ کر آپ کے دل میں فطرتی طور پر یہ سوال پیدا ہو گا کہ جب حضرت مولانا کے نزدیک چند سال ادھر۔ اسلام نام ہی اس چیز کا تھا کہ مسلمانوں کی الگ جماعت ہو۔ ان کی اپنی متحدہ قومیت ہو۔ ان کا اپنا مرکز ہو۔ ان کے تمام معاملات اس نظام کی رو سے طے پائیں جو خاص قرآن و سنت کی روشنی میں ان کی اپنی اکثریت کی رو سے وجود میں آئے۔ ان کے لئے کوئی ایسی

تحریک جوان کی احیائے ملّی کے لئے عمل میں نہ آئی ہو۔کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتی خواہ اس کے مقاصد کتنے ہی دلکش کیوں نہ ہوں۔کوئی ایسی تحریک جوان کو انفرادی اور ملّی حیات کے ہر شعبہ میں "مسلمان" بننے کی دعوت نہ دیتی ہو کبھی حق و صداقت کی تحریک نہیں ہو سکتی۔جب حضرت مولانا کا ایقان اور ایمان یہ تھا۔تو پھر آج یہ کیا ہوا کہ اُن کے نزدیک یہ تمام اصول مردود قرار پا گئے۔اور انکی جگہ ایک ایسے مسلک نے لے لی جس کی رُو سے ان اصولوں کا نام تک لینا بھی جُرم قرار پا گیا۔اس کا جواب شاید آپ کو نہ مل سکے لیکن آیئے ہم آپ کو تھوڑا سا سراغ دیں۔معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا قرآن کریم میں ناسخ و منسوخ کے قائل ہیں۔سو قرآن کریم کی وہ آیات جنکی رُو سے وہ پہلے اصول اسلامی ثابت کیا کرتے تھے بعد میں منسوخ ہو گئے۔لیکن یہاں پھر یہ مشکل آپڑے گی کہ منسوخ آیات کا تو آپ کو پتہ مل جائیگا۔لیکن یہ پتہ نہیں مل سکیگا کہ ناسخ آیات کون سی ہیں۔اس لئے کہ جب سے حضرت مولانا نے یہ نیا مسلک اختیار فرمایا ہے۔اس مسلک کی تائید میں آج تک کوئی آیت و حدیث پیش نہیں کی۔لہٰذا یہ ناسخ آیات آپ کو قرآن کریم میں نہیں ملیں گی۔بلکہ ان ناسخ احکام کا ماخذ کچھ اور ہے ذرا غور سے ملاحظہ فرمایئے۔

اصولی چیز تو یہی ہے نا کہ مسلمانوں کی الگ جماعت اور اپنی متحدہ قومیت ہونی چاہیئے۔اسکے متعلّق ارشاد ہے۔

> ہندوستان میں **مسلم قومیت** پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے۔جو یکجا نہیں منتشر ہے۔مبہم ہے اور غیر متیقن ہے۔اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیّل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت دُور از کار ہے اور بدقّت قابل توجہ کہا جا سکتا ہے"
>
> ......**مسلم قومیت** کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں بس **مذہبی اخوّت** کا رشتہ ہی ایک چیز ہے اس لئے جدید مفہوم میں کوئی قومیت نشوونما نہ پا سکے"

(میری کہانی۔از پنڈت جواہر لعل نہرو۔جلد دوم ص ۳۳۳)

آیا آپکے خیال میں کہ یہ "مسلم قومیت" کا نظریہ ہمارے مسلم قوم پرست حضرات کے نزدیک "لغو" کیوں قرار پاگیا اور آگے بڑھئے۔ ارشاد ہے۔

ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں ہے۔

(خطبہ صدارت آل انڈیا نیشنل کنونشن منعقدہ مارچ ۱۹۳۷ء۔ از پنڈت جواہر لعل نہرو)

کس قدر حسرت اور کتنا استعجاب ٹپکتا ہے اس فقرہ سے کہ "ابھی تک ایسے لوگ زندہ ہیں"۔ گویا ان کے نزدیک زندہ رہنے کا حق صرف انہی کو ہونا چاہئے جو اس دقیانوسی خیال سے توبہ کر کے ان کی ہمنوائی میں فتوے صادر کردیں کہ مسلمان کوئی الگ قوم و ملت نہیں ہے۔ آج قومیت کی بنیاد مذہب نہیں بلکہ اوطان پر رکھی جاتی ہے۔

"مسلم قومیت" کا تصور۔ جیسا کہ ہم نے شروع میں بیان کیا ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت پیدا ہوتا ہے کہ اسلام ایک پرائیویٹ عقیدہ کا نام نہیں۔ بلکہ یہ ایک منظم مذہب (ORGANISED RELIGION) ہے۔ اور یہی خصوصیت ہے جو اسلام کو دیگر ادیان سے متمیز کرتی ہے۔ اس کے برعکس ہمارے قوم پرست حضرات مذہب کو ایک پرائیویٹ عقیدہ قرار دیتے ہیں اور اسی قسم کے مذہب کی آزادی کی ضمانت دیتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ ہمارے مسلم قوم پرست حضرات نے یہ نظریہ کہاں سے لیا ہے۔

پنڈت جی ارشاد فرماتے ہیں۔

"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اُسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہوگیا ہے میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو تک کی ہے۔ قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین۔ اور ترقی دشمن کا۔ بے دلیل عقیدت اور تعصب کا۔ توہم پرستی اور

لوگوں سے بے جا فائدہ اٹھانے کا۔ قائم شدہ حقوق اور مستقل حقوق آنیوالوں کی بقا کا حامی ہے۔" (میری کہانی ص ۱۶۱)

غور فرمایا آپ نے کہ یہ "منظم مذہب" کو مٹانے کی آرزو کہاں سے پیدا ہوئی ہے۔ اور چونکہ "منظم مذہب" دنیا میں صرف اسلام ہی ہے اس لئے بالفاظ دیگر "اسلام کو مٹانے" کی وہ آرزو کہاں سے پیدا ہو رہی ہے جس کی تائید ہمارے مسلم قوم پرست حضرات کر رہے ہیں۔ اور آگے بڑھئے۔ ارشاد ہے۔

"منظم مذہب بلا استثناء مستقل اغراض سے وابستہ ہو جاتا ہے اور یوں لازمی طور پر ایک ترقی دشمن قوت بنکر تغیر اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے۔" (ص ۱۶۷)

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ وہی مقصدِ اسلامی جسے حضرت مولانا "احیائے ملی" سے تعبیر فرماتے تھے اب ایک ایسے گھناؤنے جذبے کا نام ہو گیا جسے مستقل اغراض سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ اور اس نظریہ کو "ترقی" کا دشمن کہا جاتا ہے۔ گویا ترقی یہ ہے کہ "منظم مذہب" اسلامی جماعتی نظام کا وجود دنیا میں نہ رہے۔

وہی "مسلم قومیت" جس کے متعلق حضرت مولانا پورے ایقان و بصیرت سے فرماتے تھے کہ عین اسلام ہے، اس کے متعلق ارشاد ہے۔

"مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے۔ اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد ہوتا بھی تو حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا۔" (ایضاً ص ۳۳۲)

اُمید ہے کہ حضرت مولانا نے سابق صدر کانگریس سے ضرور معافی مانگ لی ہوگی۔ کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اس "مسلم قومیت" کے تخیل کی اشاعت کے زیادہ تر یہی ذمہ دار تھے۔

مضمون بہت زیادہ بڑھ گیا، اس لئے ہم سرِدست اتنے ہی اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں۔ ابھی آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہمارے مسلم قوم پرست حضرات نے جو اپنا رُخ "کعبہ" سے پھیر کر "ترکستان" کی طرف کر لیا ہے وہ کس "قبلہ نما" کی سوئی کے رُخ کو دیکھ کر کیا ہے۔ تأسف صرف اس چیز کو دیکھ کر ہوتا ہے کہ میلانات و عواطف انسان کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ وہی مولانا آزاد جو لاہور کی انجمن کے ایک ریزولیوشن کو دیکھ کر سراپا آگ ہو جاتے تھے اب کچھ ایسے بیٹھے ہیں کہ یہ تمام چیزیں اپنی آنکھوں سے پڑھ رہے ہیں۔ اسلامی محکمات کا یوں تمسخر اڑتا دیکھ رہے ہیں۔ اور ایک لفظ احتجاج کا نہ اُن کی زبان سے نکل سکتا ہے نہ قلم سے۔ اور اسی پر اکتفا نہیں۔ بلکہ وہ تمام مسلمانانِ ہند کو عملاً بتا رہے ہیں کہ وہ راستہ جو اس کانگریس کا تجویز فرمودہ ہے جس کے قائدِ اعظم کے خیالات آپ نے ملاحظہ فرما لئے ہیں وہی راستہ دین کی "صراطِ مستقیم" ہے۔ اور اس کے علاوہ جو بھی راستہ ہے۔ باطل کا راستہ ہے۔ اس کے جواب میں سوائے اس کے کہ ہمارے دُکھے ہوئے دل کی آہیں۔ سرمد مرحوم کی ایک رباعی کی شکل میں حضرت مولانا اور ان کے دیگر ہم مسلک علمائے کرام کی خدمت میں شرفِ پذیرائی حاصل کریں۔ ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

سرمد در دین را عجب شکستے کردی ایماں بہ فدائے چشم مستے کردی
با عجز و نیاز جملہ نقد خود را رفتی و نثارِ بت پرستے کردی

یہ چیز تو آپ نے دیکھ ہی لی کہ اسلام کی رُو سے مسلمانوں کی اپنی الگ جماعت۔ اپنا مرکز اور اپنا نظامِ ملّی ہونا اسلام ہے۔ یہ نہیں ہے' تو اسلام بھی نہیں ہے! اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ مسلمانوں کی جماعت کا ملک کی دوسری جماعتوں کے ساتھ اشتراکِ عمل کیسے ہوگا! ملک کی ترقی اور بہبودی کے لئے یہ کس شکل میں ان سے تعاون کر سکیں گے۔ ایسی مخلوط آبادی میں یہ اپنے نظامِ ملّی کو کس صورت میں قائم رکھ سکیں گے! انشاء اللہ ان تمام سوالات کے جواب ہم کتاب و سنت کی روشنی میں پیش کرینگے۔ اور نہایت واضح طریق سے پیش کرینگے۔ لیکن اس وقت آپ پورے اطمینان و یقین کے ساتھ اس اساسی اور بنیادی چیز کو سمجھ لیجئے کہ اسلام نام ہے مسلمانوں کی اپنی الگ جماعت کا۔ اپنے مرکز کا اور اپنے نظامِ ملّی کا۔ یہ اصول ہے۔ باقی تمام مسائل فروعات ہیں۔ فروعات کا حل ہمیشہ اصول کی روشنی میں تلاش کیا جاتا ہے۔ اصول گم کر کے فروعات کے حل تلاش کرتے پھرنا ایسا ہی ہے جیسا اُس جسم کے پھوڑے پھنسیوں کا علاج کرنا جس جسم سے سر کٹ کر الگ ہو چکا ہو۔ وفیہا آیات لقوم یعقلون۔

طلوعِ اسلام ۴۹ جولائی ۱۹۳۸ء

گفتگوئے مصالحت

قرآنی روشنی میں!

(رازی)

یوں تو ہندوستان میں ہندو اور مسلمان آٹھ نو سو سال سے اکٹھے رہتے چلے آرہے ہیں لیکن بایں ہمہ قرب و اختلاط برادرانِ وطن جس قدر مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی اساس سے بیگانہ ہیں ذہنی احساسات اور قلبی رجحانات کے سرچشمہ سے ناآشنا اور اُنکے مذہب کے بنیادی اصولوں سے بے خبر ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ان سے اس قدر غیریت اور اجنبیت برتی ہے۔ اس وقت ہمیں ان اسباب و علل سے بحث نہیں جو اس بیگانگی اور نا واقفیت کا موجب ہیں لیکن موجودہ دورِ سیاست میں اس کی وجہ سے جو مشکلات پیش آرہی ہیں انھوں نے ہمیں مجبور کردیا ہے کہ ہم کھلے کھلے الفاظ میں بیان کردیں کہ آج بہت سی بدگمانیاں اور غلط فہمیاں اس وجہ سے پیدا ہورہی ہیں کہ ہندو روحِ اسلام سے قطعاً ناآشنا ہے۔ عوام الناس کو تو چھوڑیئے اس قوم کے ممتاز اکابر کی یہ کیفیت ہے کہ وہ ہیگل اور نیٹشے کے فلسفہ کی باریکیاں جانتے ہیں۔ وہ مارکس اور لینن کے نظریات کے ماہر ہیں۔ وہ روما اور یونان کے عروج وزوال کے اسباب سے باخبر ہیں لیکن وہ مسلمانوں کے متعلق صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ ان کو اگر ذبحِ بقر کی اجازت دیدی جائے۔ مساجد کے سامنے باجہ بجانا روک دیا جائے۔ اور انکا "ٹونٹی دار لوٹا" ان سے نہ چھینا جائے تو اُنکے مذہب و تمدن۔ تہذیب اور کلچر کی پوری پوری نگہداشت ہوجاتی ہے۔ اور جب کوئی مسلمان اس سے ذرا آگے کسی اور چیز کے تحفظِ حقوق کا مطالبہ کرتا ہے تو وہ فوراً کہہ اُٹھتے ہیں کہ دیکھو میاں! یہ سیاسی معاملہ ہے اسے مذہب

طلوعِ اسلام ۵۰ جولائی ۱۹۳۸ء

بپتسمہ دے کر خواہ مخواہ "فرقہ وارانہ" مسئلہ کیوں بناتے ہو! یہ ایک بنیادی غلطی یا غلط فہمی ہے جس کی بنا پر آج تک ہندو مسلم اختلافی مسائل کا کوئی حل تجویز نہیں ہو سکا۔ ہم پورے ایقان و بصیرت کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ جب تک اس بنیادی غلطی کو دور نہ کیا جائے گا۔ اس مسئلہ کا کوئی محکم، دیرپا اور استوار تصفیہ نہیں ہو سکے گا۔ حقائق سے چشم پوشی کر لینے سے اختلافات نہیں مٹا کرتے۔ جو ایسا سمجھتے ہیں وہ خود بھی دھوکے میں رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی دھوکے میں رکھتے ہیں۔ اور یہی دھوکا ہے جو انسان کو کسی صحیح نتیجہ تک پہنچنے نہیں دیتا۔ اس لئے کہ جب کسی اختلافی مسئلہ کو فریقین دو مختلف اور متضاد زوایائے نگاہ سے دیکھیں تو وہ کس طرح کسی ایک فیصلہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ ہندو ایک معاملہ کو پیش کرتا ہے تو اسکے سامنے سیاسی منافع، ملکی مصالح، قومی رجحانات۔ وطنی جاذبیتیں ہوتی ہیں وہ اس معاملہ کو انہی میزانوں میں تولتا ہے اور بازار کی گرمی اور سردی کے پیشِ نظر اپنی قیمتوں میں تغیّر و تبدّل بھی کر لیتا ہے۔ مبادلہ و معاوضہ کی شرح میں بھی کمی بیشی روا رکھ سکتا ہے۔ لیکن فریقِ ثانی یعنی مسلمان۔ اس معاملہ کو خالصتہً مذہبی میزان سے تولتا ہے کہ جس پر نہ بازار کی سردی گرمی اثر انداز ہو سکتی ہے۔ نہ مبادلہ و معاوضہ (EXCHANGE) کی شرح میں کچھ فرق ہو سکتا ہے۔ وہ دُنیا کے کسی معاملہ میں وہ بازارِ سیاست کے کسی سودے میں "نہیں" "ایس" نہیں کر سکتا۔ کہ اسکے سامنے یہ حکم جلی الفاظ میں لکھا ہوتا ہے کہ:-

من لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکافرون ؏

جو شخص اپنے معاملات کے فیصلے اللہ کی کتاب کے ماتحت نہیں کرتا اُسے اسلام سے کچھ تعلق نہیں وہ کفّار کے زمرہ میں شامل ہے ؏

لہٰذا مسلمان اس مقام پر مجبور ہو جاتا ہے۔ فریقِ مقابل اس کی اس مجبوری کو نہیں سمجھتا اور کہہ دیتا ہے کہ دیکھو صاحب ہم تو معاملہ کے تصفیہ پر آمادہ ہیں۔ لیکن یہ حضرت عجب قسم کے واقع

ہوئے ہیں۔ اپنی سی کہے جاتے ہیں۔ ان سے معاملہ طے کیسے ہو۔ بات تو جب ہو کہ کچھ ہم بڑھیں کچھ یہ گھٹیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ اتحاد و مفاہمت چاہتے ہی نہیں۔ یہ تو انگریزوں کے پٹھو ہیں، یہ تو جنگِ آزادی کے راستے میں سنگِ گراں بنکے بیٹھے رہنا چاہتے ہیں مسلمان یہ سب کچھ سنتا ہے اور متعجب ہو کر رہ جاتا ہے کہ یا اللہ! میری وہ کون سی خطا کی جو اس قسم کی سب و شتم کا نشانہ بنایا جا رہا ہوں۔ وہ صرف اتنا ہی کہتا ہے کہ بھائی! یہ میرے مذہب کا معاملہ ہے ہیں اس میں مجبور و بے بس ہوں۔ تو اس پر پھر ایک شور بلند ہو جاتا ہے۔ کہ لو بھئی! اب کونسل کی نشستوں میں بھی مذہب آگھسا، بندے ماترم کا گیت بھی مذہبی مسئلہ بنگیا۔ اردو ہندی کا جھگڑا بھی دین کا معاملہ ہو گیا۔ مسلمان پھر یہ سب کچھ سنتا ہے اور کہنے والوں کا منہ تکتا رہ جاتا ہے اور سوائے اسکے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ؎

یا رب یہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

لہٰذا برادرانِ وطن جب تک مسلمان کی اس مجبوری کو نہیں سمجھیں گے۔ ملکی معاملات نہیں سلجھ سکتے۔ جب تک انہیں اس بات کا یقین نہیں آجائے گا کہ ایک مسلمان کے لیے پولنگ اسٹیشن پر جا کر صحیح ووٹ دینا بھی ایسا ہی مذہبی فریضہ مقدس ہے جیسا نماز پڑھنا سیاسی مسائل کا اختلاف کا کوئی حل تجویز نہیں ہو سکے گا۔ اسوقت ہم ایک نشست میں اتنا تو نہیں کر سکتے کہ اسلام کے جملہ عناصر ترکیبی کو سامنے لاکر یہ بتادیں کہ بساطِ سیاست کے جن جن گوشوں کو ہندو خالص دنیاوی اور ملکی مسائل سمجھتا ہے۔ وہ مسلمان کے نزدیک عین دینی اور مذہبی معاملات ہیں۔ البتہ اسوقت ہم صرف ایک بنیادی مسئلہ کو قرآنِ کریم کی روشنی میں دکھانے کی کوشش کرینگے جو گزشتہ ایامِ جناح۔ گاندھی۔ بوس کی گفتگوئے مصالحت کے ضمن میں لوگوں کے سامنے آگیا ہے۔ گفتگوئے مفاہمت کی تفصیلات ہنوز پردۂ اخفا میں ہیں اس لیے ان پر تو کسی قسم کا تبصرہ قبل از وقت ہے لیکن اخبارات میں ایک اصولی بات کا ذکر ہو رہا ہے اور وہی بات

طلوعِ اسلام ۵۲ جولائی ۱۹۳۸ء

ملک کے طول و عرض میں ہیجان انگیزی کا ذریعہ بنائی جارہی ہے مسٹر جناح نے یہ کہا ہے کہ گفتگو چونکہ ہندؤں اور مسلمانوں میں مصالحت کی غرض سے ہو رہی ہے اس لیے سب سے مقدم یہ ہے کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے اور کانگریس کو غیر مسلموں کی نمائندہ جماعت۔ اور اس طرح جو معاملات طے ہوں وہ من حیث الجماعت طے ہوں کہ مسلمانوں کے معاملات طے کرنے کی مجاز صرف ان کی نمائندہ جماعت ہو سکتی ہے۔ کوئی فرد، یا کوئی فرقہ اس کا مجاز نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک بنیادی مسئلہ تھا جو مسٹر جناح نے پیش کیا۔ اس پر ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملک میں ایک ہنگامہ برپا کیا جارہا ہے کہ مسٹر جناح کا یہ مسلک خالصۃً فرقہ وارانہ ہے اس کے تو یہ معنی ہیں کہ ملک میں مسلمانوں کی ایک الگ جماعت کا وجود تسلیم کر لیا جائے اور کانگرس تمام ہندوستانیوں کی نمائندہ جماعت ہونے کے بجائے غیر مسلموں کی نمائندہ جماعت بنکے رہ جائے۔ ہمارے نزدیک یہ تمام ہنگامہ آرائی اگر مصالحت سے پہلو تہی کرنے کی نیت سے نہیں تو کم از کم اس بنیادی غلط فہمی کی وجہ سے یقینی ہے جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ مسٹر جناح نے جو کچھ کہا ہے وہ انکا اپنا ذاتی خیال ہے یا وہ بہ حیثیت مسلمان مذہب کی رُو سے۔ ایسا کہنے اور کرنے پر مجبور ہیں۔ اگر تو وہ ان کا اپنا خیال ہے تو اس میں تغیر و تبدّل ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ "خیال" نہیں بلکہ قرآن کریم کا حکم ہے تو پھر جب تک ایک شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔ وہ اس بنیادی اصول سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹ سکتا۔ ساری دنیا اس کی مخالفت کرے۔ اُسے "فرقہ پرست" کہے۔ ضدی قرار دے۔ "غدارِ وطن" اس کا نام رکھے جو جی میں آئے کہتی جائے وہ اپنے فیصلے میں تبدیلی تو ایک طرف۔ تبدیلی کا خیال تک بھی نہیں لا سکتا کہ ایک مسلمان کے مصالح۔ اس کی ہر روش۔ اسکا مسلک۔ اس کے فیصلے اسکے ارادے سب قرآن کریم کے فیصلوں کے تابع رہتے ہیں بلیٰ من اسلم وجھہٗ للّٰہ وھو محسن۔ جب تک ایسا ہوتا ہے وہ مسلمان رہتا ہے اور جب قرآن کریم کے فیصلوں پر کوئی اور شے غالب آ جائے تو پھر وہ "ہندوستانی" تو رہ سکتا ہے مسلمان نہیں رہ سکتا۔

قرآنِ کریم دُنیا میں انسانوں کی تقسیم صرف ایک اصول پر کرتا ہے جسے کفر و اسلام کا اصولِ تقسیم کہتے ہیں اس کے نزدیک انسان صرف دو جماعتوں میں منقسم ہو سکتے ہیں مسلم وغیر مسلم، انسانوں کی ایک تیسری قسم بھی وہاں ملتی ہے وہ بھی دراصل اسی دوسری جماعت ہی کی ایک شاخ ہے۔ ان کو وہ منافقین کی جماعت کہتا ہے یعنی وہ لوگ جو بعض مصالح ومنافع کی خاطر بظاہر ایک جماعت سے اپنا تعلق ظاہر کریں لیکن درحقیقت وہ دوسری جماعت کے ساتھ ہوں

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۲/۸

اور لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے تو یہ ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ (مومنین کی جماعت سے متعلق) نہیں ہوتے۔ وہ اللہ کو اور ایمان والوں کو دھوکہ دیتے ہیں لیکن دراصل یہ دھوکا انکی خود فریبی ہوتی ہے اور وہ سمجھتے نہیں ۲/۸

وہ لوگ جن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ:۔

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا. وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ ۲/۱۴

جب یہ لوگ مسلمانوں کی جماعت سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایماندار ہیں لیکن جب اپنے لیڈروں سے تنہائی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ ہیں ان لوگوں سے تو ہم یونہی تمسخر کر رہے ہیں

لیکن قرآنی تقسیم کے اعتبار سے یہ لوگ بھی غیر مسلموں ہی شامل ہوتے ہیں۔

وَإِذَا جَاءُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا. وَقَد دَّخَلُوا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوا بِهِ. وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا يَكْتُمُونَ ۵/۶۱

اور یہ لوگ جب تمہارے پاس آتے ہیں تو مومن بنجاتے ہیں۔ حالانکہ جب یہ آئے تھے تو اسوقت بھی کفر ہی لیکر آئے تھے۔ اور جب گئے تو اُسوقت بھی کُفر ہی لے کر گئے۔ اور اللہ خوب جانتا ہے جو یہ چھپاتے ہیں۔

طلوع اسلام ۵۴ جولائی ۱۹۴۳ء

بلکہ یہ تو جہنم کے اسفل ترین درجہ میں جائینگے کہ کھلے دشمن سے مار آستین ہمیشہ زیادہ خطرناک ہوتا ہے:۔

ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار۔ ۴/۱۴۵

یقیناً یہ منافق (یہ جعفر و صادق) جہنم کے سب سے نچلے حصے میں ہونگے

تو گویا قرآن کریم کے نزدیک جماعتیں صرف دو ہی ہیں مسلم اور غیر مسلم۔ اس تقسیم کے سوا وہ کسی تیسری تقسیم کو جانتا ہی نہیں۔ اسلام کے نزدیک کسی مخلوط جماعت کا تصور ہی غیر قرآنی ہے یعنی وہ اسے تسلیم ہی نہیں کرتا کہ مسلم اور غیر مسلم ملکر ایک جماعت بن سکتے ہیں۔ سارا قرآن آپ کے سامنے ہے نبی اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ آپ کے سامنے ہے۔ صدرِ اولیٰ کے مسلمانوں کی تاریخ کے اوراق آپ کے سامنے ہیں کہیں کسی ایک جگہ بھی آپ کو اس قسم کا اشارہ تک بھی نہ ملے گا کہ مومن و کافر مسلم و غیر مسلم باہمی اختلاط سے کسی ایک جماعت کے افراد بن سکیں۔ اسلام خالص مسلمانوں کی الگ جماعت قائم کرتا ہے جس میں کسی غیر مسلم کا نام تک نہیں آسکتا۔ اور اسی طرح کوئی مسلمان اپنی جماعت کو چھوڑ کر کسی دوسری جماعت میں شامل نہیں ہوسکتا جو غیر مسلموں پر مشتمل ہو۔ علیکم بالجماعۃ فانہٗ من شذ۔ شذ فی النار اپنی جماعت کے ساتھ رہو۔ جو اس میں سے الگ ہوا وہ سیدھا جہنم میں گیا۔ اس شذّ (الگ ہونے) کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ خالص مسلمانوں کی جماعت کو چھوڑ کر کسی مخلوط جماعت کا فرد بنجائے۔ من فارق عن الجماعۃ شبراً فخلع ربقۃ الاسلام عن عنقہ (جو جماعت سے ایک بالشت بھی الگ ہوگیا۔ اس کی گردن سے اسلام کا طوق اتر گیا) اگر ہم اس موضوع پر آیاتِ قرآنی۔ احادیث مقدسہ اور آثارِ صحابہؓ جمع کریں تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہوجائے۔ لیکن ان تمام تحریری اسناد کے علاوہ نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ اور صدرِ اولیٰ کے مسلمانوں (رضی اللہ تعالےٰ عنہم) کی تاریخ اپنی شہادت آپ پیش کرتی ہے۔ غیر مسلم مؤرخین نے اس باب میں بڑی تجسّس و تفحص کی ہے کہ کہیں کوئی ایک واقعہ ہی ایسا ملجائے کہ مسلمان اور غیر مسلم ملکر ایک قوم بنگئے ہوں لیکن وہ ناکام رہے ہیں۔ سر ولیم میور نے اپنی سعی و کاوش کے بعد اپنی مشہور کتاب "THE CALIPHATE ITS RISE & FALL"

"تاریخ عروج و زوالِ خلافت" میں لکھا ہے کہ صدر اوّل کے مسلمانوں کی تاریخ میں صرف ایک شخص، حارث، نامی ایسا ملتا ہے جو اپنی جماعت چھوڑ کر خاقان کے پاس چلا گیا تھا۔ لیکن وہ بھی کچھ عرصہ کے بعد تائب ہوکر واپس آگیا اسی طرح غیر مسلم بھی مسلمانوں کی جماعت کے افراد نہیں بن سکتے تاوقتیکہ وہ اسلام قبول نہ کرلیں۔ اس لیے کہ مسلمانوں کے معاملات، خواہ وہ اپنی اندرونی اصلاح و تنظیم سے متعلق ہوں۔ خواہ خارجی دُنیا سے، وہ اِن کی اپنی (غیر مخلوط) جماعت کے مشوروں سے طے پا سکتے ہیں وامرھم شوریٰ بینھم (ان کے معاملات باہمی مشورہ سے طے پائیں گے)، "بینھم" (آپس میں) خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ جماعت مسلم و غیر مسلم افراد پر مشتمل نہ ہوگی۔ بلکہ خالصتہً مسلمانوں کی جماعت ہوگی۔ پھر اطاعتِ خدا و رسول کے ساتھ جو صاحب اختیار، امیرِ ملّت، کی اطاعت کا حکم ہے تو اُس کے متعلق بھی ارشاد ہے کہ اولی الامر منکم۔ وہ صاحب اختیار، وہ امیر قوم تم میں سے ہوگا۔ کسی غیر مسلم کی قیادت میں چلنا مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ اور مخلوط جماعت میں تو ظاہر ہے کہ اپنے اور بیگانے کی تمیز باقی نہیں رہے گی۔ اس تمیز مٹانے کا نام ہی تو قومیت پرستی (NATIONALISM) ہے۔

(۱) تو ہم نے یہ دیکھ لیا کہ اِسلام کسی ایسی جماعت کا تصور بھی نہیں لا سکتا جو مسلم و غیر مسلم افراد کی مخلوط جماعت ہو۔ اُسکے نزدیک مسلمانوں کی جماعت الگ ہوگی اور ان کے علاوہ تمام دُنیا کے غیر مسلموں کی جماعت اِن سے الگ۔

---

(۲) پھر جس طرح اِسلام کسی مسلم و غیر مسلم کی مخلوط جماعت کا تصور یکسر غیر قرآنی قرار دیتا ہے۔ اسی طرح وہ افراد کی ہستی کو بھی کچھ نہیں سمجھتا۔ فرد جب تک جماعت کا رُکن ہے تو سب کچھ ہے جب وہ جماعت سے الگ ہو جاتا ہے تو اس کی اِسلامی حیثیت کچھ نہیں رہتی۔ قرآنِ کریم میں شروع سے آخر تک تخاطب جماعتِ مومنین (یا ایھا الذین امنوا) سے ہے کہیں ایک جگہ بھی فرد کو مخاطب کرنے کے قابل نہیں سمجھا گیا۔

(۳) جس طرح اسلام افراد کی کوئی ہستی تسلیم نہیں کرتا اسی طرح اُسکے نزدیک کسی "فرقہ" کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔ فرقہ سازی۔ گروہ بندی، پارٹی بازی، کو تو وہ شرک قرار دیتا ہے۔ وَلَا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعًا۔ کل حزب بما لدیھم فرحون

مسلمانو! تم مشرکین میں سے نہ ہو جانا یعنی ان لوگوں میں سے جو تفرقہ اندازی کرتے ہیں، اور اپنی الگ پارٹی بنالیتے ہیں۔ پھر ہر پارٹی۔ ہر فرقہ اپنے اپنے خیالات میں مگن رہتا ہے۔

دوسری جگہ ہے کہ جوایسا کرتے ہیں :۔

لست منھم فی شیءٍ $\frac{6}{160}$

تمہارا اُن کے ساتھ کوئی تعلق نہیں

جو جماعت سے الگ ہو گیا۔ خواہ ایک فرد ہو یا ایک فرقہ۔ اس کا اسلام سے کچھ تعلق نہیں رہتا۔"

مندرجہ صدر ہر سہ مسلّمات سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے جسقدر معاملات دوسری جماعتوں سے الگ ہونگے وہ،

(ا) نہ کسی ایسی جماعت کیطرف سے ہوسکتے ہیں جو مسلم وغیر مسلم اراکین پر مشتمل ہو۔

(ب) نہ مسلمانوں کے افراد سے ہوسکتے ہیں۔

ج) نہ کسی خاص پارٹی یا کسی فرقے سے ہوسکتے ہیں۔

بلکہ وہ مسلمانوں کی جماعت بین سے ہونگے۔ لہٰذا ازروئے قرآن و سنّت۔ ہر وہ معاملہ جو اُوپر کی تین شقوں میں سے کسی ایک شق کے ماتحت طے پائے گا وہ اسلامی اصُول کے ماتحت محکم و استوار نہیں ہوگا لیکن جو معاملہ مسلمانوں سے من حیث الجماعۃ طے پائے گا۔ وہی فیصلہ زندہ و پائندہ ہوگا کہ مسلمانوں کے نزدیک جماعت اور جماعت کے امیر کا فیصلہ خدا اور رسولؐ کے فیصلہ کے قائم مقام ہو جاتا ہے اور یہ وہ فیصلہ ہے جس سے سرتابی ابدی جہنم میں لے جانے کی موجب ہو جاتی ہے۔

طلوعِ اسلام ۵۷ جولائی ۱۹۳۸ء

ومن یعص اللہ ورسولہٗ فان لہٗ نار جہنم خالدین فیہا ابداً ۷۲/۲۳

اور جو خدا ورسول کے حکم سے سرتابی کرے گا تو اسکے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا

یہاں سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ مسلمانوں کو ایک ''فرقہ'' قرار دینا ان کو انکے مذہب سے منحرف بنا دینا ہے کہ فرقہ بندی تو اُنکے نزدیک شرک ہے مسلمان فی ذاتہٖ ایک مستقل قوم (NATION) ہے اور یہ کسی مخلوط قوم (NATION) کا جزو بن ہی نہیں سکتے۔ مذہباً یہ ناممکن ہے، یہ جب تک مسلمان رہیگا ایک قوم۔ ایک جماعت کی حیثیت سے رہے گا۔ جب کسی مخلوط قوم میں جاکر ملجائیگا۔ اسلام کے دائرے سے باہر چلا جائے گا۔ یہ حقیقت بظاہر بڑی تلخ معلوم ہوگی لیکن جس حقیقت کو خدا اور اس کا رسولؐ ایسے کھلے کھلے الفاظ میں بیان کرتا ہو اُسے رواداری کے ایک غلط مفہوم کی بنا پر کھلے لفظوں میں نہ کہنا دوسروں کو فریب دینا ہے جو اسلام میں تو کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والھدیٰ من بعد ما بینٰہ للناس فی الکتاب اولٰئک یلعنہم اللہ ویلعنہم اللعنون ۲/۱۵۹

یقیناً وہ لوگ جو اس چیز کو چھپاتے ہیں جو ہمنے دلائل وہدایت کی بنا پر نازل کیا ہے، بعد اسکے کہ ہمنے اسے کتاب میں تمام انسانوں کے لیئے بالکل ظاہر کر دیا ہے۔ تو ایسے لوگوں پر اللہ کی لعنت ہے۔ اور لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے۔

اب مسئلہ زیر نظر کی دوسری شق کو لیجیے یعنی مسلمانوں کو من حیث الجماعت غیر مسلموں کی جماعتوں سے کس صورت میں معاملات طے کرنے ہونگے۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اسلام دُنیا میں شرفِ انسانیت سکھانے کے لیئے آیا ہے۔ مسلمانوں کا جذبۂ عدل وانصاف، رحم ومروّت ہمدردی واحسان کسی خاص قوم۔ خاص نسل۔ خاص رنگ۔ خاص ملک سے کہ کسی خاص مذہب تک محدود نہیں ہوتا۔ ان کا خدا ربّ الناس یعنی تمام نوعِ انسانی کا پروردگار ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کے جذباتِ مروّت وپرورش بھی تمام نوعِ انسانی کے ساتھ یکساں ہوتے ہیں۔ لیکن نظم ونسقِ عالم کی بہترین

تقویم کے لیے۔ دُنیا میں اس جماعت کے استحکام کی خاطر جو حق وانصاف کی علمبردار ہے جو خدا کے ضابطۂ آسمانی کی امین اور حامل ہے قرآنِ کریم نے وہ قوانین بھی مرتب فرما دیے ہیں جن کی رُو سے مسلمانوں کی جماعت غیر مسلموں کی جماعت کے ساتھ تعلقات قایم کرسکتی ہے۔ تعلّقات کی ایک شکل تو وہ ہوتی ہے۔ جسے اعتماد۔ بھروسہ۔ قلبی یگانگت۔ دلی دوستی، وحدتِ ایمان وعمل کے تعلّقات کہتے ہیں اسے قرآنی اصطلاح میں تولّی کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے تعلّقات قرآنِ کریم کی رُو سے مسلمان صرف اپنی جماعت کے ساتھ وابستہ کرسکتے ہیں، غیر مسلموں کے ساتھ اس قسم کے تعلّقات قطعاً پیدا نہیں کیے جاسکتے۔ اس چیز کو قرآنِ کریم نے مسلمانوں کی مرضی پر ہی نہیں چھوڑ دیا۔ بلکہ ان کو کھلے کھلے الفاظ میں تاکیدی احکام دیدیے ہیں کہ وہ ایسا کرہی نہیں سکتے (یہ چیز کسی دوسرے وقت بیان کی جائے گی کہ دُنیا میں اس قسم کی جماعت کا وجود کیوں ضروری ہے۔ اور اس جماعت کے افراد کو غیر مسلموں کے ساتھ اس قسم کے قلبی تعلّقات پیدا کرنے سے کیوں روکا گیا ہے۔ اسوقت ہم صرف قرآنی مسلمات سے بحث کر رہے ہیں نہ اُن کے دلائل وحجج سے) فرمایا:۔

> "مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں (اولیاء دلی دوست) وہ نیک باتوں کا حکم دیتے ہیں برائیوں سے روکتے ہیں۔ نماز کو قایم کرتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اُسکے رسول کی اطاعت کرتے ہیں ... ۹/۷۱

اس کے برعکس غیر مسلموں کے متعلق فرمایا:۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِکُمْ لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا ۔ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَکْبَرُ ۔ قَدْ بَیَّنَّا لَکُمُ الْاٰیٰتِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۳/۱۱۷

> اے ایمان والو۔ اپنے سوا (یعنی اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا) کسی دوسرے کو دلی دوست۔ رازدار نہ بناؤ۔ وہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھیں گے، وہ ہمیشہ تمہارے نقصان پر خوشیاں مناتے ہیں اُن کی نفرت اور کینہ کی کچھ باتیں

توان کے مُنہ سے (بعض اوقات) نکل جاتی ہیں لیکن جو کچھ اُنکے دلوں کے اندر بھرا ہوا ہے۔ وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ہم نے کھلی کھلی باتیں تم سے کہہ دی ہیں اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ تو خود سمجھ لو کہ اس میں کیا مصلحت ہے۔)

مِنْ دُونِکُم کا ٹکڑا قابلِ غور ہے یعنی اپنے سوا۔ اپنی جماعت کے افراد کے علاوہ اور کوئی بھی ہو اس سے اس قسم کے تعلقات قطعاً پیدا نہیں کیئے جا سکتے جیسے اپنوں کیئے جا سکتے ہیں۔ ہم نے پہلے دیکھ لیا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے دُنیا میں جماعتیں صرف دو ہی ہیں ایک مُسلمانوں کی اور دوسری غیر مُسلموں کی (مِنْ دُونِکُم کی) مُسلمانوں کے سوا اور ساری دُنیا کی جماعتیں اس غیر مسلم جماعت میں شامل ہیں، جو مُسلمانوں کی جماعت نہیں وہ غیر مسلموں کی جماعت ہے۔ خواہ وہ ہزار فرقوں سے ملکر جماعت بنی ہو۔ خواہ اسے کسی مُلک کی "واحد نمائندہ" ہونے کا دعویٰ بھی کیوں نہ ہو۔ مُسلمانوں کے نزدیک وہ جماعت من دون المؤمنین (غیر مسلم) جماعت ہے اور یہی وہ جماعت ہے جس سے تولّٰی قلبی تعلقات۔ دِلی دوستی۔ اعتماد اور بھروسے کے تعلقات۔ قطعاً جائز نہیں وطن کا رشتہ تو ایک طرف رہا۔ خواہ خون کا رشتہ بھی کیوں نہ ہو۔ "خواہ اُنکے آباء و اجداد ہی کیوں نہوں اُنکے بیٹے کیوں نہ ہوں بھائی کیوں نہ ہوں رشتہ دار کیوں نہ ہوں" (۵۸؍۲۲) اُن سے تولّٰی جائز نہیں۔ غیر مسلموں کے ساتھ جو تعلقات قائم ہونگے وہ ہمیشہ باہمی معاہدوں کی رُو سے قائم ہونگے۔ جن میں باہمی حقوق وضمانت کی شرائط وقیود واضح کی جائیں گی۔ یہ وہ جماعتیں ہوں گی جنکے متعلق قرآنِ کریم میں ہے کہ "بلینکُمْ وَ بینھم میثاق" تمہارے اور اُن کے درمیان میثاق ہے۔ معاہدہ ہے۔ نبی اکرمؐ نے جسقدر معاملات غیر مسلموں سے طے کیئے سب اسی انداز سے کیئے۔ من حیث القوم کیئے۔ باہمی معاہدوں کی رُو سے کیئے۔ صدرِ اولیٰ کے مسلمانوں کی تاریخ ان مواثیق و معاہدات سے بھری پڑی ہے۔ اسکے خلاف ہمارا دعویٰ ہے اور علے وجہ البصیرت یہ دعویٰ ہے کہ قرآن، حدیث وآثار و تاریخ میں کہیں ایک سند بھی اس چیز کے اثبات میں نہیں ملے گی کہ مسلمانوں نے غیر قوموں سے انفرادی طور پر دوستی اور تولّٰی کے تعلقات قائم کیئے ہوں۔ اگر کسی کو اس میں

میں شک ہو تو اپنے دعوے کے اثبات میں کوئی ایک سند پیش کرے۔ فَاْتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ ○

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی مسلمان ایسا کرے کہ وہ انفرادی طور پر غیر مسلم جماعتوں کے ساتھ رابطۂ مودّت و مواخات قائم کرکے اُن کے ساتھ دوستی اور تولّی کا رشتہ پیدا کرے تو قرآنِ کریم کا اس باب میں کیا حکم ہے لیکن قبل اسکے کہ آپ یہ حکم سُنیں ذرا کلیجہ کو تھام لیجئے حکم وہ ہے کہ جسے دیکھنے سے آنکھیں پتھرا جاتی ہیں جس کے احساس سے دل کانپ اُٹھتا ہے جس کے لکھتے وقت ہاتھ تھر تھرا جاتا ہے سُنیئے حکم ہے کہ:۔

مَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ ۵۱ صلہ

جو تم میں سے اُنکے ساتھ اس قسم کا رشتہ قائم کرے تو وہ اُنہی میں کا ایک ہو جاتا ہے۔

غور فرمایئے۔ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ۔ وہ تم میں سے نہیں رہتا۔ وہ انہی میں سے ایک ہو جاتا ہے۔ جو اپنی جماعت کو چھوڑ کر دوسروں سے تعلقات قائم کرتا پھرے اُسے تم سے کیا واسطہ! وہ جن میں جا ملا۔ انہی میں سے ہو گیا! اللہ اکبر۔ غور فرمایئے بات کہاں پہنچ رہی ہے!! یاد رکھیئے قرآنِ کریم کوئی شاعری کی کتاب نہیں ہے کہ یونہی برائے بیت کچھ الفاظ لکھ دیتا ہے نعوذ باللہ من ذالک۔ قرآنِ کریم کا ایک ایک لفظ ہمالیہ پہاڑ سے زیادہ محکم اور اٹل ہے۔ اور جو کچھ کہتا ہے اس کا مطلب بھی وہی ہوتا ہے جب اُسنے فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ کہا تو فی الواقعہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص مسلمانوں کے حلقہ میں رہتا ہی نہیں۔ وہ انہی میں سے ایک ہو جاتا ہے جن میں وہ جا ملتا ہے۔ اس فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ کی عملی تفسیر دیکھنی ہو تو روزمرّہ کے واقعات پر غور فرمایئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مصالحت کی

صلہ آیت میں اس مقام پر یہود و نصاریٰ کا ذکر بالتصریح ہے لیکن چونکہ مسلمانوں کو تمام کفار سے تولّی کی ممانعت کی گئی ہے (دیکھئے) اور یہود و نصاریٰ کو قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر کافر کہا گیا ہے اس لیئے فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ کے معنی یہی ہیں کہ مسلمان اپنی جماعتِ مومنین کے سوا جن سے بھی تولّی رکھیگا وہ انہی میں سے ہو جائیگا۔ ۱۲ منہ

گفتگو کے متعلق ابتدائی مراحل طے ہوتے ہیں مسلمانوں کی طرف سے مسٹر جناح سامنے آتے ہیں اور مہاتما گاندھی سے کہتے ہیں کہ آپ ہندوؤں کی طرف سے آیئے۔ آپ کو کچھ خبر ہے کہ وہاں سے کیا جواب آیا؟ حیران ہوں کہ اس جواب پر آسمان کیوں نہ پھٹ پڑا۔ زمین کیوں نہ شق ہوگئی، یہ خطہ کیوں نہ غرق ہوگیا۔ جواب آتا ہے کہ ہماری طرف سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد آئینگے اُن سے بات کیجئے! اللہ جل جلالہٗ۔ یہ دن بھی ملتِ اسلامیہ کو دیکھنے تھے لیکن اُس مردِ غیورؒ کی حمیت اسے گوارا ہی نہ کرسکی کہ چشمِ فلک اس نظارہ کو بھی دیکھے کہ مسلمان آمنے سامنے ہوں اور ان میں سے ایک مسلمانوں کا نمائندہ ہو اور دوسرا ــــ غیر مسلموں کا نمائندہ۔ اُس نے کہہ دیا کہ نہیں ہندوؤں کی طرف سے آپ تنہا ہی آیئے۔ پھر اس "انہ منھم" کی تفسیر دیکھنی ہو تو وہ بیانات ملاحظہ فرمایئے جو اخبارات میں آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے جب کبھی ہندوؤں کے خلاف صدائے احتجاج اُٹھتی ہے تو اُسکے جواب میں ہندوؤں کی پوزیشن واضح کرنے کے لیے۔ اُن کی تبریت اور صفائی پیش کرنے کے لیے اور اُلٹا مسلمانوں کے سر الزام دھرنے کے لیے، کون سامنے لایا جاتا ہے؟ کوئی ڈاکٹر مونجے نہیں۔ کوئی بھائی پرمانند نہیں۔ بلکہ امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد۔

اے محمدؐ گر قیامت را برآری سر ز خاک !
سر برآر و ایں قیامت درمیانِ خلق بیں !

سچ کہا ہے قرآن کریم نے کہ جب کوئی انسانوں کو خدا سمجھنے لگتا ہے تو اُس کی حالت یہ ہو جاتی ہے گویا وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آگرے یا اُسے ہوا کے تیز جھونکے پر کاہ کی طرح ادھر اُدھر اُڑائے لیے پھر رہے ہوں یا جیسے کسی چھوٹے سے پرندے کو کوئی عقابی پنجوں والا گدھ اُچک کر لے جائے۔" وہی مومن جو تختہ دار پر بھی اپنی سی کہے جاتا ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اسے اس سے روک نہیں سکتی۔ پھر اس کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ جو جس کے جی میں آئے اُس سے کہلوا لے۔ یا للعجب!

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

بشر المنافقین بان لھم عذابا الیما ۔ الذین یتخذون الکافرین اولیاء من دون المؤمنین ۔ ایبتغون عندھم العزۃ فان العزۃ للہ جمیعا۔ (۴/۱۳۸)

ان منافقین کو خوشخبری دیدیجئے کہ اُنکے لیئے دردناک عذاب ہے وہ لوگ کہ جو مسلمانوں کو چھوڑکر (یا مسلمانوں کے سوا) غیر مسلموں کو اپنا دوست بناتے ہیں کیا یہ لوگ ان غیر مسلموں کے پاس عزت پانے کی خاطر جاتے ہیں اسو عزت تو تمام اللہ کے ہاں ہے (۴/۱۳۸-۱۳۹)

کتاب و سُنت کی ان تصریحات کو سامنے رکھیئے اور پھر دیکھیے کہ اگر مسٹر جناح یا کوئی اور مسلمان یہ کہہ دے کہ :-

(۱) ہندوؤں اور مُسلمانوں میں اتحادِ عمل کی صرف یہی صورت ہے کہ ان دونوں کے درمیان من حیث الجماعت معاہدہ ہو۔ اور

(۲) ایک فریق کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے اور دوسرے فریق کو غیر مسلموں کی نمائندہ جماعت۔

تو کہیئے اُسنے کون سا جُرم کردیا۔ ہمیں اس سے واسطہ نہیں کہ کانگریس ہندوستان کی نمائندہ جماعت ہے یا نہیں۔ وہ ساری دُنیا کی نمائندہ جماعت بنجائے لیکن اسلام کے نزدیک چونکہ مسلم و غیر مُسلم کی مخلوط جماعت کا تصور ہی باطل ہے اسلیئے مسلمانوں کے نزدیک یہ جماعت غیر مسلموں کی جماعت ہی رہے گی۔ مسلمان ایسا سمجھنے، ایسا ماننے اور ایسا کہنے پر اپنے مذہب کی رُو سے مجبور ہے۔ اس میں نہ کسی سیاسی مصلحت کو دخل ہے نہ کسی کی ذاتی رائے کو۔ آجکل ایک ہنگامہ برپا کیا جارہا ہے کہ دیکھیئے صاحب کانگرس کی وسعتِ ظرف کہ اُسنے مسلمانوں کے نمائندہ جناب جناح سے دو لفظوں میں صاف کہہ دیا کہ ہم سب مطالبات تسلیم کرلینگے بشرطیکہ وہ کانگریس کے نظریۂ قومیت (NATIONALISM) کے خلاف نہ ہوں یعنی مسلمان بجائے اپنی الگ جماعت تسلیم

کرانے کے تسلیم کرلیں کہ مسلم و غیر مسلم دونوں مل کر ایک مخلوط قوم بن سکتے ہیں۔ صدر کانگریس نے پچھلے دنوں آسام میں ایک ایڈریس کے جواب میں کہا ہے کہ ہم سب کچھ مسلمانوں کے حوالے کردینے کو تیار ہیں بشرطیکہ مسلمان اپنے الگ جماعتی نظریہ کو چھوڑ کر مشترکہ قومیت کے نصب العین کو تسلیم کرلیں کس قدر چھوٹی سی شرط۔ اور کتنا معصوم سا مطالبہ!! اور مسلمانوں کی "ہٹ دھرمی" ملاحظہ ہو کہ اتنی سی بات نہیں مانتے!! لیکن مسلمان کیا کرے! وہ اپنے خدا کی مانے، خدا کے رسولؐ کی مانے۔ یا ان "تازہ خداؤں" کی مانے۔ یوں سمجھیے کہ صرف اتنا ہی کہا جاتا ہے کہ کفنی میں تیری تمام شرطیں مان لونگا۔ بس ذراسی میری بات مان لو کہ اپنی شاہ رگ کاٹ لینے دو اور اس شرط کے نہ ماننے پر ڈھائی مچا دی جاتی ہے کہ فرقہ پرست! انسانیت کا دشمن۔ وطن کا غدار۔ انگریز کا پٹھو۔ اور پتہ نہیں کیا کیا!! ہم برادران وطن سے صرف اتنی درخواست کرینگے کہ وہ اپنے دل میں اس قسم کے خیالات کو پرورش دینے کی بجائے ایک مرتبہ مسلمان کی پوزیشن کیوں نہیں سمجھ لیتے اور اس کی ان "مجبوریوں" پر نگاہ کیوں نہیں رکھتے جو اس پر قانون خداوندی کی شکل میں مسلط ہیں اور جن "مجبوریوں" کے اندر درحقیقت اس کی "آزادی" کا راز پوشیدہ ہے +

یہ ہے بنا مسلمانوں کے واحد نمائندہ جناب محمد علی جناح کے بنیادی مطالبات کی جنہیں دیکھ کر ایک سچا مسلمان صدائے تحسین بلند کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس مرد حق آگاہ کی دقیقہ رس اور دوربین نگاہیں حقائق قرآنی کو کس طرح حالات حاضرہ کی مطابقت میں پیش کر رہی ہیں۔ مسلمان عام طور پر سمجھتا ہے کہ قرآن جبہ و عمامہ میں لپٹا رہتا ہے لیکن اس ہیٹ اور پتلون کے ساتھ روح قرآنی کی اس انداز سے ترجمانی۔ بلا ساختہ سعدی کے یہ الفاظ سامنے آتے ہیں کہ:- درویش صفت باش و کلاہ تتری پوش۔ دیکھنے والی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں کہ مسٹر جناح

اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

طلوعِ اسلام ۴۱ اگست ۱۹۳۸ء

وارْدھا کی تعلیمی سکیم اور مسلمان

(ایک عظیم الشان خطرہ سے آگاہی)

(رازی)

تمہید

تاریخِ عالم کے زمانۂ قدیم پر نگہ ڈالئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ قوت و سطوت کی مالک قومیں دوسری قوموں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے قتل و غارتگری اور کشت و خون کے کیا کیا طریقے اختیار کرتی ہیں چنگیز خان و ہلاکو کی خونچکاں داستانیں صفحاتِ تاریخ پر خون کے حروف میں لکھی ملتی ہیں، فرعون و نمرود، شداد و ہامان کے جور و استبداد کے واقعات پڑھنے والے کی روح میں کپکپی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ دَورِ جہالت تھا، علانیہ سبعیت و بربریت کا زمانہ تھا، عصرِ حاضر کا مہذب انسان اس دَورِ وحشت کو سخت نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنے زمانہ کو خدا کی برکتوں اور رحمتوں کا زمانہ سمجھتا ہے کہ جس میں قتل و خونریزی کی وہ داستانیں نہیں دہرائی جاتیں جن میں انسانیت تڑپتی، بلکتی، پھڑکتی نظر آئے، لیکن جو لوگ حقائقِ اشیاء کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں اُن پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ عصرِ حاضر کا مہذب انسان بھی دوسروں کی ہلاکت اور بربادی میں عہدِ جہالت کے وحشی انسان سے کسی حالت میں کم نہیں ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ وہ عہدِ جہالت تھا جس میں انسان نے ابھی یہ نہ سیکھا تھا کہ اپنی ستم کوشیوں اور ظلم رانیوں کو کس طرح اصلاح و بہبود کے خوش آئند نقاب اڑھائے وہ جو کچھ کرتا تھا کھلم کھلا کرتا تھا، بتا کر، جتا کر، دکھا کر کرتا تھا لیکن آج انسان عقل و حکمت میں بہت ترقی کر چکا ہے۔ آج اسی طرح کھلم کھلا اپنی ہوسِ خون آشامی کو پورا کرنا حماقت سمجھا جاتا ہے آج سب سے زیادہ مدبر، سب سے زیادہ ہوشیار وہ ہے جو

دوسروں کا خون اس انداز سے پی جائے کہ اس کا دھبہ تک کہیں نظر نہ پڑے، وہ دوسروں کی متاعِ حیات کو اِس مشفقانہ انداز سے لوٹ لے کہ اسیرِ رہزن و قزاق ہونے کا شبہ تک نہ ہو، وہ ناصح و مصلح کے معصوم لباس میں قوم کی قوم کو تباہ کر جائے دریں حالت کہ لٹنے والوں کو پتہ ہی نہ چلے کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے، دَورِ جہالت کا وحشی اور ظالم انسان آج تک بدنام چلا آتا ہے کہ اس کے جور و ستم کی ہلاکت آفرینیاں گویا ایک طوفانِ بلاخیز ہیں جو کف بردہاں بڑھتا، اُمڈتا بپھرتا چلا آتا ہے کہ جس کی طغیانیوں کو اندھے بھی دیکھتے ہیں اور جس کی شور انگیزیوں کو بہرے بھی سنتے ہیں۔ لیکن دورِ حاضر کے مہذب انسان کی استہلاک و تخریب کی چالیں ایک پُرسکوت دریا کی مانند ہیں کہ جس کی روانیوں میں نہ شور ہے نہ تموّج۔ لیکن سطحِ آب کے نیچے ایسے ایسے خوفناک مگرمچھ . . . . چھپے چلے آتے ہیں کہ قوم کی قوم کو تباہ کر دیں لیکن نہ دیکھنے والی آنکھیں دیکھ سکیں اور نہ سننے والے کان سُن سکیں، اس پرسکوت طریقِ تخریب اور اس آتشِ خاموش میں سب سے بڑا حصہ تعلیم کو حاصل ہے۔ آپ جس قوم کو تباہ و برباد کرنا چاہیں، نہایت خاموشی سے اُس کے طریقِ تعلیم کو بدل دیجئے۔ وہ رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر ہلاکت و بربادی کے عمیق و مہیب غاروں میں کھنچی چلی جائے گی اور اُسے پتہ اُسوقت چلے گا جب وہ سکراتِ موت کی ہچکیاں لے رہی ہو گی حضرت اکبر مرحوم نے اس جانکاہ حقیقت کو کس قدر بلیغ اور اپنے مخصوص انداز میں بیان فرمایا ہے کہ ؂

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!

انگریزوں کا طرزِ عمل

جب ہندوستان میں انگریزوں کے پاؤں جمنے شروع ہوئے تو انھوں نے سب سے پہلے مسئلہ تعلیم ہی کو لیا۔ لارڈ میکالے کی مشہور و معروف کمیٹی کی روئداد کسکی نگاہ سے پوشیدہ ہے۔ سوال یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم دی جائے یا نہیں خود انگلستان میں اس مسئلہ کے موافق و مخالف

طلوعِ اسلام ۴۳ اگست ۱۹۴۰ء

دو پارٹیاں بن گئی تھیں، سوال اتنی اہمیت اختیار کر گیا تھا کہ جب تک حل نہ ہوا کسی کو چین نہ پڑا ہندوستانی دل میں سمجھتے ہونگے کہ اللہ میاں نے کیسے فرشتوں کو ہم پر حکومت کرنے کے لیے بھیجا ہے جو ہماری تعلیم کے لیے یوں گھلے جا رہے ہیں، وہ جماعت جو انگریزی تعلیم کے مخالف تھی اُنکے دلائل بڑے قوی تھے۔ لیکن لارڈ میکالے نے اُس کے خلاف ایک ایسی محکم دلیل پیش کی کہ جس کے سامنے فریقِ مخالف کے تمام دلائل دھرے کے دھرے رہ گئے، اُس نے کہا کہ انگریزی تعلیم دینے سے آہستہ آہستہ ہندوستانی ایک ایسی قوم میں تبدیل ہو جائیں گے جو رنگ اور نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوگی لیکن خیالات رُجحانات، تہذیب، معاشرت کے لحاظ سے یکسر مغربی ہوگی اور یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی قوم اپنی مخصوص تہذیب و تمدّن کو کھو بیٹھے تو وہ ایک ایسا جسم بنکے رہ جاتی ہے۔ جس سے رُوح پرواز کر چکی ہو۔ چنانچہ اس دلیل کو بڑا وزندار سمجھا گیا اور ۱۸۳۵ء میں فیصلہ ہو گیا کہ ذریعۂ تعلیم انگریزی ہونا چاہیئے۔ یہ تو تھا بُنیادی مسئلہ اب یہ معاملہ پیش ہوا کہ اس طریقِ تعلیم میں جاذبیت کیسے پیدا کی جائے۔ تو اس کے لیے ۱۸۴۴ء میں لارڈ ہیسٹنگز نے اعلان کر دیا کہ مُلازمت میں ترجیح اس کو دی جائے گی جو انگریزی جانتا ہو یعنی جس طرح کُنین تلخ کرنے کے زہر کو حلوے میں لپیٹ کر دیا جاتا ہے اسی طرح اس تعلیم کو روٹی میں لپیٹ کر پیش کیا گیا، ہندوؤں پر تو اس طریقِ تعلیم کا کوئی مُضر اثر نہیں ہو سکتا تھا کہ اُن کی کوئی مخصوص تہذیب نہیں، تمدّن نہیں۔ مذہب نہیں اس لیے اُن سے چھین کیا سکتا تھا، اُن کو نقصان کچھ نہ ہوا اور روٹی ضرور مل گئی۔ لیکن مُسلمان پر اس کا کیا اثر ہوا۔ یہ ہم سے نہیں خود ایک فاضل انگریز سے سُنیئے کہ اس طرح بتدریج اسلامی ہندوستان دارالحرب بنا دیا گیا اور ایک عظیم الشّان روایات کی حامل قوم دُنیا میں یوں بے وقعت کر کے رکھ دی گئی۔ [1]"

ہندو ذہنیت

وہ دَور اب ختم ہو رہا ہے۔ حکومت اور قوت رفتہ رفتہ انگریز کے ہاتھ سے چھین کر ہندو اکثریت

[1] THE INDIAN MUSSALMANS _ by Dr. W. W. HUNTER.

کے ہاتھ میں منتقل ہو رہی ہے، مسلمان کی تخریب اور بربادی میں جو کچھ انگریز نے کیا وہ سارا نقشہ ہندوؤں کے سامنے ہے اور چونکہ ہندو نے سیاست سیکھی ہی انگریز سے ہے اس لیے — آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم — جو کچھ اُن کے اُستادوں نے کیا وہی کچھ یہ کر رہے ہیں اور کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں ایک گروہ تو ڈاکٹر مونجوں اور بھائی پرمانندوں کا ہے جو علانیہ کہتے پھرتے ہیں کہ بھارت ماتا کی پوتّر بھومی ان ملیکش مُسلمانوں کے چرنوں سے اپوتر نہیں رکھی جاسکتی۔ انہیں یا تو ہندو بن کر رہنا ہوگا یا عرب کی طرف چلے جانا پڑے گا لیکن یہ طریقِ کار اس دورِ جاہلیت سے ملتا جلتا ہے جس کا ذکر ہم شروع میں کر آئے ہیں۔ اس لیے انہی میں کا دوسرا گروہ اِس طریقِ کار کو ترجیح دیتا ہے جو دورِ "تہذیب" کی ایجاد ہے، اور جس پر انگریز عمل پیرا رہا ہے، یعنی وہ ایک ناصحِ مشفق بنتا ہے وہ ایک سادہ منش، خدا رسیدہ، مہاتما کا چولا پہنتا ہے اور ایسا ہم رنگِ زمین دام بچھاتا ہے کہ بھولے بھالے پرندے سمجھ بھی نہیں سکتے کہ یہاں کوئی پھانسنے کی ترکیب بھی کر رکھی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مہاتما گاندھی ایک عرصہ سے اپنے آپ کو عملی سیاست سے الگ بتا رہے ہیں حتیٰ کہ جب کانگریس کے کسی طرزِ عمل کے متعلق ان سے شکایت کی جاتی ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ بابا! میں تو "چار آنہ والا" ممبر بھی نہیں ہوں۔ میں ایشور بھگتی میں لگا ہوا ہوں، مجھے دُنیا داروں کے ان جھگڑوں سے کیا واسطہ۔ جب انھوں نے عملی سیاست کو چھوڑا تو سب سے پہلے اچھوتوں کے "ادھار" (اصلاح) کی اسکیم کو ہاتھ میں لیا۔ انھوں نے دیکھ لیا کہ آئندہ ہندوستان کا نظامِ حکومت جمہوری ہوگا جس میں تمام امور کا فیصلہ کثرتِ رائے، یعنی آبادی کے شمار کے اعتبار سے ہوگا جو قوم تعداد میں زیادہ ہوگی وہی حکومت کرے گی۔ اچھوتوں کے ساتھ جو سلوک ہندوؤں نے روا رکھا ہے وہ خود ان بیچاروں کی حالت سے ظاہر ہے۔ آج چونکہ عام بیداری کا زمانہ ہے اس لیے اچھوتوں نے بھی اپنی ذلت و خواری کا احساس کیا۔ مہاتما جی کو فکر لاحق ہوگئی کہ اگر انھوں نے ان مظالم کے انتقام کے طور پر جو ہندوؤں نے صدیوں سے ان پر توڑ رکھے ہیں، یہ فیصلہ کر لیا کہ یہ ہندوؤں سے الگ ہوتے ہیں تو سوراج کس کام کا۔ فوراً نوعِ انسانی کی ہمدردی کی رگ اُن کے تیئس دماغ جسم میں پھڑک اُٹھی،

طلوعِ اسلام ۴۵ اگست ۱۹۳۸ء

پست وزبوں حال اچھوت کی دکھ بھری داستان نے ان کا جگر خون کر دیا۔ اُن پر راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا۔ پونہ میں پران تیاگ برت رکھا گیا اور جب تک یقین نہیں ہو گیا کہ اچھوت مردم شماری کے رجسٹر میں اپنے آپ کو ہندو ہی لکھوائیں گے کسی اور طرف توجہ ہی نہیں کی، یہ مہاتما جی کی زندگی کا پہلا نصب العین ہے۔ اس کے بعد ایک اور اہم مسئلہ ان کے سامنے آیا۔ وہ بساطِ سیاست کو بڑی گہری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ جب تک ملک کی زبان ہندی نہیں ہو جاتی اقلیتیں اکثریت کے اندر جذب نہیں ہو سکتیں، زبان کا مسئلہ کس قدر اہم ہے اس کا ذکر ہم آگے چلکر کریں گے۔ اس مسئلہ میں جب انہیں اطمینان ہو گیا کہ ہو گا وہی جو وہ چاہتے ہیں تو اب ایک قدم اور آگے بڑھے، وہی چیز جو میکالے کے وقت میں انگریز کے پیشِ نظر تھی۔ وُہی اِن کے سامنے آئی۔ انگریز کی سیاست نے انہیں خوب بتا رکھا تھا کہ یاد رکھو جو قوم اپنی تہذیب۔ کلچر، مذہب کو الگ رکھنے کی متمنی ہو اُسے علانیہ شدھ کرنے کو نہ اُٹھو بلکہ طریقِ تعلیم بدل دو۔ تھوڑے عرصے کے بعد وہ خود بخود شدھ ہو جائے گی۔ چنانچہ اس چیز کے پیشِ نظر مہاتما جی نے آزاد ہندوستان کے لیے ایک تعلیمی اسکیم کے اُصول وضع کئے جسے واردھا اسکیم کہتے ہیں۔ اور ان اصولوں کی فروعات وجزئیات مرتّب کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنادی، چونکہ خطرہ تھا کہ مسلمان اعتراض کریں گے کہ ہندوؤں کی وضع کردہ اسکیم اُن پر کیوں نافذ کی جارہی ہے۔ اس لیے اس کمیٹی کے صدر جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے پرنسپل' جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب متعیّن کر دیے گئے، اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ مرتّب کی جو رسالہ جامعہ بابت ماہ جنوری ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی ہے، یہی وہ رپورٹ ہے جس کے متعلق ہم نے دیکھنا ہے کہ اس طریقِ تعلیم کا مسلمانوں پر کیا اثر پڑے گا۔ اور مسلمان مذہبی نقطۂ نظر سے اُسے کس حد تک تسلیم کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ دنیا کا کوئی معاملہ ہو ایک مسلمان کے لیے لازمی ہے کہ اسے قرآنِ کریم کی میزان سے تولے اور جو فیصلہ اُس بارگاہ سے ملے۔ اُسے اپنے لیے قولِ فیصل سمجھے کہ:۔

مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ۝

جو شخص معاملات کا فیصلہ قرآنِ کریم کی رُو سے نہیں کرتا اُسے اسلام سے کوئی واسطہ

نہیں، وہ کفار کے زمرے میں شامل ہے +

ہمیں اس سے نہ مہاتما گاندھی کی ذاتی مخالفت مقصود ہے نہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی ہم تو یہ جانتے ہیں کہ موجودہ وقت، سیاستِ ہند میں ایک بڑا نازک وقت ہے۔ سابقہ حکومت کا طلسم ٹوٹ رہا ہے۔ اور اس کی جگہ مقدرات کے نئے نئے ستارے منصۂ شہود پر آرہے ہیں مسلمان سابقہ دورِ حکومت میں جس قدر نقصان اٹھا چکا ہے اس کا تقاضا ہے کہ ایسے وقت میں جب کہ مستقبل کے لیے اس کی قسمتوں کے فیصلے ہو رہے ہیں۔ یہ سوچے، غور کرے کہ میرے ساتھ اب کیا ہونے والا ہے، یہی وہ جذبہ ہے جسے ہمیں مجبور کیا ہے کہ ہم اس تعلیمی اسکیم کو خالص قرآنی نقطۂ نگاہ سے دیکھیں، اور ہمیں جہاں جہاں خطرات پوشیدہ ملیں، انہیں بے نقاب کر کے مسلمان کے سامنے رکھ دیں تاکہ اُسے معلوم ہو جائے، کہ اب کس طرح

میری بربادیوں کے تذکرے ہیں آسمانوں میں

متحدہ قومیت کی تشکیل

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ مستقبل کے ہندوستان میں ہندوؤں کے ارادے کیا ہیں۔ تحریکِ آزادی کا مطمحِ نگاہ کیا ہے۔ تفصیل تو اس کی طول طویل ہے لیکن دو لفظوں میں ہندوؤں کا اس سے مقصود یہ ہے کہ "ہندوستان میں ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ایک متحدہ قوم پیدا ہو" پنڈت جواہر لال نہرو۔ مضمون مطبوعہ رسالہ جامعہ بابت اکتوبر ۱۹۳۶ء) یہ متحدہ قوم پیدا کیسے ہوگی۔ اس کے لئے یو۔ پی کے وزیر تعلیم سوامی سمپورنانند کی وہ تقریر ملاحظہ فرمایئے جو گزشتہ اپریل انھوں نے تعلیم کے موضوع پر فرمائی تھی جس کے دوران میں وہ کہتے ہیں۔

"ہر وہ شخص جو ہندو یا مسلم تہذیب کے قایم رکھنے اور اس کو مدارس میں جاری کرنے پر زور دیتا ہے، وہ یقینی طور پر ملک کو نقصان پہونچاتا ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ چیز ہندوستان میں مفقود ہونی چاہیئے۔ ... جب ہندو مسلم تہذیبیں مٹ

طلوع اسلام ۴۷ اگست ۱۹۴۹ء

جائیں گی تب ہی ہندوستانی تہذیب زندہ رہ سکے گی۔" (بحوالہ ٹریبیون و مدینہ)

ایک دفعہ پھر سُن لیجئے کہ ہندوؤں کی کوئی مخصوص تہذیب نہیں۔ کوئی مذہب نہیں۔ اس لیے آپ جب کبھی یہ سُنیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مخصوص تہذیب کو مٹا دیا جائے تو بلا تامل سمجھ لیجئے کہ اس سے مقصود مسلمانوں کی تہذیب، مذہب کو مٹانا مقصود ہے، ہندو کا لفظ ساتھ اس لیے چپکا کر دیا جاتا ہے کہ مسلمان بدک نہ جائیں۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ جب ہندوؤں کی کوئی تہذیب نہیں، کوئی مذہب نہیں تو ان کا مٹے گا کیا۔ یہ ہم نہیں کہتے کہ ہندوؤں کا کوئی مذہب نہیں کوئی تہذیب نہیں، خود ہندوؤں سے سنیئے:-

"ہندو مت کے دائرے میں بے حد مختلف اور متضاد خیالات اور رسوم داخل ہیں اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندو مت پر صحیح معنی میں لفظ مذہب کا اطلاق ہی نہیں ہوتا..... ممکن ہے کہ ایک شخص کھلم کھلا خدا کا منکر ہو (جیسے قدیم فلسفی چارک) لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں ہندو مت اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں برہمن پیدا ہوا تھا اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور اعمال کچھ ہی ہوں" (پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشت سوانحمری ترجمہ اُردو جلد اوّل صفحہ ۲۰۲-۲۰۳)

تو آپ سمجھ گئے کہ ہندوؤں کے پیش نظر سب سے مقدم یہ مسئلہ ہے کہ مسلمان کی الگ مخصوص تہذیب کو مٹا دیا جائے، تاکہ یہ متحدہ قومیت میں جذب ہو جائے اور اس طرح ایک ایسی قوم کا وجود عمل میں آجائے جو نام کے اعتبار سے تو مسلمان رہے لیکن تہذیب و تمدن۔ خیالات، رجحانات، معاشرت کے لحاظ سے خالص ہندی ہو، وہی نظریہ جو میکالے کے سامنے تھا اور جس کے حصول کے لیے انگریزی طریق تعلیم کو اختیار کیا گیا تھا۔ اب اسی مقصد کے حصول کے لیے ایک نیا طریق تعلیم آسمانِ وارد ھا سے الہام کی شکل میں نازل ہوا ہے جس کی تشریح شیخ الجامعہ نے فرمائی ہے۔ یہ بھی آپ نے دیکھ لیا ہے کہ

طلوعِ اسلام ۴۸ اگست ۱۹۳۸ء

میکالے اسکیم میں کشش پیدا کرنے کے لیے روٹی کی جاذبیت چھپائی گئی تھی، وارودھا اسکیم کی بنیاد بھی روٹی پر رکھی گئی ہے شروع سے اخیر تک اس اسکیم میں روٹی اور روٹی ہی کا شور ہے۔ یعنی مقصدِ اوّلیں تو یہ ہے کہ اس طریقِ تعلیم سے مسلمانوں کو ان کے مذہب اور اسلامی فلسفۂ زندگی سے بیگانہ بنا دیا جائے اور اس طرح ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت کا وجود عمل میں آجائے لیکن جو نصاب تجویز ہُوا ہے اس میں بظاہر بنیادی چیز صنعت و حرفت کی تعلیم رکھی گئی ہے، تاکہ نگاہیں اس حصّہ کے فوائد میں اُلجھ کر رہ جائیں اور دوسرے حصّہ کے نقصانات کیطرف توجہ نہ ہونے پائے، چنانچہ نصابِ تعلیم میں ساڑھے پانچ گھنٹے میں سے ساڑھے تین گھنٹے کے قریب دستکاری کی تعلیم کے لیے رکھے گئے ہیں۔ اس سے آپنے اندازہ فرمالیا ہوگا کہ جہاں تک مسلمانوں کی ملّی خصوصیات مٹانے کا تعلق ہے ہندو کس طرح انگریز کے قدم بقدم جا رہا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ انگریز نے جو کچھ کیا اُسکے نتائج کا نام غلامی تھا اور ہندو جو کچھ کر رہا ہے اس کا نام حصولِ آزادی رکھا گیا ہے۔ انگریز جنکے توسط سے یہ کچھ کراتا تھا انکا نام ٹوڈی تھا لیکن ہندو جنکے ہاتھوں سے یہ کچھ کراتا ہے وہ محبِّ وطن اور خادمِ ملّت کہلاتے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ:۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللٰہی، وہی مرحبی وہی عنتری

غیر مسلم کی راہ نمائی

یہ طویل تمہید اس لیے ضروری تھی کہ جب تک کسی تحریک کا پس منظر (BACK GROUND) آپکے سامنے نہ ہو آپ پر اس کے صحیح اثرات و نتائج واضح نہیں ہو سکتے۔ اسکیم زیرِ نظر میں سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ وہ مسلمان جو دُنیا کی امامت کے لیے پیدا کیا گیا تھا اس کی آج حالت یہ ہو چکی ہے کہ وہ دُنیا کی ہر شاہراہ پر غیر مسلموں کی راہ نمائی کا محتاج ہو چکا ہے، "غلام" مسلمان اپنی ہدایت و راہ نمائی کے لیے سمائے شملہ و لندن کے "الہامات" کا منتظر رہتا تھا۔ اب "آزاد" مسلمان اپنی ہدایت کے لیے واردھا اور آنند بھون کے دیوی دواروں کیطرف کان لگائے رہتا ہے انگریز نے اس

کے کسی فیصلے یا ہدایت کی دلیل مانگنا آئینِ وفا شعاری کے خلاف تھا کہ اس کے فیصلوں کی صحت کی دلیل اس کا "اقبالِ حکومت" تھا۔ گاندھی جی سے ان کے فیصلوں یا ہدایات کی دلیل مانگنا خلافِ رسمِ پرستاری ہے کہ اُنکے ہر فیصلے کی صحت کی دلیل وہ "اندرونی روشنی" ہے جس کی بنا پر انہیں معصوم عن الخطار۔ ما فوق البشر انسان۔ یعنی اوتار سمجھا جاتا ہے۔ انگریز کی غلامی استبداد کی غلامی تھی۔ گاندھی جی کی غلامی عقیدت کی غلامی ہے مسلمان کے لیے نتیجہ دونوں کا وہی ذلت و پستی ہے جسے جذبۂ مرعوبیت (INFERIORITY COMPLEX) کہتے ہیں چنانچہ جناب ڈاکٹر صاحب ممدوح اپنی رپورٹ کو مہاتما جی کے رُوبرو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

"ہم یہ رپورٹ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے سچے دل سے اُمید کرتے ہیں کہ آپ کی رہنمائی میں یہ اسکیم ہمارے ملک میں تعلیم کے ایک اچھے نظام کی بنیاد ثابت ہوگی" (صفحہ ۱۰۸)

تعلیم کے بنیادی اُصولوں کی تمہید میں رقمطراز ہیں:-

"اور میدانوں کی طرح اس میدان میں بھی مہاتما گاندھی کی سوجھ بوجھ اور رہنمائی آڑے وقت میں ہمارے کام آئی" (صفحہ ۱۱۱)

اللہ اکبر! وہ مسلمان جس کے متعلق ارشاد تھا کہ کنتم خیر اُمّتٍ اخرجت للناس۔ تم نوعِ انسانی میں بہترین قوم ہو۔ جس کی شان یہ تھی کہ وکذالک جعلناکم اُمّۃً وسطاً لتکونوا شہداء علی الناس۔ اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بہترین قوم بنا دیا تاکہ تمام نوعِ انسانی کے اعمال کے نگران رہو۔ جس کا مرتبہ یہ تھا کہ انتم الاعلون۔ تم ہی دُنیا میں سب سے بلند و بالاتر ہو۔ جسکے مونسِ اعلیٰ کے متعلق ارشاد تھا کہ انّی جاعلک للناس اماما۔ ہم نے تمہیں انسانوں کا امام، پیشرو، لیڈر بنایا ہے۔ جن کو حکم تھا کہ "دیکھنا غیر مسلموں کے خیالات کی اتباع نہ کرنا وہ تمہیں گمراہ کر دیں گے"۔ ان مسلمانوں کی آج حالت

یہ ہے کہ اپنے بچوں کی تعلیم کے مسئلہ کے حل کے لئے ایسے لوگوں کے دست نگر ہیں
جو روحِ اسلام سے یقیناً بیگانہ ہیں جس مومن کی شان تھی کہ:۔

موئے بالائے ہر بالا ترے ؛ غیرتِ او برنتابد ہمسرے

وہ مومن ایسے انسانوں سے ہدایت کا طالب ہے جن کی عقل آج تک انہیں اتنا بھی نہیں
بتا سکی کہ ایک مٹی کے بت کے سامنے ماتھا ٹیکنا کوئی شرفِ انسانیت نہیں ہے، یہ پستیوں کی حد
نہیں تو اور کیا ہے۔"

اصل رپورٹ

رپورٹ زیرِ نظر کے مطابق یہ نیا طریقِ تعلیم سات برس سے چودہ برس کے لڑکے اور لڑکیوں
کے لیے لازمی ہوگا (ص۱۳) یعنی کسی شخص کو یہ اختیار حاصل نہ ہوگا کہ جب اس کی لڑکی یا لڑکا سات
برس کا ہو جائے تو اُسے اس اسکول میں نہ بھیجے جس میں یہ طریقِ تعلیم رائج ہو۔ یہ تعلیم جبری ہوگی،
انگریز نے اپنے طریقِ تعلیم کو جبری نہیں بنایا تھا۔ یہ کمی اب سوراج کے زمانہ میں پوری ہوگی۔

اب سب سے پہلے اس نصاب کو دیکھ لیجئے جو اس اسکیم کی رُوح سے مرتب کیا گیا ہے۔

۱۔ بنیادی دستکاری .... ۳ گھنٹہ۔ ۲۰ منٹ
۲۔ گانا۔ ڈرائنگ اور حساب .... ۴۰ منٹ
۳۔ مادری زبان .... ۴۰ منٹ
۴۔ سماج کا علم اور عام سائنس .... ۳۰ منٹ
۵۔ کسرت .... ۱۰ منٹ
۶ بیچ کا خالی وقت .... ۱۰ منٹ

میزان ..... ۵ گھنٹے ۳۰ منٹ (ص۱۳۲-۱۳۱)

آپ کو یہ نصاب بڑا معصوم سا نظر آئے گا۔ اس میں بظاہر کوئی چیز ایسی نہیں جس سے مسلمانوں

کو خواہ مخواہ خطرات کا اندیشہ ہو۔ لیکن یہ خطرات اس نصاب کی تفصیل کے اندر ہیں، آپ نے یہ تو دیکھ ہی لیا ہوگا کہ اس نصاب میں مذہب کا کہیں نام نہیں۔ خود گاندھی جی اور اس اسکیم کے مرتب کرنے والے بھی اعلان کر رہے ہیں کہ ہمنے مذہب کو اس اسکیم سے بالکل الگ رکھا ہے لیکن جب ہم اس نصاب کی تفصیل کو دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ مذہب کا عنوان تو اس میں کہیں نہیں لیکن مسلمانوں کا مذہب اور ان کی تہذیب مٹانے کے لیے اس میں سب کچھ ہے لیکن وہ کچھ اس انداز سے رکھا گیا ہے کہ تا وقتیکہ گہری نظر سے نہ دیکھا جائے، اس کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں لگ سکتا۔ اس کا تجزیہ کرنے کے لیے اس اسکیم کو چار اہم عنوانات کے ماتحت مختلف ابواب میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(اول) مذہب کا مسئلہ جو بمنزلہ رُوح ہے۔

(دوم) فلسفۂ زندگی کا مسئلہ جو تہذیبِ اسلامی کی اصل ہے۔

(سوم) زبان کا مسئلہ جس پر کسی قوم کے کلچر (ثقافت) کا انحصار ہے۔

(چہارم) معاشرتی زندگی جو کسی قوم کے رجحانات قلبی و ذہنی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

ان مسائل پر مختلف ابواب میں آیندہ صحبتوں میں بحث کی گئی ہے مسئلہ اول و دوم چونکہ مقابلتہً زیادہ اہم اور پیچیدہ ہیں۔ اس لیے انپر نسبتاً شرح و بسط سے تبصرہ کیا جائے گا۔ شق سوم ایک الگ مضمون کی محتاج ہے۔ اور شق چہارم میں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ وَمَا تَوفِیقِی اِلَّا بِاللّٰہ

باب اوّل

مذہب کا مسئلہ

نصاب میں جو عنوان "سماج کا علم" ہے اس کی تفصیل رپورٹ کے صفحات ۱۱۸، ۱۱۹ پر دی ہوئی ہے، مذہب کے متعلق اس میں لکھا ہے۔

"دنیا کے مذہبوں کے اصول بتا کر یہ ثابت کیا جائے کہ خاص خاص باتوں میں سب مذہب ایک ہیں" (ص ۱۱۹)

اس اجمال کی تفصیل کے لیے وہ بیان ملاحظہ فرمایئے جو مہاتما گاندھی نے اخبارات میں شائع کیا ہے۔ یہ بیان ایک وفد کے سوالات کے جواب میں شائع ہوا ہے جو یہ دریافت کرنے کے لئے مہاتما گاندھی کے پاس گیا تھا کہ واردھا اسکیم میں مذہب کی کیا پوزیشن ہوگی۔ آپ نے فرمایا:-

"ہم نے واردھا اسکیم میں سے مذہبی تعلیم کو خارج کر دیا ہے کیونکہ ہمیں خطرہ ہے کہ جس طرح مذہب کی آجکل تعلیم دی جاتی ہے اور اس پر عمل کیا جاتا ہے، وہ بجائے اتحاد کے اختلافات پیدا کرتے ہیں لیکن اس کے برعکس میرا یہ خیال ہے کہ سچائیاں جو ہر ایک مذہب میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہیں، بچوں کو پڑھائی جا سکتی ہیں اور ضرور پڑھائی جانی چاہئیں۔ یہ سچائیاں الفاظ یا کتابوں کے ذریعے سے پڑھائی نہیں جا سکتیں۔ بچے ان سچائیوں کو اپنے استاد کی روزانہ زندگی سے سیکھ سکتے ہیں۔ اگر وہ استاد خود مذہب کی سچائیوں کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہو۔ صرف اسی صورت میں بچے یہ سیکھ سکتے ہیں کہ واقعی سچائیاں اور عدل و انصاف تمام مذاہب کے بنیادی اصول ہیں"

جب یہ سوال کیا گیا کہ سات سے چودہ برس کی عمر کے بچے تمام مذاہب کی یکساں عزت کرنا سیکھ سکیں گے، تو مہاتما جی نے فرمایا:-

"ہاں۔ میرا خیال ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت کہ تمام مذاہب اہم اصولی

باتوں میں بالکل ایک جیسے ہیں (بچوں کے دل میں یہ بات پیدا کر دیں گے) کہ وہ دوسروں کے مذہب کی بھی ایسی ہی عزت کریں جیسی اپنے مذہب کی کرتے ہیں یہ بڑی سادہ سی سچائی ہے اور سات برس کے بچے اسے آسانی سے سیکھ سکتے ہیں اور اس پر عمل کر سکتے ہیں لیکن سب سے مقدم یہ ہے کہ اُستاد خود ایسا ہی عقیدہ رکھتا ہو" (نیشنل کال مورخہ ۸ / جون ۱۹۳۸ء)

بظاہر یہ اصول آپ کو بڑی وسعتِ نظر، کشادہ ظرفی پر مبنی نظر آئے گا، لیکن یہی وہ خطرناک گھاٹی ہے جہاں مسلمانوں کا مذہب تباہ کیا جائیگا، یاد رکھیے، مہاتما گاندھی اپنے الفاظ کے انتخاب میں بڑے ہوشیار واقع ہوئے ہیں، ان کی سطح ساکت وصامت دریا کی روانیوں کی طرح ہوتی ہے لیکن اُن کے نیچے بڑے بڑے خطرناک اژدہے چھپے ہوتے ہیں سطح بین نگاہیں اُن کی نظر فریب کشش سے دھوکا کھا جاتی ہیں جو سطح سے ذرا نیچے اُتر جائیں۔ اُنہیں وہ خطرات بے نقاب نظر آجاتے ہیں وہ عظیم الشان سازش، جو ان الفاظ کی معصومیت کے اندر نقاب پوش ہے۔ اُسے بے نقاب کرنے کے لئے ہمیں ذرا تفصیل سے کام لینا ہوگا۔

مذہب کی تشریح

مذہب میں ایک تو وہ مہمات اُصول ہوتے ہیں جن پر اعتقاد کا دار و مدار ہوتا ہے۔ ان اُصولوں کو ایمانیات کہا جاتا ہے۔ دوسری چیز ان اصولوں کی تفصیلات میں قوانین، عبادات، مناسک، شعائر یعنی ظواہر ہوتے ہیں جنہیں شریعت کہا جاتا ہے۔ ایمانیات یعنی اصولوں کا تعلق قلب و دماغ سے سمجھنے سمجھانے سے ہوتا ہے اس لیے یہ غیر محسوس ہوتے ہیں لیکن مذہب کی بُنیاد انہی پہ ہوتی ہے۔ ظواہر کا تعلق اعمالِ حیات سے ہوتا ہے۔ اس لئے وہ محسوس ہوتے ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ دو مختلف مذاہب، مثلاً اسلام اور ہندو مت میں شرع و منہاج کا فرق تو محسوس فرق ہے، کون نہیں جانتا کہ مسلمانوں کے طریقِ نماز اور ہندوؤں کی پوجا پاٹ میں کس قدر اختلاف ہے،

ان محسوس و مشہود اختلافات کی موجودگی میں کسی کے سامنے یہ کہنا کہ اسلام اور ہندومت دونوں یکساں مذہب ہیں، اپنی ہنسی اُڑانا ہے، اس لیے جہاں تماگاندھی نے اس چیز کو تو چھوا نہیں البتہ اس کے متعلق یہ بات ذہن نشین کرادی کہ یہ محسوس اختلافات کوئی اہم باتیں نہیں ہیں۔ ثانوی (SECONDARY) چیزیں ہیں اصل مذہب تو وہ اصول ہیں جن کو وہ عالمگیر سچائی کہتے ہیں، یہ چونکہ غیر محسوس ہیں، ان کا اختلاف آنکھوں سے دیکھا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا یہ اعلان کردیا کہ جہاں تک مذہب کے اُصولوں کا تعلق ہے اسلام اور ہندومت بالکل یکساں مذہب ہیں، دونوں میں اصولی سچائیاں ایک جیسی ہیں اسلام کو ہندومت پر کوئی برتری اور تفوّق حاصل نہیں۔ یہ دعوے بڑا آسان ہے اس لیے کہ ایمانیات کا فرق، اُصولی سچائیوں کا اختلاف محسوس شے نہیں مثلاً مسلمان بھی خدا پرست ہے اور ایک ہندو کو بھی دعوے ہے کہ وہ خدا کو مانتا ہے، اس لیے اس اصولی مسئلہ میں دونوں یکساں ہیں، سطح بیں نگاہیں فوراً اس دھوکے کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس چیز کو ثابت کرنے کے لیے کہ ہندو کی خدا پرستی اور مسلمان کی خدا پرستی میں کیا فرق ہے دونوں مذاہب کی مزعومہ یا حقیقی آسمانی کتابوں میں سے خدا کے تصوّر کو واضح طور پر سمجھانا پڑے گا یہ ذرا مشکل مرحلہ ہے اور ہر شخص کے ذہن میں یہ بُنیادی فرق راہ چلتے نہیں بٹھایا جا سکے گا، لہٰذا یہ وہ مقام ہے جہاں نہایت آسانی سے دھوکا دیا جا سکتا ہے، عیسائیت کو اسلام سے ہمیشہ یہی خطرہ رہا کہ عقائدِ اُصول میں جب دونوں کا باہمی موازنہ ہوگا تو عیسائیت ایک سکنڈ کے لیے بھی سامنے ٹھہر نہ سکے گی۔ اس لیے انھوں نے ہمیشہ حقائق کو چھوڑ کر خالی جذبات کی راہ سے اسلام کا مقابلہ کرنا چاہا۔ ہندوؤں کو معلوم ہے کہ ایمانیات یعنی اُصولِ مذہب میں جب کبھی ہندومت اسلام کے سامنے آیا تو وہ مت شیشہ کی طرح چُور چُور ہو جائے گا۔ اس لیے ہندوؤں نے اپنی اس بُنیادی کمزوری کو چھپانے کے لیے مُدّت سے یہ روش اختیار کر رکھی ہے کہ یہ مشہور کیا جائے کہ بنیادی اصل سچائیوں کے لحاظ سے تمام مذاہب ایک جیسے ہیں کسی میں کچھ فرق نہیں کسی کو دوسرے پر بڑائی حاصل نہیں، فرق صرف ظواہر یعنی شریعت میں ہے اور شریعت کچھ ایسی اہم شے نہیں، بلکہ مذہب کے غنچے

جھگڑے ہیں وہ شریعت کے اختلافات کی وجہ سے ہی ہیں یعنی محسوس اختلافات کو فتنہ و فساد کا موجب قرار دیا جائے اور غیر محسوس بُنیادی اصُولوں کو ہندو مت اور اسلام میں قدرِ مشترک ...... (COMMON FACTOR) قرار دیا جائے یہ ایک بڑی گہری سازش ہے جو مدت سے اسلام کے خلاف آتشِ خاموش کی طرح پھیلائی جارہی ہے، اس کی ابتداء اکبر کے دینِ الٰہی سے ہوئی جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کیگئی کہ مختلف مذاہب عالمگیر سچائیوں کے لحاظ سے سب ایک ہیں یہ وہ فتنۂ عظیم تھا جس کو حضرت امام سرہندیؒ نے مسلسل جہاد سے کچلا اور مختلف بزرگانِ دین نے بڑی بڑی قربانیوں سے اس سیلابِ بلاانگیز کو آگے بڑھنے سے روکا، یہ وُہی دینِ الٰہی ہے جسکے متعلق بہار کے مسلمان کانگرسی وزیر ڈاکٹر سید محمود نے لکھا ہے کہ مستقبل کے آزاد ہندوستان میں ہندوستان کی متحدہ قومیت کا یہی مذہب ہونا چاہیئے (ملاحظہ ہو سوراجی اسلام مطبوعہ طلوعِ اسلام بابتہ ماہ جون)

جب دینِ الٰہی کی اس سازش نے وہاں شکست کھائی تو اسنے تصوّف کے راستے سر نکالا اور یہ مشہور کیا کہ مسلمانوں کا تصوف اور ہندؤں کی ویدانت ایک ہی ہے اور چونکہ مغزِ دین یہی حقیقت ہے اس لیئے یہ دونوں مذہب ایک ہی ہیں۔ چنانچہ آپنے اکثر سُنا ہوگا کہ ہندو مسلمان فقیروں کے معتقد بن بیٹھتے ہیں، یہی وہ نظریہ ہے جسکے ماتحت مشاہیرِ اسلام میں سے حضراتِ علماء بعلما۔ مجاہدینِ ملت کے مقابلہ میں صوفیائے کرام کو ترجیح دی جاتی ہے لیکن تصوّف پھر بھی گوشوں اور زاویوں میں چھپنے کا مسلک تھا۔ اس لیئے دُنیائے معاشرت میں یہی نظریہ "برہمو سماج" کی شکل میں اُبھارا گیا۔ جو آج عملاً عام طور پر ہر قوم پرست مسلمان کا مذہب بن رہا ہے، جب زمین یوں ہموار ہوگئی تو گاندھی جی ایک قدم اور آگے بڑھے اور اپنی اسکیم میں مذہب کے متعلق یہی نظریہ تعلیم کا جزو لازم قرار دیدیا آپ سمجھے بھی کہ اس سے نتیجہ کیا نکلا! ہندو مت جو اسلام کے سامنے ایک سیکنڈ کے لیئے بھی ٹھہر نہ سکتا تھا جسے مہذب محفلوں میں پیش کرتے ہُوئے خود ہندو گھبراتے اور شرماتے تھے وہ ایک ہی جست میں اس پہلے سے اُبھر کر اسلام کے ہمدوش کھڑا ہوگیا اور اسلام گاندھی جی کی معصوم کمند کے ایک جھٹکے میں عرش کی بلندیوں سے تحت الثرےٰ کی پستیوں میں آگرا۔ آپ شاید یہ کہہ دیں کہ واہ صاحب! ایک جہاتما گاندھی

کہ ایسا کہہ دینے سے کیا ہوتا ہے جب کہ خود کانگرس کے اندر اسلام کی برتری اور فوقیت کو ثابت کرنے والی اتنی اتنی بڑی ہستیاں موجود ہیں۔ لیکن جب آپ گاندھی جی کی نگہ دور رس کی حقیقت سے واقف ہو جائیں گے اور کانگرس کے محافظینِ اسلام آپ کے سامنے بے نقاب آئیں گے تو اسوقت آپکو معلوم ہوگا کہ اسلام کی فوقیت اور برتری ثابت کرنے والے کہاں ہیں! مہاتما گاندھی نے جو بات دس سال بعد زبان پر لانی ہوتی ہے۔ اس کی بنیاد وہ آج رکھ دیتے ہیں۔ پھر وہ ایسی کچی گولیاں بھی کھیلے ہوئے نہیں ہیں کہ مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی کے جال وہ کھلے بندوں اپنے ہاتھوں سے بچھائیں۔ پھر انہوں نے اپنے اُستادانِ سیاست سے یہ سبق سیکھ رکھا ہے کہ حرمِ کعبہ کے اندر ترکوں کے سینہ کو گولیوں کا نشانہ بنانے کے لیے کسی غیر کو نہ بھیجو۔ بلکہ خود وہیں کوئی "شریف حسین" تیار کر دو۔ لہٰذا گاندھی جی بھی مسلمانوں کی ہلاکت کے لیے مسلمانوں ہی کو تیار کرتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد ۱۹۱۳ء سے ایک تفسیرِ قرآن لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ کئی دفعہ اُسکے لئے چندے ہوئے اور کئی مرتبہ اُسکے مسودے گم ہوئے۔ وہ تفسیر نہ چھپنی تھی اور نہ چھپ سکی۔ حتّیٰ کہ انہوں نے تحریر کا شغلہ کم و بیش چھوڑ دیا۔ اور اپنی توجہات دوسری طرف منعطف کر لیں لیکن ہم نے دیکھا کہ ۱۹۳۱ء میں جب کہ وہ پکے نیشنلسٹ ہو چکے تھے۔ اُن کی تفسیر ترجمان القرآن کی پہلی جلد چھپ کر سامنے آ گئی۔ اس تمام تفسیر کو تو کس طرح آپ کے سامنے لایا جائے۔ البتہ انہوں نے تفسیر کے مقدمہ (یعنی تفسیر سورۂ فاتحہ کے ضمن میں ملخصاً بیان کیا ہے کہ اسلام کیا ہے۔ یعنی انہوں نے اپنی تمام تفسیر کو ([illegible]) کیا ہے۔ یہ ([illegible]) قابلِ ملاحظہ ہے۔ دینِ الٰہی کو سامنے رکھیے، برہمو سماج کے عقائد پر نگاہ ڈالیے، پھر گاندھی جی کے نظریۂ مذہب کو سامنے رکھیے۔ اور اسکے بعد مولانا آزاد کی دین کی تشریح پڑھیے ساری حقیقت آپکے سامنے روشن ہو جائے گی۔ یہ بتانے کے بعد کہ مختلف مذہبی گروہوں نے دین کے سمجھنے میں کیا کیا غلطیاں کیں۔ اسلام کے متعلق ارشاد ہے۔

"لیکن قرآنِ کریم نے نوعِ انسانی کے سامنے مذہب کی عالمگیر سچائی کا اصول پیش کیا۔
(الف) اس نے نہ صرف یہی بتایا کہ ہر مذہب میں سچائی ہے۔ بلکہ صاف صاف

کہہ دیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں اس نے کہا کہ دینِ خدا کی بخشش ہے اس لیے ممکن نہیں کہ کسی ایک قوم اور جماعت ہی کو دیا گیا ہو اور دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو۔

(ب) اس نے کہا خدا کے تمام قوانین فطرت کی طرح انسان کی روحانی سعادت کا قانون بھی ایک ہی ہے اور سب کے لیے ہے، پس پیروانِ مذاہب کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ انہوں نے دینِ الٰہی کی وحدت فراموش کر کے الگ الگ گروہ بندیاں کر لی ہیں اور ہر گروہ بندی دوسری گروہ بندی سے لڑ رہی ہے۔

(د) اس نے بتلایا کہ ایک چیز دین ہے ایک شرع و منہاج ہے، دین ایک ہی ہے اور ایک ہی طرح سب کو دیا گیا ہے البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا اور یہ اختلاف ناگزیر تھا۔ کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال اُسکے لیے اختیار کیے جائیں پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو جا سکتے۔ تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے محض شرع و منہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو۔

(ر) اس نے بتلایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں اور انکے ظواہر و رسوم کو انسانی نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں۔ یہ گروہ بندیاں تمہاری بنائی ہوئی ہیں ورنہ خدا کا ٹھہرایا ہوا دین تو ایک ہی ہے۔ وہ دینِ حقیقی کیا ہے؟ وہ کہتا ہے ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ جو شخص بھی ایمان اور نیک عملی کی زندگی اختیار کرے گا اُسکے لیے نجات ہے خواہ وہ تمہاری گروہ بندیوں میں داخل ہو یا نہ ہو۔

(د) اس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اس کی دعوت کا مقصد اسکے سوا کچھ نہیں کہ تمام مذاہب اپنی مشترکہ اور متفقہ سچائی پر جمع ہو جائیں، وہ کہتا ہے تمام مذاہب سچے ہیں۔ لیکن پیروانِ مذاہب اس سچائی سے منحرف ہو گئے

ہیں۔ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سرِنو اختیار کر لیں تو میرا کام پورا ہو گیا اور انھوں نے مجھے قبول کر لیا۔ تمام مذاہب کی یہی مشترکہ اور متفقہ سچائی ہے جسے وہ "الدین" اور "الاسلام" کے نام سے پکارتا ہے"۔ (ترجمان القرآن۔ جلد اول) ۱۶۲۔۱۶۳

ہ

حقیقی اسلام

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام کا یہ دعوےٰ ہے ـــ اور تمام مذاہب عالم میں صرف اسلام ہی کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے دُنیا کی ہر قوم میں اپنے رسول بھیجے جو خدا کا پیغام ازلی لوگوں تک پہونچاتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا یہ بھی دعوےٰ ہے ـــ اور کس قدر حقیقت پر مبنی دعویٰ ـــ کہ وہ سچائیاں۔ وہ پیغامِ ازلی۔ وہ دینِ خداوندی۔ دنیا میں کسی قوم کے پاس باقی نہ رہا، یا تو وہ حوادثِ ارضی وسماوی کی نذر ہو گیا۔ یا انسانی ہاتھوں نے اس میں الحاق وتحریف کر دی حق کو باطل کے ساتھ ملا دیا۔ دین کی صورت مسخ ہو گئی۔ اور اس ضرورت کی بنا پر کہ دُنیا میں کہیں خدا کی سچائیاں باقی نہ رہی تھیں ظہر الفساد فی البر والبحر (خشکی اور تری میں فسادی فساد رونما ہو چکا تھا) خدا نے نبی اکرمؐ کی وساطت سے اپنا پیغام ازلی قرآنِ کریم کی شکل میں نازل فرمایا جو تمام سابقہ سچائیوں کا مہیمن ہے۔ یعنی جتنی سچائیاں خدا کی طرف سے آتی رہی تھیں پر لوگوں نے انہیں محفوظ نہ رکھا تھا۔ وہ سب اسکے اندر ہیں۔ اور اسکے علاوہ وہ تمام اصولِ زندگی جن کی قیامت تک انسانوں کو ضرورت پڑے گی۔ وہ بھی اسکے اندر ہیں۔ گویا یہ پیغامِ خداوندی کا مکمل اور آخری ضابطہ ہے الدین اور الاسلام اسکے اندر اکمل بھی ہوا ہے (الیوم اکملت لکم دینکم) اور محفوظ بھی (نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون ۝) اس کی حفاظت خود خدا کے ذمہ ہے۔ اس ضابطہ کے اجمال کی عملی تفصیل محمد الرسول اللہ کا اسوۂ حسنہ ہے اور یہ امہاتِ اصول اور ان کی عملی تفصیل مل کر خدا کا سچا مذہب الاسلام بنتے ہیں، لہٰذا آج خدا کے نزدیک جو دین حقیقی ہے جو سچا مذہب ہے جو سچی شریعت ہے، وہ صرف وہی ہے جو قرآن کریم کے اندر ہے، جو شریعتِ محمدیہ کہلاتی ہے،

(ان الدین عند اللہ الاسلام) یہ سچائیاں اور کہیں نہیں۔ اگر سچائیاں کہیں اور بھی ہوتیں تو قرآنِ کریم نازل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہ تو نازل ہی اس لیے ہوا تھا کہ سچائیوں کا وجود دنیا سے گم ہو چکا تھا۔ لہذا آج دنیا کا کوئی مذہب، نہ اصول میں نہ شریعت میں اس کے برابر ہو سکتا ہے نہ اس کا بدل (SUBSTITUTE) اور آج الدین اور الاسلام کو ماننے کے معنی یہ ہیں کہ قرآن پر ایمان رکھا جائے اور شریعتِ محمدیہ کی اتباع کیجائے جو ایسا نہیں کرتا نجات و سعادت کا قطعاً مستحق نہیں ہے۔ یہ قرآنِ کریم کا دعوےٰ ہے، اگر کسی کو اس میں ذرا بھی شک ہو تو وہ ہمیں اطلاع دے، ہم قرآنِ کریم کی نصوصِ صریحہ سے ایسے واضح طور پر ثابت کر کے دکھا دینگے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھیئے اور پھر مولانا آزاد کی تفسیر کے مندرجہ صدر ٹکڑوں پر نگاہ ڈالیئے۔

(الف) وہ فرماتے ہیں کہ:۔ ہر مذہب میں سچائی ہے، تمام مذہب سچے ہیں۔ قرآنِ کریم کا دعویٰ ہے کہ ہر مذہب میں سچائی تھی۔ تمام مذاہب سچے تھے لیکن قرآن کریم کے نزول کے وقت وہ سچائیاں گم ہو چکی تھیں۔ لہذا آج سچائیاں صرف قرآن کے اندر ہیں دُنیا میں اور کہیں نہیں ہیں +

(ب) مولانا فرماتے ہیں کہ پیروانِ مذاہب کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی گروہ بندیاں بنالی ہیں لیکن قرآنِ کریم مسلمانوں کو ایک الگ گروہ قرار دیتا ہے جنہیں حزب اللہ (خدا کا گروہ) کہتا ہے[1]۔ انہیں خیرِ اُمت اور اُمتِ وسطیٰ کے القاب سے یاد کرتا ہے (یعنی بہترین جماعت بہترین قوم) لہذا مسلمانوں کا الگ گروہ قایم رہنا ان کی گمراہی نہیں۔ بلکہ انکے خدا کا حکم ہے +

(د) یہ درست ہے کہ دین ایک چیز ہے اور شرع و منہاج دوسری چیز لیکن یہ غلط ہے کہ دین (سب جگہ) ایک ہی ہے اصل یہ ہے کہ دین ایک ہی جگہ رکھ دیا گیا تھا۔ لیکن لوگوں نے اس کو بدل ڈالا۔ اور اب وہ صرف قرآنِ کریم کے اندر ہے۔

[1] "خدائے تعالیٰ نے مومنینِ مخلصین کو حزب اللہ کے لقب سے ملقب فرمایا ہے" (مولانا آزاد السلالہ ص ۲)

پھر یہ بھی درست نہیں کہ شرع و منہاج کا اختلاف یونہی معمولی سی بات ہے۔ شرع و منہاج وہ شے ہے جس کی خاطر رسول پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ بحکم خداوندی اُس کی اتباع کرنی پڑتی ہے۔ اور چونکہ شرع عملی تفصیل ہوتی ہے اصولِ دین کی۔ اس لیے جب اسوقت دین وہی دین ہے جو رسول اللہ صلعم لائے تو شریعت بھی وہی شریعت ہے جو اُن کی وساطت سے ملی۔ نہ دین کہیں اور سے مل سکتا ہے، نہ شریعت ہی غیر اہم شے ہے۔

(ک) جیسا کہ (ج) میں بتایا جاچکا ہے یہ قطعاً دھوکا ہے کہ مسلمانوں کی "گروہ بندی" اِن کی اپنی بنائی ہوئی ہے، یہ خدا ہی کی بنائی ہوئی ہے، لہٰذا نجات وسعادت کے لیے متبعین محمد الرسول اللہ کی جماعت میں شامل ہونا از بس ناگزیر ہے۔ پھر یہ بھی غلط ہے کہ "ظواہر و رسوم" کو نجات وسعادت میں کوئی دخل نہیں۔ ظواہر و رسوم (مثلاً عبادت کے طریقے۔ حرام و حلال کا فرق) شریعت کہلاتے ہیں اور شریعت دین ہی کی تفسیر کا نام ہے، "خدا پرستی اور نیک عملی" کے الفاظ بالکل مہمل ہیں اگر ان کی تشریح "قرآنِ کریم کی رُو سے نہ کیجائے، قرآنِ کریم کی رُو سے "خدا پرستی" وہی خدا پرستی ہوسکتی ہے جو قرآنِ کریم کے متعین کردہ ایمان کے مطابق ہو۔ اور اعمال وہی نیک قرار پاسکتے ہیں۔ جن کو اُس نے نیک اعمال کہا ہو۔

(و) یہ قطعاً غلط ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ تمام پیروانِ مذاہب سچے ہیں۔ وہ صرف اتنا کہتا ہے کہ اپنے اپنے وقت میں مذاہب سچے تھے، لہٰذا پیروانِ مذاہب اگر آج "فراموش کردہ سچائی" کو از سرِ نو اختیار کرنا چاہیں تو سچائی چونکہ دُنیا میں اور کہیں نہیں۔ اس لیے اُنہیں قرآنِ کریم پر ایمان لانا ہوگا۔ شریعتِ محمدیہ کی اتباع کرنی ہوگی۔ اور اس طرح مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہونا پڑے گا۔ یہ ہے آج "الدین" اور "الاسلام"۔ یہ ہم نہیں کہتے۔ خود مولانا آزاد بھی اپنے دورِ قومیت

۱؎ کونوا مع الصادقین (سچوں کے ساتھ رہو)

پرستی سے پیشتر یہی کہا کرتے تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جہاں فرمایا ہے کہ جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کی تلاش کرے گا تو وہ دین قبول نہ کیا جائے گا۔ اس آیت کا ترجمہ ۱۹۱۳ء میں یوں کیا جاتا تھا:

۳:۸۴

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الآخرۃ من الخاسرین

اب سے جو انسان احکام اسلامی کی جگہ کسی دوسری تعلیم کو تلاش کرے گا تو یقین کرو اس کی تلاش کبھی مقبول نہ ہوگی اور اُسکے تمام کاموں کا آخری نتیجہ ناکامی و نامرادی ہوگا۔ (الہلال ۲۲)

لیکن اسی آیت کا ترجمہ دورِ قومیت پرستی کے بعد یوں کیا جاتا ہے:۔

"اور جو کوئی اسلام کے سوا (جو عالمگیر سچائی اور تصدیق کی راہ ہے) کوئی دوسرا دین چاہے گا .... (ترجمان القرآن جلد اول ۱۵۸)

اور اس "عالمگیر سچائی" کی تشریح آپ پڑھ چکے ہیں۔ ۱۹۱۳ء میں "الاسلام" نام تھا "احکام اسلامی" کا، اور ۱۹۳۱ء میں نام ہوگیا اس "عالمگیر سچائی" کا جو ہر مذہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔ حالات کے بدلنے سے آیات کے ترجمے تک بدل گئے۔

اس تفسیر کا اثر

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ وہی چیز جو کبھی دینِ الٰہی کی شکل میں سامنے آئی تھی پھر وہ برہمو سماج کے رنگ میں نمودار ہوئی۔ اور جسے اب مہاتما گاندھی تعلیمی نصاب میں پیش کر رہے ہیں لفظاً وہی ہے جو مولانا آزاد نے اپنے دورِ قومیت پرستی کی تفسیر میں بیان فرمائی ہے یعنی تمام مذاہب اپنی بنیادی سچائیوں کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ فرق شریعتوں میں ہے اور شریعتیں کچھ اہمیت نہیں رکھتیں۔ اس بات کے اعلان کے لیے مہاتما جی نے اتنا عرصہ پیشتر سے زمین ہموار کرنا شروع کر دی تھی، چنانچہ ۱۹۳۱ء میں جب یہ تفسیر شائع ہوئی ہے تو مہاتما گاندھی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک تقریر فرمائی

طلوعِ اسلام ۶۲ اگست ۱۹۴۸ء

اور اس میں کہا کہ مجھے ایک عرصے سے خیال تھا کہ اسلام ایسا تنگ نظر مذہب نہیں ہو سکتا کہ وہ نجات و سعادت اپنے پیرواں تک ہی محدود رکھے اور سچائیاں اپنے اندر ہی بتلائے لیکن مجھے اس بات کی سند کہیں سے نہ ملتی تھی۔ اب جو مولانا آزاد نے تفسیر شائع کی ہے تو مجھے اپنے اس خیال کی سند مل گئی ہے کہ اسلام تمام مذاہب میں یکساں سچائیوں کا مدعی ہے۔ لہٰذا ہم نے اس تفسیر کے متعلقہ ٹکڑوں کا (ہندی) میں ترجمہ کر کے عام شائع کرایا ہے[۱]، اس کے بعد پانچ چھ برس تک مختلف قومیت پرست مسلمانوں کی طرف سے اسی اسلام کا اعلان ہوتا رہا۔ ان کی طرف سے مضامین شائع ہوتے رہے، تقریریں ہوتی رہیں۔ جب یوں میدان صاف ہو گیا تو اب مہاتما جی نے اس نظریہ کو اپنی تعلیمی اسکیم میں شامل کر دیا۔ اگر اتنی زمین ہموار کئے بغیر۔ پہلے ہی یہ نظریہ مہاتما جی کی طرف سے پیش ہوتا تو مسلمان بدک جاتے لیکن مہاتما جی نے نہایت "حسنِ تدبر" سے اپنی مخصوص شاطرانہ چالوں سے مسلمانوں کے ذہن کو اس کے قبول کرنے کے لیے تیار کرایا۔ اور اس کے بعد اس کا اعلان کیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ آج خود مسلمان اس اسکیم پر احسنت و مرحبا کے نعرے لگا رہے ہیں۔ آپ کے قوم پرست علماء حضرات، جو آمین بلند و آہستہ کہنے پر ایک دوسرے کو کافر بناتے رہتے ہیں۔ جن کے نزدیک دین کی جزئیات کی اتنی اہمیت ہے کہ وہ ٹخنوں سے نیچے پاجامہ پہننے والے کو نجات و سعادت سے محروم قرار دیتے ہیں، وہ آج اسلام کی اس جدید تعریف (DEFINITION) کی رو سے اس شخص کو جسے کل تک وہ "کافر و مشرک" کہا کرتے تھے، اسی طرح نجات و سعادت کا مستحق قرار دیتے ہیں جس طرح مسلمان کو۔ بلکہ مسلمان کو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں سمجھتے ہیں کہ یہ اپنی "مذہبی گروہ بندی" الگ قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اور ہندو ان کے نزدیک صحیح اسلام کا پیرو ہے جو ان گروہ بندیوں کو توڑ کر ایک متحدہ قومیت بنانا چاہتا ہے۔

ذرا خدا کے لئے پوچھیے کسی عالم سے، پوچھیے کسی فقیہ سے، پوچھیے کسی مولانا سے، پوچھیے کسی امیرِ شریعت سے۔ کہ کیا فی الواقع اسلام وہی ہے جو مولانا آزاد نے اپنی تفسیر میں پیش کیا ہے؟ کیا ہندو مت اور اسلام واقعی اپنی بنیادی سچائیوں کی رو سے بالکل یکساں ہیں؟ کیا مذاہب کے ظواہر و رسوم "فی الحقیقت بیکار و مہمل ہیں کہ بچوں کو جن کی تعلیم دینا انہیں اصل

[۱] مسٹر مہادیو ڈیسائی سے ہمیں اطلاع ملی ہے کہ مولانا آزاد کی اس تفسیر کا ہندی ترجمہ بابو راجندر پرشاد (پٹنہ) سے مل سکتا ہے۔ "طلوعِ اسلام"

طلوعِ اسلام — ۶۳ — اگست ۱۹۴۳ء

دین سے بیگانہ کر دینا ہے؟ کیا واقعی شریعتِ محمدیہ کو نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں؟ پوچھیئے ان سے کہ آج اُن کی اِس حمیّتِ دینی کو کیا ہوا جو شریعت سے ذرا اختلاف کو برداشت نہ کر سکتی تھی! دریافت کیجئے ان سے کہ ان کے فتاویٰ کی ان مُہروں کو کون چُرا کر لے گیا جو "ظواہر و رسوم" کے اختلافات کے فیصلوں کے لیے ہر وقت سجدہ ریز رہا کرتی تھیں! کس نے اُنکے قلموں کی سیاہیاں خشک کر دیں کیا چیز آج اُنکے گلوگیر ہوگئی۔ کہ یہ سب کچھ دیکھتے ہیں لیکن نہ کچھ لکھ سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں۔ آپ ایکدفعہ یہ تسلیم کر لیجئے کہ سچائیاں، جو اصلِ دین ہیں ہر مذہب میں یکساں ہیں۔ اور شرائع جن میں اختلاف ہے وہ کچھ اہمیت نہیں رکھتیں۔ پھر اپنے آپ سے سوال کیجئے کہ یہ جو آپکے عُلماء حضرات منبروں اور اسٹیجوں پر اسلام کی خصوصیّات پر خطبے اور لکچر دیتے ہیں۔ اسکے کیا معنی رہ جاتے ہیں۔ کیا یہ سب کچھ، بقول مہاتما گاندھی، اس لیے نہیں کیا جاتا کہ آپ محض سیاسی اغراض کیخاطر غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کی کوشش کرتے ہیں پھر پوچھیئے کہ جب آپ کے بچوں کو کامل سات برس تک جبری طور پر اس عقیدہ کی تعلیم دی جائیگی تو اُن کے نزدیک اسلام میں کون سی کشش باقی رہ جائے گی جس کی خاطر وہ اس سے متمسک رہیں؟ وہ بچہ جب ہندوؤں کو بھی اسی قسم کی سچائیوں کا حامل سمجھے گا جس قسم کی سچائیاں قرآنِ کریم میں ہیں۔ تو وہ پھر ہندو قوم میں شامل کیوں نہ ہو جائے گا۔ جس کے پاس مسلمانوں سے کہیں زیادہ دھن دولت ہوگا لاکھوں بھنگی اور چمار (اچھوت) عیسائیوں کی "مکتی فوج" میں اس لیے شامل ہوگئے کہ (۱) ان کے اپنے مذہب میں انہیں کوئی تفوق نظر نہیں آتا تھا اور (۲) جس مذہب کی اُنہیں دعوت دی جاتی تھی وہ حاکم قوم کا مذہب تھا۔ کیا یہی چیز مُسلمان بچّوں کے ساتھ بھی نہ ہوگی۔ سوامی شردھانند کی تحریک شدھی تو یونہی بدنام ہوگئی کہ وہ کُھلے بندوں نام لے کر شدھی ہوتی تھی۔ مہاتما جی اُسوقت ہنستے ہونگے کہ کیا دورِ جہالت کا سا طریق عمل اختیار کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کو شدھ کرنے کا طریقہ اس سے جداگانہ ہے انھوں نے اُسی زمانہ سے خاموش شدھی کی اسکیم کا خاکہ تیار کر لیا جس کا سنگ بنیاد مولانا آزاد کے مقدس ہاتھوں سے رکھوایا گیا۔ اور اب اس پر عمارت کھڑی کی جا رہی ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ مُسلمان اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم نجی طور پر دلائیں لیکن ذرا اس پر بھی غور

فرمایئے کہ اسکول میں تو اسے پڑھایا جائے گا کہ تمام مذاہب اصولی طور پر یکساں ہیں اور گھر پر اسے پڑھایا جائے گا کہ اسلام دیگر مذاہب سے بلند و بالاتر مذہب ہے بلکہ خدا کا سچا مذہب ہے یہی نہیں بلکہ پھر اسے گھر پر شریعت کی تعلیم بھی دی جائے گی اور یہ وہ تعلیم ہوگی جس کی نسبت مہاتما جی نے فرمایا ہے کہ تمام لڑائی جھگڑوں کا باعث ہی یہ تعلیم ہے۔ تو یہ دونوں باتیں ساتھ کیسے چلیں گی؟ یہ بھی واضح رہے کہ اسکولوں میں مذہبی تعلیم کتابوں کے ذریعے سے نہیں ہوگی اس لیے کہ مہاتما جی کو خوب علم ہے کہ وید کسی طرح قرآن کے سامنے لائے ہی نہیں جا سکتے۔ تعلیم ہوگی اُستادوں کی زندگی کے ذریعہ سے۔ اور ظاہر ہے کہ کانگریسی حکومت کے مقرر کردہ اُستاد کوئی ڈاکٹر اشرف کوئی جوش ہی ہونگے جہاں وزیرِ تعلیم ڈاکٹر سید محمود جیسے ہونگے جو مسلمانوں کا سا الگ نام رکھنا بھی ہندی قومیت کے خلاف سمجھتے ہیں[1]۔ وہاں کے اُستاد جس ڈھنگ کے ہوں گے وہ ظاہر ہے۔

باب دوم

فلسفۂ زندگی

مذہب کے متعلق تو آپ دیکھ چکے اب فلسفۂ حیات کو لیجئے مسلمانوں کے نزدیک فلسفۂ زندگی مذہب سے الگ شے نہیں۔ یوں سمجھیئے کہ مذہب جس رنگ میں انسان کو رنگنا چاہتا ہے۔ وہ اس کا فلسفۂ زندگی ہوتا ہے۔ ہندو لوگوں کا فلسفۂ حیات اہنسا ہے جس کے معنی عدم تشدد (NON VIOLENCE) کیے جاتے ہیں لیکن عدم تشدد سے اس کا صحیح مفہوم ذہن میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ اس سے مفہوم وہ فلسفۂ زندگی ہے جو حضرت مسیحؑ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے یعنی جو ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی سامنے کر دو۔ ماحصل یہ کہ ہمیشہ مار کھائے جاؤ لیکن سامنے سے ہاتھ نہ اُٹھاؤ۔ جب ہاتھ اُٹھاؤ گے تو ہنسا ہو جائے گا کہ قوت و طاقت کا استعمال ہنسا ہے اور مار کھاتے جانے کا طرزِ عمل اہنسا ہے۔ یہ وہ فلسفہ

[1] (ملاحظہ: دسوراجی اسلام مطبوعہ طلوعِ اسلام بابتہ جون ۱۹۳۸ء)

جس کے اوتار آج مہاتما گاندھی سمجھے جاتے ہیں۔ اور وہ اس فلسفہ کو انسانیت کی بہترین تعلیم قرار دیتے ہیں۔ وارد ھا اسکیم جس کے متعلق دعوے یہ ہے کہ اس کو مذہب سے کچھ علاقہ نہیں فلسفۂ زندگی کے اعتبار سے اس کی بنیاد اہنسا پر رکھی گئی ہے، چنانچہ رپورٹ زیر بحث میں سب سے مقدم "بنیادی اصول" کے ماتحت لکھا ہے کہ "ہمارے بچوں کو یہ سکھانے کی ضرورت ہے کہ اہنسا کا طریقہ ہنسا سے اچھا،" (رپورٹ صفحہ ۱۱۱) پر "سماج کے علم" کے عنوان میں درج ہے۔

> جن لوگوں نے قوموں کو آزاد کرایا ہے اور امن کے ذریعہ سے صلح حاصل کی ہے ان کی کہانیاں کورس کی کتابوں میں خاص طور پر ہونی چاہئیں۔ انسانوں کی زندگی سے ایسے سبق سکھانے چاہئیں جن سے اہنسا اور اس کے ساتھ کی خوبیوں کا ہنسا، دھوکے اور دغا سے اچھا ہونا ثابت ہو۔ (صفحہ ۱۱۹)

ہنسا یا اہنسا

ہمیں دیکھنا ہے کہ کیا قرآن کریم کی رُو سے، اسوۂ حسنہ کی رُو سے، صحابہ کبارؓ کی حیاتِ مقدسہ کی رُو سے، مسلمان کے لیے فلسفۂ زندگی یہی ہے جس کی تعلیم جبراً ان کے بچوں کو دی جائے گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے، وہ خواہ مخواہ دوسروں کو ستانے کی تلقین نہیں کرتا بلکہ اس سے بڑی سختی سے روکتا ہے، وہ اپنے بیگانے سب کی عزت، عصمت، جان، مال، مذہب کی حفاظت کرنا سکھاتا ہے اور اس کے لیے وہ برائی کو بھلائی سے روکنے کا سبق دیتا ہے۔ (اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ) لیکن اس کے نزدیک صرف اتنا حصہ ہی فلسفۂ زندگی کا ایک شعبہ ہے، زندگی صحیح فطرتِ انسانی کے مطابق نہیں ہو سکتی تا وقتیکہ اس عاجزی اور نرمی کے حصہ کے ساتھ دوسرا حصہ۔ اور نہایت اہم حصہ، بھی شامل نہ ہو یعنی وہ کہتا ہے کہ دنیا میں عفو، درگذری، نرمی، لینت، بردباری بڑے عمدہ اصول ہیں لیکن جب ایسا وقت آجائے کہ شریر النفس انسان دوسروں کی شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگیں اور کمزوروں اور ناتوانوں پر خدا کی یہ وسیع و عریض زمین تنگ کر دیں۔ جب ایسا وقت آجائے کہ نرمی اور عاجزی، عفو اور درگذری سے ظالم کی سرکشی۔ اس کا ظلم و استبداد اور بڑھتا چلا جائے

تو اسوقت یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ دُنیا میں عدل و انصاف قائم رکھنے کے لیے، قوانین الٰہی کی محافظت کے لیے، ظالم کے ظلم کو قوت سے روکو۔ اور اُس کی سرکشی اور دراز دستی کو پُوری طاقت اور زور کے ساتھ کچل کے رکھ دو۔ اُسکے تکبر و نخوت، اس کی فرعونیت اور تمردیت کو چُور چُور کر دو کہ۔ الفتنۃ اشد من القتل۔ فتنہ و فساد، ظلم و استبداد، سرکشی اور تظلّم قتل سے کہیں زیادہ شر انگیز ہے۔ کہ جس انگلی پر ایسا ناسور ہو جائے۔ جو نا قابل علاج ہو اور اس کے زہر کا سارے جسم میں پھیل جانے کا اندیشہ ہو تو اس انگلی کا کاٹ کر پھینک دینا ہی عین مصلحت ہے۔ اگر آپ کو مظلوم کی حفاظت مقصود ہے تو ظالم کے ظلم کو ہر طرح سے روکنا ہوگا۔ اگر پُرامن انسانوں کی عزت، عصمت، جان، مال کا تحفظ مطلوب ہے، تو قاتلوں کو حوالۂ دار و رسن کرنا ہوگا۔ مجرموں کو سزائیں دینی پڑیں گی، عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے محکمۂ عدالت ناگزیر ہے اور محکمۂ عدالت کے قیام و بقا کے لیے شمشیرِ جگر دار کا ساتھ ہونا بھی لابُدّ ہے۔ کوئی قانون ایسا نہیں جو دُنیا میں قوت کے بغیر نافذ العمل ہو سکتا ہو۔ قرآنِ کریم نے اسی حقیقتِ کبرےٰ کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ
لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ - وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَ
مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ إِنَّ
اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝ ۵۷/۲۵

ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور انکے ساتھ کتابیں یعنی قوانین عدل و انصاف نازل کیے تاکہ لوگ اپنے ٹھکانے پر اعتدال سے رہیں۔ اور ان کے ساتھ ہی ہم نے فولادی شمشیر (لوہے) کو بھی نازل کیا جس میں سخت قوتوں (کے راز) پوشیدہ ہیں اور لوگوں کے لیئے (اور بھی) فائدے ہیں، تاکہ اللہ دیکھے کہ کون اس کی اور اسکے رسولوں کی بلا دیکھے مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بڑی قوت والا۔ زبردست (غالب) ہے

حضرت علامہؒ فرماتے ہیں:۔

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تُو نے ٭ کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگر دار

اس بیت کا یہ مصرعۂ اول ہے کہ جس میں ٭ پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

خدا کی کتاب، یعنی قوانینِ الٰہی کے ساتھ ساتھ تلوار بھی نازل ہوئی ہے کہ لوگوں کو ٹھیک اپنے ٹھکانے پر رکھا جائے، جاویدنامہ میں حضرت علامہؒ. خاتونِ محترمہ شرف النساء کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ اُسنے وصیت کی تھی کہ اس کی قبر پر تلوار اور قرآن رکھ دیا جائے کہ:-

این دو قوت[1] حافظ یکدیگر اند ٭ کائناتِ زندگی را محور اند ٭

مومناں را تیغ با قرآں بس است ٭ تُربتِ ما را ہمیں ساماں بس است

آیت کے آخر میں فرمایا ہے کہ مسلمانوں کا خدا قویؐ عزیز ہے، بے انتہا قوتوں کا مالک اور غالب زبردست ہے، اس لیے اسکے رنگ میں رنگی ہوئی قوم بھی قوت و سطوت کی مالک ہونی چاہیئے. اہنسا کی پرستار تو اس خدا کی قوم ہوسکتی ہے جو اسدرجہ بےبس اور مجبور ہو کہ اسپر کوئی پتھر بھی پھینک دیا جائے تو وہ ہاتھ نہ اُٹھا سکے، مٹی کے بت اور ایک خدائے حیؒ و قیوم میں جتنا فرق ہے، اتنا ہی فرق اہنسا کے "اوتار" اور ایک مردِ مجاہد میں ہے. مسلمان کا ہیولے تو اہنسا اور ہنسا دونوں سے ملکر بنتا ہے.

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت ٭ یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان!

نبی اکرمؐ نے عفو و درگذری کا جو نمونہ اپنی حیاتِ مقدسہ میں پیش کیا اس کی نظیر دُنیا کے کسی بڑے سے بڑے مدعیِ امن و صلح کے ہاں نہیں مل سکتی لیکن اس کے ساتھ ہی جب قوت اور طاقت کے استعمال کی ضرورت پڑی تو کم و بیش ستر (۷۰) لڑائیوں (مغازی و سرایا) میں حضورؐ بدست شریک ہوئے، یا ان قدوسیوںؓ کی جماعت کو روانہ فرمایا... جو دُنیا میں انسانیت کے معراج کبریٰ کے مظہرِ اتم

[1] تلوار قرآن کریم کی حفاظت کرنے والی ہے، یہ تو ظاہر ہے. لیکن نکتہ بلیغ یہ ہے کہ قرآن کریم بھی تلوار کا محافظ ہے. تلوار کو اس محافظ کے بغیر آزاد چھوڑ دیا جائے. تو وہ تلوار چنگیز خاں. ہلاکو. کچنر. ہٹلر اور مسولینی بن جاتی ہے لیکن جب اس کے ساتھ قرآن محافظ ہو تو یہ عمرؓ و خالدؓ کی صورت اختیار کرتی ہے. اور دونوں میں فرق ظاہر ہے ۔ ۱۲ منہ

تھے۔ وہ مسلمان جن کے متعلق قرآنِ کریم کا ارشاد ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَہُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ۔
یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۔ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ ؀ ۹/۱۱۱

بے شک اللہ نے مومنین سے بعوض جنت اُن کی جانیں اور اموال خرید لیے ہیں اور اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کے راستے میں (میدان جنگ میں) لڑتے ہیں۔ سو یا تو دشمن کو تہِ تیغ کرکے (فاتح و مظفر لوٹتے ہیں) یا وہیں خاک و خون میں غلطاں ہو کر رسمِ شہادت کی بنیاد ڈالتے ہیں۔

مومن کی تو شان یہ ہے کہ اگر دُنیا قوانینِ الٰہی کے مطابق نہ چلے تو اس دُنیا کو زیر و زبر کر دے۔ اس زمین و آسمان کو اُلٹ دے۔ اس جہانِ آب و گِل کو درہم برہم کر دے۔

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد گفتم کہ نمی سازد۔ گفتند کہ برہم زن۔

مومن دُنیا میں پانی کی طرح ہر قالب میں ڈھل جانے کے لیے نہیں پیدا ہوا۔ بلکہ یہ تو دُنیا والوں کو اپنے خدا کے وضع کردہ قالب میں ڈھالنے کے لیے پیدا ہوا ہے اگر وہ پانی ہے تو خود بخود اس کے قالب میں ڈھل جائے گا۔ اور اگر لوہا ہے تو اُسے یہ اپنے جلال کی آتشِ سوزاں میں پگھلائے گا۔ تا آنکہ وہ موم بن کر اسکے قالب میں ڈھل جائے۔ یہ دُنیا میں قوانینِ الٰہی کا نافذ کرنیوالا ہے۔ اگر شریف النفس انسان اسے نرمی اور محبت سے مان لیں تو اس سے بڑھ کر مہربان کوئی نہ ہوگا لیکن اگر سرکش اور ضدی انسان اس قانون سے بغاوت کرے تو اس جیسا سخت گیر کوئی نہ ہوگا۔ مومن وہ ہے کہ:۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

محمد الرّسول اللہ وَالَّذِیْنَ معہٗ۔ اشدّاءُ علَی الکفار رُحماءُ بینہم

اہنسا کا فلسفہ تو انکا ہے جو آسمان میں بجلی کڑکی تو اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے، بادل گرجا تو اُسکے سامنے سجدہ میں جھک گئے، سانپ دیکھا تو ڈنڈوت کرنے لگے، اپنے ہاتھوں سے بُت تراشا اور

اُسے خدا بنا کر بیٹھ گئے لیکن جو اس تمام کائنات کو مسخر کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہو۔ وہ اہمسا کا پرستار کیسے ہو سکتا ہے (وسخر لکم ما فی السمٰوٰت والارض جمیعًا) اہمسا تو اُن کا فلسفہ ہے کہ جنہوں نے جب سے آنکھ کھولی اپنے آپ کو دوسروں کا غلام ہی دیکھا لیکن جو بارہ برس کے اندر چالیس ہزار شہر اور قلعے فتح کرنے والی قوم ہو اس کو صرف اہمسا سے کیا واسطہ۔ نبی اکرمؐ سے دریافت کیا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے، فرمایا کہ جب جہاد ہو رہا ہو تو وہ میدانِ جنگ میں ہو۔ اور جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو۔ میدانِ جہاد کا نقشہ تو آپ نے آیتِ مندرجہ صدر (وَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ) میں دیکھ لیا۔ تیاری میں مصروف رہنے کے متعلق ارشاد ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ...... ﴿۶﴾

اور جس قدر قوّت (وسامان) تم سے ہو سکے اِس سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے تم اپنے اور اللہ کے دشمنوں (کے مقابلہ) کی تیاری رکھو تاکہ (اس قوت و شوکت سے) اُن پر تمہارا رعب قائم رہے۔

کہیئے کہ وہ قوم جس کا رازِ حیات ان احکام کے اندر پوشیدہ ہو۔ اس کا فلسفۂ زندگی اہمسا ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا یہ فلسفۂ زندگی جس میں جمال کے ساتھ جلال کا عنصر بھی شامل ہے غیر مسلموں کے دل میں ہمیشہ سے کھٹکتا رہا ہے۔ کوئی ڈاکو کسی کوتوال کو اچھا نہیں سمجھ سکتا۔ اس لیے انہوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ اس فلسفۂ زندگی کو گھناؤنا بنا کر دکھایا جائے اس کی ایسی تصویر کھینچی جائے کہ جو دیکھے اس سے نفرت کرنے لگ جائے۔ عیسائی مستشرق ایک عرصہ تک اس کی نشر و اشاعت کرتے رہے ہیں (اور اب بھی کر رہے ہیں) نتیجہ اس پروپیگنڈا کا یہ ہوا کہ غیر تو غیر، خود مسلمان بھی اس قوت و شوکت کے فلسفۂ حیات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگ گیا۔ گزشتہ پچاس برس سے آپ ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے، بالعموم جہاد کے مسئلہ میں وہ کچھ ایسے جھینپے ہوئے سے نظر آئیں گے ان کا کچھ ایسا (APOLOGETIC ATTITUDE) ہو گا کہ اوّل تو اُن کی خواہش یہ ہو گی کہ کسی طرح قرآنِ کریم سے یہ آیتیں خارج ہی ہو جائیں تو اچھا ہے۔ لیکن چونکہ اس پر اُن کا بس نہیں چلتا۔

طلوعِ اسلام ۷۰ اگست ۱۹۳۸ء

اس لئے وہ آیات کی ایسی مضحکہ انگیز تاویلیں کرتے ہیں جن سے کسی طرح یہ ثابت ہو جائے کہ یہ اُس زمانے کے احکام ہیں جس میں ابھی دنیا اتنی "مہذب" نہ ہوئی تھی۔ وہ دورِ وحشت و بربریت تھا۔ یہ احکام وقتی تھے۔ اس زمانے کے مخصوص حالات کے ماتحت عربوں کی اس جنگجو قوم کے مقابلہ میں اس قسم کے طرزِ عمل کی ضرورت پڑ گئی۔ لیکن اب یہ تمام آیات "منسوخ" ہو چکی ہیں۔ اور اب جہاد صرف "اشتہار نویسی" اور "مناظرہ بازی" کا نام رہ گیا ہے۔ اس پروپیگنڈے کی تکمیل کے لئے قادیان میں ایک "نبی" بھیجا گیا اور اس نے فیصلہ ہی کر دیا کہ جہاد بالسیف اب سے قطعاً ممنوع ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ؎

ہو اگر قوّتِ فرعون کی در پردہ مرید
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی

ایک مثال

اس منظّم سازش کے متعلق حضرت علامہؒ اپنی مثنوی اسرار و رموز میں تمثیلاً بیان فرماتے ہیں کہ کسی جنگل میں ایک شیر رہتا تھا۔ وہاں کی بھیڑیں جب اس سے تنگ آ گئیں تو انہوں نے مل بیٹھ کر مشورہ کیا کہ اس آفت کا علاج کیا کیا جائے۔ ان میں جو سب سے زیادہ سیاست داں بھیڑ تھی اس نے کہا کہ دیکھو بھئی! اگر تم تمام بھیڑیں بھی اکٹھی مل جاؤ تب بھی ایک شیر نہیں بن سکتیں۔ لہٰذا اپنے آپ کو شیر بنانے کا خیال محض وہم ہے البتہ کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ اس شیر کو کسی طرح بھیڑ بنا دیا جائے۔ چنانچہ اس بھیڑ نے گیروے رنگ کے کپڑے پہنے، ماتھے پر تلک لگایا، پاؤں میں کھڑاویں پہنیں اور اپنشدوں کا منتر جاپتی ہوئی شیر کی طرف چلی۔ شیر نے دیکھا کہ ایک دیوتا سروپ مہاتما چلا آ رہا ہے ڈنڈوت کیا اور پاس بیٹھ گیا۔ بھیڑ نے آشیرباد دی۔ اور نہایت مسکین سی شکل بنا کر اپدیش دینا شروع کیا کہ بابا! یہ دنیا چند روزہ ہے، مایا کا جال ہے، یہ خونریزی اور گوشت خوری کی زندگی بھلے مانسوں کا کام نہیں۔ دشمن سے بھی پریم کرو، اپنے آپ کو مارو، آتما کی شانتی اس سے حاصل ہو گی۔

طلوعِ اسلام ۷۱ اگست ۱۹۳۸ء

ایکہ می نازی بذبحِ گوسفند * ذبح کُن خود را کہ باشی ارجمند
زندگی را می کند ناپائیدار * جبر و قہر و انتقام و اقتدار
غافل از خود شو اگر فرزانہ * گر ز خود غافل نہ دیوانہ *
چشم بند و گوش بند و لب بہ بند تا رسد فکرِ تو بر چرخِ بلند

گوسفندکی یہ خواب آور فسوں سازی کارگر ہوگئی۔ اور شیر اس کا چیلہ بنگیا۔ اب ہستی کی جگہ اہمسا کا فلسفہ اس کی زندگی کا طرزِ عمل تھا۔ گوشت چھوڑ کر گھاس پات پر گذران ہونے لگی۔ وہ قوت و ہیبت وہ تندی و تیزی، وہ جلال و جبروت مسکینی و عاجزی۔ کمزوری و ناتوانی۔ بزدلی و دوں ہمتی میں بدل گئی رفتہ رفتہ یہ حالت ہوگئی کہ:۔

از علف آں تیزیٔ دنداں نماند ہیبتِ چشمِ شرار افشاں نماند
دل بتدریج از میانِ سینہ رفت جوہرِ آئینہ از آئینہ رفت
آں جنونِ کوششِ کامل نماند آں تقاضائے عمل در دل نماند
اقتدار و عزم و استقلال رفت اعتبار و عزت و اقبال رفت
پنجہ ہائے آہنی بے زور شد * مُردہ شد دلہا و تنہا گور شد
صد مرض پیدا شد از بے ہمتی * کوتہ دستی۔ بیدلی۔ دوں فطرتی

نتیجہ یہ کہ:۔ شیر بیدار از فسونِ میش خفت۔
اور قیامت یہ کہ:۔ انحطاطِ خویش را تہذیب گفت

ناصحانِ مشفق۔

یہ گوسفندی ناصحانِ مشفق پہلے پادریوں کی صورت میں جلوہ فرما ہوا کرتے تھے۔ انگلستان سے چلتے تو اپنے اسلحہ بنانے والے کارخانوں کو تاکید کر آتے کہ دیکھنا تمہاری بھٹیاں کہیں ٹھنڈی نہ پڑجائیں۔ سولہ سولہ انچ دھانے کی توپیں، چار چار من کے گولے، ڈھلتے چلے جائیں لیکن مشرق میں مسلمانوں کو "مسیح" کی منادی سُنائی جاتی کہ خدا کی بادشاہت کمزوروں ناتوانوں اور ضعیفوں کا حصہ ہے

انہیم کھاکر سورہوتا کہ ملوکیت کے شکنجے اچھی طرح سے ہم پر کسے جائیں وہ ان کو آسمانی بادشاہت
کے خواب آور افسانے سناتے رہے حتیٰ کہ زمین کی بادشاہت یکسر دوسروں کے ہاتھ میں چلی گئی۔
وہ دَور ختم ہوا تو وہی بھیڑاب سادھو مہاتماؤں کے چولے میں مسلمانوں کے سامنے اہنسا کا پرچار
کرنے لگی۔ ڈاکٹر مونجے ملٹری کالج کھول رہا ہے۔ بھائی پرمانند سنگھٹن کے اکھاڑے قائم کر رہا
ہے۔ اور کوئی ان کو آتما گیان اہنسا کا سلوک نہیں سناتا۔ لیکن مہاتما گاندھی کا نازک دل انتہا
کے ظلم و ستم سے اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ سرحد کے پٹھانوں کو اہنسا کا سبق دینے جاتے ہیں۔

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

"پٹھان کا ہوا" بھارت ماتا کے سر پر جن کی طرح سوار تھا۔ اس کے دفعیہ کا یہی مؤثر طریقہ سمجھا گیا
کہ اپنے ہاں ملٹری کالج کھولے جائیں اور وہاں کے "خان" کو "گاندھیؔ" بنا کر ہاتھ باندھ کر ڈنڈوت
کرنا سکھایا جائے اور اس کے بعد جبری تعلیم رائج کی جائے۔ اس میں بچوں کے دلوں پر یہ نقش
کیا جائے کہ اہسا کا نظریۂ زندگی ہمیشہ ہمسا سے اچھا ہوتا ہے۔ یہی نہیں۔ ہمسا کی برائیاں اچھی
طرح سے واضح کی جائیں اور تاریخِ عالم سے ان مشاہیر کی کہانیاں پڑھائی جائیں جنہوں نے اہنسا
کے ذریعے سے دنیا میں امن حاصل کیا ہے۔ یعنی مہاتما بدھ کی سوانح حیات اُجاگر کر کے دکھائی
جائے اور محمد الرسول اللہ کی زندگی (نعوذ باللہ) گھناؤنی بتائی جائے ہندوستانی غلاموں کا دستور
حیات درخشندہ نظر آئے۔ اور عمرؓ و خالدؓ کا طرزِ عمل (حاکم بدہن) امر دود قرار پا جائے۔ ذرا
تصور میں لائیے اس وقت کو کہ آپ کے بچے سات برس کی عمر سے چودہ برس کی عمر تک اس تعلیم
کے لئے مجبور کئے جائیں جس کی رُو سے نبی اکرمؐ سے لیکر شاہ اسمعیل شہیدؒ تک تمام مجاہدینِ اسلام
کا فلسفۂ حیات نفرت انگیز ہو۔ اور اس کے برعکس ہندوستان کے تمام یوگی، سنیاسی اور ان کے
سرخیل مہاتما گاندھی خدا کے اوتار سمجھے جائیں۔ غور فرمائیے کہ نتیجہ کیا ہوگا۔ ہندو کی تو سلطنت ہوگی
اس لئے ان کے بچوں کو اہسا پڑھائیے یا ہمسا، اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ بلکہ اہمسا سے

طلوعِ اسلام ۷۳ اگست ۳۸ء

ان کے دلوں میں اپنے بزرگوں کی عزّت۔ اپنے مذہب کی عظمت اور مسلمانوں کے مشاہیر سے نفرت اور ان کے مذہب سے حقارت کے جذبات پیدا ہونگے۔ لیکن غور فرمایئے کہ مسلمان بچّوں کی ذہنی اور قلبی کیفیّت کیا سے کیا بن جائے گی۔ مہاتماجی کس قدر معصومانہ انداز سے فرماتے ہیں کہ موجودہ انداز پر مذہبی تعلیم سے چونکہ اختلافات بڑھتے ہیں۔ اس لیئے مذہبی تعلیم کو واردھا اسکیم سے خارج کر دیا گیا ہے لیکن ان سے کوئی پوچھے کہ اہنسا کی خوبیاں اور ہمسا کی بُرائیاں بتانے سے کوئی اختلاف نہ پیدا ہوگا! اس "مہاتمیّت" کے چوپے کو اُتار دیجئے تو نیچے سے صاف نظر آجائے گا کہ مقصدِ اصل کیا ہے! مقصد یہ ہے کہ مذہبِ اسلام کی تعلیم جبرًا روک دی جائے اور اسکے بجائے ہندومت کی تعلیم عام کر دی جائے۔

اعترافِ حقیقت

تہنا اہمسا اور اسلامی تعلیم میں اتنا کھُلا ہوا فرق ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب پچھلے دنوں جب واردھا اسکیم کے سلسلہ میں شملہ تشریف لائے تو انھوں نے اسکیم کے متعلق صنڈل ہال میں تقریر فرمائی۔ تقریر کے بعد ایک پرائیویٹ صحبت میں اُن سے اہمسا اور اسلامی فلسفۂ حیات کے متعلّق کچھ سوالات کئے گئے تو انھوں نے دو ہی قدم پر جاکر کھُلے الفاظ میں اقرار کر لیا کہ فی الواقعہ یہ غلطی ہے۔ اسلام کا فلسفۂ زندگی صرف اہمسا نہیں بلکہ ہمسا اور اہمسا دونوں کا امتزاج ہے۔ اب پتہ نہیں کہ جناب ڈاکٹر صاحب اس غلطی کا اعلان بھی فرماتے ہیں یا نہیں۔ لیکن ہم تو بالکل واضح الفاظ میں اعلان کر دینا چاہتے ہیں کہ اسلام نرمی اور انکساری کے ساتھ ساتھ سختی اور درشتی کا بھی مذہب ہے۔ یہ جلالؔ اور جمالؔ کا مذہب ہے۔ یہ محبت اور قوت کا مذہب ہے۔ اشداءُ علی الکُفّار بھی اسی خدا کا حکم ہے۔ جس کا حکم رحماءُ بینہم ہے۔ فاقتلوھم حیث ثقفتموھم (فتنہ پردازوں کو جہاں پاؤ کچل دو) یہ بھی اسی خدا کا ارشاد ہے جس کا ارشاد فاعفوا واصفحوا (معاف کرو اور درگذری کرو) ہے۔ مسلمان کو حکم ہے کہ

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر — شبستانِ محبّت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گذر جا بن کے سیلِ تند رُو کوہ و بیاباں سے — گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

یہ ہے وہ تعلیم جوان بچّوں کے شایانِ شان ہے۔ جو تیغوں کے سائے میں پل کر جوان ہوتے ہیں۔

نہ کہ اہنسا کی خود فریبی۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ہندوستان میں مسلمان کی آج کیا حالت ہے ہمیں تو اس سے غرض ہے کہ وہ مذہب جسے مسلمان خدا کا سچا مذہب سمجھتا ہے اس کی تعلیم کیا ہے۔

اب ذرا سماج کے علم کے ان دو ٹکڑوں کو ملائیے:

(۱) تمام مذاہب، اسلام اور ہندومت، اصولی طور پر یکساں ہیں کسی کو دوسرے پر تفوق نہیں۔

(۲) فلسفۂ زندگی کے اعتبار سے اہنسا کو ہمسا پر فضیلت ہے۔

فرمائیے نتیجہ کیا نکلا؟ اس پر اعلان پر اعلان ہو رہا ہے کہ یہ اسکیم مشترکہ تعلیم کی اسکیم ہے، اسے کسی مذہب کی تعلیم سے واسطہ نہیں۔ اللہ اکبر! کسقدر کھلا ہوا فریب!!

بنیادی نقش

"سماج کے علم کی ایک اور شق میں تحریر ہے کہ تعلیم ایسی دی جائے جس سے بچّے کے دل میں وطن کی محبت ہو۔ وہ ہندوستان کے پچھلے زمانہ کی عزت کرے۔ (رپورٹ صفحہ ۱۱)

بجا! مذہب کے اعتبار سے اسلام اور ہندومت یکساں

فلسفۂ زندگی کے اعتبار سے اہنسا کو ہمسا پر فوقیت

ہندو مذہب اور ہندو فلسفہ کا جس عہد میں زور تھا اس زمانے کی عزت بچّے کے دل میں بٹھادی جائے۔

اس طرح متحدہ قومیت کی تشکیل ہو گی۔ الگ الگ مذہب کی تعلیم چونکہ لڑائی جھگڑے کا موجب ہوتی ہے اس لئے اہنسا کے ودیا مندر میں اس کا گذر کیوں ہو۔ ان جھگڑوں کے مٹانے کا واحد علاج یہ ہے کہ تعلیم ایسی دی جائے جس کی رُو سے ہندو فلسفۂ زندگی کی عظمت اور ہندو دورِ تہذیب کی عزت دلوں میں نقش ہو جائے۔ اسلام کے فلسفۂ زندگی کی مذمت اور اس فلسفہ کے علمبرداران

طلوع اسلام ۷۵ اگست ۱۹۳۸ء

کی طرف سے دل میں نفرت پیدا ہو جائے جھگڑے خود بخود مٹ جائیں گے۔ جھگڑے تو اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ہندو سمجھتا ہے کہ اسلام اور مسلمان صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے لائق ہیں۔ اور مسلمان ایسا سمجھ نہیں سکتا۔ لیکن جب ہندو اور مسلمان دونوں بچے اس باب میں متفق اللسان ہوں گے کہ ہاں واقعی اسلام کا فلسفۂ حیات اور اس کے علمبرداران انسانیت کے سب سے بڑے دشمن ہیں تو پھر جھگڑا کیسے پیدا ہو گا جب سر ہی نہ رہے گا تو سر درد کہاں ہو گا! یہ ہے وہ ازلی روشنی جو اس نوعِ انسانی کے مصلحِ اعظم کو براہِ راست خدا کی طرف سے ملی ہے جس کے دل میں تمام مذاہب کے پیروؤں کے لئے جذبۂ ہمدردی یکساں موجزن ہے۔ یہ اس دیش کے مہاتما ہیں جہاں کے ہیرو کا سب سے بڑا کارنامہ یہ گنایا جاتا ہے کہ وہ جب افضل خاں سے صلح و محبت کا معانقہ کرنے کے لئے آگے بڑھا تو زیرِ آستین تیز نوکدار آہنی پنجہ چھپا رکھا تھا جو اس دوست سے بغلگیر ہونے پر اس کے قلب و جگر میں پیوست کر دیا گیا۔ اس دیش کے مہاتما سے آپ کس قسم کے سلوک کی توقع رکھ سکتے ہیں۔!

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود　　　　گرچہ از آدمی بزرگ شود

جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے شملہ کی اس پرائیویٹ صحبت میں جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے فرمایا تھا کہ "پچھلے زمانے" سے ان کی مراد صرف ہندوؤں کا زمانہ ہی نہیں بلکہ اس میں مسلمانوں کا زمانہ بھی شامل ہے۔ لیکن جب یہ عرض کیا گیا کہ مسلمانوں کے زمانہ میں تو ہنسا کے علمبردار ہی نظر آئیں گے۔ اس زمانہ کی عزت بچے کے دل میں کیسے بٹھائی جائے گی۔ تو انہوں نے فرمایا کہ اس زمانہ کے صوفیائے کرام کے حالات بتائے جائیں گے جنہوں نے اہنسا کے مطابق زندگی بسر کی ہے۔

ہم اس وقت اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتے کہ وہ حضراتؒ جن پر حقیقی معنوں میں "اولیاءاللہ" کا لقب صادر ہوتا ہے۔ وقت آنے پر وہ کس طرح تسبیح و مصلے کے ساتھ ساتھ شمشیر و سناں کی بھی

عین اسلام سمجھتے تھے۔ لیکن ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے اندر بھی خوبی صرف اسی چیز میں رہ گئی ہے جو ہندوؤں کے نظریۂ زندگی کے مطابق ہو۔ اسلام کا دوسرا حصہ یعنی مجاہدانہ حرارت کا شعبہ چونکہ اہنسا کے نظریہ کے مطابق نہیں رہا ہے۔ اس لئے اس میں برائیاں ہی برائیاں ہیں۔ یہ ہے عملی تفسیر (یومنون ببعض الکتاب ویکفرون ببعض) کی۔ یعنی قرآن کے اتنے حصے پر ایمان جو اپنے نظریے کے مطابق ہو اور باقی حصہ سے انکار۔

بابِ سوم

زبان کا مسئلہ

اس کے بعد زبان کا مسئلہ آتا ہے۔ "ہندوستانی" زبان نصاب میں لازمی رکھی ہے (رپورٹ صفحہ ۱۲)۔ زبان کا مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اسے ضمنی طور پر چھیڑا نہیں جاسکتا۔ یہ مضمون بہت طویل ہو رہا ہے، اس لئے ایسے اہم سوال پر ہم کسی دوسری صحبت میں مفصل بحث کریں گے۔ (انشاء اللہ) اتنا یاد رہے کہ کسی قوم کی موت و حیات کا سوال اس قوم کی زبان اور اس کے رسم الخط کا وابستہ ہوتا ہے۔ مسلمان اس کی اہمیت سے ناواقف ہیں۔ اور ہندو چپکے ہی چپکے وہ سب کچھ کئے جارہے ہیں کہ جب اس کے نتیجہ پر نگاہ پہنچتی ہے تو روح کانپ اٹھتی ہے کہ یا اللہ مستقبل قریب میں مسلمانوں پر بیا کیا کچھ گذرنے والا ہے۔ اس وقت تو اتنا دیکھئے کہ ہندوؤں کی اس تحریک کا اثر کہ "ہندوستانی" زبان سے عربی و فارسی کے "غیر مانوس" الفاظ کو نکال دینا چاہیئے، کس قدر سُرعت سے پھیلتا جارہا ہے۔ رپورٹ زیرِ نظر میں انگریزی الفاظ تو جگہ جگہ آپ کو ملیں گے۔ مثلاً ٹریننگ، کورس، پالیسی، نارمل، ورنیکلر وغیرہ، لیکن عربی اور فارسی کے ان الفاظ کی بجائے جنہیں سمجھنے میں کسی اُردو دان کو بھی دقت نہیں ہوسکتی۔ ایسے الفاظ ٹھونسے گئے ہیں جنہیں

طلوعِ اسلام ۷۷ اگست ۱۹۳۸ء

نہ عبارت کی روانی قبول کرتی ہے نہ مذاقِ سلیم۔ جبکہ بعض الفاظ بجائے خویش ایسے غیر مانوس ہیں کہ اردو دان طبقے نے شاید ہی کبھی سنے ہوں۔ مثلاً، نئی سماج کا ڈول ڈالے جس کی نیو انسانی ہمدردی پر رکھی گئی ہو، پچھم کے ملکوں میں کسی مفید سیوا کے ذریعے۔ دھیرے دھیرے اتنی مشق ہو جائے۔ جس کی نیو۔۔۔۔ نیا دُپر رکھی جائے۔۔ وغیرہ۔ کہیئے کہ طرح ڈالنا، بنیاد مغرب، خدمت، آہستہ آہستہ، انصاف ان میں سے کونسا لفظ ایسا ہے جو عام فہم نہیں۔ ان کی جگہ خواہ مخواہ پوربیوں کی بولی گھسیٹ لانا اس بات کی کھلی کھلی غمازی کر رہا ہے کہ ہر بات میں ہندوؤں کی خوشنودی کا جذبہ کس قدر غالب آ رہا ہے۔ یہ اگر مرعوبیت نہیں تو اور کیا ہے؟

❖

باب چہارم

(معاشرت)

اب مقطع کا بند سُنیئے ارشاد ہے:

"گانا۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ بچوں کو اچھے گیت یاد ہو جائیں اور انہیں اچھے گانے کی پہچان اور شوق ہو جائے۔ بچوں میں تال کا جو قدرتی احساس ہوتا ہے اسے ترقی دینے کے لئے انہیں دونوں ہاتھوں سے تالی دینا سکھایا جائے (۲۳)"

آپ کو معلوم ہے کہ اچھے بُرے گانے کی پہچان کے لئے کس قدر راگ وِدّیا کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر سُر تال سے سیکھنے کے لئے اور کیا کچھ سیکھنا پڑتا ہے۔ رقص و سرود ہندوؤں کی پراچین تہذیب کا ایک ضروری جزو ہے۔ ڈاکٹر ٹیگور کو آپ نے دیکھا ہو گا کہ وہ بایں ہمہ پیرانہ سالی نوجوان لڑکیوں کو ساتھ لیکر شہر شہر ناچ اور گانے کا تماشا دکھاتے پھرتے تھے۔ ادھر شنکر اور اس کی پارٹی رقص و سرود کے ذریعے۔ کرشن لیلا، کی یاد تازہ کرتے پھرتے ہیں۔ ہندو گنیا پاٹھ شالوں میں راگ وغیرہ نصاب میں داخل ہے۔ لہٰذا اگر ہندو لڑکے اور لڑکیوں کے لئے راگ

کا نصاب رکھا جائے تو انہیں عین مسرت ہو گی لیکن سوال یہ ہے کہ چودہ برس کی عمر میں مسلمان لڑکیوں کو راگ اور تال سکھا کر کیا بنانا مقصود ہے؟ حضرت اکبر مرحوم نے فرمایا تھا کہ

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں
دیندار متقی ہوں جو ہوں ان کے منتظم اُستاد اچھے ہوں مگر اُستاد جی نہ ہوں

مسلمانو! ذرا غور سے دیکھو کہ آزاد ہندوستان میں جبری تعلیم کی رُو سے آپ کی بیٹیاں اور بہنیں کس قسم کی تعلیم حاصل کیا کریں گی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

❁

نتائجِ مستخرجہ

علتِ مرض

یہ ہے مختصراً واردھا سکیم جو مہاتما گاندھی کے مجلّہ دماغ سے نکل کر جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی مساعیٔ جمیلہ کے صدقے مسلمانوں کے بچّے اور بچیوں کے لئے جبری تعلیم کا نصاب بننے والی ہے بنملہ میں اسکیم پر آخری مرتبہ غور و خوض ہو چکا ہے اور اس کے بعد یہ نافذ العمل ہو جائے گی۔ مسلمانوں نے دیگر اہم مسائل کی طرح تعلیمی مسائل میں بھی ہمیشہ بے رخی برتی ہے جس کا نتیجہ ان کے سامنے ہے۔ لیکن وہ یاد رکھیں کہ اگر انہوں نے اس مرتبہ بھی ایسا ہی کیا تو پچاس برس کے اندر وہ دیکھیں گے کہ اُن کا ہندوستان میں بھی وہی حشر ہو گا جو اسپین میں ہوا تھا۔ اور پھر یہ ڈھونڈیں گے کہ وہ قوم کیا ہوئی جو اپنے آپ کو مسلمان کہا کرتی تھی۔ لیکن یہ سب باتیں فروعی ہیں۔ اصل نقص کہیں اور ہے۔ یہ تو یوں سمجھئے کہ یہاں پھوڑا نکل آیا، وہاں پھنسی ہو گئی۔ کہیں خارش نمودار ہو گئی کہیں چنبل پھوٹ نکلا۔ یہ امراض نہیں ہیں بلکہ علاماتِ مرض

ہیں۔ علّتِ مرض یہ ہے کہ خون خراب ہو چکا ہے ان پھوڑے پھنسیوں کا علاج مرہم سے نہیں ہوگا۔ خون صاف کر دینے سے ہوگا۔ یہ واردھا اسکیم، یہ مخلوط و جداگانہ طریقِ انتخاب یہ ہندی اُردو کے جھگڑے۔ سب علاماتِ مرض ہیں۔ اصل مرض یہ ہے کہ ہندو ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت بنانا چاہتے ہیں۔ تاکہ مسلمان اپنی ملی خصوصیات کھو کر کان نمک میں پہنچکر نمک بن جائیں۔ جب تک آپ اس بنیادی اصول کو پاش پاش کر کے نہ رکھدیں گے آپ کے کسی مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔ مسلمان ہندوستان میں ایک الگ قوم کی حیثیت سے رہیگا۔ اس کی الگ جماعتی زندگی ہوگی۔ اور جب قوم الگ ہوگی تو پھر اس کی زبان بھی اپنی ہوگی۔ تہذیب بھی الگ ہوگی، مذہب بھی الگ ہوگا اور تعلیم بھی الگ ہوگی۔ نہ ان کی مشترکہ قومیت ہو سکتی ہے۔ اور نہ مشترکہ تعلیم۔ ہندوؤں سے کہیئے کہ وہ اپنے بچوں کیلئے تعلیمی اسکیمیں تیار کرتے رہیں۔ انہیں کیا حق حاصل ہے کہ مسلمانوں کے بچوں کیلئے تعلیمی تجاویز سوچتے پھریں۔ اور پھر ان پر انہیں جبراً عائد کر دیں۔ اور اس طرح جو کام سوامی شردھانند نے اُٹھایا تھا پر وہ پروان نہ چڑھ سکا اسے مہاتما گاندھی پورا کر دیں۔

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

ہمیں یقین ہے کہ مسلمانوں کے لئے جو مہلک اثرات اس اسکیم کے اندر چھپا کر رکھے گئے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی نگاہوں کے سامنے وہ بے نقاب ہو کر نہیں آئے اور انہوں نے اس کو محض سطحی اور عمومی نظر سے دیکھا ہے ورنہ یہ باور کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا کہ جناب ڈاکٹر صاحب دیدہ و دانستہ ہندوؤں کی چھری سے یوں مسلمانوں کے بچوں کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کرنے پر تلے بیٹھے ہوں۔ خدا کرے کہ اس اسکیم کے ساتھ ان کی تائید غلط فہمی پر مبنی ہو۔ اور جسطرح انہوں نے شملہ میں اہنسا کے متعلق اپنی غلطی کو تسلیم کیا تھا۔ اسیطرح وہ باقی اسکیم کے متعلق تفصیلاتِ بالا کی روشنی میں غور فرما کر اس سے اپنی برئیت کا اعلان فرما دیں ورنہ یہ ظاہر ہے کہ اس اسکیم کا ان کے نام سے انتساب ملّتِ اسلامیہ کا قتل نہیں تو اعانتِ قتل کے جرم سے انہیں کبھی بَری نہیں قرار دے سکیگا۔

(تکملہ) یہ مضمون پریس میں جا چکا تھا کہ مہاتما گاندھی کا ذیل کا بیان اخبارات میں شائع ہوا:۔

"مختلف طبقات و مذاہب کے بچوں میں رواداری اور دوستی کی جو روح پیدا ہو رہی ہے میں اس کے پیش نظر اس بات کو سخت مہلک اور خطرناک سمجھتا ہوں کہ ان کو یہ سکھایا جائے کہ ان کا مذہب دیگر تمام مذاہب پر برتری رکھتا ہے یا جس مذہب کے وہ قائل ہیں ان کے نزدیک بس وہی مذہب سچا ہے۔ اگر یہ تفرقہ انگیز روح قوم میں سرایت کر گئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر فرقہ کا علیحدہ اسکول ہو جس میں ایک کو دوسرے کی مذمت کرنے کی پوری آزادی حاصل ہو یا پھر ایسی درسگاہوں میں مذہب کے تذکرہ کو بالکل ہی ممنوع قرار دیا جائے" (اسٹیٹسمین ۱۷ جولائی ۱۹۳۸ء صفحہ ۱ کالم ۲)

(نیز ہندوستان ٹائمز، ۱۷ جولائی ۱۹۳۸ء)

دیکھ لیجئے جس چیز کی طرف ہم نے اپنے مضمون میں اشارہ کیا تھا وہ لفظاً لفظاً سامنے آگئی یا نہیں! اور ابھی آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا! جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں مہاتما گاندھی کا مسلک شیر کا مسلک نہیں جو بے نقاب گرجتا پھرتا سامنے آجائے۔ بلکہ ان کا مسلک ہمیشہ گھات میں رہنے کا ہے۔ اور مسلمانوں کی تباہی کے معاملات میں تو وہ خاص طور شاطرانہ چالوں سے کام لیتے ہیں۔

پھر یہ بھی دیکھ لیجئے کہ جو کچھ مہاتما جی چاہتے ہیں وہ لفظاً لفظاً وہی ہے جو مولانا آزاد نے اپنی تفسیر میں پہلے ہی سے لکھ رکھا ہے اور اس طرح مہاتما گاندھی کے مقصد کے حصول کے لیے پہلے ہی سے زمین تیار کر چھوڑی ہے۔

اندازہ فرمایئے کہ جب مسلمان بچوں کو یہ سمجھا دیا جائیگا کہ دیگر مذاہب بھی اسلام کی طرح سچے اور خدائی مذاہب ہیں تو پھر اسلامی قوانین کی حفاظت، اسلامی تمدن و تہذیب کی حفاظت اور اسلامی حقوق کی حفاظت کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا اگر صحابہ کرامؓ کو مذہب کا یہ فلسفہ معلوم ہوتا اگر خالد بن ولیدؓ۔ عمرو بن العاصؓ اور سلطان صلاح الدینؒ کو اپنے زمانہ میں کوئی گاندھی مل جاتا تو آج اسلام کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ یعنی سرے سے اسلام کا وجود ہی نہ ہوتا اور مسلمان بہت جلد اس کیمیاوی عمل سے تحلیل ہو کر فناہ ہو جاتا۔ لیکن مہاتما گاندھی یا اور ہندوؤں کا کیا گلہ۔ انہوں نے تو مسلمانوں سے انتقام لینا ہے اور اسکے لیے وہ ہر حربہ استعمال کریں گے۔ رونا تو آتا ہے ان مسلمان اکابر

پرچون کے ان مقاصد کے حصول میں اس قدر جانفشانی سے مدد دے رہے ہیں۔ از باغبان شد استکی صبا دان منکر در

زبان کا مسئلہ[۱]

رازی

"واردھا اسکیم" والے مضمون[۲] میں ہم بصراحت لکھ چکے ہیں کہ اس آئینی تبدیلیوں کے زمانہ میں ہندوؤں کے پیشِ نظر سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ جوں جوں ملک کی حکومت ان کے ہاتھ میں آتی جائے وہ ایسی تدابیر اختیار کریں جن سے ہندوستان میں مسلمان من حیث القوم زندہ نہ رہ سکیں۔ مسلمانوں کا الگ قومی تشخص انھیں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے کیونکہ ہندوستان میں جتنی قومیں باہر سے آئیں اور جنہوں نے یہاں بود و باش اختیار کی ان میں سے صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہے جسے یہ "اکال الامم" اپنے اندر جذب نہیں کر سکا ورنہ، ان کے علاوہ سب کے سب رفتہ رفتہ یہاں پہنچ کر ہندو ہو گئے۔ مسلمانوں کی انفرادیت مٹانے کے لئے ہندو پوری قوت سے سرگرمِ عمل ہے اور اس کے لئے اس نے طریق کار وہ اختیار کیا ہے جسے ہم نے دنیا کی پُرسکون روایتوں سے تشبیہ دی تھی۔ میدانِ سیاست میں ایک "متحدہ قومیت" کی تشکیل کا حسین تصور پیش کیا جا رہا ہے اور اس کے بھیانک اور خطرناک نتائج و عواقب کو جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے "بدیشی حکومت کے خاتمہ" کے دلفریب نقاب میں پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ اختلافِ مذاہب چونکہ "ہندو مسلم اتحاد" کے راستہ میں روڑا اٹکاتا ہے اس لئے مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے کا معصوم سبق دیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کا یہ ایمان کہ اسلام تمام ادیانِ عالم پر فوقیت رکھتا ہے، چونکہ بچوں کے قلب و دماغ کو "تنگ نظری اور تعصب" کے زہر سے مسموم کر دیتا ہے اس لئے درسگاہوں میں ایک ایسے مذہب

۱؎ میرا ایک مضمون "متاعِ کارواں" کے عنوان سے رسالہ ترجمان القرآن میں شائع ہوا تھا۔ زیرِ نظر مضمون انہی خطوط پر مشتمل ہے اور اکثر اقتباسات بھی اسی سے لئے گئے ہیں۔ منہ

۲؎ مطبوعہ طلوعِ اسلام بابت اگست ۱۹۳۸ء۔ اور جو الگ پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ منہ

کی تعلیم کی تجویز کی جارہی ہے جو اکبرؔ کے دین الٰہی یعنی دور حاضرہ کے برہمو سماج کے خطوط پر متشکل ہے۔ اہنسا کے مسلک سے چونکہ سبعیت و بربریت کے خونخوار جذبات کی انگیخت ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی جگہ اہنسا کا فلسفۂ حیات جنّتِ قلب و نظر بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور تعلیم کے ان تمام غیر اسلامی عناصر کو "روٹی" کے دلکش غلاف میں لپیٹ کر ایسا خوش آیند "سنبوسہ" بنا دیا گیا ہے کہ جو دیکھے لپک کر اٹھا لے۔ اسی مقصد کے حصول کے لئے اُردو کی جگہ ہندی زبان کی ترویج ہو رہی ہے اور اصل مقصد کو نگاہوں سے اوجھل رکھنے کے لئے کہا یہ جاتا ہے کہ متحدہ قومیت کے لئے ایک مشترکہ زبان کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

مسئلہ کی اہمیت

مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور انھیں اس غلط فہمی میں اور زیادہ مبتلا کیا جارہا ہے کہ زبان کا مسئلہ محض ایک ادبی مسئلہ ہے کسی قوم کے مذہب اور تہذیب سے اسکا کیا تعلق؟ لیکن انھیں یہ معلوم نہیں کہ کسی قومیت کو بنانے اور بگاڑنے میں کسی تہذیب کو زندہ رکھنے اور فنا کر دینے میں کسی قوم کا مذہب سے تعلّق باقی رکھنے اور منقطع کر دینے میں۔ زبان کا ایک غیر معمولی اثر ہوا کرتا ہے جس قوم کے پاس اپنی زبان اور اپنا رسم الخط ہے وہ ایک مستقل قوم ہے۔ اور جس قوم کی زبان میں خود اپنا لٹریچر موجود ہے اور ترقی کر رہا ہے وہ ایک زندہ قوم ہے۔ جس وقت وہ قوم اپنی زبان چھوڑنے اور اپنا رسم الخط بدل دینے پر آمادہ ہو جائے اُس وقت سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اپنی قومیت کو بدل رہی ہے، اپنی تہذیب سے رشتہ منقطع کر رہی ہے اپنی قبر اپنے ہاتھوں کھود رہی ہے۔ غیر محسوس طور پر تباہی اور بربادی کے عمیق غاروں کی طرف کھنچی جارہی ہے۔

یہ ایک "تنگ نظر" مسلمان ہی کا خیال نہیں ہے بلکہ "کشادہ ظرف" ہندو بھی اس کے مؤید ہیں چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں۔

"ایک قوم کے لئے زبان کا مسئلہ ہمیشہ بڑا اہم رہا ہے۔ آج سے تین سو برس

بیشتر ملٹن نے فلورنس سے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے اسکی اہمیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔ کسی قوم کے اپنی ایک زبان رکھنے کو خواہ وہ زبان بگڑی ہوئی ہو یا خالص ہو ایک غیر اہم سا واقعہ نہ سمجھ لینا چاہیئے۔ اور نہ اس امر کو کہ اس کے افراد زبان کے برتنے میں صحت کا کہاں تک لحاظ رکھتے ہیں.... کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ملتی کہ کوئی سلطنت یا مملکت اسوقت تک اوسط درجے کی خوشحالی و فلاح سے محروم کر دی جاسکتی ہو جس وقت تک اس کے افراد اپنی زبان کو پسند کرتے اور اس کی طرف کافی توجہ کرتے رہے ہوں"

ایک دوسری جگہ پنڈت جی فرماتے ہیں۔

"رسم الخط اور ادب کا بہت ہی گہرا تعلق ہے اور رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جسکا ماضی شاندار رہا ہو۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدلجاتی ہیں۔ آوازیں بدلجاتی ہیں اور خیالات بدل جاتے ہیں۔ قدیم و جدید ادب کے درمیان ایک ناقابلِ عبور دیوار حائل ہوجاتی ہے اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مردہ ہوچکی ہے" (میری کہانی جلد اول ۲۹۵)

ان الفاظ کو ذرا غور سے پڑھیئے اور انھیں دل کی گہرائیوں میں جگہ دیجئے کیونکہ اس مضمون میں ان کی طرف بار بار توجہ کرنی پڑے گی۔

اُستادانِ ازلی"

ہم "واردھا اسکیم" والے مضمون میں بتا چکے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تہذیب و تمدن بلکہ مذہب کو مٹانے کے لیئے ہندو کسطرح انگریز کے قدم بقدم چل رہا ہے۔

اِس لئے کہ بساطِ سیاست کی تمام چالیں ہندو نے انگریز ہی سے سیکھی ہیں۔ انگریزوں نے انگریزی زبان کو سرکاری زبان اور ذریعۂ تعلیم قرار دیکر جو کاری ضرب [illegible] لگائی تھی اسکا نتیجہ آپ اپنے ماحول میں دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے غلاموں کی زبان رور نیکلر کو بحکم نہیں مٹایا اسے بدلنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسے زندہ رہنے کا حق اسی طرح دیا۔ جسطرح "مذہبی آزادی" کا حق عنایت کیا ہے بلکہ اسی طرح کراچی کے رزولیشن میں "بنیادی حقوق" کے سلسلہ میں کانگریس کی طرف سے یہ حق دیا گیا ہے۔ انگریزوں نے صرف اتنا ہی کیا کہ ذریعۂ تعلیم کو بدل دیا۔ اور جدید زبان جاننے والوں کے لئے ترقی کے دروازے کھولدیئے۔ سنو سال کی مدت کسی قوم کی زندگی میں کوئی مدت نہیں، مگر آپ نے دیکھا کہ اس سنو سال کے اندر اس پالیسی نے کیا نتائج پیدا کر دیئے۔ ہم انگریزی پر ٹوٹ پڑے۔ ہمارے تعلیم یافتہ حضرات اپنی زبان سے اور اس کے ساتھ ہی اپنے ماضی سے۔ اپنی قومی روایات سے اپنے لٹریچر سے۔ اپنی تہذیب تمدن سے اور اپنے خیالات سے بیگانہ ہوگئے۔ انگریزی زبان اور انگریزی قوم کے خیالات ہمارے دل و دماغ کی انتہائی گہرائیوں میں گھس گئے اور اس پالیسی نے ہمیں اندر سے بدل دیا (جسے قرآن کریم "تغیّر نفس" کہتا ہے کہ جس کے بدلنے سے ساری قوم بدل جاتی ہے) گویا وہ مقصد حاصل ہوگیا جسکے پیش نظر میکالے اور اسکے رفقاء کار نے یہ شاہ ضرب تجویز کی تھی یعنی "اس زبان کے ذریعہ سے ایک ایسی قوم پیدا ہوگی جو رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی مگر روح کے اعتبار سے انگریز ہوگی"۔ ذرا اپنے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ کی ساخت کو ملاحظہ فرمایئے وہ کسقدر مغربی قالب میں ڈھل چکے ہیں۔ انگریزوں نے مذہبی آزادی کو برقرار رکھا۔ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن میں مداخلت نہیں کی لیکن ایک زبان کے بدل دینے سے قوم کی قوم کو انکے مذہب اور تمدن سے اسقدر بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر بنا دیا کہ عیسائی مشنریز با دری ہزار برس بھی مسیح کی منادی کرتے

رہتے تو یہ نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔ ہماری حالت آج یہ ہے کہ آنکھیں اپنی ہیں لیکن دیکھتے کسی اور کی نگاہ سے ہیں، کان اپنے ہیں لیکن سنتے کسی اور کی قوت سماعت سے ہیں، دل اپنے ہیں لیکن سمجھتے کسی اور کے ذریعۂ ادراک سے ہیں ہم بالکل "ہز ماسٹرز وائس" بن گئے ہیں ایک انگریز مسلمان ہو کر بھی "انگریز" ہی رہتا ہے۔ لیکن ایک تعلیم یافتہ مسلمان مسلمان کہلاتے ہوئے بھی "مسلمان" نہیں ہوتا۔ یہ قلب نظر کی تبدیلی کس چیز نے پیدا کر دی؟ یہ ذہنیت کس نے بدل دی؟ صرف ایک زبان کی تبدیلی نے۔ اور وہ تبدیلی بھی جبری تبدیلی نہیں۔ آپکی زبان کو مٹا کر نہیں بلکہ خوشی۔ آپ کی پوری آزادی برقرار رکھتے ہوئے مدرسوں میں عربی۔ فارسی۔ اردو کی تعلیم کی باقاعدہ اجازت دیتے ہوئے تعلیم کو اختیاری رکھتے ہوئے (یعنی جسکا جی چاہے بچے کو پڑھائے نہ جی چاہے نہ پڑھائے) آپ کے رسم الخط کو برقرار رکھتے ہوئے! سمجھے آپ کہ زبان کا مسئلہ کسقدر اہم ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَار

"شاگردان رشید"

ہندوستانی قومیت کے معمار بھی انھیں کے شاگرد ہیں انھوں نے اپنی قومیت کو بنانے اور دوسروں کی قومیت کو بگاڑنے کی تدابیر بھی انھیں سے سیکھی ہیں۔ انگریز چونکہ غیر ملکی تھا اس لئے اس کے نظر فریب مصالح مشتبہ نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے لیکن یہ چونکہ اسی ملک کے لوگ ہیں اس لئے انکے لیئے وہ انقلاب پیدا کر دینا آسان ہے جس کی جرأت ان کے استاد نہیں کر سکتے تھے کیونکہ انکے پاس "وطن کی مشترکہ فلاح و بہبود" کا دعویٰ ایک ایسا کارگر حربہ ہے جسکے ذریعہ وہ مسلمانوں کو مکمل فریب دے سکتے ہیں (اور دے رہے ہیں) اور کوئی انکو ٹوکنے کی جرأت نہیں کر سکتا تاوقتیکہ اس میں "تو ڈی۔ رجعت پسند۔ سامراج پرست" کے گھناؤنے القاب سننے کی ہمت نہ ہو۔ انگریز یہاں "متحدہ قومیت" کا تصور پیش نہیں کر سکتے تھے اس لئے کہ ایسا کرنے سے انکی اقلیت یہاں کی اکثریت میں

گم ہوجاتی لہٰذا انھوں نے حاکم ومحکوم کے فرق کو محفوظ رکھا لیکن اسکا تلخ نتیجہ آج انکے سامنے ہے۔ ہندو اس تجربہ سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے اور بجائے اسکے کہ اپنی اکثریت کو الگ حاکم قوم کی شکل میں متمیز کر کے اقلیتوں کے دل میں محکومیت کے نفرت انگیز احساس کو زندہ رکھے جو بالآخر حاکم قوم کے خلاف انقلابی رنگ اختیار کرلیتا ہے۔ وہ اپنی حکومت کے استحکام کے لیئے یہ بات زیادہ مصلحت آمیز سمجھتا ہے کہ ایک متحدہ قومیت کے جاذبِ نظر تصور کو پیش کر کے اقلیتوں کو اکثریت کی زنبیل میں لپیٹ لے اور انکا رنگ یوں قائم نہ رہنے دے اقلیتیں یہ سمجھ کر خوشی خوشی اکثریت کے اندر جذب ہوجائیں کہ ہم جمہوری حکومت کی مشینری کا ایک جزوِ لاینفک بن رہی ہیں گو کہ حقیقت یہ ہو کہ مشینری ان کو اس انداز سے پیسکر رکھدے کہ آئندہ انکی طرف سے کوئی خطرہ ہی باقی نہ رہے یعنی یہ اپنا الگ قومی تشخص کھو کر اکثریت کے اندر ہی جذب ہوجائیں۔ تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

مخلوط انتخاب۔ مخلوط پرچم۔ مخلوط نام۔ مخلوط تعلیم۔ اور اس کے بعد مخلوط زبان اسی مخلوط قومیت کی طرف لے جانے والے راستے ہیں جن سے مقصدِ وحید یہ ہے کہ مسلمانوں کی اہم اقلیت جو ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کی حالت میں اکثریت کی حکومت کے لیئے خارِ چشم کا حکم رکھتی ہے۔ اکثریت کے اندر جذب ہوجائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیئے مسلمانوں کی زبان کا مٹانا نہایت ضروری ہے۔ اور اس کیلئے آج ہندو پوری سرگرمی سے مصروفِ جدوجہد ہے۔ چنانچہ جیسا کہ ہم "واردھا اسکیم" والے مضمون میں لکھ چکے ہیں "آزادئ ہند کے سب سے بڑے علمبردار مہاتما گاندھی نے "سیاست" سے الگ ہو کر خالص "اصلاحی" تحریکوں کو اپنا نصب العین زندگی بنا رکھا ہے۔ ان میں اچھوتوں کی اصلاح اور ہندی کی ترویج اہم تحریکیں ہیں۔ خدانکردہ انکا مقصد یہ نہیں کہ اُردو زبان اور اسکے رسم الخط کو مٹا ڈالیں۔ انکا مقصد تو صرف اسقدر ہے۔ اور کسقدر پاک مقصد ہے کہ ہندی زبان کو دیوناگری رسم الخط کے ساتھ

ہندوستان کی "قومی زبان" بنا دیں۔ اگر اسکا نتیجہ عملاً وہی نکلتا ہو جو اُردو زبان کے مٹانے کا ہو سکتا ہے یا اس سے اُردو زبان خود بخود "مٹ جاتی" تو اس میں مہاتما جی کا کیا قصور۔ اس لئے کہ کانگریس کے شعبۂ اسلامیات کے انچارج ڈاکٹر اشرف صاحب ہمکو ایک سرکاری کمیونک میں یقین دلا رہے ہیں کہ گاندھی جی کو ایسا کرنیکا پورا پورا حق حاصل ہے اور انکا یہ فعل "فرقہ پرستی" نہیں۔ ہاں اس کے مقابلہ میں کچھ کہنا ضرور "فرقہ پرستی" ہے

گاندھی جی کا خیال یہ ہے کہ ہندی زبان ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے اور وہ دیوناگری رسم الخط ہی ہندوستان کا رسم الخط ہونا چاہیئے (ہریجن بحوالہ ٹریبون مورخہ ۸ر جولائی ۱۹۳۸ء) مگر یہ بات وہ ہندو "فرقہ پرست" ہونے کی حیثیت سے نہیں کہتے بلکہ انکا خیال یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو، مسلمان اور دوسری قوموں کو ملا کر جو قوم بنانا پیش نظر ہے اسکی زبان ہندی ہو اور رسم الخط ہندوستانی۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے وہ طریق کار اختیار کیا ہے جو ایک ٹھیٹھ "قوم پرست" کو اختیار کرنا چاہیئے۔ وہ جب کانگریس میں تشریف لاتے ہیں تو ہندوستان کی مشترک "قومی زبان" کا نام "ہندوستانی" رکھتے ہیں مگر جب ہندی سمیلن میں تشریف لیجاتے ہیں تو اسی قومی زبان کا نام "ہندی" ہو جاتا ہے۔

مدراس میں ہندی سمیلن کا جو اجلاس ہوا تھا اس میں گاندھی جی نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا

> "صرف ہندی زبان میں جسکا بعد میں جا کر دوسرا نام ہندوستانی اور اُردو بھی پڑ گیا، اور جو دیوناگری اور اُردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، اسکی صلاحیت تھی اور ہے کہ وہ ہمارے ملک کی مشترک زبان قرار دیجائے" (ملاحظہ ہو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے شعبۂ اطلاعات سیاسی و معیشتی کا کمیونک)

اسی رجحان کے تحت "ہندی ہندوستانی" کی اصطلاح وضع کی گئی اور پھر اسکا نام "ہندی یعنی ہندوستانی" (ہندی یعنی ہندوستانی) ہو گیا۔

ایک دوسرے موقع پر بھارتیہ ساہتیہ پریشد (وفاق ادبیات ہند) کے اجلاس منعقدہ

مدراس میں گاندھی جی نے جو تقریر فرمائی اس کے حسبِ ذیل فقرے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے شعبۂ اطلاعاتِ سیاسی و معاشی کے سرکاری بیان سے نقل کیے جاتے ہیں جن سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ "فرقہ پرستی" کے برخلاف "قوم پرستی" کس طرح کام کرتی ہے

"میں نے آج نہیں بلکہ ۱۹۱۸ء میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر کی حیثیت سے ہندی بولنے والی دنیا کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ ہم لوگ ہندی کے مفہوم کو اتنا وسیع کر دیں کہ اس کی تعریف میں اُردو آ جائے۔ جب ۱۹۳۵ء میں میں نے دوسری بار سمیلن کی صدارت کی تو میں نے "ہندی" اصطلاح کی باضابطہ طور پر اس طرح تعریف کی کہ ہندی اس زبان کا نام ہے جسے ہندو اور مسلمان دونوں بولتے ہیں اور جو اُردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اس توضیح سے میرا منشا یہ تھا کہ ہندی زبان بیک وقت مولانا شبلی کی فصیح و بلیغ اُردو اور پنڈت شیام سندر داس کی فصیح و بلیغ ہندی پر مشتمل ہو۔ اس کے بعد بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا زمانہ آیا جو ہندی سمیلن کی ضمنی تحریک ہے۔ اس کے اجلاس میں میری سفارش پر ہندی کے بجائے ہندی ہندوستانی کی اصطلاح اختیار کی گئی۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اس اجلاس میں میری پرزور مخالفت کی مگر میں ان کی تجویز نہ ماننے کے لیے مجبور تھا۔ اگر مولوی صاحب کی تجویز کے مطابق میں ہندی کے لفظ کو نکال دیتا تو یہ میرے اور سمیلن کے اوپر ظلم تھا اس لیے کہ یہ لفظ ہندی سمیلن والوں کا دیا ہوا تھا اور وہ میری سفارش پر ہندی کی تعریف میں اُردو کو داخل کر چکے تھے۔ اس بات کو بھی ذہن میں رکھیے کہ "ہندی" لفظ کچھ ہندوؤں کی اختراع نہیں ہے یہ نام مسلمانوں کی آمد کے بعد پڑا ہے اور اس سے مراد وہ زبان ہے جو اس وقت شمالی ہند کے ہندو مسلمان بولتے اور لکھتے پڑھتے تھے۔ لاتعداد مشہور و معروف مسلمان مصنفوں نے اپنی مادری زبان کو "ہندی" نام سے یاد کیا ہے پھر اب جبکہ ہندی زبان کی حد بندی میں ہندو اور مسلمان دونوں کی ہر قسم کی تحریری اور تقریری زبان شامل ہے تو لفظوں کے اختلاف پر یہ ہنگامہ و شور و غوغا کیوں ہے؟

اس بحث کا ایک پہلو اور بھی سوچنے کے قابل ہے۔ جہاں تک جنوبی ہند کی زبانوں کا تعلق ہے وہ صرف ایسی ہندی سے لاگ رکھ سکتی ہیں جن میں سنسکرت کے الفاظ کی ملاوٹ ہو اس لیے کہ

یہ زبانیں سنسکرت کے بعض الفاظ اور سنسکرت آوازوں سے مانوس ہیں"۔

اب آپ کے سامنے ہندوستان کی "قومی زبان" کے ارتقاء کا وہ پورا نقشہ آجاتا ہے جو قومیت ہند کے اس معمار اعظم کے پیش نظر ہے۔ اس نقشہ کے مطابق پہلا مرحلہ یہ ہے کہ "ہندی" کے دامن کو پھیلا کر "اردو" کو اس میں سمیٹ لیا جائے۔ اردو کے علیحدہ نام سے جو امتیاز ان دونوں زبانوں میں پیدا ہوتا ہے وہ محض ذرا سے تبدیل نام کے ساتھ مٹا دیا جائے اور ان دونوں کو ملا کر ایک نام "ہندی" سے موسوم کیا جائے تاکہ یہ تخیل زندہ نہ رہ سکے کہ یہ دو الگ زبانیں ہیں۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ جنوبی ہند کی زبانوں سے تعلق پیدا کرنے کی خاطر اردو کو آہستہ آہستہ ہندی کے قریب لایا جائے۔ اس میں ہندی اسالیب بیان، سنسکرت الفاظ اور سنسکرت آوازیں پیدا کی جائیں اور اس طرح "ہندی" کا دامن اردو کو سمیٹ لئے ہوئے سکڑنا شروع ہو یہاں تک کہ وہ اپنے اسالیب بیان اور اپنے ذخیرہ الفاظ اور آوازوں کی حد تک کوئی علیحدہ زبان نہ رہے۔ بلکہ ہندی کے وجود میں تحلیل ہو کر رہ جائے۔

تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جب وہ اس طور پر ہندی میں تحلیل ہو جائے تو رفتہ رفتہ رسم الخط کے امتیاز کو بھی دور کر دیا جائے۔ سردست رسم الخط کو بدلنے کی ضرورت نہیں۔ کراچی ریزولیوشن کے کھلونے سے اردو والے دل بہلاتے ہیں۔ جب قوم پرستی بڑھے گی اور اس کے اثر سے زبان کے الفاظ اور آوازوں میں تغیر پیدا ہو گا تو آہستہ آہستہ رسم الخط خود بدل جائیگا۔ ان تینوں مرحلوں کو اگر آپ ایک مثال کے ذریعہ سے سمجھنا چاہتے ہیں تو یوں سمجھئے کہ پہلے عبداللہ کا نام پرمیشری داس رکھ دیا جائے۔ جب وہ اس پر کان کھڑے کرے تو اس سے کہا جائے کہ میاں محض لفظوں کے اختلاف پر ہنگامہ اور شور و غوغا کیوں بپا کرتے ہو۔ پرمیشری داس کے معنی بھی تو وہی ہیں جو عبداللہ کے معنی ہیں۔ صرف الفاظ ہی تو بدلتے ہیں معنی میں تو کوئی فرق نہیں آتا۔ جب وہ اس طرح سمجھانے پر مان جائے تو پھر اسے یہ سمجھایا جائے کہ بھائی پرمیشری داس! ذرا کبھی کبھی دھوتی باندھ لیا کرو، اپنا ہی بھوجن جو تم کھاتے ہو تپائی پر رکھ کر کھانے لگو۔ اس میں کوئی حرج تو ہے نہیں اور فائدہ یہ ہے کہ یہ کروڑوں کی آبادی جس کے ساتھ تمہارا رہنا سہنا اور مرنا جینا ہے اس سے تمہاری اجنبیت دور ہو جائیگی۔ جب پرمیشری داس ہمارے اس معقول تجویز کو بھی مان لیں تو انکو زیادہ چھیڑو نہیں۔ آہستہ آہستہ اسی راستہ پر بڑھنے دو۔ اگر وہ نہیں تو ان کے صاحبزادے دھرمچند (جو شاید پہلے قمرالدین ہوتے) یا ان کے پوتے رام پیارے (جو حبیب اللہ ہوتے اگر یہ چال نہ چلی جاتی) خود بخود شدھ پیدا ہونگے بغیر اس کے کہ ان کی شدھی کے لئے شنکراچاریہ آف شاردا پیٹھ کی مدد حاصل کی جائے۔ ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت پیدا کرنے کی اس سے بہتر تدبیر اور کیا ہو سکتی ہے؟

ہندی زبان

مہاتما گاندھی نے اپنے دعوے کے اثبات میں اس واقعہ سے بھی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے کہ قدیم زمانہ میں خود مسلمان بھی اُردو کو ہندی کے نام سے تعبیر کیا کرتے تھے اس لئے اگر اب ہندوستان کے مشترکہ زبان کا نام "ہندی" رکھ دیا جائے تو یہ گویا اصل کی طرف رجوع کرنا ہوگا یہ دلیل بظاہر کس قدر خوش آئند و محکم ہے اور کتنی انصاف پر مبنی ہے، لیکن جن حضرات کی نگاہ تاریخ کے اوراق پر ہے۔ انہیں یہ معلوم کرنے میں زیادہ دِقت نہ ہوگی کہ مہاتما جی نے حقیقت کو کتنے باریک "چلمنی پردہ" میں چھپانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ مسلمان قواعدِ زبان کی رُو سے ہند کی ہر چیز کو یائے نسبتی کے ساتھ ہندی کہتے تھے، (جیسے عرب سے عربی۔ فارس سے فارسی۔ اسی طرح ہند سے ہندی) اس وقت یہاں کی مروّجہ زبان کے مقابلہ میں کوئی اور زبان ایسی تھی ہی نہیں، جسے اصطلاحاً ایک الگ نام رکھانے کی ضرورت محسوس ہوتی، وہ زبان جسے آجکل کی اصطلاح میں "ہندی" کہتے ہیں بعد کی پیداوار ہے۔ اور خالص ہندوانہ ذہنیت کی پیداوار۔ اربابِ علم سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اٹھارویں صدی کے آخر تک اُردو کے مقابلہ میں کسی اصطلاحی "ہندی" زبان کا چرچا نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۳ء میں للوجی نے پریم ساگر نامی کتاب لکھی۔ یہ ناگری رسم الخط میں تھی اور اس میں اُردو اس قسم کی استعمال کی گئی تھی جس سے فارسی کے عناصر فی الجملہ خارج کر دیئے گئے تھے، اور ان کی جگہ سنسکرت کے الفاظ زیادہ استعمال کئے گئے تھے، یہ تھی ہندی کی کتاب۔ یعنی اُردو کے مقابلہ میں ایک نئی زبان جسے اصطلاح میں ہندی کہا گیا۔ چونکہ اس زبان کا رسم الخط فارسی رسم الخط (یعنی مسلمانوں کے رسم الخط) سے مختلف تھا، اور سنسکرت کے رسم الخط (یعنی ہندوؤں کی قدیم زبان کے رسم الخط) کے مطابق۔ نیز اس میں عربی فارسی الفاظ کے بجائے سنسکرت کے الفاظ کے استعمال کی طرف زیادہ رجحان تھا۔ اس لئے ہندوؤں نے اسے اپنی زبان قرار دے لیا اور اس کی نشر و اشاعت میں دلچسپی لینے لگے، مسلمانوں کے نزدیک یہ بات کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ اس لئے انہوں نے

اس تحریک کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ لیکن ہندو تو بساطِ سیاست کے بڑے گہرے شاطر واقع ہوئے ہیں، مسلمانوں کی سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ یہ تحریک بھی بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ ۱۸۶۹ء میں اس نے ایک خاص منظم صورت اختیار کر لی جبکہ ۲ دسمبر کو بابو سردو پرشاد نے یہ مطالبہ پیش کر دیا کہ الٰہ آباد انسٹی ٹیوٹ کی روئداد اردو کے بجائے ہندی میں لکھی جائے اسوقت کچھ اربابِ بصیرت مسلمانوں نے اس خطرہ کو محسوس کیا۔ اور سر سید۔ سید وارث علی خان بہادر میر سید محمدؐ۔ فدا حسین اور منصور احمد وغیرہ حضرات نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ۔ جلوۂ طور میرٹھ۔ اور اودھ اخبار لکھنؤ میں اس کے خلاف مضامین لکھے۔ مسلمانوں کا چونکہ دورِ انحطاط تھا اس لئے اُن کی مساعی قلم و قرطاس کی حد سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ بلکہ اس کے بعد تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی۔ لیکن ہندو اپنی دوسری تحریکوں کی طرح اس تحریک کو بھی منظم طریق پر آگے بڑھاتے رہے۔ اور پوری استقامت کے ساتھ اسے جاری رکھا حتیٰ کہ اب وہ اسے ایک قومی تحریک کا خوشنما لباس پہنا کر میدانِ عمل میں لے آئے ہیں، ہندو ان تمام تحریکوں کو کم و بیش نصف صدی سے آتشِ خاموش کیطرح اندر ہی اندر سلگاتے چلے آرہے ہیں، اور مسلمانوں کو اسوقت ہوش آیا ہے۔ جبکہ وہ پوری حدت اور تمازت کے ساتھ شعلہ بار ہو چکی ہیں، پھر چونکہ ہندو اُن تمام تحریکوں کو منظم طریق پر چلا رہے ہیں نہ کہ ہنگامی انداز سے اس لئے انہوں نے ایک "مشترکہ مقصد" یعنی "حصولِ آزادی کے لئے متحدہ قومیت کی تشکیل" کی کوشش کے ماتحت کچھ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ اور اس طرح سے ان خالص ہندوانہ تحریکوں کو "قومی" تحریکوں کا لیبل لگا کر میدانِ سیاست میں لئے آرہے ہیں ۱۸۶۹-۷۰ء میں چونکہ ایک طرف سر سید اور منصور احمد وغیرہ مسلمان تھے، اور دوسری طرف بابو شو پرشاد اور نوین چندر راؤ وغیرہ ہندو۔ اس لئے ہندوؤں کی تحریک ترویج ہندی خالص ہندوانہ تحریک تھی۔ لیکن آج چونکہ مسلمانوں کے مقابلہ میں مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لعل نہرو کے ساتھ ڈاکٹر اشرف اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی ہیں، اس لئے آج وہی تحریک قومی تحریک بن گئی ہے،

اور اس کی مخالفت کرنے والے خود مسلم قومیت پرست حضرات کے نزدیک. انتہائی نفرت انگیز انقلاب کے مستحق. یہ ہیں بساطِ سیاست کی گہری چالیں!!

ہندو ذہنیت کا مظاہرہ۔

جب یہ تحریک اس زور اور قوت کے ساتھ پھیلائی جانے لگی تو مسلمانوں کی وہ جماعت جس کی دیدہ ور نگاہیں "متحدہ قومیت" اور "مشترکہ زبان" کے فریب کو بے نقاب دیکھ چکی تھیں، اس نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ اور مسلمانوں کو آگاہ کرنا چاہا کہ یہ محض ایک ادبی اور مجلسی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ان کی ملی اور جماعتی موت وحیات کا رشتہ بندھا ہوا ہے۔ تو کانگرسی کا ہندوانہ سیلاب بلا چاروں طرف سے اُمڈ آیا۔ مضمون کے شروع میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ پنڈت جواہر لعل نہرو نے اسے خود تسلیم کیا ہے کہ ایک قوم کی تہذیب وتمدن کو مٹانے کے لئے یا برقرار رکھنے کے لئے زبان کا مسئلہ کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن جب اس اہمیت کا احساس کرتے ہوئے مسلمانوں نے ہندوؤں کے اس طرزِ عمل کے خلاف آواز اٹھائی اور اپنی زبان کے تحفظ کا مطالبہ کیا تو انہی پنڈت جی نے فتویٰ صادر فرما دیا کہ "فارسی اور دیوناگری کے جھگڑے احمقانہ ہیں" (میری کہانی جلد دوم صفحہ ۳)

اللہ اکبر! وہی رسم الخط جس کے بدل جانے سے خود پنڈت جی کے الفاظ میں یہ اندیشہ ہے کہ الفاظ کی شکلیں بدل جائیں گی۔ آوازیں بدل جائیں گی خیالات بدل جائیں گے۔ قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابلِ عبور دیوار حائل ہو جائے گی، اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جائیگا جو مُردہ ہو چکی ہے؟ جب اس کے تحفظ کے لئے مسلمان آواز بلند کریں تو یہ جھگڑا احمقانہ بن جاتا ہے! یہ کیوں ہے؟ اس کی وجہ خود پنڈت جی بیان فرماتے ہیں کہ "ہندوستان میں ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ایک متحدہ قوم پیدا ہو"

(جامعہ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

اس لئے اگر مسلمان اپنی زبان کی امتیازی حیثیت برقرار رکھنا چاہیں تو وہ فرقہ پرست" ہیں:۔

"مگر بدقسمتی سے ابھی تک ہندوستان میں فرقہ پرستی طاقتور رہے، اور اس بنا پر زبان میں علیحدگی پسندی کا رجحان بھی وحدت کے رجحان کے ساتھ ساتھ برابر اپنا اثر دکھائے جارہا ہے۔ قوم پرستی کے پورے نشوونما کے ساتھ یہ علیحدگی پسندی جو زبان کے معاملے میں پائی جاتی ہے یقیناً فنا ہو جائے گی۔ .... ایک علیحدگی پسند حامی زبان کو اوپر سے کھرچو تم دیکھو گے کہ اندر سے وہ فرقہ پرست ہے۔ بلکہ زیادہ تر تم اُسے ایک سیاسی رجعت پسند پاؤ گے" (یہ پنڈت جی کا ایک مضمون ہے جو ہندوستان کے اکثر اردو اور انگریزی اخبارات میں شائع ہوچکا ہے)۔

ان تصریحات سے آپ پنڈت جی کا مافی الضمیر اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، زبان اور رسم الخط کے مسئلہ کو ایک قابلِ نفرت "فرقہ وارانہ مسئلہ" قرار دینا اور "سیاسی رجعت پسندی" سے موسوم کر کے اسکو اور زیادہ ذلیل بنانے کی کوشش کرنا کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ پنڈت جی زبان اور رسم الخط کی اہمیت سے ناواقف ہیں، نہیں بلکہ معاملہ بالکل برعکس ہے، وہ اس کی اہمیت سے خوب واقف ہیں، اور اسی واقفیت کی بنا پر وہ اس کے خلاف اپنی مخصوص سیاسی زبان کے شدید ترین الفاظ ——— "فرقہ پرستی"، "رجعت پسندی"، "سامراج پرستی" وغیرہ ——— پورے زور کے ساتھ استعمال کرتے ہیں تاکہ اس گولہ باری سے یہ قلعہ کسی طرح منہدم ہو جائے۔ ان کو خوب معلوم ہے کہ مسلمانوں کے پاس اپنی ایک مخصوص قومی زبان کا محفوظ رہنا در اصل ان کی مخصوص قومیت کے محفوظ رہنے کا ہم معنی ہے۔ جب تک یہ زبان ایک علیحدہ رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اور اس میں وہ الفاظ اور اسالیب بیان موجود ہیں، جو اسلامی ذہنیت کی ترجمانی کرتے ہیں، اس وقت تک مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور ان کی مستقل قومی تہذیب فنا نہیں ہوسکتی اور نہ اس لٹریچر سے بیگانہ ہو سکتے ہیں، جو ان کے ذہن میں اس قومیت اور اس تہذیب کی قدر و قیمت پیدا کرتا ہے۔ اس حقیقت سے بے خبری نہیں بلکہ کامل باخبری ہی ان کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ زبان میں "علیحدگی پسندی" کے رجحان کو فرقہ پرستی جیسے گھناؤنے

العتاب سے یاد کرکے آزادی پسند مسلمانوں میں اس کے خلاف نفرت پیدا کریں، اس لیے کہ دراصل ان کا نصب العین ہندوستان کی تمام آبادی کو ایک "قوم" بنانا اور جُدا جُدا قومیتوں کو فنا کر دینا ہے، ان کے نزدیک "سیاسی رجعت پسندی" یہ ہے کہ اس ملک کی کوئی قوم اپنی مستقل قومیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے اور "سیاسی ترقی پسندی" یہ ہے کہ سب قوموں کے لوگ اپنی اپنی قومیتوں کو چھوڑ کر اس "ایک قوم" میں جذب ہو جائیں جسے پنڈت جی وجود میں لانا چاہتے ہیں اس قسم کی متحدہ قومیت پیدا کرنے کے لیے منجملہ دوسری تدابیر کے ایک یہ تدبیر بھی ضروری ہے کہ ایک "مشترک قومی زبان" پیدا کی جائے' اور ہر ایسی زبان کو مٹا دینے یا کم از کم مسخ کر دینے کی کوشش کی جائے' جو کسی قوم کی جُداگانہ قومیت کو سہارا دیتی ہے یہی نصب العین ہے جس کو پیشِ نظر رکھ کر "ہندوستانی" زبان کا پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔

آخر منزلِ مقصود پنڈت جی کے نزدیک بھی یہی ہے کہ زبان اور رسم الخط دونوں میں "علیحدگی پسندی" کے رجحان کو مٹا دیا جائے۔ لیکن وہ اپنے ہم مشربوں سے زیادہ ہوشیار ہیں اس لیے کہتے ہیں کہ تدریج کے ساتھ ایک ایک قدم بڑھاؤ، دفعتاً رسم الخط پر ہاتھ ڈالو گے تو شکار ہاتھ سے نکل جائے گا لہٰذا سرِدست اس کی حفاظت کا اطمینان دلاؤ۔ اور پہلے الفاظ و اسالیبِ بیان میں "علیحدگی پسندی" کا رجحان دُور کرنے کی کوشش کرو جب اُردو زبان عربی و فارسی الفاظ کے ذخیروں سے خالی ہو کر ہندی الفاظ سے بھرپور ہو جائے۔ جب ذخیرۂ الفاظ کے بدلنے سے اسالیبِ بیان اور خود حقیقتِ بیان میں تغیر پیدا ہو جائے تو سمجھ لو کہ آدھا معرکہ سر ہو گیا۔ اس کے بعد دیکھیں گے مستقبل نے اگر کوئی مناسب موقع فراہم کر دیا تو رسم الخط میں بھی "علیحدگی پسندی" کا رجحان مٹا دیا جائے گا اور "مشترک قومی زبان" کی تخلیق پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ دانشمندانہ پالیسی اور کیا ہو سکتی ہے اسی بنا پر پنڈت جی فرماتے ہیں:۔

"اس لیے دانشمندی کے ساتھ ہم نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ دونوں رسم الخطوط کو پوری آزادی حاصل رہے اگرچہ یہ ان لوگوں پر ایک مزید بار ہوگا جنہیں دونوں

کو سیکھنا پڑیگا' اور ایک حد تک علیحدگی پسندگی کے لئے بھی مددگار ہوگا مگر ہمیں
انہی نقصانات کے ساتھ کام کرنا پڑے گا' کیونکہ ہمارے لئے کوئی دوسرا راستہ کھلا
ہوا نہیں ہے ...... مستقبل ہمارے لئے کیا کچھ لائے گا' اس کی مجھے خبر نہیں'
مگر سر دست دونوں کو باقی رہنا چاہئے" (پنڈت جی کا مذکورہ بالا مضمون)
"میں اس امر میں کوئی شک شبہ نہیں رکھتا کہ ہندی اور اردو دونوں ایک دوسرے
کے قریب آکر رہیں گی۔ خواہ یہ دونوں مختلف لباس پہنے رہیں' مگر اپنے جوہر اور روح
کے اعتبار سے ایک ہی زبان ہوں گی' جو قوتیں اس وحدت کی تائید کر رہی ہیں
وہ اسقدر طاقتور ہیں کہ افراد اُن کی مزاحمت نہیں کر سکتے' یہاں قوم پرستی ہے اور
ایک متحد ہندوستان دیکھنے کی خواہش عام طور پر پھیلی ہوئی ہے اسی کی فتح ہو کر
رہے گی ..... اگر ہم خوشی کے ساتھ اس علیحدگی کو برداشت کرینگے جو اسوقت قائم ہے
مگر ہم کو وحدت قایم کرنیوالوں کی اس عمل میں مدد دینی چاہئے" (مضمون مذکور)

یہاں آکر پنڈت جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی کے راستے ملجاتے ہیں۔ اگرچہ پنڈت جی علیحدگی
رجحان کو سخت قابلِ نفرت سمجھتے ہیں اور مہاتما جی کے طرزِ عمل میں علیحدگی پسندی کا یہ رجحان بالکل
نمایاں ہے' اس بنا پر پنڈت جی کو مہاتما جی سے نہ صرف اختلاف کرنا چاہئے تھا' بلکہ انہیں فرقہ
پرست" اور سیاسی رجعت پسند کہنا چاہئے۔ مگر چونکہ مقصد دونوں کا ایک ہے اور دونوں ایک ہی
منزلِ مقصود کیطرف دو علیحدہ راستوں سے چلکر ایک مقام پر ملجاتے ہیں اس لئے دونوں میں کوئی
بھی ایک دوسرے کو کھرچنے کیضرورت نہیں سمجھتا۔ بلکہ پنڈت جی مہاتما جی کی تائید کرتے ہوئے
فرماتے ہیں کہ:۔

"کم سمجھ لوگ خود گاندھی جی کو اُس چیز کا مجرم ٹھیراتے ہیں جسکے خلاف اُنھوں نے اپنا
پورا زور لگا دیا ہے" جامعہ مورخہ اکتوبر ۱۹۳۸ء ص ۳۰۹)

کھلی ہوئی فرقہ پرستی کے مقابلہ میں قوم پرستی زیادہ کامیاب چیز ہے آپ حلا نیہ ہندو

ایسے جال پھیلائیں گے تو چند بے وقوف پرندوں کے سوا کوئی اس میں نہ پھنسے گا۔ دامِ ہمرنگِ زمین ہونا چاہیئے، دانہ بکھرا ہوا ہونا چاہیئے، اور ایک ہوشیار شکاری جو پرندوں کی ذہنیت سے خوب واقف ہو رآپ کی مدد پر ہونا چاہیئے، تاکہ وہ ہر طرف سے گھیر گھیر کر پرندوں کو دام کے پاس لائے۔ پھر دیکھئے کہ پرندوں کے رب النوع تک جال میں پھنسے ہوئے نظر آئیں گے، ہندوستان کی مشترک فلاح وبہبود کا نام لے کر "قومیت" کا جال بچھایئے اس پر سیاسی ترقی اور معاشی خوش حالی کا دانہ پھیلایئے، اور ایک نقیب چھوڑ دیجئے جو اطراف ونواح میں اعلان کرتا پھرے کہ جو پرندہ اس جال کیطرف نہ آئے گا وہ فرقہ پرست اور سیاسی رجعت پسند قرار دیا جائے گا اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا جائیگا کہ ہمارے سامنے اسوقت سب سے بڑا سوال ہندوستان کے افلاس اور بے روزگاری کا ہے اور جو دانہ بکھرا ہوا ہے (نیچے بچھے ہوئے جال کا ذکر نہ کیجئے) اسی سوال کو حل کرنے کے لئے بکھیرا گیا ہے اسکے بعد آپ دیکھیں گے کہ جھنڈ کے جھنڈ آپ کی طرف آئیں گے اور اسی طرح آپ کے جال پر گریں گے جیسے شمع پر داوانے گرتے ہیں +

اثرات

ترویج ہندی کی تحریک کو "قومی تحریک" کی شکل اختیار کیے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن اسکے نتائج واثرات اس قدر واضح اور بیّن طور پر سامنے آچکے ہیں کہ اگر ہندو نوازی کی پٹی کو آنکھوں سے اتار کر دیکھا جائے تو ممکن نہیں کہ کوئی مسلمان اس خطرے سے انکار کرسکے جو مستقبل قریب میں اس راستہ سے اُن کی تہذیب وتمدّن کو مٹانے کے لیئے ایک سرکش وبیباک طوفان کی طرح بڑھتا چلا آرہا ہے، قبل اسکے کہ ہم اُس کی چند مثالیں بیان کریں یہ دیکھ لینا چاہیے کہ کانگریس کا (جو ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت کی نمائندگی کی مدعی ہے) اس باب میں لفظی دعوےٰ کیا ہے، تاکہ اسکے بعد اچھی طرح سے معلوم ہوسکے کہ دعوےٰ کیا ہے اور عمل کیا ہے، یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ مسلمانوں کو جب کبھی ہندوؤں کے کسی طرزِ عمل کے خلاف شکایت پیدا ہوتی ہے تو ہندوؤں کی مدافعت

اور برّیت میں حضرت مولانا آزاد جھوٹے گواہوں کے کٹہرے میں تشریف لے آتے ہیں اور مسلمانوں کو موردِ الزام اور ہندوؤں کو حق بجانب قرار دینے میں پُوری قوّت صرف کر دیتے ہیں، زبان کے مسئلہ میں بھی جب مسٹر جناح نے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے ہندوؤں کی روش کو مفادِ اسلامی کے خلاف ثابت کیا تو حضرت مولانا کیطرف سے ایک طول طویل بیان اخبارات میں شائع ہو گیا جسکے دوران میں وہ فرماتے ہیں:۔

"میں مسٹر جناح کو یقین دلاتا ہوں کہ انھوں نے اس مسئلہ کے متعلق جو کچھ سُنا ہے، وہ بالکل غلط ہے اگر وہ حقیقتِ حال معلوم کرنے کی ذراسی کوشش بھی کریں گے تو ان کو اپنے الزامات پر افسوس ہوگا، کانگرس کی قرارداد، نہ صرف قرارداد، بلکہ اس کا عمل بھی ذمہ دار مسلمان جماعتوں اور حامیانِ اُردو کے مطالبات کے بالکل مطابق ہے اور فی الحقیقت وہی مسئلے کا ایک ہی صحیح حل ہے یعنی وہ صاف سلیس اُردو جو شمالی ہندوستان کے شہروں میں بولی جاتی ہے، قومی اور ملک کی باہمی صوبائی زبان کے طور پر تسلیم کیجائے، اور دیوناگری اور اُردو دونوں رسم الخط تحریر کتابت کے لیے استعمال کیے جائیں۔

یہ زبان ایک اور یکساں ہے اور دونوں رسم الخط میں لکھی جاسکتی ہے اور ہر شخص جس رسم الخط کو چاہے اختیار کر سکتا ہے حکومت دونوں رسم الخط کے لیے آسانیاں مہیا کریگی اُسنے سادہ اُردو کے لیے "ہندوستانی" کا لفظ تجویز کیا ہے۔ تاکہ دونوں رسم الخط پر حاوی ہوجائے۔

مسٹر جناح کہتے ہیں کہ کانگرس جو قومی جماعت ہونے کی مُدعی ہے اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ سیوسپل اور گورنمنٹ اسکولوں میں ہندی کو لازمی قرار دے لیکن "ہندی" سے انکی کیا مراد ہے، کیا اُن کی مراد اس سے وہ زبان ہے جو صرف دیوناگری حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اگر ان کی مراد یہی ہے تو میں اُن کو بتاؤنگا کہ کسی کانگرسی حکومت نے دیوناگری رسم الخط کو لازمی قرار نہیں دیا، یہ صرف 'ہندوستانی' زبان ہے جو لازمی قرار دی جائیگی

رسم الخط اختیاری ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اُردو ہو اور ہوسکتا ہے کہ وہ دیوناگری ہو۔
میں مسٹر جناح کی توجہ وارد ھا اسکیم کیطرف منعطف کرانا چاہتا ہوں جس کو ڈاکٹر ذاکر حسین کا بورڈ بروئے کار لا رہا ہے اُسنے اساتذہ کی تعلیم میں اس امر کو لازمی قرار دیدیا ہے کہ وہ دونوں رسم الخط کی تعلیم حاصل کریں اور دونوں کی تعلیم دینے کے قابل ہوں تاکہ ہر طالب علم اس رسم الخط میں مدرّس سے تعلیم حاصل کرسکے، جس کو وہ پسند کرتا ہے۔

ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان

کیا مسٹر جناح کی مُراد "ہندی" سے وہ زبان ہے جس میں جان بوجھ کر سنسکرت کے غیر مانوس اور عجیب غریب الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے جن کو لوگ عام طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ اگر انکی مراد یہی ہے تو میں اُن کو بتانا چاہتا ہوں کہ وہ اِس معاملے میں کچھ نہیں جانتے اور جو کچھ وہ جانتے ہیں وہ بالکل گمراہ کُن ہے۔ اُن کو معلوم ہونا چاہیے کہ کانگرس جس زبان کو رواج دے رہی ہے، وہ اُردو کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ وہ اُردو جو سادہ وسلیس ہو۔ اور عربی فارسی اور سنسکرت کے غیر معروف اور نامانوس الفاظ سے مبرّا ہو

(زمزم۔ $\frac{6}{38}$ ۱۵)

اس بیان کی رُو سے حضرت مولانا نے مسلمانوں پر واضح کرنا چاہا ہے کہ کانگریس کی قرار داد اور عمل کی رو سے۔

(۱) قومی زبان وہ صاف اور سلیس اُردو ہوگی جو شمالی ہندوستان کے شہروں میں بولی جاتی ہو۔

(۲) زبان ایک ہی ہوگی البتہ وہ اُردو اور ناگری دونوں رسوم الخط میں لکھی جائیگی۔

(۳) اس مشترکہ زبان کا نام "ہندوستانی" ہوگا۔

(۴) اس میں عربی۔ فارسی، سنسکرت کے نامانوس اور غیر معروف الفاظ نہیں ہونگے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے جائیے کہ اُردو سے عربی اور فارسی کے غیر معروف اور نامانوس الفاظ خارج کرکے پوتّر بھارت ماتا کی دیو بانی کو شدھ کرنے والے مولانا آزاد دہی آزاد ہیں جو کبھی البلال

کے مدیر تھے، اور اُردو کے متعلق جن کا اسوقت خیال یہ تھا کہ :-

اُردو، فارسی کی طرح اپنے علمی ادبیات میں اب تک عربی کے ماتحت ہے۔ اس کا کوئی خاص علمی لٹریچر نہیں۔ اپنی اصطلاحات نہیں۔ جتنی علمی اصطلاحات ہماری زبان کی ہیں، سب کی سب عربی ہیں پس اُردو کے تراجم علوم میں الفاظ عربیہ کا استعمال ناگزیر اور اس لیے سند کے لیے اُردو بول چال نہیں بلکہ عربی لغت اور اصطلاح علوم کا حوالہ مطلوب ہے ..... (ہم) اُردو میں جب کسی علم و فن کو لکھیں گے تو چونکہ اُردو اپنی علمی ادبیات میں عربی کے زیرِ اثر اور کلی ماتحت ہے اسلیئے لامحالہ ہمیں عربی اصطلاحات کو مقدم رکھنا پڑیگا۔ (الہلال ۹ ہی ۱۷)

ادبی پہلو کے علاوہ اُردو زبان میں عربی الفاظ کے استعمال کے متعلق حضرت مولانا کے نزدیک ایک اہم پہلو اور بھی تھا۔ فرماتے ہیں :-

"لوگ معترض ہیں کہ مصطلحات اُردو کے لیے عربی کی مراعات استحقاق پر میں کیوں زور دے رہا ہوں، یہ کیوں ضروری قرار دیا جاتا ہے کہ حتی الامکان عربی ہی کے الفاظ اُردو کی ادبیاتِ علمیہ میں استعمال کیے جائیں لیکن شاید یہ نکتہ اُن کی نگاہوں سے مخفی ہے کہ صرف عربی ہی نہیں بلکہ ہر علمی زبان اپنی ماتحت زبانوں کے لیے ایسے ہی حقوق کا مطالبہ رکھتی ہے .... اصطلاحات حدیثہ کا سوال جانے دیجئے، مسلمان آج تمام اطرافِ عالم میں پھیلے ہیں، اُن کی زبان ہر جگہ ایک نہیں ہے لیکن مصطلحاتِ دینیہ اور علمیہ اب تک ایک ہیں، اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیئے۔ پھر کوئی سبب نہیں کہ تیرہ سو برس کا استحقاق آئندہ کے لیے اس سے سلب کر لیا جائے .... عربی اُم لغتِ اسلامیہ ہے۔ زندہ ہے اور اپنے بچوں کی پرورش کے لیے کافی اسباب و سامان اپنے پاس رکھتی ہے"۔

(الہلال مورخہ ۱۵ ہی ۱۵)

کیا ہم حضرت مولانا سے اتنا دریافت کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ عربی کا وہ استحقاق جو تیرہ سو سال سے مسلّم چلا آتا ہے آج اس کے سلب کرنے کا مجرم کون بن رہا ہے؟ وہ کون ہے جو اُمّ لغت اسلامیہ کی آغوش سے اس کے بچوں کو چھین کر انہیں براہمن تہذیب کے ماتم آلیہ (یتیم خانہ) میں داخل کر رہا ہے؟ وہ کون ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کی زبان سے عربی، فارسی کے الفاظ خارج کر کے اطرافِ عالم کے مسلمانوں سے ان کے تعلقات ہمیشہ کے لئے منقطع کرنے کی فکر کر رہا ہے؟

اے چشمِ اشکبار ذرا دیکھ تو سہی یہ گھر جو بہہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

کہہ دیا جائے گا کہ اُردو سے محض عربی اور فارسی کے "غیر معروف اور نامانوس" الفاظ خارج کئے جائیں گے تمام الفاظ نہیں لیکن یہ فرمایئے کہ وہ کونسی کسوٹی ہوگی جس پر یہ پرکھا جائے گا کہ فلاں لفظ غیر معروف ہے اور فلاں معروف و مانوس۔ جن کے ہاتھ میں وہ کسوٹی ہوگی ان کی تو آج ہی سے یہ روش شروع ہوگئی ہے کہ وہ الفاظ جو صدیوں سے زیرِ استعمال ہیں اور جن کو بچہ بچہ جانتا ہے انہیں بھی "غیر معروف" قرار دیا جا رہا ہے صوبہ متحدہ کو کون نہیں سمجھ سکتا لیکن وہاں کانگریس حکومت کی وزارت کے ایک زبردست رکن نے یہ تجویز بھی پیش کر دی ہے کہ یہ غیر مانوس لفظ ہے۔ اس کی جگہ "جنت صوبہ" کا مانوس لفظ استعمال کرنا چاہئے معلوم نہیں صوبہ کی جگہ ان کو کوئی "مانوس" لفظ کیوں نہ مل سکا۔ یا مثلاً صوبہ متوسط میں "مدرسہ" جیسے غیر معروف لفظ کی جگہ "ودیا مندر" کا مانوس لفظ سرکاری طور پر وضع کیا گیا ہے۔ اسی طرح خدمت استقبال۔ انصاف۔ بنیاد۔ عورت۔ مرد۔ جیسے غیر مانوس الفاظ کی جگہ سیوا۔ سواگت۔ نیاؤ۔ نیو۔ استری۔ پرش۔ جیسے مانوس الفاظ بدل کر لائے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ لیکن۔ صرف کی جگہ بھی پرنتو اور کیول نے لے لی ہے۔ "غیر معروف نامانوس" الفاظ کو اُردو سے خارج کر کے جدید ہندوستانی زبان کی کیا شکل بنائی جا رہی ہے۔ اس کے لئے یو۔پی۔ کے ایک کانگریس پرست کی شہادت ملاحظہ فرمایئے:

> اگر مولانا ابوالکلام آزاد جو کانگریس پارلیمنٹری بورڈ کے ممبر ہیں۔ اور جن کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ کانگریسی نقطۂ نظر سے وزارتوں کا احتساب کریں۔ تکلیف فرما کر ایک بار یہاں کی کونسل میں شریک ہوں۔ اور ان تقریروں کو سنیں جو ہندو ممبروں اور ہندو

وزراء کی طرف سے ادا ہوتی ہیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ بھی ضبط نہ کر سکیں گے اور بے اختیار فارسی یا عربی میں تقریر کرنے کھڑے ہو جائیں گے[۱]

یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہم بیسویں صدی کے کسی جلسہ میں شریک ہیں بلکہ چندر گپت اور اشوک کے دربار کا منظر سامنے آجاتا ہے اور مسلمان تو مسلمان ہندو پبلک بھی پچاس فیصدی ان تقریروں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔ پھر یہ بدعت کونسل ہال اور دفتر وزارت ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا اثر عام ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ ڈسٹرکٹ بورڈوں کی کارروائیاں بھی اب زیادہ تر اسی زبان اور اسی رسم خط میں قلمبند کی جاتی ہیں۔ اور مسلمانوں کی دلچسپی کو ہر ہر شعبہ سے کم کیا جا رہا ہے یہاں کی ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی سے بعض مسلمان صرف اس لئے استعفاء دینے پر مجبور ہو گئے[۲] کہ دفتر کانگریس سے جو اطلاع اور جو اعلان شائع ہوتا ہے وہ ہندی میں ہوتا ہے درآنحالیکہ لکھنؤ کا ہر ہندو اُردو زبان اور اُردو رسم خط سے واقف ہے اور اگر کہا جاتا ہے کہ کیوں نہ اُردو و ہندی دونوں زبانوں میں اعلانات شائع کئے جائیں تو کہا جاتا ہے کہ اس میں مصارف زیادہ ہیں، اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ جس وقت سوال کسی اقتصادی یا سیاسی مصلحت کا آئیگا تو سب سے پہلے اُس چیز کو محو کیا جائے گا جو مسلمانوں کی قومی کلچر کی سب سے بڑی امانت دار ہے؟ (نگار اگست ۱۹۳۸ء)

ان واقعات سے مولانا آزاد کے دعوے کی یہ حقیقت بھی معلوم کر لیجئے کہ ہندوستانی زبان اردو اور دیوناگری دونوں رسوم الخط میں لکھی جائے گی یہ باتیں تو وہ ہیں جو نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہیں لیکن ان کوششوں سے زبان میں جو تبدیلی غیر محسوس طور پر واقع ہو رہی ہے اس کا اندازہ غور اور تدبر کا محتاج ہے آپ کسی سینما ہال میں جائیے اور سنئے کہ وہاں فلم میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ کس دیش کی بھاشا ہے۔ حالانکہ تماشائیوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہوتی ہے یعنی ہندی کا پروپیگنڈا اس روپے سے ہوتا ہے جس کا

---

[۱] اب تو یہ مولانا آزاد کے متعلق حسن ظن ہی ہے ورنہ آں قدح بشکست وآں ساقی نماند - منہ

[۲] الحمد للہ کہ ان میں اتنی حمیت باقی تھی - منہ

بیشتر حصّہ خود مسلمانوں کی جیب سے جاتا ہے۔ یا کسی شام ریڈیو کے پاس بیٹھکر دیکھئے کہ غیر محسوس طور پر زبان کہاں سے کہاں چلی گئی ہے۔ مقررین کو چھوڑیئے۔ خود براڈکاسٹنگ اسٹیشن (محطۂ نشر الصوت) سے (جو محکمہ ابھی مرکزی حکومت کے ماتحت ہے) جو خبریں نشر کی جاتی ہیں ان میں بھی سوآگت۔ سیوا۔ اور سماج جیسے الفاظ بلا تکلف استعمال ہونے شروع ہو گئے ہیں حتیٰ کہ ان کے مطبوعہ پروگرام میں بھی "مجلس" کی جگہ سبھا کا لفظ آچکا ہے۔

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ صوبۂ متوسط میں مدرسہ کی جگہ ودّیا مندر کا نام سرکاری طور پر وضع کیا گیا ہے مولانا آزاد سے دریافت کیا گیا کہ صاحب! آپ تو فرماتے تھے کہ اُردو زبان سے عربی۔ فارسی کے غیر مانوس الفاظ نکالے جائیں گے۔ یہ مدرسہ کونسا غیر معروف لفظ ہے جس کی جگہ ودّیا مندر جیسا مشہور و معروف لفظ تجویز کیا گیا ہے تو اس پر آپ نے فرمایا کہ مسلمان اسے بیت العلوم کہا کریں۔ جھگڑا ختم ہوا۔ سرکاری نام تو ودّیا مندر ہی رہیگا۔ لیکن یہی سوال جب مسٹر شکلا سے کیا گیا جو ودیا مندر سکیم کے روحِ رواں ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ

ودّیا مندر اپنے اندر کشش رکھتا ہے۔ صوبہ کی ننانوے فیصدی آبادی کے لئے یہ روحانی وجدان کا ذریعہ ہوگا اور ان کے جذبۂ خیر کو اُبھارنے کا باعث ہوگا (ودّیا مندر اسکیم۔ بحوالہ انقلاب مورخہ [illegible])

آپ نے دیکھا کہ ایک نام کی تبدیلی سے کسی قوم کے بچوں کے جذبۂ روحانی پر کیا اثر پڑتا ہے یہ تو تھا ہندو بچوں کے جذبات کا احترام لیکن اسی صوبہ میں وادر کی میونسپل کمیٹی نے اُردو سکول کا نام اُردو ودّیا مندر رکھدیا تو مسلمانوں نے اس تبدیلی نام کے خلاف احتجاج کیا۔ کونسل میں سوالات ہوئے۔ تو ان کے جواب میں وہی مسٹر شکلا فرماتے ہیں کہ نام بیشک بدل دیا گیا ہے لیکن نام کے بدل دینے سے مسلمانوں کی تہذیب پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے کسی فرقہ اور مذہب کے جذبات کو صدمہ پہنچانا مقصود ہے" (مسلم لیگ مورخہ [illegible]) یعنی اُردو لفظ کی جگہ ہندی لفظ کا استعمال ہندو بچوں کے لئے روحانی وجدان کا ذریعہ اور جذبۂ خیر ابھارنے کا موجب معجزہ بن جاتا ہے لیکن مسلمانوں کے بچوں کو اس سے کوئی رُوحانی کاوش نہیں

ہوتی ہے مسلمانوں کے جذبات کا احترام!! اور اس پر مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی شکایات ودیا مندر کے نام سے عبث ہیں" (انقلاب بابت ۲۹) خدا جانے حضرت مولانا کے نزدیک ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کی کوئی شکایت بھی معقول ہوسکتی ہے یا نہیں؟ معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ جب سے وہ مسلمانوں سے الگ ہوکر کانگریس میں جا ملے ہیں' مسلمانوں کی قوم' سب باتیں نامعقول اور بیجا کرنے لگی ہے۔

انجمن ترقی اُردو (دکن)، نے اپنے کچھ مبلغ صوبہ متوسط میں بھیجے کہ وہ بچشم خویش وہاں کے حالات کا مطالعہ کرکے صحیح صحیح اطلاعات بہم پہنچائیں۔ ان میں سے ایک مبلغ، سید شیر علی حاتمی نے الٰہ آباد میں ایک تقریر کے دوران میں بتایا کہ صوبہ متوسط میں ابھی سے یہ حالت ہو چکی ہے مانڈ ہونا ضلع چندواڑہ کے اسکول میں ہندو اور مسلمان بچوں کو ہر صبح پرارتھنا کرنی پڑتی ہے' سامنے سرسوتی کا بُت لاکر رکھ دیا جاتا ہے' سب بچے' اس بُت کے سامنے گیان اور ودیا پراپت ہونے کی پرارتھنا کرتے ہیں۔ اگر کسی مسلمان بچے کو آپ سلام کریں تو جواب میں وہ "نمستے" اور "جے رام جی کی" ہی کہے گا۔ (انقلاب۔ مورخہ ۱۰)

یہ بھی واضح رہے کہ ودیا مندر کی اسکیم کی رُو سے وہاں بچوں کو ہندی لازمی طور پر سکھائی جاتی ہے (ایضاً)، اس واقعہ کو سامنے رکھیے اور مولانا آزاد کے بیان پر پھر ایک نگاہ ڈالیے جس میں اعلان کیا گیا ہے کہ کوئی رسم الخط جبری نہیں ہوگا۔

یہ تو تھا ہندی ترویج کا معاملہ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُردو کی تخریب کے متعلق بھی وہاں کچھ کمی نہیں کی جا رہی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو (دکن) اپنے ایک بیان میں رقمطراز ہیں:۔

"اب کانگریس حکومت کی نظرِ عنایت ملاحظہ ہو۔ اس زریں عہد میں ضلع بیتول کا واحد اُردو مدرسہ ہندی اسکول میں ضم کردیا گیا ہے۔ آشٹیر کا اُردو اسکول توڑ دیا گیا ہے اور کوتریہ کے ورنیکلر مڈل اسکول سے اُردو کو نصاب سے خارج کردیا گیا ہے۔" (انقلاب ۲۲)

اور اس پر مولانا آزاد مسلمانوں کو ڈانٹ بتاتے ہیں کہ تم خواہ مخواہ شور مچاتے ہو

پھر مولانا آزاد کا بیان ہے کہ زبان ایک ہی ہوگی البتہ دو مختلف رسوم الخط (اُردو اور دیوناگری) میں لکھی جائیگی لیکن عمل اس پر یوں ہو رہا ہے کہ یوپی کی کانگرسی حکومت کے ماتحت کتب قوانین کے جو تراجم "ہندوستانی" میں شائع ہو رہے ہیں اُن میں جو کتابیں دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں اُن کی زبان اور ہوتی ہے اور جو اُردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں اُن کی اور۔ (نگار بحوالۂ احسان کیم"!)

پھر حضرت مولانا نے کانگریس کا فیصلہ بھی بیان فرمایا ہے کہ اس مشترکہ زبان کا نام "ہندوستانی" ہوگا لیکن ہم مہاتما گاندھی کی تقریر مدراس میں دیکھ چکے ہیں کہ وہ اس بات پر بڑی شدت سے مصر ہیں کہ زبان کا نام "ہندی اتھوا ہندوستانی" ہوگا اور جب مولوی عبدالحق صاحب نے اس پر اعتراض کیا تو مہاتما جی کا اصرار اور بھی بڑھ گیا۔ اور انھوں نے صاف کہہ دیا کہ میں اس میں سے "ہندی" کا لفظ نکالکر صرف "ہندوستانی" نام رکھنا کبھی گوارا نہیں کرونگا۔ چنانچہ اُنکے نزدیک اسکا نام "ہندی اتھوا (یعنی) ہندوستانی" ہی ہے۔ یعنی اصل نام تو ہندی ہی ہے! البتہ اسی کو عرف عام میں "ہندوستانی" بھی کہہ لیا جاتا ہے، مہاتما جی سے کسی نے نہیں کہا کہ لفظ "ہندی" پر اصرار فرقہ پرستی کا آئینہ دار ہے، بلکہ ڈاکٹر اشرف ہمیں یہ بتا رہے ہیں کہ انہیں ایسا کرنے کا پورا حق حاصل ہے البتہ اسکے خلاف کچھ کہنا یہ فرقہ پرستی ہے۔ اگر کہیں مسٹر جناح بھی طرزِ عمل اختیار کرلیں اور کہہ دیں کہ اس زبان کا نام "اُردو یعنی ہندوستانی" رکھا جائے تو آپ دیکھیں کہ کس طرح شور مچا دیا جاتا ہے کہ یہ فرقہ پرستی ہے، رجعت پسندی ہے، ٹوڈیت ہے۔ علیحدگی کا رجحان (SEPARATIST TENDENCY) ہے متحدہ قومیت کی تشکیل کے خلاف ہے اور خدا جانے کیا کیا ہے۔

پھر مہاتما گاندھی کی تقریر مدراس میں آپنے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ اُنکے نزدیک "ہندی اتھوا ہندوستانی" وہ زبان ہوگی جو جنوبی ہند کی زبانوں سے قریب تر ہوگی اور اس میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ ہونگے۔ لیکن بایں ہمہ مولانا آزاد مسلمانوں کو یقین دلا رہے ہیں کہ یہ جدید زبان صاف اور

سلیس زبان ہوگی جو شمالی ہند کے شہروں میں بولی جاتی ہے اور جس میں عربی۔ فارسی اور سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ نہیں ہوں گے۔ یعنی مہاتما جی زبان کی گاڑی کو مدراس کی طرف لئے جارہے ہیں اور مولانا صاحب مسلمانوں سے کہ رہے ہیں کہ نہیں یہ تمہاری نگاہ کی تنگ نظری کا ثبوت ہے تم یہی سمجھو کہ گاڑی لکھنؤ کی طرف آرہی ہے۔ ملا در جو شخص اپنی آنکھوں سے گاڑی کو دیکھکر کہدے کہ نہیں صاحب یہ تو ہمارے سامنے مدراس کی طرف جارہی ہے شمال اور جنوب کا فرق کوئی ایسا غیر محسوس فرق نہیں ہے جسے ہم یوں پہچان نہ سکیں تو کہدیا جاتا ہے کہ تمہیں تعصب اور فرقہ پرستی نے اندھا کر دیا ہے۔ گاڑی شمال ہی کی طرف آرہی ہے۔ خدا کرے کہ کہیں ان حضرات کو بھی وہی آنکھیں مل جائیں جن سے جمہور مسلمان دیکھتے ہیں پھر ان سے پوچھیں کہ گاڑی کدھر جارہی ہے۔

کیا جانئے کیا کہتا۔ کیا دیکھتا۔ کیا کرتا　　　زاہد کو بھی گر دیتا مجھ جیسی خدا آنکھیں

مسلمانوں کا طرز عمل

ہندوؤں کے متعلق تو آپنے دیکھ لیا کہ وہ اُردو زبان کو ہندی بنا دینے میں کس برق رفتاری کے ساتھ بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ انہیں اس بات کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں کہ مسلمان اس باب میں کیا کہہ رہے ہیں اور وہ بھی کیوں! انہوں نے مسلمانوں کی دوستی کا دم کس دن بھرا تھا جو ان سے اس قسم کی توقع کی جائے، لیکن اس کے مقابلہ میں اُردو کو شدھ کر دینے میں خود مسلمانوں کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہندوؤں کے مقصد کو قریب تر لانے میں اور بھی زیادہ ممد و معاون بن رہا ہے۔ مسلمان مقررین مصنفین جرائد و رسائل محض ہندوؤں کو خوش کرنے کی خاطر اب آہستہ آہستہ اس قسم کی زبان استعمال کرنے لگے ہیں جس زبان کا آج سے دس برس پیشتر کہیں پتہ نہیں چلتا اس کی بہترین شہادت سندر لال جی الہ آبادی کا وہ خط ہے جو انہوں نے ۱۴ ستمبر ۱۹۳۸ء کو مہاتما گاندھی کے نام لکھا تھا اور اب تو حالت بد سے بدتر ہوگئی ہے وہ فرماتے ہیں ۔

اُردو رسالوں میں وِدوان (عالم) مُسلمان مصنّفوں کے لیکھ اس مضمون کے برابر نکلتے رہتے ہیں کہ ہمیں اُردو سے عربی اور فارسی کے غیر مانوس شبدوں کو نکال کر ہندی کے عام فہم شبدوں کا استعمال کرنا چاہئے۔ ایک مسلم اُردو رسالہ کی زبان پر کسی کٹر مُسلمان نے اعتراض کیا۔ آپ کو تعجب ہوگا، وِدوان (عالم) ایڈیٹر نے جواب دیا کہ "میں حجازی اُردو سے اپنے رسالہ کو ناپاک نہیں کرنا چاہتا" اس چیز پر عمل بھی جتنی کامیابی کے ساتھ آج کل اُردو رسالوں میں ہو رہا ہے، کسی ہندی رسالہ میں نہیں ہو رہا ہے۔ لاہور کے رسالہ نیرنگِ خیال سے میں نے اُردو نظم و نثر کے چند نمونے اپنے دکھن بھارت ہندی پرچار سبھا کے کانووکیشن ایڈریس میں نقل کیے تھے جنہیں اگر آپ جوں کا توں حرفوں میں کسی ہندی رسالے میں شائع کرا دیں تو کسی بھی پڑھنے والے کو یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ یہ اُردو سے لیے گئے ہیں۔ یہ سب مسلمانوں کے لکھے ہوئے ہیں، مجھے شک ہے کہ کسی ہندی رسالے سے شاید کوئی ایک نمونہ بھی ایسا نہیں نکالا جا سکتا...

آپ خود کسی وقت آئندہ کی ہندوستانی زبان کے لحاظ سے سُندر ملی جلی زبان بولا کرتے تھے کہ جسے سُن کر اُردو داں اور ہندی داں دونوں کا دل خوش ہو جاتا تھا دونوں سمجھتے تھے لیکن ناگپور کی جو آپ کی تقریر جوں کی توں دلی کے جامعہ میں چھپی ہے وہ چیز نہیں ہے۔ (جامعہ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کو اس کی ضرورت سے زیادہ رواداری نے اکثر تباہ کیا ہے۔ رواداری بڑی عمدہ چیز ہے بشرطیکہ خودکشی پر آمادہ نہ کر دے ۔۔۔ دوسرے معاملات کی طرح زبان کے معاملہ میں بھی یہ اپنی اسی رواداری سے کام لے رہا ہے، ہاتھ باندھ کر منتیں کرتا چلا جا رہا ہے کہ مہاراج! ہم اُردو کا نام بدلے دیتے ہیں۔ ہم اسکے رسم الخط کو بھی درست کر لیں گے مگر ہم توبہ کرتے ہیں کہ اس میں عربی فارسی کے الفاظ بھی نہیں لائیں گے، آپ خود دیکھ لیجئے کہ ہم ہندی کے الفاظ کس کثرت سے اس زبان میں داخل کر رہے ہیں ہم آپ کے پرستاؤ کا سواگت کرتے ہیں کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں سار کے

ہندوستان کی جنتا کے سماجی سدھار کے لئے۔ پرنتو آپ سے کیول اتنی آشا ہے کہ ہمیں اس بھاشا کو زندہ رکھنے کی آگیا دے دیجئے۔ یہ روش بڑی تباہکن ہے۔ اس کا کوئی مفید اثر "قوم پرستوں" پر نہیں پڑ سکتا۔ ان کو آپ کی زبان کی "دشواریاں" اس کے بدلنے پر مجبور نہیں کریں بلکہ وہ جذبہ اندر ہی اندر کام کر رہا ہے جس کے تحت اسپین کے عیسائیوں نے مسلمانوں کی نادرۂ روزگار عمارات کے حسین و جمیل نقوش کھرچ ڈالے تھے، اس لئے نہیں کہ ان کو آرٹ سے کوئی دشمنی تھی، بلکہ صرف اس لئے کہ اسلامی خون رکھنے والی نسلوں میں ان نقوش سے اپنے ماضی کی اور اپنی قومیت کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ بالکل اسی جذبہ کے تحت زبان سے "علیحدگی پسندی کے رجحان" کو مٹانے کی تدبیریں کی جارہی ہیں اور مسلمان سمجھ رہا ہے کہ رواداری سے کوئی بین بین راستہ پیدا ہو جائے گا۔

تم ریڑھ کی ہڈی کے بغیر محض نرم گوشت بن کر اپنی جگہ کھڑے نہیں رہ سکتے۔ اگر استقامت چاہتے ہو تو اپنے اندر ریڑھ کی ہڈی پیدا کرو۔ جب تم سے کہا جا رہا ہے کہ "اردو مسلمانوں کی زبان ہے" تو کیوں نہیں کہتے کہ ہاں صاحب! یہ ہماری زبان ہے۔ ہماری زبان رہے گی۔ اور جب تک ہم موجود ہیں اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔

یاد رکھئے زبان کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں جسے آپ یونہی ایک نظری بحث (ACADEMIC DISCUSSION) قرار دے کر آگے گذر جائیں اور اردو زبان پر تاریخی مقالات لکھ کر مطمئن ہو جائیں کہ آپ نے دلائل و براہین سے ثابت کر دیا کہ اردو ہی ہندوستانیوں کی مشترکہ زبان قرار پا سکتی ہے۔ یہ بحث اس سے کہیں زیادہ اہم ہے اور اس لئے کہیں زیادہ قوت عمل کی محتاج ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ آپ کے اسلامی تمدن اور مذہب کا تیرہ سو سال کا ذخیرہ اولاً عربی زبان میں ہے۔ ہندوستان کا مسلمان سوائے عربی مکاتب کے چند طالبعلموں کے) اس ذخیرہ سے بالکل ناآشنا ہو چکا ہے۔ اور اس لئے اپنے متعلق معلومات کے لئے مغرب کے مستشرقین کا محتاج ہے۔ وہ جس قسم کی

معلومات بہم پہونچاتے ہیں ارباب علم سے پوشیدہ نہیں پھر اسس خزانہ کا کچھ حصہ فارسی زبان میں ہے۔ یہاں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اسس سے بھی بے بہرہ ہو چکا ہے۔ اس کے نزدیک کتب عربی اور فارسی کس درجہ مہمل ہو چکی ہے۔ اسس کا نظارہ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کسی کباڑی کی دوکان پر دیکھئے۔ نادرۂ روزگار کتابوں کے ڈھیر کے ڈھیر ردی کے بھاؤ بکتے ہیں۔ جمع شدہ ذخیرہ یوں ضائع ہو رہا ہے اور آئندہ ایک کتاب بھی ان زبانوں میں یہاں نہیں چھپتی چھپے کس کے لئے؟ عربی اور فارسی یوں ختم ہوئی۔ اس کے بعد کچھ تھوڑا سا سرمایہ علمی اُردو میں منتقل ہوا تھا۔ اب جس وقت آزاد ہندوستان کی زبان ہندی (یا براہ فریب نگاہ ہندوستانی) ہو گئی تو آپ دیکھیں گے کہ چند ہی سال کے عرصہ میں اُردو کا تمام ذخیرہ بسلسلہ آثار قدیمہ والوں کی نذر ہو جائے گا جس طرح آج عربی اور فارسی کا ہو چکا ہے۔ اور جب کوئی قوم اپنے اسلاف کے سرمایۂ علمی سے محروم ہو جاتی ہے تو پھر اس کی اپنی تہذیب۔ تمدن۔ لٹریچر۔ سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ انگریزوں نے یہاں پہونچکر نہ تو انگریزی کو بالجبر رائج کیا۔ نہ عربی۔ فارسی کو جبراً اسکولوں سے خارج کیا۔ لیکن ایک سو سال کے عرصہ میں جو کچھ تبدیلی یہاں ہو گئی وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اپنی زبان پر غیروں کی زبان کے غالب آجانے سے قوم کی ذہنیت بدل گئی۔ اور قوم کی قوم علمی سرمایہ کی اس متاعِ گراں بہا سے تہی دامن ہو گئی جو صدیوں سے اسس کے لئے مایہ ناز تھی۔

رسم الخط کا مسئلہ

پھر مسلمان کے لئے رسم الخط کا مسئلہ اس سے بھی اہم ہے۔ اُردو کا رسم الخط دائیں سے بائیں طرف عربی رسم الخط ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں ہندی رسم الخط بائیں سے دائیں طرف سنسکرت کا رسم الخط ہے۔ آپ کا رسم الخط تمام عالم اسلامی کے ساتھ آپ کا تعلق پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ مسلمانوں کے بین الاقوامی تعلقات جسے یہاں اسلامزم کا ہوا بنا کر ڈرایا جاتا ہے) ہندوؤں کی نگاہ میں ہمیشہ سے کھٹکتے رہے ہیں۔ یہ تمام معصوم کوششیں "جو بتدریج اُردو رسم الخط کی جگہ ہندی رسم الخط کی

ترویج کی طرف کشاں کشاں لیے جا رہی ہیں دراصل اسی جذبہ کا مظاہرہ ہیں جو ہندوستان کے مسلمانوں کو باقی عالمِ اسلامی سے الگ کر کے انہیں ہندی قومیت میں جذب کرنے کے لیے ہر ہندو کے دل میں موجزن ہے۔ یہ اتنا بڑا خطرہ ہے کہ اگر ہندوستان کے مسلمان بروقت آگاہ نہ ہوئے اور قومیت پرست مسلمانوں کے ہمدردی سے لبریز بیانات پر بھروسہ کرتے رہے تو یاد رکھیں کہ وہ اپنی اصل سے اس طرح کٹ جائیں گے جس طرح فصلِ خزاں میں ایک شاخ درخت سے ٹوٹ کر گر پڑتی ہو اور جس کے لیے پھر کبھی مژدۂ بہار نہیں ہوتا لیکن جیسا کہ ہم نے بار بار کہا ہے مصیبت تو یہاں خود اپنوں کی لائی ہوئی ہے۔ سی۔ پی میں اگر ہندی کی تعلیم لازمی کر دی گئی ہے تو مسلمانوں کو اس سے اتنی ہی شکایت ہو سکتی ہے کہ کانگریس باوجود قومی جماعت کے ادعا کے خالص "فرقہ وارانہ" اقدام کر رہی ہے لیکن سینۂ مسلم کا ناسور تو اس وقت رِستا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ دہلی کے جامعہ اسلامیہ میں جو ایک آزاد اسلامی درسگاہ ہونے کی مدعی ہے۔ ابھی سے ہندی کی تعلیم جبری کر دی گئی ہے۔ جب اپنوں کی یہ حالت ہو تو غیروں کا کیا شکوہ!!

کہدیا جا سکتا ہے کہ تم نے انگریزی بھی تو سیکھی تھی جس کا رسم الخط اردو سے مختلف تھا، لیکن انگریزی سیکھنا تو غلامی کی لعنتوں میں سے تھا اگر آزادی کی برکات کا نتیجہ بھی وہی کچھ ہوا تو دونوں میں فرق کیا ہوا؟ پھر انگریزی ہندوستان کی متحدہ زبان نہیں قرار دی گئی تھی؛ وہ حاکم قوم کی زبان رہی تھی۔ اگر ہندو یہ اعلان کر دیں کہ ہندی ہندوستان کی اکثریت کی زبان ہے جس کے ہاتھ میں نظامِ حکومت ہوگا اس لیے اقلیتوں کو یہ زبان بجبر سیکھنی پڑے گی تو بات صاف ہو جائے اس مقصد کو متحدہ قومیت کے مشترکہ مفاد کے نقاب میں کیوں پیش کیا جا رہا ہے؟

پھر کہدیا جاتا ہے کہ ترکوں نے اپنا رسم الخط ترک کر کے لاطینی رسم الخط اختیار کر لیا ہے جو عربی رسم الخط سے مختلف ہے تو تم بھی ایسا کر لو گے تو کیا حرج ہوگا۔ سوال تو ترکوں کی حالات

ہم سے مختلف ہیں۔ انکی حکومت اپنی ہے۔ زبان اپنی ہے۔ انھوں نے معلوم نہیں کن مصالح کی بنا پر رسم الخط کو بدلا ہے لیکن ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کیا ترکوں کا ہر فیصلہ ہمارے لیئے سند ہے؟ ہم اپنے فیصلے اپنے حالات کے مطابق خود کریں گے۔ ہمارے فیصلے ہندو اکثریت کیوں کرنے؟

بعض حضرات کو یہ کہتے سُنا ہے کہ ہم ہندی رسم الخط اختیار کر کے اپنا تمام لٹریچر ہندی میں منتقل کر دیں گے اور اس طرح اسے ہندوؤں تک پہنچا کر اپنے مذہب اور تہذیب کی تبلیغ کر سکیں گے۔ بگلہ پکڑنے کا یہ طریق ایسا "استادانہ" ہے جسکی جسقدر بھی داد دی جائے کم ہے۔ آج جتنے ہندو اچھی طرح سے اُردو لکھ پڑھ سکتے ہیں پوچھئے کہ وہ آپکے اسلامی لٹریچر کو کتنا پڑھتے ہیں اور انکے خیالات کو آپنے کس حد تک متأثر کیا ہے؟

پھر کہا جاتا ہے کہ اُردو میں ۸۰ فیصدی الفاظ ہندی کے ہیں اس لیئے اسے ہندی یا تبدیل کر دینے پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے! لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ جب اُردو میں ۸۰ فیصدی الفاظ ہندی کے ہیں جو ہندوؤں کی آبادی کے تناسب سے بھی زیادہ ہیں تو اسی زبان کو قومی زبان کیوں نہ قرار دیدیا جائے۔ مسلمانوں کا تو اس میں پھر بھی بیس فیصدی ہی حصّہ رہیگا لیکن ہندو تو اتنا بھی نہیں دیکھ سکتا وہ تو اسے سَو فیصدی ہندوانا چاہتا ہے اور رسم الخط وہ اختیار کرنا چاہتا ہے جو دُنیا میں اس کے سوا اور کوئی نہ سمجھے معلوم نہیں حکومت حاصل کیے یہ باقی دُنیا سے کس رسم الخط میں خط و کتابت کیا کریں گے؟ اُردو رسم الخط سے تو پھر بھی کم و بیش آدھی دُنیا واقف ہے۔

نمونہ "ہندوستانی"

آخر میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس "ہندوستانی" کا نمونہ بھی دکھا دیا جائے جو آپ کے آزاد ہندوستان کی مشترکہ زبان بننے والی ہے۔ بھارت ساہتیہ پریشد کے اجلاس ناگپور منعقدہ اپریل ۱۹۳۵ء کی صدارت کرتے ہوئے مہاتما گاندھی نے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا وہ یوں شروع ہوتا ہے:۔

"اس سبھا کا سبھا پتیتو دینے کا کارن جب میں ڈھونڈھتا ہوں تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں۔ ایک میرا ساھتیہ کار نہ ہونا اور اس لئے کم سے کم دولین کا کارن ہونا تھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم۔ جو کچھ ہو۔ میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریں گے اور بھوشیہ میں اپنا شیلو اکیشتر بڑھا دیں گے۔ یدی ہم شتری تھجہ سے لیکر کھنیا کماری تک اور کراچی سے لیکر ڈبرگڑھ تک جو پردیش ہے اسے ایک مانتے ہیں اور اسکے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں تو ابھی دیش کے پرتیک بھاگ کے ساھتیہ کار بھاشا شاستری اتیادی آپس میں کیوں نہ ملیں اور بھن بھن بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی پتھا لو کیہ سیوا کیوں نہ کریں" (رسالہ جامعہ، مئی ۳۸ء)

یہ ہے وہ مولانا آزاد کے بیان کے مطابق صاف و سلیس اردو جو شمالی ہند کے شہروں میں بولی جاتی ہے۔

اس سے بھی دلچسپ ایک اور نمونہ ہے۔ بہار کے وزیر تعلیم ڈاکٹر سید محمود نے "ذریعہ تعلیم کے متعلق جو حکم حال ہی میں صادر فرمایا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں۔

ہندوستانی زبان کو سنسکرت سے بھرنے یا فارسی سے ملانے کے خلاف اکثر یورپین اور ہندوستانی فضلاء نے آوازیں بلند کی ہیں جن میں چند کے نام حسب ذیل ہیں ......

.... میں ان میں سے فقط دو حضرات یعنی پنڈت گردھر شرما۔ اور مولانا وحید الدین سلیم کے خیالات درج کرتا ہوں۔ پنڈت جی فرماتے ہیں:۔

"سنسکرت مایا بنا کر آپنے جنگال۔ مہاراشٹر آدی میں ہندی کا پرچار کریں کنتو وہ کیول (مگر) شکشتوں کی بھاشا بن گئی۔ سرو سدھارن (عوام) اسے بالکل نہ سمجھ سکے۔ تو کیا لابھ ہوا۔ لابھ کیا (فائدہ) پرنتے (بلکہ) بھوشا (زبان) بڑی ہانی (نقصان) ہو گئی ...... ہندی بھاشا میں ہندی بھاشا کے شبد ہی (الفاظ) پر تمام لینی چاہیئے۔ لیکن جب ان سے آوشکتا (ضرورت) پوری نہ ہو تب سنسکرت بھاشا سے سرل شبد (آسان الفاظ) لینے چاہئیں (کلیم بابت اگست ۳۸ء)

یعنی پنڈت جی نے ہندوؤں کو نصیحت کی ہے کہ ہندی زبان کو ایسا سلیس لکھو کہ اس میں سنسکرت کے

غیر مانوس الفاظ نہ آئیں لیکن جس زبان میں انہوں نے خود یہ پیغام دیا ہے اس کے سمجھنے کے لئے مہاراج بکرماجیت کے کسی نورتن کی ضرورت ہے۔ یہ ہے نمونہ آسان اُردو کا جو آپ کی مشترکہ زبان بنیگی۔ مولانا آزاد ان باتوں کے متعلق کسی بیان کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، ہندوؤں کے حق میں جو کچھ آئے کریں وہ معقول اور حق بجانب ہے۔ البتہ کبھی مسلمان کوئی شکایت کرے تو انہیں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہندوؤں کی صفائی پیش کر دیں۔ ان مثالوں کو شاید کوئی یہ کہہ کر مسترد کر دے کہ یہ کوئی سند تھوڑی ہیں؟ آئیے ہم آپ کو ایک ایسا نمونہ دکھائیں جس کے مستند ہونے میں کسی کو کلام نہ ہو۔ صوبہ متحدہ کی کانگریسی حکومت کے وزیر تعلیمات آنریبل سری سمپورنانند جی نے ایک تقریر کی جس کا ترجمہ "ہندوستانی" زبان میں فوراً گورنمنٹ کے محکمۂ اطلاعات نے شائع کیا ہے۔ اس کے مستند ہونے میں تو کسی قسم کا شبہ نہیں ہو سکتا؟ ملاحظہ فرمائیے کہ یہ کونسی زبان میں ہے۔ واضح رہے کہ یہ زبان اس لکھنؤ سے شائع ہو رہی ہے جو ہندوستان بھر میں اُردو کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ تقریر مع عنوان یہ ہے۔

"شِکشا سنگٹھن سمبندھ کے سمکش سنکیت پرانت کے شکشا سچیو مانئے شری سمپورنانند جی کا دیا کھیان (پرکاشن وبھاگ سنکیت پرانتے گورنمنٹ)

ادھکاکال جس میں کہ ہم رہ رہے ہیں اس کی یہ بھی ایک وشیشتا ہے کہ شکشا سمسیا کے پرت لوگوں کا آکرشن وشیش روپ سے ادھیک ہو گیا ہے۔ یہ بات ادھکانش سبھیہ سنسار پر گھٹت ہوتی ہے اور ورتمان سمے ہم اپنے دیش میں بھی اس شکشا سمبندھی اندولن کے بھن بھن پہلوؤں کو دیکھ رہے ہیں اور ان کا انبھون کر رہے ہیں۔ آجکل ہم اپنے کو جس راجنیتک اور پدار تھک پرستھتی میں پاتے ہیں اور ہماری اس استھتی کا جو سماجک راج نیتک اور آرتھک آدھار ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہم نے اپنے پوروجوں سے جو سنسکرتی پائی ہے اس سے اس وشیو ویاپی پرگتی کو ہمارے سمکش ایک وشیش روپ میں اپستھت کیا ہے اور ایک وشیش بھارتیہ سمسیہ بنا دیا ہے۔" ذرا آواز دیجئے مولانا آزاد صاحب کو اور ان سے پوچھئے کہ یہ لیس اُردو "جسے جنتر منتر والوں کی اصطلاح میں کالا علم" کہا جائیگا

طلوعِ اسلام | ۷۳ | اکتوبر ۴۶ء

شمالی ہندوستان کے کس شہر میں بولی جاتی ہے؟

باب دوم

کچھ اپنوں سے

آپ نے دیکھا کہ اس آئینی تبدیلی کے دور میں "حصولِ آزادی" کی آڑ میں ہندوستان سے مسلمانوں کی امتیازی خصوصیات مٹانے کے لئے ہندو اکثریت جو طریق کار اختیار کر رہی ہے۔ اس میں زبان کی تبدیلی کتنا زبردست حربہ ہے۔ لیکن سوال صرف یہی نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ اصل سوال یہ ہے کہ وہ مسلمان جو ہندوستان میں مسلمان بنکر رہنا چاہتے ہیں اور اپنی آنیوالی نسلوں کو مسلمان بنا کر دیکھنا چاہتے ہیں انھیں کیا کرنا چاہیئے۔ تحفظِ زبان کے بارے میں ہمارے سامنے کیا تعمیری پروگرام ہونا چاہیئے۔ اسکے متعلق کسی دوسری صحبت میں گزارش کی جائیگی۔ اس وقت ہم چند باتیں اپنی "ادبی برادری" سے کرنا چاہتے ہیں کہ اس معاملہ میں سب سے اہم ذمہ داری انہی پر عائد ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہم زبان چاہتے کس لیے ہیں؟ زبان بذاتِ خود تو کوئی اہم چیز نہیں ہے اسلیئے محض اس کا تحفظ مقصود بالذات قرار نہیں دیا جا سکتا، زبان کا تحفظ ہم اسلیئے چاہتے ہیں کہ اسکے ذریعہ ہمارے تمدن۔ ہمارے کلچر کی حفاظت ہوتی ہے لیکن کیا جو کچھ آجکل عام طور پر ہماری ادبی پیداوار ہے وہ ایسی ہی ہے جسے اسلامی تمدن اور اسلامی ثقافت کا آئینہ دار کہا جا سکے؟ جواب ظاہر ہے! ہمارے نوجوان لکھنے والوں میں ایک جماعت تو ایسی ہے جس نے اپنی تمام مساعی کو اس بات کے لیے وقف کر رکھا ہے کہ مذہب اور شعائرِ ملت کے خلاف "جہادِ عظیم" کیا جائے۔ اوّل تو کالجوں کی تعلیم ہی اس نہج پر رکھی گئی ہے کہ بی اے کرنے تک دماغ مذہب سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر ہو جاتا ہے اس پر آزادئ ہند کے قائد اعظم کے یہ ارشادات کہ ملک میں جس قدر مصائب موجود ہیں اُن سب کا ذمہ دار مذہب ہے، نوجوانوں کو مذہب کی مخالفت نہیں بلکہ تضحیک و تمسخر کے لیے بالکل

مسلّح کر دیتے ہیں پھر وہ اشتراکیت کی ایک خیالی جنت کے نشہ میں اس قدر مدہوش و بے باک ہو جاتے ہیں کہ سوقیانہ استہزا اور بازاری تمسخر اُنکے نزدیک عین معیارِ شرافت قرار پا جاتا ہے اور اس بدمستی میں' بقول یلدرم اُنکے مُنہ سے لچرِ فحش کے ایسے بھپکے نکلتے ہیں کہ نکیرین بھی پناہ مانگیں۔

ایک اور جماعت ہے جو جدید رومانیت کی علمبردار ہے ہماری قدیم غزل گوئی کے خلاف ان کا وعظ سُنیئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتذال اور سوقیانہ پن کا لفظ تک سُننے کے لیے تیار نہیں ہیں اس شاعری میں انہیں دُنیا بھر کے عیب نظر آئیں گے لیکن انشا ۔ رنگین ۔ جرأت ۔ جان صاحب اور مرزا شوق کو مبتذل اور فحش گو کہنے والے ذرا یہ تو دیکھیں کہ جس قسم کی عُریاں فحاشی ان کے افسانوں اور (Sonates) میں آجکل ملتی ہے اُن بے چاروں کے تصوّر میں بھی اس قسم کے نقشے نہ آسکتے تھے ۔ وہ تو پھر ایک فرضی معشوق کی کنگھی کو ہی نمایاں کرتے تھے ۔ اور آج حالت یہ ہے کہ سچ مچ عشقبازی کی جاتی ہے اور نام لے لے کر وارداتِ قلب کے مرقّع تیار کیئے جاتے ہیں جن سے اور کچھ نہیں تو ذہنی تفنیش اور دماغی معصیت کوشی کی لذّت تو ضرور ملجاتی ہے یہ سب کچھ اُس مغربی معاشرہ کا نتیجہ ہے جو غیر محسوس طور پر ہمارے نوجوانوں کے قلب و دماغ پر چھا گئی ہے اور جسکے تحت حیا سوز سفلی جذبات کے اظہار کا نام رومانیت رکھا جاتا ہے اگر آپ کو دیکھنا ہو کہ اِس رومانیت سے یورپ کی اخلاقی زندگی پر کیا اثر پڑا ہے تو ایک اطالوی مصنف کی کتاب (The Romantic Agony) مُلاحظہ فرمایئے پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس قسم کی افسانہ نگاری اور شاعری کا اخلاق کے علاوہ نوجوانوں کی عملی زندگی پر کیا اثر پڑ رہا ہے ایسے نوجوان کا دماغ شروع سے ہی حقایق کی دُنیا میں رہنے کے بجائے ایک افسانوی دُنیا کے تصورات و تخیلات میں محو رہتا ہے ۔ نتیجہ اسکا یہ ہوتا ہے کہ وہ جب دُنیا کی حقیقتوں سے دوچار ہوتا ہے تو ان کو اپنے افسانوی معیار پر پُورا اُترتے نہیں دیکھتا اس لیئے وہ ان چیزوں سے بیزار ہو جاتا ہے' یاس و قنوطیت کا المناک فلسفہ اُسکے تمام اعمال و افکار پر چھا جاتا ہے' اور وہی نوجوان جس کی قوتِ عمل سے قوم کو زندہ ہونا تھا، خود ایک چلتا پھرتا جنازہ بن کے رہ جاتا ہے۔

ایک تیسری جماعت اور ہے اور وہ (art for art sake) (آرٹ محض آرٹ کی خاطر) کی قائل ہے یہ اور اسی قسم کے اور مجلے ایسے مہمل گورکھ دھندے ہیں جو کبھی شرمندۂ معنے نہیں ہوتے بے معنے تراکیب۔ بے مطلب فقرے۔ نثرِ منظوم، نظمِ منثور ٹیگوری رنگ میں مجذوبوں کی سی بڑ ہیں نہ جن کا سر نہ پاؤں، یا تو یہ لوگ عمداً دوسروں کو بناتے ہیں، یا خود بنتے ہیں، غالب کے تتبع میں غزلیں کہی جاتی ہیں۔ جن میں شوکتِ الفاظ اور ندرت ترکیبات کے زور پر سننے والوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

عصمتِ ناہید وکوثر نوبہارِ نغمہ ہے ۔۔۔ شعلۂ جوالۂ مے اعتبارِ نغمہ ہے

بوئے رنگیں عنبر فشاں۔ مرمریں رنگِ شباب ۔۔۔ کیفِ صہبائے تمنا۔ جو مُبارِ نغمہ ہے

یا مثلاً نثر میں پیازی اُردو کے چھلکے پر سے چھلکا اُتارتے جایئے۔ اندر سے کچھ بھی نہ نکلے ۔۔

"ریحانہ، نوردِ سرور کی داستانِ شیریں، مجھ افسردہ یاسمین کا بلوریں مجسمہ گویا قدرت کا ایک حسین خواب تھا جو رشید کی نشۂ شباب میں ڈوبی ہوئی سنہری راتوں میں بہارِ گلستاں بداماں کیف زانوئے رنگیں پیدا کرتی تھی۔"

مقصد اس طویل داستان سے یہ ہے کہ جب ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تو ہماری زندگی کا نصب العین بھی اسلامی ہونا چاہیے، بالخصوص ایسے وقت میں جب کہ ہم محسوس کر رہے ہیں، کہ ہماری قومیت اور تہذیب کو فی الواقع ایک عظیم الشان خطرہ کا سامنا ہے، یہ وقت وہ ہے کہ جو کچھ جس کے بس میں ہو اس متاعِ گرانمایہ کی حفاظت کے لیے کر مرے۔ یہی ہماری زندگی کا نصب العین ہونا چاہیے۔ طریق کار خواہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں، ہماری تمام جدّ وجُہد کا رُخ اسی ایک نصب العین کی طرف ہونا چاہیے۔ ادیب اپنے ادب سے، شاعر اپنے شعر سے، افسانہ نگار اپنے افسانوں سے، رسائل اپنے صفحات سے، خریدار اپنے ذوقِ ادب و شعر سے، غرض ہر مسلمان اپنے اپنے دائرۂ امکان میں اپنی ہر کوشش اسی مقصد کے حصول میں صرف کر دے، ہمارے رسائل میں "مذہبی" اور "ادبی" کی تفریق دراصل اُس تفریق پر مبنی ہے جو کلیسا اور سلطنت کی تفریق نے پیدا ہوتی ہے، اور جو یکسر غیر اسلامی

تفریق ہے' ہمارے ہر پرچہ کو اسلامی ہونا چاہیئے' اور اس کی ادبی و صحافتی خدمات اسی عنوان کی تفسیرات ہونی چاہیئیں۔ ادب پسند حضرات کو بھی اس تبدیلی نصب العین سے قطعاً نہیں گھبرانا چاہیئے' کیونکہ "اسلامیات" اور "مولویات" میں درحقیقت بہت نمایاں فرق ہے' لیکن آج کل ہمارے ہاں یہ حال ہو رہا ہے کہ کوئی پرچہ جو اپنی پیشانی پر "علمی و ادبی مجلہ" کا عنوان لکھ لیتا ہے' اسلام اور مسلم کا لفظ بھی اس کے اندر لکھنا کفر سمجھتا ہے ہیں ادب و شعر کی اہمیت کو کم نہیں کرنا چاہتا لیکن کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ادب و شعر ہماری عمارتِ ملی کی بنیاد نہیں ہیں۔ محض تزئین و آرائش کی چیزیں ہیں۔ جب کسی عمارت کی بنیادیں خطرہ میں ہوں تو کوئی صاحبِ دانش و بینش اس وقت اپنی کوششیں اس کی تحسین و تزئین میں صرف نہیں کرتا بلکہ سب سے مقدم کام خود عمارت کے استحکام کو سمجھتا ہے۔

ہم محسوس کرتے ہیں کہ جب ہم اس تبدیلی کا اعلان کریں گے تو اطراف و جوانب سے ہم پر انگلیاں اٹھیں گی۔ لیکن بقول مولانا حالیؒ "دلفریب رنگین باتوں پر آفریں سننے سے دل شکن مگر کام کی باتوں پر نفریں سننی بہتر ہے۔

آخری گزارش

آپ نے دیکھ لیا کہ اس "تحریکِ آزادی" میں آپ کے لیے کیسی کیسی خوبصورت "زنجیریں" تیار ہو رہی ہیں اگر آپ سمجھنا چاہتے ہیں کہ یہ زنجیریں کیا کریں گی' تو ہندوستان کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالیے یہاں یونانی آئے' پارتھین آئے' باخترین آئے' ہن آئے' اور متعدد قومیں یکے بعد دیگرے آئیں لیکن آج ذرا چراغ لے کر ڈھونڈو تو سہی کہ ان قوموں کا کہیں سراغ بھی ملتا ہے؟ یہ قومیں ہندوستان سے واپس نہیں گئیں۔ آخر کیا ہوئیں' کیوں نظر نہیں آتیں؟ اس کا جواب تاریخ یہ دیتی ہے کہ انھوں نے خود فراموشی کا جرم کیا تھا اس لیے فنا ہو گئیں۔ جب یہ ہندوستان آئی تھیں تو اپنی الگ زبان' الگ تہذیب الگ تمدن' الگ مذہب رکھتی تھیں' مگر انھوں نے اپنے امتیازی خصائص

کی حفاظت نہ کی، اپنے آپ کو اس مُلک کی عام آبادی میں جذب کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج دُنیا میں ان کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے، صرف افسانے رہ گئے۔ کیا آپ بھی چاہتے ہیں کہ آپ کے بجائے صرف آپ کے افسانے باقی رہ جائیں؟

اور رازِ حیات صرف اس حقیقت میں مضمر ہے کہ:۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں ٭ موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

آپ اپنا مذہب۔ اپنا تمدن۔ اپنی تہذیب۔ اپنی زبان۔ اسی صورت میں قائم رکھ سکتے ہیں کہ آپ اپنی جماعت کو بحیثیت مستقل جماعت کے قائم رکھیں۔ وفیھا آیات لقوم یعقلون۔

(نوٹ) یہ مضمون علیحدہ رسالہ کی شکل میں بھی شائع ہو رہا ہے۔ قیمت چھ پیسہ علاوہ محصولڈاک

معارف القرآن

چونکہ زیرِ نظر رسالہ میں مسئلہ زبان پر ایک اہم اور بسیط مضمون شائع ہو رہا ہے اس لیے معارف القرآن کا سلسلہ جبری طور پر روکنا پڑا۔ انشاء اللہ آئیندہ نمبر میں یہ سلسلہ نظر افروز ہوگا اسی طرح جناب پرویز صاحب کا ایک خاص مضمون "پیامِ اقبال اور قرآن کریم" بھی اسی وجہ سے شائع نہ ہو سکا۔ آئیندہ یہ مضمون بھی انشاء اللہ قارئین کرام کی نظر سے گزرے گا۔

(منیجر)

ضروری تصحیح

طلوعِ اسلام بابت ماہ ستمبر میں صفحہ ۲۵ سطر ۱۸ پر عبارت "ہندو مسلمانوں کے نزدیک برٹش حکومت کے خاتمہ کی ضرورت اسلیے ہے" میں لفظ "ہندو" زائد ہے۔ جس سے عبارت کا مفہوم کچھ سے کچھ ہو گیا ہے، براہ کرم ناظرین کرام اپنے اپنے پرچوں میں اس کی تصحیح فرمالیں اور اس سے لفظ "ہندو" کو قلم زد کر دیں۔

(منیجر)

جنوری ۱۹۳۹ء | ا | ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ

متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب

(رازی)

ہندوستان کی سیاستِ حاضرہ میں جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ نظریۂ قومیت ہے یہی منحوس دوراہہ ہے جہاں پہنچکر ملتِ اسلامیہ کے افراد ایک دوسرے کو ہدفِ افتراق بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ الگ الگ جماعتوں میں تقسیم ہو رہے ہیں اور پھر یوں ایک دوسرے سے منہ موڑتے ہیں کہ گویا ان میں کبھی کوئی چیز وجۂ جامعیت تھی ہی نہیں۔ یہی وہ بدبخت چٹان ہے جس سے ٹکرا کر اُمتِ مسلمہ کی کشتی پاش پاش ہو چکی ہے اور اسکے منتشر تختے مختلف موجوں کے ساتھ اس بیکسی کے عالم میں بہے جا رہے ہیں جیسے گنگا میں لاشیں تیر رہی ہوں۔ قوم کی اجتماعیت فنا ہو چکی ہے انکی متحدہ قوتیں باہمی تخریب و استہلاک میں صرف ہو رہی ہیں مسلمان کا گلا مسلمان کے ہاتھوں کٹ رہا ہے۔ اور دوسری طرف وہ قوم جس نے اپنے اُستادانِ سیاست سے سیکھا ہے کہ کسی قوم کو تباہ و برباد کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ ان میں باہمی تفرقہ پیدا کر دو۔ نہایت اطمینان سے مسلمانوں کی طرف سے بالکل بے فکر ہو کر۔ اپنی آنیوالی حکومت کی تیاریوں میں مصروف ہے۔

سال گزشتہ کے آغاز میں اس نظریہ سے متعلق ایک نہایت اہم بحث کا سلسلہ چھڑا تھا۔ مولانا حسین احمد صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں فرمایا کہ "اس زمانہ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ مذہب سے نہیں بنتیں"۔ چونکہ یہ نظریہ اسلام کے شجرِ طیب کی جڑ پر تبر چلانے کے مرادف تھا اسلیئے ملتِ اسلامیہ کے قلبِ حساس میں اس سے ایک ٹیس پیدا ہوئی اور آہ و فغاں کی شکل میں ان الفاظ میں لب تک آ پہنچا کہ:۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد۔ ایں چہ بوالعجبی است

ذیقعدہ ۱۳۵۶ھ

۲

سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است !   چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست   اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است   (اقبالؒ)

ملّت کا نصیبہ یاوری کرتا تو مولانا صاحب حضرت علامہؒ کے انہی اشارات سے متنبہ ہو جاتے اور اللہ تعالیٰ ان کو جرأت عطا کر دیتا تو وہ اپنی غلطی کا اعتراف بھی فرما لیتے کہ کون سا انسان ہے جسے معصوم عن الخطاء ہونیکا دعوے ہو سکتا ہے لیکن ہماری شوریدہ بختی کہ ایسا نہ ہوا اور مولانا صاحب نے اعتراف حقیقت کے بجائے "عذرِ گناہ" کا مسلک اختیار فرما لیا اور اپنے نظریہ کی تائید میں ایک مبسوط بیان شائع کر دیا جس میں سب سے پہلے یہ فرمایا کہ میں نے اپنی تقریر میں قوم کا لفظ استعمال کیا تھا اور حضرت علامہؒ نے اپنے شعر میں اسے لفظ ملّت سے تعبیر کیا ہے جو عربی میں قوم کے لیے نہیں۔ بلکہ دین اور شریعت کے لیے مستعمل ہے۔ اس لیے حضرت علامہؒ کا الزام غلط ہے' اور اسکے بعد اپنے نظریہ کی توضیح ان الفاظ میں فرمائی۔

(۱) موجودہ زمانہ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں نہ کہ نسل و مذہب سے۔

(۲) قوم کا اطلاق ایسی جماعت پر کیا جاتا ہے جس میں کوئی وجہ جامعیت ہو۔ خواہ وہ مذہب ہو یا وطنیت یا نسل یا پیشہ یا رنگت یا کوئی اور صفتِ معنوی یا مادی وغیرہ۔

(۳) یہ دعوے کہ اسلام کی تعلیم' قومیت کی بنیاد جغرافیائی حدود یا نسلی وحدت یا رنگ کی یکسانی کے بجائے شرفِ انسانی اور اخوتِ بشری پر رکھتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ کون سی نصِ قطعی یا ظنی سے ثابت ہے۔   (مدینہ مورخہ ۱۲ فروری ۱۹۳۸ء)

جن خوش بخت حضرات کو حضرت علامہؒ کے قرب کی سعادت نصیب تھی انکا بیان ہے کہ انہوں نے حضرتِ علامہؒ نے، جب اس بیان کو پڑھا تو وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے تھے اور کہتے تھے کہ یا اِلٰہُ العالمین! اِس ہندوستان میں تیرے اس پیغامِ ازلی کا کیا انجام ہونے والا ہے! جہاں کے مفتیانِ دینِ متین اور حامیانِ شرعِ مبین کی یہ کیفیت ہے کہ وہ اُس نظریہ کو اسلامی نظریہ قرار دے رہے ہیں جس باطل نظریہ کو مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا اور جب تک اسے عملاً فنا نہیں کر دیا گیا دین کی تکمیل اور اتمامِ نعمت کا اعلان نہیں ہوا۔ حضرت علامہؒ پر ان دنوں مرض الموت کے سخت دورے پڑ رہے تھے

ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ

۳

لیکن مسئلہ کی اہمیت اتنی تھی کہ انہوں نے جان تک کی پروا نہیں کی۔ اور اس کے متعلق ایک نہایت بسیط اور جامع بیان اخبارات میں شائع فرما دیا۔ اور یوں اس مسلسل جہاد کی تکمیل فرما دی۔ جسکے اندر انکی تمام زندگی صرف ہوتی تھی۔ وہ جواب اس قدر مسکت اور مستحکم تھا کہ مولانا صاحب کو کہنا پڑا کہ میرا مقصد دہلی کے بیان میں اخبار رتھا انشا نہ تھا (متحدہ قومیت اور اسلامؒ) یعنی یہ کہ میں نے صرف یہ بتایا تھا کہ آجکل تو ر کا نظریہ یہ ہے کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں مسلمانوں کو یہ مشورہ نہیں دیا تھا کہ تم بھی اپنی قومیت کی بنا جغرافیائی حدود قرار دے لو۔

اس کے بعد حضرت علامہؒ انتقال فرما گئے۔ اور یوں اس بحث کا دروازہ بند ہو گیا لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ حضرت علامہؒ کی وفات کے قریب چھ ماہ بعد مولانا صاحب نے مرحوم کے آخری بیان کی تردید میں ایک پمفلٹ بعنوان "متحدہ قومیت اور اسلام" شائع کرا دیا۔ جو اسوقت ہمارے زیر نظر ہے اس میں شبہ نہیں کہ نفس موضوع کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ مولانا صاحب اس سے متعلق پمفلٹ نہیں بلکہ ایک ضخیم کتاب شائع فرما دیتے۔ لیکن ہمیں افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ جس انداز سے یہ پمفلٹ لکھا گیا ہے وہ کچھ پسندیدہ نہیں ہے اس میں اظہارِ حقیقت سے زیادہ زور حضرت علامہؒ کی تردید میں صرف کیا گیا ہے اور وہ بھی اس اسلوب سے کہ غم و غصہ کے انتقامی جذبات ایک ایک صفحہ سے اُبلتے نظر آ رہے ہیں جو اس بات کے غماز ہیں کہ اس تحریر کا محرک کون ساجذبہ تھا۔ اسمیں شبہ نہیں کہ ایسے وقت میں جب اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ فریقِ ثانی موجود ہی نہیں ہے۔ جو کسی کے جی میں آئے کہہ ڈالے۔ اس سے کہنے والے کا کلیجہ تو ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ طرزِ عمل کس چیز کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ حضرت علامؒ زندہ ہوتے تو ملتِ اسلامیہ کے سامنے۔ اس پمفلٹ کے جواب کے بہانہ سے قرآن کریم کے حقائق و معارف کا ایک اور باب کھل جاتا۔ اب اُن کی جگہ لینے والا کون ہے لیکن مولانا صاحب کو مطمئن رہنا چاہیئے کہ:-

اگرچہ میکدہ سے اٹھ کے چل دیا ساقی!

وہ مے۔ وہ خم۔ وہ صراحی وہ جام باقی ہے

ذلیقعد ۱۳۵۷ھ

۴

اور خم کدۂ اقبالؒ میں ایسے ایسے رندانِ قدح خوار موجود ہیں جو ساقی کی چشمِ مست کے صدقے شرابِ ہندی اور بادۂ حجازی میں ایک نگاہ میں تمیز کرکے بتا دیں۔ طلوعِ اسلام۔ جسے پیامِ اقبالؒ کی نشر و اشاعت کا فخر حاصل ہے اپنا فریضہ سمجھتا ہے کہ قرآنِ کریم کی روشنی میں متحدہ قومیت کے نظریہ کا تجزیہ کرکے مسلمانوں کے سامنے پیش کردے تاکہ وہ سعید روحیں جو تلاشِ حقیقت میں مضطرب و بیتاب رہتی ہیں کسی صحیح نتیجہ پر پہونچکر سامانِ تسکین حاصل کریں۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللہِ۔

طرزِ استدلال

آپ نے عام طور پر دیکھا ہوگا کہ ہمارے قومیت پرست حضرات اپنے دعاوی کی تائید میں ایک عجیب حربہ سے کام لیتے ہیں۔ جب کبھی ایسا ہو کہ وہ چاروں طرف سے گھر جائیں۔ کوئی راہِ مفر نظر نہ آئے۔ جواب بن نہ پڑے۔ دلائل عاجز آ جائیں۔ تو اُسوقت اُنکے ترکش کا آخری تیر نکلتا ہے اور وہ فریقِ مقابل سے نہایت جرأت و بیباکی سے کہہ دیتے ہیں کہ تم برطانیہ پرست ہو۔ سامراج کے حامی ہو۔ انگریز کے پٹھو ہو۔ رجعت پسند ہو۔ ٹوڈی ہو۔ آزادی کے دشمن ہو اور اسکا اس زور سے ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ اصل موضوع اس شور میں گم ہو کے رہ جاتا ہے ہمارا خیال تھا کہ ان اوچھے ہتھیاروں پر عام سطح کے لوگ ہی اُترتے ہونگے لیکن ہمیں یہ دیکھکر بیحد تاسف ہُوا کہ مولانا صاحب نے بھی اس باب میں اسی حربہ سے کام لیا ہے۔ چنانچہ جن اخبارات نے اُنکے پہلے بیان کی مخالفت کی تھی۔ انکے متعلق ارشاد ہے۔

> اگرچہ بہ حیثیت واقعہ بہت سے اشخاص سے غلط فہمی کا ازالہ ہو چکا ہے۔ اور ان برطانیہ پرست اخباروں کی افترا پردازی اور جھوٹے پروپگنڈے کا پردہ اُٹھ گیا ہے۔
>
> (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ)

ذرا آگے بڑھ کر تحریر فرماتے ہیں:۔

> "برطانیہ کے ازلی وفاداروں کو کب ایسی بات کا تحمّل ہو سکتا تھا" (ایضاً صفحہ)

اپنے اس رسالہ کے متعلق یوں پیش بندی کرتے ہیں کہ:۔

ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ

۵

"اگرچہ بہت سے ان لوگوں سے جنکو برطانیہ سے گہرا تعلق ہے یا جیسے دماغ اور قلبِ طاغی مدبرین کے سحر سے مانوس ہو چکے ہیں۔ اُمید نہیں کہ وہ اسکو قبول کرینگے" (ایضاً ص۶)

جن حضرات کی نگاہیں نفسیاتِ انسانی پر ہیں وہ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کی پیش بندیوں کی ضرورت کب اور کیوں لاحق ہوا کرتی ہے، یہ ابتدا میں لکھا اور آخیر میں جاکر اسے پھر دُہرا دیا کہ۔

"جو لوگ مسلمانوں کو اس میدانِ سیاست میں اُترنے سے روک رہے ہیں اور متحدہ قومیت کو بھیانک صورتیں ظاہر کر کے نفرت دلا رہے ہیں بلاشک و شبہ برطانیہ کی ایسی عظیم الشان خدمات انجام دے رہے ہیں جو اسکی افواج اور اسلحہ سے بھی انجام نہیں پا سکتیں"

(متحدہ قومیت اور اسلام ص۶)

یہاں تک بھی خیر تھی۔ لیکن — درازدستیٔ ایں کوتہ آستیناں بیں — کہ وہ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور — سنیئے اور داد دیجئے کہ — خود حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ۔

"یہ امر یقینی اور غیر قابلِ انکار ہے کہ جناب ڈاکٹر صاحب کی ہستی کوئی معمولی ہستی نہ تھی۔ اور انکے کمالات بھی غیر معمولی تھے وہ آسمانِ حکمت و فلسفہ شعر و سخن تحریر و تقریر۔ دل و دماغ اور دیگر کمالاتِ علمیہ و عملیہ کے درخشندہ آفتاب تھے۔ مگر باوجود کمالاتِ گوناگوں ساحرینِ برطانیہ کے سحر میں مبتلا ہو جانا یا بعض غلطیوں میں پڑ جانا۔ اور کسی ابجد خواں طالب علم کا اس سے محفوظ رہنا کوئی تعجب خیز بات نہیں" (ایضاً ص۸)

یہ مطلع تھا، مقطع ملاحظہ فرمایئے:۔

"غرضیکہ جادوگرانِ برطانیہ نے اپنی ساحرانہ کارگزاریوں سے سر سید جیسے تجربہ کار عقلمند شخص کو نہ صرف متحدہ قومیت سے بلکہ پالٹکس اور آئینی جدوجہد سے بھی روکا۔ اور اسی کے ذریعہ سے مسلمانوں کو ہمیشہ سیاسیات سے علیحدہ رکھوا کر بالکل نابلد اور ڈرپوک بنا دیا پھر اگر ڈاکٹر اقبال مرحوم اس سحر سے مسحور ہیں تو کیا تعجب ہے:" (ایضاً ص۴۲)

غالب کو کسی مخالف نے ماں کی گالی دی تو آپ نے کہا تھا کہ ان بد مذاق۔ کم ذوق لوگوں کو گالی دینے کا

ذیقعد ۱۳۵۷ھ ۶

سلیقہ بھی نہیں آتا۔ غالب شاعر تھا۔ اس لیے اُسنے اس چیز کو کور ذوقی پر محمول کیا لیکن اس کور ذوقی کا اگر نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب آدمی کے اعصاب پر انتقامی جذبات کا بھوت سوار ہو جائے تو اس کا عقلی توازن قائم نہیں رہتا اور اسکے بعد اسے خود معلوم نہیں ہوتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں ورنہ یہ ظاہر ہے کہ حضرت علامہؒ کے متعلق اور جو کچھ جی میں آئے کہہ لیجئے۔ شاید کوئی نہ کوئی ایسا مل جائے جو اسے باور کرلے لیکن انکے متعلق یہ کہنا کہ وہ سحرِ برطانیہ سے مسحور ہو چکے تھے ایک ایسا الزام ہے جسے تسلیم کرنے کے لیے کوئی صحیح الدماغ آدمی آپ کو نہیں ملے گا۔ اس لیے کہ جو شخص اقبالؒ سے تھوڑا بہت بھی واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ان کی تمام زندگی سحرِ برطانیہ اور افسونِ افرنگ کے خلاف ایک مسلسل جہاد تھی۔ اور ان کی زندگی کا یہ ایک ایسا کارنامہ تھا جس کا اعتراف خود انکے مخالفین تک کو تھا۔ انکے کلام پر اگر کوئی صاحبِ نظر دو لفظوں میں تبصرہ کرنا چاہے تو بلا تکلف کہہ سکتا ہے کہ وہ

فریاد ز افرنگ و دلآویزیٔ افرنگ

کی افسون شکن تشریح ہے۔ وہ اقبالؒ جس کی تمام عمر یہ کہتے کہتے گزر گئی کہ:۔

اے ز افسونِ فرنگی بے خبر ✤ فتنہ ہا در آستینِ او نگر ✤

از فریبِ او اگر خواہی اماں ✤ اشترانش را ز حوضِ خود براں ✤

وہ جسنے "کفن دزدانِ یورپ" کی انسانیت سوز و سیسہ کاریوں کے خلاف ایک مسلسل صدائے احتجاج ان الفاظ میں بلند کی ہو کہ۔

آدمیت زار نالید از فرنگ ✤ زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ ✤

وہ جو ان کے متعلق اس نتیجہ پر پہونچ چکا ہو کہ۔

جبرئیل از صحبتش ابلیس گشت

اور اس لیے ایک صدائے ربانی بنکر آخری سانس تک یہی تلقین کرتا رہا ہو کہ:۔

مومن خود ۔ کافرِ افرنگ شو[1]

[1] حضرت علامہؒ کے کلام سے اس عنوان پر گر تمام اشعار جمع کیے جائیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے (بقیہ حاشیہ دوسرے صفحہ پر)

ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ

۷

اس اقبالؒ کے متعلق یہ کہنا کہ وہ "ساحرینِ برطانیہ" کے جادو سے مسحور ہو چکا تھا یا تو بقول غالب اپنی انتہائی بد مذاقی کا ثبوت دینا ہے یا مغلوب الغضب ہونے کا اعلان کرنا۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ آج ہندوستان کے مسلمانوں میں بالعموم۔ اور اس طبقہ میں بالخصوص جو انگریزی خواں نہیں ہے سحرِ یورپ کے خلاف جس قدر بغاوت اور تنافر کے جذبات پائے جاتے ہیں یہ رہینِ منت ہیں۔ اسی مردِ حق آگاہ کی سعی پیہم کے۔ کس قدر ظلم ہے کہ بجائے اسکے کہ مولانا صاحب انگریزی نہ جاننے والے طبقہ کے نمائندہ کی حیثیت سے حضرت علامہؒ کے اس احسان کے لیے اظہارِ تشکر فرماتے۔ وہ ان کے خلاف اس حربہ کو لے کر میدان میں اتر آئے جس کی زد اچٹ کر خود اپنے ہی اوپر آپڑے کہ:۔

تا مرد سخن نگفتہ باشد ∴ عیب و ہنرش نہفتہ باشد

اگر حضرت علامہؒ کے خلاف عوام کو بھڑکانا ہی مقصود تھا تو اتنا کہہ دینا ہی کافی تھا کہ انکا فوٹو دیکھ لو داڑھی کہاں ہے؟

اور پھر آپنے یہ بھی ملاحظہ فرمایا کہ یہ سحرِ برطانیہ کا طعنہ دیا کس موقع پر جاتا ہے؟ مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ آجکل قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں۔ مذہب سے نہیں بنتیں" حضرت علامہؒ کا ارشاد ہے کہ یہ نظریہ کہ قومیت کی بنا ر وطنیت پر ہے ساحرینِ یورپ کا پیدا کردہ ہے۔ اسلام مسلم قومیت کی بناء خالص ایمان پر رکھتا ہے لہٰذا اسلام کا نظریۂ قومیت۔ یورپ کے نظریۂ قومیت کے بالکل خلاف ہے۔ اسکے جواب میں مولانا صاحب کا فتویٰ ہے کہ اقبالؒ ساحرینِ یورپ کے دامِ تزویر میں گرفتار تھا۔

یعنی

جو شخص یورپ کے ایجاد کردہ نظریہ کی تائید کرے وہ تو رئیس الاحرار ہے۔ اسپر سحرِ یورپ کا کوئی اثر نہیں

اور

جو شخص اسکی مخالفت کرے اور یہ بتلائے کہ یہ سحرِ یورپ ہے اس سے بچ کر رہنا۔ وہ ساحرینِ یورپ کے سحر

(بقیہ حاشیہ) اُس حب باید کرد کے مندرجہ صدر اشعار یونہی اسوقت ذہن میں آگئے ہیں۔ استیعاباً اسپر کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ وہ شخص جس نے کلامِ اقبالؒ کو سرسری نظر سے بھی دیکھا ہے اُسے معلوم ہے کہ طلسمِ فرنگ کی اُنہوں نے کس حد تک نقاب کشائی کی ہے ۱۲

ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ   ۸

میں گرفتار ہے۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

ان حضرات کے نزدیک سحرِ برطانیہ سے تو وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جو کفر و اسلام کے امتزاج سے ہندوستان میں ایک "متحدہ قومیت" کی تشکیل کی حمایت کرے۔ اپنی کوئی رائے نہ رکھے۔ بلکہ کانگرس کی پاس کردہ تجاویز کے لئے آلہ مکبر الصوت (Loud Speaker) کا کام دے۔ کانگرسی ائمہ سیاست کی اقتدار میں "جو نیت امام کی سو میری" کہہ کر انکی آواز پر اٹھتا اور جھکتا چلا جائے۔ ہائی کمانڈ کے فتاویٰ کے نیچے "الجواب صحیح" لکھ کر مہرِ تصدیق ثبت کر دے۔ اور جو ایسا نہ کرے۔ اسکے متعلق اعلان کر دے کہ اُسے انسان کہلانے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

وہی جذبۂ انانیت وخود پرستی جو کبھی اپنے آپ کو نحن ابناؤ اللہ (اللہ کی چاہیتی اولاد) اور دوسروں کو لیس علی شیء (عقل وبصیرت سے عاری) سمجھنے پر آمادہ کرتا تھا۔ جو اس دعویٰ کا محرک ہوتا تھا کہ لن یدخل الجنۃ الا من کان ھوداً او نصاریٰ (جنت میں وہی جاسکے گا جو ہمارے مسلک کی تائید کریگا) آج وہی جذبہ اپنے آپکو رئیس الاحرار اور باقی مسلمانوں کو ذلیل وخوار غلام سمجھنے کا محرک بن رہا ہے۔ روح وہی کارفرما ہے جو اقوامِ سابقہ کے احبار ورہبان میں ہنگامہ خیز تھی۔ صرف قالب میں فرق ہے۔

بدلکے بھیس زمانہ میں پھر سے آتے ہیں   اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات ومنات

اقبالؒ

تضاد بیانات

جیساکہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ مولانا صاحب نے حضرت علامہؒ کی زندگی میں اپنی غلطی کو اس نقاب میں چھپانے کی کوشش کی تھی کہ دہلی کی تقریر سے اُنکا مطلب صرف اس قدر بیان کرنا تھا کہ آجکل یورپ میں قومیت کے متعلق اس قسم کا نظریہ قائم ہوچکا ہے۔ اس سے مفہوم یہ مشورہ دینا نہیں تھا کہ مسلمان بھی اپنی قومیت کی تشکیل اُنہی خطوط پر کریں۔ اسکا اعتراف خود رسالہ زیرِ نظر میں بھی موجود ہے۔ جہاں فرماتے ہیں:۔

ذوالقعدہ ۱۳۵۷ھ

9

جس طرح ڈاکٹر صاحب مرحوم کو میرے بعض احباب کے خطوط کے جواب سے معلوم ہوا۔
دہلی کی تقریر میں مشورہ دینا مقصود نہ تھا اور نہ کوئی لفظ اس کا ذکر کیا گیا تھا۔"

(متحدہ قومیت اور اسلام)

لیکن اب مولانا صاحب نہ صرف اس نظریہ کا مشورہ ہی دیتے ہیں بلکہ اسے قرآن کریم سے ثابت کر کے بطور مذہبی فریضہ کے پیش کرنے کی کوشش فرماتے ہیں اور (معاذ اللہ) اسے خود نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کر کے مسلمانوں کو اس اسوۂ حسنہ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ہندوستانیوں کے لیے اپنے ضائع شدہ حقوق حاصل کرنے کا تذکرہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں

"ایسے مقاصد کے لیے متحدہ قومیت غیر مسلموں کے ساتھ بنانا خود جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسّلام سے منقول ہے۔" (ایضاً صـ۱۴)

اور اس کی اس شدت سے تائید فرماتے ہیں کہ:۔

"بنابریں متحدہ قومیت کا جذبہ (جو کہ ان مختلف مذاہب ہندیہ میں بجز وطنیت اور کسی ذریعہ سے پیدا نہیں ہو سکتا) پیدا ہونا اور نہایت قوت کے ساتھ پیدا ہونا ازبس ضروری ہے۔"

(متحدہ قومیت اور اسلام صـ۶)

معلوم نہیں کہ جس مسئلہ کو حضرتِ علامہؒ کی زندگی میں محض اخبار (خبر دینے) کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا اب کون سے مصالح سامنے آگئے کہ اسے انشاء کی حیثیت دی جا رہی ہے اور مسلمانوں کے دین اور دنیا کا تحفظ اسی کے اندر بتایا جا رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سیاسی معاملات میں عوام کا حافظہ کمزور ہوا کرتا ہے لیکن اتنا بھی کمزور نہیں جتنا مولانا صاحب خیال فرما رہے ہیں۔

لغوی بحث

مولانا صاحب نے فروری ۱۹۳۸ء میں جو بیان شائع فرمایا تھا اس میں تمام قوت اس بات کے ثابت کر دینے میں صرف فرما دی تھی کہ میں نے "قوم" کا لفظ استعمال کیا تھا اور حضرت علامہؒ نے اپنے شعر میں

ذیقعد ۱۳۵۷ھ   ۱۰

لفظ ملّت لکھا ہے جو قوم کے لفظ سے بالکل جداگانہ مفہوم پر دلالت کرتا ہے ہم نے اپنے مضمون نظریۂ قومیت مطبوعہ طلوع اسلام بابت مئی ۱۹۳۸ء میں عرض کیا تھا کہ ایک ایسے اہم مسئلہ کو لغوی بحث کے لفظی گورکھ دھندوں میں الجھا کر یہ سمجھ لینا کہ ہم نے اپنے دعوے کو نہایت محکم دلائل سے ثابت کر دیا ہے اپنے آپکو دھوکہ دینا اور قوم پر ظلم کرنا ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ متحدہ قومیت کا تصور از روئے اسلام جائز ہے یا نہیں ؟۔ اس سوال کو اس بحث سے کیا تعلق کہ لفظ ملّت بمعنی قوم استعمال ہوتا ہے یا نہیں ؟ رسالہ زیر نظر جب ہمارے سامنے آیا تو چونکہ اسکا عنوان تھا "متحدہ قومیت اور اسلام" ہمیں خوشی ہوئی کہ مولانا صاحب جیسے عالم متبحر نے اسلامی نقطۂ نگاہ سے اس موضوع پر روشنی ڈالی ہوگی لیکن ہماری مسرت بہت جلد مبدل بہ تأسف ہو گئی جب ہم نے دیکھا کہ مولانا صاحب نے ایک نہیں دو نہیں پورے بائیس صفحات پھر اس تحقیق انیق کی نذر کر دیے ہیں کہ قوم کے معنی ملت کے معنوں سے مختلف ہیں اور اس غرض کیلئے بڑی بوجھل عربی لغت کی کتابوں مثلاً مختار الصحاح۔ قاموس۔ تاج العروس۔ مجمع البحار۔ المنجد وغیرہ کے حوالوں سے اپنے دعوے کی تائید فرمائی ہے ہم تو اس چیز کو سمجھ ہی نہیں سکے کہ نفسِ موضوع کو بالآخر اس لغوی بحث سے تعلق کیا ہے یا تو مولانا صاحب خود ہی یہ نہیں سمجھ سکے کہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے کیا۔ اور یا وہ دانستہ فریقِ مقابل کو دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ کے بوجھ سے ڈرانا چاہتے ہیں۔ اس اسلوب مباحثہ سے ہمیں ایک مناظرہ کا قصہ یاد آ گیا ایک مولوی صاحب تھے فنِ مناظرہ میں طاق لیکن ویسے بالکل کورے۔ فریقِ مقابل ایک پڑھے لکھے فارغ التحصیل طالب العلم تھے اول الذکر مولوی صاحب کو فکر دامنگیر ہوئی کہ نفسِ موضوع پہ بات چھڑ گئی تو پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائیگا۔ اس لئے انہوں نے بساط مناظرہ پر شاطرانہ چال سے کام لینے کی ٹھانی۔ اٹھ کر فرمایا کہ مولوی صاحب سب سے پہلے یہ فرمایئے کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کلمہ ہے یا نہیں ۔ مولوی صاحب کے دماغ میں صرف و نحو کی جکڑ لگا رہی تھی۔ وہ اس نحوی غلطی کے کس طرح مرتکب ہو سکتے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ نہیں! یہ کلمہ کیسے ہو سکتا ہے۔ الکلمۃ لفظ وضع لمعنیً مفرد (کلمہ لفظِ مفرد کو کہتے ہیں)، مناظر مولوی صاحب نے بلند آواز سے کہا کہ لو بھائی مسلمانو! جو شخص مسلمانوں کے کلمہ کو کلمہ ہی نہیں مانتا اس سے ہماری بحث کیا ہو سکتی

ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ   11

ہے مسلمانوں کی باہمی بحث تو ان سے ہو سکتی ہے جنکا کلمہ ایک ہو۔ عوام کی جانب سے کہ نحوی مولوی صاحب نے کیا کہا۔ انہوں نے اتنا ہی سمجھا کہ یہ تو واقعی کلمہ کا بھی قائل نہیں ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اسکے بعد کیا ہوا ہوگا۔"

قوم و ملت کے لغوی گورکھ دھندے سے کچھ اسی نہج کی بحث مولانا صاحب چھیڑ دیتے ہیں اور آپ یہ سنکر انگشت بدنداں رہ جائینگے کہ خود مولانا صاحب کو اِس امر کا اعتراف ہے کہ حضرتِ علامہؒ نے ملت کا لفظ قوم ہی کے معنوں میں استعمال کیا تھا چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"مگر دوسری حیثیت سے جناب ڈاکٹر صاحب مسلمانانِ ہند کو قومیت متحدہ کا مشورہ دینا خلاف دیانت سمجھتے ہیں۔ اور یہ امر میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔" (متحدہ قومیت اور اسلام ص۳)

اب آپ خود اندازہ فرمالیجیے کہ مولانا صاحب کا اتنی طول طویل لغوی بحث سے مطلب کیا ہے۔ یہ تو ہوا خود انکا اعتراف۔ لیکن اگر بحث کا فیصلہ اِس لغوی اعتبار سے ہی کرنا ہو تو وہ تو ایک فقرہ میں ہو سکتا ہے۔ بے شک عربی میں قوم کے معنی جماعت اور گروہ کے ہیں اور ملت کے معنی شرع و دین کے لیکن حضرت علامہؒ نے اشعار مذکورۂ صدر فارسی زبان میں لکھے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ فارسی میں ملت بمعنی جماعت اور گروہ آتا ہے یا نہیں؟ اسکے متعلق مولانا صاحب فرماتے ہیں

"اور اگر غور کیا جائے تو متاخرین عرب اور فارسیوں اور ترکوں نے بھی لفظ ملت کو قوم کے معنی میں کہیں بھی استعمال نہیں کیا۔" (متحدہ قومیت اور اسلام ص۵۱)

لیکن ہم نہایت ادب سے گزارش کرینگے کہ جہاں انھوں نے عربی کے اتنے اتنے ضخیم لغت کھنگالے تھے اگر فارسی کے ایک چھوٹے سے لغت۔ مثلاً غیاث اللغات کی ورق گردانی کی تکلیف گوارا فرمالیتے تو انہیں نہایت آسانی سے نظر آجاتا کہ ملت کے معنی جماعت اور گروہ کے بھی لکھے ہیں۔

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کردیا

پھر یہ چیز بھی غور طلب ہے کہ مولانا صاحب نے "متحدہ قومیت" کے معانی متعین کرنے کا جو طریق

ذلیقعدہ ۱۳۵۷ھ ۱۲

اختیار فرمایا ہے وہ اصولی طور پر غلط ہے۔ وہ پہلے لغت سے لفظ قوم کے معنی متعین فرماتے ہیں یعنی گروہ جماعت اور پھر لفظ متحدہ کے معنی جن میں باہمی اتحاد ہو اور اسکے بعد جھٹ سے اس نتیجہ پر پہونچ جاتے ہیں کہ متحدہ قومیت کے معنی ہیں دو قوموں کا باہمی اتحاد کے رشتہ سے منسلک ہونا اور اسکے بعد فتویٰ صادر فرمادیتے ہیں کہ کہئے یہ کس طرح اسلام کے منافی ہے یہ ہے لے دے کے خلاصہ ان کی تمام لغوی بحث متعلقہ "متحدہ قومیت اور اسلام" کا۔ اسی سے تو ہم سمجھے ہیں کہ مولانا صاحب پر غالباً ابھی تک یہ بھی واضح نہیں ہوا کہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے کیا۔ یہ ظاہر ہے کہ "متحدہ قومیت" یا (Nationalism) دورِ حاضرہ کی ایک سیاسی اصطلاح ہے جسکے معانی دورِ حاضرہ کی سیاسی روشنی میں ہی متعین کئے جاسکتے ہیں نہ کہ اُس زمانہ کے کتب لغت سے جن میں اس اصطلاح کا کہیں ذکر تک نہ ہو۔ اس طرح اصطلاحات کے معانی متعین کرنے سے تو اصلی مطلب کبھی سامنے نہیں آسکتا۔ دورِ حاضرہ کی مختلف سیاسی اصطلاحات کو لیجئے۔ مثلاً ترکِ موالات۔ عدم تشدد۔ مخلوط انتخاب۔ گول میز کانفرنس۔ بین الاقوامی وفاق (FEDERATION OF STATES) وغیرہ۔ اور ان کے معانی پُرانی کتب لغت سے متعین کیجئے۔ پھر دیکھئے کہ اصلی مطلب کس طرح خبط ہوجاتا ہے۔ اس لئے کہ مصطلحات مروجہ کے معانی ہمیشہ اُس زمانہ اور اُس ماحول کے ماتحت لینے پڑیں گے جس میں کسی اصطلاح کا رواج ہوا ہو۔ لہٰذا جب ہم "متحدہ قومیت" کو اسلام کی میزان سے تولنا چاہیں گے تو پہلے یہ متعین کرنا ضروری ہوگا کہ متحدہ قومیت سے مُراد کیا ہے۔ اسکے بعد دیکھیں گے کہ اسلام اسکے متعلق کیا کہتا ہے۔ یہ ہے صحیح طریقہ کسی واضح نتیجہ تک پہنچنے کا۔ آیئے پہلے متحدہ قومیت کے معانی متعین کرلیں۔

ذیقعد ۱۳۵۷ھ ۱۳

باب دوم

متحدہ قومیت کا مفہوم

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں متحدہ قومیت (Nationalism) دورِ حاضرہ کی ایک سیاسی اصطلاح ہے جو بالخصوص ہندوستان میں فرقہ داری (Communalism) کے مقابلہ میں رائج کی گئی ہے۔ اس اصطلاح کے معانی متعین کرنے کے لئے ہمیں ان سیاسی مدبرین کی تحریروں اور تقریروں کی طرف رجوع کرنا ہوگا جنہوں نے اس اصطلاح کو رائج کیا ہے۔ مولانا صاحب نے خود فرمایا ہے کہ کانگرس نے اپنے پہلے اجلاس منعقدہ ۱۸۸۵ء میں اپنا پہلا اور ضروری مقصد حسب ذیل الفاظ میں ظاہر کیا تھا:۔

"ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے، ان سب کو متحد و متفق کر کے ایک قوم بنانا۔" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۵۳)

لہٰذا متحدہ قومیت کے معنی کانگرسی حضرات کے ہاں ہمیں مل سکیں گے اور وہ بھی عصرِ حاضرہ کے کانگرسی حضرات سے کہ اس مسئلہ نے اتنی اہمیت حال ہی میں اختیار کی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو لکھتے ہیں:۔

"ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت پیدا ہو۔"

(جامعہ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

اس سے اتنا تو معلوم ہوگیا کہ جس متحدہ قومیت کا نقشہ کانگرس کے ذہن میں ہے وہ آج موجود نہیں ہے بلکہ وہ کوشش کرنے کے بعد پیدا ہوگی۔ آج مسلمان ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہندو الگ۔ اس لئے یہ شکل متحدہ قومیت کی نہیں ہے۔ متحدہ قومیت کے عناصر ترکیبی کیا ہونگے اس کی تفصیل ذیل کی سطور میں ملیگی

عنصرِ اول مہاتما گاندھی لکھتے ہیں:۔

آج مسلمانوں کی الگ تہذیب ہے اور ہندوؤں کی الگ۔ ان دونوں تہذیبوں کے امتزاج

ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ ۱۴

سے متحدہ قومیت کی تہذیب مرتب ہوگی" (ہریجن مورخہ ۲۹ بحوالہ اسٹیسمین)
اسکی تفسیر سواحی سمپورنانند۔ وزیر تعلیم۔ یوپی، ان الفاظ میں فرماتے ہیں:۔
"ہر وہ شخص جو ہندو یا مسلم تہذیب کے قائم رکھنے اور اسکو مدارس میں جاری کرنے پر زور دیتا ہے وہ یقینی طور پر ملک کو نقصان پہونچاتا ہے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ چیز ہندوستان میں مفقود ہونی چاہیے..... جب ہندو مسلم تہذیبیں مٹ جائینگی تب ہی ہندوستانی تہذیب زندہ ہوسکے گی" (ٹریبون دمدینہ)
کانگرس کے شعبۂ اسلامیات کے معتمد ڈاکٹر اشرف صاحب اسکی تشریح میں یوں رطب اللسان ہیں:۔
"اسی اعتبار سے ہم آج ایک نئے اور زندہ تمدن کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ ہماری سیاسی اور سماجی جدوجہد اسی نئے تمدن کا پیش خیمہ ہے" (الجمعیۃ۔ رجب ۱۳۵۶ھ)
اس سے معلوم ہوا کہ متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوگا ایسی تہذیب جو نہ مسلمانوں کی ہو۔ نہ ہندوؤں کی۔ بلکہ دونوں کے امتزاج سے ایک نئی تہذیب پیدا ہو۔

عنصر دوم: آج مسلمانوں کا مذہب الگ ہے اور ہندوؤں کا الگ، اسلیے متحدہ قومیت ابھی وجود میں نہیں آسکتی اسکے لیے ضروری ہے کہ دونوں مذاہب ملاکر ایک ایسا مذہب پیدا کیا جائے جو دونوں کا مشترکہ مذہب بن سکے۔ چنانچہ ڈاکٹر سید محمود صاحب، وزیر تعلیم صوبہ بہار اپنے ایک مضمون میں اکبر کے دینِ الٰہی کیطرف اشارہ کرکے فرماتے ہیں:۔
"بعض نے اپنے ولولہ اور جوش سے مجبور ہوکر ہندوستان میں متحدہ قومیت کی آفرینش کے پیش نظر ایک ایسے جدید مذہبی نظام کی نشو و نما کرنی چاہی جو ہندوستان میں سب کے مناسب حال ہو۔ یہ ان لوگوں کی معمولی خدمات نہیں کہی جاسکتیں" (جامعہ اکتوبر ۱۹۳۶ء)
آنریبل مسٹر کے ایم منشی۔ ہوم منسٹر حکومت بمبئی نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں فرمایا۔
"جس قدر رجحانات مذہب یا زبان یا ایسے چھوٹے چھوٹے مسائل کی بنا پر قومیت پرستی

ذیقعد ۱۳۵۷ھ ۱۵

کے خلاف پیدا ہوتے ہیں۔ کانگرس ان رُجحانات کی مخالفت میں ایک مسلسل جدّ وجُہد کا نام ہے۔ من حیث القوم ہماری کمزوری کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کی طرف سے ایک واہمہ پیدا کر دیا گیا ہے کہ مذہب یا زبان کا رشتہ قومیت کے رشتہ کی جگہ وجہ جامعیت ہو سکتا ہے۔ یہ ایک بڑا مُہلک دھوکا ہے۔ یاد رکھیے مذہب یا زبان کا رشتہ ہمیشہ قومیت کے بلند ترین رشتہ کے ماتحت رہنا چاہیئے۔ یہ تصور ہی ہندوستان کو محکم اور آزاد بنا سکے گا۔" (نیشنل کال۔ ۹/۲۴؁ ۲۸)

ڈاکٹر بی۔ پتابھی سیتا رامیا، کانگرس کی مجلس عاملہ کے ایک رکن نے سودیشی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا!

ہمارا معاشرتی نظام جو ہزاروں برس ہوئے وجود میں آیا تھا اسکی رُو سے افلاس کا ناطہ علم اور عظمت کے ساتھ جوڑ دیا جاتا تھا لیکن اب زندگی کی متضاد قوتوں میں توازن پیدا ہو چکا ہے۔ اشتراکیت (کمیونزم) اور اشتمالیت (سوشلزم) دَورِ حاضرہ کے نظریۂ حیات ہیں۔ اور ہندو ازم اور اسلام ازم عہدِ کہن کی یادگاریں ہیں ہمیں چاہیئے کہ ہم اُنکی بُنیاد دونکا از سرِ نو امتحان کریں۔ (ہندوستان ٹائمز۔ ۹/۳۰؁ ۱۹)

مذہب چونکہ متحدہ قومیت کی تشکیل و تعمیر میں ایک سنگِ راہ سمجھا جاتا ہے۔ اسلیئے یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ جب تک ایک متحدہ مذہب وجود میں نہ آئے مذہب کو محض ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت دی جائے اور اسے سیاست سے بالکل الگ رکھا جائے۔ چنانچہ کانگرس کے صدر مسٹر بوس نے آسام میں ایک تقریر کے دَوران میں کہا تھا کہ "میں سب کچھ مسلمانوں کے حوالہ کر دینے کو تیار ہوں۔ بشرطیکہ وہ متحدہ قومیت کے نظریہ کو تسلیم کر لیں"۔ اسکی وضاحت میں ٹریبون نے اپنے ۱۷ جون ۱۹۳۸ء کے پرچے کے افتتاحیہ میں لکھا۔

"بس اس ایک شرط کے ماتحت طول وعرض ملک میں کوئی ایک کانگرسی بھی ایسا نہ ہوگا جو تمام اختیارات مسلمانوں کے حوالہ کر دینے پر آمادہ نہ ہو۔ اُنکے (یعنی کانگرسیوں کے) نزدیک یہ مسئلہ ذرا بھی اہمیت نہیں رکھتا کہ کانگرس یا حکومت کے دائرہ میں زمامِ حکومت جسکے ہاتھ میں ہے وہ ہندو ہے یا مسلمان یا عیسائی۔ کیونکہ اُنکے نظریہ کی رُو سے مذہب

کو سیاسیات سے نہ کوئی واسطہ ہے اور نہ ہی ہونا چاہیئے"۔

اور ایک مسلم قومیت پرست اسی نظریہ کو ان الفاظ میں دہراتا ہے:۔

"لیکن ان کا (مسلمانوں کا) باہمی اختلاف جو زیادہ تر مذہبی رجحانات کا نتیجہ ہے کبھی دور نہیں ہو سکتا اور اگر اسکے دور کرنے کی کوئی تدبیر ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ کسی ایسے ادارے میں شریک ہو جائیں جو مذہبیات سے بالکل علیحدہ اور صرف سیاسیات سے تعلق رکھتا ہو اور ایسا ادارہ صرف کانگرس ہے"۔ (مدینہ۔ ۱۳ اگست ۱۹۳۸ء)

ایک صاحب نے کہیں یہ اعتراض کیا کہ جواہرلال اور گاندہی مسلمانوں کے لیڈر کیسے ہو سکتے ہیں۔ اسکے جواب میں ایک (مسلمان) کانگرسی اخبار نے لکھا کہ۔

"اگر لیڈری سے مراد مسلمانوں کی دینی امامت و قیادت ہے تو یہ اعتراض درست ہے لیکن اگر اس سے مراد سیاسی رہنمائی ہے تو بے شک وہ قائدِ امام ہو سکتے ہیں" (زمزم ۱۵ ۱۱ ۳۸)

وارد ہا کی تعلیمی اسکیم کے متعلق جب اعتراض کیا گیا کہ اسمیں مذہبی تعلیم کا عنصر موجود نہیں۔ تو اسکے جواب میں کانگرس کا آرگن نیشنل ہیرالڈ اپنی ۳/۱۱ کی اشاعت میں لکھتا ہے:۔

"مذہبی تعصب کو یہ چیز فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ اس ملک میں جہاں اتنے مختلف عقائد موجود ہیں۔ قومی تعلیم کو مفید بنانے کی یہی تجویز ہو سکتی ہے کہ اُسے قرآن یا شاستروں کے قوانین اور احکام سے نہ لادا جائے"۔

متحدہ قومیت کے علمبردار ایک ایسے مذہب کو جو جماعتی زندگی سکھاتا ہو، کس قدر خطرناک سمجھتے ہیں اسکا کچھ اندازہ پنڈت جواہرلال نہرو کے ان الفاظ سے لگ سکتا ہے۔ وہ اپنی سرگزشت میں لکھتے ہیں

جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اُسے ہندوستان میں یا دوسری جگہ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اُسے یکسر مٹا دینے تک کی آرزو کی ہے۔ قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا۔ بے دلیل عقیدت اور تعصب کا۔ توہم پرستی اور لوگوں سے بیجا فائدہ اُٹھانے کا۔ قائم شدہ

ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ

۱۷

حقوق اور مستقل حقوق کی بقا کا حامی ہے۔" (میری کہانی۔ ص ۱۹۱)
لہٰذا متحدہ قومیت کی تشکیل کے لیے دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ مذہب اس قسم کا بنا دیا جائے جیسا دینِ الٰہی یا برہمو سماج جس کی داغ بیل اکبر نے ڈالی تھی۔ اور جس کی تشریح مولانا آزاد نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن میں کی ہے اور جب تک ایسا مذہب تیار نہ ہو سکے، اس وقت تک مذہب کو ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت دی جائے جسے دنیاوی معاملات سے کوئی تعلق نہ ہو۔

عنصر سوم۔ آج مسلمان اپنا نام من حیث الجماعت الگ رکھتے ہیں اور ہندو الگ۔ یہ افتراق و اختلاف بھی متحدہ قومیت کی تعمیر میں سخت حائل ہے۔ لہٰذا قومیتِ متحدہ کی تشکیل کے لیے ضروری ہے کہ قوم کا نام بھی ایک ہو۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب اپنے محولہ بالا مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:۔

لفظ ہندی کو زبان کے لیے نہیں بلکہ اہلِ ہند کے لیے اختیار کرنا چاہیے۔ دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایسا ملک ہے جس میں مختلف لوگ مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں صرف اسکا اظہار ہی ہماری دماغی کیفیت کا آئینہ دار بنجاتا ہے اور ہمارے متعلق یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ہم اس براعظم کی علیحدہ علیحدہ مذہبی اقوام ہیں اس لیے وقت آگیا ہے کہ ہم ایک مشترک نام اختیار کریں

یہ اسلیے کہ جیسا کہ ہم مسٹر کے۔ ایم۔ منشی کی تقریر کے اقتباس سے واضح کر چکے ہیں۔ وطنیت اور متحدہ قومیت کا رشتہ مذہب کے رشتے سے کہیں بلند و بالا ہے۔ اسلیے نام کا انتساب بالاتر رشتہ کی بنا پر ہونا چاہیے لہٰذا متحدہ قومیت کی تشکیل کے لیے تیسری ضروری چیز یہ ہوئی کہ مسلمانوں کا اپنا الگ اسلامی نام بھی نہ رہے۔

عنصر چہارم متحدہ قومیت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس قوم کی زبان بھی ایک ہو۔ اسلیے کہ جب تک کسی قوم کی زبان مختلف ہوتی ہے وہ دوسری قوم کے اندر جذب نہیں ہو سکتی اور بغیر انجذاب و انضمام متحدہ قومیت کا وجود عمل میں نہیں آ سکتا۔ الگ زبان کے وجود کے بقا کی تمنا کرنا فرقہ پرستی ہے جو قومیت پرستی کے بالکل متضاد جذبہ ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے ایک مضمون میں ارشاد فرماتے ہیں۔

۱۸ ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ

"مگر بدقسمتی سے ابھی تک ہندوستان میں فرقہ پرستی طاقتور ہے اور اس بنا پر زبان میں علیحدگی پسندی کا رجحان بھی وحدت کے رجحان کے ساتھ ساتھ اپنا اثر برابر دکھائے جا رہا ہے۔ قوم پرستی کے پورے نشوونما کے ساتھ علیحدگی پسندی جو زبان کے معاملہ میں پائی جاتی ہے یقیناً فنا ہو جائیگی۔ ایک علیحدگی پسند حامیٔ زبان کو اوپر سے کھرچو تو دیکھو گے کہ وہ اندر سے فرقہ پرست ہے۔ بلکہ زیادہ تر تم اُسے ایک سیاسی رجعت پسند پاؤ گے۔"

عنصرِ پنجم۔ جب تک مسلمان اپنے مذہب کے پابند ہیں اُنکے باہمی معاملات کا تصفیہ از روئے کتاب و سُنت صرف مسلمانوں کی جماعت۔ اُنکی اپنی مجلسِ شوریٰ اور اُس مجلس کا امیر، مرکزِ ملت، ہی کر سکتا ہے لیکن یہ اصول متحدہ قومیت کی تشکیل کے منافی ہے۔ متحدہ قومیت میں تمام معاملات کا فیصلہ ایک ایسی جمہوری حکومت کیطرف سے ہوگا جو تمام مختلف مذاہب کے مشترکہ مجموعہ پر مشتمل ہوگی۔ اور جمہوریت کے اصول کے مطابق اکثریت کا فیصلہ مُلک کا قانون بنا کرے گا۔ اور اِس جمہوریت کی بنا ہوگی۔ خالص وطنیت۔ مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کانگرس پارٹی کے لیڈر فرماتے ہیں:۔

"اب یہ ناممکن ہوگا کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جائے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اس امر کا اعتراف کریں۔ اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو اُنکے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور اُنہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اِس بات کا تو تصور بھی ناممکن ہے کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم ہو سکتا ہے .... عہدِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت کی بنا اِس نظریے پر قائم ہو سکتی ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک مُلک ہو اور اِس مُلک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتہ میں منسلک ہو کر ایک متحدہ قومیت بن جائیں۔"

(ہندوستان ٹائمز۔ مورخہ ۹/۵/۳۸)

ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ

19

یہ نظریہ ایک ہندو کا ہی نہیں بلکہ خود مولانا حسین احمد صاحب کا بھی ارشاد ہے کہ:۔

"ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی سب شامل ہوں، حاصل کرنے کے لیے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے اور اسلام امن آزادی کی اجازت دیتا ہے"

(زمزم ۷ر جولائی ۱۹۳۸ء)

اس جمہوریت میں اقلیت کی کیا حالت ہوگی۔ یہ جنگِ آزادی کے قائدِ اعظم کی زبان سے سُنیئے:۔

"دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے"۔ (میری کہانی از پنڈت جواہر لال صفحہ ۵۰ جلد دوم)

لہٰذا متحدہ قومیت کی تعمیر کا پانچواں رُکن یہ ہوا کہ اُس میں نظامِ حکومت ایسی جمہوریت پر قائم ہوگا جو مسلم و غیر مسلم کی جماعتوں پر مشتمل ہوگی اور جس میں اکثریت کے فیصلے مُلک کا قانون بنا کریں گے۔

یہ ہے مختصراً متحدہ قومیت کا تصوّر اور اُسکے عناصرِ ترکیبی۔ اسکے برعکس اگر مسلمان چاہیں کہ من حیث المسلم اپنا الگ ملّی تشخص قائم رکھیں تو یہ جذبہ فرقہ پرستی کا وہ شجرِ ملعونہ ہے جو متحدہ قومیت کی جنّتِ ارضی میں کسی صورت میں بارآور نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے جو یکجا نہیں منتشر ہے مبہم ہے۔ اور غیر متعین ہے اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت دُور از کار ہے۔۔۔۔۔۔۔ مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دُنیا میں کوئی قوم ہی نہیں۔ بس مذہبی اخوت کا رشتہ ہی ایک چیز ہے"۔

(میری کہانی جلد دوم صفحہ ۲۴۳)

پھر فرماتے ہیں:۔

"مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی مَن گھڑت اور محض پروازِ خیال ہے۔ اگر اخبارات

ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ

۴۰

اِس کی اسقدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اِس سے واقف ہوتے
اور اگر زیادہ لوگوں کو اسپر اعتقاد ہوتا بھی تو حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اِسکا خاتمہ ہوجاتا"
(میری کہانی جلد دوم صفحہ ۳۳۲)

کس قدر تاسف سے لکھتے ہیں کہ:۔

"ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اِس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں
اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دُنیا میں اِس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں"
(میری کہانی جلد دوم صفحہ ۱۳۳)

خود مولانا صاحب اِس خیال کی تائید اِن حقیقت کُشا الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

"ہندو مہاسبھا ویسے ہی ہندوؤں کی الگ جماعت ہے جیسے مسلم لیگ مسلمانوں کی۔ کانگرس
ہندوستان میں بسنے والے ہر ہندوستانی کی جماعت ہے" (زمزم، جولائی ۱۹۳۸ء)

یعنی مولانا صاحب کے نزدیک بھی پنڈت جی کی طرح مسلمانوں کی الگ جماعت کا وجود نہایت قابلِ نفرت چیز ہے اور قابلِ فخر جماعت وہی ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے امتزاج سے متحدہ قومیت کی بنیاد پر استوار ہو۔

تجزیہ

تفصیلاتِ بالا سے ہم نے دیکھ لیا کہ متحدہ قومیت کے اجزائے ترکیبی کیا کیا ہونے ضروری ہیں۔ چند الفاظ میں یوں سمجھئے کہ متحدہ قومیت میں:۔

(۱) مختلف قوموں کی تہذیب کو مٹا کر اسے ایک جدید تہذیب میں منتقل کر دیا جائے گا۔

(۲) مختلف جماعتوں کے جُداگانہ مذاہب کی تحلیل سے ایک مرکب مذہب تیار کیا جائے گا اور جب تک وہ تیار نہ ہو گا۔ اُسوقت تک مذہب کو محض ایک پرائیویٹ عقیدہ سمجھا جائے گا۔

(۳) مختلف قوموں کا الگ الگ نام بھی باقی نہ رہے گا۔ بلکہ ایک مشترکہ نام بنا بر وطنیت اختیار

ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ ۲۱

کیا جائے گا۔

(۴) مختلف جماعتوں کی زبان بھی جداگانہ نہیں ہوگی بلکہ اکثریت کی زبان متحدہ زبان قرار پائیگی۔

(۵) متحدہ قومیت کا نظام ایک ایسی جمہوریت سے مرتب ہوگا جو تمام اقوام کے امتزاج سے قائم ہوگا۔ اور جس کی رُو سے اکثریت کے فیصلے ملک کا قانون بنا کریں گے۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ

متحدہ قومیت میں مسلمانوں کو اپنا الگ قومی تشخص (National Identity) قائم رکھنے کی اجازت نہ ہوگی۔

لہٰذا

متحدہ قومیت کے معنی یہ ہوئے کہ ایک ملک میں بسنے والی مختلف قوموں کو بنا بر وطنیت اس طرح آپس میں ملایا جائے کہ انکی جداگانہ تہذیب۔ تمدن، نام، زبان۔ مذہب باقی نہ رہے۔ بلکہ انکے امتزاج سے ایک مشترکہ اور متحدہ تہذیب۔ تمدن، نام۔ زبان اور مذہب کا وجود عمل میں لایا جائے اور وہ سب ملکر ایک ایسے دستور العمل کے ماتحت زندگی بسر کریں جسے اس متحدہ قومیت کی جمہوری حکومت چلائے

یہ نظام کس طرح قائم کیا جائیگا اسکی تفصیل بھی پنڈت جواہر لال نہرو کی زبان سے سُن لیجئے۔ فرماتے ہیں:-

"سوسائٹی کی موجودہ کش مکش یعنی قومی جنگ اور پھر طبقات کی جنگ کا تصفیہ جبر کے سوا کسی اور صورت سے ممکن نہیں اس میں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کام بہت بڑے پیمانہ پر کرنا پڑے گا کیونکہ جب تک بہت بڑی جماعت ہم خیال نہ ہو جائے اسوقت تک نظام تمدن کو بدلنے کی کوئی تحریک مضبوط بنیاد پر قائم نہ رہ سکے گی۔ لیکن اسکے بعد تھوڑے لوگوں پر جبر کرنے کی ضرورت ہوگی"۔ (میری کہانی ص ۹۰ ؎)

معانی متعین ہوگئے۔ ارباب نظر کے لیے تو اسکی شاید ہی ضرورت ہو کہ اب دلائل و براہین سے یہ ثابت کیا جائے کہ اس قسم کی متحدہ قومیت کس طرح امت کو اپنے ہاتھوں آتمد بھون کے سامنے گنگا میں

۲۲ ذیقعد ۱۳۵۷ھ

ڈبو دینے کے مُرادف ہے لیکن چونکہ مولانا صاحب اِس متحدہ قومیت کے متعلق فرماتے ہیں کہ اسکی تشکیل مذہبی فریضہ کی حیثیت رکھتی ہے اور (معاذ اللہ) اسکی بُنیاد خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی تھی۔ اِسلیئے آئندہ صفحات میں واضح کیا جائیگا کہ فی الواقعہ عجم ہنوز رموزِ دیں نمی داند۔ پہلے مولانا صاحب کے دلائل پیش کیئے جائینگے۔

بابِ سوم

متحدہ قومیت اور اسلام

مولانا صاحب نے اپنے دعوے کے اثبات میں سب سے پہلے یہ دلیل پیش کی ہے کہ قرآن کریم میں جہاں مختلف انبیاء کرام کی قوموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان قوموں میں مومن و کافر دونوں شامل تھے لہٰذا اِس سے ثابت ہوا کہ مُومنین و کافرین کے امتزاج سے متحدہ قومیت بن سکتی ہے۔ لفظ قوم کی بحث کے دَوران میں ارشاد ہے کہ:۔

"جس جگہ (یہ لفظ) مضاف واقع ہوا ہے اور مضاف الیہ مُسلمان یا پیغمبر ہے اور کلام غیر مُسلم کے متعلق ہے تو یقیناً اس جگہ پر شرکوں اور کفار کا پیغمبر یا مسلمانوں کے ساتھ قومیت متحدہ میں منسلک ہونا ہی مفہوم ہوتا ہے۔ کذبت قوم نوح المرسلین۔ کذبت قبلھم قوم نوح واصحاب الرس .... الخ" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۱)

اسی قسم کی اضافتوں کی مثالوں کے بعد فرماتے ہیں:۔

"غرضیکہ اس قسم کی بے شمار آیتیں ہیں جن میں غیر مسلموں کو اور پیغمبر کو ایک قوم بتایا گیا ہے اور اِن کفار کو پیغمبر کیطرف بوجہ اتحاد نسب یا اتحاد وطن وغیرہ نسبت کیا گیا ہے۔" (ایضاً صفحہ ۱)

چنانچہ خود نبی اکرمؐ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

"بارگاہِ الٰہی سے جنابِ رسول اللہ صلعم اور دوسرے پیغمبروں کو بعد تقرر دین و شریعت کہا

ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ ۲۳

جاتا ہے:۔

قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ۔ الآیۃ ۔

کہہ دو کہ اے میری قوم تم اپنی جگہ پر عمل کرو۔ میں اپنی جگہ پر عمل کرتا ہوں"

اسکے بعد ان آیات سے حسب ذیل نتائج مستنبط فرماتے ہیں۔

"الغرض یہ آیتیں صاف طور سے واضح کر رہی ہیں کہ:۔

(الف) قرآن کے نقطۂ نظر اور استعمال میں لفظ قوم اپنے معنی کی حیثیت سے مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ ہر اس جماعت پر بولا جائیگا جن میں کوئی رابطہ ہو خواہ نسب کا یا وطن کا۔ یا پیشہ یا زبان کا۔

(ب) قومیت میں اشتراکِ مسلم و کافر ہو سکتا ہے اور قرآن کے استعمال میں یہ موجود ہے

(ج) پیغمبر بھی اتحادِ قومیت میں کافر، مشرک اور فاسق کے ساتھ دنیا میں تعلق رکھ سکتا ہے اور رکھتا ہے" (متحدہ قومیت اور اسلام ص۲۲)

ہمارا خیال ہے کہ اس دلیل کو پڑھ کر آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہو گی کہ حضرت علامہؒ کیوں بلک بلک کر روتے تھے۔ اور ہندوستان میں اسلام کے مستقبل پر کیوں خون کے آنسو بہاتے تھے جس قوم کے سب سے بڑے دارالعلوم کے سب سے بڑے عالم کی قرآن فہمی کی یہ حالت ہو اس قوم کے مستقبل کا خدا حافظ۔ یہی وہ احساس دردانگیز تھا جس کی بنا پر حضرت علامہؒ کا جگر شق ہو جاتا تھا[1] درہجومِ غم و فورِ الم کبھی سیلابِ اشک بن کر امنڈ آتا اور کبھی یک آہِ سحرگاہی کی صورت میں "بحضورِ حقؒ" یوں نالہ کش ہوتا کہ:۔

باآں قوم از تو میخواہم کشادے
فقیہش بے یقینے کم سوادے
بسے نادیدنی را دیدہ ام من!
"مرا اے کاشکے مادر نہ زادے"

[1] ارمغانِ حجاز ۲۱

ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ

۲۴

اسمیں شبہ نہیں کہ قرآنِ کریم نے مختلف انبیائے کرامؑ کے نام سے ان اقوام کو منسوب کیا ہے جو ان کے پیغامات کی اوّلین مخاطب تھیں۔ لیکن اس انتساب سے مقصد محض تعارف تھا (جعلنٰکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ہم نے تمہارے قبیلے اور خاندان اسلیئے بنائے کہ تم پہچانے جاؤ) مثلاً حضرت نوحؑ جس قوم کی طرف مبعوث ہوئے اس قوم کے متعلق قرآنِ کریم میں جہاں کچھ ذکر آئے گا تو لامحالہ اُسے "قومِ نوح" ہی کہنا پڑیگا۔ اِسکے علاوہ اس قوم کے ذکر کرنے کا اور کون سا طریقہ انسب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس قوم کا کوئی دوسرا نام ہی نہ تھا لیکن اِس سے یہ کیسے لازم آگیا کہ اِس قوم کے "کافر و مومن ملکر ایک متحدہ قومیت کے رشتہ میں منسلک ہو جاتے تھے"۔ نبی کی بعثت کے وقت ایک قوم موجود ہوتی تھی۔ کبھی اُسے اس نبی کی قوم کہہ دیا جاتا۔ اگر وہ کسی اور نام سے منسوب ہوتی تو وہ نام لے دیا جاتا مثلاً قومِ عاد، قومِ ثمود۔ کبھی اسے اُسکے کسی سردار کی طرف منسوب کر دیا جاتا۔ جیسے قومِ فرعون پھر اس قوم میں سے ایک جماعت ایمان لے آتی۔ اُن کی اس وحدتِ تخیل۔ اور وحدتِ عمل کی بنا پر انہیں دوسرے لوگوں سے متمیز کر کے مومنین کی جماعت کہا جاتا۔ جو اُس قوم میں سے انکار و تکذیب کرتے انہیں کفار کی جماعت کہا جاتا۔ قرآنِ کریم میں جہاں مختلف انبیائے کرامؑ کے نام سے مختلف قومیں منسوب ہیں۔ وہاں اُن قوموں میں سے دو مختلف جماعتوں کا ذکر الگ الگ موجود ہے۔ اور ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ متحدہ قومیت میں کسی الگ جماعت کا ذکر یا نام یا تشخص۔ یا جداگانہ قومی وجود اصولِ قومیت کے خلاف ہوتا ہے۔ پھر قرآنِ کریم نے ہمیں یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان ہر دو جداگانہ جماعتوں کے باہمی تعلقات کیسے ہوتے تھے اور انکا الگ الگ انجام کیا ہوا کرتا تھا۔ متحدہ قومیت میں اتنی بات تو ظاہر ہے کہ اگر ڈوبے گی تو تمام قوم ڈوبے گی۔ اگر ابھرے گی تو ساری کی ساری قوم اُبھرے گی یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اس متحدہ قوم کا ایک حصّہ سرفرازی و سربلندی۔ عزت و وقار۔ جاہ و حشمت۔ سطوت و حکومت کی زندگی بسر کرے۔ اور کوئی دوسرا حصّہ ذلت و مسکنت۔ تباہی بربادی افلاس و نکبت کے ہولناک عذاب میں مبتلا ہو۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جن اقوام کو مولانا صاحب انبیائے سابقہ کی متحدہ اقوام قرار دیتے ہیں ان کی یہ حالت ہوتی تھی کہ انہیں سے ایک جماعت (مومنین) کامیاب وکامران ہوتی۔ اور دوسری جماعت (کافرین) تباہی و بربادی کے جہنم میں دھکیل دی جاتی۔ سارا

ذیقعد ۱۳۵۶ھ

۲۵

قرآنِ کریم اسی قسم کے نظائر سے بھرا پڑا ہے اور ہم تو یہ کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی تمام تعلیم کا ماحصل یہ ہے کہ کفر و ایمان کے نتائج میں بیّن فرق کر کے بتا دے۔ ہم یہاں صرف ایک سورت (ہود) کی چند آیات پیش کرتے ہیں۔ رکوع دوم کے اخیر دو قسم کی جماعتوں کا ذکر ہے ایک تو وہ جسکے متعلق ارشاد ہے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ (۱۱/۲۳) ایمان والوں کی جماعت، دوسری وہ جسکے متعلق فرمایا اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَھُمْ (۱۱/۲۱) کفار کی جماعت، پھر اُن کا باہمی موازنہ ان الفاظ میں فرمایا۔ کہ ان کی شناخت میں کوئی شک شبہ باقی نہ رہے۔

مَثَلُ الْفَرِیْقَیْنِ کَالْاَعْمٰی وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِیْرِ وَالسَّمِیْعِ۔ ھَلْ یَسْتَوِیٰنِ مَثَلًا (۱۱/۲۴)

ان ہر دو جماعتوں (فرقوں) کی مثال اندھے اور بہرے اور دیکھنے اور سننے والے کی مثال ہے کیا یہ کبھی دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟

قرآنِ کریم نے یہاں لفظ بھی فریقین استعمال کیا ہے جو آپکی دورِ حاضرہ کی سیاست میں (COMMUNITIES) کا ترجمہ ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جسے Communalism یعنی فرقہ پرستی کہا جاتا ہے جو متحدہ قومیت کی بالکل ضد ہے۔

اس تمہید کے بعد تیسرے رکوع سے اُممِ سابقہ کے واقعات کا بیان شروع ہوتا ہے۔ جسمیں سب سے پہلے حضرت نوحؑ کی قوم کے تذکرہ کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖٓ۔ (۱۱/۲۵)

اور یقیناً ہم نے نوحؑ کو اُسکی قوم کی طرف بھیجا۔

ایک قوم تھی جس کی طرف حضرت نوحؑ کو بھیجا۔ اسکے بعد اس قوم کے مومنین اور منکرین کا ذکر ہے منکرین کی سرکشی اور بغاوت کا بیان ہے کشتی اور طوفان کا تذکرہ ہے۔ اخیر میں اس قوم کے دو فریقوں کو بالکل الگ کر کے دکھا دیا گیا ہے۔ ایک وہ جو نذرِ طوفان ہو گیا۔ دوسرا وہ جو حضرت نوحؑ کے ساتھ محفوظ و مصون زندہ رہا جسکے متعلق ارشاد ہے:۔

قِیْلَ یٰنُوْحُ اھْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَکٰتٍ عَلَیْکَ وَعَلٰٓی اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَکَ (۱۱/۴۸)

کہا گیا کہ اے نوحؑ ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ اترو۔ اور تم پر اور جو لوگ تمہارے ساتھ ہیں اُن پر برکات ہوں

ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ

۲۶

فرمایئے! ایک قسم کی متحدہ قومیت تھی جس کی دو جماعتوں میں تفریق ہوئی۔ پھر چھٹے رکوع میں حضرت ہودؑ کی قوم عاد کا ذکر ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ...... (۱۱/۵۰)

اور عاد کی طرف اُنکا بھائی ہود (بھیجا) جسنے کہا کہ اے میری قوم اللہ کی عبودیت اختیار کرو

پھر اس قوم کے کفار اور مومنین کی الگ الگ جماعتوں کا ذکر ہے اور انجام کار بتایا گیا ہے کہ نہ ماننے والوں پر تباہی اور بربادی کا عذاب نازل ہوا اور مومنین کی جماعت کے متعلق ارشاد ہوا

وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُودًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا...... (۱۱/۵۸)

اور جب ہمارا حکم آپہونچا تو ہم نے ہودؑ کو اور اُن لوگوں کو جو اسکے ساتھ ایمان لاچکے تھے اپنی رحمت سے بچا لیا۔

چھٹے رکوع میں حضرت صالحؑ کی قوم ثمود کا ذکر شروع ہوتا ہے (۱۱/۶۱) اور اس قوم کی سرکش اور فرمانبردار جماعتوں کی تفریق کے بعد قوم مومنین کے متعلق انہی الفاظ کا اعادہ ہوتا ہے جو مذکورہ صدر آیت میں مندرج ہیں۔

ساتویں رکوع میں قوم لوطؑ کا ذکر ہے۔ اس قوم کو بھی انہی دو گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے منکرین پر عذاب نازل ہوتا ہے اور مومنین کی جماعت حضرت لوطؑ کے ساتھ محفوظ رکھی جاتی ہے (۱۱/۸۱)

آٹھویں رکوع میں حضرت شعیبؑ کی قوم مدین کا ذکر ہے اور انکی حوالہ صدر تفریق کے بعد قوم مومنین کے متعلق آیت مندرجہ بالا کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ (۱۱/۹۴)

پھر حضرت موسیٰ کی قوم اور فرعون کی تباہی کا ذکر ہے اور ان انبیا کرام اور انکی اقوام کی مومن و کافر جماعتوں کے انجام کے تذکرہ کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ آپ کے سامنے بھی اس قوم مخاطب کے دو گروہ ہیں ایک تو مَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَيَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ والا (جماعتِ مومنین) اور دوسرا مَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَيُؤْمِنْ بِالطَّاغُوتِ والا (جماعتِ کفار) اور اس دوسری جماعت کے متعلق فرمایا:۔

وَقُل لِّلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنَّا عَامِلُونَ (۱۱/۱۲۱)

ذیقعدہ ۱۳۵۶ھ

۳۷

اور اس کفار کی جماعت سے کہہ دیجیے کہ تم اپنا کام کیے جاؤ ہم اپنی جگہ کام کیے جاتے ہیں

وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ٥ ۱۱/۱۲۲

تم بھی (انجام کا) انتظار کرو ہم بھی انتظار کرتے ہیں!

آپ ان حقائقِ قرآنی کو سامنے رکھیے اور پھر اپنی بصیرت سے فتویٰ طلب فرمایئے۔ کہ کیا ان سے وطنی متحدہ قومیت کے دعویٰ کا ثبوت ملتا ہے یا اس بات کا کہ وہ لوگ جو نبی پر ایمان لاتے تھے اور ان کی اتباع کرتے تھے۔ وہ ایک الگ جماعت کے افراد ہوتے تھے (جنہیں اِنَّا یعنی ہم کہا گیا ہے) اور دوسرے لوگ الگ گروہ پر مشتمل ہوتے تھے۔ (جنہیں کُم یعنی تم کہہ کر پکارا گیا ہے) اب یہ ظاہر ہے کہ "ہم" اور "تم" کی تفریق سیاستِ حاضرہ کی اصطلاح میں فرقہ پرستی کہلاتی ہے۔ اور متحدہ قومیت کی تشکیل اُسی وقت ہوتی ہے جب "ہم" اور "تم" کا امتیاز یوں مٹ جائے کہ:-

تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری!

پھر یہ بھی دیکھیے کہ ان ہر دو مختلف گروہوں کے باہمی تعلقات کیسے ہوتے تھے۔ کیا حضرات انبیاء کرام اور اُنکے متبعین کی جماعت کفار کی جماعت کے ساتھ یوں گھل مل کر رہتی تھی۔ کہ ان کی تہذیب ایک ہو جائے۔ تمدن ایک ہو جائے۔ نظریاتِ زندگی ایک ہو جائیں۔ یا مومنین کی جماعت کفار کی جماعت سے برأت اور بیزاری علیحدگی اور قطعِ تعلق کا اعلان فرمایا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ خدا نے یہ حکم بھی دیا تھا کہ کفار کی تباہی کے اوپر افسوس بھی نہ کرو۔

فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔ (المائدہ)

تو تم کفار کی بربادی پر تاسف بھی نہ کرو!

بلکہ اُن کی تباہی اور بربادی پر تو خوشی اور مسرت کے سجدہ ہائے شکر ادا کرنے کا حکم ہے کہ جسدِ انسانی سے اس مادۂ فاسدہ کا نکلجانا عین صحت ہے۔ فرمایا:-

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (انعام)

پھر ان ظالمین کی جڑیں کٹ گئیں۔ سو اللہ رب العالمین کے لیے سب تعریف ہے۔

۲۸ ذیقعد ۱۳۵۶ھ

ملتِ حنیفہ کے موسسِ اولیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُنکے ساتھیوں کی حیاتِ طیبہ کو قرآنِ کریم نے مومنین کے لیے اُسوۂ حسنہ قرار دیا ہے غور فرمایئے کہ اس باب میں اُنکا مسلک کیا تھا۔ اور قرآن کریم نے کس مقام پر اُنکے طرزِ عمل کو بطور نمونہ پیش کیا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ

یقیناً تمہارے لیے ابراہیم اور اُسکے ساتھیوں کی زندگی میں ایک بہترین نمونہ ہے۔ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور جو کچھ تم اللہ کے سوا پوجتے ہو ان سے بیزاری کا اعلان کرتے ہیں ہم تمہارے منکر ہیں۔ اور ہم میں اور تم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عداوت اور بغض ظاہر ہے جبتک کہ تم اللہ واحد پر ایمان نہ لے آؤ

دیکھئے "اِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ" ایک جماعت کا نام ہے اور "قَوْمِهِمْ" ایک دوسری جماعت ہے اور ان دونوں میں بغض اور عداوت ظاہر ہے: تا وقتیکہ کفار کی جماعت ایمان نہ لے آئے۔ فرمایئے یہ بغض اور عداوت کے تعلقات متحدہ قومیت ہی کا ثبوت دیتے ہیں یا متحدہ قومیت کے لیے حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ کی شرط بھی ضروری ہے۔ ذرا آج ہندوؤں سے کہیے کہ تمہارے اور ہمارے درمیان ہمیشہ کے لیے بغض و عداوت رہیگی۔ تا وقتیکہ تم ایمان نہ لے آؤ پھر دیکھیے کہ وہ آپکو کس طرح متحدہ قومیت کا جزو تسلیم کرتے ہیں یا مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ کے اُسوۂ حسنہ کی اتباع میں أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ پر عمل بنص صریح اسکا اعلان ہی کر دیجئے۔ پھر دیکھیے کہ یہ بڑے بڑے وسیع الظرف قومیت پرستی کے اوتار جناب کی نسبت کیا فیصلہ صادر فرماتے ہیں۔

مولانا صاحب قومِ نوحؑ قومِ موسیٰؑ وغیرہ کی مثالوں سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت کرسکتے تھے کہ کفار اور مومنین کی جماعتوں کو ایک مشترکہ نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے لیکن مشکل یہ ہوگی کہ اُمتِ محمدیہ کی نسبت اس نتیجہ سے بھی کچھ فائدہ نہ اُٹھایا جاسکے گا۔ اسلیئے کہ جسکے متعلق خود اللہ تعالےٰ نے کہہ دیا ہو کہ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ۔ اس نے تمہارا نام مسلمان رکھا۔ کسی کو کیا حق پہونچتا ہے کہ اُس قوم کا نام بھی کچھ

ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ

۲۹

اور رکھ سکے۔

یہ تھی متحدہ قومیت کے ثبوت میں مولانا صاحب کی پہلی دلیل۔

دوسری دلیل

متحدہ قومیت کے ثبوت میں مولانا صاحب نے دوسری دلیل اُسوۂ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیش کی ہے، فرماتے ہیں:۔

> جناب رسول اللہ صلعم نے اپنی رسالت کے چودہ برس گزر جانے کے بعد مدینہ منورہ میں وہاں کے اور اپنے ساتھ کے مہاجر و انصار مسلمانوں اور مدینہ کے یہودیوں کو ملا کر ایک متحدہ قوم اور متحدہ اُمت بنائی اور نہایت مفصل عہدنامہ اس امر کے متعلق تحریر فرمایا اور اس میں تحریر کر دیا گیا کہ شروط اور مذکور امور میں دشمنوں کے مقابل مسلمان اور یہود ایک اُمتِ متحدہ رہنگے مگر ہر ایک اپنے اپنے مذہب کا پابند ہوگا (متحدہ قومیت اور اسلام ص ۲۳)

اسکے بعد مولانا صاحب نے اُس "معاہدہ" کا ذکر فرمایا ہے جو مسلمانوں اور یہودیوں کی "متحدہ قومیت" کے مابین ہوا تھا۔

بات یوں تھی کہ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے علاوہ یہودی بھی رہتے تھے مدینہ منورہ کی محافظت کی ذمہ داری دونوں پر عائد ہوتی تھی۔ اسلئے حضور صلعم نے مسلمانوں کی جماعت اور یہودیوں کی جماعت کے درمیان ایک معاہدہ کیا جسکی رُو سے قرار پایا کہ اگر کوئی دشمن باہر سے حملہ آور ہوگا تو دونوں معاہد جماعتیں متحدہ طور پر اُس کی مدافعت کرینگی۔ اس سے مولانا صاحب استنباط فرماتے ہیں کہ نبی اکرم نے مسلمانوں اور یہودیوں کو ملا کر ایک قوم بنا کر متحدہ قومیت کی تشکیل فرمائی تھی۔ (رسالہ مذکور صفحہ ۴۹)

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے

مولانا صاحب نے اس دلیل کو یہاں پہلی مرتبہ ہی نہیں پیش کیا۔ بلکہ وہ اکثر اپنی تقریروں میں بھی دُہراتے رہتے ہیں اور بزعم خویش سمجھ لیتے ہیں کہ متحدہ قومیت کے ثبوت میں اس محکم دلیل اور

ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ ۔ ۳۰

عروۃ الوثقیٰ کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ وہ اگر کبھی ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں۔ تو انپر شاید یہ حقیقت واضح ہو جائے۔ کہ یہ واقعہ تو انکے دعوے کی بنیادوں تک کو متزلزل کر دیتا ہے۔ یہ بات ایک "ابجد خواں" بھی جانتا ہے کہ معاہدہ ہمیشہ دو مختلف اقوام میں ہوا کرتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مدینہ کے مسلمانوں کا، اور وہاں کے یہودیوں کا وطن ایک تھا۔ اب اگر متحدہ قومیت کی تعمیر کے لیے اشتراکِ وطن ہی ایک شرط ہو تو مدینہ کے مسلمان اور یہود تو اس اعتبار سے خود بخود ایک متحدہ قوم ہونے چاہئیں اس متحدہ قوم میں "معاہدہ" بخامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے۔ اس معاہدہ کا تو وجود ہی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مسلمان ایک ملک بلکہ ایک شہر میں رہتے ہوئے بھی غیر مسلموں کے ساتھ ایک قوم نہیں بن سکتے۔ مکہ کے مسلمان اور مدینہ کے مسلمان بلکہ حبش اور روم اور فارس کے مسلمان ایک قوم کے افراد ہونگے لیکن مدینہ کے مسلمان اور مدینہ کی یہود ایک قوم نہیں بن سکیں گے۔ ان میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے معاہدہ کی ضرورت پڑے گی۔ نبی اکرمؐ نے یہود اور مسلمانوں کے امتزاج سے ایک متحدہ قومیت کی تعمیر نہیں کی تھی۔ بلکہ اس معاہدہ کی رو سے دو مختلف اقوام میں باہمی اشتراکِ عمل اور اتحادِ محاذ کی شکل پیدا کی تھی۔ اور یہ وہ شکل تھی جسے قرآن کریم بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيثَاقٌ سے تعبیر کرتا ہے۔ غور فرمایئے اس آیہ مقدسہ میں ایک چیز ہے کُمْ (تم)، اور دوسری چیز ہے هُمْ (وہ یعنی غیر مسلم)، اور ان دونوں کے درمیان رابطۂ اتحاد پیدا کرنے کا ذریعہ ہے میثاق۔ متحدہ قومیت کو چھوڑیئے اسکا تو تصور ہی یکسر غیر قرآنی ہے۔ کفر و اسلام ، مومن و کافر کا اسطرح گھل مل جانا کہ انہیں آپس میں کسی معاہدہ کی ضرورت نہ رہے۔ تلبیس حق و باطل کی ایسی خوفناک مثال ہے کہ جس سے روح کانپ اٹھتی ہے اسلام کی رو سے تو مسلم اور غیر مسلم جماعتوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے بھی میثاق کی ضرورت ہے جس کے بغیر وہ ایک دوسرے کے ساتھ اجتماعی حیثیت سے اشتراکِ عمل نہیں کر سکتے۔ اور اشتراکِ عمل بھی صرف ان امور میں کر سکیں گے جو اس معاہدہ میں مشروط طور پر مذکور ہوں گے۔ اب ذرا یہ فرمایئے کہ جس طرح نبی اکرمؐ نے مدینہ کے یہود کے ساتھ معاہدہ کر کے اتحاد پیدا کیا تھا۔ آپ حضرات نے ہندوؤں کی جماعت کے ساتھ کونسا ایسا معاہدہ کیا ہے۔ معاہدہ کا سوال تو بعد میں پیدا ہوتا ہے، وہ تو جیسا کہ

ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ

۱۳

پہلے لکھا ہے آپ کی جُداگانہ قومیت ہی کو تسلیم نہیں کرتے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی تحریروں کے اقتباسات آپ دیکھ چکے ہیں۔ وہ اِس کا علانیہ تمسخر اڑاتے تھے، اور ایک جواہر لال پر کیا موقوف ہر وہ شخص (ہندو ہو یا مسلمان) جو متحدہ قومیت کا حامی ہے وہ مسلمانوں کی جُدا قومیت کے دعوے کو مذہبی جنون سے تعبیر کرتا ہے۔ ایسا دعویٰ کرنے والوں کو ساحرین برطانیہ کے جادو کا مسحور بتاتا ہے۔ رجعت پسند کہتا ہے۔ اُس کا نام ٹوڈی رکھتا ہے۔ یعنی وہ شخص جو ہندو مسلم اتحاد کے لیے اس راہِ عمل کو اختیار کرتا ہے جو قرآنِ کریم نے تجویز فرمائی اور جس پر خود نبی اکرمؐ نے عمل کر کے دکھایا۔ وہ آج — ہندوؤں کی نگاہ میں نہیں بلکہ قومیت پرست مسلمانوں کی نگاہ میں — اور عام مسلمانوں کی نگاہ میں نہیں بلکہ کتاب و سنّت کے علمبردار ہونے کے مُدعیوں کی نگاہ میں — مسلمانوں کا دشمن اور اسلام سے غداری کرنیوالا ہے۔ اور جو اُس متحدہ قومیت کا مُدعی ہے۔ جو یورپ کی تنگ نظری کی ایجاد ہے جسے ہندو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ایسا درخشاں اور تابناک بنا کر پیش کر رہا ہے، اور جسکے ماننے سے قصرِ اسلام کی بنیادیں ہل جاتی ہیں، وہ شخص واقفِ اسرارِ دین ہے۔ سرفروش و جانباز مجاہد ہے ملتِ اسلامیہ کا بہترین نمائندہ ہے۔ مسلمانوں کا صحیح ترجمان ہے۔ لہٰذا امام الہند ہے۔ امیر المومنین ہے۔ یا للعجب۔

چنیں دَور آسماں کم دیدہ باشد — کہ جبریلِ امیں را دل خراشد
چہ خوش دَیرے بنا کردند آنجا — پرستد مومن و کافر تراشد
اقبالؒ

کبھی یہ حضرات ہندوؤں سے الگ ہو کر بات سُنیں تو انہیں بتایا جائے کہ حضرت علامہؒ یا اُنکے ہم مسلک حضرات۔ جو مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے مُدعی ہیں، وہ انگریز کے مقابلہ میں ہندوؤں کے ساتھ مشترکہ محاذ قائم کرنے کے لیے بالکل اسی طریقِ عمل کو اختیار کرنا چاہتے ہیں جو نبی اکرمؐ نے اختیار فرمایا تھا۔ یعنی مسلمانوں کی الگ جماعتی حیثیت کو تسلیم کرا کر۔ ہندوؤں کے ساتھ من حیث الجماعت ایک معاہدہ کیا جائے۔ اور اُس معاہدہ کی رُو سے ہندو مسلم اتحاد پیدا کر کے صحیح آزادی حاصل کی جائے۔ لیکن ہندو چونکہ مسلمانوں کی جداگانہ جماعتی حیثیت کو فنا کر دینے

ذیقعدہ ۱۳۵۵ھ

۳۴

کے منصوبے باندھ چکا ہے اسلئے وہ اسے تسلیم کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتا۔ اور سادہ لوح مسلمانوں کو یہ کہکر اپنے زنّار کی لپیٹ میں لے لیتا ہے کہ یہ مطالبہ ہندو مسلم متحدہ قومیت کے راستہ میں ایک سخت روڑا ہے۔ اور انگریز کا پیدا کردہ ہے۔ اب مسلمان ہے کہ بلاسوچے سمجھے ہر جگہ یہی راگ الاپنا شروع کر دیتا ہے۔ اور یوں حریفانِ کوتہ آستیناں کا آلۂ کار بنکر اسی شاخ کو کاٹنے لگ جاتا ہے جس پر خود اس کا نشیمن ہے۔ چونکہ یہ مسلک ہندو کے مفاد کے عین مطابق ہے اس لئے وہ ایسے مسلمانوں کی بیحد تعریف کرتا ہے انہیں آزادیٔ وطن کا پرستار کہتا ہے ہر جگہ ان کا سواگت کرتا ہے ان کے چرنوں میں اپنی شردھا کے پھول چڑھاتا ہے شری یت اور دیش بندھو کہکر ڈنڈوت کرتا ہے اور یوں ملتِ اسلامیہ کی وحدت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے انہیں اپنی قومیت کی دیوار میں چنتا جاتا ہے۔ کسقدر صحیح کہا ہے اس مردِ حق آگاہ نے جسے فطرت کی کرم گستری نے بصیرت قرآنی اس قدر نوازاں عطا فرمائی تھی۔ فرماتے ہیں ؎

نگہ دارد برہمن کارِ خود را نمی گوید بکس اسرارِ خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر بدوش خود برد زنّارِ خود را (اقبالؒ)

ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ

۳۳

باب چہارم

مُسلم وغیرمُسلم کے تعلقات

موالات قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ انسانوں کے باہمی تعلقات کو دو شعبوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک وہ جسے وہ موالات کہتا ہے جس کے معنی ہیں قلبی تعلقات۔ ایک دوسرے پر کامل اعتماد۔ پورا پورا دلی بھروسہ۔ ایسے تعلقات جو شرائط و قیود کی سطح سے بلند ہوں جن میں قلب کو اتنا اطمینان حاصل ہو کہ حاضر و غیب دوسرے پر کامل بھروسہ کیا جا سکے اور یہ یقین ہو کہ میرے تمام مفاد دوسرے کے ہاتھ میں محفوظ ہیں۔ ظاہر ہے کہ متحدہ قومیت میں اسی قسم کے تعلقات کا تقاضا ہوگا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے کسی مُسلم کا غیر مسلم کے ہاتھ اس قسم کے تعلقات قائم کرنا جائز ہے یا نہیں۔ قرآن کریم میں موالات کے متعلق ارشاد ہے۔

"اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست (ولی) ہیں۔ نیک باتوں کی تعلیم دیتے ہیں۔ برائی سے روکتے ہیں نماز پڑھتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں ..... $\frac{9}{71}$"

دوسری جگہ فرمایا:۔

"تمہارے دوست تو صرف اللہ اس کا رسول اور ایماندار لوگ ہیں۔ جو نماز کی پابندی کرتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں اور ان میں خشوع ہوتا ہے" $\frac{5}{55}$

ان آیات میں حصر کے ساتھ بیان فرمایا کہ موالات کے تعلقات صرف مسلمانوں کے ساتھ پیدا کئے جا سکتے ہیں پھر اسی پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس کے برعکس یہ بھی بالتصریح فرما دیا کہ غیر مسلموں کے ساتھ ہرگز ہرگز اس قسم کے تعلقات پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ ارشاد ہے۔

ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ

۳۴

"اے ایمان والو۔ اپنوں کے سوا اور کسی کو دوست (ولی) مت بناؤ۔ وہ لوگ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھیں گے۔ وہ تمہاری ضرر رسانی کی تمنائیں رکھتے ہیں بعض (منصوبے) تو ان کے منہ سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ لیکن جس قدر ان کے دل میں چھپا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ہم آیات تمہارے سامنے ظاہر کر چکے ہیں اگر تم سمجھنے والے ہو تو۔ تم ان لوگوں سے محبت کرتے ہو مگر وہ کبھی تم سے محبت نہیں کرتے۔ حالانکہ تم تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو۔ جب یہ تم سے ملتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم بھی ان باتوں کو مانتے ہیں اور جب تم سے الگ ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف غصے سے اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کر کھاتے ہیں۔ کہہ دیجئے کہ جاؤ۔ اپنے غصے میں مر۔ اللہ دلوں کے حالات سے باخبر ہے۔ اگر تمہیں کوئی اچھی بات پہنچ جائے تو ان کے لئے موجب غم ہوتی ہے۔ اور اگر تم پر کوئی مصیبت آجائے تو یہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اگر تم استقلال سے رہو۔ اور ان سے اپنی حفاظت کرتے رہو۔ تو ان لوگوں کی تدابیر تم کو ذرا بھی ضرر نہیں پہنچا سکیں گی۔ اللہ ان کے اعمال کو محیط ہے"۔ $\frac{3}{119-120}$

ہم صرف اتنا دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ آیات آج بھی قرآن کریم میں موجود ہیں یا نعوذ باللہ منسوخ ہو چکی ہیں اگر موجود ہیں تو کیا ہندوستان کا ہندو ان غیر مسلموں میں شامل ہے یا نہیں جن کی نفسیاتی کیفیت کا ذکر ان آیات میں موجود ہے۔ اور اگر ہندو ان میں شامل ہے تو کیا اس کے ساتھ موالات کے تعلقات پیدا کئے جا سکتے ہیں؟ اس کا جواب بھی خود قرآن کریم سے سُن لیجئے۔ فرمایا۔

"جو لوگ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں ان کو تم کبھی نہ دیکھو گے کہ وہ ایسے لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں۔ جو اللہ اور رسول کے خلاف ہوں۔ گو وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی۔ یا کنبہ کے لوگ ہی کیوں نہ ہوں"۔ $\frac{58}{22}$

یعنی وطن کا رشتہ تو ایک طرف یہاں تو خون کا رشتہ بھی کوئی قیمت نہیں رکھتا۔

ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ

۳۵

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق پچھلے باب میں لکھا جا چکا ہے کہ انہوں نے کس قدر واضح الفاظ میں اعلان فرمایا کہ غیر مسلم جب تک ایمان لا کر جماعت مومنین میں داخل نہ ہو جائیں ان کے ساتھ موالات کے تعلقات پیدا نہیں ہو سکتے۔ اس اعلان سے متّصل یہ آیات بھی ملاحظہ ہوں۔ فرمایا۔

"اے ایمان والو! تم میرے دشمن اور اپنے دشمن کو دوست مت بناؤ کہ ان سے دوستی کا اظہار کرنے لگ جاؤ۔ حالانکہ تمہارے پاس جو کچھ حق کے ساتھ آچکا ہے وہ اس کے منکر ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر ان کو تم پر دسترس حاصل ہو جائے تو (فوراً) تمہارے دشمن ہو جائیں گے اور تم پر زبان اور ہاتھ سے مضرت رسانی پر اتر آئیں گے۔" (۶۰/۱-۲)

واضح رہے کہ ان اشاراتِ خداوندی میں کسی خاص زمانہ۔ کسی خاص ملک یا کسی خاص قوم کے غیر مسلموں کا ذکر نہیں۔ بلکہ یہ تمام کفار کو محیط ہیں۔ قرآن کریم میں اس بات کی صراحت متعدد مقامات پر موجود ہے۔ جن کے بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ البتہ اگر کسی کو اس میں کلام ہو تو ہم اس کی تصریحات پیش کرنے کو بھی تیار ہیں۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کو کفّار کے موالات سے جو اتنی شدّت سے روکا ہے تو اس کی وجہ بھی بیان فرما دی ہے کہ

ودوا لو تکفرون کما کفروا فتکونون سواء۔ فلا تتخذوا منھم اولیاء (۴/۸۹)

وہ لوگ اس تمنا میں ہیں کہ جیسے خود ہیں اسی قسم کے تمہیں بنا لیں۔ تاکہ تم اور وہ سب برابر ہو جاؤ۔ پس ان میں سے کسی کو دوست نہ بنانا۔

اس میں یہ ٹکڑا "فتکونون سواء" قابلِ غور ہے یعنی اُن کی خواہش یہ ہے کہ وہ تم کو بھی اپنے جیسا بنا لیں اور یوں تم سب برابر ہو جاؤ۔ ایک جیسے ہو جاؤ۔ ذرا غور کیجئے کیا متحدہ قومیت کی بنیاد اسی اصول پر نہیں ہے کہ ہندو اور مسلمان برابر ہو جائیں۔ ایک قوم بن جائیں۔ اقلیتیں اپنے امتیازی نشانات چھوڑ کر متحدہ قومیت کے اجزا بن جائیں۔ حالانکہ مسلمان کا امتیازی نشان ہی اس میں ہے کہ وہ صرف خدا کے رنگ میں رنگا ہو۔ صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ (اللہ کا رنگ اور اللہ کے رنگ سے بہتر کون سا رنگ ہو سکتا ہے) اور یہ رنگ اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک مسلمانوں کی جماعتی زندگی کا وجود

قائم ہے جب یہ امتیازی وجود مٹ جائے گا تو یہ رنگ بھی باقی نہیں رہے گا۔ غیر ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے۔ فرمایا۔

یا ایھا الذین آمنوا۔ ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا ۸/۲۹

اے ایمان والو۔ اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا کرے گا۔

یہ امتیاز مٹ گیا تو مسلمان بھی باقی نہ رہا۔ اور "تکونون سواء" سے کفار کی خواہش ہی یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ امتیاز مٹ جائے۔ اور اس کے مٹانے کے لئے آج ہندوستان میں سب سے بڑا حربہ متحدہ قومیت کا تصور ہے۔ جسے مولانا صاحب عین اسلامی شعار بتا رہے ہیں۔ اور نہیں سمجھتے کہ۔

دریں صد فتنہ را بر خود کشادی | دو گامے رفتی و از پا فتادی
برہمن از بتاں طاقِ خود آراست | تو قرآں را سرِ طاقے نہادی

(اقبال)

تعلقات کی دوسری قسم

تعلقات کی دوسری قسم یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ باہمی عہد و پیمان کرے۔ معاہدہ اور میثاق کی رو سے مشروط و مذکور معاملات میں ایک دوسرے کی مدد کا وعدہ کرے۔ یہ وہ طریق ہے جس کی قرآن کریم اجازت دیتا ہے۔ اور یہی وہ طریق ہے جس کی رو سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو سکتا ہے۔ ایسا ہی اتحاد نبی اکرمؐ نے مدینہ کے یہود کے ساتھ پیدا کیا تھا۔ قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ کفار اپنے عہد و پیمان پر بھی بہت کم پابند رہیں گے۔ اس لئے کہ ایک مسلمان تو اس لئے معاہدہ کی پابندی ضروری سمجھتا ہے کہ یہ اس کے خدا کا حکم ہے۔ ایسا نہ کرنے سے وہ خدا کے ہاں مجرم قرار پائیگا۔ اس کے برعکس کفار معاہدہ کو محض ایک سیاسی چال سمجھتے ہیں۔ یونان کے ایک بہت بڑے مقنن۔ سولن کا یہ قول کسے یاد نہیں کہ "معاہدہ مکڑی کا جالا ہے جو اپنے سے کمزور کو پھنسا لیتا ہے لیکن اپنے سے طاقتور کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا"۔ اور آج کون ہے جو سیاست عالم کا مطالعہ کرے اور اس مقولہ کی تصدیق نہ کرے۔ اسلئے قرآن کریم نے یہ بھی فرما دیا کہ غیر مسلموں کے ساتھ عہد و پیمان کرنے کے بعد آرام کی نیند نہ سو جاؤ بلکہ اپنی

ذیقعدہ ۱۳۵۶ھ ۳۷

جمیعت اور طاقت کو ہمیشہ برقرار رکھو کہ عہد بھی انہیں قوموں سے استوار رہتے ہیں جن میں طاقت موجود ہوتی ہے۔ مسلمان اس طاقت کو عہد شکنی میں۔ یا کمزوروں کو کچلنے میں صرف نہیں کرے گا۔ بلکہ اسے اس لئے برقرار رکھیگا کہ

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

اس کے بغیر ہر بالا دست قوت اسے ہڑپ کرنے کی فکر میں رہے گی۔ اسی لئے فرمایا

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ

اور ان کے خلاف ہر ممکن قوت کے ساتھ اور پلے ہوئے گھوڑوں سے اپنے آپ کو تیار رکھو تاکہ اس سے اللہ کے اور تمہارے دشمن خوف کھائیں اور ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی۔

قومیت پرست حضرات یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ فرض کیجئے ہم ہندوؤں کے ساتھ آج معاہدہ بھی کرلیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ معاہدہ کی پابندی ضرور کریں گے۔ لیکن وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ معاہدہ سے مطلب یہ نہیں کہ ایک کاغذ پر دستخط کر کے پھر بے فکر ہو جانا چاہئے۔ ہندوستان میں مسلمان کچھ کم حیثیت نہیں رکھتے۔ نو کروڑ نفوس اگر اپنے اندر اجتماعیت کا جذبہ پیدا کر کے ایک نظام اور ایک مرکز کے ماتحت زندگی بسر کرنے کا تہیہ کرلیں تو ہندو تو ایک طرف انگریز کی بھی مجال نہیں کہ اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے۔ اُس وقت دیکھئے کہ معاہدوں کی توقیر کس طرح نہیں ہوتی۔ یہی تو وہ خطرہ ہے جس کے لئے ہندو مسلمانوں کی الگ جماعتی زندگی کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتا۔ اور اس کے خلاف اُس نے متحدہ قومیت کا ایسا نظر فریب جال تیار کیا ہے کہ جس میں بڑے بڑے مُرغ زیرک رشتہ بر پا نظر آتے ہیں ورنہ کفار پر اعتماد، اُن سے دلی دوستی، اُن کے وعدوں کا اعتبار، اُن سے یگانگت کے تعلقات مسلمانوں کی اجتماعی خودکشی کے مرادف ہے۔

سطور بالا میں ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ کتاب وسنّت کی روشنی میں بیان کیا ہے لیکن ہمارے قومیت پرست حضرات کی یہ عادت ہو چکی ہے۔ کہ وہ کسی ایسے شخص کی کوئی بات صحیح نہیں تسلیم کرتے جو

ذلیقعد ۱۳۵۷ھ

۳۸

ان سے اختلاف رائے رکھتا ہو۔ خواہ وہ قرآن ہی کیوں نہ پڑھ کر سنائے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ اس باب میں انہی میں سے ایک جلیل القدر ہستی کے خیالات پیش کر دیئے جائیں جنہیں وہ اپنے مسلکِ قومیت پرستی سے پہلے اپنی پوری شانِ خطابت کے ساتھ مسلمانوں کے لئے واحد اسلامی راہِ عمل قرار دیا کرتے تھے۔ سنئے اور غور سے سنئے کہ مولانا ابوالکلام آزاد جو کاروانِ قومیت پرستی کے سرخیل ہیں کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

مولینا آزاد کے ارشادات (مسلکِ قومیت پرستی سے پہلے)

"کفار کے عہد و پیمان کا تجربہ بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ آبرو باختہ ہیں۔ عزتِ نفس و شرف کا انھیں لحاظ تک نہیں۔ وہ قسمیں کھاتے ہیں۔ حلف اٹھاتے ہیں کہ یہ وعدہ استوار ہے اس میں دوام و استمرار ہے۔ یہ عہد محکم ہے۔ یہ قول و قرار قانونی حیثیت رکھتا ہے۔ زبان سے سب کچھ کہتے ہیں۔ مگر ہاتھ سے کام لینے کے وقت کچھ یاد نہیں رکھتے۔ ایسے لوگوں کے مطیع رہنا ذلت کی بات ہے اسلام اپنے فرزندوں کو ان کی اطاعت سے باز رہنے کی ہدایت کر رہا ہے کہ خبردار قسمیں کھانے والے ذلیل النفس ہیں۔ ان کے حلف پر نہ جانا یہ ادھر کی بات اُدھر لگاتے ہیں۔ قوم میں تفرقے پیدا کرتے ہیں۔ منع خیر کے لئے نہایت مبالغہ کے ساتھ آمادہ رہتے ہیں۔ حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ تعدی ان کا شیوہ ہے۔ تطاول ان کی عادت ہے .... کفار سے مسلمانوں کو ساز و باز نہ رکھنا چاہئے۔ اُن سے بے تعلق لازم ہے۔ جو ساز و باز رکھتے ہیں جنہیں ان سے بے تعلق رہنے میں اپنے اور اپنی قوم کے لئے مشکلات اور مصائب کا اندیشہ ہے وہ غلطی پر ہیں۔ ان کو پشیمان ہونا پڑے گا۔ اسلام کو فتح نصیب ہوگی اور مسلمانوں کی بہبود و بہتری کا قدرتِ کاملہ کوئی اور انتظام کرے گی"

مضامین آزاد حصہ سوم

خدا معلوم وہ قرآن اب کہاں چلا گیا جو ان حضرات کو کفار کے متعلق اس قسم کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ اُس بصیرتِ ایقانی کو کن چیزوں کی چمک چکا چوند کر گئی جو ان حقائق کو بے نقاب دیکھا کرتی تھی۔ اُس جرأت

۳۹ ذیقعد ۱۳۵۷ھ

ایمانی کو کس کی نظر کھا گئی جو سینے کے پورے زور سے کفار سے برأت و بیزاری کا اعلان کیا کرتی تھی وہ حرارتِ قلبی کون سی مصلحت کوشیوں کی برفانی سلوں کے نیچے دب گئی جو کفار کی سازشوں پر یوں مشتعل ہو جایا کرتی تھی۔ اُس قدرتِ کاملہ پر بے پناہ توکل کو کیا ہو گیا جو کبھی یہ تسکین دیا کرتا تھا کہ کفار کی کثرت سے گھبرا کر ان کے ساتھ تعلقات بڑھانے پر آمادہ نہ ہو جاؤ۔ اسلام کی کامیابی کیلئے خدا خود کوئی انتظام کر دے گا۔ اسے قوم کی بدبختی نہ کہیے تو اور کیا کہیے کہ یہ حضرات جو کبھی اپنے صحیح اسلامی مسلک کی بنا پر قوم کی نگاہوں میں ممتاز و مقدس قرار پا گئے تھے۔ اپنی اس پوزیشن سے یوں ناجائز فائدہ اٹھا کر اب قوم کو اپنے ہاتھوں جہنم میں دھکیل رہے ہیں۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ
جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۱۴/۲۸-۲۹

کیا تم نے ان لوگوں کی طرف بھی دیکھا جنہوں نے کفرانِ نعمتِ الٰہی کیا اور یوں اپنی قوم کو جہنم میں دھکیل دیا۔ جس میں وہ داخل ہونگے اور جو بہت بری جگہ رہنے کی ہے

باب پنجم

متحدہ قومیت کے دعوے کے اثبات میں مولانا صاحب نے صرف یہی دو دلیلیں پیش کی ہیں جن کا جواب عرض کیا جا چکا ہے۔ لیکن اُن کے رسالہ میں چند ایک باتیں اور بھی ایسی ہیں جو اُن کی غلط فہمیوں کی آئینہ دار ہیں اور جن کا ازالہ ضروری نظر آتا ہے۔ حضرت علامہؒ نے اس نظریہ کو پیش کیا تھا کہ اسلام قومیت کی بنا اتحادِ رنگ۔ نسب۔ وطن۔ زبان۔ پر نہیں رکھتا بلکہ وہ قومیت کی بنیاد اُس بلند ترین اور عالمگیر تخیل پر رکھتا ہے جسے ایمان کہا جاتا ہے۔ اس کو مدیر احسان نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

"اسلام کی تعلیم قومیت کی بنیاد جغرافیائی حدود یا نسلی وحدت یا رنگ کی یکسانی کے بجائے شرفِ انسانی اور اخوتِ بشری پر رکھتی ہے"۔ متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۲۳

ذیقعد ۱۳۵۷ھ ۳۰

اِس کے متعلق مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ یہ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ ایسا ماننے سے یہ لازم آتا ہے کہ

"تمام انسان اور ہر فرد بشر خواہ یہودی ہو خواہ عیسائی۔ ہندو ہو یا مسلمان۔ سکھ ہو یا پارسی۔ بدھ ہو یا جینی۔ کالا ہو یا گورا۔ ایشیا ئک ہو یا افریقی (؟) سب کے سب ایک قوم ہو جائیں۔ کیونکہ شرفِ انسانی اور اخوتِ بشری سب میں پائی جاتی ہے۔ سب کے سب حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کی اولاد ہیں اور لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ اور لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ .... الخ وغیرہ آیات (جو کہ شرفِ انسانی پر دلالت کرتی ہیں) کے مصداق ہیں۔ ہمارے علم میں کوئی آیت یا حدیث قومیت کی بنیاد ایسے شرفِ انسانی اور اخوتِ بشری پر رکھنے والی موجود نہیں ہے"

ایضاً صفحہ ۳۲-۳۴

مشکل دراصل یوں واقع ہوئی ہے کہ حضرت علامہؒ نے اپنے بیان میں اسلامی قومیت کے متعلق جو اشارات ذکر فرمائے تھے۔ ان کا مخاطب قرآن فہم طبقہ تھا۔ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ فریقِ مقابل کی قرآن کریم پر اتنی بھی نگاہ نہیں ہے تو وہ شاید اسے اپنی بلندی سے کچھ نیچے اتر کر لکھتے۔

مولانا صاحب کی دلیل کا صغریٰ کبریٰ یوں قائم ہوتا ہے۔

(۱) تمام بنی آدم جس صورت میں وہ آج موجود ہیں مشرف و مکرم ہیں۔

(۲) اور موجودہ انسانوں کی باہمی خوں ریزیاں اور تفرقہ انگیزیاں بالکل واضح ہیں۔

اس لئے

(۳) تمام انسان ایک قومیت کے رشتہ میں منسلک نہیں ہو سکتے۔

مولانا صاحب کا الجھاؤ دراصل اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کی رُو سے تمام انسان جس صورت میں وہ آج موجود ہیں مشرف و مکرم ہیں لیکن اگر وہ اپنی نگاہ میں ذرا وسعت پیدا کرتے تو یہ مشکل نہایت آسانی سے حل ہو جاتی۔

۱۴ ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ

انھوں نے لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ سے یہ سمجھ لیا کہ تمام انسان شرف واکرام میں برابر ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم کا اعجاز دیکھئے کہ اس نے اِسی سورت میں تمام مسئلے کو حل کر کے رکھ دیا سورۂ والتین کی متعلقہ آیات یہ ہیں۔

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ	ہم نے انسان کو بہترین ہیئت میں پیدا کیا
ثُمَّ رَدَدۡنٰهُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ	پھر اُسے نچلے سے نچلے درجے میں گرا دیا
اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	مگر اُن لوگوں کو نہیں جو ایمان لائے اور انہوں
فَلَهُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ۔	نے اعمالِ صالحہ کئے اور اُن کیلئے غیر منقطع اجر ہیں

قرآنِ کریم یہ بتاتا ہے کہ فطرتِ انسانی نہایت عُمدہ ہیئت پر پیدا کی گئی ہے (اَحۡسَنِ تقویم) لیکن انسان اس دنیا میں خارجی اثرات کے ماتحت اِس چشمۂ صافی کو جب مکدر کر لیتا ہے تو اُس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ شرف واکرام کے درجے سے نیچے گر جاتا ہے (اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ) لیکن جو انسان قرآنِ کریم کے متعین فرمودہ ایمان و اعمالِ صالحہ پر کاربند رہتے ہیں۔ وہ شرفِ انسانی کی صفت سے موصوف ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو شرف واکرام سے نیچے گر گئے تھے اُن کے لئے شرف واکرام کی سطح پر پھر سے آنیکا صرف ایک راستہ کھلا ہے کہ وہ اُمتِ محمدیہ میں داخل ہو جائیں تاکہ فطرتِ انسانی یوں اپنی اصلی شکل میں سامنے آجائے۔ جتنے انسان یوں فطرتِ صحیحہ کو اختیار کرتے جائیں گے (جسے اسلام کہتے ہیں) وہ ایک قومیت کے شیرازہ میں منسلک ہوتے جائیں گے۔ اور یہ دائرہ رفتہ رفتہ بڑھتے بڑھتے تمام عالم کو محیط ہو جائیگا۔ یہ ہے تفسیر حضرت علامہؒ کے اِن بصیرت افروز الفاظ کی۔

"الفاظ شرفِ انسانی کے متعلق کسی کو دھوکا نہیں ہونا چاہئے۔ اسلامیات میں ان سے مراد وہ حقیقتِ کبریٰ ہے جو حضرتِ انسان کے قلب وضمیر میں ودیعت کی گئی ہے یعنی یہ کہ اِس کی تقویم فطرت اللہ سے ہے اور اس شرف کا غیر ممنون یعنی غیر منقطع ہونا منحصر ہے۔ اس تڑپ پر جو توحید الٰہی کے لیے اُسکے رگ و ریشہ میں مرکوز ہے۔"

فرمائیے کہ کیا یہ سورۂ والتین کی صحیح تفسیر نہیں ہے؟ لیکن مولانا صاحب اِن الفاظ کے متعلق

ذیقعد ۱۳۵۸ھ

ارشاد فرماتے ہیں کہ "ہمکو فلسفی الجھاؤ میں ڈالا جاتا ہے۔" اور اس جرأت کے ساتھ کہ "ہم اِن حقائق اور تخیلات کے متعلق کوئی تصدیق اور کوئی تکذیب کا کلمہ پیش کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۴۴) استغفر اللہ! مولانا صاحب نے یہ بھی نہیں سوچا کہ نشتر کی زد کہاں پہنچ رہی ہے۔ حضرت علامہؒ قرآن کی آیات کا ترجمہ واضح الفاظ میں بیان فرماتے ہیں اور مولانا کا ارشاد ہے کہ ہم اس کی تصدیق کے لیے تیار نہیں ہیں!

مولانا صاحب نے دوسری آیت وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ کی نقل کی ہے۔ لیکن اگر اُن کی نگاہیں قرآنِ کریم کے دوسرے مقامات پر بھی ہوتیں تو اُن پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ اس کا مفہوم بھی وہی ہے جو ہم نے سورۂ والتین کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ فطرتِ انسانی مکرم ہے لیکن ایک انسان صرف اس وقت مکرم ہوتا ہے جب وہ اپنی فطرتِ صالحہ کو لئے ہوئے ہو۔ اور اس کا معیار تقویٰ ہے جس کے متعلق فرمایا کہ:-

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ

اللہ کے نزدیک تم میں سے مکرم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

اور تقویٰ نام ہے اُس قانونِ الٰہی کے تابع ہونے کا جو قرآنِ کریم کی دفتین میں محفوظ ہے قرآنِ کریم قومیتِ اسلامیہ کی بنیاد اسی پر رکھتا ہے۔ اور یہی حضرت علامہ کا ارشاد ہے۔ یعنی

"نبوّتِ محمّدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک ہیئتِ اجتماعیۂ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اُس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوتِ محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا"

یہ ہے حضور! مطلب اِس فقرہ کا کہ اسلام نے قومیت کی بنا شرفِ انسانیت پر رکھی ہے۔ انسانیت کو شرف حاصل ہی اُس وقت ہوتا ہے جب وہ نبوّتِ محمّدیہ کے تابع ہو کر شجرِ طیّب کی طرح بڑھے اور پھولے پھلے اور جو اس کے تابع نہ ہو وہ مشرّف و مکرّم تو ایک طرف انسانیّت کے درجہ سے بھی گر جاتا ہے۔

ان شرّ الدّوابّ عند اللّٰہ الّذین کفروا فھم لا یؤمنون ﴿۵۵﴾

یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین حیوان وہ (انسان) ہیں جو کفر کرتے ہیں اور ایمان نہیں لاتے

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

ذیقعد ۱۳۵۶ھ ۴۳

اتحسب ان اکثرھم یسمعون او یعقلون- ان ھم الا کالانعام بل ھم اضل سبیلا

کیا تو خیال کرتا ہے کہ یہ لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں- یہ تو حیوانات کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ

پھر انسانیت میں صحیح اخوت بھی رشتۂ ایمان کی بنا پر ہی پیدا ہو سکتی ہے- (انما المومنون اخوۃ) یہ ہیں وہ حقایق جنہیں مولانا صاحب فلسفیانہ موشگافیاں اور شاعرانہ بلند خیالیاں قرار دیتے ہیں- اس کے متعلق ہم اس کے سوائے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ

تری نگاہ فرومایہ ہاتھ ہے کوتاہ
ترا گنہ کہ نخیلِ بلند کا ہے گناہ؟ اقبالؒ

اسلام میں لچک نہیں- حضرتِ علامہؒ نے اپنے بیان میں فرمایا تھا کہ

"مولانا حسین احمد صاحب سے بہتر اس بات کو کون جانتا ہے کہ اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا"

اس کے متعلق مولانا صاحب رقمطراز ہیں-

یہ خیال کہ اسلام بالکل غیر لچک دار مذہب ہے میری سمجھ سے باہر ہے میں جہاں تک اس کے قوانین کا تتبع کرتا ہوں وہ غیر مسلموں کے ساتھ ایک ملک میں رہ سکتا ہے- ان کے ساتھ صلح کر سکتا ہے- ان کے ساتھ مواعدے کر سکتا ہے- ان کے تمام معاملات خرید و فروخت- شرکت و اجارہ- ہبہ و عاریت قرض و امانت وغیرہ وغیرہ کر سکتا ہے- وہ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا- چلنا پھرنا- شادی و غمی میں شریک ہونا- کھانا- پینا وغیرہ وغیرہ کر سکتا ہے- - یہود و نصاریٰ کی لڑکیوں سے نکاح کر سکتا ہے" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۵۰ و ۵۱)

اس جواب کو پڑھئے اور پھر غور فرمائیے کہ ہم نے جو عرض کیا ہے کہ مولانا صاحب شاید سمجھے ہی نہیں کہ حضرت علامہؒ نے کیا لکھا تھا- وہ حرف حرف صحیح ہے یا نہیں- حضرت علامہؒ نے لکھا تھا کہ اسلام ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اس کا مطلب صاف ہے کہ وہ اصول جس پر اسلام نوع انسانی کی تشکیل ایک نظامِ اجتماعی میں کرنا چاہتا ہے وہ قوانینِ فطرت کی طرح اٹل اور بے لچک ہیں وہ اصول جیسا کہ ابھی ابھی لکھا جا چکا ہے یہ ہے کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے تمام ایسے نظام جو انسانوں نے وضع کیے ہیں- خلافِ فطرت اور خلافِ منشاءِ ایزدی ہیں- یعنی رنگ- نسل- وطن- زبان وغیرہ کے

ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ

۴۴

اشتراک سے نظامِ اجتماعی قائم کرنا۔ اس کے خلاف وہ ان تمام حدود و ثغور سے بلند ہو کر وحدتِ قومی کے لئے وحدتِ ایمان کو بنیاد قرار دیتا ہے۔ یہ وہ اصول ہے جس میں کوئی لچک نہیں۔ فرمایئے اس چیز کو اس سے کیا تعلق کہ مسلم و غیر مسلم کا اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا۔ شادی۔ غمی میں شریک ہونا جائز ہے۔ حیرت ہے کہ مولانا صاحب جیسی ہستی کہ جن کے علم و فضل کا شہرہ بامِ ثریا تک پہنچا ہوا ہے۔ اتنا بھی نہیں سمجھ سکے کہ ہیئتِ اجتماعیہ کے اصول اور اکٹھے چلنے پھرنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ باہمی اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے سے مسلم و غیر مسلم کی ایک متحدہ قومیت نہیں بن جائے گی۔ یہ اٹھنا بیٹھنا۔ کھانا پینا۔ عام معاشرتی آداب کی باتیں ہیں جن میں اسلام واقعی اپنے اندر لچک رکھتا ہے۔ لیکن وہ بھی صرف اس وقت تک کہ یہ چیزیں اسلام کے کسی اصول سے نہ ٹکرائیں۔ مثلاً آپ فرماتے ہیں کہ مسلمان غیر مسلمان کا کھانا کھا سکتا ہے۔ یہ لچک ہوئی۔ لیکن اگر وہ کھانا غیر خدا کے نام پر منسوب ہو تو خواہ ظاہری شکل میں کتنا ہی پاکیزہ اور صاف ستھرا کیوں نہ ہو اسے ایک مسلمان نہیں کھا سکے گا۔ یہ وہ اصول آ گیا جہاں لچک ختم ہو گئی۔ اسی طرح مثلاً مسلمان۔ یہود و نصاریٰ کی لڑکیوں سے شادی کر سکتا ہے۔ لیکن ایک مشرکہ سے شادی نہیں کر سکتا۔ یہاں پہنچ کر وہ لچک ختم ہو گئی۔ اسی طرح مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کر سکتا ہے لین دین کر سکتا ہے۔ معاہدے کر سکتا ہے لیکن ان کے ساتھ مل کر ایک متحدہ قوم نہیں بن سکتا۔ یہاں پہنچ کر اسلام کی لچک ختم ہو جائے گی۔ یہ ہے مطلب حضرت علامہؒ کے اِس فقرہ کا کہ اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا۔

مذہب کا صحیح مفہوم حضرت علامہؒ نے فرمایا تھا کہ یہ نظریۂ قومیت جسے مولانا صاحب نے پیش کیا ہے۔ یورپ کا وضع کردہ ہے اور اس کے جہنمی نتائج آج دنیا کے سامنے ہیں۔

اس کے جواب میں مولانا صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

ممکن ہے کہ یورپ نے وطنیت اور قومیت کو کسی خاص مفہوم اور کسی خاص ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے استعمال کیا ہو اور اس پر وہ گامزن ہو رہے ہوں۔ اور ان مقاصد اور

ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ

۴۵

نصب العین کو اپنے اپنے مذہبی اداروں کے مخالف پاکر مذہب کو سلام کر بیٹھے ہوں
یا مذہب کو صرف پرائیویٹ زندگی شمار کرنے لگے ہوں۔ مگر کیا یہ ضروری ہے کہ ہمارا اقدام
متحدہ قومیت یا وطنیت کی طرف صرف انہی کیفیات اور لوازم کے ساتھ ہو جو کہ ان کے
یہاں ملحوظ ہو رہے ہیں۔" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۵۹)

مذہب کے متعلق ہم گزشتہ صفحات میں لکھ چکے ہیں کہ قومیت پرست حضرات کے نزدیک مذہب صرف ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اور اسی قسم کے مذہب کی آزادی کی وہ اجازت دے سکتے ہیں۔ وہ مذہب جو مسلمانوں کے تمام شعبہ ہائے زندگی کو محیط ہو۔ جو ان کے معاشی۔ معاشرتی اقتصادی۔ عمرانی۔ تمدنی سیاسی۔ دینی۔ دنیاوی تمام امور پر حاوی ہو۔ اور جسدِ انسانیت میں بمنزلہ روح کے کام کو رہا ہو۔ قومیت پرست حضرات کے نزدیک ترقی کا دشمن۔ اور متحدہ قومیت کے راستہ میں ایک خطرناک چٹان ہے۔ اس لئے پنڈت جواہر لعل نہرو دانت پیستے ہیں کہ اس قسم کا مذہب اور ایسے مذہب کے مدعی ابھی تک زندہ کیوں ہیں! اس کے باوجود مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ ہمارا اقدام متحدہ قومیت یا وطنیت کی طرف ان کیفیات کے ساتھ نہیں اُٹھ رہا جو مذہب کو ایک پرائیویٹ عقیدت کی حیثیت دیتی ہیں یہاں پہنچکر تو ہمیں شبہ ہونے لگ گیا ہے کہ جہاں مولانا صاحب کی نگاہ قرآنی سیاست پر نہیں ہے وہاں وہ ملکی سیاست سے بھی بہت کم واقف ہیں۔ ورنہ یہ حقیقت کس سے پوشیدہ ہے کہ متحدہ قومیت بنتی ہی اُس وقت ہے جب یا تو مذہب ایک ہو۔ یا مذہب کو محض ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت دیدی جائے۔ اس کے سوائے متحدہ قومیت کی تشکیل ہو ہی نہیں سکتی۔ اصل یہ ہے کہ مولانا صاحب اور اُن کے ہم مشرب حضرات کا مذہب کے متعلق تصور ہی جداگانہ ہے۔ اور یہ وہ تصور ہے جسے ایک عرصہ سے مسلمان کے سامنے صحیح اسلام بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ اور جب کبھی وہ مذہب یا اسلام کا لفظ زبان پر لاتا ہے تو اس سے اس کا مفہوم یہی تصور رہوتا ہے۔ یہ تصور کیا ہے؟ اسلام کے پانچ ارکان۔ کلمہ۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج۔ اگر کوئی اذان دینے میں مزاحمت نہ کرے نماز پڑھنے کی کسی جگہ ممانعت ہو روزے پر بلا روک ٹوک رکھے جا سکیں زکوٰۃ کا روپیہ اپنی اپنی مرضی کے مطابق بکھیرا جا سکے اور حج کرنے کیلئے پاسپورٹ پر کوئی پابندی نہ ہو تو یہ حضرات اسے عین مذہبی آزادی

قرار دیتے ہیں۔ ان حضرات کے نزدیک مذہب اسی چار دیواری کے اندر گھرا ہوا ہے۔ ان ارکان کی تکمیل سے اسلام کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اس سے زیادہ اسلام کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرتا۔ زیادہ سے زیادہ کھانے پینے یا شادی بیاہ کے معاملات میں کچھ پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اسی لئے یہ حضرات اس دلیل کو نہایت بلند آہنگی سے پیش کرتے ہیں کہ دیکھو کانگریس نے کراچی کے ریزولیوشن میں مذہبی آزادی کے اصول کو تسلیم کر لیا ہے۔ وہ اقلیتوں کے مذہب کی حفاظت کی ضمانت دیتی ہے بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتے ہیں تو ارشاد فرماتے ہیں کہ

"کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہب اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ لگے" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۴۱)

حتیٰ کہ پنڈت جواہر لعل نہرو جیسے خدا کے منکر کے متعلق فرماتے ہیں کہ

"جواہر لعل ہندو ہے اس نے کبھی نہیں کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اس کے باوجود وہ مسلمانوں کا تحفظ چاہتا ہے" (تقریر مولانا حسین احمد صاحب مطبوعہ زمزم ۷ جولائی ۱۹۳۸ء)[1]

ان امور سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک مذہب کا وہی مفہوم ہے جو ہم نے اوپر درج کیا ہے۔ یعنی "پانچ ارکان اسلام اور ان سے متعلقہ مسائل"۔ اس سے "آگے" دنیا داری کی حدود شروع ہو جاتی ہیں۔ اور ان امور کے لئے جس قسم کا نظام ملک میں قائم ہو جائے۔ وہ ان کے نزدیک "از روئے شریعت" جائز اور درست ہو سکتا ہے۔ اسی لئے مولانا صاحب کا فتویٰ ہے (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) کہ ایسی جمہوریت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی شامل ہوں، عین اسلام کے مطابق ہے۔ یہ فتویٰ جس سے قصرِ اسلامی کی ایک ایک اینٹ گر جاتی ہے، محض اس بنا پر اس جرأت و بیباکی سے دے دیا گیا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک مذہب کا دائرہ صرف پانچ ارکانِ اسلامی تک ہی محدود ہے۔ جب ان میں عدم مداخلت کی ضمانت مل جائے تو امورِ دنیاوی کے لئے جمہوریت سے بڑھ کر اور کونسا نظام بہتر ہو سکتا ہے! لیکن انہیں کس طرح سمجھایا جائے

[1] حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ لا یالونکم خبالا۔ غیر مسلم تمہاری خرابی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے ودوا ما عنتم جس بات سے تمہیں ضرر پہنچے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔

ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ ۴۷

کہ اس قسم کی جمہوریت جس میں اکثریت غیر مسلموں کی ہو مسلمانوں کے لئے غلامی کی بدترین لعنت ہے۔ مسلمانوں کے باہمی امور کے فیصلوں کے لئے قرآن کریم نے ایک الگ اور جداگانہ نظام قائم کیا ہے جس کی بنیادی اینٹ یہ ہے۔ کہ فلاوربک لا یومنون حتیٰ یحکموک فیما شجر بینھم (تیرے رب کی قسم یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے اختلافی معاملات میں تمہیں اپنا حکم نہ بنائیں) اور نبی اکرمؐ سے ارشاد تھا کہ وشاورھم فی الامر (اور معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو) اسی کو دوسری جگہ ان الفاظ میں دھرایا ہے کہ وامرھم شوریٰ بینھم (ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں گے) جس سے ظاہر ہے کہ اس مجلس مشاورت میں کسی غیر مسلم کا دخل نہ ہوگا۔ اور اس کا صدر خود مسلمانوں کا امیر ملت۔ مرکزِ دین ہوگا چہ جائیکہ وہ نظامِ جمہوریت ایسا ہو جس میں اکثریت غیر مسلموں کی ہو۔ ایسی اکثریت کے فیصلوں کے متعلق تو قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ۔

"کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا فیصلے کرنے والا (حکم) تسلیم کرلوں۔ حالانکہ اس نے تمہاری طرف مفصل کتاب نازل کردی ہے..... اور یوں تیرے رب کے کلمات صدق وعدل کے ساتھ مکمل ہو گئے ہیں۔ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور وہ سمیع وعلیم ہے"۔

اور اگر تو زمین پر بسنے والوں کی اکثریت کی اطاعت کرے تو وہ تجھے اللہ کے راستے سے گمراہ کر دیں۔ وہ تو صرف ظن (و قیاس) کی اتباع کرتے ہیں اور ہی تکے دوڑاتے ہیں)"۔ ۶:۱۱۴-۱۱۶

ان آیات مقدسہ کے معانی کی تفصیل طویل ہے لیکن ارباب نظر سے ان کا مفہوم پوشیدہ نہیں ہوگا۔ اسلام کا نظام اجتماعی یہ ہے کہ تمام معاملات کے فیصلوں کے لئے کتاب اللہ بہ حیثیت اصولِ قانون قیامت تک کے لئے موجود ہے۔ اس قانون کو نافذ کرنے کے لئے امامت کبریٰ کے مرکزِ اوّلین۔ جناب نبی اکرمؐ مبعوث ہوئے۔ ان کے بعد منصب امامت حضورؐ کے جانشینوںؓ کی طرف منتقل ہو گیا۔ لہٰذا آج مسلمانوں کے لئے اسلامی نظامِ زندگی یہ ہوگا کہ ان کی اپنی جماعت ہو۔ اس جماعت کے

ذوالقعدہ ۱۳۵۷ھ

۴۸

منتخب افراد پر مشتمل ایک مجلس مشاورت ہو اور ان میں اتقیٰ سب سے زیادہ متقی ان کا امیر ہو۔ اور مسلمانوں کے تمام امور اس نظام کے ماتحت سر انجام پائیں۔ ایسے نظام کے بغیر محض نماز۔ روزہ سے جس قسم کا اسلام باقی رہتا ہے۔ اس کے متعلق ہم سے نہیں۔ بلکہ ایک قومیت پرست عالمِ دین کی زبانی سنئے۔ مولانا آزاد حیاتِ اجتماعیہ اسلامیہ کی بحث کے دوران میں لکھتے ہیں (لیکن قومیت پرستی کے زمانہ سے پیشتر)

"احادیثِ صحیحہ سے اس کی مزید توضیح ہوتی ہے۔ اس بارہ میں اس کثرت کے ساتھ حدیثیں موجود ہیں اور عہدِ صحابہؓ سے لیکر عہدِ تدوینِ کتب تک مختلف طبقات رواۃ حفاظ میں اس قدر ان کی شہرت رہ چکی ہے کہ اسلام کے عقیدۂ توحید رسالت کے بعد شاید ہی کوئی چیز اس درجہ تواتر و یقین تک نہیں پہنچی ہو گی۔ سب سے پہلے میں مسند امام احمد وغیرہ کی ایک روایت نقل کروں گا جس میں بالترتیب اسلام کا نظامِ عمل بیان کیا گیا ہے۔

قال صلعم۔ انی امرکم بخمس اللہ امرنی بھن۔ الجماعۃ۔ والسمع والطاعۃ والھجرۃ والجھاد فی سبیل اللہ۔ انہ من خرج من الجماعۃ قید شبر فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ الا ان یراجع۔ ومن دعا بدعوی جاھلیۃ۔ فھو من جھنم۔ قالو یا رسول اللہ وان صام وان صلی۔ قال وان صلی و صام وزعم انہ مسلم۔

یعنی فرمایا۔ تم کو پانچ باتوں کے لئے حکم دیتا ہوں جن کا حکم اللہ نے مجھے دیا ہے۔ جماعت۔ سمع طاعت۔ ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد۔ یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بے قیدی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ (حضور)

۹۴ ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ

کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا خواہ وہ روزہ رکھتا ہو۔ نماز پڑھتا ہو۔ فرمایا ہاں۔ اگرچہ نماز پڑھتا ہو۔ روزہ رکھتا ہو۔ اور بزعم خویش اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو۔

پہلی چیز جماعت ہے۔ یعنی تمام امت کو ایک خلیفہ و امام پر جمع ہوکر اور اپنے مرکزِ قومی سے جوڑ کر رہنا چاہیئے۔ الگ الگ نہیں رہنا چاہیئے۔ آگے چلکر شہرت کے ساتھ ایسی حدیثیں ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ جماعت سے الگ . . . . ہوکر رہنے کو یا ایسی منتشر زندگی کو جو ایک منظم سمٹی ہوئی جماعت کی شکل نہ رکھتی ہو اور کسی امیر کے تابع نہ ہو۔ اسلام نے غیر اسلامی اور ابلیسی راہ قرار دیا ہے۔ انفرادی زندگی کو وہ زندگی ہی نہیں مانتا۔ اسلامی زندگی جماعت ہے "!

(الخلافہ والجزیرۃ العرب۔ مولانا ابوالکلام آزاد)

اور اسی بنا پر مولانا آزاد نے کبھی فرمایا تھا کہ

"مسلمانوں کی قومیت صادقہ کا مدار صرف شریعت ہے" (خطبۂ صدارت لاہور)

ان امور سے آپ اندازہ فرمایئے کہ کانگریس جس قسم کی مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے وہ مذہب ایک پرائیویٹ عقیدہ میں سمٹ کر رہ جاتا ہے یا اس سے کچھ زیادہ بھی رہتا ہے؟ اس سے آگے بڑھنے والا مذہب تو مسلمانوں کے اپنے الگ نظام اور اپنی الگ جماعت کے قیام کا مقتضی ہو جاتا ہے اور یہ وہ باتیں ہیں جو انتہائی "فرقہ پرستی" پر دلالت کرتی ہیں۔ لہٰذا "قومیت پرستی" انہیں کس طرح اپنے دستور العمل میں جگہ دے سکتی ہے؟ ہم مولانا صاحب کو کس طرح سمجھائیں کہ اسلام تو ایمان اور اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض یعنی مسلمانوں کی اپنی حکومت و سلطنت قرار دیتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ

اللہ نے تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور وہ اعمال صالحہ کرتے ہیں۔ یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انہیں اس دنیا کی حکومت عطا فرمائے گا۔

ذرا کانگریس سے کہیئے کہ اس قسم کے مذہب کی آزادی کی ضمانت دیدے جو مسلمانوں کی اپنی حکومت کے قیام کی طرف منجر ہو۔ پھر دیکھیئے کہ کانگریس کی طرف سے کیا جواب ملتا ہے۔ اور جو مذہب مسلمانوں کو انکی اپنی حکومت کے

ذیقعدہ ۵۷ھ ۵۰

قیام کی طرف نہیں لے جاتا، وہ ایک پرائیویٹ عقیدہ سے آگے نہیں بڑھتا۔ اس قسم کے مذہب کی آج بھی آزادی حاصل ہے، اور اسی قسم کے مذہب کی آزادی کی ضمانت کانگریس کے ریزولیوشن دیتے ہیں جس پر مولانا صاحب اور اُن کے ہم مسلک حضرات یوں شاداں و فرحاں پھرتے ہیں۔ سچ فرمایا تھا حضرتِ علامہ نے کہ

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت — ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

غیر اسلامی نظام

حضرت علامہ نے فرمایا کہ "ہر وہ دستور العمل جو غیر اسلامی ہو نامعقول و مردود ہے"، اسکے متعلق مولانا صاحب فرماتے ہیں :۔

> اُسی طرح یہ کہنا کہ نظامِ اسلامی اور اس کا کاربند کسی دوسرے نظام کے ساتھ شریک ہی نہیں ہو سکتا، غیر قابلِ قبول امر ہے۔ قوانینِ اسلامیہ اور احکامِ شرعیہ نے اگرچہ بہت سے اُمور میں کوئی نہ کوئی تجویز قائم کر دی ہے۔ مگر بے شمار اُمور کو زیرِ اباحت و اجازت رکھا ہے جن میں ہم کو اختیار ہے کہ اپنی صوابدید کے مطابق عمل کریں۔ ان ہی اُمور میں بادشاہتیں اور انکے حکام اور انجمنیں وغیرہ اپنے اپنے آراء و اعمال کو کام میں لاتی رہتی ہیں ۔"
>
> (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۶۳)

یہاں پھر وہی بنیادی غلط فہمی اُلجھاؤ کا باعث بن رہی ہے۔ حضرت! دستور العمل اور نظام سے مراد وہ اصول حیات ہیں جو اسلام نے اپنے متبعین کے لئے مرتب فرمائے ہیں۔ اور جو قوانینِ فطرت کی طرح اٹل ہیں۔ لاتبدیل لکلمات اللہ ۔ اور آپ جن چیزوں کی اجازت و اباحت کا ذکر فرما رہے ہیں وہ ان اصول کی فروعات و جزئیات ہیں۔ مسلمانوں کی الگ اجتماعی زندگی کا قیام و وجود اصولِ اسلام میں سے ہے جس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ البتہ قومی اور جماعتی حیثیت سے دوسری قوموں کے ساتھ اشتراکِ عمل اور اس کا طریق کار وغیرہ چیزیں ہیں جنہیں اسلامی جماعت اپنے اپنے زمانہ کے مخصوص حالات کے ماتحت خود مرتب کر سکتی ہے۔ فرع اور اصول کا فرق ایسی بین چیز ہے جس کے متعلق کچھ زیادہ لکھنا بے سود معلوم ہوتا ہے۔

ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ ۵۱

غیروں کا تشبہ

مولانا صاحب نے اپنے رسالہ میں ایک اور چیز کا بھی ذکر کیا ہے جس کے لئے وہ اپنی عادت سے مجبور نظر آتے ہیں۔ اسلئے کہ وہ عام طور پر اپنی تقریروں میں اس قسم کی چیزیں بیان فرماتے رہتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"بڑے بڑے دعویدار اسلامیت و مذہبیت ایسے ہیں جن کی صورت اور لباس میں اور انگریز کی صورت اور لباس میں فرق معلوم نہیں ہوتا۔" (ایضاً صفحہ ۱۶)

ہر چند یہ چیز ہماری مقولی بحث کے دائرہ سے خارج ہے اور یوں بھی ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ

درویش صفت باش و کلاہ تتری دار

لیکن چونکہ مولانا صاحب اس چیز پر خاص زور دیتے رہتے ہیں۔ اس لئے ہم ان سے اتنا دریافت کرنے کی جراُت کرتے ہیں کہ مغرب زدہ مسلمانوں کی اس "اتباعِ فرنگ" پر تو وہ آئے دن اعتراضات کرتے رہتے ہیں لیکن ان کی نگاہ اُن مسلمان مہاشوں کی طرف کیوں نہیں اُٹھتی جو نہ صرف لباس میں ہی بلکہ آدابِ معاشرت میں بھی خالص "شری یُت" بنتے جارہے ہیں۔ ان کو بھی تو کبھی ٹوکا ہوتا کہ یہ غیروں کا تشبہ اسلام میں جائز نہیں۔ ایک قومیت پرست اسلامی درسگاہ کے ایک مسلمان پروفیسر نے ایک مرتبہ بڑے فخر سے کہا کہ وہ جب پنجاب کے دورے کے لئے نکلے ہیں تو ہر جگہ "پنڈت جی نمسکار" کہہ کر ان کا سواگت کیا جاتا تھا! ایسے حضرات کے اسلام میں مولانا صاحب کو کبھی کوئی نقص نظر نہیں آتا لیکن اُن سے اختلافِ رائے رکھنے والوں کی ہر چیز سے کفر ٹپکتا دکھائی دیتا ہے! اسے اگر "رنگین چشمہ" کی برکات نہ کہیئے تو اور کیا کہیئے:

میری نگاہِ شوق پر اس درجہ سختیاں اپنی نگاہِ شوخ کی کچھ بھی سزا نہیں

شَهَادَةٌ مِّنْ اَهْلِهَا

گذشتہ صفحات میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کے پیشِ نظر آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ ایسی دو قومیں جن کا مذہب، تمدن، تہذیب، کلچر مختلف ہوں، جن کے نظریاتِ زندگی الگ الگ ہوں، نصب العینِ حیات جداگانہ ہوں۔ وہ قومیں قرآنِ کریم کی رُو سے، باہدگر مل کر، ایک متحدہ قومیت کے رشتہ میں منسلک نہیں ہوسکتیں۔ یہ ایک ایسی حقیقتِ ثابتہ ہے کہ جس کا اعتراف اب غیر مسلموں تک کو کرنا پڑا ہے۔ مولانا

۵۲ ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ

حسین احمد صاحب تو کفر و اسلام کے امتزاج سے متحدہ قومیت کی تشکیل کا وعظ فرما رہے ہیں۔ اور ان کے ابرِ یعنے صدر کانگریس مسٹر بوس کا یہ ارشاد ہے کہ :-

"کلچر۔ زبان۔ تہذیب۔ غرضیکہ ہر شے میں۔ برطانیہ اور ہندوستان ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس لئے سوائے خوشگواری تعلقات کے کوئی اور چیز ان ہر دو ممالک کو آپس میں نہیں ملا سکتی۔ اور ہندوستان کی طرف سے اس قسم کے تعلقات اسی صورت میں پیدا ہو سکیں گے جب یہ ملک کامل آزادی حاصل کر لیگا۔" (اسٹیٹس مین۔ مورخہ ۲ ہ ۱۱)

دیکھئے یہ ہے وہ جادو جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ کانگریسی حضرات خود اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایسی مختلف قومیں جن میں تہذیب۔ تمدن وغیرہ کا اشتراک نہیں ہوتا۔ ایک متحدہ قومیت میں تحلیل نہیں ہو سکتیں۔ البتہ ان میں اچھے تعلقات پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ یعنے باہمی وفاق اور معاہدہ کی رو سے۔ اور وہ بھی ایسی صورت میں کہ دونوں قومیں اپنے اپنے معاملات میں بالکل آزاد ہوں۔ لیکن یہی اصول جب مسلمان پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ ہندو اور مسلمان تہذیب۔ تمدن۔ مذہب وغیرہ میں ایکدوسرے سے مختلف ہیں۔ اس لئے یہ دونوں ملکر متحدہ قومیت میں تبدیل نہیں ہو سکتے۔ البتہ ان میں باہمی اتحاد پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اور اسکی یہی شکل ہے کہ مسلمان اور ہندو اپنے اپنے معاملات میں دو جُداگانہ اور آزاد قومیں ہوں اور انکے درمیان اشتراکِ عمل کا ذریعہ معاہدہ اور وفاق ہو۔ تو کانگریسی ہندو حضرات اسے اصولِ حریت نوازی کے خلاف بتاتے ہیں۔ اور قومیت پرست مولوی صاحبان اسے "سحرِ برطانیہ" کا پیدا کردہ کفر قرار دیتے ہیں۔ یہ ہے قومیت پرست حضرات کا اصولِ سیاست اور یہ ہے اُن کا تفقہ فی الدین۔ یعنے یہ ہمارے آئمہ دین مسلمانوں کے ساتھ ملکر ایک اجتماعی زندگی بسر کرنے کو خلاف مذہب بتاتے ہیں اور غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک متحدہ قومیت کی تعمیر انکے نزدیک عین قرآن و حدیث کے مطابق ہے انکی فقہ میں میدانِ عرفات میں جمع ہونے والے مسلمان سب فرقہ پرست ہیں کہ وہ اپنی الگ۔ خالصۃً اسلامی جماعت کے وجود کا پتہ دیتے ہیں۔ اور ہری پور میں اکٹھے ہونے والے مسلمان اسلام کے صحیح ترجمان ہیں کہ وہ متحدہ قومیت کے علمبردار ہیں۔ انکے نزدیک ہندو اور مسلمان تو بھائی بھائی بن سکتے ہیں لیکن مسلمان اور مسلمان آپس میں مواخات کا رشتہ پیدا نہیں کر سکتے۔ یا للعجب۔

برہمن گفت برخیز از در غیر ۔۔۔ زیارانِ وطن ناید بجز خیر

ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ

۵۳

بیک مسجد دو مُلا می نہ گنجد زافسونِ بتاں گنجد بہ یک دیر (اقبال)

وطنیت کی جہنّم

حضرت علامہ نے قرآنِ کریم کی روشنی میں بتایا تھا کہ وہ قومیت جس کی بنیاد وطنیت پر رکھی جاتی ہے نوعِ انسانی کے لئے کس قدر جہنّمی زندگی پیدا کرنے کی موجب ہوتی ہے اور وطنیت وہ جذبہ ہے جس کے بغیر بقول مولانا صاحب۔ ہندوستان میں متحدہ قومیت کی تشکیل ہو ہی نہیں سکتی۔ فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لئے کوئی رشتۂ اتحاد بجز متحدہ قومیت نہیں جس کی اساس محض وطنیت ہی ہو سکتی ہے اسکے علاوہ اور کوئی چیز نہیں" (انصاری، اپیل)

حیرت ہے کہ ایک طرف ہمارے علمائے کرام ہیں کہ جنکے گھر میں سیاسی اور تمدنی زندگی کے تمام مسائل کے لئے درخشندہ اصول موجود ہیں۔ لیکن وہ ان اصولوں کے خلاف دوسروں کے نظریات زندگی کو نصب العین حیات بنا رہے ہیں اور دوسری طرف غیر مسلم ہیں کہ وہ چاروں طرف سے ٹھوکریں کھا کر قرآنِ کریم کے انہی نظریات کو صحیح اصولِ زندگی قرار دے رہے ہیں۔ اسی "وطنیت" کے متعلق پچھلے دنوں مسٹر کے ہنٹر اجن نے بمبئی یونیورسٹی کے کانووکیشن ایڈریس کے دوران میں کہا تھا:۔

"عصرِ حاضر کا ایک مہیب ترین خطرہ جس سے بچنے کے لئے یونیورسٹی کے ہر فرد کو کامل جدوجہد کرنی چاہیئے یہ ہے کہ قومیت کا وہ تنگ نظریہ جس نے یورپ کو آج یوں جہنّم زار بنا رکھا ہے۔ نوجوانوں کے دلوں میں سرایت نہ کر جائے۔ یہ وہ نظریہ ہے جس کی رُو سے غلط اور صحیح، جائز اور ناجائز جھوٹ اور سچ کے امتیازات "سودیشی" اور "بدیشی" کے امتیازات کے تابع ہو جاتے ہیں کبھی اس چیز کو ایامِ جاہلیت کی یادگار سمجھا جاتا تھا کہ ہر وہ شے جو اجنبی اور بدیشی ہو اس سے نفرت کی جائے لیکن آج یہی چیز "قومیت" کا طرۂ امتیاز ہے جس میں ۹/۱۰ حصّہ یہ اصول ہے کہ وہ لوگ جو تمہارے ملک سے باہر رہتے ہوں۔ انکی طرف سے بدگمانی اور نفرت کے جذبات دل میں موجزن رہیں۔ وہ قلب جو وطنیت کے ان جذبات سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اخلاق کے تمام معیاروں کی طرف سے بے حس ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ آج حریت نوازی نام ہی اس چیز کا رہ گیا ہے کہ انسان اس اصول

کو کہہ رہا ہو کہ یہ وہ نظریہ ہے کہ :-

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے

اور جسے حضورِ رسالتمآب کے خاکِ قدم کا ہر ذرّہ ابھر ابھر کر دکھا رہا ہو کہ یہ وہ اصول سیاست ہے کہ

قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

وہ کس طرح آپ کی ہمنوائی میں شریک ہو جائے اسی مجبوری کی بنا پر تو اس نے کہا تھا کہ :-

غلامم جز رضائے تو نجویم جز آں راہے کہ فرمودی نپویم

ولیکن گر بہ ایں ناداں گوئی خرے را اسپِ تازی گو۔ نگویم (اقبال)

آخری گذارش

مولانا صاحب نے اپنے رسالہ کی "آخری گذارش" میں فرمایا ہے

"ہم اس عرض کے بعد اپنی تحریر کو اس فلسفیانہ تقریر اور شاعرانہ تخیل کے جوابات سے طویل اور دراز کرنا مناسب نہیں سمجھتے جو ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنے فلاسفری دماغ سے تراش کر کے ذکر فرمائی ہے" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ)

اور اس رسالہ کے دیباچہ نگار صاحب نے اس کے مقصد کا ان گہربار الفاظ میں تعارف کرایا ہے۔

"حضرت شیخ مدظلہ نے اس بحث کے ذیل میں جن مذہبی اور سیاسی جواہرات کے منتشر ذخائر کو مجتمع فرمادیا ہے وہ نہ صرف متلاشیانِ حق کے لئے سرمایہ طمانیتِ قلب ہی ہیں بلکہ ان سے یقیناً ہماری حیاتِ سیاسی کے ایک شاندار باب کی تعمیر ہوگی اور موجودہ و آئندہ نسلیں اسلامی نقطۂ نظر سے قومیت متحدہ کے مفہوم کو سمجھنے میں کسی سفسطہ کا شکار نہ ہوسکیں گی۔

کاش علامہ اقبال مرحوم آج ہم میں موجود ہوتے تو جو شبہات اس مسئلہ خاص کے بارے میں انہیں باقی رہ گئے تھے وہ بھی دور ہو جاتے" (ایضاً صفحہ)

اس مطلع اور مقطع کے متعلق ہم کچھ نہیں لکھنا چاہتے۔ کیونکہ یہ اس وقت درج کئے جارہے ہیں جب حضرت علامہ کے استدلالات، مولانا صاحب کے اعتراضات اور انکے جوابات قارئین کے سامنے آچکے ہیں۔ وہ از خود فیصلہ کرلیں گے کہ قرآن کریم کی رو سے کونسا نظریہ ملتِ اسلامیہ کی زندگی کا ضامن ہے اور کونسا انکی خودکشی کے مترادف

ذیقعدہ سنہ ۱۳۵۷ھ

۵۴

پر آنکھیں بند کرکے کاربند رہے کہ "میرا ملک غلط یا صحیح"۔ (سب پر مقدم ہے)۔" (اسٹیٹس مین ۳ ۱۱/۳۸)

یہ ہے وطنیت کا وہ ملعون جذبہ جس کی مخالفت اسلام نے اس شدّ ومد سے کی ہے اور جس کے متعلق حضرت علامہ نے آج سے آٹھ سال پیشتر اپنے مشہور خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا۔

> "سیاسیات کی جڑ حقیقتاً انسان کی روحانی زندگی میں ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اسلام ذاتی آراء کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک سوسائٹی ہے۔ یا اگر آپ پسند فرمائیں تو اسے ملکی اور مذہبی نظام کہہ سکتے ہیں۔ میرے سیاسیات میں دلچسپی لینے کا اصلی سبب یہ ہے کہ کہیں دورِ حاضرہ کے سیاسی اصول جو دہریت پر مبنی ہیں اسلام کے بنیادی اصولوں کو متاثر نہ کردیں۔ میں یورپ کے پیش کردہ نیشنلزم (وطنیت) کا سخت مخالف ہوں (اس نیشنلزم کی تعلیم ہے کہ قوم کی بنیاد مذہب پر نہیں بلکہ وطن پر ہے) کیونکہ مجھے اس میں دہریت اور الحاد کے جراثیم نظر آرہے ہیں۔ اور یہ جراثیم انسانیت کے لئے سخت مضر ہیں"۔

لیکن چشمِ فلک نے یہ نظارہ بھی دیکھنا تھا کہ اسی نظریہ وطنیت کو ایک دن ہندوستان کے سب سے اعلیٰ دار العلوم کے سب سے بڑے کلید بردار کے حجلۂ دماغ سے کتاب وسنت کا حسین ودلکش نقاب اوڑھ کر مسلمانوں کے لئے فریبِ نگاہ بننا تھا۔ آج اسلام کی مظلومیت کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے۔ اور مسلمانوں کے لئے صفِ ماتم بچھانے کا اس سے زیادہ اندوہناک مقام اور کونسا ہوسکتا ہے۔ حیرت ہے کہ اس پر آسمان کیوں نہ ٹوٹ پڑا۔ زمین کیوں نہ شق ہوگئی۔

اے محمدؐ گر قیامت را برآری سر زخاک　　　سر برآر و ایں قیامت درمیانِ خلق بیں

اور پھر ستم بالائے ستم کہ یہ سب کچھ سہواً نہیں ہوتا بلکہ غلطی پر متنبہ کرنے والے مردِ حق شناس کو ساحرِ برطانیہ کی طلسم وافسوں کا شکار بتایا جاتا ہے۔ اور دینِ حجازی کے اس محرمِ اسرار کو "افرنگ زدگی" کا طعنہ دے کر "برطانیہ کی عظیم الشان خدمات انجام دینے والا" قرار دیا جارہا ہے اور یہ سب اس جرم کی بنا پر کہ وہ اس دورِ تجدد پسندی میں اس رسمِ کہن کی یاد کیوں تازہ کررہا ہے کہ جس کی رُو سے مکہ کا بوجہل گلے نہیں لگایا جاسکتا۔ لیکن فارس کا سلمانؓ "اہل بیت" میں سے ہوسکتا ہے۔ لیکن اس بچارے کی مجبوری پر بھی تو نگاہ رکھئے کہ جسے قرآنِ کریم کا ہر حرف پکار پکار

مسز سروجنی نائیڈو نے بھی اپنی ایک تقریر میں قومیت کے متعلق قریب قریب یہی کچھ کہا ہے ملاحظہ ہو اسٹیٹس مین ۲۱ مئی

ذوالقعدہ ۱۳۵۷ھ ۸۹

وہ کونسی حیات انگیز جرس کارواں ہے جو بلالؓ کے نغمۂ عشق کو اپنے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہو اور وہ کونسی سکوت افزا بنسری کی لے ہے جو ناقوسِ برہمن کے شور میں گم ہو جانے میں ہی رازِ حیات پوشیدہ دیکھتی ہے۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ حضرت علامہ اگر آج ہم میں موجود ہوتے تو وہ مولانا صاحب کی اس تحقیقِ انیق کی داد کن الفاظ میں دیتے۔ البتہ جو کچھ ہم سمجھ سکے ہیں وہ تو اتنا ہی ہے کہ یا تو مولانا صاحب "متحدہ قومیت" اور "ہندو مسلم اتحاد" کے فرق کو ہی نہیں سمجھ سکے اور یا متحدہ قومیت کے متعلق اسلام کی تعلیم انکی نگاہوں سے یکسر اوجھل ہے اگر پہلی بات ہے تو ملتِ اسلامیہ کے لئے ماتم کا مقام ہے کہ یہ حضرات جو قوم کی کشتیٔ سیاست کے ناخدا ہونیکے مُدّعی ہیں، سیاستِ حاضرہ کی اس ابجد سے بھی ناواقف ہیں۔ اور اگر دوسری بات ہے تو پھر معاف فرمایئے یہ کہنے میں کیا مبالغہ ہے کہ ایسا "فقیہہ ملت"۔

چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

خلاصہ بحث

بحثِ قومیت کو اگر ہم چند مختصر الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو یوں کہا جائیگا کہ مولانا صاحب کے نزدیک ایک ملک کی جغرافیائی حدود کے اندر رہنے والے انسان عقائد و اعمال کے تمام اختلافات کے باوجود ایک قوم بن سکتے ہیں اور ہمارا دعوے یہ ہے کہ یہ نظریۂ قومیت غیر اسلامی ہے۔ اسلام کے نزدیک صرف وہی افراد مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں جن میں وحدتِ ایمان و عمل ہو۔ مولانا صاحب نے اپنے دعوے کے اثبات میں یہ دلیل بیان فرمائی ہے کہ قومِ نوحؑ اور قومِ ابراہیمؑ میں تمام مومن و کافر شامل تھے اور ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ یہ حضرات انبیاء کرامؑ جس قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے، اس قوم میں ایسے افراد کو الگ کر کے جن میں وحدت عمل و ایمان ہوتی تھی ایک جُداگانہ نئی قومیت کی تشکیل فرماتے تھے۔ یہ قومیتِ اسلامی قومیت کے معیار کے مطابق تعمیر ہوتی تھی۔ ہم نے اپنے دعوے کے اثبات میں کتاب و سنّت کی نصوصِ صریحہ پیش کی ہیں لیکن جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں ہمیں چونکہ فریقِ مقابل سمجھا جائیگا۔ اس لئے اس باب میں کسی آخری فیصلہ تک پہنچنے کے لئے کسی حکم کی ضرورت محسوس ہوگی۔ آیئے ہم آپکے سامنے ایک ایسے حکم کا فیصلہ پیش کردیں جو مولانا صاحب کے

۵۷

ذیقعدہ ۱۳۵۲ھ

نہ صرف ہم مسلک ہیں بلکہ جن کی علمی قیادت اور دینی امامت کے خود مولانا صاحب بھی معترف ہیں۔ سنیئے کہ ان کا فیصلہ کیا ہے، اور پھر غور فرمایئے کہ یہ حضرات آج کس کے جادو سے مسحور ہو رہے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد البلاغ بابت ۱۲ و ۲۶ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"قرآنِ حکیم میں اگرچہ نبوت کے عام اشتراکِ جنسی کی بنا پر تمام انبیاء کرام کا نام ایک ساتھ اور ایک حیثیت سے آیا ہے لیکن بعض خصوصیاتِ نوعی کے لحاظ سے اس نے انبیاءؑ کے جو مختلف طبقات قائم کر دیئے ہیں ان میں دو سلسلے عام طور پر ممتاز نظر آتے ہیں۔

ایک سلسلہ ان انبیاء مؤسسین کا ہے جنہوں نے اپنی دعوت کے ذریعہ نئی قومیتوں کی بنیاد ڈالی اور جو قدیم عمارتوں کی اصلاح کے لئے نہیں بلکہ از سر نو ایک نئی قومی عمارت بنانے کے لئے آئے تھے۔ دوسرا سلسلہ انبیاء مجددین و محدثین (بالفتح) کا ہے جنہوں نے کسی نئی امت کی بنیاد نہیں ڈالی بلکہ کسی پیشتر کی قائم شدہ امت صالحہ کی مزید تکمیل و تبلیغ کی یا امتدادِ عہد کے نتائج مضلہ و استیلائے بدعات و محدثات سے اسے نجات دلا کر فرض تجدید و احیاء ادا کیا۔

انبیاء مؤسسین

پہلے سلسلہ کا وصف امتیازی یہ ہے کہ وہ تمام قدیم نظام۔ قدیم عقائد اور قدیم اخلاق و مقومات کو مٹا کر ایک جدید قومیت صالحہ کی بنیاد ڈالتا ہے اور اس کو آب و ہوا اور جغرافیانہ حدود طبعیہ کے اثر سے الگ کر کے صرف مذہبی آب و ہوا میں ترقی اور نشوونما دیتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں خدائے تعالیٰ نے اس صنف کے ایک نمایاں سلسلے اور اسکی ممتاز کڑیوں کا ذکر متعدد موقعوں پر ایک ساتھ کیا ہے۔

اَلَمْ یَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَقَوْمِ اِبْرٰهِیْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْیَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ (۹-۷۰)

کیا ان منکرینِ حق تک ان لوگوں کے نتائجِ اعمال کی خبر نہیں پہونچی جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ یعنے نوح۔ عاد۔ ثمود اور ابراہیم کی قوم نیز مدین کے رہنے والے اور وہ بدبخت جن کی بستیاں الٹ دی گئیں۔ (یعنے قوم لوط) ان سب کے پاس ہمارے پیغمبر دلائل اور نشانیاں

ذیقعدہ ۱۳۵۵ھ

۵۸

ے کرآئے تاکہ وہ ہدایت وسعادت حاصل کریں اور اپنی بداعمالیوں کے نتائجِ مہلکہ سے نجات پائیں - خدا ان لوگوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا تھا. پر افسوس اُنہوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا!

اس آیۂ کریمہ میں خدائے تعالےٰ نے اوّل حضرت نوحؑ کا ذکر کیا ہے جنہوں نے ایک نئی امتِ صالحہ کی بنیاد رکھی اور انکے بعد ان جماعتوں کا ذکر کیا ہے جن میں دعوتِ نوحی کے مجدّدین آتے رہے، پھر حضرت ابراہیمؑ کا نام لیا ہے جو حضرت نوح کے بعد دوسرے دورِ قومیت کے مصدر و بانی تھے اور پھر انکے بعد کی دعوت ہائے مجدد کی طرف اشارہ کیا ہے -

دعوتِ نوحی

انبیاء موسسین علیہم السلام میں سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوتِ موسسہ سامنے آتی ہے جو پہلے صنفِ انبیاء میں بلحاظ تقدم عہد کے ایک مخصوص امتیاز رکھتے ہیں. اُنہوں نے ایک جدید قوم پیدا کی اور اس کو مذہبی امتیازات ومقومات کی آب و ہوا میں پرورش کرنا چاہا - جن لوگوں نے مذہب کی اس حبل المتین کو مضبوط پکڑا عذابِ الٰہی سے نجات پائی - مگر جن لوگوں نے اس سررشتۂ حیات کو چھوڑ دیا ہلاک ہو گئے اور باوجود رحمی ونسلی تعلّقات کے خدا نے انکو نوح علیہ السلام سے بیگانہ قرار دیا انکی دعوت کی بنیاد نسل اور جغرافیہ نہ تھا وہ ایک نئی قوم پیدا کرنا چاہتے تھے. اسلئے خود انکی نسل جسمانی کے رشتہ کا بھی کوئی اثر باقی نہیں رہا تھا - ان کا گھرانا اب وہی قوم تھی جو حق وسعادت کے رشتہ میں منسلک ہو کر تیار ہوئی تھی اور سب سے پہلے وہ خود ہی اپنے پیدا کردہ خاندان ملت کے ایک رکن ہو گئے تھے اگرچہ وما اٰمن معہٗ الا قلیل -

ونادٰی نوحٌ ربّہٗ فقال ربِّ انّ ابنی من اھلی وانّ وعدک الحق وانت احکم الحاکمین قال یا نوحُ انّہٗ لیس من اھلک انّہٗ عملٌ غیر صالح فلا تسئلن ما لیس لک بہ علم (۱۱ - ۴۷)

اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ خدایا! تو نے وعدہ فرمایا تھا کہ تیرے خاندان کو عذابِ طوفان سے نجات دی جائیگی تو احکم الحاکمین ہے تیرا وعدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا. میرے لڑکے کو اس عذاب سے نجات دے کیونکہ میرے خاندان میں داخل ہے. خدا نے کہا اے نوح! تو جس کو اپنا اہل کہہ رہا ہے وہ تیرا اہل نہیں ہے. تیرا گھرانا تو وہ ہے عمل صالح

ذیقعدہ ۱۳۶۲ھ ۵۹

کا گھرانہ ہے (جس کی دعوت دیکر تو) ایک صالح قوم پیدا کرنی چاہتا ہے، جو اس گھرانے میں داخل ہوا وہ تیرا ہے اور جو اس سے نکل گیا وہ تیرا نہیں رہا۔ بلکہ ان کے گھرانے کا فرزند ہو گیا جنہوں نے عمل بد کو اس نے اختیار کیا۔ پس مجھ سے وہ سوال نہ کر جس کا تجھے علم نہیں دیا گیا۔
اے نوح! یہ نصیحت میں اسلئے کرتا ہوں تاکہ حقائق و اسرار الہٰی تجھ پر کھلیں اور تو ان لوگوں میں سے نہ ہو جائے جو علم حقیقت سے محروم ہیں۔

تشریح مزید

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کو حکم دیا تھا کہ عذاب طوفان سے بچنے کے لئے کشتی بناؤ جب کشتی بن چکی تو فرمایا

احمل فیھا من کل زوجین اثنین واھلک (۱۱-۴۲)

کشتی میں تمام ضروری حیوانات وانواع کا ایک ایک جوڑا رکھ لو نیز اپنے گھرانے کے آدمیوں کو بھی سوار کرالو۔

لیکن ساتھ ہی ان لوگوں کو اس سے مستثنیٰ بھی کر دیا تھا جنکے متعلق پہلے فرمان ہو چکا تھا کہ اپنے کفر و تمرد کی وجہ سے وہ اس عذاب میں ضرور حصہ پائیں گے اور انکے لئے کوئی طلب اور کوئی سوال مقبول نہ ہوگا۔

الا من سبق علیہ القول۔ مگر ان لوگوں کو ساتھ نہ لو جنکی نسبت پہلے حکم ہو چکا ہے۔

وہ پہلا حکم یہ تھا کہ لا تخاطبنی فی الذین ظلموا۔ جن لوگوں نے حق و عدالت سے انحراف کیا اور اپنی سرکشی و عدوان سے غضب ایزدی کے مورد ٹھیرے سو انکی بابت مجھ سے کچھ نہ چاہنا۔

لیکن چونکہ حق تعالیٰ نے حضرت نوح کو انکے "اہل" و اقارب کو بچا لینے کا حکم دیا تھا اور ان کا بیٹا بدرجۂ اول لفظ "اھل" کے جسمانی مفہوم میں داخل تھا اس لئے آپ کو جرأت ہوئی اور جناب خداوندی میں اسے اپنا "اھل" قرار دے کر سوال کیا اس پر جواب ملا کہ انہ لیس من اھلک گو بظاہر وہ تمہارے اہل میں سے تھا لیکن در اصل اسے تم سے کوئی تعلق نہیں۔ "اہل" میں وہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ وہ سرے سے تمہاری قوم ہی میں داخل نہ رہا بلاشبہ وہ تمہاری قوم اور تمہارے گھرانے میں سے تھا لیکن اب تو تمہاری قوم دوسری ہو گئی۔ تم نے حق اور راستی کی روح پیدا کر کے جو نئی قومیت صالحہ پیدا کی ہے اب وہی تمہاری قوم وہی تمہارا گھرانا وہی تمہارے

اہل ہیں۔ تمہارا رشتہ صرف اس نئی قوم ہی کا رشتہ اساس ہونا چاہیئے۔ وہ رشتہ خون اور جسم کا نہیں بلکہ حق اور دعوتِ حق کی روح کا ہے۔ اسی رشتہ میں منسلک کرکے یہ نئی قوم "دعوت نوحؑ" سے پیدا کی گئی ہے تمہارے جسمانی تعلقات کے جو "اہل" اس قومیت میں داخل نہ ہوئے وہ تم سے کٹ گئے اور تمہاری جگہ "عملِ غیر صالح" کی فرزندی میں داخل ہوگئے"!

آگے چلکر تحریر فرماتے ہیں:۔

"انسان کی اجتماعی حیات یا قومیت دراصل ان تمام عقائد و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے جو نسل و وطن اور متوارث و متواصل علائق نسل سے ترکیب پاتے ہیں۔ ان انبیاء کرام کا مشن یہ ہوتا ہے کہ ان تمام نسلی اور قومی امتیازات قدیمہ کو مٹا کر ایک نئی روحانی امتیاز و خصوصیت کی بنیاد پر نئی قومیت پیدا کریں۔ پس اس بنا پر انکی دعوت کا اولین اسوۂ حسنہ یہی ہونا چاہیئے تھا کہ خود بھی نسل و خاندان کے تمام رشتوں کو توڑ دیں اور اس طرح نسلی قربانی کا طاقت در حربہ تیار کریں اس قربانی کا انکے تمام کاروبارِ دعوت میں سب سے زیادہ کارکن ہوتا ہے۔ قوم دیکھتی ہے کہ کس طرح داعی الی الحق نے اپنے تمام رشتوں کے گھر کو اُجاڑ دیا اور اس عمارت کا ایک گوشہ بن گیا جسکی چھت کے نیچے ہمیں جگہ دے رہا ہے۔

چنانچہ انبیاء کرام و رسل عظام کے اس سلسلہ میں جنہوں نے نئی قومیتوں کی بنیاد رکھی ہے سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا مقام ہے اور چونکہ انکی دعوت اسی پہلی قسم کی دعوت تھی۔ اسلئے ضرور تھا کہ انکی اولین قربانی کا بھی وہ اسوۂ حسنہ قائم کرتے۔ پس آیۂ کریمہ مندرجہ صدر میں جب انہوں نے اپنے بیٹے کے لئے خدا کو پکارا تو ارشاد ہوا کہ یہاں جسمانی رشتہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اگر تمہارا بیٹا عملِ صالح کے اس نئے گھرانے میں داخل ہو جاتا جسکی تم نے بنیاد رکھی ہے تو وہ تمہارا عزیز تھا لیکن اس نے عملِ صالح کی جگہ عملِ غیر صالح سے رشتہ جوڑا پس اب اس کا ذکر بیکار ہے اور یہ بنا رِ قومیت کا وہ ناموسِ الہٰی ہے جس کا تمہیں علم ہونا چاہیئے۔

قال رب انی اعوذ بك ان اسئلك ما لیس لی بہ علم۔ حضرت نوحؑ نے عرض کیا۔ اے میرے پروردگار میں اپنے ضعفِ بشری کا اعتراف کرتا ہوں اور تیری رحمت و مغفرت میں پناہ لیتا ہوں کہ جس چیز کی حکمت و حقیقت پر میری نظر نہ تھی میں نے اسکی نسبت تجھ سے سوال کیا!"

پھر ارشاد ہے۔

حضرت نوح علیہ السّلام نے جس نئی اُمت کی بُنیاد رکھنی چاہی تھی اگرچہ ضلالتِ عصر اور جہلِ انسانیت اس سے دست وگریباں رہی اور اسلیئے مآ اٰمن معہ الا قلیل (۱۱۔۴۲) اُنپر ایمان لانے کی سعادت نہیں ملی ۔ مگر ایک چھوٹی سی جماعت کو۔

تاہم جس امتِ صالحہ کی اس عہدِ اولیٰ میں بُنیاد پڑی تھی وہ ضائع نہ گئی ۔ اور خدا کا کوئی حکمِ دعوت ضائع نہیں جا سکتا۔ اگرچہ خود حضرت نوحؑ پر بہت کم لوگ ایمان لائے کیونکہ انسانی مدنیتہ و عمران کا بالکل عہدِ طفولیت بلکہ اس سے بھی مقدم تر دور تھا۔ اور مذہب کا سلسلۂ ارتقا ابھی ابھی اپنی ابتدائی کڑیوں سے ایک دو قدم آگے بڑھا تھا۔ لیکن جب حضرت نوح علیہ السّلام اور اُنکے صدیقین و متبعین کی اولاد زمین کے مختلف گوشوں میں پھیلی تو وہ اپنے ساتھ اس نئی قومیت کے عقائد و اعمال بھی لیگئی۔

. . . .

یہ دراصل اسی طرف اشارہ ہے کہ حضرت نوح کی دعوت کسی خاص نسل اور قوم کو زندہ کر دینے کے لیئے نہ تھی بلکہ وہ اس قسم کی دعوت میں داخل تھی۔ جو موجودہ نسلوں اور قوموں سے بالاتر ہو کر خود ایک نئی قوم پیدا کرتی ہے ۔ اور اسکی بُنیاد محض اُخوۃ دینی پر قائم ہوتی ہے پس وہ جغرافیہ و نسل سے ماوری رہ کر ایک عالمگیر برادری بن جاتی ہے اور زمین کا ہر ٹکڑا نوعِ انسانی کا ہر حصّہ، اقوام و ملل کی ہر نسل اسکے دامن میں پناہ لے سکتی ہے۔" (اختتام اقتباسات البلاغ)

. . . .

یہ تو ہے وہ نظریہ قومیت جسکے ہم مدعی ہیں۔ اِسکے برعکس وہ نظریہ قومیت جسکی بنا روطنیت پر ہے اسے ساحرینِ یورپ نے کس طرح مسلمانوں کے اندر پھیلایا ہے اور وہ کیسا ابلیسانہ جال ہے اسکے متعلق مولانا آزاد البلاغ بابت ۲۶ کے عربی افتتاحیہ میں فرماتے ہیں۔

"فالافرنجیہ! الافرنجیہ! الزموھا تکونوا من الفائزین، والقومیۃ! القومیۃ! اعلنوھا ان کنتم مومنین .... فاولئک حزب الشیطٰن الا ان حزب الشیطٰن ھم الخاسرون (۵۸۔۱۹) (فرنگی فتنوں کے خطیب) شور مچاتے ہیں کہ فرنگیت! فرنگیت! اسے قبول کرلو۔ اگر تم کامیابی چاہتے ہو اور قومیت! قومیت! کا خوب ڈھنڈورا پیٹو اگر تم مومن ہو۔ (مولانا فرماتے ہیں) خبردار یہ سب شیطانی گروہ ہیں اور شیطانی گروہ ہی ناکام و نامراد ہونیوالا ہے۔"

اس کے بعد ہم مولانا حسین احمد صاحب کی خدمت میں سوائے اسکے اور کیا عرض کریں کہ "فتانی جلد بعض ... غور فرمائیں!"

عرضداشت بخدمت

حضرات علماء کرام و بزرگانِ عظام

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ. وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ - اَمَّا بَعْد: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ: قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ:

"اور کفار ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ (اے مسلمانوں) اگر تم نے بھی ایسا ہی نہ کیا (یعنی ایک دوسرے کے دوست نہ ہوئے) تو (یاد رکھو یہ (تمہارے لئے) زمین میں بڑے فتنہ و فساد کا موجب ہوگا"۔

ہندوستان کے مسلمان جس نازک دور سے آج کل گذر رہے ہیں وہ کسی دیکھنے والی آنکھ اور حرکت کرنے والے قلب سے پوشیدہ نہیں۔ اِس آئینی تبدیلیوں کے زمانہ میں جبکہ پرانے دستورِ حکومت کی بساط سمٹ رہی ہے اور اس کی جگہ ایک جدید نظامِ حکومت کا نظر فریب دامِ ہمرنگِ زمین آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر بچھایا جا رہا ہے جیسے رات کی تاریک چادر ہر شے کو نہایت خاموشی سے دبے پاؤں ڈھانپ لیتی ہے، ہر وہ صاحب بصیرت مسلمان جس کی انگلیاں نبضِ ملت پر اور نگاہیں رفتارِ زمانہ پر ہیں محسوس کر رہا ہوا بہ شدت محسوس کر رہا ہے کہ اگر عوام مسلمان اپنے مستقبل سے اسی طرح بے خبر اور خواص اپنے مناقشات میں باہمی لمنط منہمک رہے تو وہ دن دور نہیں جب یہاں 9 کروڑ فرزندانِ توحید کو دوسروں کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔

وَاِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ؁ پس مبارک ہیں وہ لوگ جو اس
مہلت سے فائدہ اٹھائیں اور پیشتر اس کے کہ وہ آنے والا خطرہ سر پر آ پہنچے، اس کے
روک تھام کی تجویز کریں۔ اور قبل اس کے کہ دامنِ سحاب میں تڑپنے والی بجلیاں بے نقاب
ہو کر اپنی شعلہ فشانی کا تماشا دکھائیں وہ اپنے خرمنِ ایمان و متاعِ دین کی مناسب تدابیر سے
حفاظت کریں۔ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ ؁ کے ارشادِ خداوندی
کے مطابق پورے ساز و سامان کے ساتھ ان خطرات کے مقابلہ کے لئے چاق و چوبند رہیں۔

ایسے نازک دور اور پُرخطر حالات میں آپ حضرات کا یہ اجتماع اربابِ نظر کے نزدیک
بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اہم ترین مسائل جو آج ہندوستان کی سیاسی زندگی
میں ملّتِ اسلامیہ کے لئے موت و حیات کی کشمکش کا موجب بن رہے ہیں، آپ حضرات
کی نگاہوں کے سامنے ہوں گے، اور آپ ان مسائل کا حل تلاش کرنے میں پورے غور و
فکر سے کام لیں گے۔ لیکن طلوعِ اسلام جس کا مقصدِ وحید مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ سے
متعلق امور کا حل کتاب و سنت کی روشنی میں پیش کرنا ہے، اپنا فرض سمجھتا ہے کہ موقعہ
کی نزاکت کے اعتبار سے چند گزارشات آپ حضرات کی خدمتِ گرامی میں پیش کرنے کی
جرأت کرے۔ امید ہے کہ اس جذبہ کے پیشِ نظر جس نے حضرت عمرؓ کو مدینہ کی ایک بڑھیا
کے ٹوکنے پر اپنی رائے پر نظرِ ثانی کرنے کی دعوت دی تھی، آپ حضرات ان معروضات
پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔ کیونکہ حکمت مومن کی متاعِ گم گشتہ ہے۔ جہاں کہیں سے
ملے لینی چاہیئے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

متحدہ قومیت

ہندوستان کی موجودہ تحریکِ آزادی کی بنیادیں اس نظریہ پر قائم ہیں کہ اس ملک کی جغرافیائی حدود کے اندر بسنے والے تمام انسان

؁ یہ ایسا ہی یقینی ہے جیسے تم ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہو۔

؁ ان (کفار) کے مقابلہ کے لئے پوری قوت سے تیار رہو۔

ایک قوم کے افراد ہیں۔ اور کانگریس اس قوم کی نمائندہ جماعت ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا متحدہ قومیت کا یہ تصور اور معیار اسلامی ہو سکتا ہے؟ اس بحث میں اُلجھنا مفید مطلب نہ ہوگا۔ کہ کتب لغت میں قوم کے کیا معنی ہیں۔ بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ متحدہ قومیت کا جو مفہوم سیاست حاضرہ میں لیا جاتا ہے، اس کی رُو سے اس قسم کی متحدہ قومیت کا تصور اسلامی ہو سکتا ہے یا نہیں!

یہ تو ظاہر ہے کہ قومیت نام ہے ان امتیازی خطوط کا جن سے انسانوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ سے تمیز ہوتا ہے۔ اور متحدہ قومیت کے نظریہ کے ماتحت یہ امتیازی خطوط وہ جغرافیائی حدود ہیں جو اس ملک کو محیط ہیں۔ اس جغرافیائی نظریہ کے غیر اسلامی ہونے میں شُبہ نہیں کیا جا سکتا۔ جغرافیائی حدود تو محض اتفاقی حادثات ہیں اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ خود فطرت کے نظامِ عمل کے ماتحت یہ حدود بدلتی رہتی ہیں۔ اور پھر انسانی قوانین بھی آئے دن ان حدود و قیود میں تبدیلیاں پیدا کرتے رہتے ہیں[1]۔ لہٰذا وہ قرآنِ کریم جو شرق وغرب کے امتیازات سے بلند و بالا ہے۔ اور وہ خدائے بزرگ و برتر جو مشارق و مغارب کا مالک ہے۔ کیا ایسی کمزور چیزوں کو انسانی تقسیم کا معیار قرار دے سکتا ہے! قرآنِ کریم کی رُو سے انسانوں کی تقسیم کا معیار ہے کفر و ایمان۔ اس کے نزدیک تمام رُوئے زمین پر بسنے والے مومن ایک قوم ہیں اور غیر مسلم ایک الگ قوم۔ غیر مسلموں کے پاس چونکہ کوئی ایسا ضابطۂ خداوندی نہیں جو ان امور میں ان کی راہ نمائی کر سکے اس لئے وہ اپنے ذہن سے نت نئے بودے معیار قائم کرتے رہتے ہیں کبھی وہ قوموں کی تقسیم نسل کے اعتبار سے کرتے ہیں۔ کبھی زبان کی رُو سے کبھی رنگ کے معیار پر کبھی وطن کے۔

اسلام انسان کو ان غیر فطری حدود و ثغور سے بلند لے جاتا ہے اور ان کی تقسیم مادی امتیازات کے بجائے قلبی امتیاز کے ماتحت کرتا ہے۔ اس قلبی امتیاز کا نام ہے کفر و اسلام

[1] کل تک برما ہندوستان کا ایک جزو تھا۔ اور آج ایک الگ ملک ہے۔ منہ

کی تفریق اِن مختلف امتیازات کی وجہ سے مختلف کلچر جس کا ترجمہ عام طور پر تہذیب یا تمدن کیا جاتا ہے پیدا ہوتے ہیں وہ مخصوص ذہنیت جو اسلام کی روح کو اپنے اوپر طاری کر لینے سے پیدا ہوتی ہے۔ اسلامی کلچر ہے۔ اور یہی کلچر وہ رشتہ ہے جس میں منسلک ہوکر تمام دنیا کے مسلمان ایک قوم بن جاتے ہیں اور مسلمانوں کی قوم تمام دنیا کی قوموں سے متمیز ہو جاتی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ اسلامی معیارِ تقسیم کی رُو سے ہندوستان کے مسلمان اور ہندو دونوں ملکر ایک قوم نہیں بن سکتے۔ اکثریت کا چونکہ اس میں فائدہ ہے کہ وہ قومیت کی ایسی تعریف کرے جس سے اقلیتیں الگ قوم نہ بن سکیں بلکہ اکثریت کے اجزا بنی رہیں اسلیئے ہندوؤں نے یہاں بہ تقلید یورپ۔ قومیت کا معیار ''وطنیت'' قرار دے دیا ہے حالانکہ خود یورپ اب اِس معیارِ تقسیم کو اپنے ہاتھوں سے توڑ رہا ہے۔ جرمنی کے اندر بسنے والے یہودی اس ملک سے نکالے جا رہے ہیں۔ اور سوڈیٹن لینڈ کے رہنے والے جرمن۔ جرمنی کے باشندوں کے ہم قوم قرار پا چکے ہیں۔ کلچر کے معیار کے مطابق اہلِ ہند کی تقسیم چونکہ ہندوؤں کے مفاد کے خلاف ہے اِس لئے وہ اس طرف آنا ہی نہیں چاہتے۔ چنانچہ ان کے نوجوانوں کے نمائندے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو کو انکار ہے کہ مسلمانوں کا کوئی الگ کلچر ہے۔ اور ان کے قدامت پسند طبقہ کے نمائندے۔ مہاتما گاندھی کی تجویز یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب و کلچر کو ملا کر ایک کر دیا جائے۔ تاکہ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا تصور ہی باقی نہ رہے ان تمام امور کو اس مضمون میں واضح طور پر بیان کیا جا چکا ہے جو متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمدؒ صاحب کے عنوان سے طلوعِ اسلام بابت جنوری ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا ہے۔ آپ حضرات سے درخواست ہے کہ اِس مضمون کا بغور مطالعہ فرمائیں اور پھر واضح اور غیر مبہم الفاظ میں اعلان فرمائیں کہ مسلم قومیت کا معیار وطنیت ہے یا ان کے لئے وجۂ جامعیت ایمان ہے یہ چیز آپ ہی نے ہمیں بتائی تھی کہ لیس البران یحب الوطن ولکن البران یحب العالم

ترجمہ۔ نیکی اس میں نہیں ہے کہ وطن سے محبت کیجائے۔ بلکہ نیکی اس میں ہے کہ ساری دنیا سے محبت کی جائے۔ اسلام اسی عالم پرستی کی دعوت سے کر آیا۔ وہ اپنے پیروؤں کو وطن پرست نہیں بلکہ انسانیت پرست دیکھنا چاہتا ہے۔

(مولانا آزاد۔ ورنستمبر ۱۹۲۰ء بحوالہ "مسلمانوں کا ایثار" صفحہ ۳۰۹)

اگر یہ صحیح ہے کہ مسلم قومیت کی بنا، وطنیت نہیں اور مسلم اور غیر مسلم ملکر ایک قوم کی تشکیل نہیں کر سکتے۔ تو ہندوستان میں متحدہ قومیت کا مسلک کس طرح جائز قرار پا سکتا ہے! جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے یہ نظریہ یورپ کے مادہ پرستوں کی اختراع ہے جسے ہندو اپنے قومی مفاد کی خاطر یہاں رائج کر رہا ہے لیکن مسلمان بنا بر اتباع و تقلید کوئی مسلک اختیار نہیں کر سکتا۔ اگر آپ اجازت دیں تو آپ کے سامنے اس خطبہ صدارت کے چند الفاظ پیش کئے جائیں جو آپ کے سالانہ اجلاس ۱۹۲۱ء میں مولانا ابوالکلام صاحب آزاد نے ارشاد فرمائے تھے یہ الفاظ شاید آج بعض حضرات کو غیر مانوس معلوم ہوں۔ لیکن آپ میں سے اکثر حضرات ان سے ناآشنا نہ ہوں گے۔ آپ کے صدر نے آپ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔

حضرات علماء کرام و ارکان جمیعۃ! اس وقت ایک بڑی آزمائش ہمارے طریق عمل کے لئے درپیش ہے۔ ہم نے مدتوں کی غفلت کے بعد قومی و اجتماعی اعمال کی کشمکش و کشاکش میں قدم رکھا ہے۔ اس لئے سب سے پہلے ہماری نظر آج کل کے مجلسی اور اجتماعی کاموں کے طرق و اسلوب پر پڑتی ہے اور تقلید و محاکات کا جذبہ ہمیں بے اختیار ان کی جانب کھینچنے لگتا ہے لیکن میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ آپ کی راہ ان راہوں سے بالکل الگ ہے اور کتاب اللہ کی ہدایت اور حکمتِ نبوۃ کی سنّت نے آپ کو دنیا اور دنیا والوں کے تمام گھڑے ہوئے طریقوں اور قاعدوں سے مستغنی کر دیا ہے آپ اس لئے نہیں آئے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے طریقوں کی تقلید کریں بلکہ آپ کو علم و عمل شریعت اس لئے دیا گیا ہے تاکہ دنیا کی آنکھیں آپ کی طرف امید و طلب سے اٹھیں اور آپ کی ہدایت ان کے لئے اتباع و تقلید کا پیام ہو

آپ کے پاس اللہ کی کتاب ہے اور اس کے رسول صلعم کی سنّت ہے۔ اور ان دو چیزوں سے بڑھ کر اور کونسا مبداءِ علم اور سرچشمۂ حکمت ہو سکتا ہے جو انسانی اعمال کے تمام اصول وفروع کے لئے دنیا میں وجود رکھتا ہو۔ دنیا میں علم و یقین صرف وحیٔ الٰہی اور علوم و اعمال نبوت میں اس کے سوا علم و یقین اس سمارۂ دنیا کے نیچے موجود نہیں"

حضرات! سیاستِ حاضرہ میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلم و غیر مسلم کے امتزاج سے ایک "متحدہ قومیت" کا تصور کس طرح اسلامی تعلیم کے مطابق ہو سکتا ہے ہمیں امید ہے کہ آپ اس سوال کے مختلف گوشوں پر کتاب و سنّت کی روشنی میں غور فرما کر ایک واضح نتیجہ کا اعلان فرمائیں گے۔

مذہب کا تحفظ

حضرات! مسلمانوں سے آج یہ کہا جاتا ہے کہ جب کانگریس اس امر کی ضمانت دیتی ہے کہ ان کے مذہب کا پورا پورا تحفظ کیا جائے گا تو پھر ان کے لئے عدمِ اعتماد کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی!

یہ دلیل بظاہر بڑی خوش آئند معلوم ہوتی ہے لیکن جب ذرا گہری نگاہ سے اس کا تجزیہ کیا جائے گا۔ تو اس ضمانت کی حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گی۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اربابِ کانگریس جن میں مسلم قومیت پرست حضرات پیش پیش ہوتے ہیں اس امر کا کھلم کھلا پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ مذہب صرف پرائیویٹ عقیدہ کا نام ہے۔ یہ چیز آپ ابھی ابھی اپنے ایک سابقہ صدر کی زبانی سن چکے ہیں کہ مذہب اسلام پرائیویٹ عقیدہ کا نام نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کے ہر شعبہ کو محیط ہے۔ مولانا آزاد ہی نے دوسری جگہ فرمایا ہے کہ دنیا کو ایسے مذہب کی کیا ضرورت ہے جو صرف خطبۂ نکاح میں چند آیتیں پڑھ دینے یا بسترِ نزع پر یٰسین کو دوہرا دینے کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے" (الہلال ۱۲/۱۱ 9

اسلام محض اخلاقی ضابطہ نہیں بلکہ ایک مکمل نظامِ زندگی کا نام ہے۔ مسلمانوں کے جملہ

امورِ حیات۔ معاشی ہوں یا معاشرتی ، سیاسی ہوں یا مذہبی، تمدنی ہوں یا عمرانی تمام کے تمام ایک قانونِ الٰہی ایک ضابطۂ خداوندی کے ماتحت سرانجام پاتے ہیں۔ اور اس نظامِ زندگی کا نام ہے اسلام۔ ایسے مذہب کو منظّم مذہب (ORGANISED RELIGION) کہتے ہیں اور منظّم مذہب کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو علانیہ فرماتے ہیں کہ ایسے مذہب کے وجود سے ان کا دل کڑھتا ہے۔ اور ان کی دیرینہ آرزو ہے کہ ایسا مذہب (نعوذ باللہ) صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ (ملاحظہ ہو "میری کہانی" صفحہ ۱۴۱)

کیا آپ حضرات کے نزدیک بھی مذہب محض ایک پرائیویٹ عقیدہ کا ہی نام ہے! اور کیا مذہب کے تحفظ کے متعلق کانگریس کی کوئی ضمانت کافی ہو سکتی ہے! یہ مذہب کو پرائیویٹ حیثیت دیدینے کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ایسی آوازیں بھی ہمارے کانوں تک آنے لگی ہیں کہ "مہاتما گاندھی تمہارے مذہبی امام تو نہیں ہو سکتے لیکن سیاسی امام ضرور ہو سکتے ہیں" کیا آپ حضرات اس نظریہ کی تائید کرتے ہیں! اور مذہب اور سیاست کی اس تفریق کو اسلام کے مطابق خیال فرماتے ہیں!

منظّم مذہب کے تحفظ کی ضمانت کو چھوڑیئے! قرائن بتا رہے ہیں کہ عام شعائرِ اسلامی کے ادا کرنے میں جیسی کچھ انفرادی آزادی آج حاصل ہے آنے والی حکومت کے دور میں وہ بھی باقی نہیں رہے گی۔ مثلاً ذبیحہ گاؤ کو لیجئے اگرچہ یہ چیز مذہبی فریضہ نہیں۔ صرف مذہبی رخصت ہے۔ لیکن یہ مسلم ہے کہ اگر کوئی طاقت مسلمانوں کے کسی مذہبی حق کو زبردستی چھیننا چاہے تو اس حق کی حفاظت فرض ہو جاتی ہے۔ اب ملاحظہ فرمایئے کہ اس باب میں ہندوؤں کے کیا خیالات ہیں۔ مہاتما گاندھی فرماتے ہیں۔

> یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ یورپین کے لئے گاؤ کشی جاری رہنے کے بابت ہندو کچھ بھی محسوس نہیں کرتے۔ میں جانتا ہوں کہ ان کا غصہ اس خوف کے نیچے دب رہا ہے جو انگریزی عملداری نے پیدا کر دیا ہے۔ مگر ایک ہندو بھی ہندوستان کے

طول و عرض میں ایسا نہیں ہے جو ایک دن اپنی سرزمین کو گاؤکشی سے آزاد کرانے کی اُمید نہ رکھتا ہو۔ اور ہندو مذہب کو جیسا کہ میں جانتا ہوں۔ یہ اس کی روح کے سراسر خلاف ہے وہ عیسائی یا مسلمان کو بزورِ شمشیر بھی گاؤکشی چھوڑنے پر مجبور کرنے سے اغماض نہیں کرے گا"

(الفضل ۹ مارچ ۱۹۱۸ء بحوالہ اسٹیٹسمین)

پھر ایسی مہاتماجی نے ہری پور کانگریس کے اجلاس کے موقعہ پر بالکل واضح الفاظ میں فرمادیا کہ "کسی نہ کسی طرح بذریعہ قانون گئوکشی بند کی جائے گی"

(مسلمانوں کا ایثار صفحہ ۳۷۰)

ذرا آگے بڑھیئے! ہندوستان کی آئندہ نسلوں کے لئے جو تعلیمی اسکیم تیار کی گئی ہے۔ اور جو لازمی اور جبری تعلیم ہوگی۔ اس میں ہے کہ تمام مذاہب اصولی سچائیوں کے لحاظ سے بالکل یکساں ہیں اور فلسفۂ حیات کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اہمسا کو ہمسا پر فضیلت حاصل ہے ان امور کی تشریح کے لئے نصابِ تعلیم میں اکبر اور دارا شکوہ کے سوانح حیات اور مہاتما گاندھی اور مہاتما بدھ کے کوائف زندگی شامل کئے گئے ہیں۔ آپ غور فرمائیں کہ جن بچوں کو جبری طور پر اس قسم کی تعلیم دی جائے گی کیا ان کے دل و دماغ کبھی صحیح اسلامی قالب میں ڈھل سکیں گے؟ یہ تو خیر آنے والے زمانہ کی باتیں ہیں۔ آج کانگریس میں سوشلسٹ نوجوانوں کی اکثریت ہے۔ اور مسٹر بوس کے انتخاب نے بتا دیا ہے کہ یہی گروہ آئندہ کانگریس کا روحِ رواں ہوگا۔ سوشلزم کے متعلق آپ حضرات کو علم ہوگا کہ یہ نظام کس درجہ دہریت کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ ہندوستان میں آج سوشلزم کا سب سے بڑا مدعی جواہر لال نہرو ہے، جو دہریہ ہے۔ اسے خدا کے نام سے اس درجہ چڑ ہے کہ ڈاکٹر عالم کے مقدمہ میں اس نے عدالت سے کہہ دیا کہ وہ خدا کے نام کی قسم کھانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ آپ غور فرمائیں کہ ان حالات کے ماتحت مسلمان کس طرح اپنے آپ کو فریب دے سکے کہ متحدہ قومیت کے نظامِ حکومت کے ماتحت ان کے مذہب کا تحفظ کیا جائے گا۔

آپ غور فرمائیں کہ کیا وہ مسلک جو ملک میں اس قسم کے نظام حکومت کے قیام کی دعوت دے رہا ہو کبھی اسلامی مسلک کہا جا سکتا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ آنے والا نظامِ حکومت جمہوری نظام ہوگا۔ یعنی اس نظام میں اکثریت کے فیصلے ملک کا قانون بنا کریں گے اور اکثریت لامحالہ ہندوؤں کی ہوگی۔ ہندوؤں کی حکومت کے متعلق آپ کی جمعیت کے ناظم مولانا احمد سعید صاحب کی رائے ہے کہ۔

"اسلامی حکومت کے زوال پر اگر خدانخواستہ اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت قائم ہو جاتی تو مسلمانوں کو چھٹی کا کھایا یاد آجاتا۔ جو قوم موجودہ غلامی کی حالت میں یہ ستم ڈھا رہی ہے۔ حکمران بنکر خدا جانے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی"

(الجمعیۃ۔ بابت ۱۰؍جنوری ۱۹۲۶ء صفحہ ۲)

لیکن آج مسلمانوں سے کہا جاتا ہے کہ کانگریس یعنی ہندوؤں کی اکثریت پر پورا پورا بھروسہ رکھو۔ کامل اعتماد کرو۔ موہومہ خطرات کو دل میں نہ آنے دو۔ کانگریس کو حکومت دلانے میں بڑی پوری کوشش کرو۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کی محافظ ہے۔ مولانا حسین احمد صاحب نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا۔

"جواہر لال ہندو ہے۔ اس نے کبھی نہیں کہا کہ میں مسلمان ہوں اس کے باوجود وہ مسلمانوں کا تحفظ چاہتا ہے"

(زمزم لاہور۔ بابت ۷؍جولائی ۱۹۳۹ء)

حالانکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا۔ غیر مسلم تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ۔ جس بات سے تمہیں نقصان پہنچے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ۔ وہ چاہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) اللہ کی اس شمع نورانی (اسلام) کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔ جب صورتِ حالات یہ ہو تو فرمائیے کہ کفار کے ساتھ تولی، دلی دوستی، قلبی اعتماد کے تعلقات کس طرح پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ قرآن کریم کے ارشادات گرامی آپ

حضرات کے سامنے ہیں۔ وہ کتنی شدت اور تکرار سے مسلمانوں کو تاکید کرتا ہے کہ کفار کے ساتھ بھروسہ اور رازداری کے دلی تعلقات بھی قائم نہ کرو اور جب ان سے دلی تعلقات قائم نہیں کئے جا سکتے تو حیرت ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی متحدہ قومیت کیسے بن سکتی ہے! اور جب متحدہ قومیت نہیں بن سکتی تو پھر سوائے اس کے اور کونسا مسلک صحیح ہو سکتا ہے کہ مسلمان پہلے اپنا الگ قوم ہونا تسلیم کرائیں پھر ایک باوقار معاہدہ کی رو سے ہندوؤں سے اشتراکِ عمل کریں۔ آپ کو غالباً یاد ہوگا کہ آپ کی جمعیۃ کے ناظم مولانا احمد سعید صاحب نے جمعیۃ کے اجلاس مراد آباد کے قریب ایک مبسوط بیان میں فرمایا تھا کہ۔

> جب کانگریس حکومت ہند سے اپنے مطالبات منظور کرا رہی ہے تو مسلمان اگر کانگریس سے اسی بنا پر مفاہمت کرنا چاہیں تو کیا بیجا ہے؟
>
> (مسلمانوں کا ایثار، صفحہ ۴۲۵)

یہی آج مسلمانوں کے جمہور کا مطالبہ ہے اور ان کی درخواست ہے کہ اس مطالبہ میں آپ نہ صرف ان کے ہمنوا ہوں بلکہ ان کی قیادت کریں۔ جیسا کہ آپ کے جلیل منصب کا تقاضا ہے۔

حصولِ آزادی

کہا جاتا ہے کہ حصولِ آزادی مقدم ہے۔ دوسری چیزوں پر بعد میں غور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں تو آئینی تبدیلی واقع ہو رہی ہے یعنی انگریزی کی حکومت کی جگہ نیا نظامِ حکومت رفتہ رفتہ ملک میں نافذ کیا جا رہا ہے۔ اگر آزادی سے مفہوم انگریز کا یہاں سے نکل جانا ہے تو ظاہر ہے کہ جس دن انگریز یہاں سے نکلا اسی دن موجودہ نظام کی جگہ نیا نظام حکومت یہاں مسلط ہو چکا ہوگا اور "دوسری چیزوں" پر غور کرنے کی گنجائش بالکل نہ ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ دوسرا نظامِ حکومت جو تدریجاً ملک پر مسلط ہو رہا ہے ایسا نظام ہے جس میں مسلمان اپنے تمام انفرادی اور اجتماعی

امور میں حکومتِ انگریزی کے منشاء کے مطابق زندگی بسر کر سکے گا! اور جس کے لئے اسے کانگریس میں مدغم ہو کر اندھا دھند کوشش کرنی چاہیئے۔ لیکن یہ مفروضہ ہی غلط ہے۔ کہ ہندوؤں کا مقصد انگریز کو یہاں سے نکال دینا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کانگریس کا نصب العین "پورنا سواجیہ" ہے۔ لیکن

یہ ہے وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا

آج تک متعین ہی نہ ہو سکا کہ ان الفاظ کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ مہاتما گاندھی سے جو اس ترکیب کے مصنف ہیں۔ بار بار اس کا مفہوم دریافت کیا گیا ہے لیکن انہوں نے جو بتایا وہ بجائے خویش ایک چیستان ہے۔ ۲ر مارچ ۱۹۳۰ء کو سابرمتی سے جو خط انہوں نے حکومتِ ہند کے نام لکھا تھا اس میں ہے کہ حکومت کو "سوراجیہ" سے خائف نہیں ہونا چاہیئے۔ فرماتے ہیں۔

> "اگر ڈومینین اسٹیٹس جس کا آپ نے اعلان کیا ہے۔ اصل معنوں میں استعمال کیا جائے تو سوراج کے ریزولیشن سے کوئی خطرہ محسوس کرنا نہیں چاہیئے۔ اس لئے کہ برطانوی مدبرین بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ڈومینین اسٹیٹس بھی ایک قسم کی آزادی ہے۔ لیکن مجھے جو اندیشہ ہے وہ یہ ہے کہ مستقبل قریب میں ڈومینین اسٹیٹس دینے کا کوئی ارادہ ہی نہیں ہے۔"

۶ر مارچ ۱۹۳۱ء کو امریکہ کے اخبارات کے نمائندوں کے استفسار کے جواب میں گاندھی جی نے "پورنا سوراجیہ" کے متعلق فرمایا۔

> "سوراج کے معنی ہیں اندرونی طور سے منظم حکومت اور پورنا کے معنی ہیں مکمل۔ کوئی صحیح لفظ نہ پاتے ہوئے ہم نے "مکمل آزادی" کے لفظ کو اس کے معنوں میں مجبوراً اختیار کر لیا ہے۔ پورن سوراجیہ کا مطلب یہ نہیں کہ کسی بیرونی طاقت سے تعلقات نہ رکھے جائیں۔ پھر برطانیہ سے یہ تعلقات کیسے منقطع کئے جا سکتے ہیں۔ یہ تعلقات تو باہمی فائدے کے لئے ہیں۔"

اس سوال کے جواب میں کہ کیا آپ "پورن سوراجیہ" برٹش جھنڈے کے نیچے قبول کر لیں گے۔

انہوں نے کہا۔

"اس جھنڈے کے نیچے نہیں۔ بلکہ اگر ممکن ہوا تو ایک مشترک جھنڈے کے نیچے۔ اور اگر ضرورت ہوئی تو علیحدہ قومی جھنڈے کے نیچے۔"

آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ گورنروں اور کانگریسی وزراء میں تصادم کے موقع پر مہاتما جی نے کہا تھا کہ

"برطانیہ اور ہندوستان کے تعلقات کو خوشگوار رکھنے کے لئے میں اپنے خون کا آخری قطرہ صرف کر دوں گا۔"

برطانیہ کے ساتھ تعلقات کے متعلق ۱۹۳۶ء کی کانگریس کے سالانہ اجلاس کی تقریب پر صدر کانگریس نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا۔

"سلطنت برطانیہ اس وقت تاریخ کے دوراہوں میں سے ایک راستہ پر کھڑی ہے۔ یا تو وہ اس انجام سے دوچار ہوگی جو دوسری سلطنتوں کا ہو چکا ہے۔ یا اسے اپنے آپ کو آزاد قوموں کے ایک وفاق میں تبدیل کرنا ہوگا۔ برطانیہ عظمیٰ کے لئے اپنے نظامِ سلطنت کے اندرونی تضاد و تباین کو ختم کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ سلطنت کو آزاد قوموں کے وفاق میں تبدیل کر دے"

اور پھر جب آپ اس بیان کو بھی پیشِ نظر رکھیں جو پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنی سیاحت یورپ کے دوران میں پراگ کے مقام پہ دیا تھا اور جس میں انہوں نے کہا تھا کہ۔

انگلستان کا دشمن ہندوستان کا دشمن ہے

تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوؤں کے نزدیک موجودہ تحریکِ آزادی کا منتہیٰ کیا ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک آزادی سے مفہوم محض "معاشی آزادی" ہے۔ کیا قرآن کریم کی رو سے مسلمان کے لئے بھی آزادی کا مفہوم صرف اسی قدر ہے! پھر جب حالت یہ ہے تو غور فرمایئے کہ یہ ایسا کونسا عظیم الشان مقصد ہے جس کے لئے مسلمان اپنی جداگانہ ہستی۔ اپنی الگ قومیت۔ اپنی خالص اسلامی اجتماعیت۔ اپنی مرکزیت گم کر کے مسلم و غیر مسلم کے امتزاج سے ایک "متحدہ قومیت"

کی تشکیل کر جہادِ عظیم سمجھے۔ مسلمان کے نزدیک صحیح آزادی صرف وہ آزادی ہے جس میں وہ اس کرۂ ارض پر حکومتِ الٰہی قائم کر سکے۔

اگر باین نرسیدی۔ تمام بولہبی است

نظامِ اجتماعی

حضرات! ہم سے زیادہ آپ واقف ہیں کہ اسلامی زندگی اجتماعی زندگی کا نام ہے۔ اسلام کے نزدیک جس طرح مسلم و غیر مسلم کی مخلوط جماعت کی کوئی اصل نہیں، اسی طرح اس کی رُو سے انفرادی زندگی کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔

اسلام کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کی بلا شرکتِ غیرے اپنی جماعت ہو، اپنا امیر ہو، اپنا نظام ہو اور اس طرح یہ خود بھی ضابطۂ الٰہی کے ماتحت زندگی بسر کریں اور پھر ساری دنیا کو اس حکومتِ الٰہی میں شامل کرنے کی کوشش کریں۔ اُمّتِ مسلمہ ابھی تک وہ زمانہ نہیں بھولی جب آپ حضرات ہر منبر، ہر اسٹیج اور ہر پلیٹ فارم سے مسلمانوں کو یہی پیغامِ ہدایت دیا کرتے تھے کہ جماعت اور امیر کے بغیر کوئی زندگی اسلامی زندگی نہیں کہلا سکتی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے رسالہ "مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب" میں سے ذیل کے اقتباسات ہم تمثیلاً پیش کرتے ہیں۔

> "اسی بنا پر شارع نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام "جماعت" رکھا ہے اور جماعت سے علیحدگی کو "جاہلیت" اور حیاتِ جاہلی سے تعبیر کیا ہے"

قرآن کے نزدیک فرد اور فرد کی ہستی کوئی شے نہیں ہے، ہستی صرف اجتماع اور جماعت کی ہے اور فرد کا وجود اور اعمال بھی اس لیے ہیں تا کہ ان کے اجتماع و تالیف سے ہیئتِ اجتماعیہ پیدا ہو۔"

پس جاہلیت کا دوسرا نام تفرقہ ہوا۔ اور اسلام کا دوسرا نام جماعت۔ اور التزامِ جماعت۔ یہی وجہ ہے کہ تمام احادیث میں یہ حقیقت واضح کیگئی اور اعلان کیا گیا ہے کہ جو شخص جماعت اور اطاعتِ امام سے الگ ہو گیا گویا وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔ اسکی موت جاہلیت کی موت ہوگی، اگرچہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو اور اپنے آپکو مسلمان سمجھتا ہو۔"

مسلمانوں کے لیئے راہِ عمل ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اور ہمیشہ کیطرح اب بھی ایک ہی ہے۔ یعنی ہندوستان کے مسلمان اپنی جماعتی زندگی کی اس معصیت سے باز آجائیں جس میں وہ ایک عرصہ سے مبتلا ہیں اور جس کی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے اُن پر بند ہو گئے ہیں۔ جماعتی زندگی کی معصیت سے مقصد یہ ہے کہ ان میں ایک جماعت "بنکر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہو گیا ہے، وہ بالکل اس گلّے کی طرح ہیں جسکا انبوہ جنگل کی جھاڑیوں میں منتشر ہو کر گم ہو گیا ہو۔......... قرآن و سنّت نے بتایا ہے کہ شخصی زندگی کے معاصی کسی قوم کو یکایک برباد نہیں کر دیتے۔ اشخاص کی معصیت کا زہر آہستہ آہستہ کام کرتا ہے لیکن جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (یعنی نظامِ جماعتی کا نہ ہونا) ایسا تخمِ ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے، اور پوری قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے۔"

پس اے اربابِ علم و بصیرت و صاحبانِ عقل و فراست فرمائیے! کہ وہ جماعت، وہ امیر، وہ اسلامی نظام وہ مرکزیت آج کہاں ہے؟ کیا جماعت سے مُراد وہ کانگرس ہے، جس میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے؟ کیا امیر سے مفہوم کانگرس کا صدر ہے جو کبھی بُت پرست اور کبھی دہریہ ہوتا ہے؟ غور فرمائیے کہ سب سے مقدم یہ چیز نہیں کہ مسلمانوں کو اجتماعی زندگی کا سبق دے کر انہیں ایک مرکز پر جمع کیا جائے؟ ہم نے

مانا کہ احوال و ظروف بدل جایا کرتے ہیں۔ لیکن کیا خدا و رسولؐ کے احکام بھی ایسے ہیں، کہ احوال و ظروف کی تبدیلی کے ساتھ وہ بھی بدل جائیں۔ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہی زندگی جو خود آپ حضرات کے تفقہ فی الدین کے مطابق کفر و جاہلیت کی زندگی ہے۔ کسی وقت عین اسلامی زندگی قرار پا جائے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ خدا و رسول کے احکام غیر متبدل ہیں تو پھر کیا مسلمانوں کی جداگانہ جماعت و مرکز کا قیام سب سے مقدم اور عین تقاضائے اسلام نہیں!

حضرات! یہ تو ابھی معلوم نہیں کہ اس مرتبہ آپ کے محترم صدر کا خطبۂ صدارت کیا ہوگا۔ لیکن سال ۱۹۲۱ء کے خطبۂ صدارت میں آپ صاحبان کو یوں مخاطب کیا گیا تھا:۔

حضرات! آپ مجھے اجازت دیں کہ میں مختصراً اس مسئلہ کی نسبت بھی کچھ عرض کر دوں جس کو میں علیٰ وجہ البصیرت آج تمام اعمالِ اصلاحیہ کے لیے بمنزلہ اصل و اساس کے یقین کرتا ہوں۔ اور کامل بارہ برس کے مستقل غور و فکر کے بعد اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ بغیر اسکے کبھی عقدہ کا حل نہیں ہو سکتا۔ میرا اشارہ مسئلہ نظامِ جماعت اور قیامِ امارتِ شرعیہ کیجانب ہے۔ مسئلہ نظامِ جماعت سے مقصود یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اصلاحِ حال اور ادائے فرائضِ شرعیہ کی استطاعت کبھی ظہور پذیر نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنی موجودہ حیاتِ انفرادی کو ترک کر کے حیاتِ اجتماعی و شرعی اختیار نہ کر لیں۔ یعنی احکامِ نظامِ شرع کے مطابق سب ایک امیر و قائدِ شرع کی اطاعت پر مجتمع نہ ہو جائیں اور بکھرے ہوئے متفرق قومی مرکزوں کی جگہ ایک ہی مرکزِ قومی پیدا نہ ہو جائے، یہی اصل و اساس کار ہے۔ اور تمام مقاصدِ اصلاح اور مصالحِ انقلاب کا ظہور اسکے قیام و وجود پر موقوف ہے، حضرات اسلام کے نظامِ اجتماعی کی نسبت کسی شرح و تفصیل کی ضرورت نہیں۔ علی الخصوص ایک ایسے مجمع میں جیسا کہ فضل و توفیقِ الٰہی سے اسوقت میرے گرد و پیش موجود ہے، اسلام نے مسلمانوں کے تمام اعمالِ حیات کے لیے بنیادی حقیقت یہ قرار دی ہے، کہ کسی حال میں بھی

فرادیٰ متفرق الگ الگ اور منتشت نہ ہوں، ہمیشہ مجتمع مؤتلف۔ متحد۔ اور نفسِ واحدہ ہوکر رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن و سنّت میں جابجا اجتماع و وحدت پر زور دیا گیا۔ اور کفر و شرک کے بعد کسی بدعملی سے بھی اسقدر اصرار و تاکید کے ساتھ نہیں روکا۔ عقیدۂ توحید سے لیکر تمام عبادات و اعمال تک یہی حقیقت مرکزیہ جلوہ طرازی کررہی ہے اور اسی بنا پر بار بار نظم جماعت پر زور دیا گیا ہے۔ علیکم بالجماعۃ والسمع والطاعۃ......" (خطبۂ صدارت مولانا آزاد، اجلاس جمعیۃ العلماء، لاہور)

اسی خطبہ میں موجودہ حالت کے متعلق فرمایا تھا۔

"اور اب حالت یہ ہے کہ دس کروڑ مسلمان جو تمام کرۂ ارض میں سب سے بڑی یکجا اسلامی جماعت ہے ہندوستان میں اس طرح زندگی بسر کررہی ہے کہ نہ تو کوئی ان میں رشتۂ انسلاک ہے نہ وحدتِ ملّت کا کوئی رابطہ ہے نہ کوئی قائد و امیر ہے اور نہ کوئی آمر و نافذ شرع ہے محض ایک بھیڑ ہے۔ ایک انبوہ ہے......... ایک گلّہ ہے جو ہندوستان کی آبادیوں میں بکھرا ہوا ہے اور یقیناً ایک حیاتِ غیر شرعی و جاہلی ہے، جس میں یہ پوری اقلیم مبتلا ہوگئی ہے۔"

اسکے بعد خطبۂ مذکور میں یہ بحث کیگئی تھی کہ جب کوئی قوم کفّار کے غلبہ سے محکوم ہوجائے تو اُسے کیا کرنا چاہیئے؟ اور اس باب میں فتنۂ تاتار اور فتاویٰ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کے تذکرہ کے بعد ارشاد تھا کہ

"فی الحقیقت احکامِ شرع کی رُو سے مسلمانانِ ہند کے لیے دو راہیں تھیں اور اب بھی دو راہیں ہیں۔ یا تو ہجرت کرجائیں یا نظامِ جماعت قائم کرکے ادائے فرضِ ملّت میں کوشاں ہوں۔"

چونکہ یہ راہِ عمل کتاب و سنّت کی روشنی میں متعیّن کی گئی تھی۔ اسلیئے جس طرح یہ ۱۹۲۱ء میں عین راہِ صواب تھی، اسی طرح آج ۱۹۳۹ء میں بھی اسے صراطِ مستقیم ہونا چاہیئے۔ اُمت کی آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس راہِ رُشد و ہدایت میں ان کی راہ نمائی فرمائیں۔

اپنے اور بیگانے حضرات! یہ شکایت کی جاتی ہے کہ مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم کے مدعی جذبۂ حریت سے خالی ہیں، ٹوڈی ہیں، سرکار پرست ہیں، اول تو یہ الفاظ ہر شخص کے متعلق استعمال نہیں کیے جا سکتے لیکن اگر بفرضِ محال اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو غور طلب بات یہ ہے کہ اگر کسی مسجد میں ایسے نمازی آتے ہوں جو تقویٰ اور پرہیزگاری کے بلند معیار پر پورے نہیں اترتے تو کیا اُنکی وجہ سے مسجد کو چھوڑ کر بتکدہ کا رُخ کر لینا جائز ہو جائے گا۔ آپ ہی ہمیں بتایا ہے کہ :-

"اگر ایک بھائی غلطی کر رہا ہے تو تم غلطی مت کرو اور اُسے منالو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اپنوں سے رُوٹھ کر غیروں کی چوکھٹ پر چلا جائے۔ اور بڑی سے بڑی مصیبت اور بڑے سے بڑا دُکھ برداشت کیا جا سکتا ہے مگر یہ نہیں دیکھا جا سکتا کہ اپنوں کا سر ہو اور غیروں کی چوکھٹ"

(مضامین آزاد حصہ ششم)

آپکا یہ بھی ارشاد تھا کہ مسلمان کے لیے گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنا یا کانگرس میں جا کر شامل ہو جانا، دونوں راستے صراطِ مستقیم سے ہٹا دینے والے ہیں۔

"اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اُس کے پیروؤں کو اپنی پولٹیکل پالیسی قائم کرنے کے لیے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولٹیکل تعلیموں کے آگے جھک کر نیا راستہ پیدا کریں ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں وہ دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنے والے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں ....

ہم تو خود اسے مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی سمجھتے ہیں کہ ہمیشہ اُنہوں نے اپنے سامنے دو راستے ہی دیکھے۔ یا گورنمنٹ پر اعتماد اور یا ہندوؤں اور کانگرس کی شرکت"

(مضامین مولانا آزاد حصہ سوم)

آپ نے مسلمانوں کو یہ بھی تاکید فرمائی تھی کہ :-

"نہ تو گورنمنٹ پر بیجا اعتماد کیجیے اور نہ ہندوؤں کے حلقۂ درس میں شریک ہو جیو" (ایضاً)

فرض کیجئے کہ مسلمانوں کی الگ تنظیم کی حامی جماعت میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو جذباتِ حریت سے عاری ہیں تو کیا اس اکثریت کو بہت جلد اور آسانی سے اقلیت میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا؟ حضرات علماء مسلمانوں کو یہ نصیحت کیا کرتے ہیں کہ کانگریس کی اکثریت سے مت خوف کھاؤ۔ بلکہ جوق در جوق اس میں شامل ہو جاؤ۔ اور یوں اپنے عزمِ راسخ اور ہمتِ بلند سے اکثریت پر چھا جاؤ۔ اسی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ کانگریس میں شرکت کے بجائے جسے کبھی خود آپ بھی ضلالت کی راہ بتایا کرتے تھے۔ آپ حضرات جوق در جوق مسلمانوں کے جداگانہ نظامِ اجتماعی میں شریک ہو جائیں اور اپنے جذبۂ حریت و استقلال سے نہ صرف ان کی اصلاح کریں۔ بلکہ ان کی اکثریت کو اقلیت میں بدل دیں۔ یہ اقدام بہر نوع مستحسن ہوگا کیونکہ یہ نظام مسلمانوں کی الگ اجتماعیت اور مرکزیت کا حامی ہے اور اسلامی اصول کی رُو سے یہی مسلک صحیح مسلک ہے۔

بزرگانِ محترم! آپ کے جلسہ کے اعلانات سے ظاہر ہے کہ آپ علماءِ کرام کی جداگانہ جمعیت کو لازمی سمجھتے ہیں اس کے استحکام و تحفظ کے لئے متفکر اور کوشاں ہیں۔ پھر عام مسلمانوں کی جداگانہ جمعیت کے قیام کو آپ کیوں مسلکِ حریت نوازی کے خلاف قرار دیتے ہیں! کیا مسلمانوں کی عدم موجودگی میں علماءِ کرام کی جمعیت کا وجود ایسا ہی نہ ہوگا جیسے بغیر گاڑیوں کا انجن جب گاڑیوں کے متعلق فتویٰ یہ ہو کہ غیر انجنوں سے جڑ جائیں تو اپنے انجن کا استحکام اور اس کی حفاظت کے کیا معنی؟ اگر آپ اجازت دیں تو طبیعت پر جبر کر کے ایک تلخ حقیقت کا بھی اظہار کر دیا جائے۔ طنزاً نہیں بلکہ سچے درد اور حمیت کے ساتھ۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خیرِ امت (بہترین قوم) بنا کر بھیجا ہے وہ امتِ وسطیٰ ہیں ان کے ذمہ دنیا کی امامت کا فریضہ ہے شھداء علی الناس ان کا منصب ہے ظاہر ہے کہ جب افرادِ امت کی یہ پوزیشن ہے تو اس امت کے اربابِ علم و فضل کی حیثیت کو دنیا میں کس درجہ ممتاز اور بلند ہونا چاہیئے۔ کیا کانگریس میں اربابِ علم و فضل کو یہی رتبہ حاصل ہے؟ نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کانگریس میں علماءِ کرام کی حیثیت بالکل مقتدیوں کی سی ہے غور فرمائیے کانگریس کی مجلس عاملہ میں علماء کی کتنی تعداد ہے! اس کے نظام و آئین کی تشکیل و تنسیخ میں علماء کا کتنا حصہ ہے! کانگریس کے مختلف شعبوں میں جو بڑی بڑی سیاسی، معاشی، معاشرتی، اصلاحی اسکیمیں تیار ہوتی رہتی ہیں ان کی تخلیق و تعمیر میں علماء کا کتنا ہاتھ ہوتا ہے۔

ہمارے نزدیک خیرِ اُمّت کے ممتاز طبقہ کے صدرِ محترم کو دنیا کے بلند سے بلند مقام پر ہونا چاہئے اسے ساری دنیا کا امام بننا چاہئے۔

مومنے بالائے ہر بالا ترے غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

کیا اہم سیاسی کانفرنسوں میں آپ کی نمائندگی کو کبھی حقِ امتیاز دیا گیا ہے۔ اگر نہیں اور یہ واقعہ ہے کہ ہمارے علمائے عظام کی حیثیت وہاں امامت و قیادت کی حیثیت نہیں تو پھر آپ ہی انصاف کیجئے کہ اس بے توجہی سے ملّتِ اسلامیہ کا سینہ چھلنی کیوں نہ ہو جائے۔ اسی گری ہوئی حیثیت کا نتیجہ ہے کہ آپ کی جو آواز کانگریس کے پلیٹ فارم سے باہر آتی ہے۔ اس کا اثر ہندو تو ایک طرف خود مسلمانوں پر بھی نہیں ہوتا۔ ۱۹۲۱ء میں جب خلافت کمیٹیوں کے قیام کی تحریک عام تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کس قدر صحیح فرمایا تھا۔

"کانگریس کمیٹیاں کسی شہر یا بستی میں پچاس جلسے منعقد کر کے مسلمانوں سے کہیں کہ چرخہ چلاؤ اور ولایتی کپڑا چھوڑ دو۔ تو وہ اثر پیدا نہیں ہوگا۔ جو خلافت کمیٹی جمعہ کے دن مسجد میں ایک وعظ کرا کے پیدا کر سکتی ہے۔" (مضامین مولانا آزاد ۱۹۲۱ء)

ذرا تصوّر میں لائیے اس حالت کو جب تمام ملّتِ اسلامیہ اجتماعی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہو، آپ جیسے منتخب افرادِ اُمّت پر مشتمل مجلسِ مشاورت ہو ان میں سے اتقیٰ (سب سے زیادہ تقویٰ شعار لہٰذا سب سے زیادہ اکرم) ان کا امیر ہو۔ اُمّت کے تمام امور کے فیصلے مرکز سے ہوتے ہوں، مرکز کی اطاعت بمنزلہ اطاعتِ خدا و رسول ہو، پھر معلوم ہوگا کہ عزت عظمت اور شوکت سب اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لئے ہیں غیروں کے ہاں حقیقی عزت اور اصلی عظمت کہاں۔

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو اپنی فطرت کے تجلّی زار میں آباد ہو

الحاد کی رو

حضرات! غالباً آپ نے اس چیز کو بھی محسوس کیا ہوگا کہ آجکل مسلمانوں کے نوجوان طبقہ میں الحاد و بیدینی کی رَو کس برق رفتاری سے بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ ان میں پیش پیش وہ گروہ ہے جو اپنے آپ کو حریّت پسند اور سوشلسٹ کہتا ہے

یہ طبقہ جنگِ آزادی کی آڑ میں خدا، رسول، شریعت، مذہب، ہر چیز کا (نعوذ باللہ) مذاق اُڑاتا ہے۔ اللہ اور آخرت پر ایمان کو (خاکم بدہن) اساطیر الاولین کہتا ہے۔ مذہبی عقائد کی علانیہ تضحیک اور شعائرِ الٰہی کا بیباکانہ استہزا کرتا ہے۔ اسلامی تہذیب اور تمدن کی ہنسی اڑائی جاتی ہے۔ مذہب کی پابندی کرنے والوں کو حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور انکی تحقیر و تذلیل کی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ علانیہ ہوتا ہے لیکن ان کے جملہ حرکات سے بالعموم مسامحت اور چشم پوشی برتی جاتی ہے کیونکہ وہ مسلکِ قومیت پرستی کے مدعی ہیں جنگِ آزادی کے سپاہی ہیں، میدانِ حرّیت کے غازی ہیں۔ ان ملحدانہ خیالات کے اسباب کچھ ہی ہوں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان خیالات کے اظہار میں اس قدر بے باکی اور جرأت کی بڑی وجہ ان کی قومیت پرستی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قومیت پرستوں کا کیمپ ان کی مدافعت اور حفاظت کا ضامن ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ایک دہریہ، خدا کا منکر، مذہب کا دشمن، تہذیب اسلامی کا مضحکہ اڑانے والا۔ کانگریس کا صدر، یعنی تمام قومیت پرست حضرات کا امیر ہو سکتا ہے تو پھر خدا کا انکار یا مذہب کی مخالفت جرم کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ سنتے ہیں کہ ایک بت پرست بھی جنگِ آزادی میں شریک ہو کر "مجاہد فی سبیل اللہ" کہلایا جا سکتا ہے، تو ان کے نزدیک اسلام کی کوئی ضرورت یا اہمیت ہی نہیں باقی رہتی۔ بالخصوص جبکہ اس فتویٰ کی سند بھی انہیں ایک بہت بڑے عالمِ دین سے، ان الفاظ میں مل جائے کہ

> مسٹر گاندھی نے (جنگِ آزادی) میں اپنی جان اور مال دونوں لٹا دیا پس وہ فی الحقیقت "مجاہد فی سبیل اللہ" ہیں اور بانفسھم و باموالھم[1] کے ہر دو مراحل جہادِ مقدس سے گذر چکے ہیں۔ یہ مسٹر گاندھی (حق و عدالت کا عجیب سپہ سالار ہے۔
>
> (مضامین مولانا آزاد نمبر ۱۹ بحوالہ الداعی بابت شوال ۱۳۵۷ھ صـــ)

کیا یہ سب کچھ اسلام کے مطابق ہو رہا ہے؟ اگر اسلام کے مطابق نہیں تو کیا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی رُو سے اس الحاد و بیباکی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا سب سے مقدم فریضہ نہیں؟ اس کے روکنے کی سب سے عمدہ تدبیر یہی نہیں کہ مسلمانوں کی اجتماعی قوت

---

[1] اپنے جان و مال سے جہاد کرنے والے قرآن کریم نے یہ صفات مومنین مجاہدین کے لیے بتائے ہیں منہ

واقتدار کو مستحکم کیا جائے، تاکہ ہر شخص اس جیتی جاگتی زندہ و درخشندہ قوم سے وابستہ رہنے میں عزت ووقار، سرفرازی وسربلندی محسوس کرے۔ اور اس طرح ان کے معتقداتِ دین اور نظریاتِ حیات کی عظمت نوجوانوں کے دلوں میں قائم ہو جائے۔ موجودہ انتشار و افتراق، تحزب و تشیع، فرقہ بندی اور گروہ سازی کی وجہ سے قوم کی ہوا اکھڑ چکی ہے۔ قوائے عملیہ معطل ہو چکے ہیں۔ یک جہتی و یک نگہی کے فقدان سے فکر و نظر کی قوتیں بیکار ہو گئی ہیں ان کے اعمال کوئی محسوس نتائج نہیں پیدا کرتے۔ قدم بڑھتے ہیں لیکن مسافت طے نہیں ہوتی۔ ہاتھ اٹھتے ہیں لیکن محملِ لیلیٰ تک رسائی نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ جب قوم کی حالت یہ ہو جائے تو اس کی کوئی چیز وجۂ جاذبیت نہیں ہو سکتی۔ "اپنے" اس سے اس لئے بیگانے ہو جاتے ہیں، کہ وہ اس کے اندر کوئی کشش نہیں پاتے اور اغیار بیگانے اسے عزت کی نگاہ سے اس لئے نہیں دیکھتے کہ من حیث القوم اس کی کوئی محکم اور پائیدار ہستی ان کے سامنے نہیں ہوتی۔ لہٰذا ایسی قوم ازیں سو راندہ و آں سو درماندہ، ریگ کے منتشر ذروں کی طرح ہوا کے ہر تیز جھونکے کے ساتھ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر اڑتی پھرتی ہے۔ حضرات والا تبار! اٹھئے اور ریت کے ان بکھرے ہوئے ذروں کو سمیٹ کر ایک چٹان میں منتقل کر دیجئے تاکہ حوادثِ زمانہ کی اگر بڑی سے بڑی موج بھی اٹھے تو سر ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے۔

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی   مزی چو خس کہ ہوا تند و شعلہ بیباک است

آخری گذارش

حضرات! اس قدر کھلی کھلی باتیں کرنے کی جرأت کے لئے ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں۔ یہ جرأت محض اس بنا پر ہے کہ وقت بہت نازک اور خطرات بہت قریب ہیں کشتی قعرِ دریا میں ہے اور بہت سے خائن ہاتھ اس کے تختوں میں سوراخ کرنے میں مصروف ہیں۔ ایسے وقت میں اگر مسامحانہ اخلاق اور مداہنت و چشم پوشی سے کام لیا گیا تو انجام تباہی ہے۔ اس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ روایتی پابندیوں اور رسمی تکلفات سے قطع نظر حق و صداقت کی جو راہ کتاب و سنت

نے ہمیں دکھائی ہے، اس کی طرف واضح الفاظ میں اشارہ کر دیں ان حقائق کو جو گذشتہ صفحات میں پیش خدمت کیے گئے ہیں، طلوعِ اسلام کے اوراق میں بار بار دُھرایا جا چکا ہے۔ اور اپنے مسلک کے پیشِ نظر ہر دعویٰ کی دلیل کتاب وسنت سے پیش کی گئی ہے۔ اس وقت ان دلائل کا اعادہ ضروری نہیں سمجھا گیا۔ کیونکہ کتاب وسنت کی نصوص خود آپ حضرات کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔

ہندوستان کی موجودہ سیاست میں مسلمانوں کے متعلق جو کچھ کتاب وسنت کی روشنی میں ہم سمجھ سکے ہیں وہ یہ ہے کہ۔

(۱) کفر و ایمان کے معیارِ تقسیم کے مطابق مسلمان ایک الگ مستقل بالذات قوم ہیں۔ اس لئے وہ غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک متحدہ قومیت کی تشکیل نہیں کر سکتے۔

(۲) مسلمانوں کی موجودہ تباہی اور بربادی ان کی لامرکزیت کی وجہ سے ہے اس لئے ہنگامی جوش وخروش اور ہمسایہ قوم کی مناسبت سے قطع نظر مقدم یہ ہے کہ انہیں اجتماعی زندگی کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا جائے اور جماعت کا مرکز قائم کرنے کی کوشش کی جائے، کیونکہ جماعت کی اطاعت اور امارت ہی میں اسلامی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔

(۳) قیامِ جماعت اور امارت کے ساتھ باہمی معاملات کے تصفیہ کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دو قوموں کی حیثیت سے باہمی معاہدہ کیا جائے اور متحدہ قومیت کے غیر اسلامی نظریہ کی بجائے اتحادِ بین الاقوام کا صحیح مسلک اختیار کیا جائے۔

(۴) اس قسم کے معاہدہ کی رُو سے یہ دونوں قومیں حصولِ آزادی کے مشترک مقصد کے لئے متحدہ محاذ قائم کریں۔

(۵) مسلمانوں کے لئے آزادی کا مفہوم قیامِ حکومتِ الٰہی ہے جو اس مقصد

کے حصول میں حائل ہوگا۔ وہ ان کا دشمن ہے۔

ہمیں امید ہے کہ آپ حضرات ان اصولوں سے متفق ہوں گے یہ اصول نئی چیز نہیں ہیں بلکہ وہی اصول ہیں جسے آپ نے اپنے ۱۹۲۶ء کے اجلاس کلکتہ میں ایک ریزولیشن میں بدیں الفاظ تسلیم کیا تھا۔

"چونکہ برادرانِ وطن کے مخالفانہ طرزِ عمل سے منافرت کی خلیج وسیع ہو رہی ہے۔ اس لئے مسلمان اپنی تنظیم کرکے اپنے بل پر ملک کو آزاد کرائیں۔ البتہ جو غیر مسلم حضرات اس بارہ میں اتحادِ عمل کرنا چاہیں ان کے ساتھ اشتراکِ عمل کیا جائے۔"

۱۹۲۶ء سے منافرت کی یہ خلیج برابر وسیع سے وسیع تر ہو رہی ہے اور ایسا ہونا عین ارشاد خداوندی کے مطابق ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًاؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْۚ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُؕ قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ۝ هٰۤاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا یُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَیْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَیْظِكُمْؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۝ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ٘ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَیِّئَةٌ یَّفْرَحُوْا بِهَاؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّكُمْ كَیْدُهُمْ شَیْـًٔاؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ۝ (سورہ آلِ عمران)

"اے ایمان والو! اپنوں کے سوا کسی دوسرے کو اپنا ولی دوست رازدار (معتمد) نہ بناؤ۔ وہ تمہاری تباہی میں کوئی کمی کرنے والے نہیں جس بات سے تمہیں نقصان پہنچے انہیں وہ اچھی لگتی ہے۔ ان کی دشمنی تو ان کی باتوں سے ہی ظاہر ہے۔ لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا ہے وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو ہم نے (فہم و بصیرت کی) نشانیاں تم پر واضح کردیں۔ دیکھو! تمہارا حال تو یہ ہے کہ تم انسے دوستی رکھتے ہو مگر وہ تمہیں (ایک لمحہ کے لئے بھی) دوست نہیں رکھتے۔ تم اللہ کی کتاب پر ایمان رکھنے والے ہو

جتنی کتابیں بھی نازل ہوئی ہیں۔ (لیکن) وہ جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان والے ہیں۔ لیکن جب اکیلے ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف جوشِ غضب میں اپنی بوٹیاں نوچنے لگتے ہیں۔ (غور کرو ایسے لوگوں کو اپنا ہمراز بنانا اور قوم کے بھیدوں اور تدبیروں سے آگاہ کردینا کیونکر جائز ہوسکتا ہے) تم ان سے کہدو کہ (جاؤ) اور جوشِ غضب میں اپنے آپ کو ہلاک کرڈالو۔ اللہ وہ سب کچھ جانتا ہے جو انسان کے سینہ میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اگر تمہارے لئے کوئی بہتری کی صورت ہوجائے تو وہ انہیں بُری لگتی ہے اور اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچے تو وہ بڑے ہی خوش ہوتے ہیں۔ (چنانچہ وہ تمہیں نقصان پہنچانے کی تدبیروں میں برابر لگے رہتے ہیں[1]) لیکن یاد رکھو اگر تم مصائب و مشکلات میں ثابت قدم رہے اور تقوے کی راہ اختیار کی تو ان کا مکر و فریب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا جیسے کچھ بھی ان کے کرتوت ہیں خدا کی قدرت انہیں گھیرے ہوئے ہے۔"

ہماری درخواست ہے کہ آپ اپنے مسلک کا اعلان واضح اور غیر مبہم الفاظ میں فرما کر ملّتِ اسلامیہ کے سامنے صحیح راہِ عمل پیش کریں۔ ہمیں یقینِ واثق ہے کہ آپ کا اعلان ہماری گذارشات کے پیشِ نظر جو مذکورہ بالا آیاتِ مقدسہ اور آپ کے ۱۹۲۶ء کے ریزولیوشن کے عین مطابق ہیں، ہمارے بیان کردہ اصولوں پر مشتمل ہوگا۔ لیکن اگر خدانخواستہ آپکو ان اصولوں سے اختلاف ہو تو ہماری مؤدبانہ استدعا ہے کہ آپ وجہ اختلاف کو کتاب و سنّت کی روشنی میں ملّت پر واضح کرنے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔

---

[1] تشریحی اضافہ از مولانا ابوالکلام آزاد۔ منہ

طلوعِ اسلام مارچ ۱۹۳۹ء محرم ۱۳۵۸ھ

خطبۂ صدارت سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ الہ آباد ۱۹۳۰ء

(حکیم الامت حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ)

حضرت علامہ کا اصل خطبہ انگریزی میں ہے۔ جن حضرات نے آپؒ کی انگریزی تحریر دیکھی ہے وہ ہم سے متفق ہونگے کہ اسکا اُردو میں ترجمہ کس قدر مشکل ہوتا ہے، بالخصوص اسوقت جبکہ لفظی التزام بھی پیشِ نظر ہو۔ اس ترجمہ میں الفاظ سے زیادہ مفہوم کی ادائیگی کو سامنے رکھا گیا ہے۔ اور وہ بھی اپنی استعداد کے مطابق، اسلیئے ہوسکتا ہے کہ کہیں ہم مفہوم کے سمجھنے اور اسکے صحیح طور پر ادا کرنے میں غلطی کر گئے ہوں۔ جسکے لیئے ہم بدل معذرت خواہ ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

حضرات! میں آپکا بے انتہا شکرگزار ہوں کہ آپ نے ایک ایسے وقت میں جو مسلمانانِ ہند کے سیاسی خیالات و اعمال کی تاریخ میں نہایت نازک ہے مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کا اعزاز بخشا ہے۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ اس عظیم الشان اجتماع میں بعض ایسے حضرات موجود ہیں جنکا موجودہ سیاسی تجربہ میری نسبت بہت زیادہ وسیع ہے اور امورِ مہمہ کے متعلق جنکی معلومات کی میرے دل میں بے انتہا وقعت ہے اسلیئے اگر میں ان سیاسی امور میں جنکے تصفیہ کے لیئے یہ حضرات آج اس جگہ جمع ہوئے ہیں اُنکی رہنمائی کا دعویٰ کروں تو یہ دعویٰ بالکل بیجا ہوگا میں کسی جماعت کا لیڈر نہیں اور کسی لیڈر کا پیرو نہیں۔ میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اسلام اور اسکی شریعت اُس کی سیاست تمدن۔ اُس کی ثقافت (کلچر) اسکی تاریخ اور اسکے ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس روحِ اسلامی کے ساتھ جو مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بے نقاب ہوتی جاتی ہے۔ میری مستقل وابستگی نے مجھے ایک ایسی فراست عطا کردی ہے جس کی روشنی میں مَیں اس عظیم الشان اہمیت کا اندازہ کرسکتا ہوں جو اسلام کو

طلوعِ اسلام محرم ۱۳۵۸ھ

ایک عالمگیر حقیقتِ ثابتہ کی حیثیت سے حاصل ہے چونکہ اس امر کے فرض کر لینے میں مجھے کوئی تامّل نہیں کہ مسلمانانِ ہند اس روحِ اسلامی سے عہدِ وفا باندھ چکے ہیں اسلیئے میرا منشا یہ نہیں کہ میں آپ کے فیصلوں میں آپکی رہنمائی کی جرأت کروں، بلکہ مقصد صرف اتنا ہے کہ اس فراست کی روشنی میں جو مجھے حاصل ہے آپ کو اس اصل اساس کا صحیح اور واضح احساس کرادوں جو ان فیصلوں کی عمومی تشکیل کر سکے۔

اسلام اور قومیت Nationalism

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام جو ایک اخلاقی نصب العین اور ایک خاص قسم کی سیاستِ مدن کا مجموعہ ہے (اس سے میری مراد ایک ایسے معاشرتی نظام سے ہے جو ایک خاص ضابطۂ قوانین کے ماتحت ہو اور جس میں ایک مخصوص اخلاقی تخیّل کی روح کارفرما ہو)۔ مسلمانانِ ہند کی تاریخِ حیات میں سب سے بڑا جزوِ ترکیبی رہا ہے اسنے وہ اساسی جذبات اور باہمی کشش کے سامان مہیا کئے ہیں جو منتشر افراد اور مختلف گروہوں کو بتدریج متحد کر کے بالآخر انہیں ایک متمیز اور معین قوم کی صورت میں منظم کر دیتے ہیں جو اپنا مخصوص اخلاقی شعور رکھتی ہے، درحقیقت یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان ہی وہ ملک ہے جس میں اسلام کا وہ شعبہ جو قوموں کی تعمیر سے متعلق ہے اپنی پوری آب و تاب سے کارفرما ہوا ہے، دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی اسلام کے نظامِ ترکیبی نے سوسائٹی کی جو صورت اختیار کی ہے وہ صرف اس امر کی رہینِ منت ہے کہ اسلام ایک ایسے کلچر کی حیثیت سے عمل پیرا ہوا ہے، جس کا محرّک ایک مخصوص اخلاقی تخیل ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ مسلم سوسائٹی نے اپنی نمایاں ہم آہنگی اور قلبی یک جہتی کے ساتھ جو موجودہ شکل اختیار کی ہے وہ ان آئین و قوانین کے قالب میں ڈھل کر تیار ہوئی ہے۔ جنکا اسلامی کلچر کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ لیکن وہ خیالات جو مفکرینِ یورپ نے دنیائے سیاست میں پھیلا دیئے ہیں وہ ہندی و غیر ہندی مسلمانوں کی موجودہ نسل کے مطمحِ نگاہ کو نہایت تیزی کے ساتھ بدلتے جا رہے ہیں، ہمارے نوجوان ان خیالات سے متاثر ہو کر اس امر کے لیے مضطرب ہو رہے

ہیں کہ اپنے اپنے ملکوں میں ان خیالات کو عمل میں لے آئیں۔ وہ ان حقائق پر کبھی تنقیدی نگاہ نہیں ڈالتے۔ جو یورپ میں ان خیالات کے ارتقا کا باعث ہوئے ہیں۔ یورپ میں مسیحیت صرف تارک الدنیا اشخاص کا ایک نظام سمجھا جاتا تھا جسنے رفتہ رفتہ ایک وسیع نظام کلیسائی کی صورت اختیار کرلی۔ لوتھر نے جو صدائے احتجاج بلند کی تھی وہ اِس کلیسائی نظام کے خلاف تھی نہ کہ دُنیائے معاملات کے کسی نظام مدنیّت کے خلاف۔ اسلئے کہ عیسائیّت کو تو کسی ایسے سیاسی نظام سے تعلق ہی نہیں، بلاشبہ لوتھر اس نظام کے خلاف بغاوت کرنے میں بالکل حق بجانب تھا۔ مگر میرے نزدیک اُسنے اس امر کا احساس نہ کیا تھا کہ یورپ کے مخصوص حالات میں اس بغاوت کا نتیجہ بالآخر یہ ہوگا کہ حضرت مسیحؑ کا عالمگیر نظامِ اخلاق کا ملّا تہ وبالا ہوجائے گا۔ اور بے شمار قومی اور محدود نظام ہائے اخلاق اسکی جگہ لے لیں گے۔ مُدعا لوتھر جیسے آدمیوں کی اس قسم کی تحریکوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک وحدت ٹوٹ کر ایسی کثرت میں تبدیل ہوگئی جسکے مختلف اجزاء میں کوئی باہمی ہم آہنگی نہ تھی اور انسانیّت کا ایک ہمہ گیر تصوّر قومیّت کے تنگ دائرہ میں گھر کے رہ گیا۔ قومیّت کا یہ تصوّر کسی محسوس بُنیاد۔ مثلاً عقیدۂ وطنیت پر ہی قائم ہوسکتا تھا اور اِسکا اظہار ایسے مختلف نظام ہائے سیاست کے ذریعہ سے ہی ممکن تھا جو قومی خطوط پر نشو و ارتقاء حاصل کرسکتے ہوں وہ خطوط جو صرف اِس اُصول کو ہی تسلیم کریں کہ سیاسی اتحاد کی بُنیاد جغرافیائی حدود پر ہی قائم ہوسکتی ہے۔ اگر مذہب کے متعلق عقیدہ ہی یہ ٹھہرے کہ اِسکا تعلق کاملاً اگلے جہاں سے ہے تو مسیحیّت کا جو حشر یورپ میں ہوا وہ بالکل لازمی تھا، حضرت مسیحؑ کے عالمگیر اُصولِ اخلاق کی جگہ قومیّت کے نظریۂ اخلاق و سیاست نے لے لی۔ اس تخریب و تعمیر اور ردّ و بدل کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ یہ سمجھ بیٹھا کہ مذہب ہر فرد کا نجی مُعاملہ ہے، اور انسان کی دُنیاوی زندگی سے اسکا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اسلام، وحدتِ انسانی کو رُوح اور مادہ کے دو الگ الگ شعبوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ اسلام میں خدا اور کائنات، روح اور مادہ، مذہب اور سیاست میں ناخن اور گوشت کا سا باہمی تعلق ہے اسکے نزدیک انسان کسی ایسی ناپاک دُنیا کا باشندہ نہیں

جسے کسی ایسی مقدّس دُنیا کے حصُول کی خاطر تیاگ دینا پڑے جو اِس دُنیا سے الگ کہیں اور واقع ہو۔ اسلام کے نزدیک مادہ رُوح کی اس صورت کا نام ہے جو زمان و مکان کے لباسِ مجاز میں جلوہ فرما ہے[1]۔ یوُرپ نے غالبًا مانی کے عقیدے سے رُوح و مادہ کی ثنویت (Duality) کا خیال اخذ کیا۔ اور بلا تنقید اُسے قبول کر لیا۔ آج یوُرپ کے بہترین مفکّر تو اپنی اس ابتدائی غلطی کو محسوس کر رہے ہیں لیکن اُسکے سیاسی مدبّر غیر محسوس طور پر دُنیا کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ اندھا دُھند اس غلطی کو ایک ایسے عقیدہ کی حیثیت سے قبول کر لے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ روح اور مادہ کی یہی وہ غلط تفریق ہے جو یوُرپ کے مذہبی اور سیاسی افکار پر اس بُری طرح سے اثر انداز ہوئی ہے کہ اُسنے یوُرپ کے نظامِ حکومت سے مسیحیت کو قریب قریب بالکل خارج کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے یوُرپ ایسی بے جوڑ سلطنتوں کا مجموعہ بنکے رہ گیا ہے جنکے سَر میں انسانیت کا سودا نہیں، بلکہ اُسپر قومیت کا بھوت سوار ہے۔ یہ بے جوڑ اَنمل سلطنتیں عیسائیت کے اخلاقی اور مذہبی معتقدات کو پامال کرنے کے بعد اب ایک متحدہ یوُرپ کی ضرورت کا احساس کر رہی ہیں۔ یعنی پھر اسی وحدت کا احساس جسے مسیحی کلیسا کے نظام نے ابتدا میں اُن کو دیا تھا لیکن اُنہوں نے بجائے اِسکے کہ حضرت مسیحؑ کے عالمگیر اخوتِ انسانی کے تصوّر کی روشنی میں اسکی تشکیل کرتے لوتھر کی تعلیم سے متأثر ہو کر تباہ و برباد کر ڈالا۔ دُنیائے اسلام میں کسی لوتھر کا تصوّر ہی ممکن نہیں۔ کیونکہ اسلام میں یورپ کے ازمنہ متوسط جیسا کوئی کلیسائی نظام ہی موجود نہیں جو اپنے کسی تباہ کرنے والے کو بلا رہا ہو۔ دُنیائے اسلام میں ہمارے پاس ایک عالمگیر نظامِ سیاست موجود ہے۔ بنیادی اُصولوں کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ اُنکا سرچشمہ علمِ الٰہی ہے، ان بنیادوں پر جو عمارت قائم ہے، وہ البتہ ضروریاتِ زمانہ کے اقتضا کے مطابق ایک نئی رُوح کی محتاج ہے اور اس احتیاج کی وجہ یہ ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے فقہا اور واضعین قوانین، دُنیائے جدید کے داعیات سے متمسک نہیں ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ دُنیائے اسلام میں قومیت کے اس تصوّر کا انجام کیا ہوگا۔ یہ پیشین گوئی کرنا مشکل ہے کہ آیا اسلام اسکو اپنے اندر جذب کر کے اِسکی ترکیب کو بدل دیگا۔ جیسا کہ یہ اس سے قبل بہت سے مختلف النوع خیالات کو اپنے اندر جذب کر کے ان کی نوعیّت کو بدل چکا ہے یا خود اسلام

[1] To Islam matter is spirit realising itself in space and time.

طلوعِ اسلام محرم ۱۳۵۰ھ

اس نظریہ کی قوت سے متاثر ہو کر اپنے نظام کو یکسر تبدیل کرے گا۔ حال ہی میں مجھے لیڈن یونیورسٹی (ہالینڈ) کے پروفیسر ویِن سِنک (Wen Sinok) نے لکھا تھا کہ:-

"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اسوقت اُسی نازک دَور میں داخل ہو رہا ہے جو مسیحیت پر ایک صدی سے بھی زیادہ مدت سے طاری ہے، سب سے مشکل مسئلہ یہ ہے کہ وہ کونسا طریقِ عمل اختیار کیا جائے جس سے قدیم دقیانوسی غلط تصوّرات کی عمارت تو منہدم ہو جائے لیکن مذہب کی بُنیادیں محفوظ رہیں۔ میرے لیئے تو یہ بھی ممکن نہیں کہ میں بتا سکوں کہ اس بحران میں مسیحیت کا انجام کیا ہوگا، چہ جائیکہ میں یہ کہہ سکوں کہ اسلام پر اسکا کیا اثر ہوگا۔"

اور موجودہ دَور میں تو ہو یہ رہا ہے کہ قومیت کا تصور مسلمانوں کے مطمحِ نگاہ میں نسل پرستی کا جذبہ اُبھار رہا ہے۔ جو اُن مساعیٔ حسنہ کو غارت کر رہا ہے جنہیں شرفِ انسانیت کی خاطر اسلام نے سرانجام دیا تھا۔ اور نسل پرستی کے اِس شعور کا مطلب یہ ہے کہ نظامِ حیات کے متعلق ایسے نظریّے اور معیار قائم ہو جائیں جو نہ صرف اسلامی نظریاتِ زندگی سے مختلف ہوں بلکہ اُن سے متصادم ہو جائیں مجھے اُمید ہے کہ آپ حضرات مجھے اِس بظاہر علمی بحث Academic discussion سے معذور سمجھیں گے۔ آپ حضرات نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لیئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے، اور اپنے اِس عقیدہ میں مایوسی کا کوئی شائبہ نہیں پاتا کہ اسلام ایک زندہ اور پائندہ قوت ہے جو نگہِ انسانی کو جغرافیائی حدود و قیود کے قفس سے آزاد کرکے اسکی فطری وسعتوں میں اذنِ بال کشائی دیگا۔ جسکا عقیدہ ہے کہ مذہب انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم ترین طاقت کا حامل ہے اور جسکا محکم یقین ہے کہ اسلام خود تقدیرِ الٰہی ہے۔ زمانہ کی تقدیریں اسکے ہاتھ میں رہیں گی اور اسکی تقدیر کسی کے ہاتھ میں نہ ہوگی۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ تمام مسائل کو اپنے خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھے۔ یہ ہرگز خیال نہ فرمایئے کہ جس مسئلہ کی طرف مَیں اشارہ کر رہا ہوں وہ خالص نظری مسئلہ ہے۔ نہیں، یہ تو ایک زندہ اور عملی مسئلہ

ہے جو خود نفس اسلام پر بحیثیت ایک نظام حیات و عمل کے اثر انداز ہوگا۔ اس مسئلہ کے صحیح اور مناسب حل پر ہی اس امر کا انحصار ہے کہ آپ حضرات ہندوستان میں ایک ممتاز تہذیب کے علمبرداروں کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں، ہماری تاریخ میں اسلام پر کبھی ابتلا و آزمائش کا ایسا زمانہ نہیں آیا جیسا آجکل اسے درپیش ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر ایک قوم اس بات کا مختار ہے کہ اپنے اپنے معاشرتی نظام کے اصول اساسی میں ترمیم، تاویل یا تنسیخ کرلے لیکن ایک تازہ تجربہ کرنے سے پہلے اسکے لیے قطعاً ضروری ہے کہ اپنے اس تجربہ کے نتائج و عواقب پر واضح انداز سے غور و خوض کرلے۔ اس اہم مسئلہ کو جس پہلو سے میں دیکھ رہا ہوں۔ اس سے کسی شخص کو یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ میں اُن حضرات سے جو مجھ سے اختلاف رکھتے ہیں، آمادۂ پیکار رہوں۔ یہ مسلمانوں کا اجتماع ہے اور مجھے یقین ہے کہ اسکے افراد اسلام کی رُوح اور اُسکے نصب العین سے قلبی تعلق کو جزو ایمان سمجھتے ہیں۔ اس لیے میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ موجودہ صورتِ حالات کے متعلق جس چیز کو میں نیک نیتی کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں اُس کو کھلے کھلے الفاظ میں بیان کردوں۔ صرف یہی وہ طریق عمل ہے جس کی رُو سے میرے لیئے ممکن ہے کہ میں اپنی بصیرت کی روشنی میں آپ حضرات کے سیاسی مسلک کو واضح کرسکوں۔

قومیتِ ہند کی وحدانیّت

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ مسئلہ کیا ہے اور اسکے مالہٗ وماعلیہ کیا ہیں؟ کیا مذہب سچ مچ ایک نجی معاملہ ہے؟ کیا آپ اس امر کو پسند فرمائیں گے کہ بہ حیثیت ایک اخلاقی اور سیاسی نظریہ کے اسلام کا بھی دنیائے اسلام میں وہی حشر ہو جو اس سے پہلے عیسائیت کا یورپ میں ہوچکا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے، کہ ہم اسلام کو ایک اخلاقی نظریہ کی حیثیت سے تو باقی رکھیں، لیکن ایک نظام سیاست کی حیثیت سے اسکو رد کرکے اسکی جگہ وہ قومی (National) نظام ہائے سیاست اختیار کرلیں جن میں مذہب کو کسی قسم کی دخل دہی کی اجازت نہ ہو؟ یہ سوال ہندوستان میں ایک خاص اہمیت اختیار کرلیتا ہے، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ ایک یوروپین کی زبان سے

طلوعِ اسلام — محرم ۱۳۵۸ھ

تعجب انگیز نہیں کہ مذہب ایک نجی اور انفرادی چیز ہے۔ یورپ میں عیسائیت کا تصور ایک کیشِ رہبانیت کی حیثیت رکھتا تھا، جس کا مقصد یہ تھا کہ مادی دُنیا کو ترک کر کے تمام توجہات صرف رُوحانی دنیا پر مرکوز کر دی جائیں، اس کیش کا منطقی نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا، جو مذکورہ بالا دعوٰی میں بیان کیا گیا ہے (یعنی یہ کہ مذہب ایک نجی معاملہ ہے)۔ لیکن نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے واردات وکیفیاتِ رُوحانی (Religioue experiences) کی جو نوعیت قرآنِ مجید سے ظاہر ہوتی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ کیفیّات وواردات اس نوعیت کے نہیں ہوتے کہ وہ محض شخصِ متعلّقہ کے قلب میں پیدا ہو کر صرف اسی پر اثر انداز ہوں اور اس کا معاشرتی ماحول ان سے کچھ بھی متاثّر نہ ہو۔ یہ ایسی کیفیّات ہیں کہ ان کا مہبط تو قلبِ انسانی ہو۔ لیکن اُن سے ایک پورا معاشرتی نظام وجود میں آجائے۔ ان کیفیات کا فوری ماحصل یہ ہوتا ہے کہ اُن سے ایک خاص نظامِ تمدّن کے اصولِ اساسی مرتّب ہو جاتے ہیں جو آئینی تصوّرات (قوانین وضوابط) کا ایک جہانِ خاموش اپنے آغوش میں لئے ہوتے ہیں اور جن کی تہذیبی اہمیت محض اس لئے کم نہیں ہوسکتی کہ ان کا ماخذ وحیِ الٰہی ہے اس سے ظاہر ہے کہ اسلام میں مذہب اور اس کے پیدا کردہ معاشرتی نظام میں کچھ ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ اگر ایک کو ردّ کر دیا جائے تو دوسرا خود بخود ردّ ہو جاتا ہے۔ بنابریں قومیّت کے خطوط پر کسی ایسے نظامِ تمدّن کی تعمیر جو وحدتِ اسلامی کے اصول سے متصادم ہوتا ہو، مسلمان کے تو وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو اس وقت براہِ راست مسلمانانِ ہند کو درپیش ہے۔ رینان لکھتا ہے کہ "انسان تو اس کی نسل اور مذہب کا غلام بنایا جاسکتا ہے۔ اور نہ ہی دریاؤں پہاڑوں کی حدود بندیاں اسے مقید کر سکتی ہیں۔ بلکہ صحیح الدّماغ اور گرم جوش دل رکھنے والے انسانوں کی عظیم الشّان اجتماعیت ایک اخلاقی شعور پیدا کر دیتی ہے جسے "قوم" کہتے ہیں۔ اس قسم کی جماعتی ترکیب ناممکن نہیں۔ اگرچہ اس کے لئے ایک طول طویل اور زہرہ گداز مرحلہ طے کرنا پڑے گا جس میں یوں کہیئے کہ انسانوں کو نئے قالب میں ڈھالنا اور انہیں تازہ جذبات سے مسلح کرنا ہوگا۔ اگر ہندوستان میں کبیر کی تعلیم اور شہنشاہِ اکبر کا دینِ الٰہی عوام کی ذہنیت پر غالب آجاتا تو اس قسم کی قومیت اس ملک میں بھی قائم ہو جاتی۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ ہندوستان کی مختلف ذاتوں اور اس کے مختلف مذہبی گروہوں میں

طلوعِ اسلام محرم ۱۳۵۶ھ

یہ رجحان کبھی پیدا نہیں ہوا کہ اپنی اپنی انفرادی جزئیات کو ایک عظیم الشان "کل" میں فنا کر دیں۔ (اور یوں قطرات سمندر میں مل کر سمندر بن جائیں)۔ ہر گروہ اپنی جماعتی ہستی قائم رکھنے کے لئے بضد ہے۔ اس قسم کے اخلاقی شعور کا پیدا ہونا جو رینان کے نظریۂ قومیت کا اصل اصول ہے اتنی بڑی قیمت کا مطالبہ کرتا ہے کہ اقوامِ ہند اسے ادا کرنے کے لئے بالکل آمادہ نہیں ہیں۔ لہٰذا ہندوستان میں اتحادِ قومی یہاں کی مختلف اقوام کے جداگانہ وجود کے انکار میں نہیں بلکہ ان سب کے تعاون اور ہم آہنگی میں تلاش کرنا چاہیئے۔ صحیح تدبر کا تقاضا یہ ہے کہ حقائق خواہ کتنے ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہوں۔ ان سے چشم پوشی نہ کی جائے حصولِ مقصد کا عملی طریق یہ نہیں۔ کہ جس صورتِ حالات کا وجود ہی نہ ہو اسے خواہ مخواہ موجود فرض کر لیا جائے بلکہ یہ کہ حقائق جس انداز میں ہیں ان کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے حتیٰ الوسع بہترین استفادہ کیا جائے۔ ہندوستان اور ایشیا کی تقدیر حقیقتاً اسی بات پر منحصر ہے کہ ہندوستان میں اتحادِ قومی کو ان ہی راستوں سے تلاش کیا جائے۔ ہندوستان بجائے خویش ایک چھوٹا سا "ایشیا" ہے۔ اس کے باشندوں کے ایک حصہ کا کلچر اقوامِ مشرق کے کلچر سے ہم آہنگ ہے۔ اور دوسرے حصہ کا کلچر وسطی اور مغربی ایشیا کی اقوام کے کلچر کے ساتھ اگر ہندوستان میں باہمی اشتراکِ عمل کا کوئی موثر اصول دریافت کر لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس قدیم سرزمین میں جو اپنے باشندوں کی کسی فطری ناقابلیت کی وجہ سے نہیں بلکہ زیادہ تر اکثر تاریخ میں اپنے محلِ وقوع کی وجہ سے مدتِ دراز تک مصیبت و ابتلا کی آماجگاہ رہی ہے۔ امن و امان اور مصالحت باہمی کی خوشگوار ہوائیں چلنے لگیں گی اور اس کے ساتھ ہی ایشیا بھر کی تمام سیاسی گتھیاں بھی سلجھ جائیں گی۔

لیکن اس تلخ حقیقت کے بیان کرنے سے صدمہ ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے ملک کی اندرونی یکجہتی کے لئے اس قسم کے اصول دریافت کرنے میں جتنی کوششیں کیں وہ اب تک بالکل ناکام رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ کوششیں کیوں ناکام رہی ہیں؟ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ایک دوسرے کی نیتوں کو شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور دل میں یہ آرزوئیں چھپی ہوئی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح فریقِ مقابل پر تغلب و تسلط حاصل کر لیا جائے۔ یا اس کی یہ وجہ ہے کہ باہمی

اشتراکِ عمل کے بلند مقاصد تباہ ہوتے ہوں تو ہوں لیکن وہ استمراری اجارہ داری ہاتھ سے نہ جانے پائے جو اتفاقات زمانہ سے ایک فریق کے قبضہ میں آچکی ہے۔ حالت یہ ہے کہ دماغ میں اَنَا الْمَوْجُوْدُ لَا غَیْرِیْ کا سودا سما رہا ہے۔ لیکن ان جذبات کو قومیت پرستی کے مقدس چولے میں چھپایا جاتا ہے۔ "بلند آہنگ دعاوی کو دیکھو تو حبّ الوطنی کی وسعت قلبی کے مظاہرے ہو رہے ہیں۔ لیکن دل کی گہرائیوں میں اتر کر جائزہ لو تو وہاں "ذات اور قبیلہ" کی وہی پرانی تنگ نظری جلوہ فرما ہے۔ ہاں! اور اس کا یہ بھی باعث ہو سکتا ہے کہ ہم حقیقت کے تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ اس ملک میں ہر ایک جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تمدنی روایات کے مطابق آزادانہ طور پر اپنی اجتماعی نشوونما کر سکے۔ بہرحال ہماری ناکامی کے وجوہ کچھ بھی ہوں میں اب تک مایوس نہیں ہوں۔ واقعات کی رفتار ایک اندرونی یکجہتی کے میلان کا پتہ دیتی ہے اگر اس اصول کو ایک مستقل فرقہ وارانہ تصفیہ کا سنگِ بنیاد تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانوں کو اپنے اس وطنِ عزیز میں اس امر کی مکمل آزادی حاصل ہو گی۔ کہ وہ اپنے کلچر اور روایات کی بنا پر اپنی نشوونما کر سکتے ہیں تو جہاں تک میں نے مسلم ذہنیت کا مطالعہ کیا ہے میں بلا تامل اعلان کرتا ہوں کہ اس اصول کے تسلیم کر لینے کے بعد مسلمانِ ہندوستان کی آزادی کے حصول کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر بالکل آمادہ ہو گا۔ واضح رہے کہ یہ اصول کہ ہر جماعت کو اپنی اپنی مخصوص بنیادوں پر آزادانہ نشوونما و ارتقاء کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ کسی تنگ نظرانہ فرقہ پرستی کے جذبہ پر مبنی نہیں ہے۔ فرقہ پرستی بھی کئی قسم کی ہے اور اس کے اقسام میں بیّن فرق پایا جاتا ہے۔ جو قوم دوسری قوموں کے متعلق اپنے دل میں بدخواہی کے جذبات کی پرورش کرتی ہے۔ وہ نہایت پست فطرت اور رذیل قوم ہے۔ میرے دل میں دوسری قوموں کے رسوم و شعائر، قوانین و ضوابط، مذہبی و معاشرتی ادارات کا بیحد احترام ہے۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھئے۔ قرآنِ کریم کی تعلیم کے مطابق تو مجھ پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو میں دوسری قوموں کے معابد کی حفاظت بھی کروں۔ بایں ہمہ مجھے اس ملت سے عشق ہے جو میری زندگی کی طبعی اُفتاد کا سرچشمہ ہے اور جس نے اپنے مذہب

اپنے لٹریچر۔ اپنی حکمت اور اپنے کلچر کی تجلیات سے اقبال کو اقبال بنا دیا ہے۔ اور یوں اپنے درخشندہ ماضی کو ایک جیتے جاگتے زندگی بخش عنصر کی صورت میں میرے حال میں سمو دیا ہے۔ ملت پرستی کے اس بلند ترین پہلو کی قدر و قیمت کو تو نہرو رپورٹ کے واضعین تک نے بھی تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ علیحدگیٔ سندھ کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

> "یہ کہنا کہ فرقہ وار صوبوں کا وجود میں لانا قومیت پرستی کے وسیع نظریہ کے منافی ہوگا، ایسا ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ دنیا میں الگ الگ فرقوں کی ہستی بین الاقوامیت کے وسیع ترین تصوّر کے منافی ہے۔ ان دونوں بیانات میں ایک حد تک صداقت موجود ہے۔ لیکن بین الاقوامی نصب العین کا سرگرم سے سرگرم حامی بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ بین الاقوامی نظامِ حکومت اس وقت تک ناممکن بلکہ محال ہے جب تک ہر قوم مکمل طور پر خود مختار نہ ہو اسی طرح جب تک مختلف فرقے اس باب میں بالکل آزاد نہ ہوں کہ وہ اپنی تہذیب و تمدن (کلچر) کی بنیادوں پر اپنے نظامِ زندگی کی تشکیل کر سکیں۔ ایک ہم آہنگ قوم کا وجود عمل میں نہیں آسکتا اور یہ کسے یاد نہیں کہ جب فرقہ پرستی کسی بہتر جذبہ پر مبنی ہو تو وہی بگڑ بن جاتی ہے۔"

ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان

اس سے ظاہر ہو گیا کہ ہندوستان جیسے ملک میں ایک ہم آہنگ کل کی تشکیل کیلئے بلند سطح کی فرقہ پرستی بالکل ضروری اور ناگزیر ہے۔ برعکس یوروپین ممالک کے، ہندوستان میں جماعتی تشکیل کی بنا جغرافیائی حدود نہیں ہندوستان ایک ایسا براعظم ہے جس میں مختلف النسل، مختلف اللسان اور مختلف المذاہب انسانوں کی جماعتیں آباد ہیں ان کے نظریۂ زندگی کی بنا کسی مشترک نسلی شعور پر نہیں ہے۔ حتّٰی کہ ہندو بھی کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جس کے مختلف افراد میں فکر و نظر کی یکسانیت ہو۔ ہندوستان میں یوروپین اصولوں کے مطابق جمہوریت کی تشکیل نہیں ہو سکتی جب تک یہاں مختلف فرقوں کی جداگانہ ہستی کو تسلیم نہ کر لیا جائے۔ لہٰذا مسلمانوں کا یہ مطالبہ بالکل حق بجانب ہے کہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (Muslim India) کو معرضِ وجود میں لایا جائے۔

طلوعِ اسلام — محرم ۱۳۵۹ھ

دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس نے جو ریزولیوشن پاس کیا ہے میرے نزدیک تو اُسکا محرک یہی مقدس جذبہ تھا کہ بجائے اسکے کہ ہندوستان میں مختلف جماعتوں کے جذبۂ آزادی کا گلا گھونٹ دیا جائے انہیں اس امر میں خودمختار چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے حلقہ میں اپنے مخصوص نظریاتِ زندگی کے ماتحت اپنے جوہرِ مضمر کی نشوونما کر سکیں۔ اور پھر ان صحیح عناصر کے مجموعہ سے ایک ہم آہنگ کُل کی تخلیق ہو۔ اور مجھے یقینِ واثق ہے کہ لیگ کا یہ اجلاس مسلمانوں کے اُن مطالبات کی پُرزور تائید کریگا، جو مذکورہ قرارداد میں بیان کئے گئے ہیں، جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں تو اِن مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب صوبۂ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کیجائے ہندوستان کو حکومتِ خوداختیاری زیرِ سایہ برطانیہ ملے۔ یا اس سے باہر کچھ بھی ہو مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ یہ تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی تھی، لیکن اس نے اسکو اس بنا پر رد کر دیا کہ اگر اس تجویز کو عملی جامہ پہنا دیا گیا تو اس سے ایک ایسی ریاست معرضِ وجود میں آجائے گی جسکا سنبھالنا مشکل ہو جائیگا۔ جہاں تک رقبہ کا تعلق ہے کمیٹی کی یہ رائے صحیح ہے۔ لیکن بلحاظِ آبادی مجوزہ ریاست ہندوستان کے بعض موجودہ صوبوں میں سے بھی چھوٹی ہوگی اگر قسمتِ انبالہ اور چند ایسے اضلاع کو جن میں غیرمسلم آبادی کی اکثریت ہے اس ریاست سے خارج کر دیا جائے تو یہ رقبہ میں کم ہو جائیگی۔ اور اس میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب بڑھ جائیگا۔ جب اس طرح غیرمسلم آبادی کا تناسب بہت کم رہ جائیگا تو یہ متحدہ اسلامی ریاست اس قابل ہو جائیگی کہ وہ اپنے علاقہ کے اندر رہنے والی اقلیتوں کو مؤثر تحفظات دے سکے۔ اس تجویز سے نہ تو ہندوؤں کو بدکنا چاہیئے اور نہ ہی انگریز کو پریشان ہونے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان دُنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی مُلک ہے۔ اس مُلک میں اسلام بحیثیت ایک تمدّنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا

طلوعِ اسلام		محرم ۱۳۵۷ھ

جائے مسلمانانِ ہند کے اِس زندہ اور جاندار طبقہ میں کہ جسکے بل بوتے پر یہاں برطانوی راج قائم ہے (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ برتاؤ نہیں کیا) اگر یوں ایک مرکزیّت قائم کردی جائے تو یہ آخرالذکر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھادیگا۔ اِس سے مسلمانوں میں ذمّہ داری کا احساس اور انکا جذبۂ حُبِّ وطن اور بھی زیادہ ہوجائیگا۔ جب اس طرح شمال مغرب کے مُسلمانوں کو ہندوستان کے سیاسی نظام میں رہتے ہوئے بڑھنے اور پھلنے پھُولنے کے مواقع حاصل ہونگے تو وہ ہر بیرونی حملے کے مقابلہ میں خواہ وہ خیالات کا سیلاب ہو یا شمشیر و سنان کا ہجوم، ہندوستان کی بہترین مدافعت کرسکیں گے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی چھپّن فیصدی ہے لیکن ہندوستانی فوج کا چوّن فیصدی حصّہ انہیں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور اگر وہ اُنیس ہزار گورکھے علیحدہ کردیئے جائیں جو نیپال کی آزاد ریاست سے بھرتی کیئے جاتے ہیں تو پنجاب کے فوجی سپاہیوں کی تعداد ساری ہندوستانی فوج میں باسٹھ فیصدی ہوجاتی ہے۔ اِس میں ابھی وہ چند ہزار سپاہی شامل نہیں ہیں جو صوبہ سرحد اور بلوچستان سے ہندوستانی فوج میں بھرتی ہوتے ہیں۔ اِس سے آپ بآسانی اندازہ لگاسکتے ہیں کہ ہندوستان کو غیر مُلکی جبیرہ دستی سے محفوظ رکھنے کے لیئے شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں میں کس قدر صلاحیت موجود ہے۔ رائٹ آنریبل مسٹر سری نواس شاستری کا خیال ہے کہ مسلمان شمال مغربی سرحد کے قریب آزاد اسلامی ریاستوں کا مطالبہ اس غرض سے کررہے ہیں کہ بوقتِ ضرورت حکومتِ ہند پر دباؤ ڈالنے کا ایک ذریعہ اُنکے ہاتھ آجائے۔ میں مسٹر شاستری کو کھُلے کھُلے الفاظ میں بتادینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے مطالبہ کا محرّک وہ جذبہ نہیں ہے جس کا الزام وہ مسلمانوں پر عائد کررہے ہیں۔ یہ مطالبہ مسلمانوں کی اِس دِلی خواہش پر مبنی ہے کہ انہیں بھی کہیں اپنی نشوو ارتقاء کا موقعہ ملے۔ اس لیئے کہ اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اُس وحدتِ قومی کے نظامِ حکومت میں قریب قریب ناممکن ہے جسکا نقشہ ہندو اربابِ سیاست اپنے ذہن میں لیئے بیٹھے ہیں اور جس سے مقصدِ وحید یہ ہے کہ تمام مُلک میں مستقل طور پر انہیں کا غلبہ اور تسلّط ہو۔ ہندوؤں کو یہ خطرہ بھی لاحق نہ ہونا چاہیئے

کہ آزاد مسلمان ریاستوں کے قیام سے مقصد یہ ہوگا کہ ان میں ایک قسم کے مذہبی نظامِ حکومت کی ترویج ہوگی۔ میں آپ کی خدمت میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اسلام کے متعلق جب "مذہب" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مفہوم کیا ہوتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اسلام "خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ" کا ہی نام نہیں ہے۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے جسکی ہیئت ترکیبی میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ ہر عملِ خیر کو اپنے اندر جذب کرلے اس نظام کا تعین اُسوقت ہو چکا تھا۔ جبکہ دُنیا میں کسی رُو سے کے دماغ میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہ آیا تھا۔ اس نظام کی بُنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے۔ جسکی رُو سے انسان جمادات اور نباتات کیطرح بالکل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اسکو کبھی اس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا۔ اور کبھی اُس سے، بلکہ وہ ایک ایسی روحانی ہستی سمجھا جاتا ہے۔ جس کی صحیح قدر و قیمت اُسوقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ پر فِٹ ہو، وہ اس مشینری کا ایک فعّال پُرزہ ہوتا ہے اور اُسے ٹھیک انداز میں چلانے کے لیئے اُسپر حقوق و فرائض کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اسلامی نظامِ حکومت کی ماہئیت کو سمجھنے کے لیئے "ٹائمز آف انڈیا" کا وہ مقالۂ افتتاحیہ پڑھنا چاہیئے جو جریدۂ مذکورہ نے آج سے کچھ عرصہ پیشتر انڈین بینکنگ انکوائری کمیٹی کے متعلّق لکھا تھا۔ "ٹائمز" لکھتا ہے۔

> قدیم ہندوستان میں حکومت کیطرف سے شرحِ سُود متعیّن کرنے کے لیئے قوانین وضع ہوا کرتے تھے۔ لیکن جب اس مُلک میں اسلامی حکومت قائم ہوئی تو اس شرحِ سود پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی گئی، باوجودیکہ اسلام میں وقوم قرضہ پر سُود لینا صاف طور پر ممنوع[1] قرار دیا گیا ہے۔"

---

[1] یعنی جو غیر مُسلم سود کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کی شرح سود پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ حالانکہ حکومت کے مذہب میں سود حرام تھا۔ (طلوعِ اسلام)

لہٰذا ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کے متعلق میرا یہ مطالبہ ہندوستان اور مسلمانانِ ہند دونوں کے بہترین مفاد پر مبنی ہے۔ اس سے چونکہ اندرونی طاقتوں میں توازن پیدا ہو جائے گا۔ اسلیے ملک میں امن وامان قائم ہو جائیگا۔ یہ تو ہندوستان کا فائدہ ہوگا۔ اور اسلام کو موقع ملیگا کہ اسپر عربی ملوکیت سے جو غیر اسلامی اثرات غالب آچکے ہیں، اُن سے مخلصی حاصل کر لے۔ اور اپنے شرعی قوانین اپنی تعلیم اور اپنے کلچر کی تنظیم کر کے انہیں اپنی اصلی روح اور عصرِ حاضر کی ضروریات سے قریب تر لا سکے۔

فیڈرل ریاستیں

اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی۔ کہ چونکہ ہندوستان میں آب وہوا نسل۔ زبان معتقدات اور معاشرتی نظام میں گوناگوں اختلافات ہیں۔ اسلیے یہاں کسی محکم دستوری نظام کے لیے صرف ایک ہی صورت ہو سکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ یہاں زبان نسل۔ تاریخ مذہب کی وحدت اور اقتصادی مفاد کی یکسانیت کی بنیادوں پر خود مختار ریاستیں قائم کیجائیں۔ سائمن رپورٹ نے فیڈریشن کا جو تصوّر قائم کیا ہے وہ یہ ہے کہ مرکزی مجلس وضع قوانین انتخاب عام سے مرتب نہ کیجائے بلکہ وہ فیڈرل ریاستوں کے مختلف نمائندوں کی مجلس ہو نیز سائمن رپورٹ میں یہ چیز بھی موجود ہے کہ ملک کو مختلف علاقوں میں نئے سرے سے اُسی اصول پر تقسیم کیا جائے۔ جسکا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ سائمن کمیشن کی ان سفارشات کی میں پوری پوری تائید کرتا ہوں۔ لیکن اسکے ساتھ میں اس اضافہ کی بھی جرات کرتا ہوں کہ صوبوں کی جدید تقسیم دو شرطوں کے ماتحت ہونی چاہیئے۔ اول یہ کہ یہ تقسیم جدید دستور کے نفاذ سے پہلے ہو جانی چاہیئے اور دوسرے اسکی نوعیت ایسی ہونی چاہیئے کہ اس سے آئے دن کے فرقہ وارانہ جھگڑوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔ اگر صحیح طریق پر صوبوں کی جدید تقسیم عمل میں آگئی تو ہندوستان کے آئینی مباحث میں سے جُداگانہ اور مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کا مسئلہ خود بخود معدوم ہو جائے گا کیونکہ صوبجات کی موجودہ ترکیب ہی موجودہ مناقشات کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ ہندو کا خیال ہے کہ

طلوعِ اسلام محرم ۱۳۵۲ھ

جُداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا اُصول حقیقی قومیت پرستی کے منافی ہے۔ قومیت کا جو تصوّر اُسنے قائم کر رکھا ہے اُس سے مفہوم یہ ہے کہ مختلف جماعتیں اور فرقے یوں ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں۔ کہ کسی جماعت کا جداگانہ انفرادی تشخص باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورتِ حالات موجود نہیں۔ اور نہ اُسکا ہونا مناسب ہے۔ ہندوستان مختلف النسل اور مختلف المذاہب انسانوں کا مُلک ہے۔ اسکے ساتھ ہی مسلمانوں کی عام اقتصادی پستی، تمام ہندوستان میں بالعموم اور پنجاب میں بالخصوص اُنکا لاتعداد قرضہ۔ صوبوں میں اُن کی ایسی ناکافی اکثریت جو کسی وقت اقلیت میں بدلی جاسکتی ہے۔ اگر ان امور کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو آپ پر بالکل واضح ہو جائیگا کہ ہم جُداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے لیے اسقدر مضطرب کیوں ہیں؟ ایسے مُلک میں اور ایسے حالات کے ماتحت فیڈریشن میں اگر اقوام کی نمائندگی کی بجائے صوبوں کی نمائندگی ہو تو اس سے ہر ایک طبقہ کے مفاد کی صحیح صحیح نمائندگی نہیں ہو سکے گی اور اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ زمامِ حکومت چند افراد کے ہاتھ میں (Oligarchy) رہے گی۔ ہاں! اگر موجودہ صوبجاتی تقسیم کی بجائے ہندوستان کی جدید تقسیم مختلف قوموں کی لسانی نسلی تمدنی "کلچرل" اور مذہبی ہم آہنگی کی بنیاد پر کردی جائے تو مسلمانوں کو اسپر کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ فیڈریشن میں بجائے مختلف اقوام کی نمائندگی کے مختلف علاقوں کی نمائندگی ہو۔

سائمن رپورٹ اور فیڈریشن

لیکن جہاں تک مرکزی فیڈرل حکومت کے اختیارات کا تعلق ہے جو نظامِ حکومت "ہندوستانی پنڈتوں" (یعنی نہرو رپورٹ) اور "انگلستانی پنڈتوں" (یعنی سائمن رپورٹ) نے تجویز کیا ہے۔ اسکی پُشت پر جو جذبات کارفرما ہیں۔ ان میں ایک ایسا باریک فرق ہے جو آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ "ہندوستانی پنڈت" مرکز کو بحالتِ موجودہ قائم رکھنا چاہتے ہیں (یعنی وہ فیڈریشن کی بجائے یونیٹری (Unitary) کی شکل کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں تمام

صوبے مرکز کے ماتحت رہتے ہیں۔ انکی خواہش یہ ہے کہ حکومت کی باگ ڈور مرکزی اسمبلی
کے ہاتھ میں ہو جسے وہ بصورتِ موجودہ قائم رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ موجودہ
نامزدگی (Nomination) کا سلسلہ ختم ہو جانے پر مرکزی اسمبلی میں اُن کی اکثریت اور
بھی زیادہ مضبوط و مستحکم ہو جائے گی۔ برعکس اسکے چونکہ "انگلستانی پنڈت" یہ محسوس کرتے
ہیں کہ مرکز کی جمہوریت اُنکے مفاد کے خلاف جائے گی۔ اور اگر ذمہ دار حکومت کے حصول
کے لیے ایک قدم بھی آگے بڑھا تو جو اختیارات آج اُنکے ہاتھ میں ہیں۔ وہ بھی اُن سے چھن
جائینگے، اسلیے وہ جمہوری نظام کو مرکز کے بجائے صوبوں کی طرف منتقل کردینے کی فکر میں ہیں۔
بلاشبہ وہ فیڈریشن کے اصول کی ترویج کر رہے ہیں اور چند تجاویز کی رُو سے اُنہوں نے اسکا آغاز بھی کر دیا
ہے۔ لیکن جن مقاصد کے پیشِ نظر وہ اس اصول کی قدر و قیمت متعین کر رہے ہیں وہ اُن مقاصد سے
بالکل مختلف ہیں جنکے ماتحت ہندوستان کے مسلمان اس کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں۔ مسلمان
فیڈریشن کا مطالبہ اسلیے کرتے ہیں کہ اسکے ذریعے سے ہندوستان کا مشکل ترین عقدہ یعنی فرقہ وار مسئلہ
حل ہو جائیگا۔ لیکن شاہی کمیشن (Royal commission) کے ارکان کے ذہن میں فیڈریشن کا جو تصور ہے
وہ اصولاً کتنا ہی درست و محکم کیوں نہ ہو اُن کی غرض و غایت یہ معلوم نہیں ہوتی کہ فیڈرل ریاستوں
کو مکمل طور پر خود مختار کر دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں جمہوریت کے
نفاذ سے برطانیہ کے لیے جو صورتِ حالات پیدا ہوگی۔ اُس سے بچاؤ کی کوئی شکل نکل
آئے۔ انہیں فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کی کوئی فکر ہی نہیں اس لیے وہ اسے جُوں کا تُوں چھوڑ رہے
ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک حقیقی فیڈریشن کا تعلق ہے۔ سائمن رپورٹ فیڈریشن
کے اصول کی اصلی ماہیئت کو ہی رَد کر رہی ہے۔ نہرو رپورٹ کے واضعین اس چیز کو بھانپ
کر کہ مرکزی اسمبلی میں اکثریت ہندوؤں کو حاصل ہوگی وحدانی نظامِ حکومت
(Unitary form of Govt.) کی تجویز پر آگئے ہیں کیونکہ اس نظامِ حکومت کی
رُو سے ہندوؤں کو سارے ہندوستان پر عام غلبہ و اقتدار حاصل ہو جائے گا

سائمن رپورٹ برائے نام فیڈریشن کے چلمنی پردہ کی آڑ میں موجودہ برطانوی اقتدار کو قائم رکھنا چاہتی ہے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ اہلِ برطانیہ قدرتی طور پر اس اقتدار سے دستکش نہیں ہونا چاہتے جو انہیں آج تک حاصل رہا ہے اور کچھ اسلیئے کہ اگر ہندوستان کی مختلف اقوام میں باہمی سمجھوتہ نہ ہو تو اہلِ برطانیہ کو بہانہ ملجاتا ہے کہ موجودہ طاقت اپنے ہی ہاتھ میں رکھیں۔ جہاں تک وحدتی نظامِ حکومت کا تعلق ہے وہ تو میرے نزدیک آزاد ہندوستان میں قابلِ التفات ہی نہیں باقی رہی فیڈریشن تو وہ اس قسم کی ہونی چاہیئے کہ اس میں باقیماندہ اختیارات Residuary Powers کلیتہً خودمختار ریاستوں کے ہاتھ میں رہیں اور مرکزی فیڈرل حکومت صرف انہی اختیارات کے استعمال کی اہل ہو جو مختلف آزاد ریاستیں اپنی رضامندی سے اسکی تحویل میں دیدیں۔ مَیں مسلمانانِ ہند کو کبھی ایسے نظام کے منظور کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا جس میں حقیقی فیڈریشن کا اصول ناپید ہو یا جس میں مسلمانوں کی انفرادی ملّی ہستی کو تسلیم نہ کیا جائے، خواہ وہ نظام برطانوی الاصل ہو یا ہندی الاصل۔

فیڈرل اسکیم اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنس

مرکزی حکومت کی وضع و ہیئت میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس اغلباً اس سے بہت پہلے ہو رہا تھا جب کہ برطانیہ نے اس کے نفاذ کے مؤثر ذرائع اختیار کرنے کا خیال کیا یہی وجہ ہے کہ اس امر کا اعلان کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں والیانِ ریاست کی شرکت بھی نہایت ضروری ہے بہت دیر کے بعد کیا گیا۔ والیانِ ریاست کی طرف سے گول میز کانفرنس میں دفعتہً آل انڈیا فیڈریشن میں شرکت پر آمادگی کا اظہار، اور اس اعلان کے ساتھ ہی ہندو مندوبین کا جو اب تک وحدتی نظامِ حکومت کے بالکل غیر متزلزل حامی چلے آتے تھے، خاموشی سے فیڈرل اسکیم کی ترتیب پر اظہارِ رضامندی باشندگانِ ہند کے لئے علی العموم اور اقلیتوں کے لئے علی الخصوص بڑا تعجب انگیز تھا۔ حتیٰ کہ مسٹر شاستری نے

بھی جنہوں نے چند ہی روز قبل ہندوستان کے لئے فیڈرل سکیم کی سفارش کی پاداش میں سرجان سائمن پر سختی کے ساتھ نکتہ چینی کی تھی۔ اپنی رائے بدل لی۔ اور اِس تبدیلیٔ رائے کا کانفرنس کے پہلے اجلاس عام میں اعتراف کیا اور اِس طرح وزیرِ اعظم انگلستان کے لئے اپنی افتتاحی تقریر میں ایک نہایت برجستہ فقرہ چست کرنے کا سامان فراہم کر دیا۔

انگریزوں کی یہ خواہش کہ والیانِ ریاست آل انڈیا فیڈریشن میں شریک ہو جائیں اور ہندوؤں کا یہ اقدام کہ انہوں نے فیڈرل حکومت کو بلا تامل منظور کر لیا خالی از علت نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ والیانِ ریاست (جن میں مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل ہے) کے فیڈریشن میں شامل ہونے سے دو نتیجے بالکل عیاں ہیں۔ یعنی یہ چیز ایک طرف تو ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے علیٰ حالہٖ استحکام اور اور استبقاء کا بڑا عمدہ ذریعہ بن جائے گی۔ اور دوسری طرف آل انڈیا فیڈرل اسمبلی میں ہندوؤں کو ایک زبردست اکثریت حاصل ہونے کا موجب ہوگی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت کی آخری وضع و ہیئت کے سلسلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات کو برطانوی مدبرین نہایت شاطرانہ انداز سے والیانِ ریاست کے مہروں کی وساطت سے اپنی مطلب برآری کا ذریعہ بنا رہے ہیں۔ اُدھر والیانِ ریاست کو اس سکیم میں اپنی مطلق العنان حکومت کے برقرار رکھنے کے بہتر امکانات نظر آ رہے ہیں **اگر مسلمانوں نے خاموشی کے ساتھ کسی ایسی سکیم کو منظور کر لیا تو وہ یاد رکھیں کہ اِس طرح وہ اپنی جداگانہ ملی ہستی کی قبر اپنے ہاتھوں سے کھود ڈالیں گے۔** ہندوستان میں اس وضع کی فیڈرل حکومت کی پالیسی حقیقتاً ہندو والیانِ ریاست کے ہاتھ میں ہوگی۔ کیونکہ مرکزی فیڈرل اسمبلی میں انہی کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی اور وہ ان تمام معاملات میں جن کا تعلق برطانوی شہنشاہیت سے ہوگا، تاجِ برطانیہ کی پوری پوری حمایت کریں گے، اور جہاں تک اندرونی نظم و نسق کا تعلق ہے وہ ہندوؤں کے

تسلط اور اقتدار کو برقرار رکھنے اور اسے اور زیادہ مستحکم کرنے میں ہر طرح کی مدد دیں گے

بہ الفاظ دیگر اس سکیم کا مقصد یہ ہے کہ برطانوی امپیریلزم اور ہندو انڈیا میں ایک ایسا سودا ہو جائے جس کی رُو سے ہندو ہندوستان میں انگریز کے وجود کو دائمی بنا دیں اور انگریز اس کے صلہ میں ہندوستان میں ہندوؤں کو ایک ایسا نظامِ حکومت عطا کر دیں جس میں تمام دیگر اقوام ہندوؤں کی مستقل غلامی کے پھندے میں جکڑی رہیں۔ لہٰذا اگر

برطانوی ہند کے صوبوں کو حقیقی معنوں میں خود مختار ریاستوں میں متشکل نہ کیا گیا تو ہندوستان کی فیڈریشن میں والیانِ ریاست کی شمولیت کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہ سمجھا جائے گا کہ

انگریز اپنے خاص شاطرانہ انداز میں ایسی چال چلنا چاہتا ہے کہ اپنے ہاتھ سے کچھ نہ جائے اور ہر ایک کو خوش بھی کر دیا جائے یعنی مسلمان کو فیڈریشن کے نقلی کھلونے سے، ہندو کو مرکز میں اکثریت سے اور برطانوی ملوکیت کو خواہ وہ ٹوری Tory ہوں یا لیبر (Labourites) حقیقی اختیارات کی تفویض سے۔ ہندوستان میں ہندو ریاستوں کی تعداد

مسلم ریاستوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے اور یہ بھی دیکھنا ہے کہ برطانوی ہند اور ریاستوں کے نمائندوں سے مرتب مرکزی ایوان (House) یا ایوانوں Houses میں مسلمانوں کے تینتیس ۳۳ فی صدی مطالبہ کو کس طرح پورا کیا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فیڈریشن کی جس سکیم پر گول میز کانفرس میں بحث ہوئی ہے مسلم مندوبین اس کے متعلقات سے پورے طور پہ آگاہ ہیں۔ مجوزہ آل انڈیا فیڈریشن میں مسلمانوں کی نیابت کا مسئلہ ابھی تک زیرِ بحث نہیں آیا۔ رپورٹر نے مختصاً لکھا ہے۔

"فیڈرل کمیٹی کی سفارشات کے مسودہ (Interim report) میں دو ایوانوں کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ دونوں میں برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں کے نمائندے

شریک ہوں گے۔ ان کے تناسب کے معاملہ پر بعد میں فیڈرل سب کمیٹی ان عنوانات کے زیرِ نظر غور کرے گی جو ابھی اس کمیٹی کے لئے متعین نہیں کئے گئے۔"

میری رائے میں تناسب کا معاملہ بے حد اہم ہے اور اس پر اسمبلی کی وضع و ہیئت کے ساتھ ہی غور ہونا چاہیئے تھا۔ میرے خیال میں بہترین طریق کار یہ تھا کہ سر دست صرف برطانوی ہند کے صوبوں کی فیڈریشن بنائی جاتی ہے۔ فیڈریشن کی جس سکیم کا آغاز جمہوریت (صوبوں کے منتخب شدہ نمائندے) اور استبداد (ریاستوں کے نامزدہ نمائندے) کے غیر مقدس اتحاد سے ہو گا۔ اس سے اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ ہندوستان وحدتی نظامِ حکومت کے گورکھ دھندے میں الجھا رہے۔ یہ وحدتی نظام انگریزوں کے لئے، برطانوی ہند کی سب سے بڑی قوم کے لئے (یعنی ہندوؤں کے لیے) اور والیانِ ریاست کے لئے بہت سے فوائد کا سرچشمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کو اس سے اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا جب تک انہیں ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے پانچ میں مکمل اختیارات (یعنی باقیماندہ اختیارات Residuary Powers فیڈریشن کے بجائے صوبوں کی تحویل میں ہوں) کے ساتھ اکثریت حاصل نہ ہو جائے نیز فیڈرل اسمبلی کے ارکان کی مجموعی تعداد میں ایک تہائی نشستیں نہ مل جائیں۔ جہاں تک برطانوی ہند کے صوبوں کو مکمل اختیارات تفویض کرنے کا تعلق ہے۔ اعلیٰحضرت نواب صاحب بھوپال، سر اکبر حیدری اور مسٹر جناح کا منطقہ نہایت مستحکم بنیادوں پر مبنی ہے۔ چونکہ اب والیانِ ریاست بھی ہندوستانی فیڈریشن میں شامل ہو رہے ہیں اس لئے برطانوی ہند کی اسمبلی میں مسلمانوں کی نیابت کے مسئلہ پر از سر نو غور ہونا چاہیئے۔ اب سوال صرف برطانوی ہند کی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی کا نہیں بلکہ تمام ہندوستان کی فیڈرل اسمبلی میں برطانوی ہند کے مسلمانوں کی نیابت کا

ہے۔ اب ہمارا یہ مطالبہ یوں پیش ہونا چاہیئے کہ ہیں آل انڈیا فیڈرل اسمبلی میں ایک تہائی نشستیں دی جائیں اور فیڈریشن میں شامل ہونے والی مسلم ریاستوں کی نمائندگی کو اس ایک تہائی سے علیحدہ رکھا جائے۔

مسئلہ دفاع (Defence)

ایک اور مشکل مسئلہ جو ہندوستان میں فیڈریشن کو کامیابی سے چلانے کے راستہ میں مزاحم ہو رہا ہے۔ ہندوستان کی مدافعت کا مسئلہ ہے۔ شاہی کمیشن کے ارکان نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ہندوستان کی تمام خامیوں کو ابھار کر سامنے لا کھڑا کیا ہے تا کہ فوج کے نظم و نسق کی باگ ڈور حکومت برطانیہ کے ہاتھ میں رکھنے کے لئے وجہ جواز پیدا کر سکیں۔ ارکانِ کمیشن لکھتے ہیں کہ:۔

"ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات کچھ اس قسم کے واقع ہوئے ہیں کہ ہندوستان کے دفاع کو اس وقت یا مستقبل قریب میں ایسا مسئلہ نہیں قرار دیا جا سکتا جس کا تعلق خالصۃً ہندوستان سے ہو۔ فوج پر کامل اختیارات ملک معظم کی حکومت کے کارندوں کے ہونگے اور وہی اس کا نظم و نسق کرینگے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذکورہ صورتِ حالات کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ برطانیہ ہند میں ذمہ دار حکومت کی طرف پیش قدمی کا دروازہ اس وقت تک بند سمجھا جائے جب تک ہندوستان برطانوی افسروں اور برطانوی فوجوں کی امداد کے بغیر اپنی مدافعت کا پورا اہل نہ بن جائے۔ بحالاتِ موجودہ آئینی ترقی کے راستے میں ایک رکاوٹ تو ضرور موجود ہے اور وہ یہ کہ اگر نہرو رپورٹ کی تجویز کے مطابق اس امر پر اصرار کیا جائے کہ کسی آئندہ تغیر و تبدل

میں یہ بات بھی شامل ہے کہ فوج کا نظم و نسق منتخب مجلس وضع قوانین کی تحویل میں چلا جائے۔ تو اس بات کا خطرہ ہے کہ یہ جو اُمیدیں بندھ رہی ہیں کہ مرکزی حکومت ارتقائی منازل طے کر کے اس نصب العین تک پہنچ جائے جس کا ذکر ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کے اعلان میں کیا گیا ہے۔ وہ ایک غیر معین مدت تک کے لئے دھری کی دھری رہ جائیں گی۔"

اپنی اس دلیل کو اور زیادہ مستحکم کرنے کے لئے ارکان کمیشن نے اس بات پر بھی زور دیا ہے۔ کہ ہندوستان میں ایسے مذاہب موجود ہیں جو ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور ایسی قومیں موجود ہیں جن کی قومیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور جن میں باہمی چشمک ہر وقت موجود رہتی ہے۔ اور ارکان کمیشن نے یہ کہہ کر مسئلہ کو بالکل لاینحل بنانے کی کوشش کی ہے کہ

"یہ حقیقت کہ ہندوستان عام محاورہ کے مطابق ایک امۃ واحدہ قوم (Nation) نہیں ہے۔ کہیں اتنی ابھر کر سامنے نہیں آتی جتنی اس خیال کو پیش نظر رکھنے سے نمایاں ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کی عسکری اور غیر عسکری اقوام میں کتنا بڑا فرق ہے۔"

کمیشن نے مسئلہ کے ان پہلوؤں کو اس شدومد سے بیان کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انگریز ہندوستان کو محض بیرونی خطرات ہی سے محفوظ نہیں کر رہے بلکہ اس کے اندرونی امن و سکون کے بھی غیر جانبدار محافظ ہیں۔

فیڈریشن کا جو نظام میرے ذہن میں ہے اس کی رُو سے ہندوستان میں فیڈریشن کے نافذ ہو جانے کے بعد صرف بیرونی حفاظت ہی کا سوال باقی رہ جائے گا۔ تمام صوبوں میں داخلی امن کے قیام کے لئے لازماً فوجیں موجود ہوں گی۔ ان کے علاوہ ہندوستان کی فیڈرل کانگریس، ہندوستان کی شمال و مغربی

سرحد پر ایک طاقتور سرحدی فوج متعین کر دے گی جس میں عام صوبوں کے دستے شامل ہوں گے اور تمام قوموں کے قابل و کارروان فوجی افسروں کے ہاتھ میں ان کی قیادت ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ ہندوستان میں اس وقت قابل فوجی افسر موجود نہیں ہیں اور کمیشن کے ارکان نے اسی امر واقعہ کو پیش کر کے نظم و نسقِ فوج کو ملکِ معظم کی حکومت کے ہاتھ میں رکھنے کے لئے وجہ جواز پیدا کی ہے۔ اس معاملے کے متعلق میں سائمن رپورٹ سے ایک اقتباس پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا جو میری رائے میں خود کمیشن کی اختیار کردہ پوزیشن کے خلاف ایک محکم دلیل ہے۔ رپورٹ مظہر ہے کہ:-

"جن ہندوستانیوں کو ملک معظم کی طرف سے شاہی کمیشن ملا ہوا ہے ان میں سے کسی کو بہ حالاتِ موجودہ کپتانی سے اونچا فوجی منصب حاصل نہیں۔ ہماری معلومات کے مطابق اس وقت ۳۹ کپتان ہیں جن میں سے ۲۵ عام رجمنٹوں میں مامور ہیں۔ ان میں سے بعض کی عمر اتنی ہے کہ اگر وہ ضروری امتحانات پاس بھی کر لیں تو بھی پنشن پانے سے پیشتر کپتانی سے اونچا عہدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ اکثر ایسے ہیں جنہوں نے سینڈ ہرسٹ کے فوجی کالج میں تعلیم نہیں پائی۔ بلکہ جنگِ عظیم میں انہیں کمیشن مل گئے۔ جب حالت یہ ہے تو تغیر کی حالت کتنی ہی مخلصانہ اور اسے عمل میں لانے کی کوشش کتنی ہی سرگرم کیوں نہ ہو ظاہر ہے کہ نشوو ارتقا کی رفتار بہت سست اور مدھم رہے گی اس سلسلے میں رکاوٹ پیدا کرنے والے ان حالات کو بھی مدِنظر رکھنا ضروری ہے۔ جو سکین کمیٹی نے (جس کے ممبر سب دیسی متر فار تھے) ان مؤثر الفاظ میں بیان کئے ہیں کہ "ترقی بہرحال اس امر پر موقوف ہوگی کہ ہر مرحلہ میں کامیابی حاصل کی جائے اور فوجی صلاحیت کو برقرار رکھا جائے" موجودہ ہندوستانی افسر تمام کے تمام چھوٹے درجے کے ہیں اور ان کا تجربہ بہت محدود ہے ان میں سے اونچے درجے کے افسر قلیل مدت میں پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ جب تک افسروں کے درجے میں موزوں ہندوستانیوں کی بھرتی کی تعداد میں معتد بہ اضافہ نہیں ہوگا (اور ہم انکی تعداد میں اضافہ کے دل سے خواہاں ہیں)

جبتک ہندوستانیوں کی کافی تعداد تعلیم و تجربہ حاصل کرکے اس قابل نہیں ہو جائیگی کہ کم از کم چند ہندستانی رجمنٹوں کے سارے عہدے سنبھال سکیں۔ جب تک ایسے دستے اپنی صلاحیت کا پورا عملی ثبوت نہ دینگے۔ جب تک ہندستانی افسر کامیاب فوجی خدمت کے ذریعہ اعلیٰ کمان کے قابل نہیں بن جائینگے اسوقت تک یہ پالیسی کہ تمام فوج ہندوستانی افسروں پر مشتمل ہو بروئے کار نہیں لائی جا سکتی۔ پھر بھی اس سکیم کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے سالہاسال درکار ہوں گے۔"

اب میں یہ دریافت کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس صورت حالات کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا یہ ہماری عسکری اقوام کی فطری ناقابلیت کا نتیجہ ہے یا فوجی تعلیم دینے کی سستی رفتار کا؟ ہماری عسکری اقوام کی فوجی صلاحیت ناقابل انکار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ فوجی تعلیم کے لئے دوسری تعلیمات کے مقابلے میں زیادہ وقت درکار ہو۔ میں فوجی معاملات کا ماہر نہیں ہوں کہ اس چیز کا صحیح اندازہ کر سکوں لیکن ایک عام آدمی کی حیثیت سے میں محسوس کرتا ہوں کہ مذکورہ استدلال کے مطابق یہ لائحہ عمل تو ایک لامتناہی سلسلہ نظر آتا ہے۔ اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ ہے کہ ہندوستان ہمیشہ کے لئے غلامی کی زنجیروں میں جکڑا رہے۔ لہٰذا یہ اور بھی ضروری ہے کہ نہرو رپورٹ کی تجویز کے مطابق سرحدی فوج کے مسئلہ کو ایک ایسی کمیٹی کے حوالے کر دیا جائے جس کے عناصر ترکیبی کا فیصلہ باہمی سمجھوتے سے کر لیا جائے۔ اگر یہاں فیڈرل حکومت قائم ہو گئی تو مجھے یقین ہے کہ اسلامی ریاستیں ہندوستان کی حفاظت کے لئے ایک غیر جانب دار ہندوستانی فوج اور غیر جانب دار ہندوستانی بحری طاقت کی تعمیر پر بصد خوشی رضامند ہو جائیں گی۔ مغلوں کے عہد میں اس قسم کی غیر جانب دار دفاعی فوج موجود تھی بلکہ اکبر کے زمانے میں سرحد ہند کی محافظ فوج کے تمام جرنیل ہندو تھے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ فیڈرل حکومت کے ماتحت غیر جانب دار ہندوستانی فوج کی سکیم کے پیش نظر مسلمانوں کے متعلق ہندوؤں کے یہ شکوک بھی بالکل رفع ہو جائیں گے۔ کہ مسلمانانِ ہند بیرونی حملے کی صورت میں اپنے ماورائے سرحد کے مسلمانوں کے ساتھ مل جائیں گے

دوسری شکل [۲]

میں نے اختصار کے ساتھ یہ بتانے کی کوشش کی ہے۔ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو میری رائے میں اس ملک کے دو نہایت اہم آئینی مسئلوں کے متعلق کیا طریق عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ مسلمانوں کا اہم مطالبہ یہ ہے کہ ہندوستان کی از سرِ نو اس انداز پر تقسیم کی جائے کہ اس سے فرقہ وارانہ مسئلہ کا مستقل طور پر حل ہو جائے (یعنے صوبوں کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ ان میں ہر قوم کو اپنی تہذیب کے مطابق اپنی نشوونما میں کامل آزادی حاصل ہو) لیکن اگر مسلمانوں کا یہ مطالبہ قابل التفات نہ سمجھا جائے تو میں پورے زور کے ساتھ اُن اسلامی مطالبات کی تائید کرتا ہوں جو آل انڈیا مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کی طرف سے بار بار پیش کئے جا چکے ہیں۔ مسلمانانِ ہند کسی ایسے آئینی تغیر پر ہرگز رضامند نہیں ہو سکتے جو صُوبہ جات سرحد، سندھ، بلوچستان اور پنجاب اور بنگال میں ان کے حقوق اکثریت پر اثر انداز ہو یا اس امر کی ضمانت نہ دے کہ مرکزی مجلس وضع قوانین میں ان کی نیابت ایک تہائی یقینی طور پر ہو گی۔ مسلمانوں کے سیاسی رہنما اس سے پہلے ان دونوں پر غلطی کھا چکے ہیں۔ اول میثاق لکھنؤ جس کی تخلیق ہندوستان میں "متحدہ قومیت" کے غلط نظریہ کے ماتحت کی گئی اور جس کی رُو سے مسلمانانِ ہند کے سیاسی اقتدار کے تمام راستے مسدود کر دیئے گئے۔ دوسرے وہ کوتاہ نگہی جو پنجاب کے مسلمانوں کی دیہاتی Rural اور شہری Urban تقسیم کا موجب بنی۔ اور جس کی وجہ سے مسلمانوں کی وحدت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور یوں پنجاب کے مسلمانوں کی اکثریت اقلیت میں بدل گئی۔ لیگ کا فرض ہے کہ وہ میثاقِ لکھنؤ اور مسلمانانِ پنجاب کے دیہاتی اور شہری تقسیم کی تجویز کی مذمت کرے۔

سائمن رپورٹ نے مسلمانانِ پنجاب اور بنگال کے لئے آئینی اکثریت Statutory Majority کی سفارش نہیں کی اور اس طرح مسلمانوں کے ساتھ سخت بے انصافی کی ہے۔ اور یوں مسلمانوں کے لئے اس کے سوائے کوئی راستہ نہیں چھوڑا کہ وہ یا تو میثاق لکھنؤ پر قانع رہیں یا مخلوط انتخاب کی سکیم منظور کریں۔

سائمن رپورٹ کے متعلق حکومتِ ہند کے خریطہ Despatch میں اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے کہ رپورٹ شائع ہونے کے وقت سے لے کر اس وقت تک مسلمانوں نے ان تجاویز میں سے کسی ایک کے قبول کرنے کے متعلق بھی رضامندی کا اظہار نہیں کیا۔ حکومت ہند نے اس خریطہ میں یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کو حقوق اکثریت سے اس بنا پر محروم کر دینا کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے۔ ان میں اُنہیں زائد نشستیں Weightage دی گئی ہیں مسلمانوں کے لئے جائز شکایات کا موجب ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود حکومت ہند نے سائمن رپورٹ کی اس مجوزہ بے انصافی کی کوئی تلافی نہیں کی۔ بہرنوع لارڈ اِروِن اور اُن کی حکومت نے تسلیم کر لیا ہے کہ اکثریت کے لئے فرقہ وارانہ نیابت اس وقت تک باقی رہنی چاہیئے جب تک کہ حقِ رائے دہندگی Franchise کو اتنا وسیع نہ کر دیا جائے کہ اس سے ہر قوم کے ووٹ دینے والوں کی تعداد کا تناسب قریب قریب وہی ہو جو ان کی کل آبادی کا تناسب ہے، اور دوسرے جب تک صوبہ کی مجلس مقننہ کے مسلم ارکان دوتہائی اکثریت کے ساتھ جُداگانہ انتخاب سے دست برداری پر رضامندی کا اظہار نہ کریں۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ باوجودیکہ حکومت ہند مسلمانوں کی شکایات کو حق بجانب تسلیم کرتی ہے، پھر بھی اس کو یہ ہمت کیوں نہیں پڑتی کہ پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کو آئینی اکثریت دینے کی سفارش کرے۔

مسئلہ سندھ

ہندوستان کے مسلمان کسی ایسے نظام پر رضامند نہیں ہو سکتے جس میں سندھ کو ایک مستقل صوبہ نہ بنایا جائے اور صوبہ سرحد کی سیاسی حیثیت دوسرے صوبوں کے برابر نہ کر دی جائے۔ مجھے کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ سندھ کو بلوچستان کے ساتھ ملا کر ایک مستقل صوبہ کیوں نہ بنا دیا جائے۔ سندھ اور احاطہ بمبئی میں تو کوئی چیز بھی مشترک نظر نہیں آتی خود ارکان کمیشن اعتراف کرتے ہیں کہ طریق بود و ماند اور تمدّن کے اعتبار سے سندھ ہندوستان کی بجائے عرب اور عراق سے زیادہ قریب ہے۔ مشہور مسلم جغرافیہ دان مسعودی نے اس حقیقت کو بہت پہلے محسوس کر لیا تھا جب اُس نے کہا تھا کہ "سندھ ایک ایسا ملک ہے جسے ہندوستان کی بجائے ممالک اسلامیہ سے زیادہ قرب حاصل ہے"۔ روایت ہے کہ اُمیہ خاندان کے پہلے حکمران نے مصر کے متعلق کہا تھا کہ اس کی پُشت

افریقہ کی طرف ہے اور منہ عرب کی طرف۔ ضروری ترمیمات کے ساتھ یہی قول سندھ کی اصلی پوزیشن کو بھی واضح کردیتا ہے۔ مصر کی طرح سندھ کی بھی پشت ہندوستان کی طرف ہے اور منہ وسط ایشیا کی طرف۔ علاوہ بریں جب ہم سندھ کے زراعتی وسائل اور معاملات پر غور کرتے ہیں جو اپنے متعلق حکومت بمبئی کے دل میں کبھی جذبات ہمدردی پیدا نہیں کرسکتے۔ نیز جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ کراچی لازماً نشوو ارتقا پاکر ہندوستان کا دوسرا سب سے بڑا تجارتی شہر بن جائیگا اور اس سے سندھ کی تجارت میں لامتناہی ترقی کے امکانات پیدا ہو جائیں گے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ سندھ کو احاطہ بمبئی کے ساتھ وابستہ رکھنا تدبر اور دور اندیشی کے منافی ہے، کیونکہ اگرچہ آج ان دونوں کے درمیان بہ ظاہر کش مکش نہیں لیکن مستقبل قریب میں ان کے درمیان جذبات رقابت پیدا ہونے کے بہت امکانات ہیں۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ علیحدگی سندھ کے راستہ میں مالی مشکلات حائل ہیں اس مسئلہ کے متعلق آج تک میرے سامنے کوئی قطعی اور مستند بیان نہیں آیا۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے کہ واقعی اس قسم کی مشکلات موجود ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ حکومت ہند ایک ہونہار صوبہ کو مستقل نشوو ارتقا کی جدوجہد میں عارضی طور پر مالی امداد دینے کے لئے آمادہ کیوں نہیں ہوتی۔

صوبہ سرحد

صوبہ سرحد کے متعلق یہ دیکھ کر بے حد قلق ہوتا ہے کہ ارکان کمیشن نے اس امر سے انکار ہی کردیا ہے کہ اس صوبہ کے باشندوں کو بھی اصلاحات کا کوئی حق حاصل ہے۔ کمیشن نے صوبہ سرحد کے لئے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ پہلے BRAY کمیٹی کی تجاویز سے بھی کم ہیں اور اس صوبہ کیلئے جو کونسل تجویز کی گئی ہے اسے چیف کمشنر کی مطلق العنانی کو چھپانے کے لئے ایک نظر فریب پردے کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ افغان کے سگریٹ سلگانے کا فطری حق محض اس لئے چھین لیا گیا ہے کہ وہ اتفاق سے بارود خانہ Powder House میں مقیم ہے۔ ارکان کمیشن کا یہ تمثیلی استدلال بہ ظاہر کتنا ہی خوش آیند کیوں نہ ہو لیکن بے حد ناقابل اطمینان ہے۔ سیاسی اصلاحات کو "روشنی" کہنا چاہیئے نہ کہ "آگ" اور روشنی کا ہر انسان حق دار ہے خواہ وہ بارود خانہ کے اندر مقیم ہو یا کوئلہ کی کان میں۔ افغان بہادر ہے، بالغ نظر ہے اور اپنے جائز حقوق کے لئے ہر تکلیف برداشت کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ اس لئے اسے کامل خود اختیاری حکومت کے مواقع سے محروم کرنے کی

جو کوشش کی جائے گی وہ یقیناً اس کی برافروختگی کا باعث ہو گی۔ ہندوستان اور انگلستان دونوں کے مفاد کا تقاضا یہی ہے کہ اس قوم کو مطمئن رکھا جائے۔ حال ہی میں اس بدنصیب صوبے میں جو الم انگیز واقعات پیش آچکے ہیں وہ اسی ناروا سلوک کا نتیجہ ہیں، جو ہندوستان میں خوداختیاری حکومت کا اصول نافذ کرنے کے وقت سے اہلِ سرحد کے ساتھ روا رکھا گیا۔ مجھے امید ہے کہ برطانوی مدبرین صوبہ سرحد کی موجودہ بے چینی کو بیرونی اسباب کا نتیجہ قرار دے کر صورتِ حالات کے صحیح اندازہ سے چشم پوشی نہیں کرینگے۔

صوبہ سرحد کے متعلق حکومتِ ہند کے خریطہ میں جو سفارشات کی گئی ہیں۔ وہ بھی اطمینان بخش نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس خریطہ میں ایک نام نہاد مجلس نمائندگان اور ایک نیم نمائندہ Semi-representative سی کابینہ مہیا کر کے سائمن رپورٹ کی سفارشوں پر اضافہ کر دیا گیا ہے لیکن یہ محض اشک شوئی ہے کیونکہ اس اہم ترین مسلم صوبے کو دوسرے ہندوستانی صوبوں کی سطح پر نہیں لایا گیا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ افغان فطرتاً ہندوستان کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں جمہوری ادارات کے لئے زیادہ موزوں ہے۔

گول میز کانفرنس

میرا فرض ہے کہ اب میں گول میز کانفرنس کے متعلق بھی کچھ عرض کروں۔ ذاتی طور پر گول میز کانفرنس کے نتائج کے متعلق میری توقعات کچھ زیادہ خوش آیند نہیں ہیں۔ امید تو یہ تھی کہ فرقہ وارانہ مناقشات کی کش مکش گاہ سے دور نئی فضا زیادہ بصیرت افروز ہو گی۔ اور ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں اختلاف کا مخلصانہ تصفیہ آزادیٔ ہند کے مقصد کو قریب تر لے آئیگا۔ لیکن واقعات کچھ اور ہی داستان سنا رہے ہیں لندن میں فرقہ وارانہ مسائل کے متعلق جو بحث و تمحیص ہوئی اس سے یہ حقیقت کہ ہندوستان میں ان دو بڑی تہذیبوں کی حامل اقوام میں کس قدر اصولی اختلافات موجود ہیں اس انداز سے عریاں ہو گئی کہ اس سے پیشتر شائد ہی کبھی ایسا ہوا ہو۔ اس کے باوجود وزیرِ اعظم انگلستان اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریزاں ہے کہ ہندوستان کا مسئلہ قومی مسئلہ نہیں، بلکہ بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ بیان کیا جاتا

ہے کہ وزیر اعظم نے کہا کہ "میری حکومت کے لئے مشکل ہوگا کہ وہ پارلیمنٹ کے سامنے جداگانہ انتخاب کے حق میں تجاویز پیش کر سکے۔ اس لئے کہ مخلوط انتخاب کے اصول کو برطانیہ کے خیالاتِ جمہوریت کے ساتھ زیادہ مطابقت حاصل ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ وزیر اعظم انگلستان نے یہ سوچا ہی نہیں کہ ایک ایسی سرزمین میں جہاں مختلف قومیں آباد ہوں برطانوی جمہوریت کے نمونہ پر کوئی نظامِ حکومت قابلِ عمل نہیں ہو سکتا۔ اور اس نے یہ بھی نہیں سمجھا کہ مخلوط انتخاب تو ایک طرف خود جداگانہ انتخاب بھی اس تجویز کا نعم البدل نہیں ہو سکتا جو تہذیبی خطوں کے مطابق صوبوں کی ازسرِنو تقسیم پر مشتمل ہے، اقلیتوں کی سب کمیٹی میں بھی اطمینان بخش تصفیہ کی کوئی امید نہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ تمام کا تمام مسئلہ برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے ہو اور ہمارا خیال ہے کہ تیز بین برطانوی مدبرین اکثر ہندوستانی سیاست دانوں کی طرح اس مسئلہ کو سطحی نظر سے نہیں دیکھیں گے بلکہ اس کی گہرائیوں میں اتر کر ہندوستان جیسے ملک میں امن و سکون کے صحیح اصول و مبادی کا واضح طور پر مشاہدہ کر لیں گے۔ ہندوستان کے لئے نظامِ حکومت کی بنیادیں "متحدہ قومیت" کے غلط تصور پر رکھنا یا یہاں ان اصولوں کو ٹھونسنا جو برطانیہ کے اندازِ جمہوریت کے رہینِ منت ہوں، ہندوستان سے دوستی نہیں بلکہ اسے نادانستہ خانہ جنگی کے لئے تیار کرنا ہے۔ جہاں تک میری بصیرت کام دیتی ہے اس ملک میں اس وقت تک امن قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہندوستان میں بسنے والی مختلف اقوام کو ایسے مواقع بہم نہ پہونچائے جائیں کہ وہ اپنے ماضی کے شجرِ مقدس سے پیوستہ رہتے ہوئے عصرِ حاضر کے داعیات کے مطابق خودمختارانہ اپنی ملت کی نشوونما کر سکیں۔

مقامِ مسرت ہے کہ ہمارے مسلم مندوبین اس مسئلہ کو صحیح اصول پر حل کرنے کی اہمیت سے پورے طور پر آگاہ ہیں جسے میں نے ہندوستان کا بین الاقوامی مسئلہ کہا ہے وہ اس بات پر زور دینے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ مرکزی حکومت میں خود مختارانہ حکومت کے مسئلہ سے پیشتر فرقہ وارانہ مسئلہ کا تصفیہ کر لیا جائے۔ کسی مسلم سیاست دان کو فرقہ پرستی Communalism کے طعن سے گھبرانا نہیں

چاہیئے جسے اغیار نے محض مخالفانہ پروپیگنڈہ کے لئے اختیار کیا ہے اور اسے اس غرض سے ایجاد کیا گیا ہے کہ اہلِ برطانیہ کے جذبات جمہوریّت کو اپیل کر کے اپنا اُلو سیدھا کیا جائے اور اس طرح ہندوستان میں جس چیز (متحدہ قومیت) کا وجود ہی نہیں اسے انگلستان کو باور کرا کر اُسے خواہ مخواہ غلط راستہ پر لگا دیا جائے۔ اس وقت سر دھڑ کی بازی لگ رہی ہے۔ ہم تعداد میں بھی سات کروڑ ہیں۔ اور ہندوستان کی کوئی دوسری قوم ایسی نہیں جو ہماری طرح یک رنگ و ہم آہنگ ہو۔ بلکہ ہندوستان کی تمام اقوام میں صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہے جس پر صحیح معنوں میں موجودہ زمانے کے مفہوم کے مطابق لفظِ قوم کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ہندو ہم سے ہر اعتبار سے آگے بڑھے ہوئے ہیں لیکن ان میں آج تک وہ ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکی جو منتشر افراد کو ایک قومیت کے رشتہ میں منسلک کرنے کے لئے لاینفک ہے اور جو آپ کو اسلام کی بارگاہ سے بلا مزدِ قیمت بطورِ عطیہ کے مل گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آج ہندو ایک قوم بننے کے لئے بے حد مضطرب اور بے تاب ہیں لیکن افراد کو قوم بننے کے لئے ایسے ہی دشوار گذار مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ جیسے قطرے کو گوہر بننے کے لئے۔ اور ہندو تو اس وقت تک ایک قوم بن ہی نہیں سکتے جب تک کہ وہ اپنے تمام موجودہ معاشرتی نظام کو یکسر بدل نہ ڈالیں۔ نہ ہی مسلمان لیڈر اور سیاست دانوں کو اس قسم کے عیارانہ اور گمراہ کُن استدلالات کی رو میں بہہ جانا چاہیئے کہ ترکی اور ایران اور دیگر ممالک اسلامیہ کے باشندے قومی یعنی جغرافیائی نظریات کے ماتحت ترقی کرتے جا رہے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات بالکل مختلف ہیں، ہندوستان سے باہر کے اسلامی ممالک میں قریب قریب تمام آبادی مسلمانوں کی ہے اور وہاں کی اقلیتیں بہ اصطلاح قرآن کریم "اہلِ کتاب" پر مشتمل ہیں اور اہلِ کتاب اور مسلمانوں کے درمیان کوئی معاشرتی حدبندی نہیں ہے۔ کوئی یہودی یا عیسائی یا اہلِ زرتشت اگر مسلمان کے کھانے کو چھو دے تو اس کا کھانا بھرشٹ نہیں ہو جاتا اور اسلامی شریعت میں اہلِ کتاب کی عورتوں کیساتھ شادی بھی جائز ہے۔ اسلام نے تمام نوعِ انسانی میں ایک وحدت پیدا کرنے کے لئے پہلا عملی قدم یہ اُٹھایا کہ ان لوگوں کے آگے بڑھنے اور اتحاد پیدا کرنے کی دعوت دی جن کا اخلاقی نصب العین اسلام کے نصب العین سے قریب تر تھا۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے

يَاأَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ

اے اہل کتاب آؤ اس حقیقت پر متحد ہو جائیں جو ہمارے اور تمہارے درمیان قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسلام اور عیسائیت کی جنگوں نیز اہل یورپ کی مختلف النوع چیرہ دستیوں نے اس آیۂ مقدسہ کے لامتناہی مفہوم کو دنیائے اسلام میں عملی جامہ پہننے کا موقعہ نہ دیا۔ آج اسلامی ممالک میں اس حسین خواب کی تعبیر اس رنگ میں ہو رہی ہے جسے "اسلامی قومیت" کہا جاتا ہے۔

میرے لئے یہ عرض کرنا چنداں ضروری نہیں کہ ہمارے نمائندے جتنے زیادہ اس بات میں کامیاب ہوں گے کہ وہ غیر مسلم نمائندوں کو ہمارے "دہلی ریزولیوشن" کے مطالبات کو تسلیم کرنے پر رضا مند کرلیں، اتنی ہی ان کی کامیابی زیادہ سمجھی جائے گی۔ اگر یہ مطالبات منظور نہ کئے گئے تو پھر قوم کے لئے موت اور حیات کا سوال درپیش ہوگا۔ اس وقت مسلمانوں کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر متحدہ طور پر عملی قدم اٹھائیں۔ اگر آپ سچ مچ اپنے مقاصد اور آرزوؤں کی تکمیل کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپ کو اس متحدہ عمل کے لئے ہر وقت آمادہ رہنا چاہیئے۔ اکابرینِ سیاسی معاملات کے متعلق کافی غور و تدبر کر چکے ہیں جس نے ہمارے دلوں میں ان قوتوں کا کم و بیش احساس ضرور پیدا کر دیا ہے۔ جو اس وقت ہندوستان کے اندر اور باہر کی قوموں کی تقدیروں کو سانچے میں ڈھال رہی ہیں۔ لیکن میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا انہوں نے ہمیں اس عملی قدم کے لئے بھی تیار کر دیا ہے جس کے لئے مستقبل میں رونما ہونے والے حالات متقاضی ہوں گے۔ میں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ دورِ حاضرہ میں مسلمان دو مصیبتوں میں مبتلا ہیں۔ پہلی مصیبت قحط الرّجال کی ہے۔ سر میلکم ہیلی اور لارڈ اردون کی یہ تشخیص بالکل صحیح تھی کہ مسلم قوم میں رہنماؤں کا فقدان ہے جیسا کہ انہوں نے علی گڈھ یونیورسٹی کے طالب علموں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ لیڈروں سے میری مراد ایسے حضرات ہیں جنہیں مبدا فیض کی کرم گستری یا مشاہدات و تجربات کی بنا پر ایک طرف اسلام کی روح اور اس کے منتہائے نگاہ کے متعلق بصیرتِ تامہ حاصل ہو اور دوسری طرف عصرِ حاضرہ کے

تاریخی شواہد بھی ان کی نگاہوں کے سامنے بے نقاب ہوں۔ ایسے لوگ درحقیقت وہ زندہ قوتیں ہوتے ہیں جو قوم کے عروقِ مُردہ میں خونِ زندگی پیدا کر دیتے ہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ وہ اللہ کی دین ہوتے ہیں، جسے چاہے دے، حسبِ فرمائش بنوائے نہیں جا سکتے۔ دوسری مصیبت جو مسلمانوں کو تباہ کر رہی ہے یہ ہے کہ ان کے دل سے احساسِ اجتماعیت فنا ہو رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ افراد اور چھوٹے چھوٹے فرقے الگ الگ راستوں پر گامزن ہو رہے ہیں اور ان کا کوئی کام ملت کے اجتماعی افکار و اعمال کو کچھ فائدہ نہیں پہنچاتا۔ ہم آج میدانِ سیاست میں وہی کچھ کر رہے ہیں جو صدیوں تک مذہب کے دائرے میں کرتے رہے ہیں۔ لیکن فرقہ بندی کے فروعی جھگڑے ہماری اجتماعیت کو نقصان نہیں پہنچا سکے۔ ان جھگڑوں سے کم از کم یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اصلِ اصول (مذہب) جو ہماری اجتماعیت کا نقطۂ ماسکہ ہے اس سے ہمیں گہری دل چسپی ہے۔ پھر یہ اصول اپنے اندر اتنی وسعت رکھتا ہے کہ کوئی گروہ یا فرقہ اس حد تک سرکش نہیں ہو سکتا کہ وہ مسلمانوں کی جماعت سے کٹ جائے۔ لیکن سیاسیات کے دائرے میں انتشار اور بالخصوص ایسے مواقع پر انتشار جب کہ قوم کی زندگی کا انحصار ہی اتحادِ عمل پر ہو قوم کو فنا کر کے رکھ دیتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم ان ہر دو مصیبتوں کا علاج کیا کریں۔ پہلی مصیبت (یعنی صحیح رہنماؤں کا فقدان) کا علاج تو ہمارے بس میں نہیں ہے۔ البتہ دوسری مصیبت (عدم احساسِ اجتماعیت) میرے خیال میں ناقابلِ علاج نہیں۔ اس باب میں میرے سامنے ایک منظم لائحہ عمل موجود ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جب تک وہ مزعومہ خطرہ پیدا نہ ہو جائے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ صورتِ حالات پیدا ہو جائے تو اس وقت ضرورت ہو گی کہ ہر طبقے اور ہر گروہ کے ممتاز افراد کا بر ملت ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھیں۔ اس لئے نہیں کہ ریزولیوشن پاس کئے جائیں۔ بلکہ اس لئے کہ مسلمانوں کے لئے آخری طریق کار متعین کیا جائے، اور انہیں حصولِ مقاصد کا عملی راستہ بتایا جائے۔ میں نے اس خطبہ میں دوسری شکل کا تذکرہ صرف اسلئے کر دیا ہے کہ آپ اسے اپنے پیشِ نظر رکھیں اور اس دوران میں اس پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کریں۔

خاتمۂ سخن۔ حضرات! مجھے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکا۔ خاتمہ پر میں اس امر کی اہمیت واضح

کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں پر جو نازک وقت آج آچکا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے اندر وحدتِ افکار وعمل پیدا کر کے مکمل طور پر منظم ہو جائیں۔ ان کی یہ تنظیم ملتِ اسلامیہ اور ہندوستان دونوں کے حق میں مفید ہوتی۔ ہندوستان کی سیاسی غلامی ایشیا بھر کے لئے لامتناہی مصائب کا سرچشمہ بنی رہی ہے اور اس وقت بھی وہی کیفیت ہے۔ اس غلامی نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے۔ اور اس سرزمین کو اظہارِ خودی کی اس مسرت سے یکسر محروم کر دیا ہے جس کی برکت سے یہ کبھی ایک عظیم الشان اور درخشندہ کلچر کی تخلیق کا موجب بنی تھی جس سرزمین (یعنی ہندوستان) کے ساتھ ہمارا جینا اور مرنا وابستہ ہو چکا ہے۔ اس کی طرف سے ہم پر ایک اہم فریضہ عائد ہوتا ہے۔ علاوہ بریں ہم پر ایشیا کی طرف سے اور علی الخصوص مسلم ایشیا کی طرف سے بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ تنہا ایک ملک میں سات کروڑ فرزندانِ توحید کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں: تمام مسلم ایشیا کے ممالک مجموعی طور پر بھی اسلام کے لئے اتنی گراں بہا متاع نہیں جتنی اکیلے ہندوستان کی ملتِ اسلامیہ۔ اس لئے ہمیں ہندوستان کے مسئلہ کو صرف اس زاویہ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیئے کہ ہندوستان میں اسلام کا کیا حشر ہوگا۔ بلکہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس نقطۂ خیال سے بھی کہ ہماری موت اور حیات کا عالمِ اسلامی پر کیا اثر ہوگا۔ ہندوستان اور ایشیا کی طرف سے جو فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں، ان سے ہم کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ جب تک ہمارا نصب العین متعین نہ ہو اور اس کے حصول کے لئے ہم سب منظم طور پر عزم نہ کرلیں۔ ہندوستان کے دیگر سیاسی گروہوں میں ہماری مستقل ملّی ہستی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم منظم ہوں، متحد ہوں۔ ہم آہنگ ہوں۔ ہمارا بکھرا ہوا شیرازہ ان تمام سیاسی مسائل پر جن کے ساتھ ہماری ملت کی موت اور زندگی وابستہ ہے، بہت بُری طرح اثر انداز ہو چکا ہے۔ میں فرقہ وار مسائل میں سمجھوتہ کی طرف سے نااُمید نہیں ہوں، لیکن مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستان میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمان کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کر کے ان کا مقابلہ کرنا پڑے اور ایسے خطرناک حالات میں آزاد راہِ عمل وہی قومیں اختیار کر سکتی ہیں جو حصولِ مقاصد کے لئے تُلی بیٹھی ہوں اور اپنے تمام عزائم کو ایک

متحدہ نصب العین پر مرکوز کئے ہوئے ہوں۔ اچھا تو کیا اس بات کے امکانات موجود ہیں کہ مسلمانوں میں اس قسم کی وحدتِ افکار پیدا ہو سکے۔ ہاں! یہ ممکن ہے۔ اس کے لئے طریقِ عمل یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو پارٹی بازی کے محدود مفاد اور ذاتی اغراض کی سطح سے بلند کر لیں اور اس بلند ترین نصب العین کی روشنی میں جس کی نیابت کے لئے دنیا میں ملّتِ اسلامیہ کا وجود قائم ہے اپنے انفرادی اور اجتماعی اعمال کی قدر و قیمت متعین کریں خواہ وہ اعمال مادی اغراض و مقاصد کے حصول کی خاطر ہی کیوں نہ ہوں اس مادیت کے کثیف مقاصد سے روحانیت کی لطیف منازل کی طرف گامزن ہو جیئے۔ مادہ ہنشأ کا مظہر ہے اور روح نورانیت۔ زندگی اور وحدانیت کی قندیل۔ مسلمانوں کی تاریخ سے میں نے ایک سبق سیکھا ہے اور وہ یہ کہ ان کی تاریخ کے نازک ترین ادوار میں مذہب (اسلام) نے ملّت کو بچایا ہے نہ کہ ملّت نے مذہب کو (یعنی اگر اسلام کی حفاظت کی طرف توجہات مرکوز کرو گے تو تم خود بخود محفوظ ہو جاؤ گے اور اگر یہ سمجھو گے کہ مسلم افراد کی حفاظت ہو جائے تو اسلام بھی محفوظ ہو جائے گا تو یہ خام خیالی ہے)۔ اگر آج آپ اپنے تمام تصورات اور تخیلات کو صرف اسلام کے نقطۂ ماسکہ پر مرتکز کر دیں۔ اور جو زندہ اور پائندہ قائم و دائم نظریۂ حیات وہ پیش کرتا ہے اس سے اپنی بصیرت حاصل کریں تو اس سے آپ اپنی منتشر قوتوں کو پھر سے مجتمع اور گم گشتہ مرکزیت کو از سرِ نو حاصل کر لیں گے۔ اور یوں اپنے آپ کو تباہی و بربادی کے مہیب جہنّم سے بچا لیں گے۔ قرآنِ کریم کی ایک عظیم الشان آیت[1] میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ تمام نوعِ انسانی کی تخلیق اور نشأۃِ ثانیہ ایک فردِ واحد کی تخلیق اور نشأۃِ ثانیہ کے مثل ہوتی ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ آپ حضرات جو بحیثیت قوم نوعِ انسانی کے متعلق اس بلند ترین تصور کے اوّلین مظہر ہونے کے جائز مدعی ہو سکتے ہیں باہمی بے تعلقی کو چھوڑ کر ایک جسدِ واحد کی طرح ایسی زندگی بسر کریں (کہ اگر پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا چبھے تو آنکھ کے آبگینہ میں آنسو چھلک آئے) جب میں یہ کہتا ہوں کہ ہندوستان میں معاملات جس طرح بظاہر نظر آتے ہیں، ان کی حقیقت اس سے کہیں مختلف ہے تو اس سے میں آپ کو کسی چیستان میں اُلجھانا نہیں چاہتا۔ ان الفاظ کا صحیح مفہوم آپ کے اُفقِ دماغ پر اس وقت

---

[1] مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ۔ الآیۃ

نور افشاں ہوگا جس وقت آپ انہیں حقیقی "اجتماعی خودی" کی روشنی میں دیکھنے کا ملکہ حاصل کر لیں گے قرآنِ کریم کے الفاظ میں

عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

(اپنی خودی کا استحکام کرو اگر تم خود صحیح راستہ پر گام زن ہو گے تو کوئی غلط راستہ پر چلنے والا تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔)

(یہ ہے وہ خطبہ جسکے متعلق ہم نے لمعات میں لکھا کہ اس وقت جب کہ فکر و نظر کی پریشانیوں کی وجہ سے مسلمانانِ ہند کے سامنے کوئی واضح نصب العین نہیں ہے۔ حضرتِ علامہؒ کے یہ ارشاداتِ گرامی روشنی کے بلند مینار کی طرح ساحلِ مقصود کی طرف صحیح راہنمائی کر رہے ہیں۔ یہ خطبہ ایسا نہیں ہے کہ آپ اسے ایک مضمون کی طرح سرسری نگاہ سے پڑھ ڈالیں اور پھر اُٹھا کر رکھ چھوڑیں۔ بلکہ اس کا ایک ایک فقرہ اور ایک ایک لفظ اس قابل ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے، اور جب تک ایک بات کا صحیح مفہوم واضح طور پر ذہن نشین نہ ہو جائے آگے نہ بڑھا جائے جب اس طرح یہ گراں قدر خیالات آپ کے خاطر نشین ہو جائیں گے تو اس وقت آپ کو معلوم ہوگا کہ اقبالؒ کا صحیح مقام کیا تھا۔ اور پھر آپ سمجھ سکیں گے کہ حضرتِ علامہؒ نے یہ کیوں فرمایا تھا کہ ؎

چو رختِ خویش بربستم ازیں خاک   همه گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر   چه گفت و با که گفت و از کجا بود

طلوعِ اسلام)

طلوعِ اسلام — جون ۱۹۳۹ء

متبادل دستورِ ہند

Alternative Constitution for India.

ذیل میں ہم محترم ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب کے مرتب فرمودہ متبادل دستورِ ہند (Alternative Constitution.) کے پورے مسودے کا خاص ترجمہ[1] شائع کرتے ہیں۔ اس مسودہ کا اصل متن سب سے پہلے اسٹیٹسمین بابت [illegible] ۲۱ میں شائع ہوا تھا۔

قارئین سے مخفی نہ ہوگا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی رُو سے ہندوستان کے لئے ایک ایسا وفاقی نظام (فیڈریشن اسکیم) زیرِ غور ہے جو اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ ہندوستان میں متحدہ قومیت موجود ہے۔ چونکہ یہ مفروضہ حقیقتِ نفس الامری کے خلاف ہے اس لئے ظاہر ہے کہ کوئی ایسا نظام جس کی رُو سے مسلمانوں کا ملّی وجود مفقود ہو جائے کسی صاحبِ احساس و بصیرت مسلمان کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مسلم لیگ نے اس نظام کی واضح الفاظ میں مخالفت کی ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ اگر مسلمانوں کے لئے ایسا نظام قابلِ قبول نہیں ہے تو وہ کس قسم کا نظام چاہتے ہیں۔ یہ مسئلہ لیگ کے زیرِ غور تھا کہ ہمارے محترم ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب نے اس مشکل مسئلہ کا نہایت عمدہ حل پیش کر دیا۔ اور اُنہوں نے ایک ایسے وفاق کا خاکہ تیار فرمایا جو تہذیبی متجانس مملکتوں ـــ (Culturally Homogeneous States.) پر مشتمل ہو۔ چونکہ یہ خاکہ ایک مسلمان کا تیار کردہ ہے جو اپنے خدا کی طرف سے ہمیشہ عدل و انصاف پر مامور ہے اس لئے اس دستور میں ہندوستان کی کسی قوم پر کسی قسم کی کوئی زیادتی نہیں کی گئی ہے بلکہ کوشش کی گئی ہے کہ ہر قوم کو اپنی اپنی تہذیب اور کلچر کے ماحول میں پورے نشوونما و ارتقاء کے مواقع بہم پہونچائے جائیں جیسا

---

[1] مولوی خواجہ محمد معین الدین صاحب حیدرآبادی بی۔ اے عثمانیہ نے ہماری درخواست پر ترجمہ فرمایا ہے۔

کہ ہم سابقہ اشاعتوں میں بیان کر چکے ہیں۔ شمال مغرب میں ایک اسلامی علاقے (Block) کے قیام کا خیال حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی فراست و تدبر کا رہین منّت ہے۔ آپ پہلے شخص تھے جو ہندوستان میں واحد متجانس قوم کی تخلیق کے عدمِ امکان کا صحیح صحیح اندازہ لگا چکے تھے۔ اس امر کا اعلان آپ کو ان کے اس خطبۂ صدارت میں ملیگا جو طلوعِ اسلام میں شائع ہو چکا ہے۔ آپ جس تحریک کے بانی تھے وہ بعد میں "پاکستان" کے نام سے موسوم ہوئی۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب نے موجودہ حالات کی روشنی میں اسی تحریک کو وسعت دی ہے اور شمال مغرب میں مسلم علاقے کے قیام کی تجویز کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے بقیہ ملک کے مسلم مفاد کو بھی اپنی اسکیم میں شریک کر لیا ہے۔ صاحبِ موصوف نے یہ اصول پیش کیا ہے کہ ہر تہذیبی وحدت (Cultural Unit) خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایک ایسا مسکن (.Home-Land) ملنا چاہیئے جہاں وہ دوسری وحدتوں کے ساتھ خوش گوار تعلقات قائم رکھتا ہوا اپنے تہذیبی انداز پر ترقی کر سکے اس نظریہ کی وضاحت ڈاکٹر صاحب نے اپنے مشہور مقالہ "ہندوستان کے تہذیبی مستقبل" میں کی ہے (جو طلوعِ اسلام میں شائع ہو چکا ہے)۔ موجودہ اسکیم ایک عملی خاکہ ہے جو اس نظریہ کو قطعی صورت عطا کرنے کے لئے مرتب کیا گیا ہے۔

چونکہ اس اسکیم کی رُو سے مسلمانوں کو اپنی تہذیب کے ماحول میں اپنے جُداگانہ تشخص کے قیام و بقا کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے ہندو۔ اور ہندو نواز حضرات کی طرف سے اس کی مخالفت ضروری تھی۔ اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس اسکیم کی رو سے ہندوستان کے حصے بخرے کئے جا رہے ہیں۔ یہ اعتراض بالکل سطحی ہے۔ اسکیم کا مقصد تفریق و تشتت نہیں، بلکہ اس کا مقصد حقیقی بنیادوں پر ہندوستان کو ایک دوامی اتحاد عطا کرنا ہے۔ بالفاظِ دیگر اسکیم کا حقیقی مقصد جس کو بحث و تمحیص میں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ یہ ہے کہ ملک متحد کیا جائے۔ لیکن یہ اتحاد ایسے مفروضات پر مبنی نہ ہو جسے اکثریت نے اپنا

مفاد کی خاطر وضع کر رکھا ہے بلکہ ان حقیقتوں پر مبنی ہو جن سے چشم پوشی کرنا تمام مشکلات کا سرچشمہ ہے۔ ہندو قومیتوں کو ہندوستان کی تہذیبی تقسیم کے خلاف کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ خود کانگریس کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ اور سچ پوچھا جائے تو کانگریس کی مقابلہ میں یہ اسکیم زیادہ مکمل ہے کیونکہ کانگریس کے ذہن میں تہذیبی تقسیم صرف لسانی بنیاد پر ہے اور اسکیم زیرِ نظر کا اصول ایسا جامع ہے کہ اس میں لسانی پہلو بھی داخل ہو جاتا ہے۔ پھر کانگریس کی تقسیم مسلمانوں کو تہذیبی خود مختاری Cutural Autonomy عملاً نہیں کرتی۔ برخلاف اسکے اس اسکیم میں ہر تہذیبی وحدت کے لئے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایک مسکن تجویز کیا گیا ہے۔ جس میں وہ اپنی مرضی کے مطابق ترقی کر سکے۔ اور دوسری وحدتوں کے ساتھ خوش گوار تعلقات قائم رکھ سکے۔ یہ اسکیم ہندو مسلم مسئلہ کا پُر امن حل ہے اور اس کے ذریعے ایک ایسا نظامِ زندگی پیدا کرنا مقصود ہے جس میں کسی اقلیت کو اکثریت کی چیرہ دستیوں کا خوف نہ ہو۔

اس وقت ملک کو جس چیز پر فوری توجہ کرنے کی ضرورت ہے وہ متبادل دستور ہے جو قانون ۱۹۳۵ء کے بجائے پیش کیا گیا ہے۔ نصب العین تو یہ ہے کہ ہندوستان کو باقاعدہ تہذیبی منطقوں (Cultural Zone.) میں تقسیم کر دیا جائے لیکن اس نصب العین تک پہنچنے کے لئے ایک عبوری مرحلہ (Transitory Period) .... بھی ناگزیر ہے۔ یہ عارضی قانون اس مرحلہ کے طے کرنے میں ممد ہوگا نصب العین تک پہونچنے کے لئے ایک مقام پر جبری تبادلۂ آبادی کا سوال بھی آجاتا ہے لیکن دستور زیرِ نظر کے بموجب سردست یہ سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کانگریس کا یہ دعوے کہ وہ تمام اقوامِ ہند کی مشترکہ نمائندہ اور ان کے مفاد کی محافظ ہے۔ درست ہوتا تو اس قسم کا دستور فوراً کانگریس کی طرف سے پیش ہونا چاہیئے تھا لیکن کانگریس کی حقیقت اب بے نقاب ہو چکی ہے اس لئے اس کی طرف سے کوئی

ایسی کوشش کیوں ہو جس کی رُو سے مسلمان بھی آزادی کی فضا میں سانس لے سکے ہم ہندوستان کے ہر صاحب بصیرت سے درخواست کریں گے کہ وہ اس مجوزہ دستور پر ٹھنڈے دل سے غور کرے۔ اس دستور کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ یہ اوّلاً وفاقی (Federal List) کو آخری ترین درجہ تک گھٹا کر ہر صوبہ داری وحدت کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری عطا کرتا ہے اور یہاں کسی سیاسی جماعت کو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔ دوئم یہ دستور انگریزی انداز کی پارلیمنٹری عاملہ (Parliamentary Executive.) کی بجائے جو ہندوستانی حالات کے ماتحت اکثریت کی حکومت کے مرادف ہوتی ہے۔ صوبوں اور مرکز میں ایک ایسا مخلوط اور مستحکم عاملہ (Composite Stable executive.) تجویز کرتا ہے جس کی پالیسی متفق علیہ ہو اور جس کی مثال امریکہ کا عاملہ ہے۔ جو لوگ ہندو مسلم اتحاد کے خواہاں ہیں انہیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ دونوں قوموں کے باہمی اشتراکِ عمل کا یہی ایک دانشمندانہ طریقہ ہو سکتا ہے۔ متبادل دستور کے یہ اہم اجزا ہیں۔ اب ہندو اربابِ سیاست کا فرض ہے کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ اس پر غور فرمائیں۔

ہمارے نزدیک تو اس اسکیم کے خلاف ہندوؤں کی طرف سے صرف ایک ہی اعتراض ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ اس کی رُو سے ہندوؤں کے وہ خواب جن کی رُو سے مسلمانوں کی حیثیت اس ملک میں اچھوتوں سے زیادہ نہیں رہنے پاتی، شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکیں گے یہ اسکیم سردست مسلم لیگ کے زیرِ غور ہے ممکن ہے وہ اس میں جزئی تبدیلیاں کر دے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تحریکِ پاکستان کے حامیوں کے زاویہ نگاہ سے زیادہ مطابقت دینے کے لئے اس اسکیم میں کسی اور فرعی ترمیم کی ضرورت لاحق ہو جاتی لیکن جہاں تک اصول کا تعلق ہے، دستور و آئین کے ماتحت اس اسکیم کے مطابق دستور ہی مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ

فیڈریشن کی کسی متبادل اسکیم کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں تو اس کا اطلاق ان تجاویز پر بھی ہو سکتا ہے جو کانگریس اپنی یثاق (Convention) کے ذریعے پیش کرے گی۔ لیکن اگر کانگریس گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی مذمت ایمانداری کے ساتھ کر رہی ہے تو اس کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ وہ اس متبادل دستور میں مسلم لیگ کے ساتھ اتفاق نہ کرے اور پارلیمنٹ کو اس کے قبول کرنے پر مجبور نہ کرے کیوں کہ یہ دستور اتحاد کا دستور ہے۔ افتراق کا نہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہ اسکیم یا اس قسم کی اور کوششیں آئینی جدوجہد اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس آئینی تبدیلیوں کی زمانہ میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کس طرح ہو سکتا ہے ورنہ یہ تو ظاہر ہے کہ ہمارے نزدیک ایک مسلمان کا نصب العین تو حکومتِ الٰہی کا قیام ہے اور بس لیکن جن حالات میں ہم گھر چکے ہیں۔ ان کے ماتحت اس قسم کی آئینی کوششیں بھی نہایت ضروری ہیں اسلئے جناب ڈاکٹر عبداللطیف صاحب فی الحقیقت تمام قوم کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں اور اگر برادرانِ وطن تنگ نظری سے کام نہ لیں تو ان کی طرف سے بھی مستحق مبارک باد ہیں۔ چونکہ یہ اسکیم ایک قانونی مسودہ ہے۔ اس لئے اس کا ترجمہ اصطلاحی ہے۔ اصل مقصد تک پہنچنے کے لئے سرسری مطالعہ نہیں بلکہ غور و تدبر کی بھی ضرورت ہوگی۔ طلوعِ اسلام۔

مسودہ اسکیم جس کو ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب حیدرآبادی نے آل انڈیا مسلم لیگ کی ذیلی کمیٹی کے ایما پر جو بمقام لاہور بتاریخ ۲۹ جنوری ۱۹۳۹ء عیسوی منعقد ہوئی تھی مرتب کیا ہے یہ مسودہ حسبِ ذیل اجزاء پر مشتمل ہے

(۱) قرارداد برائے منظوری آل انڈیا مسلم لیگ جس میں حسب صراحت فہرست منسلکہ ہندوستان کے لئے نئے دستور کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

(۲) فہرست منسلکہ کے تین حصے ہیں

(الف) حصہ اول و دوم میں اس نصب العین کی وضاحت کی گئی ہے جو مسلمانانِ ہند کے پیش نظر رہنا چاہیئے۔

(ب) حصہ سوم میں قانون حکومت ہند بابتہ ۱۹۳۵ء کی مجوزہ فیڈریشن کی اسکیم کی بجائے ایک متبادل اسکیم کا خاکہ پیش کیا گیا ہے جو نصب العین مندرجہ (الف) کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔

۱۵ مارچ ۱۹۳۹ء شرح دستخط حاجی سر عبداللہ ہارون

مسودہ قرارداد

برائے منظوری مسلم لیگ

چونکہ قانون حکومت ہند بابتہ ۳۵ء میں جو دستور تجویز کیا گیا ہے وہ مسلمانان ہند کے لئے ناقابل قبول ہے کیونکہ:-

(الف) یہ دستور اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ ہندوستان کی آبادی ایک مخلوط (Composite) قوم پر مشتمل ہے، حالاں کہ یہ صحیح نہیں ہے اور نہ آئندہ اس کی توقع کی جا سکتی ہے کیونکہ اس ملک کی دو بڑی قومیں ہندو اور مسلمان دو مختلف معاشرتی نظامات سے تعلق رکھتی ہیں اور اپنی زندگی کے ہر جزو میں دو اساساً مختلف مذاہب اور تہذیبوں سے رہنمائی حاصل کرتی ہیں۔

(ب) اس دستور کے تحت جو جمہوری اکثریتی حکومت (Democratic Majority Govt) قائم کی جانے والی ہے اور جس کی مثال اس وقت ایک سے زیادہ صوبجاتی وحدتوں میں موجود ہے وہ فی الحقیقت ایک ہی غالب قوم یعنی ہندوؤں کی حکومت ہوگی جنکے رحم و کرم پر دوسری قوموں کو زندگی بسر کرنا پڑے گی۔

(ج) یہ دستور مسلمانوں کو نہ صرف مرکز بلکہ کثر برطانوی صوبہ جات اور معدودے چند کے سوا

باقی سینکڑوں دیسی ریاستوں میں دوامی طور پر ایک بے دست و پا اقلیت (Minority) بنا دیتا ہے۔

(د) یہ دستور مسلمانوں کو ان کے معاشی احیاء اور اسلامی اصول پر آزادانہ تہذیبی ترقی کے مواقع عطا نہیں کرتا۔

(ک) یہ دستور ملک میں مسلمانوں کی تاریخی اہمیت کو زائل کر دیتا ہے اور ان کے لئے ایسی حیثیت اختیار کرنے کے امکان کا ہمیشہ کے لئے سدِّباب کر دیتا ہے جس کے ذریعے وہ ملک کے نظم و نسق پر اپنا مفید اثر ڈال سکیں اور۔

(و) یہ دستور ہندو اور مسلمانوں کے موجودہ تہذیبی اختلافات کو جو مذہبی، سماجی، معاشی تعلیمی اور سیاسی اُمور میں رُونما ہیں اور جن کی وجہ سے ہندوستان کی آزادی غیر معیّن طور پر ملتوی ہوتی چلی جا رہی ہے ترقّی دیتا اور دوام عطا کرتا ہے۔

لہٰذا مسلم لیگ برطانوی پارلیمنٹ سے مطالبہ کرتی ہے کہ قانون حکومت ہند بابتہ ۱۹۳۵ء کو کسی ایسے قانون سے بدل دے جو ملک کو حسب صراحت فہرست (۱)، قرارداد ہذا تہذیبی متجانس آزاد مملکتوں کے احدیہ (Confedracy of culturally homogeneous free States) میں منسلک کر دے۔

فہرست اوّل

حصّہ اوّل

تمہید

تہذیبی اساس پر متجانس مملکتوں (Culturally Homogeneous States) کے احدیہ (Confederacy) کے قیام کے لئے ملک کی ایسی تہذیبی وحدتوں

(Cultural Units) یا قوموں کو جو اپنی تعداد یا معاشی حیثیت سے متجانس ملکتیں بن سکتی ہیں مختلف منطقوں (Zones) میں تقسیم کرنا ضروری ہے۔ چونکہ یہ تقسیم ہندوستان کی دو بڑی قوموں یعنے ہندو اور مسلمان کے مابین ہو سکتی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو یہ بتانا چاہیئے کہ ان کے لئے ایسے منطقے کہاں قائم کئے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد ملک کا جو حصہ بچ رہتا ہے اس کو ہندو منطقوں میں تقسیم کر لیا جا سکتا ہے تاکہ ہر دو قومیں اپنے اپنے منطقوں میں محفوظ رہ کر آزادی کیساتھ ایک احدیہ میں شامل ہو سکیں۔ چھوٹی قومیں مثلاً عیسائی۔ اینگلو انڈین۔ بدھ اور پارسی جہاں اب ہیں وہیں رہ سکتی ہیں۔ کیونکہ وہ مسلمانوں یا ہندوؤں سے ایسے تہذیبی اختلافات نہیں رکھتیں جو نا قابلِ مصالحت ہوں۔ ان کو ملک کے دستور کے تحت معقول اور مؤثر تہذیبی تحفظات (Safe Guards) حاصل رہیں گے یا اگر وہ چاہیں تو ہندو اور مسلم منطقوں میں جہاں بھی ممکن ہو ان کے لئے مراکز (Cantons) مقرر کر دئے جا سکیں گے۔

(ب) ایسے منطقوں کے قیام کے لئے وقت درکار ہے۔ کیونکہ اس کے لئے تبادلہ آبادی ضروری ہو اور یہ تبادلہ ترکی اور یونان کے ۱۹۲۳ء کے تبادلہ آبادی کے اصول پر ایک مقررہ میعاد میں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ کام آغاز ہو حدود کا تعین ہو جانا چاہیے۔ تبادلہ آبادی کا مسئلہ آخر کار جائداد کے معاوضہ کا مسئلہ ہو گا جو نقل وطن کرنے والے چھوڑ جائیں گے۔ اس کا تصفیہ متعلقہ حکومتیں آپس میں کر سکتی ہیں۔ اس تبادلہ میں جو لوگ متاثر ہوں گے۔ ان کے رجسٹرات کی ترتیب کا کام نیز دو قوموں کے مابین مالی ذمہ داریوں کا تعین عبوری دور میں کیا جا سکتا ہے۔ منطقوں کے تعین کے لئے شاہی کمیشن کا تقرر ضروری ہو گا اور اس کمیشن کے غور کے لیے ۱۹۴۱ء کی مردم شماری ابتدائی مواد فراہم کر سکتی ہے۔

ہندوستان کیلئے دائمی احدیہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب کہ یہ منطقے قطعی طور پر قائم ہو جائیں اور ان کو تہذیبی بنیاد پر متجانس بنایا جائے اس چیز کو آخری مقصد اور ہندوستان کے اتحاد کے مسئلہ کا واحد حل قرار دے کر عبوری دور کے لئے ایسا دستور مرتب کیا جا سکتا ہے، جو پورے ملک کے

لئے سیاسی اتحاد کی طمانیت عطا کرنے کے ساتھ ساتھ کسی قوم کو دوسری قوم پر غالب آنے کا موقع نہ دے اور پھر بھی سب کے لئے مطلوبہ متجانس آزاد ملکتوں کے ارتقا کی غرض سے مشترکہ طور پر کوشش کرنے کی اخلاقی ترغیب موجود ہو۔

عبوری دستور اجمالی طور پر فہرست ہذا کے حصۂ سوم میں بیان کیا گیا ہے اور یہی اسوقت ہماری توجہ کا محتاج ہے۔

حصۂ دوم

منطقوں کی تقسیم

مگر عبوری دستور کا خاکہ پیش کرنے کے قبل یہ ضروری ہے کہ ان منطقوں (Zones) کو اجمالاً بیان کر دیا جائے جو آخر کار قائم ہوں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قطعی حدود کا تعیّن شاہی کمیشن کرے گا، مگر اس اجمال سے اسکیم کا نصب العین متعیّن ہوگا اور عبوری دور میں مدد ملے گی۔

مسلم منطقے

موجودہ حالات کے مدِنظر مسلمانوں کے حسب ذیل منطقے قائم کئے جانے چاہئیں۔

(۱) شمال مغربی علاقہ۔ اس وقت مسلمانوں کا ایک بڑا علاقہ شمال مغربی جانب موجود ہے، جو سندھ۔ بلوچستان۔ پنجاب۔ سرحدی صوبہ۔ کشمیر، خیرپور اور بہاولپور پر مشتمل ہے۔ اس پورے رقبہ کو مسلم منطقہ بنایا جا سکتا ہے، جس سے تین کروڑ مسلمانوں کو اپنا ایک مسکن مل جائیگا۔ اس رقبہ میں جو ہندو اور سکھ آباد ہیں ان کو اس رقبہ کی ہندو اور سکھ ریاستوں میں جن پر برطانوی اقتدار اعلیٰ کے ساتھ معاہدات کے تحت حکومتیں قائم ہیں یکجا کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کو ایک آزادانہ متجانس وجود عطا کرنے کے لئے کشمیر اور جموں کے حدود میں تھوڑی سی تبدیلی کی جا سکتی ہے اس ریاست میں مسلم آبادی زیادہ ہے اور یہ ریاست یہاں کے ہندو

فرمانروا کو برطانوی حکومت سے مالی معاوضہ میں عطا ہوئی ہے۔ ملک کے دوامی مفاد کی خاطر یہ ہو سکتا ہے کہ مہاراجہ کو معقول معاوضہ دیکر سابقہ معاملت کا از سرِ نو تصفیہ کیا جائے۔ اسکی صورت یہ ہے کہ یا تو برطانوی پنجاب کا وہ حصہ جو وادی کانگڑہ کہلاتا ہے اور جس کی آبادی زیادہ تر ہندو ہے مہاراجہ کو دے کر اس کی بجائے ریاست کے ان چند حصوں کو جنہیں مسلمان بکثرت آباد ہیں پنجاب کے حوالہ کیا جائے یا کوئی ایسی تجویز کی جائے جس پر تہذیبی متجانس مملکتوں کے مجوّزہ احدیہ کی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے فریقین آپس میں متفق ہوں۔ یہاں یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ امرتسر کو جو مسلم منطقہ میں واقع ہے سکھوں کا آزاد شہر بنا دیا جائے کیونکہ یہ سکھوں کا اہم مذہبی مقام ہے۔

(۲) شمال مشرقی علاقہ۔ ہندوستان کی دوسری جانب یعنے شمال مشرق میں بنگال اور آسام کے تین کروڑ مسلمانوں کا ایک مستحکم علاقہ ہے جس کو ایک آزاد سیاسی وجود عطا کیا جا سکتا ہے

(۳) دہلی۔لکھنؤ کا علاقہ۔ مندرجہ صدر دو علاقوں کے درمیان مسلمان بے تکے پھیلے ہوئے ہیں یہ اپنے سے قریب جو علاقہ ہو انہیں توطن پذیر ہو سکتے ہیں۔ باقی جو مسلمان صوبہ متحدہ اور بہار سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ ہے ان کو ایک نئے علاقہ میں جو صوبہ متحدہ کی مغربی سرحد سے چل کر لکھنؤ پر ختم ہوتا ہے اور جس میں رام پور کو شریک کر لیا گیا ہے مرتکز کیا جا سکتا ہے۔ یہ منطقہ پنجاب کے مسلم علاقہ کے متصل ہو گا مگر اس میں ہندوؤں کے مذہبی مراکز مثلاً متھرا۔ بنارس۔ ہردوار اور الہ آباد داخل نہیں رہیں گے۔

(۴) دکن کا علاقہ۔ وندھیا اور ستپورہ کے جنوب میں مسلمان مختلف وسعتوں کی آبادیوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی تعداد بھی ایک کروڑ بیس لاکھ ہے۔ ان کے لئے ایک منطقہ قائم کرنے کی ضرورت ہے، اس قسم کا منطقہ ممالک محروسہ حیدر آباد اور برار سے بن سکتا ہے مگر اس کے ساتھ جنوب میں ایک تنگ پٹی براہ کرنول و کڑپا مدراس تک لیجانی ہو گی۔ مسلمانوں کا ایک بااثر طبقہ مغربی ساحل کی طرف براہ بیجاپور ایسی راہ کو ترجیح دیتا ہے۔ یہ راہ مسلمانوں کے ایک وسیع تجارت

پیشہ اور ملاح طبقہ کے توطن کے لئے جو صدیوں سے کارومنڈل اور مالابار کے ساحل پر زندگی بسر کرتا چلا آرہا ہے ضروری ہوگا۔

حیدرآباد کو جنوبی مسلم آبادی کے اجتماع کے لئے اس لئے منتخب کیا گیا ہے کہ اس کی حیثیت مرکزی ہے اور اس کی مدد سے ہندوؤں کے پانچ خود مختار تہذیبی منطقے جو مرہٹوں۔ آندھروں تاملوں۔ کنڑوں اور ملایالموں کیلئے علیحدہ علیحدہ مختص ہونگے، بنائے جاسکتے ہیں۔ اگر اس مرکزی مقام سے مسلم منطقہ کو ہٹایا جائے تو ان پانچ ہندو منطقوں میں مداخلت ہوگی جس سے ہندو منطقے منقسم ہو جائیں گے اور ان کی لسانی اور تہذیبی متجانست (Homogenity) متاثر ہوگی۔ اس وقت تین مختلف قومیں یعنے مرہٹے۔ آندھرے اور کنڑے دکن کے ہر دو جانب اپنے حقیقی وطن سے آگے بڑھ کر اس رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں ان کو اپنے اصل مرکز کی طرف واپس ہو جانا پڑے گا۔ اور وہاں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ زندگی بسر کرنی ہوگی تاکہ اس درمیانی حصہ میں کل جزیرہ نما (Peninsula) کے مسلمان جمع ہو سکیں۔

یہ مرکزی حصہ ایک مسلمان فرمانروا کے زیر نگین ہونے کی وجہ سے یہ تصور نہ کیا جائے کہ محض اس بنا پر اس کو مسلمانوں کا وطن بنانے کا خیال پیدا ہوا۔ ایسا نہیں ہے یہ بالکل اتفاقی مطابقت ہے اور توقع ہے کہ اس مطابقت سے تصفیۂ آخر میں معتد بہ سہولت ہوگی۔

چھوٹے مسلم مراکز

جو مسلمان مندرجہ صدر چار مسلم منطقوں کے باہر رہتے ہیں مثلاً جنگی بود و باش راجپوتانہ، گجرات مالوہ اور مغربی دیسی ریاستوں میں ہے وہ ان رقبوں کی دیسی ریاستوں میں جمع ہو سکتے ہیں، نیز ایک نئے جدید آزاد شہر اجمیر میں جو اس اسکیم کے تحت مسلمانوں کے لئے تہذیبی بنیاد پر متجانس ہوگا۔

ہندو منطقے

بقیہ ہندوستان کو مختلف زبانوں مثلاً بنگالی۔ ہندی۔ اوریہ۔ راجستانی۔ گجراتی۔ مرہٹی

تلنگی، تامل، کنڑی اور ملایالم کے اعتبار سے یا جیسا ہندو پسند کریں اس کے مطابق ہندو منطقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

واضح باد کہ ہر تہذیبی منطقہ خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان اپنی فطری مماثلت کے لحاظ سے برطانوی علاقہ اور دیسی ریاستوں پر مشتمل ہوگا۔ ہر ایسا منطقہ ایک متجانس مملکت ہوگا اور جہاں کسی منطقہ میں ایک سے زیادہ وحدتیں ہوں اس کی حکومت اپنے اندرونی معاملات میں آزاد ہوگی مگر وہ کل ہند احدیہ میں دوسری ریاستوں کے ساتھ مطابقت رکھے گی۔

تحفظات

احدیہ کے دستور میں حسب ذیل تحفظات رکھے جائیں گے۔

(۱) قانون اقوام ہند (Public Law of Nations) مختلف اقوام کے افراد ایسے رقبوں میں جن سے ان کا تعلق نہ ہو خاص اغراض کے لئے زندگی بسر کر سکیں گے۔ ان افراد کو ہندوستانی اقوام کے قانون کے تحت جس کو مرکزی حکومت منظور کرے گی، شخصی حفاظت اور شہری حقوق حاصل رہیں گے۔

(۲) مذہبی معابد۔ متروکہ رقبوں کی جملہ مذہبی عبادت گاہوں، یادگاروں اور قبرستانوں کی نگرانی و نگہداشت خواہ وہ ہندوؤں کے علاقہ میں ہوں یا مسلمانوں کے، احدیہ کے متعلقہ منطقہ کی حکومت مرکزی حکومت کی نگرانی میں کرے گی۔

(۳) عیسائی، پارسی اور بدھ مذہب کے پیرو۔ چھوٹی قومیں مثلاً عیسائی اینگلو انڈین، پارسی اور بدھ مذہب کے پیروؤں کو خواہ وہ مسلم سلطنت میں ہوں یا ہندو سلطنت میں وہ تمام مذہبی اور تہذیبی تحفظات عطا کئے جائیں گے جو اپنی انفرادیت (Individualits) کو برقرار رکھنے کے لئے وہ طلب کریں اور اگر وہ چاہیں تو ان کو مراکز (Cantons) کے مطالبہ کا بھی حق حاصل رہے گا۔

(۴) ہریجن - مختلف پست اقوام اور اچھوت جن کو ہریجن کہا جاتا ہے پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں - ان میں مختلف نسلی اختلافات ہیں - ان کی کوئی مشترکہ تہذیب نہیں ہے نہ یہ زمیندار ہیں - لہٰذا ان کو اس بات کی کامل آزادی حاصل رہے گی کہ وہ ہندو اور مسلم علاقوں میں جہاں چاہیں مستقلاً وطن پذیر ہوں ، اور یہاں انہیں عیسائیوں - اینگلو انڈینوں - بدھوں اور پارسیوں کی طرح کامل شہری حقوق حاصل رہیں گے -

یہ اس صورت کا ایک وسیع خاکہ ہے جو تہذیبی متجانس مملکتوں کا احدیہ آخر کار اختیار کریگا نظر برین عبوری دور کو چند منازل میں منقسم کرنا ہوگا تاکہ اس مقصد تک بتدریج رسائی ہو - چنانچہ حصہ سوم میں ابتدائی منزل کو پیش کیا گیا ہے جس پر فوری عمل ضروری ہے -

حصۂ سوم

دستورِ عبوری

ہندوستان کا عبوری دستور ایسا ہونا چاہیئے کہ وہ اس احدیہ کی تصویر میں بیٹھ سکے جسکو حصۂ دوم میں بیان کیا گیا ہے - یہ ہوسکتا ہے کہ اس کی صورت وفاق کی سی ہو بشرطیکہ مرکز کے اختیارات کو اقل درجہ تک گھٹا دیا جائے - مگر اس وفاق کو ایسی وحدتوں پر مشتمل ہونا چاہیئے جن کو آگے چل کر مطلوبہ تہذیبی منطقوں میں منسلک کیا جاسکے - اس کے لئے فوری تبادلۂ آبادی کے بغیر تہذیبی یا لسانی اصول پر چند نئے صوبجات کے قیام کی ضرورت ہے نئے صوبجات کو جزوی طور پر بھی قائم کیا جاسکتا ہے ، لیکن ان میں سے ایک صوبہ کو موجودہ صوبہ متحدہ سے فوراً تراشنا پڑے گا اور اس کا مرکز لکھنؤ ہوگا - اس صوبہ کی تشکیل اس مقصد کے پیش نظر ہونی چاہیئے کہ وہ آئندہ چل کر صوبہ متحدہ اور بہار کے مسلمانوں کا مستقل مسکن اور مسلم منطقہ ہوگا -

وفاقِ عبوری

Transitional Federation.

یہ دستوری ماہرین کا کام ہے کہ وہ عبوری دستور کی تفصیلات کو مرتب کریں لیکن جو بھی دستور مرتب ہو اس میں حسب ذیل شرائط رہنے چاہئیں۔

(۱) تمہید میں یہ صاف طور پر بتا دیا جانا چاہیئے کہ عبوری وفاق کے دستور کا مقصد ہندوستان میں تہذیبی متجانس آزاد مملکتوں کے احدیہ کا قیام ہے۔

(۲) قانون سازی — Legislation.

(الف) وفاقی مجلسِ مقننہ (Federal Legislation) کی فہرست کو اقل درجہ تک گھٹا دینا چاہیئے اور صرف ان مدات تک محدود کر دینا چاہیئے جن کا تعلق ملک کے مشترکہ سیاسی اور معاشی مفادات سے ہو۔

(ب) بقیہ مدات صوبہ واری فہرست میں بشرائط ذیل داخل رہیں گے۔

منطقی مجالس — Regional Boards.

بعض ایسے تہذیبی اور معاشی معاملات ہو سکتے ہیں جو ملحقہ وفاقی وحدتوں ...... (Contiguous Federal Units) کے نزدیک مشترکہ اہمیت رکھتے ہوں۔ ان کے لئے منطقی مجالس مفید ہوں گے تاکہ ایک مشترکہ پالیسی تجویز کی جائے اور وفاقی وحدتوں کو اس مشترکہ پالیسی کی رہنمائی میں حسب صوابدید خود ضروری قوانین بنا لینے کی اجازت دیدی جائے۔ ایسے تین منطقے حسب ذیل ہو سکتے ہیں۔

(۱) شمال مغربی منطقہ جو سندھ، بلوچستان، صوبہ سرحدی، کشمیر، خیرپور اور علاقہ پنجاب کی دیسی ریاستوں پر مشتمل ہوگا۔

(۲) شمال مشرقی منطقہ جس میں بنگال اور آسام شامل ہونگے۔

(۳) ممالک محروسہ حیدرآباد دبرار۔

اس ترتیب کے دو فوائد ہیں۔

(۱) اس کی بدولت تہذیبی قانون سازی، وفاقی اقتدار سے خارج ہو جائے گی۔

(۲) اس سے ایک منطقی شعور پیدا ہوگا جو تہذیبی خود مختار Culturally Autonomous) مملکتوں کے نشوونما کے لئے ضروری ہے۔

مسلمانوں کے تحفّظات

عبوری وفاقی دستور کی نوعیت خواہ کچھ ہی ہو، خواہ وہ جدید وحدتوں پر مشتمل ہو جسکی صراحت اُوپر کی گئی ہے یا اس میں وہی وحدتیں ہوں جو اس وقت موجود ہیں، بہرحال مسلمانوں کو دستور میں حسب ذیل تحفّظات کی ضرورت ہوگی۔

(الف) مجالس مقنّنہ میں نمائندگی

(۱) مسلمانوں کے لئے جُداگانہ حلقہ ہائے انتخاب (Separate Electorates.) کا طریقہ قائم رہے گا، نیز وہ تناسب بھی جو اس وقت مسلمانوں کو مختلف مجالسِ مقنّنہ (Legislatures) میں حاصل ہے۔

(۲) کل ہندو وفاق میں دیسی ریاستوں کی شرکت اس امر کی تابع ہونی چاہیئے کہ مرکز میں موجودہ تناسب کو قائم رکھنے کے لئے وہ مرکزی مقنّنہ میں مسلمانوں کی کافی تعداد روانہ کریں

(۳) اگر مجوّزہ منطقی مجالس قائم ہوں تو ان میں مسلمانوں کی نمائندگی معقول اور مؤثّر اور اس قوت کے متناسب ہونی چاہیئے جو اُن کو ہر منطقہ کی مختلف وحدتوں کی مجالسِ مقنّنہ میں مجموعی طور پر حاصل ہو۔

(ب) قانونسازی

ایسے امور جن کا تعلق مذہب، شخصی قانون اور تہذیب سے ہو وہ مقنّنہ متعلقہ کے مسلم ارکان کی خاص کمیٹی کے زیرِ اقتدار رہیں گے۔ اس کمیٹی کی تعداد میں یک ثلث کی حد تک صرف ان کے لئے ایسے مسلم نمائندوں سے بذریعہ انتخاب اشتراکِ عمل کیا جا سکتا ہے، جنکو قانون اسلام

اور مذہبی امور پر عبور حاصل ہو۔ اس کمیٹی کے فیصلوں کو پوری مجلس مقنّنہ تسلیم کرے گی۔ اگر یہ فیصلے دوسری اقوام کے مفادات کو متاثر کرتے ہوں تو نظم و نسق کے اعلیٰ عہدے دار کی ایماء پر مجلس مقنّنہ میں ان پر غور ہو سکے گا، لیکن کوئی ایسی ترمیمات کی اجازت نہ ہوگی جو مجوّزہ قانون کی بنیاد پر اثر انداز ہو۔

(ج)۔ عاملہ۔ Executive

حکومت عاملہ یا وزارتیں خواہ صوبہ میں ہوں یا مرکز میں غالب جماعت سے ترتیب نہیں دی جائیں گی، جیسا کہ متجانس جمہوری (Homogeneous Democratic.) ممالک مثلاً انگلستان میں رواج ہے۔ ہندوستان میں صرف اکثریتی قوم Majority Nationality. ہی مجالسِ مقنّنہ کے ارکین کی غالب تعداد کا مستقلاً انتخاب کرتی ہے اور چونکہ یہ غالب قوم۔ جو ہندوؤں پر مشتمل ہے، ملک کی دوسری بڑی قوم یعنی مسلمانوں سے نہ صرف زندگی کے بنیادی امور اور نقطۂ نظر بلکہ خانگی اور سماجی زندگی کی جزویات میں تک اختلاف رکھتی ہے اس لئے مجلسِ مقنّنہ میں مستقل اکثریت کی حکومت بالفاظ دیگر غالب طبقہ کی حکومت بنجاتی ہے اور جیسا کہ چاہیئے پوری رعایا کی حکومت نہیں تصوّر کی جاسکتی۔

موجودہ نوبت پر ہر صوبہ نیز مرکز میں ایسے عاملہ کی ضرورت ہے جو مخلوط ہو یعنے جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو نمائندگی حاصل رہے جس کی پالیسی ہر دو فریق کے لئے قابلِ قبول ہو اور جسکو مقنّنہ علیٰحدہ نہ کرسکے۔ یہ انتظام کم ازکم اس وقت تک رہنا چاہیئے جب تک کہ ہندوستان تہذیبی متجانس اور آزاد مملکتوں کے اصدیہ میں تحویل نہ ہو جائے کیونکہ ملک میں اسی وقت حقیقی جمہوریت پیدا ہوسکتی ہے اور ذمہ دارانہ حکومت کا قیام حق بجانب ہوسکتا ہے۔

نظر بریں عبوری دستور کے تحت جو عاملہ مقرر ہوگا نہ انگریزی نوعیت کا پارلیمنٹری عاملہ (Parliamentary Executive) نہیں بلکہ مقنّنہ سے آزاد مستحکم عاملہ

(Stable Executive Independent of Legislature)

ہونا چاہیئے، جیسا کہ ممالک متحدہ امریکہ میں ہے مگر یہاں کے وزیراعظم کا انتخاب امریکہ کے صدر جمہوریہ کی طرح رعایا کی جانب سے براہِ راست عمل میں نہ آنا چاہیئے۔ بلکہ مقننہ کے اراکین کی جانب سے کیا جانا چاہیئے۔ منتخبہ وزیراعظم صرف انتخاب کنندہ مقننہ کی میعاد میں برسرِ خدمت رہیگا۔ مگر مقننہ کو اس کی علیٰحدگی کا اختیار نہ ہوگا۔ وزیراعظم اپنے رفقا یا وزرا کا انتخاب اچھی حکومت کی خاطر مقننہ کی جملہ جماعتوں سے کریگا اور منتخب وزرا میں ایک مناسب تعداد ایسے مسلمانوں کی ہوگی جنکو مقننہ کے مسلم اراکین کا اعتماد حاصل ہو اور جن کو ان مسلم اراکین کی مجوزہ فہرست (Panel.) سے منتخب کیا جائے۔

جن دو صورتوں میں ہندوستان کو فی الحال منقسم کیا جائے گا۔ ان میں سے ایک یعنی صوبہ لکھنؤ کا وزیراعظم مسلمان ہونا چاہیئے کیونکہ اس رقبہ کو عبوری دور میں مسلم منطقہ کیلئے تیار کرنا ہے اور اس لحاظ سے اس صوبہ کی پالیسی کسی مسلمان کے ہاتھوں میں ہونا ضروری ہے۔

سررشتہ جات امن عامہ و تعلیم میں جن کو ایسے مسائل سے تعلق ہوتا ہے جن کے تحت تہذیبی اختلافات پیدا ہوتے رہتے ہیں، ایک وزیر اور ایک نائب وزیر کے عہدے قائم کئے جانے چاہئیں اور ان میں سے کسی ایک پر مسلمان کا تقرر ہونا چاہیئے۔ تاکہ حکومت اس کی مدد سے اعتدال پر قائم رہے۔

(د) پبلک سروس کمیشن

دستور میں یہ تجویز کی جانی چاہیئے کہ ان تمام صوبہ جات میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں نیز مرکز میں پبلک سروس کمیشن کا کم از کم ایک رکن مسلمان ہوگا اور اس کا فرض ہوگا کہ وہ دیکھے کہ پبلک خدمات میں مسلمانوں کی مقررہ شرح کو عملاً برقرار رکھا جا رہا ہے یا نہیں۔

(ہ)۔ عدلیہ۔ Judiciary.

مسلمانوں کے شخصی قانون کے تحت فیصلہ جات مسلم حکام کرینگے۔

(و) مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی ترقی کیلئے مجلس کا قیام

دستور میں یہ شرط ہونی چاہیئے کہ ہر صوبجاتی وحدت میں مسلمانوں کی ایک مجلس اس غرض سے قائم کی جائیگی کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم کے تہذیبی پہلو کی نگرانی کرے، ان کی فنی اور صنعتی تربیت کا

اہتمام کرے اور ان کی معاشی اور سماجی اصلاح کی تدابیر سوچے۔ اس کے لئے موازنہ میں ایک مناسب رقم شریک کی جانی چاہیئے۔

(س) خصوصی محصول۔ **Special Taxation.**

اگر مسلمان کسی خاص غرض سے اپنے اوپر کوئی محصول عائد کرنا چاہیں تو اس کے لئے ضروری قانون پاس کیا جائے گا۔

انتظام برائے تبادلہ آبادی

عبوری دستور کا ایک مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو اپنے اپنے مقررہ منطقوں میں منتقل ہونے کے لئے زمین تیار کی جائے اور ان کو سہولتیں بہم پہنچائی جائیں تاکہ یہ منطقے تہذیبی خود مختار مملکتیں بن سکیں۔ دورِ عبوری میں منتقلی خود اختیاری ہوگی۔ اس کے لئے ہر منطقہ میں ضروری قوانین بنائے جانے چاہئیں اور منتقلی کے انتظام کیلئے مشینری کا قیام عمل میں لایا جانا چاہیئے چنانچہ مجوزہ دستور میں ایک شاہی کمیشن کے تقرر کی تجویز ہونی چاہیئے تاکہ یہ کمیشن تدریجی تبادلہ آبادی کا نظام العمل مرتب کرے۔

خود اختیاری منتقلی کی وقتاً فوقتاً تنقیح کی جانی چاہیئے اور اگر یہ معلوم ہو کہ اس سے ہندو اور مسلمانوں کے مابین تہذیبی مناقشات میں لائق لحاظ تخفیف ہوگئی ہے یا ان کو جہاں بھی وہ ہیں اپنی حفاظت کا اطمینان ہوگیا ہے یا اس اثنا میں فریقین میں تالیفِ قلب ہوگئی ہے تو جبری تبادلہ کو غیر معیّن مدّت کے لئے ملتوی کر دیا جانا چاہیئے اور خود اختیاری منتقلی کے طریقہ کو مزید عرصہ کے لئے جاری رکھا جانا چاہیئے +

طلوعِ اسلام
جولائی ۱۹۳۹ء

سوشلزم اور اسلام

قرآن کریم نے ایمان و اعمالِ صالحہ کا گراں بہا حصل اور درخشندہ نتیجہ یہ قرار دیا ہے کہ (انعاماتِ اُخروی کے علاوہ) مسلمانوں کو اس دنیا میں ایک امتیازی زندگی عطا ہوتی ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا.... (الانفال)

اے ایمان والو اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا کرے گا۔

وہ جیتے ہیں تو خدا کی منتخب جماعت کی طرح سرفرازی و سربلندی کی تابناک زندگی لئے ہوئے اور مرتے ہیں تو حکومتِ الٰہیہ کے جانباز سرفروشوں کی طرح ممتاز حیثیت سے۔ یہی ان کی امتیازی زندگی، یہی فرقانی شان ہے جسے قرآن کریم نے ایک شمعِ نورانی، ایک سرچ لائٹ سے تعبیر کیا ہے جس کی جگمگاتی روشنی میں وہ ظلمت کدۂ عالم کے تاریک ترین گوشوں میں بلاخوف و حزن چلتے پھرتے ہیں اور ہر راستہ کو مطلعِ انوار بنا دیتے ہیں۔ وَیَجْعَلْ لَّکُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِہٖ ۔ لیکن ان کی یہی امتیازی زندگی، یہی ممتاز حیثیت ہے جو ہر غیر مسلم کی نگاہ میں خارِ چشم بن کر کھٹکتی ہے وہ اسے دیکھتے ہیں تو بغض و عناد۔ حسد و تنگ نظری کے جانگسل ابخرات اُن کے سینے ہوئے جہنم زار سینہ سے اُٹھتے ہیں اور ان کے قلب و دماغ پر دھوئیں کے سیاہ بادل بن کر چھا جاتے ہیں۔ وہ اس غم و غصّہ کی آگ میں جلتے ہیں اور مثلِ مارِ سیاہ۔ برخود پیچیدہ۔ جوشِ غضب میں اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کر کھاتے ہیں۔ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ۔ اور چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اللہ کی نورانی شمع کو پھونکیں مار مار کر بجھا دیں۔

اسلام دنیا میں ہر طاغوتی قوت کے خلاف اعلانِ جنگ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر طاغوتی قوت ہمیشہ اس فکر میں رہتی ہے کہ مسلمانوں کی اس امتیازی زندگی کو مٹا کر انہیں اپنا جیسا کرلے

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً ۔ ۴/۸۹

وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح سے خود کفر کرتے ہیں اُسی طرح تم بھی کفر کرنے لگ جاؤ تاکہ دونوں برابر ہو جاؤ۔

یہ طاغوتی قوتیں کہیں تو تلوار کی جھنکار اور تیروں کی بوچھاڑ میں چڑھتے ہوئے جھکڑوں، اٹھتی ہوئی آندھیوں، کڑکتی ہوئی بجلیوں، گرجتے ہوئے بادلوں، بڑھتے ہوئے سیلابوں۔ کف بردھاں طوفانوں کی طرح بپھرتی، اُمنڈتی میدانِ کارزار میں اعلانِ جنگ کرتی سامنے آتی ہیں۔ لیکن کہیں گربۂ مسکین کی طرح نرم و نازک پنجوں میں فولادی نشتر چھپائے، اپنے خبث باطن پر ہمدردیٔ نوعِ انسانی کی منافقت کا رنگین نقاب ڈالے، آنسوؤں سے تر آستینوں میں دشنۂ تیز لئے، بساطِ سیاست پر اس معصومانہ انداز سے فروکش ہوتی ہیں کہ بڑی بڑی تیز بین نگاہیں بھی دھوکہ کھا جائیں اور انہیں پیغامبرانِ عہدِ وفا سمجھ کر نہایت کشادہ ظرفی اور خندہ پیشانی سے گلے لگالیں۔ اور جبتک چھپے ہوئے فولادی پنجے شیر افضل خاں کی طرح سینے سے پار ہی نہ ہو جائیں۔ ان کے اخلاص و محبت میں شُبہ نہ ہونے پائے۔ پہلی قسم کے ہجومِ مخالفت سے مسلمان آسانی سے عہدہ برآ ہوتا رہا لیکن اس دوسری قسم کی شاطرانہ چالوں میں یہ عام طور پر مات کھا گیا۔ بدبختی سے آج ہندوستان کے مسلمانوں کو گئو سالہ پرست سامریوں کی اسی قسم کی ہلاکت آفرینیوں سے سابقہ پڑا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بڑے بڑے مدعیانِ عقل و دانش مسمریزم کے معمول[1] کی طرح "عامل" کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اُسی کے کانوں سے سُنتے ہیں، اُسی کے دل سے سمجھتے ہیں اور جو کچھ وہ چاہتا ہے، وہی کچھ زبان سے نکالتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں نہ وہ امتیازی زندگی باقی ہے، نہ وہ قرآنی شان، لیکن غیر مسلموں کی ضد اور کد اور بغض و عناد کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ان کی جُداگانہ ہستی خدا کے اس نُورِ مبین کی یاد تازہ کرتی ہے۔

[1] جس پر مسمریزم کا عمل کیا جاتا ہے۔ "MESMERISED"

مسلمانوں کی اس امتیازی زندگی کا راز ان کی الگ جُداگانہ جماعتی زندگی میں ہے۔ اُنکی علیحدہ ملّی ہستی میں ہے۔ ان کے غیر مخلوط قومی تشخص میں ہے۔ یہ مٹا تو اُن کی امتیازی زندگی بھی مٹی اور وہ مٹی تو پھر یہ دنیا میں بالکل دوسروں کی طرح ہو گئے۔ اور یہی غیر مسلموں کی دلی آرزو ہے۔
وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَاءً ۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی جُداگانہ ملّی ہستی کو مٹانے کے لیے آج برادرانِ وطن چاروں طرف سے یورش کرکے اُمنڈ آئے ہیں۔ جس طرح میدان جنگ میں فوج کے مختلف دستے ہوتے ہیں اور تقسیمِ عمل کے لحاظ سے ان کے فرائض میں بھی اختلاف ہوتا ہے، لیکن مقصدِ زیرِ نظر سب کا ایک ہوتا ہے، اُسی طرح آج کے میدانِ سیاست میں ہندوؤں کی جماعتیں مختلف ہیں، ان کے طریقِ کار جُداگانہ ہیں، لیکن نصب العین سب کا ایک ہے اور وہ نصب العین ہے مسلمانوں کی جُداگانہ ہستی کا استہلاک۔

اس فوج کا میمنہ Right wing وہ ہے جسے گاندھی جی کا گروپ کہا جاتا ہے۔ اور میسرہ Left wing وہ جسے نوجوانوں کی جماعت قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے طریقِ کار مختلف ہیں، لیکن محاذ مشترک ہے۔ میمنہ کے پاس اپنے حربے ہیں اور میسرہ کے پاس اپنے ہتھیار۔ میمنہ کی طرف سے کبھی واردھا اسکیم کی کمند پھینکی جاتی ہے جس میں مقصد پیشِ نظر یہ رکھا گیا ہے کہ بچوں کے ذہن میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ دنیا کے تمام مذاہب یکساں طور پر برسرِ حق ہیں، ایک کو دوسرے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ کوئی برتری نہیں۔ لہٰذا وہ تفریق جو بنا بر مذاہب قائم کی جاتی ہے انسانوں کی خود ساختہ ہے، غیر فطری ہے، باہمی اختلافات کا موجب ہے۔ مذاہب سب برابر ہیں۔ البتہ فلسفۂ زندگی میں اہسا کو ہسا پر افضلیت حاصل ہے کبھی "ہندی۔ ہندوستانی" کا نظر فریب جال بچھایا جاتا ہے۔ اور دیوناگری کو ہندی قومیت کا مشترکہ رسم الخط قرار دیا جاتا ہے۔ تاکہ مسلمان اپنے ماضی سے یکسر کٹ جائے۔ اپنی ملّی روایات کو بھول جائے۔ اپنے ادب، تمدّن اور کلچر، اپنے اسلاف کے اندازِ زندگی اور فلسفۂ حیات سے بیگانہ ہو جائے۔ یہ

اور اس قسم کے بہت سے حربے ہیں جو اس سمت سے مسلمانوں کے خلاف استعمال کئے جارہے ہیں۔ ان کے متعلق طلوعِ اسلام کے صفحات پر متعدد بار لکھا جا چکا ہے، لیکن ان کا میسرہ۔ میمنہ سے بھی زیادہ پُرکار واقع ہوا ہے۔ اور ان کا حربہ بھی زیادہ مؤثر ہے۔ ملک میں افلاس، عزت ناداری، بے کاری کے بادل چھارہے ہیں۔ ہر سال صرف ایک پنجاب یونی ورسٹی سے کم و بیش بیس ہزار طالب علم میٹرک کا امتحان پاس کرکے بیکاروں کی فوج میں اضافہ کئے جارہے ہیں۔ نوجوانوں کی تعلیم میں مذہب کا عنصر پہلے سے غائب ہے۔ اس پر بھوک کی مار۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ میسرہ والوں کے سامنے نوجوانوں کی یہی جماعت ہے اور وہ ان کی اس دُکھتی رگ سے واقف ہیں، اس لئے وہ ان کے سامنے یہ سوال پیش کرتے ہیں کہ دنیا میں انسانوں کی تقسیم۔ کافر و مسلم کے بجائے صرف دو گروہوں میں ہو سکتی ہے، امیر اور غریب، سرمایہ دار اور مزدور۔ لہذا روٹی کا سوال سب سے مقدم ہے۔ مذہب۔ تمدّن۔ کلچر۔ زبان۔ سب سیر شکمی کی باتیں ہیں۔ سرمایہ داری کے ڈھکوسلے ہیں۔ اس زہر سے بجھے ہوئے نشتر کا نام ہے سوشلزم۔ چنانچہ اس جماعت کی طرف سے اعلان کیا جاتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں نظامِ حکومت سوشلزم ہوگا۔ اس وقت بھوک، ناداری۔ افلاس۔ بیکاری کی سب لعنتیں دُور ہو جائیں گی۔ روٹی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس نظامِ حکومت کے قیام میں مذہبی تفریق۔ ہندو مسلم کا امتیاز۔ سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ لہٰذا اُٹھو اور سب سے پہلے اس روڑے کو راستے سے ہٹا دو تاکہ اس جہنمی زندگی کے بجائے تمہیں جنتِ ارضی کی زندگی میسر آجائے۔ بھوکا نوجوان جب اس مژدۂ جانفزا کو سنتا ہے تو بے تحاشہ اس پر لبیک کہتا ہے اور اس کے بعد جو کچھ اس سے کہا جاتا ہے، کہتا ہے اور کرتا ہے۔ اس دستۂ فوج کے سپہ سالار پنڈت جواہر لال نہرو ہیں (جو لاکھوں روپے کی ذاتی جائداد کے باوجود سب سے بڑے سوشلسٹ ہونے کے مدعی ہیں)۔

وہ فرماتے ہیں۔

"دنیا کی ساری تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشی مفاد ہی وہ قوت ہے جو جماعتوں اور طبقوں کے سیاسی خیالات کی تشکیل کرتی ہے۔" (میری کہانی۔ جلد دوم۔ صفحہ ۵۰)

اس اجمال کی تفصیل ان الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔

"ہر پھر کر ہم اس چیز پر پہنچ جاتے ہیں جس کے سوا اس مسئلہ کا اور کوئی حل نہیں یعنے ایک اشتراکی نظام کا قیام. پہلے قومی دائرے میں. پھر ساری دُنیا میں۔ ایسا نظام جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم، ریاست کی نگرانی میں مفادِ عامّہ کے لحاظ سے کی جائے. یہ انقلاب کس طرح سے ہونا چاہیئے؟ یہ ایک جُداگانہ سوال ہے. لیکن یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جس چیز میں پوری قوم بلکہ کل نوعِ انسانی کی بھلائی ہو وہ محض اس وجہ سے ردّ نہیں کی جا سکتی کہ کچھ لوگ جو موجودہ نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس تغیّر کے مخالف ہیں۔ اگر سیاسی یا تمدّنی ادارے اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں تو اُن کو مٹا دینا چاہیئے۔" (صفحہ ۲۰-۴۱۹)

اس سے غرض یہ ہے کہ مسلمانوں کے دل سے اس "خیالِ خام" کو نکال دیا جائے کہ وہ ایک الگ مِلت ہیں، جُداگانہ جماعتی حیثیت رکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو مِلتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی کوئی گنجائش نہیں۔ آج جماعتوں اور مِلتوں کی بُنیاد معاشی مفاد پر رکھی جا رہی ہے"۔

(خطبۂ صدارت آل انڈیا نیشنل کنونشن)

پنڈت جی کو یا نی مِلتوں اور قوموں کے متعلق کچھ زیادہ تردّد نہیں، اضطراب ہے تو صرف مِلتِ اسلامیہ کے متعلّق۔ فرماتے ہیں۔

ہندوستان میں مسلم قومیّت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم ہے، جو یکجا نہیں ہے مُنتشر ہے، مبہم ہے، غیر متعین ہے۔ اب سیاسی نقطۂ نگاہ سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیّل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت دُور از کار ہے۔ اور بدقت قابلِ توجہ کہا جا سکتا ہے۔

(میری کہانی صفحہ ۳۴۱)

اور چوں کہ مسلمانوں کا یہ دعوےٰ کہ وہ ایک جداگانہ ملّت ہیں، مذہب کی بنا پر ہے بلکہ ان کی ملّی زندگی کا نظام ہی مذہب ہے، اس لیے اس قسم کے مذہب کے متعلق پنڈت جی کا ارشاد ہے:

"منظّم مذہب بلا استثنا، مستقل اغراض سے وابستہ ہو جاتا ہے اور یوں لازمی طور پر ایک ترقّی دشمن قوت بن کر تغیّر اور ترقّی کی مخالفت کرتا ہے"۔ (صفحہ ۶۸-۱۶۷)

اس لیئے پنڈت جی دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ اس مذہب کو دیکھ کر میرا جی کڑھتا رہتا ہے۔ میرے بس میں ہو تو اسے صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کردوں۔ یریدون ان یطفؤا نور اللہ بافواھھم۔

چوں کہ انہیں معلوم ہے کہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت ناگفتہ بہ ہے بھوک اور افلاس کا عذاب ان پر مسلط ہے، قوم میں تشتت و افتراق کی وجہ سے اجتماعی زندگی کی بجائے لامرکزیت کی انفرادی زندگی آچکی ہے، ان کے سامنے زندگی کا کوئی خاص نصب العین نہیں رہا مقصدِ حیات صرف روٹی رہ گیا ہے، خواہ اس کا طریقِ حصول کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ دو لفظوں میں یہ کہ ان کے اندر کوئی قومی کیریکٹر نہیں رہا اس لیے پنڈت جی علانیہ کہتے ہیں کہ:

"میرے خیال میں عام مسلمان، عام ہندوؤں سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے نظامِ اجتماعی میں ایک حد تک آزادی پائی جاتی ہے۔ اور اگر ان میں ایک مرتبہ بیداری پیدا ہو جائے تو غالباً وہ اشتراکیت کی راہ پر تیزی سے قدم بڑھائیں گے" (صفحہ ۵۰۶)

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام میں آزادی کی روح موجود ہے، لیکن اسلامی آزادی میں اور اس آزادی میں جو پنڈت جی کے ذہن میں ہے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ جس چیز کو آزادی قرار دیتے ہیں اسلام اُسے الحاد و بے دینی سمجھتا ہے۔ اسلام کے نزدیک آزادی وہ ہے جو آئینِ خداوندی کی سخت ترین اطاعت سے حاصل ہو۔

پھر سوشلزم کا نظامِ زندگی پنڈت جی کا ذاتی مسلک نہیں بلکہ اعلان کیا جاتا ہے اور نہایت

ذمہ دارانہ حلقوں سے یہ آواز اٹھتی ہے کہ ہندوستان کا آئندہ نظامِ حکومت سوشلزم ہوگا
مسٹر بوس نے ہری پورہ کانگریس کے خطبۂ صدارت کے دوران میں کہا کہ:-

"ہم ہندوستان کو ایک سوشلسٹ اسٹیٹ میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے ملک کو ابھی سے تیار کرنے کی ضرورت ہے"۔

اس کی وضاحت میں پنڈت جی فرماتے ہیں کہ موجودہ قومیت پرستی تو محض ابتدائی مراحل ہیں آخری منزل تو یہی تمدنی انقلاب ہوگا جسے سوشلزم کہتے ہیں۔

"جب تک ہمیں تھوڑی بہت سیاسی آزادی حاصل نہ ہوگی ہمارے لیے قوم پرستی کا تخیل سب سے بڑا محرکِ عمل رہیگا ...... یہاں تک کہ لوگوں کے دل میں قوم پرستی کے جذبہ کی جگہ تمدنی و اجتماعی انقلاب Social Revolution کا جذبہ پیدا ہو جائے"۔ (صفحہ ۱۴۵)

پنڈت جی اور ان کے رفقائے کار نے سوشلزم کے متعلق یہ کچھ اجمالاً کہا ہے اور اس سے زیادہ تفصیل میں جانے کی انہیں ضرورت بھی نہ تھی۔ اس لیے کہ ان کاموں کے لئے انہیں ہر جگہ ہر وقت اور ہر قیمت پر "مسلمان" تیار ملتے ہیں۔ دنیا میں بھوک کیا کچھ نہیں کرا سکتی؟ چنانچہ پنڈت جی ڈرگائم نے اس سے زیادہ جو کچھ کہنا تھا خود مسلمانوں کی زبانی کہلوایا۔ کانگریس کے "شعبۂ اسلامیات" کے ایک سابق کارکن مسٹر منظر رضوی فرماتے ہیں۔

"غریبوں، مفلسوں اور غلاموں کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں۔ اس کا سب سے بڑا مذہب روٹی کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس کا سب سے بڑا تمدن ایک پھٹا پرانا کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ایمان موجودہ افلاس اور نکبت سے چھٹکارا پالینا ہے۔ وہی روٹی اور کپڑا جس کے لیے وہ چوری تک کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آج افلاس اور غلامی کی دنیا میں اس کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں ...... اس پیٹ کے لیے اسے انقلاب اور کرانتی کرنی پڑے گی"۔ (مدینہ ۱۳ دسمبر ۱۹۳۷ء صفحہ ۶)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"آنے والی لڑائی درصل امیری اور غریبی کی لڑائی ہوگی۔" (مدینہ نومبر ۱۹۳۶ء)

یہ وہ وقت ہوگا جب ہندو اور مسلم کی وہ تفریق جو مذہب کی بنا پر قائم ہے۔ کیسر مٹ جائیگی اور اس کی جگہ طبقات کی تفریق لے لیگی یعنی ہندو اور مسلم غریب مل کر ایک قوم بن جائینگے۔ جن میں وجہ جامعیت، رشتۂ وحدت روٹی ہوگا۔ پنجاب پراونشل مسلم ماس کانٹیکٹ کمیٹی کے سکرٹیری منشی احمد دین صاحب لکھتے ہیں:

> "ہم تو دیانت داری کے ساتھ یہ سمجھ چکے ہیں کہ ہندوستان کے آنے والے انقلاب میں جو جنگِ آزادی لڑی جائے گی وہ محنت اور سرمایہ۔ غریب اور امیر بالفاظِ دیگر ظالم اور مظلوم کی جنگ ہوگی جس میں ہندو اور مسلمان مظلوم ایک طرف ہونگے گویا اس لڑائی میں ہندو اور مسلمان عوام دونوں برابر ہوں گے ..... لہذا فرقہ وارانہ جنگ طبقہ وارانہ جنگ میں تبدیل ہو جائے گی" (مدینہ ۱۳ دسمبر ۱۹۳۷ء)

عدم گنجائش کی بنا پر ہم انہی اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں۔ ورنہ ہم بتاتے کہ پنڈت جی نے جو یہ فرمایا تھا کہ مسلمانوں کا نوجوان طبقہ کتنے جلدی سوشلزم کے دام میں گرفتار ہو جائے گا وہ کس قدر حقیقت پر مبنی ہے۔ آج آپ مختلف جرائد و رسائل میں مسلمان نوجوانوں کے مضامین پڑھیئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس بیباکی اور بزعم خویش "آزادی" سے خدا، رسول، مذہب، اسلامی شعائر، ملّی تمدّن کا (نعوذ باللہ) تمسخر اُڑاتے ہیں۔ ان پر پھبتیاں کستے ہیں، حتیٰ کہ گالیوں پر اُتر آتے ہیں اور اس پر شرماتے نہیں بلکہ بڑا فخر اور ناز کرتے ہیں۔ چونکہ ان کے معلّمِ اوّل (پنڈت جی) خود ملحد ہیں۔ خدا کو نہیں مانتے اور سوشلزم کی بنیاد ہی دہریّت پر ہے، اس لیئے ان نوجوانوں کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ دنیا میں تمام خرابیوں کی جڑ (معاذاللہ) خدا کی ہستی پر اعتقاد ہے۔ آپ نے کبھی غور بھی فرمایا کہ یہ کتنی گہری سازش اور کیسی خطرناک چال ہے جو اس بظاہر معاشی مسئلہ کے رنگ میں چلی جا رہی ہے۔ یہی نوجوانوں کا

طبقہ کل کو ملتِ اسلامیہ بننے والا ہے۔ اس طبقہ کے دل میں خدا اور مذہب کے متعلق اس قسم کے جذبات پیدا کر دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کل کی "ملتِ اسلامیہ" اپنے کو مسلمان کہلانے میں شرم محسوس کرے گی۔ اور یوں وہ امتیاز جو انہیں بناء برمذہب حاصل تھا مٹ جائے گا اور اس کے مٹنے سے ان کی جداگانہ ملی ہستی، الگ جماعتی تشخص خود بخود فنا ہو جائے گا۔ اور اس طرح مخالفین اسلام کے وہ تمام منصوبے جنہیں بروئے کار لانے کے لئے وہ اس درجہ مضطرب و پریشان ہیں ایک ایک کر کے پورے ہو جائیں گے۔

جب سوشلزم کا نظام ہندوستان کے مستقبل پر اس درجہ اثرانداز ہونے والا ہے اور بالخصوص جہاں تک مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ کا تعلق ہے اس کے علمبردار اس قدر طوفان خیز انقلاب کا تہیہ کئے بیٹھے ہیں تو کیا یہ ضروری نہیں کہ ہم معلوم کریں کہ بالآخر سوشلزم ہے کیا اور اسلام سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اس چیز کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس نظریہ کو مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو یہ فریب دے کر کہ یہ تو محض ایک اقتصادی مسئلہ ہے اسے کسی کے مذہب اور معتقدات سے کوئی واسطہ نہیں۔ چنانچہ کانگریس کے شعبۂ اسلامیات کے معتمد ڈاکٹر اشرف صاحب اپنے ایک تازہ مضمون میں جس کا عنوان ہے "سوشلزم کیا نہیں ہے" فرماتے ہیں۔

"اکثر لوگ سوشلسٹوں کے بارے میں منجملہ اور غلط فہمیوں کے حسب ذیل خیالات کا اظہار انتہائی متانت اور ذمہ داری سے کیا کرتے ہیں:

دنیا میں محنت کشوں اور مزدوروں کا ایک معاشی نظام کرنے کے نصب العین پر سوشلسٹ دنیا کے تمام معتقدات و خیالات کو قربان کر سکتے ہیں۔ یعنی اگر اس قسم کا نظام حکمرانی قائم کرنے میں انہیں مذہب کی بھینٹ دینی پڑے تو وہ مطلق تامل نہیں کریں گے۔ علیٰ ہذا القیاس

اگر ضرورت کا تقاضا ہو تو وہ معاشرت و تہذیب کے موجودہ ڈھانچہ کو بھی
نہایت بیباکی کے ساتھ اس کے راستے میں قربان کر دینگے غرض
محنت کشوں اور مزدوروں کے مضبوط و مستحکم معاشی نظام حکمرانی کے
علاوہ سوشلسٹوں کے نزدیک ہر چیز ہیچ ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ اس قسم کے معترض اپنے بیان کی تائید میں کسی سوشلسٹ کا قول نقل کرنے یا کسی مستند یا غیر مستند کتاب کا حوالہ دینے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتے ...... میں ذمہ دارانہ طریقہ پر اور ہلکی سی بصیرت رکھتے ہوئے اس کا اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی رائے زنی سوشلزم کے بارے میں قطعاً لاعلمی پر مبنی ہے۔" (ہندوستان۔ مورخہ ۱۴ رمئی ۱۹۳۹ء)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب نے کس قدر ذمہ دارانہ طریقہ پر اس امر کا اعلان فرمایا ہے کہ سوشلزم کے خلاف اس قسم کی تنقید "قطعاً لاعلمی پر مبنی" ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ بھی شکایت ہے کہ ایسی تنقید کرنے والے معترض کسی سوشلسٹ مفکر کا قول نقل نہیں کرتے اور کسی مستند یا غیر مستند کتاب کا حوالہ نہیں دیتے۔ لیکن آپ سنیئے اور حیران رہ جائیے کہ خود جناب ڈاکٹر صاحب نے اپنے پورے مضمون میں کہیں ایک جگہ بھی نہ کسی سوشلسٹ مفکر کا کوئی قول نقل کیا ہے نہ کسی مستند یا غیر مستند کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یا تو سوشلزم کے متعلق خود ڈاکٹر صاحب کی معلومات بھی ایسی ہی سطحی ہیں جیسی اسلام کے متعلق یا انہیں اپنے مفروضات کی تائید میں کوئی حوالہ ہی نہیں مل سکا۔ بہرحال ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اور ان جیسے دوسرے سوشلسٹ حضرات کی واقفیت کے لیئے سوشلسٹ مفکرین کے اقوال و کتب کے حوالوں سے بتائیں کہ سوشلزم کیا ہے اور اس کے بعد ان حضرات کے لیے جو یہ معلوم کرنے کی تمنا رکھتے ہوں کہ اسلام کے نزدیک اس نظامِ زندگی کی کیا قدر و قیمت ہے یہ عرض کریں کہ کتاب و سنت کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

ڈاکٹر صاحب اپنے مضمون کی تمہید میں فرماتے ہیں کہ

"مگر پڑھنے والے اور بالخصوص مذہبی لوگ ایک بات کو پہلے صاف کرلیں "دین داروں" کی نگاہ فی نفسہٖ کسی سوال کے خارجی مطالعہ پر بہت کم جاتی ہے۔ ان کے ذہن دائمی مظاہر سے مانوس ہیں۔ ان کے اکثر سوالات دین ومذہب کو مرکز مان کر پیدا ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے مفکّروں نے برابر بدلنے والی سماج کی تقسیم بھی مسلم وکافر میں کردی ہے۔ وہ جب سوشلزم۔ سوراج۔ فاشزم یا کسی جدید سماجی سوال پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معاً انہیں پہلے ذہن میں یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ یہ اسلام کا حامی ہے یا مخالف اور اس کے بعد دیگر جزئیات پر متوجہ ہوتے ہیں۔ اسکی منطقی ترتیب کی آسانیاں بہت ہیں۔ ادنیٰ بات یہ ہے کہ دنیا کے چاروں طبق تھوڑی سی توجہ اور غور وفکر سے روشن ہوجاتے ہیں اور کوئی مرحلہ ایسا نہیں آتا جہاں پیمانہ کارِ مولا نہ ملتا ہو۔" (ایضاً)۔

آپ نے اندازہ فرمایا کہ ایک سوشلسٹ کے نزدیک یہ اندازِ فکر ونظر کس قدر لغو ہے کہ ہر نظریۂ زندگی اور ہر نظامِ حیات کو مذہب کے آئینہ میں دیکھا جائے۔ ڈاکٹر صاحب ایسا کہنے اور سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ، جیسا کہ آئندہ سطور سے واضح ہوگا۔ سوشلزم کی ابتداء ہی مذہب کی مخالفت سے ہوتی ہے۔ لیکن اس مسلمان کی "مجبوری" کو کیا کیا جائے جس کے خدا کا یہ ارشاد ہو کہ،

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ ﴿۵/۴۴﴾

جو ان معاملات کا فیصلہ کتاب اللہ کے ماتحت نہیں کرتا وہ دائرۂ اسلام سے خارج اور کفار کے زمرہ میں شامل ہے۔

ہمیں ڈاکٹر صاحب سے نہ کوئی شکایت ہے، نہ افسوس۔ لیکن دلی رنج ہے ان قومیت پرست علماء کے گروہ پر جن کی آج حالت یہ ہے کہ جو لوگ ان سے سیاسی مسلک میں اختلاف رکھتے ہیں

انکے کالر ٹائی، ہیٹ، بوٹ، سگریٹ غرضیکہ ہر شے سے انہیں بُو ئے کفر آتی ہے لیکن جو لوگ کانگریسی مسلک میں ان کے ہم نوا ہیں۔ وہ جو کچھ جی میں آئے مذہب کے خلاف علانیہ کہتے پھریں۔ ان حضرات کی مقدس پیشانیوں پر شکن تک نہیں پڑتی۔ بلکہ اُن سے اُن کے ایسے گہرے تعلقات ہوتے ہیں کہ خود ڈاکٹر اشرف صاحب۔ جمعیت علماء ہند کے سالانہ اجلاس (دہلی) کی تقریب پر جمعیت کے پنڈال میں انکے پلیٹ فارم پر تقریر کرتے نظر آتے ہیں۔ مسیلمہ کذاب نے جب دعوائے نبوت کیا تو اس کے متبعین سے پوچھا گیا کہ تم اُس کی اتباع کیوں کرتے ہو تو انہوں نے کہا کہ کیا کریں ہمیں اپنے قبیلہ (ربیعہ) کا جھوٹا نبی مضر کے سچے نبی سے اچھا لگتا ہے یہ تھی عصبیتِ جاہلیت کہ اپنے قبیلہ کا جھوٹا بھی دوسرے قبیلہ کے سچے سے اچھا نظر آئے۔ آج وہی عصبیت پارٹی بازی کے رنگ میں جلوہ گر ہے فرق صرف لباس میں ہے روح وہی کارفرما ہے۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات ومنات

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون میں یہ جتایا ہے کہ یہ قطعاً غلط ہے کہ

(۱) سوشلزم مذہب کی مخالف ہے۔ سوشلسٹ خدا کی توحید یا عبادت سے روکتے ہیں۔ اور معابد کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

(۲) روس کے کمیونسٹ ازدواجی تعلقات میں حرام وحلال کی تمیز نہیں کرتے۔

(۳)۔ سوشلزم قدیم تمدن یا کلچر کی مخالف ہے، اور

(۴) سوشلسٹ تشدد پرست ہیں اور اپنے نظریہ کو بجبر منوانا چاہتے ہیں۔

آیئے ہم دیکھیں کہ سوشلزم کے عناصر ترکیبی کیا ہیں اور جن الزامات کو ڈاکٹر صاحب جیسا سوشلسٹ "بہتانِ عظیم" قرار دے رہا ہے وہ مبنی بر حقیقت ہیں یا نہیں۔ پہلے سوشلزم کو لیجئے۔ اس کے بعد اسلام سے اس کا تقابل۔ واللہ المستعان۔

سوشلزم

سرمایہ دار اور مزدور کے باہمی تعلقات کا سوال اتنا ہی پرانا ہے جتنی مدنی الطبع انسان کی عمرانی زندگی کی تاریخ۔ نوعِ بشری کے دیگر مہماتِ اصول کی طرح یہ مسئلہ بھی مختلف مفکرینِ عالم کے زیرِ نظر رہا ہے اور اس کے تسلی بخش جواب اور حل کے لئے بہت کچھ دماغ سوزیاں اور خامہ فرسائیاں ہو چکی ہیں، چنانچہ فیلسوفوں کے ابوالآبا افلاطون یونانی کی جمہوریت کا محرک بھی یہی خیال تھا، اور اس وقت سے آج تک انسانی جماعتوں کی تنظیم و انضباط کے متعدد نظریوں کا منبع بھی یہی سوال رہا ہے۔
نوعِ انسانی کے دورِ استبداد میں برسرِ اقتدار افراد نے حکومت و سرمایہ کے نشے میں غریب اور مفلس انسانوں پر جو ظلم و ستم کی قیامتیں برپا کر رکھی تھیں، ان سے متأثر ہو کر کچھ ماہرینِ نظامِ عالم اس نتیجہ پر پہونچے کہ جب تک سرمایہ اور حکومت کے ان اجارہ داروں کی وہ قوت نہیں چھین لی جائے گی جس کے بل بوتہ پر یہ مفلوک الحال انسانوں پر دستِ ظلم دراز کرتے ہیں، نظامِ دنیوی میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ان داعیوں نے اپنی جدوجہد کا مقصد یہ قرار دیا کہ مطلق العنان حکومت کا خاتمہ کر کے اس کی جگہ جمہوری حکومت قائم کی جائے۔ یہ جذبہ بڑا مستحسن اور یہ اقدام نہایت مبارک تھا چنانچہ یورپ میں انقلابِ فرانس کے بعد شخصی حکومت جمہوریت سے بدلتی گئی۔ ہر چند یہ جمہوریت بھی 'اسلامی جمہوریت' کے مقابلہ میں "استبداد" ہی کا دوسرا نام تھا لیکن بہرحال اس شخصی حکومت سے کسی حد تک بہتر تھی جو اس سے پیشتر وجۂ ننگِ انسانیت تھی۔ یورپ کی سرمایہ داری یقیناً ایک انقلاب کی مستحق تھی لیکن بدقسمتی سے اس انقلاب کے علمبردار وہ انتہا پسند (Extremists) تھے جو لفظ اعتدال سے ناواقف تھے اور ان کے سامنے سرمایہ داری کی تخریب کے بعد مساواتِ انسانی کی تعمیر کا کوئی صحیح پروگرام نہ تھا چنانچہ ان انقلاب پسند لوگوں نے ایک نظامِ زندگی وضع کیا جس کی رو سے وہ چاہتے تھے کہ ذاتی املاک و مقبوضات کا خاتمہ کر دیا جائے۔ تمام پیداوار مزدوروں اور کسانوں میں

مساویانہ تقسیم کر دی جائے۔ اور یوں دُنیا سے بڑے اور چھوٹے کا امتیاز مٹا دیا جائے اس نظام کا نام سوشلزم ہے، اور اس کی انتہائی شکل کیمونزم کہلاتی ہے لیکن یہ نظام محض اقتصادیات تک ہی محدود نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے اس لئے اس کے جملہ عناصر ترکیبی کو سامنے رکھے بغیر اسکے متعلق انسان کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتا۔

اشتراکی خیالات کا مبتدع اگرچہ مزدوک ہے جو ایران میں سنہ ۵۰۰ء کے قریب پیدا ہوا لیکن دَورِ حاضر کی تحریک کا رہنمائے اعظم المانیہ (جرمنی) کا ماہر اقتصادیات کارل مارکس (Karl Marx— 1818-1883) ہے یہ شروع ہی سے انتہا پسند تھا، اور ان خیالات کی نشر و اشاعت کے لئے اس نے کئی ایک اشتراکی اخبارات میں کام کیا، یہ خیالات ہنوز اُس کے سینہ کی پہنائیوں میں پرورش پا رہے تھے کہ وہ برسلز میں جرمن مزدوروں کی ایک خفیہ جماعت سے ملا جو اپنے آپ کو اخوان العدل (League of Just) کہتی تھی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اس جماعت نے اپنا نام بدل کر اشتراکیین (Communes) رکھ لیا جس کے معنی ایسی جماعت تھے جو با اتحادِ یک دیگر مزدوروں کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کریں (ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا) اس زمانہ میں مارکس کو اینجلز (Engels) نامی ایک اور ماہر اقتصادیات ملا جو اس کا ہم خیال تھا اور جو مارکس کے بعد اس تحریک کا قائدِ اعظم سمجھا جاتا ہے۔ مزدوروں کی مذکورہ صدر جماعت نے ۱۸۴۷ء میں ایک جلسہ کیا جس میں انہوں نے مارکس اور اینجلز سے درخواست کی کہ وہ اس جماعت کی وجہ تخلیق اور اس کے اغراض و مقاصد کا ایک دستورِ اساسی مُرتب کر دیں۔ چنانچہ ۱۸۴۸ء کو یہ دستورِ اساسی منشورِ اشتراکیت (Communist Manifesto) کے نام سے شائع ہوا یہی دستور موجودہ اشتراکیت کا نصب العین ہے اور وحی مُنزل کی طرح واجب التسلیم مانا جاتا ہے انہیں دنوں (۱۸۴۸ء میں) شاہ جرمنی نے قومی مجلس کو برخواست کر دیا جس سے متاثر ہو کر مارکس اور اسکے رفقائے کار نے عوام میں یہ تحریک شروع کر دی کہ وہ ٹیکس ادا نہ کریں اور حکومت کی مخالفت کیلئے مسلح جماعتوں کی تنظیم شروع کر دیں۔ حکومت نے اس کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلایا اور اسے ملک بدر کر دیا۔ یہ

پہلے فرانس پہونچا اور وہاں سے انگلستان آگیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جرمنوں کی کیمونسٹ جماعت نے ایک بین الاقوامی حیثیت حاصل کر لی چنانچہ اس جماعت کی برسلز کی شاخ نے اپنا نام بین الاقوامی مزدوروں کی جماعت (International working men Association) رکھا، اور مارکس کو اس کا صدر بنایا۔ انہوں نے ۱۸۶۴ء میں ایک کانفرنس منعقد کی جسے اشتراکیت کی پہلی بین الاقوامی (کانفرنس) کہتے ہیں۔ لیکن اشتراکین اور انارکسٹ (بے نظمی اور بے آئینی کے علمبرداروں) کے باہمی اختلافات کی بنا پر یہ کانفرنس ٹوٹ گئی۔ زاں بعد ۱۸۸۹ء میں اس کی دوسری بین الاقوامی کانفرنس ہوئی، لیکن ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کی بنا پر اس کی مختلف شاخوں میں پھر اختلافات رونما ہو گئے۔ حتیٰ کہ ۱۹۱۹ء میں اس کی تیسری بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی جو درحقیقت اس عالمگیر تحریک کا سنگِ بنیاد ہے۔ اس آخری کانفرنس نے دوسری کانفرنس کے معتدلین کے طریقِ کار کو مذمت کی نگاہ سے دیکھا اور اپنا رشتہ واتحاد پہلی بین الاقوامی سے منسلک و منوط کر کے ہر قسم کے جارحانہ تشدّد و غارتگری کو اپنا نصب العین قرار دیا جو اُن کے نزدیک مارکس کے نظریہ کی اصل ہے۔

یہ تحریک یُوں تو آتشِ خاموش کی طرح سلگتی سلگاتی مختلف اقوامِ عالم میں اثر انداز ہوتی رہی، لیکن جہاں یہ رعد آسا دھماکے کیساتھ ابھری وہ رُوس کا میدان تھا ویسے تو ۱۹۰۵ء کی انقلابی تحریک ہی سے رُوس میں اُس کے آثار نمودار ہو چکے تھے لیکن ۱۹۱۷ء میں زارِ رُوس اور اُس کی حکومت کے خلاف ایک طوفان انگیز شورش برپا کی گئی جس کا سرغنہ لینن (Lenin-- 1870-1924) تھا، اس انقلاب نے حکومتِ رُوس کا تختہ اُلٹ دیا۔ اور اشتراکین کی جماعت جس کا مقامی نام بالشویک تھا برسرِ اقتدار آگئی۔ اُن کی پہلی مجلسِ انتظامیہ چونکہ مزدوروں اور کسانوں پر مشتمل تھی جنہیں سوویٹ (Soveit) کہتے تھے۔ اس لئے اس نظامِ حکومت کا نام بھی سویٹ رُوس کی جمہوریت رکھا گیا۔ لینن اس جماعت کا صدر تھا جس نے، جنوری ۱۹۱۸ء کی شب کو آئینی نظامِ حکومت کی اسمبلی کو برطرف کر کے اپنی آمریّت (Dictatorship) کا اعلان کر دیا۔ لینن ۱۹۲۴ء میں مر گیا اور اس کی جگہ سٹالن (Stalin-1879) ڈکٹیٹر

متفرع ہوا۔ روس میں اگرچہ کمیونسٹ جماعت ہی برسرِ اقتدار ہے لیکن ہنوز وہاں نظامِ حکومت و معاشرت کمیونزم کے مکمل دستور کے مطابق عمل میں نہیں آیا۔ یوں سمجھئے کہ بعض صورتوں میں سوشلزم اور بعض میں اس سے زیادہ متشدد طریقِ حکومت کارفرما ہے۔ البتہ کمیونسٹ جماعت تدریجاً اس نظام کو بدل کر اشتراکیت کے آخری نقطہ کی طرف لئے چلی جا رہی ہے۔ بہرکیف تحریکِ اشتراکیت کا آتش دان آج روس میں ہے اور وہیں سے اس کی چنگاریاں اُڑا اُڑ کر نظامِ عالم کے خرمنِ امن و طمانیت کو جلانے کے سامان فراہم کر رہی ہیں۔

موجودہ اشتراکیت کے اصول و طریقِ کار کی تفصیلات جو مارکس، انجیلز، لینن، سٹالن اور ان کی روسی جماعت کے اربابِ حل و عقد کی تحریر و تقریر سے ماخوذ ہیں حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) معاشی اور معاشرتی نظام

مارکس اپنے منشورِ اشتراکیت (Communist Manifesto) کے شروع میں لکھتا ہے۔

"سرمایہ داروں نے جو ظلم و تشدد برپا کر رکھا ہے اس کا واحد علاج یہ ہے کہ دنیا سے جماعتی تفریق کو مٹا دیا جائے۔ عمرانی زندگی کے مصائب و آلام صرف جماعتی امتیازات کی بنا پر ہیں اور اس کا ازالہ مزدوروں کی جماعت کا برسرِ اقتدار آ کر، عالمگیر یکسانیت و مساوات پیدا کر دینا ہے۔"

پھر لکھتا ہے کہ۔

"اس تحریک کا مقصدِ وحید یہ ہے کہ دُنیا سے ذاتی ملکیت اور شخصی و انفرادی حقوق کے خیال کو فنا کر دیا جائے اور اس طرح جب مزدوروں کی جماعت کو تسلّط حاصل ہو جائے تو تدریجاً سرمایہ داروں کے تمام املاک و خزائن پر قبضہ کر لیا جائے، اور یوں ملکی پیداوار کے تمام وسائل و ذرائع مزدوروں کی جماعت کی حکومت کے ہاتھ میں مرکوز کر دیئے جائیں۔"

ایک اور جگہ رقمطراز ہے۔

"اشتراکی اپنے خیالات اور مقاصد کو پوشیدہ رکھنے سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ علی الاعلان کہتے ہیں کہ ان کے مقاصد صرف اس طرح حاصل ہو سکتے ہیں کہ موجودہ نظامِ معاشرت کو مسلح قوت کے ذریعہ تباہ و برباد کر دیا جائے۔ برسرِ اقتدار جماعتوں اور طبقوں کو اشتراکی انقلاب سے خوف کھانا اور ڈرنا چاہئے۔ مزدور اس انقلاب میں کچھ نہیں کھوئیں گے، انہیں تو ایک دنیا کو فتح کرنا ہے۔"

اسی اصل الاصول کی تائید کمیونزم کے مختلف لٹریچر کے ذریعہ سے ہوتی رہتی ہے چنانچہ ہندوستان میں نظامِ عمل کا مسودہ ("Draft platform of action in India") مطبوعہ ڈیلی ورکر (لندن) کی تیسری شق یہ ہے۔

"ہر قسم کی ذاتی ملکیت مثلاً زمین، جنگلات، سرمایہ، جاگیرداران، والیانِ ریاست، اور مذہبی عبادت گاہوں کی تمام جائدادیں بلا کسی معاوضہ کے ضبط کر لی جائیں۔"

"اشتراکی نظامِ شمسی، (Communistic Solar System) مطبوعہ لیبر پارٹی لندن کے شروع میں ہے۔

"اشتراکی بین الاقوامی کا مقصد یہ ہے کہ وہ ایک منظّم و مسلح لڑائی کے ذریعے سے بین الاقوامی سرمایہ داری کا انہدام کرے اور اس کی جگہ بین الاقوامی سودیٹ جمہوریت کو قائم کرے، جو سرمایہ داری کے مکمل استیصال تک ایک درمیانی ارتقائی منزل کا کام دے۔"

(V·Adorntsky) جو کہ مارکس، انجیلز لینن انسٹیٹوٹ، ماسکو کا ڈائریکٹر ہے۔ اپنی کتاب (Dialectical Materialism) کے صفحہ لکھتا ہے۔

"جماعتی جنگ کے ذریعہ سے اور ڈکٹیٹر شپ کی مدد سے، اشتراکیت جماعتی امتیازات

وتفوّق کو مٹا کر ایک ایسی سوسائٹی کی تشکیل کرے گی، جس میں طبقاتی امتیازات کا وجود نہ ہوگا۔"

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مدیر مارکس ولینن کی اسناد سے اشتراکیت کے حاصل الحصول کے متعلّق لکھتا ہے۔

"مشترکہ ملکیت، وسائل پیداوار کا اجتماعی نظم ونسق اور انفرادی وشخصی حقوق واملاک کا مکمل انقطاع، سوشلسٹوں کا نصب العین حیات ہے۔"

(۲) مذہبی نظام کہا جاتا ہے کہ اشتراکیت ایک خالصتًہ اقتصادی اور سیاسی تحریک ہے، جسے مذہب سے کچھ سروکار نہیں لیکن مدعیانِ تحریک کے نزدیک سب سے پہلے مذہبی انقلاب کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک دنیا میں غریب انسانوں پر جس قدر ظلم واستبداد کی قیامتیں ٹوٹ رہی ہیں سب مذہب کے وجود سے ہیں۔ اور ان مصائب وآلام کا استیصال اُس وقت تک ناممکن ہے جبتک لوگوں کے دلوں سے خدا کے وجود کا ایمان قاطبتًہ مٹا نہ دیا جائے۔ اس لئے کہ

"دنیا میں سب سے پہلا اور سب سے بڑا استبداد کا حامی خود خدا ہے۔"

(Bolshevism by E'dmand Candler)

اور خود لینن خدا کے تصور کی ابتداکی وجہ یُوں بیان کرتا ہے۔ کہ

"سرمایہ داری کی غیر مرئی قوتوں نے ذہنِ انسانی میں ایک ڈر کی صورت پیدا کر دی ہے۔ جس سے ایک حاکم اعلیٰ کے تخیّل کی بنیاد پڑی۔ اسے انسان نے خدا کے نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ سو جبتک خدا کا تخیّل ذہنِ انسانی سے فنا نہ کر دیا جائے، یہ لعنت کسی طرح دُور نہیں ہو سکتی۔"

(Hammer and Sickle by Mark Patrick)

لینن، مارکس کے حوالہ سے اپنے ایک مقالہ مطبوعہ لینن منقلی بابت دسمبر ۱۹۲۶ء میں لکھتا ہے۔

"مذہب لوگوں کے لئے افیون ہے۔ اس لئے نظریۂ مارکس کی رُو سے دنیا کے تمام مذاہب اور کلیسا سرمایہ داری کے آلۂ کار ہیں۔ جن کی توسط سے مزدور جماعت کے حقوق کو پامال

کیا جاتا ہے اور انہیں فریب دیا جاتا ہے۔ لہٰذا نفس مذہب کے خلاف جنگ کرنا ہر اشتراکی کے لئے ضروری ہے۔ تا آنکہ دنیا سے مذہب کا وجود ہی مٹ جائے"۔

مبادیات اشتراکیت (A. B. C. of Communism) مصنّفہ (Buhareu Preobrazbensky) کے باب ۸۹ میں لکھا ہے۔

"اشتراکیت کے نام لیواؤں کا اوّلین فرض ہے کہ مارکس کے اس قول کو کہ مذہب لوگوں کے لئے افیون ہے، عام جماعتوں کے ذہن نشین کرا دیں اور انہیں یقین دلا دیں کہ ازمنۂ گذشتہ میں کیا اور دورِ حاضرہ میں کیا، متمرّد اور سرکش انسانوں کے ہاتھ میں مذہب ہی ایک ایسا حربہ ہے جس کے ذریعہ دُنیا میں عدم مساوات، جماعتی تفریق اور غضب و استبداد کو روا رکھا جاتا ہے۔ اور جس کے نام سے مزدوروں کی جماعت سے سرمایہ کے دیوتا کی پُوجا کرائی جاتی ہے"۔

اس سے ذرا آگے چل کر لکھتا ہے۔

"مذہب اور اشتراکیت عملی اور نظری ہر دو حیثیتوں سے بالکل متضاد و متبائن ہیں"۔

صفحہ ۲۵۷ پر ہے کہ

"جو اشتراکی اپنے مذہبی عقیدے کو بھی ساتھ ساتھ رکھتا ہے، اسے اشتراکیت سے کچھ واسطہ نہیں"

(Lenin and Gandhi) کا مصنّف (Rene Fulop Millor) لکھتا ہے۔

"لینن نے بار بار اپنی تقریر و تحریر میں اس بات پر زور دیا ہے کہ اشتراکین کے عوام و خواص کا نصب العین حیات ہی یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ہر ممکن کوشش صرف کر دیں کہ خدا سے اس کا غلبہ و تسلّط سطوت و حکومت چھن جائے۔ کیونکہ اشتراکی نظام کا بدترین

دشمن خدا کا وجود ہے:

مقدمۂ سازش (میرٹھ) کے ملزم مسٹر نمبکار نے اپنے بیان میں کہا تھا۔

"ہم اس امر کو صیغۂ اخفا میں رکھنا نہیں چاہتے کہ ہم (اشتراکین) دنیا کے تمام مذاہب کے خلاف ہیں اور ہم کبھی اس بات کو گوارا نہیں کر سکتے کہ دنیا میں مذہب کی تبلیغ ہو یا کوئی اشتراکی، مذہبی عبادات و مناسک کو ادا کرے"

اس کی تصدیق دوسرے ملزم مسٹر ادھیکاری نے ان الفاظ میں کی تھی۔

"ہم بہ حیثیت اشتراکین، اور مادہ پرست مذہب اور خدا کے دشمن ہیں۔ لینن نے اسی بات پر زیادہ زور دیا ہے کہ مذہب کے خلاف بھی جنگ اسی زور و شدت سے جاری رکھی جائے جس طرح جماعتی تفریق کے خلاف جنگ ہو۔ چنانچہ اشتراکین کی پانچویں کانفرنس میں مذہب کے متعلق جو فیصلہ کیا گیا وہ بالکل عیاں ہے کہ سرمایہ داری کے تعصبات اور توہم پرستی کے مقابلہ کے لئے سب سے پہلے مذہب سے جنگ کرنا ہو گا، اور اس کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ بالخصوص مزدوروں کی اس جماعت میں جہاں اُن کی روزانہ زندگی میں مذہب عمیق اثر پیدا کر چکا ہے"

چنانچہ پانچویں کانفرنس کے محولہ بالا حق کے الفاظ یہ ہیں۔

"مذہب، حکومت اور کلیسا کے خلاف جنگ کرنا"

اس اصول اور اصول کی فروعی تصریحات کے ماتحت ۱۱ فروری ۱۹۲۲ء کو حکومتِ سوویٹ نے فیصلہ کر دیا کہ قحط سالی کے دفعیہ کی آڑ میں تمام عبادت گاہوں کی املاک ضبط کر لی جائیں۔

(Russia Reported by Walter Duranty—1921-1933)

یہی نہیں بلکہ ماسکو یونیورسٹی کے پروفیسر (Julius F. Hecker) نے اپنی کتاب موسومہ (Religion under the soveit) جو درحقیقت رُوس کی تائید میں ہے لکھا ہے۔

"بالشویک کٹر مادّہ پرست اور دہریہ ہیں مذہب ان کے نزدیک دورِ جہالت کی قلبی گمراہی کا نام ہے، یا ایک فریب ہے یا، افیون ، ہے اور کلیسا ان کے نزدیک اقتدار پسند جماعتوں کا ایک ڈھونگ ہے جو زیر دست انسانوں کے تذلّل اور تعبّد کی خاطر وضع کیا گیا ہے، ان کے نزدیک اشتراکیت کی تہذیب جدید میں مذہب کے لئے کوئی گنجائش نہیں"

پھر لکھا ہے۔

"اشتراکین محض اپنی جماعت کے ارکین سے ہی اس دہریت کا اقرار نہیں لیتے۔ بلکہ غیر اشتراکین میں بھی ان عقائد کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں، اور آنے والی نسلوں کے افراد کے نصاب تعلیم کی اس انداز سے تشکیل کرتے ہیں۔ کہ وہ خود بخود ایسے لامذہبی معتقدات کو ذہن میں لئے ہوئے آگے بڑھیں"

آگے چل کر تحریر ہے۔

"ان کے نزدیک زندگی صرف اسی دنیا کی ہے اس کے بعد پھر وہ کسی اُخروی زندگی کے قائل نہیں۔ ان خیالات کی نشرو اشاعت کے لئے ان کی سوسائٹیاں قائم ہیں جنہیں جمعیتِ منکرینِ خدا (Union of the Godless) کہا جاتا ہے۔ ان جماعتوں کو اشترکی پارٹی کی پوری امداد حاصل ہے"

سنہ ۱۹۳۱ء میں اسی انجمن (منکرینِ خدا) کے صدر (Yaroslavsky) کی تقریر کے اقتباسات اخبارات میں شائع ہوئے تھے۔ جن میں اس نے اپنی انجمن کے ارکین کو مخاطب کرکے کہا تھا۔ کہ

"چونکہ خدا کے خلاف پروپیگنڈا کچھ سست پڑگیا ہے اس لئے خطرہ ہے کہ مذہب کا شگوفہ پھر نہ پھوٹ نکلے۔ لہذا ضرورت ہے کہ پروپیگنڈا نہایت شدومد سے کیا جائے"

(ہندوستان ٹائمز مورخہ ۱۲-۴-۳۱- و لیڈر مورخہ ۱۶-۴-۳۱)۔

ہندوستانی سوشلسٹوں کے سپہ سالار پنڈت نہرو مذہب کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟ سنئیے!!

"جس چیز کو مذہب یا منظّم مذہب کہتے ہیں اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہوگیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے۔ اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو تک کی ہے۔ قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا ندھے یقین اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بیجا فائدہ اُٹھانے کا، قائم شدہ حقوق اور مستقل حقوق رکھنے والوں کی بقا کا حمایتی ہے۔"

(میری کہانی صلا۲۱)۔

(۳) اخلاق اشتراکیت کا یہ جہاد، صرف خدا اور اس کے متعیّن کردہ قوانین کے خلاف ہی نہیں ہے بلکہ اس تجدد پسندی کے نشہ میں وہ ہر اُس اخلاقی قانون اور ضابطہ کو کالعدم کر دینے پر تُلے بیٹھے ہیں جو معلّم اخلاق یا سوسائٹی کے ارکین نے نظامِ امنیّتِ عالم کے لیے وضع کیا ہو چنانچہ لینن اپنی ایک تقریر میں نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

"ہم ان تمام اخلاقی حدود و شرائع کی مذمت کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت عقیدہ کا نتیجہ ہوں۔ ہمارے خیال میں اخلاق کا نظریہ ہمیشہ جماعت کے مفاد کی جنگ کے ماتحت ہونا چاہئیے۔ ہر وہ حربہ جو قدیم غاصبانہ نظامِ معاشرت کے خلاف اور مزدوروں کی تنظیم کی تائید میں استعمال کرنا ضروری سمجھا جائے عین اخلاق ہے۔ اشتراکین کا اخلاق و شریعت تو صرف اسی قدر ہے کہ ڈکٹیٹر کی قوت و سطوت کا استحکام و استبقا کس صُورت سے ہو سکتا ہے۔ اس کے خلاف جو کچھ ہے سب ناجائز ہے چنانچہ جماعتی مفاد کی خاطر جرائم کا ارتکاب، دروغ بافی، فریب دہی عین حق و صداقت ہے، نہیں! بلکہ معاندین کے خلاف کذب و افترا ہی بعض اوقات سب سے اہم حربے ہوتے ہیں۔"

(Lenin and Gandhi)

اسی حقیقت کا اعادہ "مبادیاتِ اشتراکیت" میں ان جامع الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"جو کچھ جماعتی جدّوجہد کی تائید میں ہو عین حلال و درست۔ اور جو اس کے راستہ میں مزاحمت کرتا ہو حرام و ناجائز؛"

یہ نظریہ اشتراکیت میں کچھ بعد کی پیداوار نہیں۔ یہ تمام عمارت ان بنیادوں پر استوار کی گئی ہے جس کی داغ بیل خود مارکس نے اپنے منشور میں ان الفاظ میں ڈالی تھی۔

"اشتراکیت کے انقلاب میں ان تمام کہنہ خیالات کی تبدیلی مضمر ہے جو مختلف ادوارِ عالم میں مختلف شکلوں میں رونما ہوئے ہیں؛"

(۴) نظامِ عائلی مذہب و اخلاق کی حدود و قیود کو توڑ کر سب سے پہلے مرد و عورت کے جنسی تعلقات کو تمام اغلال و سلاسل سے آزاد کیا گیا ہے۔ خدا سے انکار اور مکافاتِ عمل کے اعتقاد سے بیگانگی کا اولین نتیجہ یہی ہونا چاہئے تھا کہ فطرتِ انسان پر جذباتِ بہیمیہ غالب آ جائیں اور خواہشاتِ سفلیہ قوائے ملکوتی کے حسنِ ازلی پر خباثت و رذالت کے گھناؤنے پردے ڈال دیئے چنانچہ سب سے پہلے یہ آواز ۱۹۰۷ء میں (Artiaybashev) نے ایک ناول (Samine) نامی میں بلند کی۔ وہ لکھتا ہے۔

"خواہشاتِ نفسانی کو بلاقیود و پابندی فرد کرنا ہی عین فطرت ہے۔ اس کے لئے نہ ضمیر کی آواز کی پرواہ کرنی چاہئے اور نہ ہی خدا اور انسانوں کے وضع کردہ اصولوں سے خائف ہونا چاہئے۔ بادہ نوشی اور حرامکاری میں کوئی ایسی معیوب بات نہیں جس سے انسان خواہ مخواہ شرماتا پھرے۔ تُند و تیز مَے نوشی اور وسیع جذباتِ فحش کاری فطرتی جذبات ہیں۔ اور جو چیز فطری ہو وہ ناجائز کیسے ہو سکتی ہے؛[1]"

چنانچہ (Samine) کی اس صلائے عام پر بہت سے نوجوان مرد و عورتوں نے لبّیک کہا، اور بلاقیود ہوس رانیوں کی عام سوسائٹیاں وجود میں آ گئیں۔ اسی طرح دہانِ شراب کی بھی بیشمار قسمیں رائج ہو گئیں۔ چنانچہ مسٹر (Alexander Wicklead) نے اپنی کتاب

(۱) Religion under the Soveit

(Ten years in Soveit Russia) میں بادہ نوشی کی کئی قسمیں گنائی ہیں۔

لیکن اس کا بہت گہرا اور خطرناک اثر سلسلۂ ازدواج و مناکحت پر پڑا جس پر مدنی الطبع انسان کی عائلی زندگی کا کلیتہً دار و مدار ہے چنانچہ زمین، سرمایہ اور جائداد کی طرح اشتراکیت کی رُو سے عورت بھی تمام افرادِ جماعت کی مشترکہ ملکیت ہے۔ جس کی تقسیم ماحصل محنت کی تقسیم کی طرح حکومت کرتی ہے۔ کوئی شخص کسی عورت کو اپنی بیوی نہیں کہہ سکتا۔ عورت حکومت کی ملکیت اور سب کی بیوی ہے۔ اس اشتراک کا تخیل بھی اشتراکین کے مورثِ اعلیٰ مزدک ایرانی کی مرفعتِ اخلاق کا رہینِ منت ہے۔ چنانچہ اس کے نظامِ اشتراکیت میں بھی مناکحت کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی، عورت مشترکہ بیوی، اور بچہ حکومت کی اولاد سمجھے جاتے تھے۔ ملاحظہ ہو (Enc. of Religions and Ethics)

روس میں ابھی اشتمالیت کے طرز کی حکومت ہے جو اشتراکیت سے کہیں معتدل اور نرم رو ہے۔ لیکن وہاں عورت و مرد کے جنسی تعلقات کے لئے کسی نکاح و عقد کی بندش ضروری نہیں۔ جبتک کسی جوڑے کا جی چاہے میاں بیوی کی حیثیت سے رہے۔ البتہ اعداد و شمار کی سہولت اور قانون کی دیگر شقوں میں آسانی کی خاطر اتنا ضروری ہے کہ وہ کسی مجسٹریٹ کے سامنے جاکر اپنے ان تعلقات کی اطلاع کر دیں یہ محض رسمی سی بات ہے۔ ورنہ رجسٹری شدہ اور غیر رجسٹری شدہ میاں بیوی کی اولاد میں قانوناً و عرفاً وہاں کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ ہاں جو شادیاں مذہبی قواعد کے مطابق سرانجام پاتی ہیں حکومت انہیں قانوناً تسلیم نہیں کرتی (ملاحظہ ہو (Soveit union year book for 1928)

شادی کی غرض و غایت وہاں تولید و افزائش نسلِ انسانی یا نظامِ عائلی کی طرز پر زندگی بسر کرنا نہیں بلکہ محض تعیش و ہوس رانی ہے مانع حمل تدابیر اگرچہ آج تمام مہذب دنیا میں رائج ہو چکی ہیں لیکن روس میں اس کے لئے حکومت کی طرف سے باقاعدہ ریسرچ انسٹیٹوٹ کھلے ہوئے ہیں۔ یورپ اور دیگر مہذب ممالک میں ابھی حرام کاری کے نتائج کو بالعموم چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے کیونکہ اس سے صنفِ نازک کی عفت پر دھبہ لگتا ہے اور مانع حمل تدابیر زیادہ تر لامحالہ اس لئے اختیار کی جاتی ہیں کہ اولاد پیدا نہ ہو۔ اس میں اسقاطِ حمل قانوناً جائز ہے اور حکومت کی طرف سے مخصوص ہسپتال صرف اس غرض

کے لئے کھلے ہوئے ہیں کہ ان میں اسقاطِ حمل منظم طریقہ سے عمل میں لایا جائے۔ دیکھئے

(Modern Russia by Cecil Hamilton)

مناکحت کے بعد طلاق کا سوال آتا ہے۔ طلاق حاصل کرنے کے لئے متعاقدین میں سے کسی ایک کا عدالت میں جا کر صرف یہ کہدینا کافی ہے کہ اسے فریقِ ثانی کے ساتھ رہنا منظور نہیں۔ (Soveit year book-1929) اس کے بعد یہ ضروری نہیں کہ فریقِ ثانی کو بھی اس کی اطلاع دی جائے۔ چنانچہ (Modern Russia) کی مصنّف کے بیان کے مطابق روس میں نصف چھٹانک مکھن حاصل کرنے کے مقابلہ میں طلاق حاصل کرنا آسان ہے۔ خاتون موصوفہ رقمطراز ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ صبح کو مرد رہتا سہتا گھر چھوڑ کر گیا ہے، لیکن شام کو واپس آیا تو گھر میں نہ بیوی موجود ہے نہ بچے۔ صرف ایک اطلاعی کارڈ رکھا ہوا ہے کہ بیگم صاحبہ آج کسی اور کی زینتِ آغوش ہوں گی۔

طلاق کے بعد بچے کی کفالت کا ذمہ دار مرد کو قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر باپ عدالت میں یہ ثابت کردے کہ ماں کا تعلق بیک وقت کئی مردوں کے ساتھ تھا، تو بچے کی کفالت کے اخراجات سب میں برابر تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔ (Mo"dern Russia)

حکومت نے لاوارث بچوں کے لئے پرورش گاہیں بنا رکھی ہیں لیکن مسٹر (Domillett) بلجیم قونسل کے قول کے مطابق وہاں قریب پچاس لاکھ بچے لاوارث مارے مارے پھرتے ہیں جنہیں نہ کھانے کو ملتا ہے نہ رات کو سونے کے لئے چھت میسر ہے۔

ایک ممتاز روسی سائنس دان (Anton Nemilo(e)) جو اشتراکیت کا پرجوش حامی ہے، اپنی کتاب (Biological Tragedy of Women) میں اعتراف کرتا ہے کہ مردوں میں صنفی انارکی (حدود شکنی و قیود فراموشی) عام ہوگئی ہے چنانچہ وہ تنبیہ کرتا ہے کہ اگر صورتِ حال یہی رہی تو اشتراکی نظام تباہ ہو کر رہے گا۔

مشہور اشتراکی اخبار (Prauda) میں اب سے چند سال قبل ایک مضمون نکلا تھا،

جس میں درج تھا۔

"محبت کے معاملہ میں ہمارے نوجوان چند خاص اصول رکھتے ہیں اور ان سب اصولوں کی تہہ میں یہ تخیل کارفرما ہے کہ جس قدر زیادہ تم حد کو پہونچنے میں کامیاب ہوگئے۔ یا بالفاظ دیگر جس قدر زیادہ تم حیوانیت کے قریب ہوگئے اسی قدر زیادہ تم اشتراکی ہوگئے لیبر فیکلٹی کا ہر ممبر، ہر طالب علم، خواہ وہ مرد ہو یا عورت اس بات کو اصول متعارفہ میں سے شمار کرتا ہے کہ محبت کے معاملات میں جہاں تک ممکن ہو اس کو اپنے اُوپر کوئی قید عائد نہیں کرنی چاہیئے۔ اس طرح کے اصولِ متعارفہ میں سے ایک اصل یہ بھی ہے کہ ہر لڑکی جو لیبر فیکلٹی میں داخل ہے اس پر یہ لازم ہے کہ جب اس کے نوجوان ساتھیوں میں سے کسی کی نظرِ انتخاب اس پر پڑے تو وہ بلا حیل و حجت اپنے آپ کو اس کے سُپرد کردے"۔ (بحوالہ ترجمان القرآن - ۱۲/۱) -

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ جب اشتراکیت کی معتدل شکل اشتمالیت میں نظامِ عائلی کا یہ حال ہے تو اصل اشتراکیت میں تو خانگی زندگی کا وجود ہی مٹ جائے گا۔ مذکورہ صدر واقعات سے قطع نظر جب اشتراکیت کا اصول ہی یہ ہے کہ عورت املاک انسانی کی طرح جماعت کی مشترکہ ملکیت ہے۔ اور جنسی تعلقات کے لئے نکاح و پابندی کی ضرورت نہیں تو اشتراکیت میں عائلی زندگی کا جو حشر ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ نہ خون کے رشتے رہیں گے نہ ترکہ و وراثت کا سوال ہوگا نہ کوئی عورت محرمات میں سے ہوگی۔ نہ کوئی باپ کہلائے گا نہ بیٹا کسی سے منسوب ہو سکے گا نہ کسی کی کوئی بیوی ہوگی۔ نہ بیوی کا خاوند ہوگا نہ ہمشیرہ کی تمیز ہوگی نہ ماں کی پہچان غرضیکہ انسانوں کی بستیاں حیوانوں کا وسیع جنگل ہوگا جہاں جذبات شہوانیہ کے فرد کرنے کے لئے متضاد جنسوں کے افراد اکٹھے رہتے ہوں گے۔

(۵) طریق کار مارکس کے منشور کے بعد تحریک اشتراکیت میں لیننؔ کی کتاب (State and Revolution) گویا عہد جدید کا مرتبہ رکھتی ہے۔ اس میں لیننؔ لکھتا ہے۔

"سرمایہ داری نظامِ حکومت کی جگہ اشتراکین کی حکومت کا برسرِ اقتدار آجانا تشدد آمیز انقلاب کے بغیر ممکن نہیں"

پھر دوسری جگہ لکھتا ہے۔

"مزدوروں کی جماعت کی آزادی تشدد آمیز انقلاب اور موجودہ نظامِ حکومت کی مشینری کی مکمل تخریب کے بغیر ممکن نہیں"

اسی کتاب کے صفحہ ۹۶ پر انجلز کے ایک مقالہ کا اقتباس دیتے ہوئے جو ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا تھا۔ وہ لکھتا ہے۔

"انقلاب ایک ایسا عمل ہے جس کی رو سے آبادی کا ایک حصہ دوسرے حصہ پر اپنا اختیار وارادہ قوت واستیلاء۔ نوکِ شمشیر، گولیوں کی بوچھار، اور آتشیں گولوں کے دھماکوں سے زبردستی مسلط کر دیتا ہے"

اور یہ کہ۔

"ہم حکومت کی مشینری کی مکمل تخریب اس انداز سے چاہتے ہیں کہ مسلح مزدوروں کی جماعتیں زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں"

سنہ ۱۹۰۵ء کے انقلابِ روس پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے اپنے خیالات ان الفاظ میں ظاہر کئے تھے۔

"ہم اس حقیقت کو بالکل چھپانا نہیں چاہتے کہ اس کے بعد جو انقلاب ہوگا وہ جارحانہ خون آشام اور ہلاکت آفریں جنگ ہوگی"

A. B. C. of Communism جس کا پہلے ذکر آچکا ہے انہیں خیالات سے لبریز ہے۔ اور اس میں بتایا گیا ہے کہ ان حالات کے ماتحت مزدوروں کی جماعت کے لئے خانہ جنگی Civil War بالکل لاینفک ہو جاتی ہے۔ اسی کتاب کے آخری باب ان تمام تفصیلات کو اجمالاً ان الفاظ میں قلمبند کیا گیا ہے۔

"اشتراکیت کا انقلاب صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے کہ وہ عالمگیر شکل

اختیار کرلے۔

(Stalin) اپنی مشہور کتاب (Leninism) میں بھی انہی تدابیر کو بروئے کار لانے پر زور دیتا ہے۔ روس کی کمیونسٹ جماعت نے ۱۹۱۹ء میں ایک لاسلکی پیغام دنیا کی کمیونسٹ جماعت کے نام بھیجا تھا جس میں منجملہ دیگر امور کے یہ بھی تھا کہ۔

"اس جدوجہد اور جنگ وجدل کا طریق عمل یہ ہوگا کہ جمہور مزدور کی جماعت میدانِ عمل میں آجائے۔ اور سرمایہ داری نظام کے خلاف ہر اس ہتھیار سے کام لے، جو ان کے ہاتھ آجائے"

اس کے بعد کمیونسٹ روس کی دوسری کانگریس منعقد ہوئی جس میں مزبورہ صدر تدابیر سے اتفاق کرتے ہوئے مقاصدِ انقلاب کے ماتحت قرار پایا کہ۔

"بین الاقوامی اشتراکیت اپنا نصب العین یہ مقرر کرتی ہے کہ بین الاقوامی سرمایہ داری کے نظامِ حکومت کے خلاف مسلح جنگ شروع کردے"

اثناں بعد ۱۹۲۲ء میں پانچویں کانگریس میں ان امور کے جزئیات وفروعات کی تفصیل طے پائی۔ چنانچہ اس کی رودَاد میں ہے۔

"وقت آگیا ہے کہ تمام اشتراکین پر یہ فرض کر دیا جائے کہ تمام ممالک عالم میں خواہ وہ جماعتی جنگ کے اعتبار سے آزاد، قانون پسند اور امن جو ہی کیوں نہ ہوں منظم طریق پر جماعت کے ایسے کاموں میں شریک ہو جائیں، خواہ وہ جائز ہوں یا ناجائز"

یہی چیز ٹراٹسکی نے اپنی کتاب (Defence of Terrorism) میں پیش کی ہے جہاں وہ لکھتا ہے کہ۔

"انقلاب کا تقاضہ ہے کہ وہ انقلاب پسند جماعتوں سے مطالبہ کرے کہ جو قوت ان کے حیطۂ اختیار میں ہو اُسے بروئے کار لے آئیں۔ اگر ضرورت ہو تو ایک مسلح شورش کے ذریعہ اور اگر مناسب سمجھیں تو دہشت انگیز طریقوں سے"

پنڈت جواہر لال نہرو فرماتے ہیں۔

"بعض لوگ جو عدم تشدد کا عقیدہ رکھنے کے مدعی ہیں کہتے ہیں کہ شخصی ملکیت کو اس کے مالکوں کی مرضی کے خلاف قومی ملکیت بنانے کی کوشش کرنا جبر ہے۔ اس لئے یہ عدم تشدد کے خلاف ہے .... یہ امید رکھنا کہ ایک پورے طبقے یا پوری قوم کے عقائد بدلے جاسکیں گے، یا اپنے حریفوں کو عقلی دلائل سے قائل کرلے یا ان کے جذبۂ انصاف کو ابھارنے سے باہمی مخالفت دور ہو جائے گی، اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے یہ محض ایک فریب خیال ہے کہ مؤثر دباؤ ڈالے بغیر، یعنی جبر و تشدد سے کام لئے بغیر کوئی حاکم قوم محکوم ملک سے قبضہ اٹھا لے گی۔ یا کوئی طبقہ اپنے اقتدار یا امتیازی حقوق سے دست بردار ہو جائے گا۔ (میری کہانی ص ۵۶۰-۵۷)

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"سوسائٹی کی موجودہ کشمکش یعنی قومی جنگ اور پھر طبقات کی جنگ کا فیصلہ جبر کے سوا کسی اور صورت سے ممکن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کام بڑے پیمانہ پر کرنا پڑے گا کیونکہ جب تک بڑی جماعت ہم خیال نہ ہو جائے اس وقت تک نظام تمدن بدلنے کی کوئی تحریک مضبوط بنیاد پر قائم نہ ہو سکے گی۔ لیکن اس کے بعد تھوڑے لوگوں پر جبر کرنے کی ضرورت ہو گی۔" (میری کہانی ص ۷۶۹)۔

چونکہ جماعتی مفاد کے حصول کے لئے اشتراکیت میں جائز و ناجائز کی کوئی تمیز باقی نہیں رکھی گئی، اس لئے ان کے نزدیک حلیف و حریف برابر ہیں۔ عہد و پیمان اور میثاق و معاہدہ کوئی شے نہیں۔ بظاہر دوست ہوں گے لیکن اس دوستی کے پردہ میں تخریب و استہلاک کی ہر ممکن کوشش بروئے کار لائیں گے لہٰذا ان پر نہ امن و صلح کے زمانہ میں کوئی بھروسہ نہ جنگ و قتال کے وقت کسی ایفائے عہد کی توقع۔

اشتراکیت کے آہنی اصول۔ اور ان اصولوں کے پروپیگنڈا کا اثر ہے کہ ۱۹۱۷ء کے بعد آج تک اقصائے عالم کا کوئی گوشہ امن و امان کی زندگی بسر نہیں کرسکا ہر ملک اور ہر طبقہ میں عدم اطمینان و فقدان سکون کی ایک

رو پھیل گئی ہے جو مختلف قسموں کے انقلابات کی شکل میں آئے دن امن عامہ پر برق خاطف بن کر گرتے رہتے ہیں چنانچہ ۱۹۰۵ء میں انقلاب روس کے بعد ۱۹۰۶ء میں ایران میں ۱۹۰۸ء میں ترکی میں اور ۱۹۱۱ء میں چین میں انقلابات کا سیلاب اُمڈا۔ یورپین ممالک میں یہ انقلابات اسٹرائک کی شکل میں پیدا ہوئے ۱۹۱۱ء میں ریلوے کی جنرل اسٹرائک ہوئی۔ اسی طرح ۱۹۱۰ء میں جرمنی میں عام نیابت کے لئے مزدوروں نے مظاہرے کئے اور روس میں ۱۹۱۴ء میں باکو وغیرہ کے کارخانوں میں اسٹرائک ہوئی۔ پھر جنگِ عظیم کے بعد تو ان انقلابات کو پوچھئے ہی نہیں۔ تاریخ عالم میں جو تغیرات صدیوں میں ہوا کرتے تھے وہ اب دنوں میں ہو جاتے ہیں۔ اور اگر دس بیس سال اُدھر کی تاریخ کے اوراق آج سے سو سال پیشتر کے کسی مدبر و سیاست دان کے سامنے رکھ دیئے جائیں تو وہ انہیں کبھی حقیقت پر محمول نہ کرے گا بلکہ محض افسانہ طرازی سمجھ کر خاموش ہو رہے گا۔ پھر روس میں ان انقلابات کی وجہ سے نوعِ بشری جن لرزہ فگن اور جگر پاش مصائب و آلام کا شکار ہوئی ہے اُس کی نظیر تو شاید ہی کہیں ملے۔ دنیا بھر کی تاریخ کے رنگین اوراق کے مقابلہ میں اکیلے روس کی خونی داستان کا پلڑا شاید جھکتا ہی نظر آئے گا۔ اور ابھی آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

نظامِ حکومت

اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ ایسی تمثیلی سوسائٹی (Ideal Society) کی تشکیل کے بعد جس کے خواب مدعیانِ اشتراکیت دیکھ رہے ہیں اشتراکیت کا نظامِ حکومت کیا ہوگا؛ اس کے متعلق (Stalin) اپنی کتاب (Leninism) میں لکھتا ہے۔

"لینن ازم (عہد حاضرہ کی اشتراکیت) سے مُراد مزدوروں کی جماعت کے ڈکٹیٹر مقرر کرنے کا نظریہ اور اس نظریہ کی عملی ہیئت کذائی ہے۔"

اس کے بعد ڈکٹیٹر شپ (Dictatorship) کی تفصیل خود لینن کے الفاظ میں یوں لکھتا ہے۔

"ڈکٹیٹر ایسی مختارِ عام ہستی کا نام ہے جس کا وجود قاطبۃً قوتوں کے ہجوم پر مبنی ہو۔ ایسی مطلق العنان ہستی جو کسی قانون اور کسی ضابطہ کی پابند نہ ہو۔ آئینی نظام حکومت کے علمبردار سُن لیں اور خوب غور سے سُن لیں کہ ڈکٹیٹر شپ کے معنی ہیں "قوت، غیر محدود اور قاہرہ قوت۔ جو

جبر واکراہ پر مبنی ہو۔ اور جسے آئین و دستور شریعت و قانون سے کچھ سروکار نہ ہو۔"

اس اجمال کی مزید تفصیل وہ (Foundations of Leninism) میں دیتا ہے اور لکھتا ہے۔

"مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ ایسی انقلاب پسند اور صاحب اقتدار ہستی کا وجود ہے جس کی مطلق العنانی سرمایہ داری کی مکمل شکست و ریخیت کے بعد لوگوں سے بجبر منوائی جائے گی۔"

دوسری جگہ خود لینن کے الفاظ نقل کر کے وہ لکھتا ہے۔

"مزدوروں کا ڈکٹیٹر جمہوریت کے انداز کی صاحب اقتدار ہستی نہ ہوگی جس کا انتخاب رائے عامہ سے عمل میں آتا ہے۔"

چنانچہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے شروع شروع میں مزدوروں اور کسانوں کے مندوبین پر مشتمل ایک آئینی مجلس قائم ہوئی تھی لیکن ۶ رجنوری ۱۹۱۸ء کو لینن نے اس مجلس کو کالعدم کر کے اپنے ڈکٹیٹر ہونے کا اعلان کر دیا۔

عملی حیثیت سے اگرچہ روس کی حکومت اپنے آپ کو اشتمالی جمہوریت (Socialist Republic) کہتی ہے لیکن درحقیقت وہاں اشتراکین کی جماعت اور اس جماعت کا ڈکٹیٹر ہی اصل حاکم ہے۔ اس جمہوریت میں جس انداز سے نمائندے منتخب ہوتے ہیں اس کا اندازہ کچھ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک کسان نے کانگریس کے بھرے مجمع میں کہہ دیا تھا کہ رائے عامہ تو محض ایک کھلونہ ہے اشتراکین اگر ہمیں مجبور کریں تو ہمیں ٹٹو کو نمائندہ بنا کر بھیجنا پڑ جاتا ہے۔

(Communism Exposed)

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ اشتراکیت کا موجودہ نظامِ حکومت شخصی اور بالکل ایسا ہی مطلق العنان ہے۔ جیسا شہنشاہیت کا نظامِ حکومت تھا (Religion—under the Soveit) کا مصنف لکھتا ہے کہ۔

"بالشوزم اپنی ڈکٹیٹر شپ کے ساتھ بلاشائبہ تشکیک شخصی حکومت ہے بلکہ قدیم نظامِ شخصیت

سے بھی زیادہ خود اختیار"۔

اسی کی تائید اشتراکیوں کی تیسری بین الاقوامی کانفرنس نے ان الفاظ میں کی ہے۔

"سیاسی نظامِ حکومت میں جمہوریت کے طرزِ حکومت کو مسترد کر دیا جائے"۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا)۔

اور بفرضِ محال اگر کسی ملک کے سوشلسٹ جمہوری حکومت بھی قائم کرنا چاہیں تو اس کی نوعیت کیا ہو گی؟

اس کا جواب پنڈت جواہر لال نہرو کی زبانی سنئے جو فرماتے ہیں کہ۔

"دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے"۔ (میری کہانی ص۵۵)۔

اور اس حقیقت کا عملی ثبوت آپ کو آج کل کے کانگریسی صوبوں کے اندازِ حکومت سے بخوبی مل سکے گا۔ پھر جو حیثیت گاندھی جی کو دی جا رہی ہے۔ نگہ حقیقت بین اس سے بھی اندازہ کر سکتی ہے کہ ہُوا کا رُخ کس طرف کو ہے۔

(باقی)

ان اصول و مبادیات سے لازمی طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اشتراکیت کا نصب العین اور دستور اساسی حسب ذیل شقوں میں منقسم ہے۔

نظامِ معاشی:۔ ہر قسم کی شخصی اور انفرادی ملکیت خواہ وہ جائیداد کی شکل میں ہو یا سرمایہ کی، یکسر مٹا دی جائے۔ انفرادی کوششوں اور ذاتی محنتوں کے حاصل کو عوام کی مشترکہ ملکیت قرار دے دیا جائے۔ تاکہ جماعتی تفریق مٹ جائے اور مالی مساوات پیدا ہو جائے۔

نظامِ عائلی:۔ ازدواجی تعلقات پر سے تمام قیود اور پابندیاں اٹھا دی جائیں۔ عورت کو ہر مرد سے اختلاطِ جنسی کی مکمل آزادی ہو، بچے عوام کی ملکیت قرار دئے جائیں، اور اس طرح "نظامِ عائلی" کو کالعدم کر دیا جائے۔

نظامِ حکومت:۔ ہر قسم کی حکومت کا خاتمہ کر دیا جائے اور جب تک یہ مقصد حاصل نہ ہو، اس وقت تک حکومت کے تمام اختیارات ایک قوتِ قاہرہ یعنی منزہ عن الخطا، اور مطلق العنان

ڈکٹیٹر کو دے دئے جائیں۔

نظامِ مذہب:۔ خدا کی ہستی کا اعتقاد ذہنِ انسانی سے محو کر کے تمام مذاہب کا نام ونشان صفحۂ ارض سے مٹا دیا جائے۔ اور جب یہ ہو گیا تو عاقبت پر ایمان خود بخود ناپید ہو جائے گا۔

طریقِ کار:۔ ان نظریات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جائز وناجائز ہر حربہ استعمال کیا جائے۔ اور خون وآتش کی ہلاکت انگیزیوں سے لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ اس نظامِ زندگی کو اختیار کریں۔

یہ ہے مختصراً وہ **سوشلزم** جس کے متعلق ڈاکٹر اشرف صاحب کا ارشاد ہے کہ اس کے خلاف یہ "پروپیگنڈا، قطعاً لاعلمی پر مبنی ہے کہ "وہ خدا اور مذہب کے خلاف ہے۔ قدیم تمدن اور کلچر کے خلاف ہے۔ ضابطۂ اخلاق کے خلاف ہے۔ ازدواجی تعلقات کی حدود وقیود کے خلاف ہے۔ اس کے نظامِ حکومت میں جمہوریت نہیں۔ سوشلسٹ تشدد پسند ہوتے ہیں" وغیرہ وغیرہ۔ ہم حیران ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے اس بیان کو "قطعاً لاعلمی" پر مبنی سمجھیں یا دانستہ کتمانِ حقیقت پر۔ بہر حال سوشلزم کے بنیادی اصول آپ کے سامنے ہیں۔ اور ان کی ایک ایک شق سوشلسٹ مفکرین کے اقوال وکُتب کی اسناد پر مبنی ہے۔ ان شقوں کو سامنے رکھ کر اب ہم دیکھیں گے کہ سوشلزم کہاں تک اسلام کے موافق، یا مخالف ہے۔

اسلام

جس طرح اشتراکیت کے تعارف میں صرف ان ہی اصولوں کو معتبر سمجھا گیا ہے جو مدعیانِ تحریک کے نزدیک مستند ہیں اور ان کے ماورا فرد عات یا ذاتی قیاسات کو اہمیت نہیں دی گئی، اسی طرح اسلامی تعلیم کو پیش کرتے وقت صرف قرآنِ کریم کی نصوصِ صریحہ اور سنتِ نبوی کی حکمتِ بالغہ کو ہی سامنے رکھا جائے گا۔

نظامِ معاشی | اشتراکیت ذاتی اور انفرادی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتی۔ لیکن اسلام ہر شخص کی کمائی

اس کی ذاتی ملکیت قرار دیتا ہے زمانۂ ظہورِ اسلام میں جائداد و املاک عموماً مویشیوں کی شکل میں تھیں۔ ان کے متعلق فرمایا۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُم مِّمَّا عَمِلَتْ أَيْدِينَا أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ ۳۶-۷۱

کیا ان لوگوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم نے ان کے لئے اپنے دستِ قدرت سے مویشی پیدا کئے ہیں جن کے یہ لوگ مالک ہیں۔

جب خدا کی بنائی ہوئی چیزیں انسان کی ملکیت ہو سکتی ہیں تو انسان کی اپنی کمائی اور مصنوعات تو یقیناً اُس کی ملکیت ہوں گی۔ ارشاد ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۴-۳۲

جو مرد کماتے ہیں اس میں مردوں کا حصہ ہے اور جو عورتیں کماتی ہیں اس میں عورتوں کا حصہ ہے۔

اشتراکیت کے اصول نفی املاک سے اسلام کا معاشی تمدنی اور عمرانی ہر قسم کا نظام منہدم ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ۱۷-۲۶

قرابت دار کو اس کا حق دیتے رہنا۔ اور محتاج اور مسافر کو بھی۔ اور مال کو بے موقع فضول خرچی میں نہ اڑانا۔

ظاہر ہے کہ ان حقوق کی ادائیگی اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب کوئی چیز کسی کی ملکیت ہو۔ اگر ہر چیز غیر کی ملکیت ہو اور کمانے والے کو صرف اس کی ضرورت کے مطابق حصہ ملے تو وہ دوسروں کے حقوق کیسے ادا کر سکتا ہے۔

یہی حال ترکہ و وراثت کے احکام کا ہے جن پر ذاتی ملکیت کی عدم موجودگی میں عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ حکم ہے۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۚ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ ۴-۳۳

اور ہر ایسے مال کے لئے جسے والدین اور رشتہ دار لوگ چھوڑ دیں ہم نے وارث مقرر کر دیئے ہیں اور جن لوگوں

سے تمہارے عہد بندھے ہوئے ہیں ان کو ان کا حصہ دیدو۔

دوسری جگہ ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۔ ۴ - ۷

مردوں کے لئے حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور قرابت دار چھوڑ جائیں اور عورتوں کے لئے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور قرابت دار چھوڑ جائیں وہ چیز تھوڑی ہو یا بہت حصہ قطعی ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ وصیت، وراثت، ترکہ کے احکام اسی صورت میں نافذ العمل ہیں جب کوئی شخص ترکہ چھوڑ کر مرے۔ اگر کوئی شخص ترکہ نہ چھوڑے تو ان احکام کا اطلاق نہیں ہوگا۔ پس اشتراکیت میں جب ترکہ ہی نہیں تو یہ احکام خود بخود ساقط ہو جائیں گے۔

بظاہر یہ اعتراض قوی نظر آتا ہے لیکن ادنیٰ تدبر سے اس کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے اس میں شبہ نہیں کہ وراثت و ترکہ کے احکام اسی وقت نافذ ہوں گے جب کوئی ترکہ چھوڑ کر مرے لیکن "ترکہ نہ چھوڑنے" اور "ترکہ نہ چھوڑ سکنے" میں بڑا فرق ہے۔ پہلی صورت میں جواز ہے اور دوسری میں جبر۔ قرآن حکیم کے اوامر کا مطلب یہ ہے کہ وہ بجائے خویش متعین ہیں اور جس چیز کو قرآن نے حلال کیا ہے دنیا کی کوئی طاقت اسے حرام نہیں بنا سکتی حتیٰ کہ یہ اختیار خود نبی ؐ کو بھی نہیں دیا گیا۔ حضورؐ نے ایک قسم کے شہد نہ کھانے کی پابندی اپنے اوپر عائد کر لی۔ تو فوراً حکم آ گیا۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ۶۶

اے نبیؐ جس چیز کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے اسے اپنے اوپر حرام کیوں کرتے ہو۔

یا مثلاً قرض لینے اور دینے کا معاملہ ہے ہو سکتا ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں ایسا وقت آ جائے کہ کسی کو قرض لینے کی ضرورت نہ پڑے۔ یا کسی کے پاس قرض دینے ہی کو کچھ نہ ہو تو ان صورتوں میں اگرچہ قرضہ کے احکام ساقط العمل ہو جائیں گے لیکن دنیا کی کوئی طاقت ایسا قانون نہیں بنا سکتی۔ جس کی رُو سے قرآن کے تجویز فرمودہ قواعد لین دین کو اس طرح بدل دیا جائے کہ ایک مسلمان باوجود جائز ضرورت و احتیاج کے کسی سے کچھ قرض نہ لے سکے۔

دوسرا مسلمان استطاعت واقتدار رکھتے ہوئے اپنے مسلمان بھائی کو قرضہ نہ دے سکے۔ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے وجعلنا موالی ہم نے وارث مقرر کر دیئے ہیں۔ اور مدعیانِ اشتراکیت کہتے ہیں کہ جنہیں اللہ وارث مقرر کرتا ہے انہیں ہم ورثہ سے محروم کرتے ہیں" کیا کوئی مسلمان ایسے قانون کو برداشت کر سکتا ہے جو خدائی قانون کا ناسخ ہو ــــ؟

قرآن کریم کی تعلیم کی رو سے مسلمان کی زندگی کا مقصد وحید اور نصب العین حیات ہی یہ ہے کہ وہ اللہ کے راستے میں ہر وقت ہر ایثار کے لئے تیار رہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم کے پہلے ورق میں انسانوں کی ان امتیازی خصوصیات کا ذکر ہے جن سے وہ صحیح اسلامی سوسائٹی کے افراد بن سکتے ہیں۔ یہ خصوصیتیں تین ہیں۔

(۱) اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ	ایمان بالغیب
(۲) وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ	عبادتِ بدنی (نماز)
(۳) وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ	انفاق فی سبیل اللہ

اور اصل نیکی کے متعلق فرمایا۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ط ۳-۹۲

تم نیکی کو نہیں پہونچ سکتے یہاں تک کہ اپنی محبوب شے کو خرچ نہ کر دو۔

یہ ظاہر ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ذاتی ملکیت تسلیم کی جائے۔ ورنہ جو چیز اپنی ملکیت ہی نہیں۔ اس میں سے انفاق کیسا؟ قرآنِ کریم نے فرمایا۔ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ گویا جو اللہ نے دیا ہے وہ انفرادی ملکیت ہے۔

وَآتُوْھُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیْ اٰتٰکُمْ۔ ۲۴-۳۳۔

اس مال میں سے ان کو (غلاموں کو) بھی دو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے۔

اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ ۲-۲۶۷

اپنی کمائی میں سے عمدہ چیز کو خرچ کیا کرو۔

مَا کَسَبْتُمْ سے مطلب ہی یہ ہے۔ کہ جو کچھ تم کماتے ہو۔ وہ تمہاری ملکیت ہے۔

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ط (۵۷ - ۷) جس مال کا تم کو (پہلوں سے منتقل کر کے) وارث بنایا ہے اس میں سے خرچ کرو۔

اشتراکیت کے حامی کہہ سکتے ہیں کہ جب کسی کا سرمایہ۔ جائداد۔ کمائی۔ ورنہ سب کچھ حکومت لیلے تو یہ انفاق کی وہ حد ہے جس سے بڑھ کر قربانی اور ایثار کی مثال نہیں ہو سکتی۔ لیکن اسلامی انفاق (جو تقوٰے پر مبنی ہے) اور اس قسم کے جبر میں بڑا فرق ہے۔ اسلام نے بھی ایک ٹیکس (زکوٰۃ) مقرر کیا ہے۔ جو بہر حال وصول کیا جاتا ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۹-۱۰۳

ان کے مالوں میں سے صدقہ لیجئے۔ کہ اس سے یہ ظاہر و باطن میں پاک ہو جائیں گے۔ اور پھر ان کے لئے دعا کیجئے۔

لیکن ساتھ ہی اس نے خیرات کا بھی حکم دیا ہے جس میں جبر و اکراہ کو دخل نہیں۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ - قُلِ الْعَفْوَ - (۲۱۹-۲)۔

آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں۔ کہدیجئے کہ جتنا آسان ہو۔

اس کے علاوہ جہاں دنیاوی قوانین سے محض قومی افادیت اور ملکی مفاد مقصود ہوتے ہیں۔ وہاں اسلامی انفاق میں ان مفاد کے ساتھ ساتھ تزکیہ قلوب و نفوس بھی پیش نظر ہے۔ ایک طرف قوم کے محتاج۔ مفلوک الحال افراد کی دستگیری مقصود ہے تو دوسری طرف معطی کے قلب کو حب مال کی خباثت سے پاک اور اس کی جگہ ایثار و قربانی کے جذبہ کی پرورش کرنا بھی مطلوب ہے۔ یہ دوسرا مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ انسان ارادہ و اختیار کے باوجود اپنی پاک کمائی اور جائز ملکیت میں سے بہ خوشی خرچ کرے۔ قرآن کریم نے اس فرق کو نہایت لطیف پیرایہ میں بیان فرمایا ہے۔

جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی کیفیت اس دانہ کی سی ہے جس میں سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال کے اندر سو دانے ہوں۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ آزار دیتے ہیں ان کے اعمال کا ثواب ملے گا۔

"مناسب بات کہد ینا اور درگذر کرنا بہتر ہے ایسی خیرات سے جس کے بعد آزار پہونچایا جائے۔ اے ایمان والو احسان جتا کر یا آزار پہونچا کر اپنی خیرات کو برباد نہ کرو وہ شخص جو اپنا مال لوگوں کے دکھلانے کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یوم قیامت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کی حالت اس چکنے پتھر کی سی ہے جس پر کچھ مٹی پڑ گئی ہو۔ لیکن جسے زور کی بارش فوراً بہا لے جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنی کمائی کا پھل ذرا بھی ہاتھ نہیں لگتا" ۔ ان لوگوں کے خرچ کئے ہوئے مال کی حالت جو خدا کی رضا جوئی کی خاطر خرچ کرتے ہیں اور اپنے نفسوں کو اس عمل شاقہ کا خوگر بنا کر اپنے اندر پختگی پیدا کرنا چاہتے ہیں اس باغ کی سی ہے جو کسی ٹیلے پر واقع ہو اگر بارش زور کی پڑے تو وہ دوگنا چوگنا پھل لائے۔ اور اگر زور کا مینہ نہ برسے تو معمولی پھوار بھی اس کے لئے کافی ہے" (البقرہ رکوع ۳۶)۔

چنانچہ یہاں پر ریا کو بھی کفر قرار دیا ہے کیونکہ اس میں مقصد پیش نظر مرضات اللہ ـــــــــ نہ تھا چہ جائیکہ جبر کو ایثار قرار دے دیا۔ اختیار و ارادہ کے ساتھ انفاق کی غرض اسلام کے نزدیک یہ ہے کہ نفس کو اس عمل شاق کا خوگر بنا کر اس میں ایثار و ہمدردی خلائق کی پختگی پیدا کر دی جائے۔ یہ چیز اشتراکیت کے جبر میں کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

اس بیان سے واضح ہے کہ جس معاشی نظام کی بنیاد اسلام نے قائم کی ہے اشتراکیت اس کے بالکل منافی ہے اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ نظام معاشی ہماری اقتصادی مشکلات کا واحد حل ہے جب تک زکوٰۃ باقاعدہ بیت المال میں جمع ہوتی رہی اور اس کی تقسیم کا طریقہ درست رہا اس وقت تک اہل حاجت کی امداد اور قومی ضروریات میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ بلکہ بعض اوقات تو یہ حالت ہو گئی کہ زکوٰۃ کا روپیہ بیت المال میں موجود ہے مگر کوئی لینے والا نہیں۔ صدقہ و خیرات کی تحریص کا نتیجہ یہ تھا کہ اغنیاء محتاجوں کے گھروں پر جا جا کر روپیہ تقسیم کرتے تھے۔ اور قانون وراثت کی رو سے جائداد کی دوامی ملکیت کا امکان بھی جاتا رہا تھا جس کے ماتحت مسلم کی جائداد چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے، دُور دُور کے انسان اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور دولت کسی ایک طبقہ کے لوگوں میں محدود رہنے نہیں پاتی۔

مُساوات ادنیٰ واعلیٰ۔ امیر و غریب، متموّل و مفلس کے باہمی امتیازات کو مٹا کر مالی مساوات کے ذریعہ سے انسانوں کو ایک ہی سطح پر لے آنے کا اصول کچھ ایسا سحر کار واقعہ ہُوا ہے کہ عوام تو ایک طرف بڑے بڑے مفکرین اس کی نظر بندی سے مسحور ہو جاتے ہیں۔ اور یہی اشتراکیت کا وہ اصول ہے جسے بلند آہنگ دعاوی کے ساتھ عین اسلام قرار دیا جاتا ہے۔ آیئے دیکھیں کہ اسلامی مساوات اور اشتراکی مساوات میں کیا فرق ہے۔ اشتراکیت کا تقاضا ہے کہ تمام انسانوں کی دولت اور اُن کی محنتوں کا حاصل عوام کی ملکیت قرار دے دیا جائے اور وہاں سے ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق کفاف مِل جائے تاکہ ادنیٰ و اعلیٰ کا امتیاز اُٹھ جائے۔ اور سرمایہ دار اور مزدور میں جو حدِ فاصل ہے وہ خود بخود مٹ جائے۔ لیکن اسلام کی نظر میں مساوات انسانی کا تخیل صرف مالی مساوات سے بہت زیادہ بلند و بالا ہے۔ اسلام نظامِ سرمایہ داری کا سب سے بڑا دشمن اور غریب انسانوں کا دلی ہمدرد ہے۔ اسلام کے نزدیک نہ تو مال و دولت معیارِ فضیلت بن سکتے ہیں اور نہ حسب و نسب کے امتیازات۔ قرآنِ کریم نے معیارِ بزرگی یہ بتایا ہے:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ $\frac{49}{13}$

اے ساکنانِ زمین ہم نے تم سب کو ایک (ہی نوع کے) مرد اور ایک ہی نوع کی عورت سے پیدا کیا ہے (ہمارے نزدیک تم سب برابر ہو) اور تمہارے مختلف گروہ اور قبیلے محض اسلئے بنائے ہیں کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ ورنہ اللہ کے نزدیک تم سب میں قابلِ عزت وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

اور اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ حقیقی عزت اور اصلی مفاخر دولت کی فراوانی اور سرمایہ کی کثرت میں نہیں ہے بلکہ دلوں کے تقویٰ اور اعمال کی صلاحیت میں ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے دو انسان جب اس میدانِ مسابقت میں نمودار ہوئے۔ جن میں سے ایک ہابیل غریب مسکین خدا سے ڈرنے والا اور دوسرا قابیل امیر اور متکبر تھا تو اللہ تعالیٰ نے ہابیل کی قربانی کو شرفِ قبولیت بخش کر یہ واضح کر دیا کہ خدا کے نزدیک معیارِ فضیلت تقویٰ ہے۔ (سورۂ مائدہ رکوع ۵)

قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ مال و دولت کے ساتھ اگر تقویٰ و خدا ترسی نہ ہو۔ اور وہ تکبر نخوت تمرّد اور

سرکشی کا موجب بن جائے۔ تو ایسا مال انسان کو بہت جلد ذلیل و خوار کر دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو قارون کا ذکر (۲۸ ؍ ۷۹۔۸۱) - اور ان دو شخصوں کا قصہ جن میں سے ایک کے دو باغ تھے اور دوسرا غریب تھا۔ (الکہف ۱۸ - ۳۲ تا ۴۵) -

لیکن جہاں قرآن کریم نے فضیلت و فوقیت کا معیار، مال و دولت کی بجائے اعمالِ صالحہ اور حُسنِ نیّت کو قرار دیا ہے۔ اور دولت و حشمت سے جو تمرّد اور تکبّر پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی مختلف عنوانوں سے مذمت کی ہے۔ وہاں اس نے دولت و ثروت کے اعتبار سے بنی نوعِ انسان میں مدارج کے اختلاف کو مقتضیاتِ فطرت میں سے قرار دیا ہے اور کارزارِ عالم کے چلانے کے لئے اس تفریقِ مدارج کو برقرار رکھنا وہ ضروری سمجھتا ہے۔ فرمایا:۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ۔ ۴۳

ان کی دنیاوی زندگی کی روزی ہم تقسیم کرتے ہیں اور ہم نے ایک کو دوسرے پر رفعت اور فوقیت دے رکھی ہے۔ تاکہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے۔

چونکہ اختلافِ مدارج فطری امر تھا۔ اور اس کا قائم رکھنا ضروری تھا۔ اس لئے فرمادیا کہ اس تفریق کو دیکھ کر حسد نہ کیا کرو۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ط ۴۴

اور تم ایسے کسی امر کی تمنا نہ کرو جس میں اللہ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

اس تفریقِ مدارج کو پیدائشی یا پہلے جنم کے کرموں کا پھل نہیں بتایا، بلکہ کسبِ دولت کی قابلیت و استعداد کے اختلاف پر مبنی قرار دیا ہے اور فرمایا۔

لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۲؎ ہ انسان کو وہی کچھ ملیگا جس کی اس نے کوشش کی ہو۔

دولت کی مساویانہ تقسیم کو اس نے خلافِ فطرت قرار دیا ہے۔ اور اسے کفرانِ نعمت بتایا ہے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ

رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَاءٌ ۚ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۔ ۱۶/۷۱

اللہ نے تم کو ایک دوسرے پر رزق میں فضیلت دی ہے۔ سو جن لوگوں کو فضیلت دی گئی ہے۔ وہ اپنے مال کا حصہ اپنے غلاموں (اور نوکروں) کو اس طرح کبھی نہ دیں کہ مالک و مملوک سب آپس میں برابر ہوجائیں۔ کیا اس طرح اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں۔

کیونکہ اختلافِ مدارج اعمال و مساعی کے مطابق ہوتے ہیں۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۴۶/۱۹ | اور ہر ایک کے مدارج انکے اعمال کے مطابق ہیں۔

اختلافِ مدارج دنیاوی کاروبار کے لئے اس لئے نہایت ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔ انسان کی عمرانی زندگی کا تقاضا ہے کہ تقسیمِ عمل ہو۔ اور چونکہ اعمال بہرحال ادنیٰ اور اعلیٰ ہوتے ہیں۔ اس لئے تقسیمِ عمل کے اعتبار سے مدارج مختلفہ کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ انسان کے اندر خاص خاص قویٰ ودیعت کیئے گئے ہیں۔ جن کو بروئے کار لانے کے لئے خاص خاص جذبات کو حرکت میں لانا نہایت ضروری ہے۔ مثلاً قوتِ مدافعت کا مظاہرہ اُسی وقت ہوگا۔ جب غیرت و حمیت یا دفعِ مضرت کا جذبہ حرکت میں آئیگا۔ یا مثلاً قوتِ استدلال کے جوہر صرف اُسی وقت کھلیں گے۔ جب جذبۂ خودداری پر ٹھیس لگے گی۔ اسی طرح کسب و ہنر کے ملکات اپنی انتہائی وسعتوں کے ساتھ صرف اس صورت میں رُونما ہونگے جب اُن کے لئے کوئی جذبہ یا کشش موجود ہوگی۔ یہ چیز انسان کی سرشت میں ہے کہ وہ اپنی محنت کے حاصل کا خود مالک اور مختار ہونا چاہتا ہے۔ وہ اپنی مساعی کی پیداوار کو "میری" کہنا چاہتا ہے۔ "میں" اور "میرا" ہی وہ "سم سم" ہے جس سے تمام مشقتیں آسان ہوجاتی ہیں۔ اور ہر مشکل کا طلسمی باب خود بخود کھل جاتا ہے۔

وَيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ (۱۱:۳) | ہر بڑائی والے کو اس کی بڑائی دیجائیگی۔

کارگہِ حیات میں جتنی جدوجہد۔ جسقدر تگ و دو ہے سب اسی خواہش کو پورا کرنے کے لئے ہے نبضِ حیات میں تموّج ہے تو اسی کے دم سے۔ اور نظامِ عالم کے عروقِ مُردہ میں خونِ زندگی دوڑ رہا ہے تو اسی کی حرارت سے۔ ذہنِ انسانی سے یہ جذبہ نکل جائے تو ہنگاموں اور شورشوں کی یہ شوکت دنیا راہبوں کی جھونپڑی

اور سنیاسیوں کی کُٹیا بن جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مال و دولت کی فراوانی تکبّر و غرور پیدا کر دیتی ہے جو انسانی استبداد و مظالم کا اصل الاصول ہے۔ لیکن اسلام کے نزدیک درد سر کا علاج سر کاٹنا نہیں کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ بلکہ سر میں کیفیت اعتدال پیدا کر کے درد کو دُور کرتا ہے۔ انسانی اعمال میں بڑی افراط اور تفریط ہے۔ اسے دُور کر کے اعمال میں اعتدال پیدا کرنا اسلام کا کام ہے۔ مال و دولت کو معیارِ فضیلت قرار دینے سے سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ اور مال و دولت پر لات مار کر جنگلوں کا رُخ کرنے سے نظامِ کائنات درہم و برہم ہو جاتا ہے۔ اسلیئے اسلام نے ایک طرف اس رہبانیت سے منع کیا۔ اور جدّ و جہدِ حیات میں مساعی و اعمال، مسابقت و مقابلہ کو اصلِ زندگی قرار دیا۔ اور دوسری طرف سرمایہ داری کے عواقبِ خبیثہ اور نتائجِ قبیحہ کے خلاف جہاد کیا۔ کہ مال و دولت کو عزّت و فضیلت کا معیار سمجھکر غریبوں کو کچلنا شروع نہ کر دیا جائے۔ فرمایا

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۚ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿٢١﴾

دیکھئے ہم نے ایک کو دوسرے پر کس طرح فوقیت دی ہے لیکن آخرت بلحاظ مدارج اور باعتبار فضیلت بہت بڑی ہے۔

اور اختلافِ مدارج کو وجہِ ابتلاءٗ بتایا۔

وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ۔ ﴿١٦٥﴾

اور تم میں سے ایک کو دوسرے پر رفعت دی ہے تاکہ جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے اس میں تمہاری آزمائش ہو سکے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (المائدہ ع ۷) ﴿٤٨﴾

اگر مشیت خداوندی ہوتی تو تمام انسانوں کو ایک ہی جماعت بنا دیا جاتا۔ یہ اس لئے نہیں کیا کہ جو کچھ تم کو دیا گیا ہے اُس میں آزمائے جا سکو۔ پس نیکی کرنے کے لئے سابقت کرو۔

ایک شخص اپنی محنت و مساعی سے جو کچھ کماتا ہے۔ اسے اس کی واحد ملکیت قرار دید یجئے۔ اور پھر

اسے ترغیب دیجئے کہ وہ برضا و رغبت اپنے اختیار و ارادہ سے اپنی کمائی سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے دیکھئے اس سے انسانیّت کتنے قدم آگے بڑھتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی دولت مند اور صاحب ثروت شخص جو اپنے آپ کو واجب التکریم سمجھتا ہے کسی غریب اور مفلس انسان کی جو صاحب تقویٰ ہے خود بخود اس وجہ سے عزّت کرتا ہے کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔ تو غور فرمایئے کہ انسانیت کس درجہ فروغ پاتی ہے۔ لیکن اگر ارادہ اور اختیار کو انسان سے چھین لیا جائے تو انسانیّت اور شرافت تباہ ہو جاتی ہیں۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ ۲۷

اللہ نے موت و حیات (انسانی) کو پیدا کیا تاکہ تم آزمائے جاؤ کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرتا ہے۔

یہی وہ ابتلاء ہے جس سے انسانیّت تکمیل کو پہنچتی ہے۔ اشتراکیّت کی جبری مساوات انسانی شرف و اختیار کی ترقی معکوس اور رجعتِ قہقری ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ۔ (والتین)

ہم نے انسان کو بہترین ہیئتِ کذائی میں بنایا پھر اس کو ادنیٰ درجہ کی طرف لوٹا دیا۔

اسلامی مساوات کی درخشندہ مثالیں اس کے صدرِ اولیٰ میں ہر مقام پر نظر آتی ہیں۔ جن کے پیش کرنے سے اشتراکیّت باوصف اپنے مزعومہ دعاوی مساوات، یکسر قاصر ہے۔ ایک حبشی غلام جسے خود حضرت ابوبکر صدیقؓ زرِ فدیہ دے کر آزاد کراتے ہیں کے شرفِ اعتبار کا یہ عالم ہے کہ جب وہ دُور سے آتا دکھائی دیتا ہے تو عمرؓ اور ابوبکرؓ کھڑے ہو جاتے ہیں کہ سیدنا بلال ہمارے آقا آ رہے ہیں۔ اور بنی ہاشم کے ممتاز ترین قبیلہ کے ممتاز ترین رکن۔ مولائے علیؓ فرماتے بلال میرے اہل بیت میں سے ہے۔ روم کا ادنیٰ مزدور مدینہ میں آکر آزادی حاصل کرتا ہے اور حضرت عمرؓ اپنی آخری خواہش یہ فرماتے ہیں کہ "میرے جنازہ کی نماز صہیب رومی پڑھائیں"۔ خود رسول اللہؐ اپنے غلام زید بن ثابتؓ کے ساتھ بنی ہاشم کے خاندان کی خاتون محترمہ اپنی پھوپھی زاد بہن کا عقد فرما دیتے ہیں۔ اسی غلام کے بیٹے (اسامہ بن زیدؓ) کا اس

لشکرِ جرار کا سپہ سالار مقرر کر دیا جاتا ہے جس میں ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ جیسے قصرِ اسلامی کے ارکینِ اعلیٰ بحیثیت سپاہی کے کام کرتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق میں ہمیں یہ تصویریں بھی ملتی ہیں کہ خلیفۃ المسلمین جنابِ عمرؓ اس اونٹ کی مہار پکڑے ہوئے پیدل چل رہے ہیں جس پر آپ کا غلام سوار ہے۔ یا ایک نو مسلم نصرانی شاہزادے کی چادر پر طوافِ کعبہ کے دوران میں جب ایک غریب بدو کا پاؤں پڑ جاتا ہے تو شاہزادہ دنیاوی وجاہت کے گھمنڈ میں اس کے منہ پر تھپڑ مارتا ہے۔ اور بدو اس کا ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہے۔ شاہزادہ دربارِ خلافت میں آ کر شکایت کرتا ہے کہ ادنیٰ بدو نے ایک عالی وقار امیر کے طمانچے کا جواب طمانچے سے دیدیا۔ وہاں سے فیصلہ ہوتا ہے کہ شاہزادے نے چونکہ قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اس لئے اس نے اپنے کئے کی سزا پائی۔ شہزادہ مساوات کے اس اصول کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور کہتا ہے کہ شاہزادہ اور مزدور آپس میں برابر نہیں ہو سکتے۔ جب کہا جاتا ہے کہ اسلام کی ترازو میں دونوں برابر ہیں۔ تو وہ اسلام چھوڑ کر پھر عیسائی ہو جاتا ہے۔ خلیفۃ المسلمین نے اس کا عیسائی ہونا برداشت کر لیا لیکن یہ گوارا نہ کیا کہ مساواتِ اسلامی کے بنیادی اصول پر کسی قسم کا حرف آئے۔ یہی وہ مساوات کی تعلیم تھی جو سردارانِ قریش کی نگاہوں میں کھٹکتی تھی اور جس کی وجہ سے وہ اسلام کے دشمن بن گئے کیونکہ اس تعلیم کی رُو سے اُن کے تمام مدارج و مراتب ملیامیٹ ہوئے جاتے تھے۔ ابوجہل کائنات سے اپیل کرتا ہے کہ وہ محمدؐ سے بدلہ لے۔ کیونکہ

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب ۔۔۔ از قریش و منکر از فضلِ عرب!
در نگاہِ او یکے بالا و پست ۔۔۔ با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
قدرِ احرارِ عرب نشناختہ ۔۔۔ با کلفتانِ حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند ۔۔۔ آبروئے دودمانے ریختند

(اقبالؒ)

اس دورِ سعید کے بعد جو انسانیت کے معراجِ کبریٰ کا عکس تھا۔ اسلام کے دورِ شاہنشاہیت میں بھی مساوات کی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ بڑے بڑے مفکرین انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ شاہزادہ

مرآد کے لئے کسی معمار نے مسجد بنائی۔ شاہزادہ کو پسند نہ آئی۔ اور اُس نے جوشِ غضب میں معمار کے ہاتھ کٹوا دیئے۔ معمار نے قاضی کے ہاں انصاف چاہا۔ مرآد مجرموں کے کٹہرے میں لایا گیا۔ اس نے اقرارِ جرم کیا۔ قاضی نے فیصلہ دیا کہ جس طرح معمار کے ہاتھ کاٹے گئے ہیں اسی طرح شاہزادہ کے ہاتھ بھی کاٹ دیئے جائیں کہ

عبدِ مومن کمتر از احرار نیست   خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست
پیشِ قرآں بندہ و مولا یکے ست   بوریا و مسندِ دیبا یکے ست (اقبالؒ)

شاہزادہ نے ہاتھ بڑھا دیئے۔ مُدعی کو تابِ خاموشی نہ رہی اور پکار اٹھا کہ میں نے شہزادہ کا قصور معاف کیا۔ آج کل کے گئے گذرے زمانے میں بھی اسلامی مساوات کا نظارہ دیکھنا ہو تو کسی مسجد میں جماعت کے وقت چلے جائیے۔ جہاں انسانوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے   تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

یہ مثال بھی آپ کو صرف اسلام کی تاریخ میں ہی ملے گی کہ ہندوستان میں "غلاموں کا خاندان" اور مصر میں "مملوک" (غلام) صدیوں تک حکومت کرتے رہے۔ غلام ہو کر آقا اور مملوک ہو کر مالک بن جانا محض اسلام کے طفیل تھا۔

مالی تفوّق کے اعتبار سے خود دَورِ صحابہؓ میں مختلف طبقات موجود تھے۔ حضرت زبیر بن عوامؓ کے کاروبار میں ایک ہزار مزدور روزانہ کام کیا کرتے تھے۔ حضرت طلحہؓ کی روزانہ آمدنی کا اوسط ایک ہزار دینار تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی تجارتی ترقی کا یہ عالم تھا کہ ایک بار اُن کا قافلہ مدینہ میں آیا تو اس میں سات سو اونٹوں پر صرف اشیائے خوردنی لدی ہوئی تھیں۔ لیکن مسلمانوں میں ان ہستیوں کا نام اگر آج تک سلام و صلوٰۃ کے ساتھ لیا جاتا ہے تو اس کی وجہ اُن کی دولت و ثروت نہیں بلکہ ان کا وہ ایمان۔ تقویٰ۔ اعمالِ صالحہ۔ ایثار۔ قربانی ہیں۔ جو آنے والی نسلوں کے لئے اُنہوں نے نمونہ کے طور پر یادگار چھوڑا ہے۔ انہی متموّل صحابہ کبار کے ساتھ ساتھ اصحابِ صفہ جیسے مفلوک الحال حضرات کا نام بھی آج تک مسلمانوں کے لیئے باعثِ افزائشِ ایمان و عمل ہے۔

اسلام نے مال کو خزائن و دفائن کی شکل میں زمین دوز کرنے سے منع کیا ہے۔

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ....

.....تَکْنِزُوْنَ۔ (۹-۳۴-۵)

جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ آپ انہیں ایک بڑے دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔ انہیں دوزخ کی آگ میں تپایا جائیگا۔ اور ان سے ان لوگوں کی پیشانیوں۔ کروٹوں۔ پشتوں کو داغا جائیگا۔ یہ وہ ہے جس کو تم نے اپنے واسطے جمع کر رکھا تھا۔ اب اپنے جمع کرنیکا مزہ چکھو۔

اور مال و دولت کے انتقال کی صورت اس نے باہمی رضامندی قرار دی ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ ۔ ۴/۲۹

اے ایمان والو آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر مت کھاؤ۔ لیکن اگر تجارت ہو یا باہمی رضامندی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

لیکن بیع و اشترا لین دین ہر معاملہ میں محتاجوں کے ساتھ احسان و مروت کی تاکید کی ہے۔ چنانچہ ربوا کو حرام قرار دیکر قرضہ کے متعلق فرمایا۔

وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ ۔ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (۲:۲۸۰)

اگر (مقروض) تنگدست ہو تو آسودگی تک اُسے مہلت دیدو اور معاف کر دو۔ یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔ اگر تم سمجھو۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ اعتنا ہے۔ اشتراکیت کے حامی سرمایہ داری کے خلاف یہ الزام عائد کرتے ہیں۔ کہ اس میں مزدور کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہیں ملتا۔ لیکن کیا خود اشتراکیت اس الزام سے بری ہے؟ نظامِ اشتراکیت کے ماتحت یہ فیصلہ کہ مزدور کس قدر کام کرے حکومت کرتی ہے (اسکی تفصیل آئندہ صفحات میں ملے گی) مزدور کی محنت کا حاصل حکومت کی ملکیت ہوتا ہے۔ اور مزدور

کی ضروریات کا تعین بھی حکومت ہی کرتی ہے جس کے مطابق اسے زرِ کفاف ملتا ہے۔ کیا یہ ہر ہر قدم پر مزدور کی آزادی کو سلب کرنا نہیں ہے؟ فرض کرو ایک مزدور سے حکومت اس قدر کام لیتی ہے جس کا معاوضہ قاعدے کے مطابق چار روپئے روزانہ ہونا چاہئے لیکن اگر اس کی ضروریات کے لئے صرف ایک روپیہ روزانہ کافی سمجھا جاتا ہے تو باقی تین روپے روزانہ حکومت کے پاس چلے جاتے ہیں۔ اور سرمایہ دارانہ و اشتراکی نظام میں جہاں تک مزدور کے معاوضہ کا تعلق ہے کچھ فرق نہیں رہتا کہا جاسکتا ہے کہ اشتراکی نظام کے ماتحت حکومت مزدوروں ہی کی اصلاح و بہبود پر بقایا تین روپے صرف کر دیتی ہے اور سرمایہ دار اسے اپنے ذاتی مصرف میں لاتا ہے۔ لیکن یہ خرچ کی نوعیت کا فرق ہے جہاں تک مزدور کا تعلق ہے دونوں اس کی کمائی کے غاصب ہیں۔ اگر مزدور اپنی مرضی سے اپنی کمائی کا کچھ حصہ کسی کے نام منتقل کر دے تو یہ دوسری بات ہے۔ ورنہ کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ دوسرے کی محنت کا ماحصل اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرے۔ قرآن کریم اس قسم کے معاملہ کو غصب و ظلم قرار دیتا ہے۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَإِذَا كَالُوْهُمْ أَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ۔ ۸۳-۳

ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے بڑی خرابی ہے کہ جب لوگوں سے ناپ کریں تو پورا پورا لیں۔ اور جب ان کو ناپ کر دیں تو کم دیں۔

اس ناپ تول کے اصول میں معاوضہ بالمثل کی تمام فروعات شامل ہیں۔ اور خسرانِ مبین ان لوگوں کے لئے ہے جو دوسرے سے محنت تو پوری پوری لیں لیکن معاوضہ کم دیں۔ قرآن کے نزدیک محنت کرنیوالا اپنے پورے معاوضہ کا حقدار ہوتا ہے جو اسے فوراً مل جانا چاہیئے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ مزدور کو اس کی پوری پوری مزدوری دیدو قبل اس کے کہ اس کا پسینہ خشک ہو۔

ضروریات کے تعین کے لئے اسلام نے حدود و شرائط مقرر کر دی ہیں جن سے اسراف و تبذیر کا امکان نہیں رہتا اس نے ہر انسان کو اختیار دیا ہے کہ وہ اپنی کمائی کے اندر اپنی ضروریات خود متعین کرے چنانچہ غلامی اور آزادی میں فرق ہی یہ ہے کہ آزاد اپنی ضروریات کا تعین خود کرتا ہے۔ اور غلام

کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا۔

ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْکًا لَّا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰہُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَہُوَ

یُنْفِقُ مِنْہُ سِرًّا وَّجَہْرًا ہَلْ یَسْتَوٗنَ ۔ ۱۶/۷۵

اللہ تعالیٰ ایک مثال بیان فرماتے ہیں کہ فرض کرو کہ ایک تو غلام ہے پرائے بس میں وہ کسی پر اختیار

نہیں رکھتا۔ اور دوسرا شخص ہے جسے ہم نے خوب روزی دی ہے اور وہ اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ

(جس طرح جی چاہے خرچ کرتا ہے) کیا یہ دونوں آپس میں برابر ہو سکتے ہیں۔

مسلم اپنی مِلک کا مالک ہے اور اس کے حقِ ملکیت کو خدا کے سوا کوئی خرید نہیں سکتا۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَہُمْ وَاَمْوَالَہُمْ بِاَنَّ لَہُمُ الْجَنَّۃَ ط ۹-۱۱۱

بے شک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ

ان کو جنت دی جائے گی۔

شبہ ہو سکتا ہے کہ جب اسلام میں مسلم کے جان و مال کو خدا نے خرید رکھا ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ حق و صداقت کی حمایت و حفاظت میں اگر ضرورت آپڑے تو عبدِ مومن بلا تامل اپنی جان و مال کو قربانی کے لئے پیش کر دے گا۔ تو اگر اشتراکی حکومت مزدور کا مال لیکر مفادِ عامہ میں صرف کرے تو عین اسلام کے مطابق ہوگا۔ ان دونوں صورتوں میں بڑا فرق ہے اشتراکیت میں مزدور کی محنت کا حاصل حکومت زبردستی لے لیتی ہے اور مزدور کی مرضی کو اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا۔ لیکن خدا اور بندے کا معاملہ کلیۃً بندہ کی خوشی پر مبنی ہے اگر بندہ خدا کی راہ میں کچھ دیتا ہے تو اپنی خوشی سے اور بدلے کی امید میں دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے انفاق فی سبیل اللہ کے لئے لفظ قرضہ استعمال کیا ہے۔

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْہُ لَکُمْ ۔ (۶۴/۱۷)

اگر تم لوگ اللہ کو اچھی طرح (خلوص سے) قرضہ دو گے تو وہ اسے تمہارے لئے بڑھاتا جائے گا۔

مسلم کا ایمان بمنزلہ ایمان ہے۔ کہ دنیوی زندگی کے بعد اُخروی زندگی ہے جو حقیقی دارالمکافات ہے اگرچہ بعض ایسے ہیں جن کا بدلہ دنیا میں بھی ملتا ہے مثلاً اعمال صالحہ کے نتیجہ میں عزت و وقار کی حیات

طیبہ. اور اعمالِ بد کے بدلہ میں ذِلت ورُسوائیوں کی لعنتی زندگی مگر حیاتِ اُخروی کے مقابلے میں یہ معاوضے کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَّلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرًا ۔ (۱۶-۳۰)

جن لوگوں نے نیک اعمال کئے ہیں ان کے لئے اس دنیا میں بھی بہتری ہے اور آخرت تو کہیں بہتر ہے

اشتراکیت میں غریب مزدور کو محنت کا ثمرہ نہیں ملتا. اور چونکہ وہ بعد کی کسی زندگی کا قائل نہیں ہے اس لئے اس سودے میں اسے صرف دینا ہی دینا ہے. معاوضہ کچھ نہیں ملتا۔ اگر رضا و رغبت کو مقدم رکھا اور ہر شخص اپنی محنت کی پیداوار کا خود مالک ہو اور ساتھ ہی آخرت پر بھی ایمان۔ تو اتفاق اسلامی اتفاق ہوتا ہے۔ ورنہ اشتراکیت میں تو خسرۃ الدنیا والآخرۃ اور خالص غلامی کے سوا کچھ نہیں۔

معاشی نظام کی طرح اشتراکیت کے معاشرتی نظام کو بھی جس کی رو سے صرف مالی مساوات قائم ہوتی ہے اسلام کے قانونِ مساوات سے کچھ تعلق نہیں، بلکہ وہ قرآن کی نصوصِ صریحہ اور واضح، اور بیّن تعلیم کے سراسر خلاف ہے۔ لہٰذا جو شخص اس نظام کی ظاہری مساوات سے متاثر ہو کر اسے "عین اسلام" کہتا ہے یا خوش ہوتا ہے کہ روس اسلام کے قریب آرہا ہے وہ حقیقت سے دُور ہے۔ اس یہ ہے کہ مسلمان چونکہ بالعموم اپنی تعلیم سے بیگانہ ہیں۔ اور اُن کے اعمال کو قرآن سے کوئی نسبت نہیں اس لئے جونہی انہوں نے اشتراکیت میں مساوات کا ذکر سنا (اور دُنیا عدم مساوات سے گھبرا چکی ہے) تو انہوں نے سمجھا کہ یہ مساوات ہی جملہ آلام کا علاج ہے اور اسے عین اسلامی تعلیم قرار دیا حالانکہ حقیقی مساوات جس کی دنیا کو تلاش ہے اسلامی مساوات ہی ہے۔ اور اشتراکیت کی مساوات قرآنی تعلیم کے بالکل بر عکس ہے۔ حضرت ابو ذرؓ کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اغنیا کی دولت کو غربا کا حق سمجھتے تھے۔ گویا اُن کے خیال میں اشتراکیت کی ایک جھلک پائی جاتی تھی۔ حضرت عثمانؓ (خلیفہ ثالث) کو جب یہ معلوم ہوا۔ تو اُنہوں نے اُن کو فوراً زبدہ میں بھیج دیا جو ایک بیابان مقام تھا تاکہ تنہائی کی زندگی بسر کریں۔ حضرت ابو ذرؓ نے وہیں وفات پائی۔

نظامِ عائلی (ازدواجی زندگی)

معاشرتی اور معاشی نظام کے ماتحت عائلی نظام کا ذکر ضمناً آچکا ہے اس باب میں عائلی نظام کے ایک اہم پہلو یعنی ازدواجی نظام کے متعلق مزید تصریح مقصود ہے۔ اشتراکیت میں مرد و عورت کے جنسی اختلاط کے متعلق کوئی حدود مقرر نہیں۔ نہ وہاں نکاح ہے نہ طلاق۔ نہ حرام و حلال اور نہ جائز و ناجائز میں تمیز۔ اسلامی تمدن اور شرعی نظام میں ازدواجی تعلقات کے ضبط و انضباط کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ دنیا نے عورت کے معاملہ میں بھی افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ ایک گروہ نے عورت کو محض جذبات شہوانیہ کا آلہ کار سمجھا چنانچہ یونان کی ابیقوریت میں عورت کا تخیل کچھ ایسا ہی تھا۔ ایران میں مزدک کے فلسفۂ اشتراکیت کی رُو سے عورت سوسائٹی کی مشترکہ ملکیت بھی جاتی تھی۔ ظہور اسلام سے پیشتر عرب میں بھی عام سوسائٹی کا قریب قریب وہی نقشہ تھا جو آج روس کی اشتراکیت میں پایا جاتا ہے چنانچہ جب کئی مرد ایک عورت سے اختلاط کرتے اور بچہ پیدا ہوتا تو اس کی صورت جس مرد سے ملتی اسی کی طرف منسوب کر دیا جاتا تھا۔ اسے نکاح۔ بغایا، کہتے تھے۔ اسی طرح جب دس سے کم مرد ایک عورت سے بیک وقت جنسی تعلقات پیدا کرتے اور بچہ پیدا ہوتا تو عورت جس مرد کی طرف چاہتی بچّہ کی نسبت کر دیتی تھی اسے نکاح رہط کہتے تھے (اشتراکیت ایسی صورت میں تمام مردوں پر بچّے کی کفالت مساویانہ عائد کرتی ہے) نکاح کی ایک شکل متاع، بھی تھی جس کی رُو سے مرد و عورت باہمی اختلاط کا معاہدہ کر لیتے تھے اور اجور معینہ کے سوائے مرد پر کوئی اور ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تھی۔

ان معاہدوں کے علاوہ فحش کاری کی داستانیں اتنی عام تھیں کہ شعرا انہیں فخریہ اپنے اشعار میں بیان کرتے تھے۔

اِسلام نے ان فواحش کو دیگر خبائث کے ساتھ ظہر الفساد فی البر والبحر (خشکی اور تری میں فساد ہی فساد برپا تھا) سے تعبیر کیا مرد اور عورت کے تعلّقات کے متعلق نہایت واضح اور تاکیدی احکام صادر فرمائے اس نے مرد و عورت کے اختلاط جنسی کا صرف ایک طریقہ جائز قرار دیا جسے نکاح کہتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ اور تمام طریقے حرام اور ناجائز قرار دے۔ فرمایا۔

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ - (۴-۳)

عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہو۔ اس سے نکاح کر لو (بجز محرمات کے)

مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ - (۵-۵)

(صرف) اس طریق پر کہ انہیں بیوی بنا کر رکھو۔ نہ کہ اعلانیہ بدکاری کرو یا خفیہ آشنائی رکھو۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ - (۳۲-۲۴)

اور جو تم میں بے نکاح ہوں ان کا نکاح کر دیا کرو۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝ ۱۷-

اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ بلاشبہ وہ بڑی بے حیائی ہے اور بری راہ۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ ۝ نیز ۷-۳۳

کہہ دیجئے کہ میرے رب نے حرام کیا ہے تمام فحش باتوں کو۔ ان میں جو علانیہ ہیں وہ بھی اور جو پوشیدہ ہیں

وہ بھی اور ہر گناہ کی بات۔

نکاح کی غرض و غایت جذباتِ شہوانیہ کا فرو کرنا قرار نہیں دیا۔ بلکہ اس سے مقصود بقائے نسلِ انسانی اور خانگی زندگی کا سکون و راحت بتایا ہے۔

جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ؕ ۴۲-۱۱

اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس کے جوڑے بنائے (جن کے ذریعے سے تمہاری نسل کو پھیلاتا رہے)۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً

وَّرَحْمَةً ؕ (۲۱-۳۰)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے واسطے تمہاری جنس کی بیویاں بنائیں تاکہ ان کے ذریعے سے

آرام و سکون ملے اور تم میں باہمی محبت اور جذبۂ رافت پیدا کیا۔

نکاح کو قرآنِ کریم نے معاہدہ قرار دیا ہے اسے عمر قید نہیں بتایا جس کے بندھن مقدراتِ انسانی کی طرح اور جنم لیکھے کی طرح انمٹ ہوں۔ فرمایا۔

وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ وَأَخَذْنَ مِنكُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا (۲۱)

اور تم ان عورتوں کا مہر کیسے لے سکتے ہو جب کہ تم اُن سے بے حجابانہ مل چکے ہو۔ اور تم ان کے ساتھ بہت پختہ معاہدہ کر چکے ہو۔

زویمر نے اپنی کتاب (Across the world of Islam.) کے صفحہ پر لکھا ہے کہ اسلامی نکاح ایک معاہدہ ہے (Sacrament) نہیں ہے اس معاہدے کی شرائط مقرر کی گئی ہیں جن کی رُو سے مرد کے ذمہ مہر واجب ہوتا ہے۔

وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً ۴-۴ | اپنی بیویوں کے مہر خوش دلی سے ادا کرو۔

اور وہ عورت کی ضروریات کا کفیل اور بوجہ صنفِ نازک ہونے کے اس کا محافظ ہوتا ہے۔

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ ۴-۳۴

مرد عورتوں کے محافظ ہیں بوجہ اس کے کہ اللہ نے ایک (جنس) کو دوسری پر (مختلف چیزوں میں) فضیلت دی ہے۔ اور اس سبب سے بھی کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

عورت کی طرف سے علاوہ اس سکون و راحت کی زندگی مہیا کرنے کے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے مرد کی عزت و آبرو کا تحفظ ضروری ہے۔

فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ (۳۴-۴)

نیک بخت عورتیں اطاعت شعار ہیں اور مرد کی عدم موجودگی میں اس چیز کی حفاظت کرتی ہیں جس کی حفاظت کا اللہ نے حکم دیا ہے۔

نکاح کے معاہدہ میں جبر و اکراہ نہیں۔ عورت کی رضامندی کے بغیر نکاح جائز نہیں ہوتا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا (۱۹-۴)

اے ایمان والو تمہارے لئے یہ بات حلال نہیں کہ عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ۔

اس معاہدہ کے دوران میں بیوی سے حُسنِ سلوک اور معاشرتِ حَسنہ کی تاکید ہے۔

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ | اور ان عورتوں کے ساتھ خوبی کے ساتھ گذران کرو۔

اس معاہدے میں عورت کو وہی حقوق دیئے ہیں جو مرد کے ہیں۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (۲-۲۲۸)۔

اور عورتوں کے حقوق (مردوں کے ذمے) ایسے ہی ہیں جیسے (مردوں کے حقوق) عورتوں کے ذمے ہیں۔

اگر میاں بیوی میں کشیدگی پیدا ہو جائے۔ اور اختلافِ مزاج یا دیگر حالات کی وجہ سے وہ سکون و راحت مفقود ہو جائے جو اس معاہدہ کی اصل غرض تھی۔ اور گھر اضطراب و عدمِ اعتماد کا جہنم بن جائے۔ تو اس صورتِ حالات کے لئے بھی اسلام نے احکام نافذ فرما دیئے ہیں۔ پہلے مختلف تدابیر سے معاملات سلجھانے کی تاکید کی ہے۔ لیکن اگر تمام تدابیر و مساعی کارگر نہ ہوں اور اختلافات ایسی بھیانک اور لاینحل شکل اختیار کر لیں کہ اصلاح ناممکن ہو جائے تو ایسی صورت میں نکاح کے معاہدے کو فسخ کر دینے کی اجازت دی گئی ہے لیکن ایسی قیود و شرائط کے ساتھ کہ پہلے مکمل انقطاع سے پہلے بھی نوّے فیصدی اتصال و ایتلاف کا امکان باقی رہے۔ لیکن جب مکمل انقطاع بھی ناگزیر ہو جائے تو ایک دوسرے کے حقوق کی انتہائی نگہداشت کی گئی ہے۔ یہ احکام سورۂ بقرہ سورۂ نساء اور سورۂ طلاق میں تفصیل سے درج ہیں۔ معاہدہ کے فسخ کرنے کے لئے جیسے مرد کے لئے ادائیگی مہر کا فدیہ مقرر کیا ہے ویسے ہی عورت کو بھی فدیہ ادا کر کے طلاق حاصل کرنے کی اجازت دی ہے۔

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ (۲-۲۲۹)۔

اس مال کے لینے دینے میں عورت مرد کسی پر گناہ نہ ہوگا جسے ادا کر کے عورت آزادی حاصل کرنا چاہے۔

طلاق کے بعد دوسری جگہ نکاح کرنے کی مرد و عورت دونوں کو اجازت ہے۔ مگر عورت کو کچھ عرصہ انتظار کرنا پڑتا ہے جسے عِدّت کہتے ہیں تاکہ ممکن ہے کہ اس تجرّد کی زندگی سے اصلاح کا مادہ پیدا ہو جائے۔ نیز یہ کہ اگر وہ حاملہ ہے تو دوسرے نکاح سے قبل نتیجۂ حمل ظاہر ہو جائے (سورۂ بقرہ رکوع نمبر ۲۸)

اشتراکیت میں نہ نکاح ہے۔ نہ محرمات[۱] کی کوئی قید، نہ طلاق کے لئے کوئی حدود و شرائط۔

---

[۱] قرآن کی رُو سے وہ عورتیں جن سے نکاح حرام ہے اُن کی تفصیل سورہ النساء آخر پارہ نمبر ۴ ملاحظہ فرمایئے۔ ۱۲ منہ

نہ عدت کا وجود، نہ زنا سے پرہیز۔ نہ فواحش سے احتراز پس اسلام سے اسے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ تجدد پسند طبقہ یہ کہے کہ جب بالغ مرد و عورت باہمی رضامندی سے جنسی اختلاط پیدا کریں تو اسے بہر حال معاہدہ ہی سمجھنا چاہئے لیکن مذہب کو چھوڑ کر خود دنیاوی قوانین اور سماجی قواعد کی نظر میں بھی مرد و عورت کی یہ باہمی رضامندی جب تک قانونی قول و قرار کی شکل اختیار نہ کرے مُعاہدہ تسلیم نہیں کی جاتی۔ خود روس کی موجودہ اشتراکی حکومت میں اگرچہ رجسٹری اور غیر رجسٹری شدہ شادیوں کے بچوں میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا لیکن باہمی اختلاط کو مستند قرار دینے کے لئے اقرار و معاہدہ کی رجسٹری ضروری ہے بالغ مرد و عورت کا جنسی اختلاط جو نکاح کے بغیر ہو۔ قرآن کی نگاہ میں زنا ہے۔ فرمایا۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۔ (۲-۲۴)۔

زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والا مرد۔ ان میں سے ہر ایک کے سو سو درّے لگاؤ۔

گویا زنا ایک شرعی جُرم ہے جس سے حدِ شرعی لازم آجاتی ہے۔ چونکہ اس میں زانیہ کو بھی سزا دینے کا حکم ہے اس لئے یہ حکم زنا بالجبر سے متعلق نہیں بلکہ باہمی رضامندی کے اختلاط سے متعلق ہے۔ قرآن کریم میں - - - - - - - ہے کہ جب عورتیں اسلام لانے کے لئے آئیں تو ان سے منجملہ دیگر امور کے یہ بھی اقرار لیا کرو کہ وَلَا يَزْنِيْنَ ۔ ۶۰-۱۲۔ (وہ بدکاری نہیں کریں گی) یہ اس لئے کہ ایامِ جاہلیت میں بدکاری عام تھی اور اسے روکنا ضروری تھا۔ ان ہر دو احکام میں بالغ مرد و عورت کی باہمی رضامندی سے بلا نکاح مباشرت کا نام زنا رکھا گیا ہے۔

ازدواجی زندگی کے اثرات یعنی عائلی نظام میں اشتراکیت کی رُو سے۔ (۱) اسقاطِ حمل یعنی قتلِ اولاد قانوناً جائز بلکہ بعض اوقات ضروری ہے (۲) اولاد ماں باپ کی نہیں ہوتی، بلکہ حکومت (عوام) کی ملکیت ہوتی ہے (۳) حسب و نسب کا کوئی رشتہ اور خون کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا ان ہر سہ امور میں قرآنِ کریم کا فیصلہ حسب ذیل ہے۔

(۱) قتلِ اولاد کے متعلق فرمایا۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ (۶-۱۵۱) | اپنی اولاد کو افلاس کے سبب سے قتل نہ کرو۔

مِنْ اِمْلَاقٍ (افلاس کے ڈر سے) کے یہ معنی نہیں ہیں کہ افلاس کے علاوہ اور اسباب کے ماتحت قتلِ اولاد جائز ہے قتلِ اولاد بہرحال حرام وممنوع ہے لیکن مِنْ اِمْلَاقٍ کا ذکر اس وجہ سے کر دیا ہے کہ نزولِ حکم کے وقت سوسائٹی میں یہ شکل بالعموم رائج تھی۔ اس کی مثال قرآن کریم ہی میں ہے

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (البقرہ)

پس فحش باتیں کرنا، گناہ کرنا، آپس میں جھگڑنا حج میں منع ہے۔

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ فحش باتیں کرنا، آپس میں جھگڑنا، اور فسق وفجور میں مبتلا ہونا صرف حج کے ایام میں ممنوع، حج کے علاوہ دیگر ایام میں حلال وجائز ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ افعال شنیعہ ناجائز تو بہرحال ہیں لیکن ایامِ حج میں بالخصوص ان سے محترز رہنا چاہئے اور اس وضاحت کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ زمانۂ جاہلیت میں حج میں ایسی حیا سوز حرکات عمل میں آتی تھیں، جو اس فریضۂ مقدس کی حرمت وتکریم کے سراسر منافی تھیں۔

یہی صورت قتلِ اولاد کے متعلق ہے حضور صلعم جب عورتوں سے اسلام کی بیعت لیتے تھے تو اس میں یہ اقرار بھی شامل تھا۔

لَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ (۶۰-۱۲)۔ | کہ وہ اپنے بچوں کو قتل نہیں کریں گی۔

دوسری جگہ قرآن میں ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ (انعام ۶-۱۴۱)۔

بڑے نقصان میں ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو محض بلا کسی سند ودلیل کے حماقت سے قتل کر دیا

اسلامی قانون کی رُو سے اسقاطِ حمل قتلِ اولاد میں داخل ہے۔ ہندوستان کی موجودہ حکومت میں یہ جرم ہے

(۲) قرآن کی رُو سے اولاد ماں باپ کی وارث ہوتی ہے اور والدین کے ذمہ اولاد کے بہت سے حقوق وفرائض عائد کئے گئے ہیں۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِیْٓ اَوْلَادِكُمْ (النسآء) ۔ | اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے

اور اس کے بعد ان تفصیلات کا ذکر ہے جن کی رو سے جائیداد کی تقسیم وغیرہ عمل میں آتی ہے علاوہ بریں اولاد کی تربیت و پرورش کے متعلق کتاب وسنت میں مبسوط ومفصّل احکام موجود ہیں۔ جن کے اعادہ کی ضرورت نہیں اگر اولاد کو عوام کی ملکیت تسلیم کر لیا جائے تو ان احکام کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

(۳) نسبی رشتہ داروں کا ذکر معاشی اور معاشرتی نظام کے سلسلہ میں احکام وراثت کے ماتحت آچکا ہے۔ والدین کے ساتھ احسان ومروّت کی تاکید قرآنِ کریم میں بار بار آئی ہے وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا اور وَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ (ان دونوں کو جھڑکی بھی نہ دو) قرآنِ کریم نے نسبی قرابت کو عائلی نظام کا جزوِ لاینفک قرار دیا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ط (۲۵-۵۴)۔

اللہ وہ ہے جس نے پانی (نطفہ) سے آدمی کو پیدا کیا۔ اور (اس تعلق کے ذریعہ) اس کو خاندان والا اور نسب وقرابت والا بنایا۔

مذکورہ بالا نصوص صریحہ سے یہ بھی واضح ہے کہ قرآن کریم نے عورت کی حیثیت کو کس قدر بلند کر دیا ہے وہی عورت جس میں ادیانِ سابقہ اور عام سوسائٹی کے فیصلہ کے مطابق رُوح بھی نہیں تھی۔ اسے اسلام نے مردوں کے ہمدوش کھڑا کر دیا۔ اور سوائے ان اختلافات کے جو مرد وعورت میں تخلیق کی وجہ سے ہیں۔ کوئی فضیلت اور فوقیت ایک کو دوسرے پر نہیں رہی۔ عورت کی چار حیثیتیں ہیں۔ بیٹی بیوی۔ ماں اور مبدع سوسائٹی اور ان چاروں حیثیتوں میں اسلام نے عورت کے حقوق کی زبردست نگہداشت کی ہے۔ بیٹی کی حیثیت سے ترکہ میں اس کو حصّہ دیا ہے۔ بیوی کی حیثیت سے اس کے ساتھ حُسنِ معاشرت کی تاکید ہے وراثت میں اس کا حصّہ ہے اور ازدواجی معاہدے میں اسے مردوں کے برابر حقوق دیئے ہیں۔ جن کی نگہداشت فریقین کے ذمّے نکاح کے ذریعہ فرض کی جاتی ہے۔ بحیثیت ماں اس سے حُسنِ سلوک اور احسان ومروّت کا حکم ہے بحیثیت مبدع سوسائٹی مردوں

کو اس کے ناموس کا ذمہ دار بنایا۔ اور اس کی عفت و عصمت کو اس قدر گراں بہا بتایا کہ کسی کو اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھنے کی اجازت نہیں دی۔ فرمایا۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (۲۴-۳۰)

مسلمان مردوں سے کہدیجئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں۔

اور عورتوں سے بھی کہدیا کہ دوسروں سے آنکھیں دوچار کر کے انہیں اذنِ تماشا نہ دیں کیونکہ ان کا جوہرِ بے بہا ہے جس کی غارت گری کی جرائتیں اکثر انہیں راستوں سے پیدا ہوتی ہیں۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ

اور مسلمان عورتوں سے بھی کہدیجئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں۔

اللہ اکبر! کہاں یہ احکام اور کہاں اشتراکیت کی شترِ بے مہاری جس میں عورت عام سوسائٹی کی ملکیت سمجھی جاتی ہے۔ ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

نظامِ حکومت

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اشتراکیت کا مقصد دنیا سے ہر قسم کے نظامِ حکومت کو فنا کر دینا ہے اور جب تک یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا وہ حکومت ایسے مطلق العنان ڈکٹیٹر کے ذریعہ سرانجام دینا چاہتی ہے جس کے اختیارات غیر محدود۔ اور جس کا حکم قانون ہو جو خود کسی قانون کا پابند نہ ہو اور جس کے انتخاب کے لئے رائے عامہ کی ضرورت نہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو گا کہ نظامِ حکومت کس طرح وجود میں آیا شکار اور گلہ بانی کی منفردہ زندگی کے بعد جب انسان نے قبائلی اور مدنی زندگی اختیار کی تو ضروری ہوا کہ فرد کی آزادی اور اختیار و ارادہ کو محدود کیا جائے۔ کیونکہ باہمی تعاون کی زندگی میں فرد کے اعمال و افعال کا اثر خود اس کی ذات تک محدود رہنے کی بجائے دوسروں تک متعدی ہوتا ہے۔ اور ان کے حقوق کو محفوظ رکھنے کے لئے قواعد و ضوابط اور حدود و قیود کی ضرورت لازمی ہو جاتی ہے ساتھ ہی ایک ایسی قوت

کی بھی ضرورت ہوتی ہے جوان قواعد متعینہ کو نافذ کر سکے۔ اس نظامِ حکومت کی ابتدا تو سیدھی سادھی تھی۔ لیکن نگران کار جماعت کے افراد نے محسوس کیا کہ درندوں کے شکار اور چوپایوں کی سیاقت میں وہ ذہنی تسکین نہیں جو خود انسان کے شکار اور جماعت کی قیادت میں ہے۔ چنانچہ انہوں نے رفتہ رفتہ ایسے قوانین کی طرح ڈالی جن سے برسر اقتدار جماعت کے ہاتھ مضبوط ہوں۔ مصر کے فراعنہ بطور دیوتاؤں کے پوجے جاتے تھے۔ بابل کے نمرود کی بھی پرستش ہوتی تھی۔ ہندوستان کے راجہ ایشور پرماتما کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ روم الکبریٰ کا اسقف خدا کے بیٹے کا قائم مقام تھا۔ فارس کے کسریٰ اپنے آپ کو ظلّ اللہ سمجھتے تھے۔ غرض ہر جگہ اس جذبہ حکمرانی کے کرشمے مختلف اشکال و صور میں ظاہر ہوتے تھے

یک چراغیست کزوا انجمنے ساختہ اند

گذشتہ صدی تک یہ شخصی استبداد شاہنشاہیت کی صورت میں مختلف اقوام عالم میں بالعموم کارفرما تھا۔ تغیر پسندی کے جذبے نے اس بساط کو الٹا اور انقلاب فرانس نے یورپ میں جمہوری یا قومی طرزِ حکومت کی بنا ڈالی۔ جس میں نظامِ حکومت قومی نمائندوں کی مجلس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور مجلس کے فیصلے کثرتِ آراء ہوتے ہیں یہ مجلس جو قوانین وضع کرتی ہے ان کا مرافعہ نہیں ہو سکتی اس نئے نظامِ حکومت کو جو ذہنِ انسانی کی ہے اس وقت تک بہترین پیداوار ہے۔ رفتہ رفتہ تمام قوموں نے قبول کر لیا ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ شخصی مطلق العنانی کے مقابلہ میں یہ طرزِ حکومت بہت بڑی اصلاح ہے۔ لیکن

بنی نوعِ انسان کے دنیاوی مفکرین کے مقابلہ میں عرب کے امیؐ نے جو نظام بخشا وہ انسانوں کی آزادی کو برقرار رکھنے اور ان کی تمدنی و عمرانی زندگی کے تحفظ کے لئے بہترین دستور ہے۔ اساس و اصول کے لحاظ سے خدا کی کتاب مسلمانوں کے لئے قانون ہے یہ اس خدا کا فرمان ہے جو رب العٰلمین ہے جس کے نزدیک تمام انسان برابر ہیں جو نہ کسی کی رُو رعایت کرتا ہے۔ اور نہ کسی کے ساتھ ذرّہ برابر ظلم کرتا ہے وہ بحیثیت خالق ہونے کے بہترین طور پر جانتا ہے کہ نظم و نسق عالم کے لئے کس قسم کے قوانین کی ضرورت ہے۔ خدا کی کتاب کہتی ہے کہ۔

اِنِ الحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (یوسف) | حکومت صرف خدا کے لئے ہے۔

یہ وہ ضابطہ ہے جو شریعتِ الٰہی کی شکل میں دنیا کو ملا جس کے اساسی احکام اٹل اور جس کے اصول ناقابلِ تغیر ہیں۔ اسلام کا طرزِ حکومت اور تمدن و معاشرت تمام تر اسی ضابطہ پر مبنی ہے اس ضابطہ کے نافذ کرنے کے لئے ایک رئیسِ ملت کا انتخاب رائے عامہ سے ہوتا ہے جس کی حیثیت اشتراکیت کے ڈکٹیٹر کی طرح واضع قوانین کی نہیں ہوتی بلکہ وہ قوانین کا محض نگراں و پاسبان ہوتا ہے۔ اور جہاں تک قوانین کے اطلاق کا تعلق ہے اس میں اور ایک عام مسلمان میں کچھ بھی فرق نہیں ہوتا وہ مقامی اور وقتی معاملات کا حل کتاب اللہ کی روشنی میں مشاورت سے کرتا ہے اور فرعی وجزوی احکامات کی تدوین کے لئے وہ ایک جماعت مقرر کرتا ہے جو قرآن کو سامنے رکھکر احکامات منضبط کرتی ہے اور جسے فقہا کی جماعت کہا جاتا ہے ایک عام مسلمان ہو یا فقہا کی جماعت کا رکن مجلسِ مشاورت کا ممبر ہو یا خود رئیسِ قوم (امیر المومنین) سب پر یہ قوانین یکساں طور پر نافذ ہوتے ہیں۔ اسلام کے قانون کے مہمات اصول خود اس احکم الحاکمین کے وضع فرمودہ ہیں اس لئے مسلمانوں کے لئے وہی قانون قابلِ تسلیم ہوگا جو شریعتِ الٰہی کے مخالف نہ ہو۔

اسلامی طرزِ حکومت کا یہ خاکہ صرف نظریہ ہی نہیں بلکہ دنیا اس کو عملی شکل میں خلافت راشدہ کے زمانے میں دیکھ چکی ہے حقیقت یہ ہے کہ اس سے بہتر نظامِ حکومت نہ کبھی وجود میں آیا اور نہ آسکتا ہے خلفاء قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے تھے وہ مہاجرین وانصار سے خصوصاً اور عام مسلمانوں سے عموماً مشورہ کرتے تھے۔ کیونکہ قرآن کا حکم تھا۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳-۵۳) | اور حکومت میں مسلمانوں سے مشورہ لیا کرو۔

اور۔

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲-۳۶) ان کی حکومت باہمی مشورے سے ہے۔

اُن کے زمانے میں قانون کی نگاہ میں ادنیٰ واعلیٰ غریب وامیر سرمایہ دار و مزدور میں کوئی فرق نہ تھا حضورؐ نے فرمایا۔

لَيْسَ لِاَحَدٍ عَلٰى اَحَدٍ فَضْلٌ اِلَّا بِدِيْنٍ اَوْ تَقْوٰى (مشکوٰۃ)۔

ایک کو دوسرے پر سوائے دین اور تقوے کے اور کوئی حق فضیلت و ترجیح نہیں۔

چنانچہ حضرت عمرؓ اور اُبیؓ بن کعبؓ کا کوئی مختلف فیہ معاملہ جب حضرت زید بن ثابتؓ کی عدالت میں پیش ہوا اور حضرت زیدؓ نے خلیفۃ المسلمین کو دیکھ کر تعظیم کے لئے جگہ خالی کر دینی چاہی تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ لے زید یہ پہلی ناانصافی ہے جو اس مقدمہ میں تم کر رہے ہو۔ (کتاب الخراج)۔

اسی طرح حضرت امیرؓ ایک مقدمہ میں مدعا علیہ کی حیثیت سے گئے تو مدعی کے برابر کھڑے رہے۔ (عقد الفرید)۔

خود خلیفۃ المسلمین کے منصب کا اندازہ اس تقریر سے ہو سکتا ہے جو حضرت صدیق اکبرؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد فرمائی۔

لوگو! میں تمہارا امیر مقرر ہوا ہوں۔ حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ بھائیو! میں تو صرف شریعت الٰہی کی اتباع کرنے والا ہوں کوئی نئی بات پیدا کرنے والا نہیں ہوں اگر میں درست کام کروں تو میری معاونت کرو۔ اور اگر میں کج ہو جاؤں۔ تو مجھے سیدھا کرو۔ (ابن سعد جلد ۲)۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد ایک مجلس میں جہاں باہمی اختلاف رائے تھا فرمایا

میں بھی تم میں سے ایک کے برابر ہوں (کَاَحَدِکُمْ) اور میں یہ نہیں چاہتا کہ جو میں چاہوں تم اس کی اتباع کرو۔ (کتاب الخراج)۔

حضرت عمرؓ کا قول ہے۔

لَاخِلَافَةَ اِلَّا عَنْ مَشْوَرَةٍ۔ (کنز العمال)۔

خلافت صرف عام مشورہ سے ہے۔

جس سے ظاہر ہے کہ خلافت و امارت نہ تو وراثت میں مل سکتی ہے نہ طاقت سے بجبر منوائی جا سکتی ہے۔ خلافت اسلامیہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے بلکہ ایک امانت ہے جو رائے عامہ سے

صاحب الامر کو تفویض کی جاتی ہے۔ چنانچہ بنی امیہ کی ملوکیت میں جب سلیمان نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو اپنا جانشین مقرر کردیا تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ چونکہ میں رائے عامہ سے خلیفہ منتخب نہیں ہوا ہوں اس لئے میں خلیفہ برحق نہیں ہو سکتا۔

تصریحاتِ مذکورہ سے واضح ہے کہ۔

(۱) اسلام میں حکومت کا قائم رہنا ضروری ہے اور یہ حکومت قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کی ذمہ دار ہوگی۔ لیکن اشتراکیت حکومت کے وجود کو ہی فنا کر دینے کے درپے ہے۔

(۲) اسلام میں حکومت شریعتِ الٰہی کے ماتحت ہوگی۔ لیکن اشتراکین خدا کی ہستی ہی کے قائل نہیں۔

(۳) اسلام میں قوانین و احکام کی حفاظت و نگہبانی کے لئے امیر ملت رائے عامہ سے منتخب ہوتا ہے...... لیکن اشتراکیت کا ڈکٹیٹر رائے عامہ کا محتاج نہیں ہوتا۔

(۴) اسلام میں مقامی اور وقتی ضروریات کے حل اور فرعی و جزوی مسائل کے استنباط کے لئے مجالس مشاورت ہوتی ہیں۔ گویا انتخاب و مشاورت میں جمہوری طرز اختیار کیا گیا ہے۔ نہ کہ شخصی .... لیکن اشتراکیت کی ڈکٹیٹرشپ میں جمہوریت کا وجود ہی نہیں۔

(۵) اسلامی قانون کی نگاہ میں عام مسلمان اور صاحبانِ امر میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ اور ان میں سے ہر ایک مسئول اور قانون کا پابند ہوتا ہے......... لیکن اشتراکی ڈکٹیٹر پر کسی قانون کی پابندی لازمی نہیں ہوتی۔

(۶) مسلمانوں کے مقدمات شریعتِ محمدی کے ماتحت فیصل ہوتے ہیں..... لیکن اشتراکین کے نزدیک شریعت مہمل شے ہے۔

اس تقابل سے ظاہر ہے کہ اشتراکی نظام حکومت کی کوئی شق بھی اسلامی نہیں کہلائی جا سکتی۔

مذہبی نظام اشتراکیت کا اوّلین اصول مذہب کے خلاف جنگ کرنا ہے اس کے نزدیک خدا اور آخرت کی زندگی پر ایمان بنی نوع انسان کی تمام مصیبتوں کا باعث ہے۔

گویا جب تک یہ اعتقادات ذہن انسانی سے حرف غلط کی طرح مٹا نہیں دیئے جائیں گے دُنیا کو اطمینان نصیب نہیں ہوگا پس جس تحریک کا نصب العین ہی تمام ادیان کو جس میں اسلام بھی شامل ہے دنیا سے نیست و نابود کرنا ہو۔ اسے عین اسلام کہنا اگر پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے مسلمان کا وجود دنیا میں مذہب کے نام سے ہے اگر مذہب نہیں تو مسلمان نہیں مسلمان کی عبادتیں اور قربانیاں اس کا مرنا اور جینا صرف اس ذات کے لئے ہیں جسے خدا کہتے ہیں۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (۶-۱۶۳)۔

کہہ دیجئے کہ میری عبادتیں اور میری قربانیاں میرا مرنا میرا جینا صرف رب العالمین کے لئے ہے مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے اور (اس اعتقاد کی بدولت) میں سب سے پہلے مسلمان ہوں۔

بقول علامہ اقبال۔ ع ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے

خدا اور آخرت کے متعلّق مسلمان کا یہ ذہنی اور قلبی احساس ہی اس کی ساری پونجی ہے۔ مگر اشتراکیت مسلمان کی اس اساس کو تباہ و برباد کر دینے کے درپے ہے قرآن کہتا ہے کہ خدا روف بالعباد (اپنے بندوں پر رحمدل) ہے اشتراکیت کہتی ہے کہ وہ (خاکم بدہن) بدترین ظالم ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ میری دعوت یکسر دلیل و برہان پر مبنی ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْآ اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ (۱۲-۱۰۸)۔

کہہ دیجئے کہ میں اور میرے متبعین خدا کی دعوت علی وجہ البصیرت دیتے ہیں۔

اشتراکیت کہتی ہے کہ مذہب افیون کی گولی ہے جو قوائے ذہنی کو سلب کر لیتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ حُدُوْدُ اللّٰہِ کی پابندی میں ہی دین و دنیا کی فلاح و کامیابی ہے۔

"بالتحقیق فلاح و بہبودی صرف ان مومنین کے لئے ہے جو اپنی نمازوں میں خشوع کرتے

والے ہیں جو لغویات سے برکنار رہنے والے ہیں۔ جو اعمال و افعال میں اپنا تزکیہ کرتے ہیں جو اپنے آپ کو حرام شہوت رانی سے بچائے رکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ (۲۳-۵-۱)

اشتراکیت کہتی ہے تمام حُدود و قیود کا توڑنا ہی اصل انسانیت اور فلاح و بہبودی کا راز ہے۔ قرآن جہاں اس دنیا میں عزت و کامیابی حاصل کرنے کو ضروری قرار دیتا ہے وہاں وہ اس حقیقتِ کبریٰ کو بھی فراموش نہیں ہونے دیتا کہ دنیاوی زندگی حقیقی انسانی زندگی کی ایک تخمی شکل ہے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ - (۲۹-۶۴) -

اور یہ دنیاوی زندگی اپنی بہ اہمیت بمنزلہ کھیل کود کی زندگی ہے اصل زندگی تو دارالآخرۃ کی ہے۔

لیکن اشتراکیت کہتی ہے کہ اصل زندگی دنیوی زندگی ہے اس کے بعد کی زندگی کا خیال لغو و مہمل ہے۔ مذہب اور امورِ دنیا (مثل سیاست و اقتصادیات، معاشرت و معیشت) کسی اور مذہب میں جُداجُدا ہوں تو ہوں لیکن اسلام دین و دنیا کو الگ نہیں کرتا۔ اس نے جہاں رُوحانی اور اخلاقی زندگی کا ایک دستورالعمل پیش کیا ہے وہاں تمدّنی اور معاشرتی سیاسی اور اقتصادی زندگی کا مکمّل ضابطہ بھی مسلمانوں کو دیا ہے۔ اور یہی چیز تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت ہے (اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ) مسلمان کے لئے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً ۔ "اے اللہ مجھے دنیا میں بھی بہتری عطا فرما اور عاقبت میں بھی۔" کی دعا تجویز کی گئی ہے۔ غرض اصل اور فرع دونوں میں اشتراکیت قرآن کے سراسر خلاف ہے۔ اور جب کوئی اس تحریک کی تائید کرے گا قرآن کا رشتہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اشتراکین کا مذہب کے خلاف جنون ردِّعمل کا نتیجہ ہے اور انہیں امید ہے کہ وہ رفتہ رفتہ اعتدال پر آجائیں گے۔ لیکن واقعات اس خوش فہمی کی تکذیب کرتے ہیں۔ ۲۳ جنوری ۱۹۱۸ء کو بالشویکوں نے مذہب اور آزادئ ضمیر کے متعلق جو منشور جاری کیا تھا اس میں مذہب و ملت کو حکومت سے علیحدہ کیا گیا تھا اور یہ اجازت دی تھی کہ۔

(۴) کوئی شہری جونسا مذہب بھی چاہے۔ اختیار کر سکتا ہے۔

اور اگرچہ مدارس و مکاتب میں مذہبی تعلیم کے مظاہرے ممنوع قرار دیئے گئے تھے لیکن اس کی اجازت بھی کہ۔

(۵) ہر شہری نج کے طور پر اپنے بچّوں کو مذہبی تعلیم دلا سکتا ہے۔

(Religion under the Soveit)

اس میں مذہبی عبادتگاہوں سے تعرض نہیں کیا گیا تھا لیکن ۱۹۲۲ء (فروری) میں حکومت نے یہ فیصلہ کر دیا کہ مذہبی عبادت کدوں کی جائداد و املاک ضبط کر لی جائیں۔

(Russia Reported—1921-1923)

۲۸-۱۹۲۷ء میں یہ تشدّد اور بھی بڑھ گیا۔ اور عبادتگاہیں مسمار کر دی گئیں۔ مذہبی مکاتب جبراً بند کر دیئے گئے مذہبی تعلیم ممنوع قرار دیدی گئی۔ مناسک و عبادات کی ادائیگی روک دی گئی اور خدا کے پرستاروں کے لئے خدا کا نام لینا جرمِ عظیم قرار دیدیا گیا۔ اِن واقعات سے ظاہر ہے کہ جُوں جُوں یہ تحریک زیادہ مستحکم ہوئی۔ مذہب کے خلاف اس کا جذبۂ انتقام و عناد زیادہ مشتعل ہوتا گیا۔ لہٰذا یہ اُمید کہ قوّت کے استحکام کے بعد اشتراکیین میں میانہ روی آجائے گی۔ اپنے آپ کو دھوکہ دینا اور حقیقت سے چشم پوشی کرنا ہے۔ لیکن بفرضِ محال اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ وحشت و سبعیت کے بعد اشتراکیین میں اعتدال آجائے گا تو جب وہ کچھ مسلمانوں کو مرتد اور باقی کو جور و ستم کا شکار بنا کر شہید کر چکے ہوں گے تو اس وقت جبکہ (کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی) اگر اُن کا مزاج اعتدال پر آیا بھی تو اس سے اسلام کو کیا فائدہ

کی میرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ

ہائے اُس زُود پشیماں کا پشیماں ہونا

حقیقت یہ ہے کہ اشتراکیین کی دہریّت اُن کے نزدیک خود ایک مذہبی حیثیت رکھتی ہے منکرینِ خدا کی انجمنیں قائم ہیں انہیں حکومت کی طرف سے امداد ملتی ہے اور لا مذہبیت کی اشاعت کے لئے پوری آزادی حاصل ہے

(Religion under the Soveit)

طریقِ کار اشتراکیت کی نشر و اشاعت کے لئے جو لائحۂ عمل یا طریقِ کار اختیار کیا گیا ہے اُس میں ہر قسم کا فتنہ و فساد، آگ اور خون، مسلح انقلاب، جور و استبداد، جبر و استکراہ سب کچھ شامل ہے۔ اشتراکیین کے نزدیک جائز وہ ہے جس سے مطلب براری ہو۔ اور ناجائز وہ ہے جو ان کے مقاصد کے منافی ہو اسلام اس طریقِ کار کا حامی نہیں۔

کسی نظام میں تغیر پیدا کرنے کے لئے دو قسم کے طریقۂ عمل اختیار کئے جاتے ہیں، اوّل یہ کہ خرابیوں کے اسباب و علل پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے۔ حالات کا جائزہ لیا جائے۔ مخالفین کے خلاف دل میں انتقامی جذبہ پیدا نہ ہو۔ نقائص و اسقام کے دُور کرنے کے لئے نرم روی سے علاج سوچے جائیں۔ دعویٰ کے اثبات میں دلائل و براہین پیش کرنے سے فریقِ مخالف کا سکوت نہیں بلکہ سکون مقصود ہو۔ جب تک اپنی حفاظت اور مظلوموں کی حمایت کے لئے مدافعت کی ضرورت نہ پڑے طاقت و قوّت کا استعمال نہ کیا جائے۔ اگر سوسائٹی کی صحت و بقا خطرہ میں پڑ جائے تو (اس کے جسم کا) صرف اتنا حصّہ ہی کاٹا جائے جو زہر آلود ہو کر لاعلاج ہو چکا ہو۔ اس طریقِ عمل کا نام قرآنِ کریم نے اصلاح رکھا ہے۔

دوسرا طرزِ عمل وہ ہے جس کی ابتداء غیظ و غضب اور جوشِ انتقام سے ہوتی ہے۔ اس میں ہر قسم کی تخریبی قوّت بروئے کار لائی جاتی ہے۔ فریقِ مخالف کا کوئی عذر مسموع نہیں ہوتا۔ ہر نظریئے کو زبردستی منوایا جاتا ہے۔ بدعنوانیوں کا استیصال ویسی ہی بدعنوانیوں سے کیا جاتا ہے۔ اس جوش و خروش، اس شورش و اضطراب کا نام جسے آجکل انقلاب کہا جاتا ہے قرآن کی اصطلاح میں فساد ہے۔ اسلام اس قوّت آزمائی، اس ہنگامہ آرائی، اس جبر و اکراہ، اس ظلم و استبداد کا یکسر مخالف ہے۔ قرآنِ کریم نے اس طریقہ کا ضمناً اس انداز میں ذکر فرمایا ہے:۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ	اور جب ان سے کہا جاتا ہے فساد مت کرو زمین
قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ۔ اَلَآ اِنَّهُمْ	میں۔ تو کہتے ہیں کہ نہیں، ہم تو محض اصلاح کرنیوالے
هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ (۲: ۱۱-۱۲)	ہیں۔ بیشک یہی لوگ مفسد ہیں لیکن وہ اسے سمجھتے نہیں۔

اسلام کا طریقِ کار اصلاح ہے۔ فساد نہیں۔ چنانچہ حضرات انبیاءؑ نے تغیرِ حالات کے لئے اصلاح ہی کا طریقہ اختیار فرمایا۔ مثلاً حضرت شعیبؑ کے ذکر میں ہے:۔

وَمَآ اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَکُمْ اِلٰی مَآ اَنْھٰکُمْ عَنْہُ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ

میں یہ نہیں چاہتا کہ تمہارے خلاف وہ طریق عمل اختیار کروں جس سے میں خود منع کرتا ہوں میں تو جہانتک میرے امکان میں ہے صرف اصلاح چاہتا ہوں۔

اپنی نشر و اشاعت کے لئے اسلام نرم روی اور رواداری سے کام لیتا ہے۔ اور جبر و اکراہ کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ فرمایا:۔

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ۔ (۲ : ۲۵۶)

دین کے معاملہ میں کسی قسم کی زبردستی جائز نہیں (اسلئے کہ) ہدایت و گمراہی بالکل ایک دوسرے سے الگ ہو چکی ہے

جس کا جی چاہے ایمان اختیار کرے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے (فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ) اسلام نے جہاں جسمانی جبر و اکراہ کو معیوب قرار دیا ہے وہاں عقل و شعور کے مقابلہ میں ذہنی استکراہ کو بھی جائز نہیں رکھا۔ اس نے اپنی دعوت کے لئے اصلاح کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ کیونکہ اس کا مقصود سکونِ قلب ہے نہ اسکاتِ خصم۔ علم منطق کی رُو سے استدلال کے بالعموم تین طریقے قرار دیئے گئے ہیں۔ ایک برہانیات جس میں یقینی شواہد کے ذریعہ دعوے کے اثبات میں دلائل لائے جاتے ہیں دوسرے خطابیات جس میں مؤثر طریقِ خطابت سے مافی الضمیر کو دوسرے کے ذہن نشین کرایا جاتا ہے۔ اور تیسرے جدلیات یعنی ایسے اقوال سے دعوے کو ثابت کیا جاتا ہے جو فریقین میں مسلّم ہوں۔ قرآن کریم نے یہی تینوں طریقے اپنی دعوت کے لئے تجویز فرمائے ہیں۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (۱۶ : ۱۲۵)

لوگوں کو اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت و دانائی اور موعظۂ حسنہ کے ذریعے بلاؤ۔ اور ان سے مناظرہ نہایت عمدہ طریق سے کرو۔

حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ جب فرعون کو دعوتِ حق دینے کے لئے مامور ہوئے تو ان سے ارشاد ہوا کہ:۔

اِذْھَبَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی ۔ فَقُوْلَا لَہٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّہٗ یَتَذَکَّرُ اَوْ یَخْشٰی (۲۰ : ۴۳-۴۴)

تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ۔ اس نے طوفان برپا کر رکھا ہے لیکن اس سے نرمی بات کرنا شاید وہ نصیحت قبول

کرلے یا (اللہ سے) ورثے۔

نبی اکرمؐ کو ارشاد ہوا کہ تبلیغ حق کے لئے

وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا (النساء)

ان سے ایسی باتیں کہئے کہ سیدھی ان کے دل میں اُتر جائیں

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام کو لڑائیاں بھی لڑنی پڑیں لیکن اُس کا مقصد کسی قوم کی آزادی کو سلب کرنا نہیں تھا[1] بلکہ ہر ایک مذہب کے لئے آزادی حاصل کرنا تھا۔ فرمایا:۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (۲۲/۴۰)

اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کا ایک دوسرے کے ہاتھ سے زور نہ گھٹواتا رہتا تو نصاریٰ کے گرجا۔ یہودیوں کے معبد۔ ترساؤں کے مندر اور مسلمانوں کی مساجد جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے منہدم ہو گئے ہوتے۔

مذکورہ بالا صورت کے علاوہ قتل و خونریزی کو قرآن کریم نے فعل شنیع قرار دیا ہے۔ سورۂ مائدہ میں فرمایا:۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (۵/۳۲)

قتلِ بے گناہ یا فساد فی الارض کی نوعیت سے جس نے ایک جان کو بھی مار دیا۔ یوں سمجھئے کہ گویا اُس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔ اور جس نے ایک انسان کو مرنے سے بچایا اُس نے گویا کل بنی نوع انسان کو زندگی بخشی۔

امن پسند انسانوں کو بھیڑ بکری کی طرح ذبح کر ڈالنا۔ جذبۂ وحشت و غارت گری فرو کرنے کے لئے خون کی ندیاں بہا دینا۔ انتقام لینے کے لئے ہنستے انسانوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دینا۔ اسلام کے

---

[1] سر طامس آرنلڈ نے اپنی مشہور کتاب (Preaching of Islam) میں مختلف اقوام و ممالک میں تبلیغ اسلام کی تاریخ شرح و بسط سے لکھ کر ثابت کیا ہے کہ اسلام کہیں بھی بزور شمشیر نہیں پھیلایا گیا۔ منہ

نزدیک حرام ہے۔ اسلام کا مادہ سَلِمَ ہے جس کے معنی امن وسلامتی کے ہیں۔ اسلام کو فساد و غارتگری سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ وہ کسی شکل میں بھی حق وصداقت اور عدل و انصاف کا رشتہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک جو چیز ناجائز وحرام ہے وہ دوست دشمن سب کے لئے ناجائز و حرام ہے۔ فرمایا:۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (۵:۸)

(دیکھنا) کسی قوم کی دشمنی کہیں تمہارے لئے اس بات کا باعث نہ ہو جائے کہ تم عدل نہ کرو۔ (ہمیشہ) عدل کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

تاریخ و عجب ہے میں اس امر کے شواہد بکثرت ملتے ہیں کہ مسلمان اور غیر مسلم کے تنازعہ میں مسلمان قاضی کی عدالت کی ڈگری غیر مسلم کو ملی۔ مدینہ منورہ کے یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف جھگڑوں میں اپنے ججوں کو چھوڑ کر نبی اکرمؐ کو ثالث مقرر کیا۔

میدانِ جنگ میں دُنیا بھر کے مقننین قوت کے ہر قسم کے استعمال کو جائز قرار دیتے ہیں لیکن نبی اکرمؐ جب کسی دستہ فوج کو روانہ فرماتے تو التزاماً انھیں تاکید فرماتے تھے کہ

"خبردار اگر کسی نے غیر مذہب والے پر ظلم کیا یا اس کے مذہب کی تنقیص کی یا کوئی چیز بجبر اس سے چھین لی تو یاد رکھو قیامت کے دن خدا کے حضور اس کی طرف سے ایسا کرنے والے مسلمان کے خلاف میں جھگڑونگا۔" (ابوداؤد۔ جلد دوم)

ان حقائق کی روشنی میں کون کہہ سکتا ہے کہ اشتراکیت کا طریق عمل اسلام کے نزدیک جائز ہے۔ ظلم واستبداد۔ جور وتعدی۔ خون آشامی۔ آتش ریزی۔ فتنہ وفساد اور قتل وغارت کی ہلاک انگیز و امن شکن تحریک اسلام کے نزدیک کیسے مستحسن ہو سکتی ہے جس کا مقصدِ وحید ہی دنیا سے اس قسم کے وحشیانہ جرائم کا نیست ونابود کرنا ہے!

نتائج:۔ اگر یہ صحیح ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو یہ دیکھنے کے لئے کہ

اشتراکیت نے دنیا کی مسرتوں اور راحتوں میں کس قدر اضافہ کیا ہے اور نظامِ انسانیت عالم میں کیا کیا ترقیاں کی ہیں۔ روس کی حالت پر غور کرنا چاہیئے۔ کیونکہ روس ہی فی الحقیقت اشتراکیت کا گہوارہ ہے۔

اشتراکیت کے علمبرداروں کے نزدیک دنیا کی تمام تباہیاں اور بربادیاں۔ تمام ہلاکتیں اور مصیبتیں اقتصادی نظام ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے ہیں اور اُن کا واحد علاج تحریکِ اشتراکیت ہے بلشہ ۱۹۱۸ء میں زارِ روس کے نظامِ حکومت کا تختہ الٹ کر اس تحریک نے زور پکڑا۔ ابھی ایک برس بھی نہ گزرا تھا کہ سنہ ۱۹۲۰ء میں روس میں ایک قیامت خیز قحط پڑا جس کے رفع کرنے کے لئے جائز و ناجائز طریقے استعمال کئے گئے۔ جائدادیں غصب کی گئیں۔ سرمائے چھین لئے گئے۔ فقیر کی جھونپڑی سے لیکر امیر کے محلات تک میں جو کچھ ملا سب کچھ ضبط کر لیا گیا۔ حتیٰ کہ تختہ ہائے مسجد جو قابلِ سوختن نہ قابلِ فروخت سمجھے جاتے تھے انھیں بھی حکومت نے اپنے قبضہ میں کر لیا۔ لیکن حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ ماہرینِ زراعت کے نزدیک قحط کی اصلی وجہ اشتراکیت کی پہلی اسکیم ملکیت (Requisition Scheme) تھی۔ یہ دیکھکر کہ پیداوار آوروں کی ملکیت ہو جاتی ہے کسانوں نے زمین میں دلچسپی لینی چھوڑ دی اور خود لینن کو کہنا پڑا کہ یا تو ذاتی تجارت کی پھر اجازت دینی پڑے گی یا کسانوں کے خلاف جدال و قتال کرنا ہوگا۔ چنانچہ ملکیت کی اسکیم کو چھوڑ کر اجتماعی طریقِ زراعت (Collec... Scheme) جاری کیا گیا۔ مگر یہ بھی ناکام رہا۔ اس اسکیم میں فوج کے سپاہی کسانوں کی فصل اٹھا کر حکومت کے مرکزوں میں جمع کرتے تھے۔ اور جو کوئی ان کی مزاحمت کرتا تھا اُسے گولی کا نشانہ بنا دیا جاتا تھا۔ اس تشدد کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ کسان زمین چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اور زمینیں سبزۂ بیگانہ سے آشنا گئیں (ملاحظہ ہو (Bombay Sentinal)

چنانچہ ایک امریکن سیاح مسٹر (Sherwood Eddy) جو عام طور پر روسی طرزِ حکومت کا مداح ہے پچیس سالہ سیاحت کے خیالات قلمبند کرتے ہوئے اپنی کتاب (Russia to-day) میں لکھتا ہے کہ کسانوں کو حکومت کی طرف سے نادر شاہی احکام ملتے ہیں کہ اس قدر غلہ فی کھیت پیدا کرنا ہوگا۔ اگر آفاتِ ارضی و سماوی کی وجہ سے کسان غلہ کی اتنی مقدار بہم نہ پہنچا سکے تو اُسے سائبیریا کے یخ بستہ

میدانوں کی طرف جلاوطن کر دیا جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو Daily Gazette Karachi)

اس میں شبہ نہیں کہ ان ایام میں ساری دنیا اقتصادی کساد بازاری کے بے پناہ عذاب میں ماخوذ تھی۔ خود ہندوستان میں اجناس کا نرخ اتنا گر گیا تھا کہ اس کی نظیر گذشتہ صدی میں ملنی مشکل ہے۔ لیکن بایں ہمہ اگر غلّہ کا قحط کہیں دنیا کے کسی حصہ میں پڑا تو وہ صرف روس کا ملک ہی جو دنیا بھر میں گندم کی پیداوار کا بہترین خطہ سمجھا جاتا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں وہاں دوبارہ قحط پڑا جس میں دیہاتیوں کا یہ حال ہو گیا تھا کہ وہ بلی۔ کتے حتیٰ کہ انسانوں تک کو کھا گئے۔ مگر تعزیری پولیس فصل جمع کرنے کے کام میں بدستور مشغول تھی۔ آذربائیجان کے علاقہ میں قحط اپنی انتہائی شدت پر تھا۔ فروری سے اکتوبر ۱۹۳۲ء تک قریب ... ۳۰۰۰ نفوس اس علاقہ سے خراسان کی طرف ہجرت کر گئے۔ مسٹر (Williams) نے اپنی سیاحت کی بنا پر جن حالات کا انکشاف کیا ہے وہ عبرت و بصیرت کی داستان ہیں۔ وہ لکھتے ہیں ہزارہا کھیت ایسے دیکھے گئے جن پر فصل پڑی سڑ رہی تھی۔ کیونکہ بہت سے کسان بھوک کی شدت سے زمین چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ جو باقی تھے وہ خود بھوکے مر رہے تھے۔ کیونکہ تمام غلہ پہلے حکومت کے گوداموں میں جمع ہوتا تھا اور پھر وہاں سے کسانوں کا حصہ ملتا تھا (ملاحظہ ہو Bombay Sentinal) مجریہ ۱۳ مارچ ۱۹۳۳ء) ایک کسان نے کانگریس کے بھرے اجلاس میں کہہ دیا تھا کہ "زمینیں ہماری ہیں لیکن فصل تمہاری۔ چراگاہیں ہماری ہیں لیکن گھاس تمہاری جنگل ہمارے ہیں لیکن درخت تمہارے تشدد پسند انقلاب کی بنیادی غلطی یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر خرابی کا علاج تشدد سے کرنا چاہتا ہے۔ اور اس طرح ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کا مضمون ہو جاتا ہے۔ اس کے حامی مرض کے اسباب و علل پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کرتے۔ انہیں ہر بات پر غصہ آ جاتا ہے اور ان کا ہر علاج انتقامی جذبہ میں شور بور ہوتا ہے اشتراکیت کا انقلاب تشدد کا انقلاب ہے۔ چنانچہ نسل کشی اسپان کے ۲۰۰ ڈکٹیٹروں پر یہ الزام لگایا گیا کہ انھوں نے اسپان کی نگہ پرداخت میں تساہل برتا ہے۔ اس تساہل کے لئے ۱۱ کو سزائے موت۔ ۹ کو دس دس سال کی قید اور باقیوں کو اور سزائیں دی گئیں۔ (اسٹیٹسمین مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۳۳ء)

روس کے ایک اخبار کی رپورٹ کے مطابق مارچ ۱۹۳۳ء میں ایک شخص کو غلہ چرانے کے جرم میں

سزائے موت کا فتویٰ سنا دیا گیا۔ چنانچہ خود لینن نے اِس بدنظمی سے متاثر ہو کر لکھا تھا کہ اِس میں شک نہیں کہ ہم بے آئینی کے ایک بحرِ ذخار میں بہے چلے جا رہے ہیں اور مقامی اثرات سخت درجہ مانع ہیں کہ ملک میں نظامِ امنیت قائم ہو سکے (Communism Exposed)

حکومت کے اقتدار۔ اشتراکیت کے تسلط اور استیلائے بہیمی کے استحکام کے لئے جس قدر ظلم و تشدّد اور قتل و غارت روا رکھا گیا ہے نظام و آئین کے تحفظ کے لئے جس قدر بے آئینی و بے نظمی برتی گئی ہے قانون کے ضبط و انضباط کے لئے عدل و انصاف کے اندھے دیوتا کے مندر پر جس قدر قربانیاں چڑھائی گئی ہیں اور اپنے اعتقادات کی نشر و اشاعت کے لئے جس قدر خون کی سیلاب انگیزیاں برپا کی گئی ہیں اُس کا کچھ اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے ہو سکیگا جو مسٹر جون واٹن ہرڈ (John Wynne Hurd) نے اپنے تیس سالہ قیامِ رُوس کے زمانہ میں فراہم کئے تھے اور جو ڈیلی گزٹ کراچی کی اشاعت مورخہ ۵،۶ جون ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئے تھے۔

تعدادِ مقتولین

اساقفہ	۳۱
پادری	۱۵۶۰
جج وکلاء اور مجسٹریٹ	۳۴۵۸۵
اساتذہ اور طلباء	۱۶۳۶۷
سول حُکّام	۷۹۹۰۰
امراء و رؤساء	۶۵۸۹۰
فوجی افسر	۵۶۳۴۰
مزدور مرد و عورت	۱۹۶۰۰۰
سپاہی اور جہازراں	۲۶۸۰۰۰
کسان اور کاشتکار	۸۹۰۰۰۰

بخت نصر کی تباہ کاریاں۔ یونانیوں کی ستم ریزیاں، ایرانیوں کی لشکر انگیزیاں۔ رومیوں کی ہلاکت آفرینیاں۔ حتیٰ کہ چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کی قتل و غارتگری کی خونچکاں اور خونفشاں قیامت خیزیاں سب اِس فہرست کے سامنے شرمندہ ہیں۔ یہ نتائج اس اشتراکیت کے ہیں جس کے متعلق خود لینن کا دعویٰ تھا کہ یہ تحریک حکومت اور جنگ کی دہشتوں سے نجات دلانے کی صراطِ مستقیم ہے۔

(Dialectical Materialism

by V-Adoratsky)

اور جس کے متعلق محولہ بالا کتاب کے مؤلف کا بیان ہے (جو آجکل ماسکو میں مارکس۔ اینجلز۔ لینن انسٹیٹیوٹ کا ڈائرکٹر ہے) کہ:۔

نسلِ انسانی صرف قوتِ بازو سے جو اشتراکیت کی شکل میں موجود ہے۔ نیم بربریت کی زندگی اور افلاس۔ استبداد اور جہالت کے پنجہ سے رہائی پا سکتی ہے نہ کہ خدا کی مدد کے بھروسہ پر جس کے متعلق ہمارا الیقین ہے کہ اس کا وجود ہی نہیں ہے۔" (ایضاً ص۱۰۱)

یہ ہے وہ روس جس کے متعلق ہمارے ہندوستانی سوشلسٹ جناب منظر صاحب کا بیان ہے کہ

" اسی ردّعمل کا نتیجہ روس کی نئی حکومت ہے جو زمین پر ایک جنت ہے۔

وہاں بے روزگاری۔ بھوک۔ جہالت اور تنگدستی کا نام نہیں" (مدینہ ۱۲؍ ہجرت ۱۴)

اس کے مقابلہ میں خدا کی مدد پر بھروسہ رکھنے والے اسلام نے جو نتائج پیدا کئے اُن کے متعلق مسٹر (A. Von Kremer) "جو ایک ممتاز مستشرق ہیں، لکھتے ہیں کہ:۔

" اصلاح کا یہ عظیم الشان کام برابر سرانجام پاتا رہا۔ حتیٰ کہ جب محمد (صلعم) کی وفات ہوئی تو عرب کے بیشتر حصہ پر خدا کی امنیت و سکینت کے ایسے بادل چھا رہے تھے جو قتل و غارتگری کے خوگر۔ عربوں نے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھے تھے۔ امن و سلامتی کا یہ دَور دَورہ محض اسلام کے طفیل سے تھا۔"

(Preaching of Islam)

فتنہ وفساد کے استیصال اور امن وسلامتی کے تسلط کے لئے اسلام کو بھی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ نبی اکرمؐ کی دس سالہ مدنی زندگی میں کم وبیش ۸۰ لڑائیاں ہوئیں۔ جن میں مسلمانوں کے ۲۵۹ اور مخالفین کے ۷۵۹ آدمی قتل ہوئے۔ یعنی کُل ۱۰۱۸ گویا مقتولین کی اوسط فی لڑائی ۱۲ ہوئی۔ ان ۸۰ جنگوں میں قیدیوں کی اوسط فی لڑائی سات ہے۔ قیدیوں کے ساتھ سلوک کے متعلق جنگِ بدر کے ایک قیدی عزیز کا بیان ہے کہ میں حضرت مصعب ابنِ عمیرؓ کے سپرد کیا گیا۔ حضرت مصعب دن بھر محنت مشقت کرتے اور شام کو گیہوں کی روٹیاں مجھے کھلاتے اور خود کھجوروں پر گذارہ کرتے۔ میری گردن ندامت سے جھک جاتی اور جب میں کہتا کہ آپ روٹی کیوں نہیں کھاتے تو فرماتے کہ بھائی تم ہمارے مہمان ہو اور مہمان کی مدارات ہم پر فرض ہے

بصائر وعبر۔ دنیا نے آج جس قدر مادیات میں ترقی کی ہے اس کی مثال تاریخِ عالم میں شاید ہی کہیں ملے۔ میدانوں۔ پہاڑوں۔ خشکی۔ تری۔ غرض تحت الثریٰ سے اوجِ ثریا تک ہر جگہ انسان کو اقتدار حاصل ہے۔ لیکن بایں ہمہ غلبہ واستیلاء جس اضطراب وبیتابی کے دور سے دنیا آج گذر رہی ہے اس کی نظیر بھی تاریخِ عالم میں کہیں نہیں ملے گی۔ حریر واطلس کے نرم ونازک لباس میں لپٹے ہوئے جسم کے اندر قلبِ انسانی کو دیکھئے تو عدمِ اطمینان اور فقدانِ سکون کی ایک آگ شعلہ فگن رہتی ہے۔ بڑے بڑے مدبرین جلیل القدر مفکرین سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں کہ ہلاکت وتباہی کی ان مہیب غاروں سے نجات کی کوئی صورت نکل آئے۔ مختلف فارمولے اور متعدد ازم تجویز کئے جاتے ہیں لیکن

ع تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی۔ ایک اسکیم پر عمل کرتے ہیں۔ اس کی روشنی میں تھوڑی دور چلتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بس اب راہِ نجات مل گئی۔ لیکن جلدی گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا ہے اور اس میں بھٹکنے لگ جاتے ہیں۔ تنہا عقلِ انسانی کی اس بے بسی کی مثال قرآنی الفاظ میں یوں سمجھئے کہ وہ بجلی کی سی چمک ہے۔ جب چمکتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کرۂ ارض سے لے کر عالمِ افلاک تک سب کچھ منور ہو گیا کُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ (بقرہ) جب ان کا

گرد و پیش روشن ہو جاتا ہے تو چلنے لگتے ہیں۔ اور جب چمک ختم ہو جاتی ہے تو حیران و ششدر کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا۔ اقوامِ عالم کی یہ حالت تو اس لئے ہے کہ ان کے پاس کوئی مستقل شمعِ ہدایت نہیں لیکن حیرت ہے مسلمانوں پر کہ جن کے پاس وہ نورِ مبین اور شمعِ ہدایت موجود ہے جو لوگوں کو اندھیرے سے روشنی کی طرف لانے والی ہے (لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ) لیکن افسوس انھوں نے اس شمعِ ہدایت کو چراغِ تہِ داماں کی طرح غلافوں میں لپیٹ کر زینت دہ طاقِ نسیان بنا رکھا ہے اور دوسروں کے جگنو کی روشنی کو خضرِ راہ سمجھ کر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ کہیں اشتمالیت کہیں فسطائیت کہیں نازی ازم، کہیں کمیونزم۔ غرضیکہ

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اِک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں،

ظہورِ اسلام کے وقت عرب کے دائیں بائیں دو تہذیبیں موجود تھیں۔ ایک طرف رُومیوں کی تہذیب اوجِ کمال پر تھی۔ دوسری طرف ایرانیوں کے تمدن کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ اگر اسلام اپنے ساتھ کوئی مستقل تہذیب نہ لایا ہوتا اور فلاح و بہبود دوسروں ہی کی تقلید میں ہوتی تو انھیں حکم دیدیا جاتا کہ رومیوں یا ایرانیوں کی تہذیب اختیار کرلو لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ بلکہ کہا گیا کہ :-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ (النساء)

اے مسلمانو۔ تم ایمان رکھو اللہ پر اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل فرمائی۔

یعنی کتابِ مبین کی روشنی میں جو اللہ کا نور ہے رسول اللہ کے نقوشِ قدم پر چلے جاؤ۔ تہذیب اسلامی کے ان عناصرِ ترکیبی پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف چند سال کے عرصہ میں ایک اونٹ چرانے والی بادیہ نشین قوم قیصر و کسریٰ کی تہذیبوں کی مالک بن گئی۔ یہ احسانیات

یونان کے افسانے نہیں بلکہ تاریخ کی ٹھوس حقیقتیں ہیں۔ ایک انگریز مورخ کے بیان کے مطابق عہدِ فاروقی تک یعنی بارہ سال کے عرصہ میں مسلمانوں نے چالیس ہزار شہر اور قلعے فتح کر لئے تھے۔ جس کی اوسط ۹ قلعے روزانہ پڑتی ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اسلام کا انقلاب اشتراکیت کا انقلاب نہ تھا۔ جس میں خونِ ناحق کے سوا کچھ نہیں۔ اسلام کی فتح اس انداز کی تھی کہ جیسا حمص کا شہر فتح ہوا تو اُس کی حفاظت کے لئے شہر والوں سے سال بھر کا زرِ جزیہ لیا گیا۔ لیکن چونکہ چھ ہی مہینے کے بعد مسلمان فوجوں کو کسی اور جگہ منتقل ہونا پڑا خلیفۃ المسلمین نے حکم بھیجا کہ نصف زرِ جزیہ اہلِ شہر کو واپس دیدیا جائے۔ کیونکہ جب ہم ان کی حفاظت ہی نہ کرینگے تو زرِ معاوضہ کیسا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور جب مسلمان رخصت ہونے لگے تو اہلِ شہر کا جو عیسائی تھے یہ حال تھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور وہ مسلمانوں سے کہتے جاتے تھے کہ خدا کے لئے جلد واپس آنا۔ ایسا نہ ہو کہ ہمیں پھر رومیوں کے ماتحت رہنا پڑے۔ حالانکہ رومی اُن کے ہم مذہب تھے۔

یہ نتائج مارکس اور لینن کی اتباع نہیں بلکہ خدا اور رسول کی اتباع سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ راستہ آپ کو منشورِ اشتراکیت سے نہیں بلکہ احکم الحاکمین کے ضابطۂ ازلی کی مدد سے ملیگا جسے قرآن کہتے ہیں۔ اگر آپ قرآن کے تابع فرمان ہو جائینگے تو صدرِ اسلام کی تمام نعمتیں حاصل ہو جائینگی۔ کیونکہ خدا کی طرح جو حیٌّ لَا یَمُوتُ ہے اس کی کتاب بھی زندۂ جاوید۔ لیکن اگر آپ کفر و اسلام۔ حق و باطل۔ اہرمن و یزدان۔ خدا و شیطان۔ قرآن و اشتراکیت کو بیک وقت دل میں جگہ دینگے۔ اگر خدا کو خدا مانتے ہوئے دوسروں کے آستاں پر جبہ سائی کرینگے۔ اگر اُس کے نورِ مبین کی موجودگی میں دوسروں کی نظر فریب ضیا پاشیوں کو مشعلِ ہدایت بنائینگے تو یاد رکھئے قرآن کا یہ اٹل فیصلہ آپ کے لئے موجود ہے۔ کہ

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ
تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۔ ۲۲/۳۱

جس نے خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک بنایا، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ گویا وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پہ آگرا۔ یا کوئی پرندہ اسے اُچک کر لے گیا۔ یا ہوا کا تھپیڑا اسے اڑا کر کسی دُور دراز مقام میں لے گرا (یعنی اس کا کوئی مرکز نہ رہا)

لیکن اگر آپ گلشنِ کائنات میں سرفرازی و برومندی چاہتے ہیں تو اس کا ایک اور صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ مذہب و شریعت کی ارضِ مقدس میں آپ اپنی جڑوں کو مضبوطی سے پیوست کریں کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ
اس شجرِ مقدس کی طرح جس کی جڑیں مضبوط اور شاخیں آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی ہوں۔

دگر بشاخِ گُل آویز و آب و نم در کش
پریدہ رنگ ز بادِ صبا چہ میجوئی (اقبالؒ)

لیکن اگر کسی تحریکِ ارضی کی جاذبیت آپ کو اپنی طرف اس لئے کھینچ رہی ہے کہ اس میں عیش و نشاط کی فراوانیاں مضمر ہیں تو یاد رکھئے خدا کا یہی قانون ہے کہ۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ
لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ۲۸/۵۸

ہم بہت سی بستیاں ایسی ہلاک کر چکے ہیں جو اپنے سامان عیش و طرب پہ نازاں تھیں۔ سو دیکھ لو یہ اُن کے گھر بار ہیں کہ پھر ان کے بعد یہ آباد نہ ہوئے مگر تھوڑی دیر کے لئے اللہ آخر کار ان سب سامانوں کے ہم ہی وارث ٹھہرے۔

برادران! یہ ہے سوشلزم اور اس کے مقابلہ میں یہ ہے اسلام! آپ خود فیصلہ فرمالیجئے کہ سوشلزم کو اسلام سے کتنا تعلق ہے لیکن غور طلب معاملہ یہ ہے کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ کانگریس کا نصب العین یہ ہے کہ ملک کو سوشلزم کے لئے تیار کیا جائے۔ اور جب اختیارات اپنے ہاتھ میں

آجائیں تو یہاں سوشلزم کے انداز کی حکومت قائم کردی جائے۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے علمائے کرام کا یہ فتویٰ ہے اور بار بار فتویٰ ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ بلاشرط جوق در جوق کانگریس میں شریک ہو جائیں یعنی عملاً نظامِ سوشلزم کے قیام میں معاونت کریں۔ آپ ان سے کبھی دریافت تو کیجئے کہ وہ نظام سوشلزم جو اسلام کی ضد ہے اس کا عملی قیام کس طرح اسلامی فریضہ قرار پاسکتا ہے۔ حیرت ہے کہ یہ حضرات ایک طرف سوشلزم کو اسلام کی نقیض بھی قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف اُن کی حالت یہ ہے کہ خود جمیعت العلماء کے سالانہ اجلاس (دہلی) کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر ڈاکٹر شوکت اللہ شاہ صاحب انصاری اپنے خطبۂ صدارت میں سوشلزم کو تمام مصائب کا واحد علاج قرار دیتے ہیں اور ہمارے علماء حضرات میں سے کسی ایک کی طرف سے ایک لفظ بھی مخالفت کا نہیں کہا جاتا۔

مولانا ابوالکلام صاحب آزاد ترجمان القرآن (جلد دوم) میں سوشلزم اور قرآنی تعلیم میں اصولی فرق بتاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس کانگریس کے سرگرم کارکن بھی ہیں جس کا نصب العین سوشلزم نظامِ حکومت کا قیام ہے۔ اپنے مسلک کے جواز میں ان حضرات کے پاس لے دے کے دلیل صرف ایک ہے کہ انگریز کو ملک سے نکال دو۔ ہم کہتے ہیں کہ وہ کون سا مردِ مسلمان ہے جس کے ہاتھ میں قرآن ہو اور وہ ایک سیکنڈ کے لئے بھی انگریز کی غلامی پر قانع رہ سکے۔ لیکن سوال صرف انگریز کو نکال دینا ہی نہیں۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کے بعد ہندوستان کا نظامِ حکومت کیا ہو۔ اور چونکہ جدید نظامِ حکومت کی بساط بھی ساتھ ہی ساتھ بچھتی چلی جارہی ہے اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس امر کا فیصلہ بھی اسی وقت کیا جائے۔ کانگریسی مسلک کی مساعی کا مقصد یہ ہے کہ جب اختیارات مل جائیں تو نظامِ حکومت سوشلزم ہو لیکن ایک صحیح مسلمان کا ایمان یہ ہے کہ جب آزادی مل جائے تو ملک کا نظامِ حکومت اسلامی ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ متحدہ قومیت کے نظر فریب سراب کو چھوڑ کر تمام مسلمان اپنی الگ جماعتی تشکیل کریں اور اپنا نصب العین قرار دیں ملک میں حکومتِ الٰہیہ کا قیام۔ وذٰلِکَ دِینُ القَیِّمَۃ

ایک مسلمان

طلوعِ اسلام
اگست ۱۹۴۳ء

کفار سے دوستی!

قرآنِ کریم کی تحریفِ معنوی کا ایک حسرت آفرین منظر

(ایک مسلمان)

دُنیا میں بعض لوگ فطرۃً غلام ہوتے ہیں۔ محکومی ان کی سرشت میں مضمر اور عبودیت انکے خمیر میں داخل ہوتی ہے۔ انکا مسلکِ زندگی ہوتا ہے ہر صاحبِ اقتدار کے سامنے جھکنا۔ اسکی خوشنودی حاصل کرنا۔ اُنہیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ صاحبِ قوت و سطوت کون ہے، وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ طاقت کہاں ہے؟ جہاں طاقت نظر آئے ان کی جبینِ نیاز وہیں سجدہ ریز ہو جاتی ہے۔ کہ:-

طواف اندر سرشتِ برہمن است

ایسے غلام فطرت انسانوں کے بالعموم دو طبقے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو کھلے بندوں صاحبِ غلبۂ اختیار کی خوشامد کرتے ہیں، اُن کی بارگاہِ عالیہ میں تمنائے قرب ان کی زلیست کا سہارا اور اسکا حصول ان کے نزدیک حاصلِ زندگی ہوتا ہے۔ وہ اس کی خاطر، جائز و ناجائز ہر قسم کے وسائل اختیار کرتے ہیں اور "حکومت پرست" کہلانے میں انتہائی عزّت و مسّرت محسوس کرتے ہیں۔ یہ لوگ چونکہ کھلم کھلا طوقِ غلامی زیبِ گلو کرتے ہیں، اس لیے دوسرے انسان اُن کی نسبت دھوکا نہیں کھا سکتے۔ اسکے برعکس انہی لوگوں کا ایک اور طبقہ ہے۔ جو اپنی اس خوئے، غلامی کو تقدس کا پیرہن اُڑھا کر اپنے خبثِ باطن کو مذہب کی آڑ میں چھپاتے ہیں۔ اور یوں خدا اسکے رسولؐ اور ملّتِ اسلامیہ کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ٥ (۲/۹) وہ خود اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ کیا کر رہے ہیں۔ یہ ہے وہ طبقہ جو ملّت کے لیے ہمیشہ رہزن

ایمان و حریت ثابت ہوتا ہے؛ اور ان سے بچنا ہمیشہ متاعِ دین و تقویٰ کے تحفظ کا موجب۔ ان میں سے کچھ تو محض بنا بر جہالت ایسا مسلک اختیار کرتے ہیں، لیکن اکثر نفس پرستی کا شکار ہو کر جلبِ منفعت کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔ یہی طبقہ تھا کہ جب اُسنے مُلک میں انگریز کا غلبہ دیکھا تو کتاب و سنت کو اپنے جذباتِ رزیلہ کے ابلہ فریب غلافوں میں لپیٹ کر آگے بڑھا کہیں "حاکمِ وقت" کی اطاعت کو فریضۂ خداوندی قرار دیا۔ کہیں اسے "اولی الامر منکم" ٹھیرا کر اسکی فرماں پذیری کو (نعوذ باللہ) خدا و رسولؐ کی اتباع کے قائمقام بتایا۔ کہیں اس کی خاطر "جہاد بالسیف" کو حرام قرار دیا۔ اور کہیں "لا تفسدوا فی الارض" کی "نص صریح" سے اسکے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کا خیال تک لانا کفر کے مرادف بتایا۔ غرضیکہ یہ تھا وہ گروہ "حاملانِ دینِ متین" اور "مفتیانِ شرعِ مبین"، جنہے اپنی نفس پرستی کی خاطر غیر خدا کی غلامی کی بدترین لعنت کو نعمتِ الٰہی اور موہبتِ ربانی بنا کر دکھایا۔ اور یوں مذہب کی آڑ میں اپنے جذباتِ ردیہ اور خواہشاتِ دنیاوی کی تسکین کا سامان بہم پہونچایا —— وہ زمانہ گزر گیا۔ اب انگریز کا اقتدار بھی رفتہ رفتہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور حکومت آہستہ آہستہ ہندو کے ہاتھ میں منتقل ہوتی جا رہی ہے۔ اس تبدیلی کے ساتھ ہی اس غلام فطرت نفس پرست طبقہ نے بھی اپنے سجدوں کی سمت میں تبدیلی پیدا کرنا شروع کر دی ہے۔ اب انھوں نے اظہارِ تعبد و تذلل میں اپنی "نمازوں" کا رُخ لندن سے آنند بھون کی طرف پھیر لیا ہے۔ اربابِ اقتدار کی خوشنودیٔ مزاج کے لیے کہیں ہند و مسلم امتیاز مٹا کر ایک متحدہ قومیت کا نظریہ وضع کیا جا رہا ہے۔ تاکہ اکثریت نہایت اطمینان و سکون سے پورے مُلک پر حکومت کر سکے۔ کہیں تمام مذاہب میں "عالمگیر سچائی" کے وجود کو تسلیم کرایا جا رہا ہے تاکہ خداوندانِ حکومت یہ کہہ کر انہیں بابِ عالی سے "دھتکار" نہ دیں کہ تم ہمارے مذہب کو اپنے مذہب سے کمتر درجہ دے رہے ہو۔ کہیں اہنسا کو ہنسا پر فضیلت دے کر حرمتِ جہاد کے اُسی دیرینہ ملت کش فتویٰ کو نئے قالب میں پیش کیا جا رہا ہے۔ متحدہ قومیت کے راستہ میں سب سے بڑا روڑا یہ تھا کہ قرآن کریم مسلمانوں کو کفار کی دوستی سے بڑی شدت سے منع کرتا ہے لیکن

قرآن کو تو یہ حضرات ہمیشہ اپنے خیالات کے تابع چلاتے ہیں۔ اِس لیے اب یہ آواز بلند ہونی شروع ہو گئی ہے کہ قرآنِ کریم صرف اُن کفّار کی دوستی سے روکتا ہے۔ جنھوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگ و قتال کیا ہو۔ عام کفّار کی دوستی سے منع نہیں کرتا۔ لہٰذا انگریز سے دوستی تو حرام ہے، لیکن ہندو سے دوستی عین قرآنی تعلیم کے مطابق ہے۔ (استغفراللہ) یہ تو اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار احسان ہے کہ اسنے اپنی کتابِ مُبین کے ایک ایک لفظ پر بڑے بڑے زبردست پہرے دار بٹھا رکھے ہیں کہ کسی کی مجال نہیں کہ انہیں اپنی جگہ سے ہلا سکے۔ ورنہ جو لوگ قرآنِ کریم میں اس درجہ تحریفِ معنوی کی جرأت کر سکتے ہیں، ان سے یہ کب بعید تھا کہ وہ الفاظِ قرآنی میں بھی (نعوذ باللہ) اپنی مرضی کے مطابق ردّ و بدل کر ڈالتے۔ کتبِ سابقہ میں جو ردّ و بدل ہُوا وہ بھی ایسی ہی دسیسہ کاریوں کا شرمندۂ احسان تھا۔ آیئے ہم دیکھیں کہ قرآنِ کریم کفّار سے دوستی کے متعلق کیا حکم دیتا ہے۔

اِس میں شبہ نہیں کہ قرآنِ کریم تمام نوعِ انسانی کے ساتھ عدل و انصاف کی تاکید کرتا ہے کہ وہ مساواتِ انسانی کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ لیکن وہ انسانوں کے مختلف طبقات کے فرق کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ کھلے کھلے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ کہ ظالم اور مظلوم میں نمایاں فرق ہے۔ اگر تمہیں مظلوم کے ساتھ ہمدردی ہے تو اس کی مدافعت اور امداد کی خاطر ظالم کی مخالفت کرنی ہوگی۔ تم بیک وقت ظالم اور مظلوم دونوں سے دوستی کے تعلقات قائم نہیں رکھ سکتے۔ مظلوم سے دوستی کا لازمی نتیجہ ظالم سے ترکِ موالات (دوستی چھوڑ دینا) ہوگا۔ اِس لیے کہ ظالم کا دوست بھی ظالم ہوتا ہے۔ ان کی مسخ شدہ فطرت کی ہم آہنگی، انکے راہ گم کردہ خیالات کی یک جہتی۔ انکے فساد انگیز اعمال کی ہمرنگی، ان میں رشتۂ موالات، دوستی کا علاقہ پیدا کر دیتی ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّي بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (6/129)

اور اس طرح ہم ظالمین کو اُنکے اعمال (کی ہم رنگی کی) وجہ سے ایک دوسرے کا دوست بنا دیتے ہیں۔

دوسرے مقام پر فرمایا:۔

اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ۔ ۴۵/۱۹

اور یقیناً ظالمین ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور اللہ تو متقین کا دوست ہے

اِسی اُصولِ وحدت فی الخیال والعمل (فکر و نظر اور اعمال و افعال کی یکسانیت) کے مطابق قرآن کریم نے تمام نوعِ انسانی کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جو دُنیا میں قوانینِ الہٰیہ کے سامنے سر جھکاتا ہے۔ اور اس طرح اِس زمین پر خدا کی حکومت کا قیام اپنا منتہائے نگاہ قرار دیتا ہے۔ اس گروہ کو تو مومنین کی جماعت 'حزب اللہ' کہا گیا ہے۔ اسکے برعکس دوسرا گروہ کفار کا ہے جو اس نظامِ زندگی کو تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ غیر خدا (طاغوتی) قوتوں کے وضع کردہ دستور و آئین کے ماتحت زندگی بسر کرتا ہے۔ چونکہ ان ہر دو جماعتوں کی فطرت میں تضاد۔ سرشت میں تخالف۔ زاویۂ نگاہ میں تباین۔ ذہنیت میں اختلاف۔ لائحۂ عمل میں افتراق اور منزلِ مقصود میں بُعد المشرقین ہوتا ہے۔ اِس لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ ان دونوں میں باہمی دوستی کے تعلقات استوار ہوں۔ دوستی کے لیے فکر و نظر میں یگانگت۔ قلب و دماغ میں موانست خیال و عمل میں وحدت اور منزلِ مقصو کی یکسانیت ضروری ہے۔ جہاں ان باتوں میں اتحاد و ائتلاف نہ ہو۔ وہاں دوستی کیسی؟ دوستی تو قلبی تعلقات کا نام ہے۔ جب دِل ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہوں تو دِلی تعلقات کس طرح پیدا ہوں۔ کبھی ممکن ہے کہ حکومت کا باغی اور اسکا جانثار سپاہی ایک دوسرے کے دوست ہوں؟ نور اور ظلمت۔ خدا اور شیطان کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ باہمی دوستی کے تعلقات کے لیے قرآن کریم نے تولّٰی کا لفظ استعمال فرمایا ہے، جسکے معنی ہیں بھروسہ کے تعلقات۔ ایک دوسرے پر کامل اعتماد۔ دلی دوستی۔ محبتِ قلبی۔ اور یہ ہیں وہ تعلقات جو ایک مومن کسی غیر مومن سے کسی حالت میں بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ انگریز ہو۔ خواہ ہندو کہ قرآن کریم کے نزدیک

اس باب میں یہ دونوں ایک ہی شق میں شمار ہوتے ہیں۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے فرمایا کہ مومن۔ مومن کا دوست ہوتا ہے۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۹/۷۱

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست (ولی) ہوتے ہیں۔

اور کفار آپس میں ایک دوسرے کے دوست۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ۔ ۸/۷۳

اور کفار ایک دوسرے کے دوست ہیں (اے مسلمانوں) اگر تم نے بھی (باہمی دوستی میں ایسا ہی مسلک اختیار) نہ کیا تو (یاد رکھو) زمین میں عظیم الشان فتنہ و فساد برپا ہو جائے گا۔

اس مقام پر یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ کفار ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں۔ ان کی دوستی میں قدرِ مشترک، وجہِ جامعیت۔ حق کی مخالفت ہوتی ہے۔ ان کے مقابلہ میں اگر مسلمان باہمدگر اُخوت و محبت کے تعلقات نہ رکھیں گے تو دنیا میں فسادِ عظیم برپا ہو جائے گا (اس فساد کا نظارہ آج خود ہندوستان میں دیکھیے جہاں مسلمان مسلمان کی دوستی کے بجائے کفار کی دوستی اختیار کر رہا ہے اور جو اس کے خلاف کہتا ہے اُسے گردن زدنی قرار دے دیتا ہے۔)

یہاں تک تو ہم نے یہ دیکھا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے مومن کا دوست مومن اور کافر کا دوست کافر ہو سکتا ہے۔ لیکن چونکہ دنیا میں حق پرست جماعت (حزب اللہ) کے استحکام و استبقا کے لیے یہ اصول اپنے اندر بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ یہ جماعت غیر مسلموں کی جماعت سے ایسے تعلقات پیدا نہ کرلے اس لیے قرآنِ کریم نے بالکل صاف اور واضح الفاظ میں اس کی ممانعت فرما دی۔ اور متعدد مقامات پر اس کی تکرار سے اس کی اہمیت اچھی طرح ذہن نشین کرا دی۔ فرمایا۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ

وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۔ ۳/۲۸

جو لوگ ایمان والے ہیں انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ مومنوں کو چھوڑ کر کفار سے دوستی کے تعلقات پیدا کریں۔ جس کسی نے ایسا کیا (تو وہ یاد رکھے کہ) اس کا اللہ کے ساتھ کوئی سروکار نہیں رہا۔ بلکہ تمہیں چاہیئے کہ ان سے اپنے بچاؤ کا پورا پورا انتظام کرو۔ اور اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے (کسی اور سے مت ڈرو)۔ اور (انجام کار) اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔

کفار سے دوستی نہ پیدا کرو اور ان کی طرف سے اپنی حفاظت کا پورا پورا بندوبست رکھو اس لیے کہ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۔ ۴/۱۰۱ ۔ یقیناً کفار تمہارے کھلے کھلے دشمن ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی سلیم العقل انسان اپنے کھلے دشمن کو دوست بنا کر اپنی آستین میں سانپ پالنے کی حماقت نہیں کر سکتا۔

اس مقام پر قرآنِ کریم نے کفار کو جماعتِ مومنین کا "کھلا ہوا دشمن" کہا ہے۔ اور متعدد مقامات پر شیطان کو بھی کھلا ہوا دشمن (عدوٌ مبین) قرار دیا ہے۔ کفار اور شیطان میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ دونوں قوانین الٰہیہ سے سرکشی کرنے والے ہیں۔ اس لیے جس طرح کفار ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں۔ کفار اور شیاطین بھی باہمدگر دوست ہوتے ہیں۔

اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۔ ۷/۲۷

یقیناً ہم نے شیاطین کو ان لوگوں کا دوست بنایا ہے جو ایمان نہیں لاتے

اور اگر اپنے آپ کو مومن کہلانے والے حکومتِ خداوندی سے بغاوت کرنے والے شیاطین کی دوستی اختیار کر لیں تو ان کے متعلق ارشاد ہے۔

فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ۭ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۔ ۷/۳۰

(تمہارے دو گروہ ہو گئے) ایک گروہ کو (سیدھی) راہ دکھائی۔ اور دوسرے پر گمراہی ثابت ہو گئی (اسی لیے کہ) ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا دوست بنا لیا۔ بایں

یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ راست پر ہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ یہ کونسا گروہ ہے۔ وہ گروہ جو بزعمِ خویش یہ سمجھتا ہے کہ ہم بالکل راہِ راست پر ہیں۔ گمراہ وہ ہیں جو کفار کی دوستی سے منع کرتے ہیں اور خالصتہً مسلمانوں کی الگ غیر مخلوط جماعت میں باہدگر اخوت و مودت کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہ شیاطین جن سے دوستی رکھنے والوں کے متعلق فرمایا کہ ان پر گمراہی مسلط ہو چکی ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے غیر مسلم جماعتوں کے وہ بڑے بڑے سربرآوردہ لوگ ہیں جو اپنی طاغوتی قوتوں کے بل بوتے پر حکومتِ خداوندی کے قیام کی مخالفت کرتے ہیں اور دینِ الٰہی کا انکار کرتے ہیں۔ مثلاً منافقین کے متعلق فرمایا:۔

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ ۔ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ 2/14

جب یہ لوگ مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ لیکن جب اپنے شیاطین کے ساتھ خلوت میں بیٹھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم دل سے تو تمہارے ہی ساتھ ہیں۔ اُن سے تو ہم تمسخر کرتے ہیں۔

ذرا اپنے گرد و پیش نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ آج کون مسلمانوں کی جماعت سے اس قسم کا عملی تمسخر کرتے ہیں اور کون کفار کے ساتھ خلوت میں بیٹھ کر ان سے کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ ہماری دوستی کے متعلق اس بات سے کبھی بدگمانی پیدا نہ کرو کہ ہم مسلمانوں سے بھی ملتے جلتے ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ 2/16

وہ لوگ جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے۔ لیکن ان کی تجارت انہیں کوئی فائدہ نہ دے گی۔ اور نہ ہی یہ راہِ ہدایت پر رہے۔

یعنی صراطِ مستقیم کو بھی کھو بیٹھے۔ اور جس دنیاوی تجارت کی خاطر کفار کی دوستی اختیار کی تھی وہ بھی کچھ سُودمند ثابت نہ ہوئی (اور عاقبت کا خسارہ اس پر مستزاد ہے) اس لیے کہ یہ جتنا جی چاہے دوستی کا دم بھریں کفار تو انہیں اپنی مطلب براری کے لیے ساتھ رکھتے ہیں اور اسی چیز کی قیمت اُدا کرتے ہیں جب مطلب نکل

جائے گا تو پھر انہیں کون پوچھے گا۔

یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ "منافقین" نبی اکرمؐ کے عہدِ مسعود کی کسی خاص جماعت کا نام تھا۔ بلکہ یہ وہ طبقہ ہے جو ہر زمانے میں موجود رہتا ہے۔ جن کے متعلق فرمایا۔

بَشِّرِ الْمُنَافِقِينَ بِأَنَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ الَّذِينَ يَتَّخِذُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ
مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ أَيَبْتَغُونَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۔ ۴/۱۳۸-۱۳۹

(اے رسول) تم منافقین کو یہ خوش خبری سنادو کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے یعنے وہ لوگ جو مسلمانوں کے سوا کفار کو اپنا دوست بناتے ہیں کیا یہ لوگ کفار کے پاس عزت تلاش کرنے جاتے ہیں؟ اگر ایسا ہی ہے تو یاد رکھیں کہ) عزت جتنی بھی ہے سب کی سب اللہ ہی کے لیے ہے (یعنے اُسی کے قبضۂ اختیار میں ہے۔)

غور فرمایئے اس حقیقت کی طرف کہ یہ لوگ غیروں کے ہاں عزت حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں۔ یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی مسلمان اپنی جماعت کی برومندی اور اسلام کے مستقبل سے (نعوذ باللہ) مایوس ہو جائے اور اپنے اندر اتنی جرأت بھی نہ رکھے کہ علانیہ کفر کا اقرار کرلے۔

مُذَبْذَبِينَ بَيْنَ ذَٰلِكَ لَا إِلَىٰ هَٰؤُلَاءِ وَلَا إِلَىٰ هَٰؤُلَاءِ ۚ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ
فَلَنْ تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا ۔ ۴/۱۴۳

کفر و ایمان کے درمیان متردّد (کھڑے) ہیں نہ تو ادھر ہیں نہ اُدھر۔ (حقیقت یہ ہے کہ) جس پر اللہ راہ گم کر دے (یعنے اس کے قوانین کے مطابق راہِ سعادت گم ہو جائے) تو تم اس کے لیے کوئی راہ نہیں نکال سکتے۔

اسی لیے اس کی ملحقہ آیات میں فرمایا:۔

"مسلمانو! ایسا نہ کرو کہ مسلمانوں کے سوا کفار کو اپنا دوست بنالو کیا تم چاہتے ہو کہ خدا کا صریح الزام اپنے اوپر لے لو۔ بلاشبہ منافق دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں ڈالے جائیں گے۔ اور اُس دن تم کسی کو بھی ان کا رفیق و مددگار نہ پاؤ گے (۴/۱۴۴-۱۴۵)

دیکھا آپ نے! کفار کی دوستی اور منافقت کیسے ساتھ ساتھ جاری ہے۔ پھر جس طرح کفار کے متعلق فرمایا کہ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اسی طرح منافقین کے متعلق بھی فرمایا۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ۔ 9/67

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔

لہٰذا مسلمانوں کو جہاں کفّار کی دوستی سے منع فرمایا ہے وہاں منافقین کی دوستی سے بھی روک دیا۔ اس لیے کہ کفّار اور منافقین میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ آخر الذکر مردم شماری کے رجسٹر میں اپنا نام مسلمانوں جیسا لکھاتے ہیں اور یہی چیز ہے جو دوسروں کے لیے فریب خوری کا موجب بن جاتی ہے چوں کہ قرآن کریم کے سامنے فطرتِ انسانی کا کوئی گوشہ چھپا نہیں اس لیے اس نے منافقین کے ذیل میں اس گروہ کا بھی ذکر کردیا۔ جو ان کے فریب میں آ کر ان سے موالات و محبت کی سفارش کرتا ہے۔ فرمایا۔

"مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم منافقوں کے بارے میں دو فریق بن گئے ہو۔ حالاں کہ اللہ نے ان کی بدعملیوں کی وجہ سے انہیں اُلٹا دیا ہے (اور وہ راہِ حق سے پھر چکے ہیں) کیا تم چاہتے ہو کہ ایسے لوگوں کو راہ دکھا دو جن پر خدا (کے قوانین) نے راہ گم کر دی ہو۔ یاد رکھو جس پر اللہ راہ گم کردے۔ تم اس کے لیے کوئی راہ نہیں نکال سکتے۔ ان منافقین کی دلی تمنا ہے کہ جس طرح اُنہوں نے کُفر کی راہ اختیار کر لی ہے۔ تم بھی کر لو۔ اور تم سب ایک ہی طرح کے ہو جاؤ۔ پس دیکھو۔ جب تک یہ لوگ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں۔ تمہیں چاہیئے کہ ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ۔ اور اگر یہ ایسا نہ کریں تو انہیں گرفتار کرو اور جہاں کہیں پاؤ قتل کرو۔ اور نہ تو کسی کو اپنا دوست بناؤ نہ مددگار" 4/88-89

ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو سمجھ لیجئے کہ منافقین صرف نبی اکرمؐ کے زمانۂ مبارک کے کسی خاص گروہ کا نام نہیں بلکہ یہ لوگ ہر زمانے میں موجود رہتے ہیں اور کُفّار کے ساتھ دوست داری کے تعلقات قائم کرتے ہیں۔ بقول مولانا ابو الکلام صاحب آزاد۔ "کُفر کی طرح نفاق بھی محض عہدِ نزول ہی کی پیداوار نہ تھا ہمیشہ ظہور میں آنے والی گمراہی تھی اور انسان کی گمراہیاں کسی خاص عہد و نسل کی نہیں بلکہ نوعِ انسانی کی گمراہیاں ہوتی ہیں۔"

(ترجمان القرآن ج ۲، ص ۱۳۱) ۲۱

کفار اور منافقین کی دوستی سے منع کیوں کیا گیا۔ اس کی تفصیل سورۃ آل عمران کی ان آیات میں ملیگی

جہاں فرمایا۔

"اے ایمان والو۔ اپنوں کے سوا کسی اور کو اپنا ہمراز و معتمد نہ بناؤ۔ یہ لوگ تمہاری تخریب کیا کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ وہ تمہاری ضرر رسانی کی تمنا رکھتے ہیں (بغض و منصوبے) تو ان کے منہ سے ظاہر ہو جاتے ہیں لیکن جس قدر ان کے دل میں چھپا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ہم آیات تمہارے سامنے ظاہر کر چکے ہیں اگر تم سمجھنے والے ہو تو۔ تم ان لوگوں سے محبت کرتے ہو لیکن وہ کبھی تمہارے ساتھ محبت نہیں رکھتے۔ حالاں کہ تم تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو۔ جب یہ تم سے ملتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم بھی ان باتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور جب تم سے الگ ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف غصہ میں اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کر کھاتے ہیں۔ کہہ دو کہ جاؤ۔ جوشِ غضب میں اپنے آپ کو ہلاک کر لو۔ اللہ دلوں کے حالات سے باخبر ہے۔ اگر تمہارے لیے کوئی بھلائی کی بات ہو جائے تو ان کے لیے موجبِ غم ہو جاتی ہے اور اگر تم پر کوئی مصیبت آجائے تو یہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اگر تم ثابت قدمی سے رہو اور ان سے اپنی حفاظت کرتے رہو تو ان لوگوں کی تدبیریں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گی۔ اللہ ان کے اعمال کو محیط ہے۔" ۳/۱۱۸-۱۲۰

جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں قرآنِ کریم کی رُو سے دنیا میں دوست داری کے تعلقات کے لیے رشتہ صرف ایمان و تقویٰ کا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی رشتہ نہیں۔ ہم وطن ہونا تو ایک طرف اگر کسی مسلمان کا حقیقی بھائی رشتہ ایمان کی بنا پر اسلامی برادری میں شریک نہیں ہوا۔ تو اس سے بھی دوست داری کے تعلقات قائم نہیں کیے جا سکتے۔ فرمایا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۔ ۹/۲۳

اے مسلمانو! اگر تمہارے باپ اور تمہارے بھائی ایمان کے مقابلے میں کفر کو عزیز رکھیں

تو انہیں اپنا دوست مت بناؤ اور جو کوئی ان سے دوستی کے تعلقات قائم کرے گا۔ تو ایسے ہی لوگ ہیں جو ظالم ہیں۔

سورۂ مجادلہ میں فرمایا:-

"تم کبھی ایسا نہ دیکھو گے کہ وہ لوگ جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں ان لوگوں سے دوستی کے تعلقات قائم کرنے لگیں جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں۔ خواہ وہ ان کے اپنے باپ۔ اپنے بھائی اور اپنے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ (اولٰئک) وہ لوگ ہیں جن کے دل میں اللہ نے ایمان کو نقش کر دیا ہے۔ اور وہ اپنی رحمت (روح) سے ان کی مدد کرتا ہے۔ اور انہیں ان باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ جس میں یہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان لوگوں سے راضی ہو گیا اور یہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ یہ لوگ ہیں۔ اللہ کی جماعت (حزب اللہ) اور یاد رکھو کہ کامیابی صرف اللہ کی جماعت کے لیے ہے۔" 58/22

قرآنِ کریم نے ملّتِ اسلامیہ کے موسسِ اوّل حضرت ابراہیمؑ کے مسلک و مشرب کو مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے۔ یہ حکم کس مقام پر ہے غور فرمائیے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ. كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ 60/4

مسلمانو۔ تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں ایک بہترین نمونہ ہے جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور جن کی تم۔ اللہ کو چھوڑ کر۔ پرستش کرتے ہو۔ بیزار ہیں ہم تمہارے ساتھ (ہر قسم کے تعلقات سے) انکاری ہیں۔ ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے بغاوت اور بغض ظاہر ہے۔ جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔

آپ نے غور فرمایا کہ غیر مسلموں سے دوستداری کے تعلقات قائم کرنے کے لیے شرط کیا ہے؟ حتّٰی تؤمنوا باللہ یعنے جب تک ایک کافر و مشرک اسلام لا کر جماعتِ مومنین میں داخل نہیں ہو جاتا۔ اس سے دوستی کے تعلقات قائم

نہیں کئے جا سکتے۔ چنانچہ سورۂ توبہ میں مشرکین کے متعلق فرمایا۔

فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ .. ۹/۱۱

اگر یہ لوگ (اپنے کفر و شرک سے) توبہ کرلیں۔ اور نماز قائم کریں۔ اور زکوٰۃ ادا کریں تو پھر یہ تمہارے دینی بھائی ہو جائیں گے۔

اس لیے کہ:-

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ۔ ۵/۵۵

اے مسلمانو! تمہارے دوست تو صرف اللہ۔ اس کا رسول۔ اور وہ جماعتِ مسلمین ہے جو نماز قائم کرتے ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور (ہر حال میں) اللہ کے حضور جھکے ہوئے ہیں۔

بس یہ ہے ایک شکل غیر مسلموں سے مودّت و مواخات۔ تولّی اور دوست داری کی۔ یعنے وہ اسلام قبول کریں اس میں مشرک، کافر، یہود، نصاریٰ، سب داخل ہیں۔ جب تک یہ لوگ اسلام قبول نہ کریں ان سے دوستی کے تعلقات قائم نہیں کیے جا سکتے۔ فرمایا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۔ ۵/۵۱

اے ایمان والو۔ یہود اور نصاریٰ کو اپنا دوست مت بناؤ۔ وہ باہمدگر ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور تم میں سے جو شخص ان سے دوستی قائم کرے گا تو وہ بھی انہی میں کا ایک ہو جائیگا یقیناً اللہ ظالمین کو راہِ ہدایت نہیں دکھاتا۔

اس لیے کہ ان کا اور جملہ کفار کا شیوہ، حق کی مخالفت اور قوانینِ الٰہیہ کی تضحیک و استہزا ہے۔ فرمایا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا وَلَعِبًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاءَ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۵/۵۷

اے ایمان والو۔ اہلِ کتاب اور کفار جن کا شیوہ یہ ہے کہ وہ تمہارے دین سے استہزاء کرتے

ہیں۔ انہیں کبھی اپنا دوست نہ بناؤ۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اگر تم مومن ہو تو۔

سورۂ فاتحہ میں دو جماعتوں کا ذکر ہے جو ایک دوسرے سے بالکل متمیّز ہیں۔ ایک وہ جنہیں "منعم علیہ" کی جماعت کہا گیا ہے۔ یعنے وہ جن پر اللہ کے انعام و اکرام کی بارش ہے۔ دوسری وہ جن پر اللہ کا غضب نازل ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم کے دیگر مقامات میں ان دونوں جماعتوں کی تفصیل و تشریح موجود ہے۔ پہلی جماعت اللہ پر ایمان رکھنے والوں کی اور دوسری کفار کی ہے۔ اس لیے ایسے لوگوں سے دوستی کے تعلقات قائم کرنے سے بالتصریح روک دیا گیا ہے۔ فرمایا

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ تَوَلَّوۡا قَوۡمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡؕ مَا هُمۡ مِّنۡكُمۡ وَلَا مِنۡهُمۡۙ وَيَحۡلِفُوۡنَ عَلَى الۡكَذِبِ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ۔ 58/14 (نیز دیکھو 60/13)

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو ایسے لوگوں سے دوستی پیدا کرتے ہیں جن پر اللہ نے اپنا غضب نازل کر رکھا ہے۔ ایسے لوگ نہ تم میں سے ہیں۔ نہ اُن میں سے۔ اور وہ دیدہ دانستہ جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں (کہ وہ تم میں سے ہیں)۔

سورۂ انعام میں یہودیوں کے متعلق فرمایا کہ یہ لوگ کفار کی دوستی اختیار کرتے ہیں اس لیے کہ ان پر خدا کا عذاب مسلّط ہے۔ اگر یہ اسلام قبول کر لیتے تو کبھی کفّار کو دوست نہ بناتے۔

"تم دیکھو گے کہ ان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کفر کرنے والوں سے دوست داری کے تعلقات قائم کرتے ہیں۔ کیا ہی بُری بات ہے جو ان کے نفسوں نے ان کے لیے تیار کر دی ہے کہ ان پر خدا کا غضب ہوا اور وہ عذاب میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اور اگر یہ لوگ اللہ پر۔ اس کے رسولؐ اور جو کتاب اس پر نازل ہوئی ہے اس پر ایمان رکھتے تو (کفار کو) اپنا دوست نہ بناتے لیکن ان میں سے اکثر فاسق ہیں" 5/80-81

اور قرآنِ کریم ایک مردِ مومن کے صحیح ایمان و عمل کا تو معیار ہی یہ قرار دیتا ہے کہ وہ ثابت کرے کہ اس کے دل میں خدا۔ رسول اور اپنی جماعت مسلمین کے علاوہ کسی اور کی محبت کا شائبہ تک نہیں۔ فرمایا۔

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تُتۡرَكُوۡا وَلَمَّا يَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ جَاهَدُوۡا مِنۡكُمۡ وَلَمۡ يَتَّخِذُوۡا مِنۡ

دُونِ اللّٰهِ وَلَا رَسُولِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِیْنَ وَلِیْجَةً ؕ وَاللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۔ ۹/۱۶

کیا تم سمجھتے ہو کہ تم یونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے حالاں کہ ابھی اللہ نے یہ تو آزمایا ہی نہیں کہ تم میں سے کون میدانِ جہاد میں پورا اترتا ہے۔ اور اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے سوا کسی اور کو اپنا دلی دوست نہیں بناتا۔ اور اللہ کو تمہارے اعمال کی خبر ہے

قرآنِ کریم کی یہ نصوصِ صریحہ آپ کے سامنے ہیں۔ ان سے آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ غیر مسلموں کی دوستی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے۔ اور وہ حکم کس تاکید اور شدت سے ہے۔ یہ بھی آپ نے دیکھ لیا کہ یہ حکم عام کفار کے متعلق ہے۔ کفار کی کسی خاص جماعت سے متعلق نہیں۔ وہ کفار جو مسلمانوں کے خلاف عملاً جنگ و قتال میں مصروف ہوں۔ اور وہ جو اس طرح مصروف نہ ہوں۔ سب کے سب ان احکام میں شامل ہیں۔ کفار، حکومتِ خداوندی کے باغی ہیں اور یہ نہیں ہو سکتا کہ خدا کا کوئی وفادار بندہ ایسے باغیوں سے دوستی کے تعلقات پیدا کرے ان کے ساتھ دوستی کی شرط صرف ایک ہے یعنے (حتّٰی تؤمنوا باللّٰہ) کہ وہ اسلام قبول کر کے مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جائیں۔ اگر یہ شرط پوری نہیں ہوتی خواہ وہ مسلمانوں کے باپ بھائی، اور عزیز رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر وہ کفر کو ایمان پر ترجیح دیتے ہیں۔ (اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِیْمَانِ) تو ان سے کبھی دوستانہ تعلقات قائم نہیں کیے جا سکتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآنِ کریم نے ان کفار کا بھی ذکر کیا ہے جو مسلمانوں سے عملاً برسرِ پیکار ہوں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے تذکرہ سے مقصود یہ ہے کہ دوستی کے تعلقات کی ممانعت صرف انہی کفار سے ہو۔ عام کفار سے نہیں۔ ایسا سمجھنا قرآنِ کریم کے ان تمام مقامات سے آنکھیں بند کر لینا ہے، جن میں اس حکم کی تعمیم ہے (اور جنہیں ہم اوپر دیکھ چکے ہیں) سورۂ ممتحنہ میں ہے۔

لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْۤا اِلَیْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۔ ۶۰/۸

جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ان کے بارے میں اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان کے ساتھ احسان و مروّت (برہ)

اور عدل و انصاف (قسط) کا سلوک کرو۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا۔

إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَن تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ 60/9

اللہ تمہیں ان لوگوں سے دوستی کے تعلقات پیدا کرنے سے روکتا ہے جو تمہارے ساتھ دین کے معاملہ میں لڑے ہوں اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکال دیا ہو۔ یا جنہوں نے ان لوگوں کی مدد کی ہو جنہوں نے تمہیں جلا وطن کیا ہے۔ اس لیے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا وہ ظالمین سے ہوگا

اس آیت کو اگر باقی قرآن کریم سے الگ ہٹا کر دیکھا جائے تو یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ دوستی کے تعلقات کی ممانعت صرف ان کفار سے ہے جو محارب ہوں (یعنی جنہوں نے مسلمانوں سے جنگ کی ہو) لیکن جو شخص اس آیت کو دیگر آیاتِ متعلقہ سے ملا کر پڑھتا ہے۔ وہ کبھی اس شبہ میں نہیں پڑ سکتا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں تمام کفار سے (بلا تخصیص اس امر کے کہ انہوں نے عملاً قتال کیا ہو یا نہ) دوستی کے تعلقات سے منع کیا گیا ہے۔ ان احکام کی موجودگی میں صرف اس ایک آیت سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ دوستی کے تعلقات صرف ان کفار سے ممنوع ہیں جنہوں نے قتال کیا ہو۔ یؤمنون ببعض الکتاب ویکفرون ببعض (قرآن کے ایک حصہ پر ایمان اور دوسرے سے کفر) کی عملی تفسیر ہے۔ اگر دوستی کی ممانعت کا حکم صرف ان کفار تک محدود ہوتا جو برسرِ پیکار رہوں تو جس وقت یہ لوگ جنگ سے باز آ جاتے اور صلح کر لیتے تو ان سے پھر دوستداری کے تعلقات پیدا کر لیے جا سکتے تھے لیکن قرآنِ کریم تو دوست داری کے تعلقات قائم کرنے کے لیے صرف ایک شرط ٹھہراتا ہے اور وہ یہ کہ یہ لوگ ایمان لا کر تمہاری جماعت میں شامل ہو جائیں (حتّٰی تؤمنوا باللّٰہ)۔ اپنے کفر و شرک سے باز آ کر مسلمان ہو جائیں (فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ فاخوانکم فی الدین۔ 9/11) اور یہ ظاہر ہے کہ تیغ و تفنگ توپ اور بندوق کی لڑائی تو ان جذباتِ بغض و عناد کا محسوس و مشہود مظاہرہ ہے جو عام کفار کے دلوں میں اسلام کے خلاف موج زن رہتے ہیں۔ ورنہ وہ کونسا غیر مسلم ہے جو مسلمانوں کا دشمن نہیں ہے۔ جب قرآن کریم کا یہ کھلا ہوا ارشاد موجود ہو کہ ان الکٰفرین کانوا لکم عدوا مبینا 4/101 (یقیناً تمام کفار تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں) تو پھر

دوستی کے معاملہ میں محارب وغیر محارب کفار کی تخصیص اگر قرآن کی کھلی ہوئی مخالفت نہیں تو اور کیا ہے۔ آیت مندرجہ بالا (۱۹۷) میں امتناعِ دوست داری کے حکم کی تاکید کی ہے۔ اور اس قسم کی مثالیں قرآن کریم میں اور مقامات پر بھی ملتی ہیں۔ مثلاً فرمایا:-

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۔ (۱۹۷)

اور (ایامِ) حج میں تو عورتوں کی طرف رغبت کرنا جائز ہے۔ نہ کوئی گناہ کی بات اور نہ لڑائی جھگڑا۔

اب اگر کوئی شخص اس آیت سے یہ نتیجہ اخذ کرے کہ فسق و فجور اور باہمی جنگ و جدل سے ممانعت صرف ایامِ حج میں ہے باقی سارا سال بے شک یہ کچھ کرتے رہو۔ تو سوائے اس کے کہ آپ ایسے شخص کی بصیرت کا ماتم کریں اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس آیت کو قرآن کریم کے دیگر احکام متعلقہ کے ساتھ ملا کر دیکھنا ہوگا۔ یا مثلاً سورۃ ممتحنہ کی کی یہی آیت (۶۰/۸) جس میں یہ ارشاد ہے کہ اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ جن لوگوں نے تمہارے ساتھ جنگ و قتال نہ کیا ہو ان سے نیکی اور احسان اور عدل و انصاف کا سلوک کرو۔ تو اس سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جنگ و قتال کرنے والوں سے عدل و انصاف نہیں کرنا چاہیئے۔ ان سے بے انصافی اور ظلم کرنا چاہیئے۔ لیکن یہ نتیجہ اس صورت میں نکلتا ہے کہ آپ اس آیت کو باقی قرآن سے الگ ہٹا کر دیکھیں۔ اگر آپ اس آیت کو آیتِ ذیل سے ملا کر پڑھیں تو مطلب صاف ہو جاتا ہے۔ فرمایا:-

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۔

کسی قوم سے دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو کہ وہ تقویٰ سے بہت قریب ہے۔

اب ان آیات کو ملا کر پڑھنے سے واضح ہو گیا کہ:-

(۱) عدل و انصاف کا حکم تمام انسانوں سے ہے۔ خواہ وہ ہمارے بدترین دشمن ہی کیوں نہ ہوں۔

(۲) احسان و مروّت کی اجازت ان غیر مسلموں سے ہے جو عملاً جنگ میں مصروف نہ ہوں۔

(۳) دوستی اور مودّت کے تعلقات کسی غیر مسلم سے جائز نہیں۔ عام اس کے کہ وہ عملاً شمشیر بکف تمہارے مقابل ہوں یا نہ۔

اس کے بعد آپ خود فیصلہ فرما لیجئے کہ آج یہ فتویٰ دینا کہ انگریز کی دوستی تو حرام ہے کہ اس نے تمہارے خلاف لڑائیاں کی ہیں۔ لیکن ہندو کی دوستی عین اسلام ہے کہ اس نے تمہاری خوں ریزی نہیں کی ہے۔ اگر قرآن کریم سے کھلی ہوئی بغاوت نہیں تو اور کیا ہے۔ اور تماشا یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک جنگ صرف وہی جنگ ہے جس میں تلوار کی دھار سے خون بہایا جائے۔ اگر ایک قوم شمشیر و سنان کی مدد کے بغیر اپنی سازشوں اور فریب کاریوں سے دوسری قوم کا تمام خون پی جائے تو اس قوم کو گلے لگائے رکھنا چاہیئے اور اپنا بہترین دوست سمجھنا چاہیئے! قرآنی حقائق سے آنکھیں بند کر لینے کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ انسان میں اتنی عقلِ سلیم بھی باقی نہ رہے کہ وہ ایسی کھلی ہوئی حقیقت کو پہچان سکے۔ سچ فرمایا ہے قرآن کریم نے کہ:-

فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (۲۲/۴۶)

ان لوگوں کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینہ کے اندر ہیں۔

یوں تو اس قسم کا فتویٰ دینے والے حضرات میں سے ہر ایک کی حالت قابلِ رحم ہے لیکن ہمیں سب سے زیادہ افسوس مولانا آزاد پر ہے کہ وہ یہ سب کچھ دیدہ و دانستہ کر رہے ہیں۔ اور یوں قوم کو "جہنم" میں لے جانے کے سب سے بڑے ذمہ دار ہیں۔ آپ سورۂ توبہ کے حواشی میں فرماتے ہیں:-

"اس سورت میں جا بجا اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ دشمنوں سے رفاقت و اعانت کے رشتے نہ رکھو اگرچہ وہ تمہارے قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں اور دوسری سورتوں میں بھی ایسے ہی احکام موجود ہیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ اور اس طرح کے تمام احکام، احکامِ جنگ میں سے ہیں نہ کہ معیشت و علائق کے تمام احکام اور یہ بات خود قرآن نے جا بجا اس درجہ وضاحت اور قطعیت کے ساتھ واضح کر دی[1] ہے کہ شک اور تردد کی ذرا بھی گنجائش نہیں رہی۔

جہاں تک ایک انسان کے دوسرے انسان کے ساتھ معاملہ کرنے کا تعلق ہے۔ قرآن کہتا ہے' اصل اس باب میں محبت و شفقت ہمدردی و سلوک اور تعاون[2] و سازگاری[3] ہے اس کے سوا

---

[1] مولانا صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کون سے مقامات ہیں جہاں اس امر کی وضاحت اور قطعیت درج ہے

[2] ہر معاملہ میں تعاون نہیں بلکہ صرف بِرّ و تقویٰ کے معاملہ میں تعاون (تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔ منہ)

[3] سازگاری سے اگر مراد دوستی ہے تو یہ غلط ہے۔ دوستی صرف مسلمانوں کے ساتھ جائز ہے۔ کفار کے ساتھ نہیں۔ منہ

کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ وہ کہتا ہے[1] ہر انسان دوسرے انسان کا بھائی ہے خواہ اس کا ہم وطن ہو یا نہ ہو۔ ہم نسل ہو یا نہ ہو۔ ہم عقیدہ[2] ہو یا نہ ہو اور امتیاز[3] و تفرق کی وہ تمام باتیں جو اس انسانی بھائی چارگی کا رشتہ قطع کرتی ہیں خدا کی طرف سے نہیں ہیں خود انسانوں کی گھڑی ہوئی معصیت اور گمراہی ہے۔ پیغمبرِ اسلام کی دعاؤں میں سب سے زیادہ اعتراف اسی حقیقت کا ہوتا تھا کہ "اِنِّیْ اَشْھَدُ اَنَّ الْعِبَادَ[4] کُلَّھُمْ اِخْوَۃٌ" (مسلم) خدایا! میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے تمام بندے آپس میں بھائی بھائی ہیں!

لیکن جب تمام ملک و قوم نے اس دعوت کو بزورِ شمشیر نابود کر دینے کا فیصلہ کر دیا اور پیروانِ دعوت پر محض اختلافِ عقائد کی بنا پر ظلم و ستم کرنے لگے تو قدرتی طور پر جنگ کی حالت پیدا ہو گئی۔ اب دو فریق ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے۔ ایک فریق مسلمانوں کا تھا جو اپنا بچاؤ کر رہا تھا۔ دوسرا دشمنوں کا تھا جو حملہ آور تھا۔ پس ایسی حالت میں ناگزیر ہو گیا کہ دوستوں اور دشمنوں میں صاف صاف امتیاز ہو جائے۔ جو دوست ہیں وہ دشمنوں کے کیمپ سے کسی طرح کا تعلق نہ رکھیں جو دشمن ہیں وہ دوستوں سے کسی طرح کی سازش نہ کر سکیں۔ قرآن میں جس قدر احکام عدمِ موالات کے ہیں وہ سب اسی صورتِ حال سے تعلق رکھتے ہیں اور اس سورت کی آیت (۲۳) بھی اسی سے متعلق ہے۔

اصل اس باب میں سورۂ ممتحنہ کی یہ آیات ہیں جو ایک ایسے ہی معاملہ کی نسبت نازل ہوئی تھیں:

"خدا تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ ان مشرکوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور انصاف کے ساتھ پیش آؤ جنہوں نے دین کے بارے میں تم سے لڑائی نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ خدا تو تمہیں صرف ان لوگوں کی رفاقت و سازگاری سے روکتا ہے

---

[1] کہاں کہتا ہے؟ شاید بنی آدم ہونے کی جہت سے مولانا صاحب نے ایسا کہہ دیا ہو۔ ورنہ قرآن میں تو ایسا کہیں نہیں کہا گیا۔

[2] یہ غلط ہے۔ اسی سورۂ توبہ کی گیارہویں آیت میں ہے کہ مشرک صرف اس صورت میں تمہارا دینی بھائی بن سکتا ہے جب وہ کفر و شرک سے توبہ کر کے اسلام لے آئے۔ مولانا صاحب ہندوؤں سے سلسلۂ مواخات قائم کرنے کی تڑپ میں یہ کچھ بھی بھول گئے۔ منہ

[3] کفر و ایمان کا امتیاز اگر اللہ تعالیٰ کا قائم کردہ نہیں تو اور کس کا ہے۔ مولانا صاحب اسے "معصیت اور گمراہی" قرار دے رہے ہیں۔ استغفر اللہ۔ منہ

[4] یہاں عباد سے مراد، عباد الرحمٰن (اللہ کے بندے) ہی ہو سکتا ہے۔ عبد الطاغوت اور عبد الرحمٰن دونوں بھائی کیسے ہو سکتے ہیں جب کہ قرآن کریم میں حصر کے ساتھ موجود ہے کہ انما المومنون اخوۃ۔ مومن باہم ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ مومن اور کافر بھائی کیسے ہو سکتے ہیں۔

جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی کی ہے (یعنی محض اس لیے کہ تم نے ان کا
دین چھوڑ کر ایک نیا دین اختیار کر لیا ہے، تم پر حملہ کر دیا ہے) اور ظلم و ستم کر کے تمہیں
تمہارے گھروں سے نکالا ہے۔ نیز تمہیں جلا وطن کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے
پس جو کوئی ایسے لوگوں میں رفاقت و سازگاری رکھے گا تو ایسے ہی لوگ ہیں جو ظلم کرنے والے
ہیں!" 9:60 (متن پہلے درج کیا جا چکا ہے)

اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ قرآن میں جہاں کہیں مسلمانوں کو مشرکینِ عرب یا یہود و نصاریٰ کی موالات سے روکا گیا ہے تو اس سے مقصود صرف وہی جماعتیں تھیں جنہوں نے مسلمانوں سے محض اختلافِ دین کی بنا پر قتال کیا تھا اور جن کے ظلم و ستم نے مسلمانوں کو ترکِ وطن پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ تمام مشرکینِ عرب یا یہود و نصاریٰ سے ترکِ علائق کا حکم دے دیا گیا ہو اور ظاہر ہے کہ قرآن کا یہ حکم کیوں کر ہو سکتا ہے جب کہ اس کی دعوت سرتاسر انسانی اخوت[1] و مساوات کی دعوت اور عمومِ شفقت و احسان[2] کا عالمگیر پیام ہے۔" (ترجمان القرآن جلد دوم ص 145-146)

آپ نے ملاحظہ فرمایا ان ٹکڑوں کو کہ

(1) "قرآنِ کریم میں جس قدر احکامات عدم موالات کے ہیں وہ سب اسی صورت حالات سے تعلق رکھتے ہیں۔"

(2) "قرآن میں جہاں کہیں مسلمانوں کو مشرکینِ عرب یا یہود و نصاریٰ کی موالات سے روکا گیا ہے تو اس سے مقصود صرف وہی جماعتیں تھیں جنہوں نے مسلمانوں سے محض اختلافِ دین کی بنا پر قتال کیا تھا۔"

یعنی مولانا صاحب نے قرآنِ کریم کے تمام احکامات متعلقہ امتناعِ موالاتِ کفار کو صرف ان لوگوں سے مخصوص کر دیا ہے جنہوں نے مسلمانوں سے قتال کیا ہو۔ محض اس لیے کہ ہندو کے ساتھ دوستی کا جواز پیدا ہو جائے۔ ہم یہ لکھ رہے ہیں اور ہماری نگاہ ان پیشانیوں پر ہے جن پر مولانا صاحب کے خلاف اس الزام

[1] انسانی اخوت اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب دو انسانوں میں ایمان وجہ جامعیت ہو۔ منہ

[2] شفقت اور نرمی اور دوست داری کے تعلقات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ منہ

کی وجہ سے کئی شکن پڑ رہے ہیں جو زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ یہ انتہائی بدگمانی ہے اور بہت زیادتی!

لیکن ذرا صبر کیجئے اور خود مولانا صاحب کی زبان سے سن لیجئے کہ عدم موالات کے احکام صرف ان کُفار تک محدود ہیں جنہوں نے قتال کیا ہو۔ یا ان کے علاوہ دیگر کفار پر بھی ان کا اطلاق ہوتا ہے۔ ترجمان القرآن کی مندرجہ صدر عبارت مولانا صاحب کے دَورِ قومیت پرستی کی بصیرتِ قرآنی کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس دَور سے پیشتر آپ ان آیات کے متعلق وہی کچھ سمجھتے تھے جو ہم نے لکھا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔ الہلال بابت ۹/۱۹ اپریل ۱۹۱۳ء کے صفحہ ۲۲۲ پر آپ نے کفار کے ساتھ تعلقات کی بحث چھیڑی ہے۔ پہلے آیت (۸/۶۰) "لا ینھٰکم اللہ ...... الآخر" سے قرآنِ کریم کے نرمی و رافت کے احکام سے بحث کی ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ جب دوسری قوم مسلمانوں کی تخریب کے درپے ہو تو "پھر اسی قرآن کا جس نے گذشتہ آیات میں احسانِ عام اور محبتِ عمومی کا حکم دیا تھا، یہ حکم ہے۔" اس کے بعد دوسری آیت (۹/۶۰) "انّما ینھٰکم ..... الآخر" نقل فرمائی ہے اور پھر کفار سے جنگ و قتال کا ذکر ہے۔ اس باب میں تحریر ہے۔

> "اور غور کرو کیسی سخت وعید ان کے لیے فرمائی جو ان عیسائیوں سے رسم و راہِ دوستی اختیار کریں جنہوں نے مسلمانوں سے مقابلہ کیا ہے۔ فرمایا کہ ایسے لوگوں کا شمار بھی ان ہی عیسائیوں کے ساتھ ہوگا۔"

یہاں تک تو صرف ان کفار کا ذکر تھا جنہوں نے مسلمانوں سے قتال کیا ہو۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:۔

> "اور متعدد مقامات میں عام طور پر دشمنانِ حق و اسلام کی نسبت فرمایا:۔
> مسلمانوں کو چاہیئے کہ اپنے برادرانِ دینی کو چھوڑ کر کفار کو اپنا دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کریگا تو پھر اس سے اور خدا سے کوئی سروکار نہیں۔" ۳/۲۸ (الہلال میں آیات کا متن بھی دیا گیا ہے لیکن چونکہ ہم متن پہلے لکھ چکے ہیں اس لیے صرف ترجمہ لکھا گیا ہے)

پھر فرماتے ہیں:۔

> "اتنا ہی نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کے لیے جو دینِ الٰہی کی کسی نہج پر بھی مخالفت کرتے ہوں۔ یا شعائرِ الٰہیہ کی تضحیک و تمسخر جن کا شیوہ ہو اور احکامِ اسلامی کی ہنسی اُڑانے پر

(جیسا کہ آجکل ملاحدۂ مسلمین اور متفرنجین مارقین و مفسدین کا شیوہ ہے) یہ حکم صاف سورۂ مائدہ میں نازل فرمایا۔

مسلمانو! ان لوگوں کو اپنا دوست نہ بناؤ جو تمہارے دین کے ساتھ ہنسی اور تمسخر کرتے ہیں اور گویا اسے ایک کھیل سا بنا لیا ہے۔ جب تم نماز کے لیے اذان دیتے ہو تو یہ نماز کا تمسخر اُڑانا شروع کر دیتے ہیں (۵۷-۵۸۔ الہلال میں متن بھی موجود ہے)۔

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس بارے میں اصولی طور پر اسلام کی تعلیم کیا ہے۔"

دیکھ لیا آپ نے۔ ۱۹۱۳ء میں لکھا جاتا ہے کہ محارب کفّار کے علاوہ "عام طور پر تمام دشمنانِ حق و اسلام سے دوستی کے تعلقات منع ہیں۔ ان سے بھی "جنہوں نے تمہارے خلاف تلوار اٹھائی ہے" اور ان سے بھی جو دینِ الٰہی کی کسی نہج پر بھی مخالفت کرتے ہوں"۔

اور ۱۹۳۶ء کی اس تفسیر میں جو "موتی نگر کانگریس کیمپ۔ لکھنؤ" (ترجمان القرآن جلد دوم ص۴۰۸) سے شائع ہوئی ہے۔ تحریر فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں "جس قدر احکامات عدم موالات کے ہیں وہ سب ان کفّار سے متعلق ہیں جنہوں نے مسلمانوں سے جنگ کی ہو۔"

کیا تحریفِ قرآنی کی اس سے بڑھ کر روشن مثال اور بھی ہو سکتی ہے؟ اور کیا اس کے بعد یہ کہنا بدگمانی اور زیادتی ہے کہ مولانا صاحب آج دیدہ دانستہ محض ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے۔ قرآنِ کریم کو اس قدر مسخ شدہ صورت میں پیش کر رہے ہیں۔ اور آیاتِ قرآنی کی ایسی "تاویل" کر رہے ہیں جو قرآنِ کریم کی واضح اور بیّن تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ اس تعلیم کے خلاف جس کے (۱۹۱۳ء میں) یہ خود سب سے بڑے داعی تھے۔ حیرت ہے کہ مولانا صاحب کا سیاسی مسلک کیا بدلا انہوں نے سارا قرآن ہی بدل ڈالا

زمن بر صوفی و ملّا سلامے که پیغام خدا گفتند مارا
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت خدا و جبرئیل و مصطفےٰ را

اقبالؒ

مولانا صاحب نے ۱۹۱۳ء میں "اولیاء اللہ و اولیاء الشیطان" کے عنوان سے ایک مبسوط

مقالہ تحریر فرمایا تھا۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے مضمون کا خاتمہ اس مضمون کے مختصر سے اقتباسات سے کریں جن سے آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ "کفر دوستی" کے متعلق جو کچھ ہم نے سمجھا ہے اصولی طور پر یہی کچھ کبھی مولانا صاحب سمجھا اور سمجھایا کرتے تھے۔ ہم نے یہی لکھا ہے کہ قرآنِ کریم نوعِ انسانی کو دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک مسلمانوں کی جماعت اور دوسری غیر مسلموں کی جماعت۔ مولانا صاحب فرماتے ہیں۔

"قرآنِ کریم کے تدبر و مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق و باطل۔ ایمان و کفر۔ نور و ظلمت۔ تعلقِ علوی و رشتہ سفلی۔ اور اعمالِ صالحہ اور کاروبارِ مفسدہ و سیئہ کے اختلاف کے اعتبار سے دو بالکل متضاد اور باہمدگر مخالف گروہ دنیا میں ہمیشہ سے ہوتے چلے آئے ہیں اور جب کبھی حق و باطل کا معرکہ گرم ہوتا ہے تو انہی دو جماعتوں کی قطاریں ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا ہوتی ہیں۔ قرآنِ حکیم نے مختلف ناموں سے ان دونوں جماعتوں کا ذکر کیا ہے اور جا بجا ان کے آثار و علائم اور خواص و اعمال کی تشریح کی ہے۔ مثلاً ۳۲ سے زیادہ مقامات میں ایک ایسی جماعت کا ذکر کیا گیا ہے جس نے اپنے دلوں کو حق کے قبول کے لیے مستعد کر لیا ہے اور جو اپنی تمام قوتوں اور جذبوں سے اللہ اور اس کی صداقت کو چاہنے والی اور پیار کرنے والی ہے اور اس لیے اللہ نے اسے اپنا دوست اور ساتھی بنا لیا ہے۔ اس جماعت کو اولیاء اللہ کے لقب سے پکارا گیا ہے یعنی وہ خدا کے دوست ہیں اور اس کے چاہنے والوں کے گروہ میں داخل ہیں......... لیکن اس جماعت کے مقابلے میں ایک دوسری جماعت ہے جو اپنے خواص و اعمال میں بالکل اس کی ضد اور مخالف واقع ہوئی ہے۔ قرآنِ کریم اسے اولیاء الشیطان سے تعبیر کرتا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں وہ تمام قوتیں جو تعلقِ الٰہی اور رشتۂ حق و صداقت کی مخالف ہیں شیطانی قوتیں ہیں اور ان میں ہر قوت اور ہر عمل شیطانِ لعین کا ایک مظہرِ خبیث ہے۔ پس جو لوگ حق و صداقت کی راہِ روشن سے ہٹ کر اعمالِ باطلہ کی تاریکی میں گم ہو گئے ہیں اور اللہ کا رشتہ ان کے ہاتھوں میں نہیں ہے وہ خواہ کسی حال اور کسی شکل میں ہوں لیکن درحقیقت شیطان کے ولی۔ اس کے پرستار۔ اس کی نسل کے چاکر اس کی بادشاہت کے غلام ہیں......... پس ایک طرف تو اولیاء اللہ ہیں ، اور

دوسری طرف اولیاء الشیطان۔

اولیاء الشیطان کے بھی مثل اولیاء اللہ کے مختلف مدارج و مراتب ہیں۔ آخری مرتبہ درجۂ کفر ہے اور اس کا سب سے بڑا اصل واشقیٰ گروہ "الکافرین" کا ہوتا ہے۔ یہ دونوں جماعتیں ہمیشہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا رہتی ہیں اور باہم معرکۂ جنگ و قتال گرم رہتا ہے ....
اولیاء اللہ اور اصحاب الجنہ کا مقصد دعوتِ خدا کی بادشاہت اور اس کا کلمۂ علیا ہوتا ہے۔ پس وہ خدا کے حکموں کو بیان کرتے اور اس کے پاک اور مقدس اوامر کے ترجمان ہوتے ہیں۔ اولیاء الشیطان کی چیخ و پکار اور جدوجہد کا مقصد شیطانی حکومت ہوتا ہے ..... پس مومن اور اللہ کا ولی وہی ہے جو شیطان کے ولیوں کو قتل کرے اور ان کے فساد و طغیان سے ارضِ الٰہی کو پاک کردے کیوں کہ اس کے ایک ہی آقا اور خداوند نے حکم دیا ہے۔

فَقَاتِلُوٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ ۔ اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفًا ۔ ۴/۵۸

شیطان کے دوستوں اور پجاریوں کو قتل کردو شیطان کے مکر و فساد خواہ کتنے ہی قوی اور مہیب نظر آئیں لیکن اللہ کے ولیوں کے سامنے بالکل ہی ضعیف و بے طاقت ہیں۔

اور ایسا کرنا قتل و خوں ریزی نہیں بلکہ عین صلح و اصلاح اور امن و نظام ہے۔ کیونکہ فساد و ظلم کے روکنے کے لیے جو شخص خون بہاتا ہے وہ اپنا حقیقی مُصلح اور محسن ہے کیوں کہ اس نے ایک جماعت کا خون بہا کر تمام عالم کو زندگی بخش دی اور جو شخص ظلم و فساد کو زندگی بخشتا ہے وہی دنیا کا دشمن اور انسانیت کا عدو ہے۔ کیونکہ چند انسانوں کی خاطر تمام انسانوں سے دشمنی کر رہا ہے۔"

(الہلال ۱۵ و ۲۲ جولائی سنہ ۱۹۱۴ء)

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ مولانا صاحب کے فہم قرآن کے مطابق:۔

(۱) دنیا میں ہمیشہ سے دو گروہ ایسے چلے آتے ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل متضاد

اور باہمدگر مخالف ہیں

(۲) ایک گروہ مسلمانوں کا ہے اور دوسرا گروہ کافرین کا۔

(۳) مومنین کا گروہ خدا کو دوست رکھتا ہے۔ اور کافرین کا گروہ خواہ وہ کسی حال اور کسی شکل میں ہو شیطان کا دوست ہوتا ہے۔

(۴) یہ دونوں گروہ ہمیشہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہوتے ہیں۔ (ہمیشہ کا لفظ قابلِ غور ہے۔ یعنے خواہ شمشیر و سنان کی خوں ریز جنگ ہو یا کفار کی طرف سے مکر و حیل کی خاموش لڑائی)۔

(۵) جماعتِ مومنین کا مقصد حکومتِ الٰہی کا قیام اور جماعتِ کفار کا نصب العین قوانینِ الٰہیہ کے مقابلہ میں غیر خدا قوتوں کے نظامِ حکومت کا تسلط ہے۔

(۶) چوں کہ ان ہر دو جماعتوں کا طریقِ فکر و نظر اور لائحہ عمل و منزلِ مقصود بالکل ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ اس لیے حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لیے اس مخالف جماعت کی تخریب نہایت ضروری ہے خواہ اس کے لیے خوں ریزی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔

(۷) جب حالت یہ ہے تو ظاہر ہے کہ ان دونوں جماعتوں میں کسی صورت میں بھی دوستی کے تعلقات قائم نہیں ہو سکتے۔

لیکن یہ مولانا صاحب ہیں دَورِ قومیت پرستی سے پہلے کے۔ مسلکِ قومیت پرستی کے بعد کے مولانا صاحب کے نزدیک

(۱) یہ دونوں گروہ ایک دوسرے سے اس انداز سے مل سکتے ہیں کہ ان میں باہمی امتیاز و تفریق کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی اور یوں ایک متحدہ قومیت کی تخلیق ہو جاتی ہے۔

(۲) دو انسانوں کے بھائی بھائی بننے کے لیے صرف ان کا ابنِ آدم ہونا کافی ہے۔ نور و ظلمت، حق و باطل۔ ایمان و کفر کا فرق اس بھائی چارگی کے راستے میں قطعی حائل نہیں ہوتا۔

(۳) نورِ حق اور صداقت کسی خاص مذہب یا جماعت کا حصہ نہیں بلکہ "عالمگیر سچائیاں"
تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔

لہٰذا (۴) عام کفار سے دوستی کے تعلقات کی قطعاً ممانعت نہیں۔ صرف ان سے ممانعت ہے
جو مسلمانوں سے جنگ و قتال کریں۔

اور

اس تمام "تدبر فی القرآن" کا منشاء جو "موتی نگر کے کانگریس کیمپ" میں بیٹھ کر کیا گیا ہے۔ فقط اتنا کہ کسی طرح ہندوؤں کی دوستی کا جواز قرآن سے ثابت کر دیا جائے۔

یہ ہے ایک عالم کی وہ لغزش جس سے نبی اکرمؐ نے پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی تھی۔ اور یہ ہے ایک ایسے لیڈر کی رہنمائی جس کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ۚ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۝ (۱۴: ۹-۲۸)

"کیا تم نے ان لوگوں کی حالت نہیں دیکھی جنہیں اللہ نے (علم و فضل) کی نعمت عطا فرمائی تھی۔ مگر انہوں نے کفرانِ نعمت سے اسے بدل ڈالا (بے جا استعمال کیا) اور یوں اپنی قوم کو ہلاکت کے جہنم میں لے گرے۔ جس میں وہ جا داخل ہوئے۔ اور وہ کیا ہی برا ٹھکانہ ہے۔"

[illegible]
[illegible]
فتاوی از مقام کبریائی
[illegible]

طلوعِ اسلام
ستمبر ۱۹۳۹ء

کانگریس بے نقاب

ہم شروع سے لکھتے چلے آرہے ہیں کہ:-

(۱) متحدہ قومیت کی تشکیل کے لیے ضروری ہے کہ وہ دو یا دو سے زیادہ مختلف قومیں جو اس متحدہ قومیت کے عناصرِ ترکیبی ہوں. ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہو جائیں کہ انہیں کوئی وجہ امتیاز باقی نہ رہے. ان کی تہذیب، تمدن نظریاتِ زندگی فلسفۂ حیات. زاویۂ نگاہ بایں نمط ایک ہوجائیں کہ:-

تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

(۲) چونکہ مسلمان دنیا میں ایک مستقل اور مخصوص نظریۂ زندگی اور فلسفۂ حیات کے قائل ہیں. جسے ضابطہ خداوندی کہا جاتا ہے اور جو اُن کی تہذیب اور تمدن کا سرچشمہ ہے اسلیے وہ بجائے خویش ایک مستقل قوم (حزب اللہ) ہیں، لہذا نہ تو مسلمان کسی متحدہ قومیت کا جزو بن سکتے ہیں. اور نہ ہی کوئی غیر مسلم اُن کی جماعت کا رکن بن سکتا ہے، تا وقتیکہ وہ اسلام لاکر اُن میں کا ایک نہ ہو جائے.

اور

(۳) موجودہ تحریکِ آزادی سے ہندوؤں کا مقصد محض اتنا ہے کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کی ملی خصوصیات کو مٹا کر ملک میں "رام راج" قائم کرلیا جائے. اپنے ان دعاوی کے ثبوت میں ہم بارہا ہندو کانگریسی زعماء کی تقریروں اور تحریروں کے اقتباسات ان صفحات پر پیش کر چکے ہیں جن میں یہ حقیقت چھلک کر سطح پر آجاتی رہی ہے. لیکن ہمارے مسلمان قومیت پرست

حضرات اکثر یہ کہہ کر اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکے میں رکھنے کی کوشش کرتے رہے، کہ یہ خواہ مخواہ کی بدگمانی ہے چونکہ ہمارے دعاوی اس فراست قرآنی پر مبنی تھے جو ایک مسلمان کے لیے دنیا کے ہر گوشہ میں بہترین راہ نما ہو سکتی ہے اس لیے ہمیں یقین تھا کہ حالات خود بخود بتا دینگے کہ ہمارا مسلک بدگمانی پر مبنی ہے یا حقیقت پر۔ الحمدللہ کہ اس باب میں ہمیں زیادہ دیر تک زحمت کشِ انتظار نہیں ہونا پڑا۔ اور واقعات اس تیزی سے بڑھتے آرہے ہیں کہ جلسے پہ حقیقت خود بخود بے نقاب ہوتی جا رہی ہے، اور قومیت پرست حضرات میں سے اکثر و بیشتر اتنا محسوس کرنے لگ گئے ہیں کہ تحریکِ آزادی کی "نیلم پری" محض ایک دھوکا ہے جس کی آڑ میں ہندو راج کے منصوبے پرورش پا رہے ہیں۔ ذیل میں ہم آچاریہ کرپلانی، جنرل سکریٹری آل انڈیا کانگرس کمیٹی۔ کا ایک مبسوط بیان شائع کرتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ موجودہ تحریکِ آزادی سے کانگریس کا مفہوم کیا ہے۔ اس بیان پر ہم اپنی طرف سے کوئی تنقید نہیں کرینگے۔ بلکہ اسکے بعد ایک ایسے اخبار کا تبصرہ من وعن شائع کر دیں گے، جو اپنے مسلکِ قومیت پرستی میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ اس بیان اور تبصرے کے مطالعہ کے بعد خود اس نتیجہ پر پہونچ جائینگے کہ ہمارے مسلم قومیت پرست حضرات تحریکِ آزادی کے فریب میں قوم کو تباہی اور بربادی کے کس جہنم کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہے ہیں۔

بیان آچاریہ کرپلانی

گاندھی جی نے زندگی کا کوئی ایسا فلسفیانہ نظام پیش نہیں کیا ہے جو منطقی حیثیت سے مکمل ہو لیکن پھر بھی انھوں نے سیاست و معاشرت کا جو خاکہ تیار کیا ہے اسکے تمام اجزا ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ ان تمام اجزاء کا بنیادی اصول ایک ہی ہے۔ اور ان سب میں زبردست اتحاد پایا جاتا ہے۔ ان اجزاء کو نہ تو بنیادی اصولوں سے جدا کیا جا سکتا ہو

اور نہ باہم ایک دوسرے سے اُنکا جو تعلق ہے اُسے توڑا جا سکتا ہے۔ اور اگر ایسا کیا جائیگا تو سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اگر ہم گاندھی جی کے بتلائے ہوئے بُنیادی اصُولوں کو نہ مانیں تو پھر ہمارے کام کا سارا پروگرام بے رُوح ہو کر رہ جائے گا۔ علی ہٰذا القیاس اگر ہم اصُول کو تو مانیں، لیکن اُس کے ساتھ جو پروگرام وابستہ ہے اُسکے مختلف اجزا کے باہمی ربط کو نہ مانیں تب بھی ہم پروگرام کی اہمیت کو زائل کر دینگے اس لیے وہ لوگ جو کانگرس کے پروگرام کو تو مانتے ہیں، لیکن اُس سیاسی عقیدہ کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں جس پر گاندھی جی نے کانگرس کے پروگرام کی بُنیادیں قائم کر رکھی ہیں، وہ درحقیقت نہ تو کانگریس کی حالیہ تاریخی ترقی سے واقف ہیں۔ اور نہ یہ جانتے ہیں کہ گاندھی جی کے فلسفۂ حیات (آئڈیالوجی) نے کانگریس میں کیا مرتبہ حاصل کر لیا ہے۔ ایسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اب کانگرس صرف ایک ایسی سیاسی جماعت ہی نہیں ہے۔ جو مُلک کو پردیسی اقتدار سے آزاد کرنا چاہتی ہے۔ بلکہ یہ ہماری معاشرت کی موجودہ حیثیت کو بھی بالکل بدل ڈالنا چاہتی ہے اور اس کی بُنیاد ایک بالکل نئے فلسفہ پر رکھنا چاہتی ہے، جب تک گاندھی جی کا اثر کانگرس پر غالب نہیں ہوا تھا۔ اُسوقت تک کانگرس کے لیڈروں کا خیال یہ تھا کہ کانگرس کو صرف سیاست کے دائرہ میں محدود رکھنا چاہیئے۔ اُن لوگوں کا خیال تھا کہ ہماری سیاسی غلامی کو ہماری معاشرتی حالت سے براہِ راست کوئی بُنیادی تعلق نہیں ہے۔ اسی لیے ان لیڈروں نے یہ طے کیا تھا کہ کانگرس کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ معاشرتی اصلاح کے کاموں میں دخل دے۔ وہ اسے بالکل سیاسی جماعت رکھنا چاہتے تھے۔ اُس زمانہ میں یہ ممکن تھا کہ مختلف معاشرتی نظریہ رکھنے والے انسان سیاسی حیثیت سے ایک محاذ پر جمع ہو جائیں۔ گویا ان لوگوں نے زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا،۔ ایک سیاسی زندگی اور دوسری معاشرتی زندگی ـــــ لیکن گاندھی جی نے آ کر اس اصول کو توڑ دیا۔ انھوں نے پُرانے ڈاکٹروں کی تشخیص کو غلط قرار دے کر یہ بتلایا کہ ہماری سیاسی غلامی کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جسے ہم اپنی اخلاقی، روحانی، اور

معاشرتی زندگی سے جُدا کرسکیں، اس لیئے ہماری سیاسی جدوجہد کو معاشرتی، اخلاقی اور رُوحانی جدوجہد کے ساتھ وابستہ ہونے کی سخت ضرورت ہے۔"

گاندھی جی نے کانگرس کو یہ بتلایا کہ ہمارا کام صرف یہی نہیں ہے کہ مُلک کی سیاسی باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھ سے چھین کر اہلِ مُلک کے ہاتھ میں دیدیں، بلکہ سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اپنی تمام جدّوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ زندگی پر رکھیں جس کے دائرہ میں ہماری معاشرت، اخلاق اور رُوحانیت سب کچھ داخل ہو، بالفاظِ دیگر، ہماری تحریک کو صرف سیاسی ہی نہ ہونا چاہیئے بلکہ اُسے رُوحانی اور اعلیٰ فلسفۂ زندگی کے ماتحت ہونا چاہیئے تاکہ اس جدوجہد سے نہ صرف ہماری سیاسی زندگی ہی متاثر ہو بلکہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ اس سے متاثر و متغیر ہو اور ہماری زندگی کا ایک بالکل نیا باب شروع ہو جسے ہم تاریخ کا ایک نیا دَور کہہ سکیں۔

زندگی کا یہی وہ نیا باب اور نیا دَور ہے جسے گاندھی جی کانگریس کے ذریعہ ہندوستان میں لانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ اِس میں بڑی دقتیں ہیں۔ لیکن ان تمام دقتوں کے باوجود گاندھی جی کی کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ اس جامع انقلاب کو کانگرس کے ذریعہ رُونما کیا جائے۔"

اس انقلاب کی اہمیّت کو سمجھ لینے کے بعد یہ بالکل ناممکن ہے کہ ہم گاندھی جی کے بتلائے ہوئے عقیدہ ——— یعنی عدم تشدد اور صداقت یا اہنسا اور ستیہ ——— کو تو نہ مانیں لیکن کانگریس کے پروگرام کو قابلِ عمل سمجھیں، اسلئے کہ یہ عقیدہ اور پروگرام دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جکڑے ہوئے ہیں جس طرح جانور کی ٹانگ اُسکے جسم کے ساتھ یا درخت کی شاخیں اس کی جڑ کے ساتھ۔ اگر آپ جڑ کو کاٹ دیںگے تو شاخیں کہاں رہینگی؟ جس چیز کو آپ پروگرام کہتے ہیں وہ دراصل اِسی عقیدہ ہی سے تو نکلا ہے۔

ہم سے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ چرخہ، کھادی، دیہات سدھار، اور اچھوت ادھار کو سیاسی

انقلاب سے کیا تعلق. لیکن اگر ہم مذکورہ بالا امور کو پیش نظر رکھیں تو پھر یہ سوال نہیں کریں گے. کانگرس کے لیئے یہ ناممکن ہے کہ سیاسی لحاظ سے اس کی رائے کچھ اور ہو، اور معاشرتی اعتبار سے کچھ اور، سیاست و معاشرت دونوں کے متعلق کانگرس کا نقطۂ نظر ایک ہونا چاہیئے.

ستیہ اور اہنسا یا صداقت و عدم تشدد ایک قسم کی مذہبی اصطلاحیں ہیں. لیکن ہمیں ان اصطلاحوں کو قوم کی زندگی کے ہر شعبہ میں بروئے عمل لانا ہے، رُوحانی اصول زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوتے ہیں، انہیں زندگی کے کسی ایک پہلو سے متعلق کر کے باقی پہلوؤں کو اُن سے بے نیاز کرنا ناممکن ہے. خلاصہ یہ کہ گاندھی جی نے ہماری زندگی کے عملی کام کا جو پروگرام پیش کیا ہے، ہمیں صرف اسی کو چلانا ہوگا.

ان باتوں کو سمجھ لینے کے بعد ہندو مسلم اتحاد کے سوال کو سمجھ لینا بے حد آسان ہے، گاندھی جی نے ہمیں یہ سمجھایا ہے کہ اس سوال کو حل کرنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ہم مسلمانوں کو وعاتیں، نشستیں اور سیاسی حقوق دیدیں یا مُسلم عوام کے ساتھ براہِ راست رابطہ پیدا کرنے کی اسکیمیں چلا کر کانگریس کے رجسٹر میں مُسلم ممبروں کی تعداد بڑھالیں.

گاندھی جی جس رابطۂ عوام کو چاہتے ہیں وہ اس طرح حاصل نہیں ہوسکتا. اسکا ذریعہ صرف یہ ہے کہ صداقت و انصاف کے ساتھ نہ کہ لین دین کے محض سیاسی جذبہ کے ساتھ اکثریت رکھنے والا فرقہ ہر ساعت اقلیت والے فرقہ کی خدمت کرے. ہندو مسلمانوں کے درمیان نفرت و بداعتمادی کے بہت قدیم اور تاریخی اسباب ہیں. ان اسباب کو نہ تو رعایتوں اور معاہدوں سے دُور کیا جا سکتا ہے اور نہ مسلمانوں کو کانگرس کا ممبر بنا کر ہی اُن کو رفع کر دینا ممکن ہے. اگر نفرت و بداعتمادی کے ان اسباب کو رفع کیئے بغیر مسلمانوں کو کانگرس کا ممبر بنا لیا جائے، تو وہ کانگرس کے اندر ایک لانیحل مسئلہ بن جائینگے لیکن مسلمانوں کا کانگرس کے باہر رہ کر

ایک لانیحل مسئلہ بنا رہنا اِتنا بُرا نہیں ہے جتنا بُرا یہ ہے کہ وہ کانگرس میں آکر کانگرس کے اندر عقدۂ لانیحل بن جائیں۔ اِس لیئے گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد کا جو طریقہ اختیار کر رکھا ہے وہی سب سے بہتر طریقہ ہے۔ جو اُنکے بنیادی اُصول یعنی عدم تشدّد اور صداقت پر مبنی ہے +

بہرحال اسوقت تک ہم نے جو کچھ کہا ہے اُس سے یہ بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ کانگرس کے عقیدہ اور پروگرام میں باہم گہرا تعلق ہے۔ نیز اسکے تمام مختلف پروگرام بھی ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں جیسے جسم کے ساتھ اعضائے جسم۔ اِس لیئے کسی ایک پروگرام کو دوسرے پروگرام سے جُدا کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی ذی رُوح جسم کے اعضاء کو چیر پھاڑ کے جدا جُدا کرنا +

عقیدہ اور پروگرام کا یہ اتحاد ہی دراصل گاندھی جی کے فلسفۂ حیات کا دوسرا نام ہے۔ یہ فلسفہ اپنی صفات کے لحاظ سے انقلابی ہے۔ لیکن اِس انقلاب میں تشدّد کا ذکر کہیں نہیں آتا۔ اس انقلاب کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ہم زندگی کو دیکھنے کا نیا نقطۂ نظر پیدا کریں۔ اور ہر چیز پر ایک بالکل نئی حیثیت سے نظر ڈالیں یا ایک رُوحانیت پرست کی زبان میں یوں کہیئے کہ ہم چیزوں کی ابدی و سرمدی حقیقت کو معلوم کریں اور پھر اپنی زندگی کو اسکے مطابق ڈھالیں +

لیکن تمام اُصول اور پروگرام بیکار ہیں تاوقتیکہ انکو چلانے والی عملی شخصیت موجود نہو یہ شخصیت دراصل غیر محسوس اصولوں اور پروگراموں کا محسوس مجسّمہ ہوتی ہے۔ آج کل اِس قسم کی شخصیت صرف گاندھی جی کی شخصیت ہے اسلیئے اگرچہ اُن کی بعض اسکیمیں بظاہر موجودہ زمانہ کے لحاظ سے نامناسب نظر آئیں لیکن پھر بھی ان میں عجیب و غریب طاقت ہوتی ہے۔ گاندھی جی کا فلسفہ ایک مکمل انقلابی فلسفہ ہے جو حقیقتوں اور سچائیوں پر مبنی ہے وہ ہماری ساری زندگی کو ایک بالکل نئے سانچے میں ڈھال دینا چاہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ وہی گاندھی جو ایک زمانہ میں کونسلوں میں جانے کا شدید مخالف تھا۔ اب نہ صرف کونسلوں میں جانیکا حامی ہے، بلکہ عہدے قبول کرنے کے حق میں بھی ہے۔ اور پھر اس کی پھرتی ملاحظہ کیجئے کہ جیسے ہی کانگرسیوں نے وزارت کی کرسیاں سنبھالیں۔ اُس نے فوراً ہی اسکیمیں پیش کرنا

شروع کر دیں ——— شراب کی بندش کی اسکیم، تعلیم کی ایک بالکل نئی اسکیم۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ کانگرس کی ہر اسکیم گاندھی جی کے فلسفہ کے ماتحت چلائی جائیگی۔ یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ آپ کسی اسکیم کو کسی اور فلسفۂ زندگی کے اصول پر چلا سکیں۔ کانگرسی اسکیموں کا قلم کسی اور فلسفہ پر نہیں لگایا جا سکتا یا فلسفۂ زندگی دُنیا کے کسی اور فلسفۂ زندگی کا ماتحت نہیں بنایا جا سکتا۔ علیٰ ہذا القیاس سوشلسٹوں کو بھی یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ سوشلزم اور گاندھی ازم بالکل جُدا جُدا چیزیں ہیں جن میں کوئی مطابقت پیدا نہیں کی جا سکتی۔

بہر حال گاندھی جی کا فلسفۂ زندگی ایک ایسا مکمل فلسفہ ہے۔ جس سے اجتماعاً قوم بھی صحیح رہبری حاصل کر سکتی ہے اور فرداً فرداً اشخاص بھی اِس سے سیدھا راستہ پا سکتے ہیں اُصول اور پروگرام دونوں ایک ہی ہیں۔ اِس لیئے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم کانگرس کے فلاں پروگرام کو تو مانتے ہیں۔ لیکن اُس کے فلاں اُصول کو نہیں مانتے، کیونکہ گاندھی جی کے اصول و پروگرام میں ذی رُوح جسم کے مختلف اعضا کا سا تعلق ہے۔ یہ دونوں ایک ہی چیزیں ہیں اور دونوں مِلکر قوم سے ایک خاص نوع کی زندگی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اسی مطالبہ کی روشنی میں تعلیم کا نیا نظام ترتیب دیا گیا ہے۔ چرخہ، کھادی، دیہات سُدھار، اچھوت اُدھار، ہندو مسلم اتحاد وغیرہ وغیرہ سب ایک ہی اصول کے ماتحت ہیں۔ اور جب تک اس اصول کو نہ سمجھا جائے ان چیزوں کی اصلیت، نیز ان سب کے باہمی ربط کو سمجھنا مشکل ہے۔ اِس ایک ہی اصول کے پیشِ نظر گاندھی جی نے تعلیم کی ایک نئی اسکیم تیار کی ہے۔ اِس تعلیم کے ذریعہ بچّوں کو گاندھی جی کی نئی سوسائٹی میں اپنی جگہ پیدا کرنے کے لیئے تربیّت کیا جائے گا۔ اِس نئی سوسائٹی کی ضروریات کے مطابق بچّوں کی ذہنیت کو ڈھالا جائے گا۔ بنا بریں تعلیم کی اسکیم کو گاندھی کے سیاسی و معاشرتی پروگرام کا سنگِ بنیاد سمجھنا چاہیئے"۔

تبصرہ اخبار مدینہ ۱۷ مورخہ ۱۷

مقالہ افتتاحیہ | صفحہ ۴ پر آچاریہ کرپلانی جنرل سکریٹری آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا جو مضمون شائع کیا جا رہا ہے، وہ کانگرس کے تقریباً ۹۵ فیصدی ممبروں کے نقطۂ نظر کی صحیح ترجمانی کرتا ہے اِس مضمون میں جو کچھ کہا گیا ہے اُسکا خلاصہ یہ ہے کہ :-

(۱) آج سے پہلے کانگرس صرف ایک سیاسی جماعت سمجھی جاتی تھی۔ مگر جب سے گاندھی جی کا اثر اس پر غالب ہوا ہے، یہ صرف سیاسی جماعت نہیں رہی، بلکہ اُسکا دائرۂ عمل اخلاق، معاشرت اور روحانیات سب پر حاوی ہو گیا ہے۔ اب کانگرس، گاندھی جی کی رہنمائی میں ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں ایک انقلاب بپا کر دینا چاہتی ہے۔

(۲) یہ انقلاب ہماری زندگی کو بالکل اُسی طرح بدل دیگا، جس طرح فرانس اور روس کے انقلاب نے وہاں کی ہر چیز کی قدر و قیمت اور ہر رسم و رواج کی نوعیت و حیثیت کو یکسر متغیر کر کے رکھ دیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کانگرس اس انقلاب کو تشدّد سے نہیں، عدم تشدّد سے لانا چاہتی ہے۔

(۳) گاندھی جی ہم کو ایک نئی زندگی اور ایک نئی سوسائٹی سے رُوشناس کرنا چاہتے ہیں اور اِس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے مختلف موانع کے باوجود انھوں نے کانگریس کو منتخب کیا ہے۔

(۴) اِس انقلاب کا عملی نمونہ وہی ہے جو ہمیں گاندھی جی کی زندگی میں نظر آتا ہے۔

(۵) کانگرس کے ہر ممبر کے لیے ضروری ہے کہ وہ گاندھی جی کے فلسفۂ زندگی کو دنیا کے تمام دوسرے فلسفہ ہائے زندگی سے بہتر سمجھے۔ اور کانگرس کے پروگرام کو گاندھی جی کے فلسفہ کی روشنی میں دیکھے۔ جو شخص ایسا نہیں کر سکتا وہ کانگرس کا ممبر نہیں بن سکتا۔

(۶) گاندھی جی کے فلسفۂ زندگی اور اُنکے عملی پروگرام میں ایک ذی رُوح جسم کے مختلف اعضاء کا سا تعلق ہے۔ اس لیے یہ ناممکن ہے کہ آپ صرف پروگرام کو مانیں اور اُصول کو نہ مانیں یا ان میں سے کسی ایک جزو کو مانیں اور دوسرے کو نہ مانیں۔ بہ الفاظِ دیگر: جو شخص گاندھی جی کے فلسفۂ زندگی کو نہیں مانتا، یعنی سیاست، معاشرت اور اخلاق و روحانیات وغیرہ کے متعلق اُنکا جو نقطۂ نگاہ ہے۔ اُس کی نظری یا عملی کسی شکل کو بھی کُلاً یا جزءً صحیح تسلیم نہیں

کرتا، وہ سچا کانگرسی نہیں بن سکتا۔

(۷) علیٰ ہذا القیاس وہ لوگ بھی سچے کانگرسی نہیں ہیں جو صرف سیاسی آزادی کے مقصد میں کانگرس سے متحد ہیں۔ لیکن تمدّنی، معاشرتی، اخلاقی اور رُوحانی نظریوں میں گاندھی جی سے اختلاف رکھتے ہیں۔

(۸) ہم نہیں چاہتے کہ جب تک مسلمان ان باتوں کو نہ مانیں کانگرس میں داخل ہوں اسلئے کہ ابتک تو وہ کانگرس کے باہر ہمارے لیے مصیبت بنے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر اپنے موجودہ عقائد ہی کے ساتھ وہ کانگریس میں داخل ہوگئے تو پھر کانگریس کے اندر ہمارے لیے اِس سے کہیں زیادہ مصیبت بن جائیں گے۔

(۹) گاندھی جی نے وزارتیں قبول کرنے کا مشورہ صرف اسلئے دیا ہے تاکہ اپنے نقطۂ نظر کے مطابق وہ ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب بپا کرسکیں، تعلیم کی جدید اسکیم اس انقلاب کا پہلا دروازہ ہے۔ اس اسکیم کے ذریعہ نئی نسل کی ذہنی تربیت گاندھی جی کے فلسفۂ زندگی کے مطابق کی جائیگی۔

اتحاد کے بجائے ادغام

یہ تمام باتیں مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول ہوں یا نہ ہوں لیکن اِس میں شک نہیں کہ آجکل قومی اتحاد و یکرنگی کا جو نظریہ ہے اُس کی رُو سے ان کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔ آپ نیشنلزم کے قائل ہوں یا سوشلزم کے، دونوں صورتوں میں آپ کا یہ عقیدہ ہونا چاہیئے کہ ہندوستان کے تمام فرقوں کے فلسفۂ زندگی کی کم ازکم بنیاد ایک ہو گاندھی جی یہی چاہتے ہیں، اور چونکہ وہ ہندو ہیں اور ہندو بھی نہایت پُرجوش و راسخ العقیدہ قسم کے، اسلئے قدرتاً اُن کی خواہش ہے کہ اس فلسفۂ زندگی کی بنیاد ہندو فلسفہ، ہندو تاریخ، اور ہندو روایات پر ہو، اُردو کے مقابلہ میں ہندی کو فروغ دینے کی جو دیوانہ وار کوششیں اُنھوں نے کیں اور کر رہے ہیں وہ اسی خواہش کا نتیجہ ہیں۔ اچھوتوں کو ہندوؤں میں شامل کرنے کے لیے انھوں نے اپنی جان پر کھیل جانیکی جو دھمکی دی تھی اس کی تہ میں بھی صرف یہی تمنّا کام کر رہی تھی اور اب ودیا مندر اسکیم اور واردھا

اسکیم کے نام سے تعلیم کی جو اسکیمیں تیار کی گئی ہیں۔ اُن میں بھی یہی آرزو چھپی ہوئی ہے۔
لیکن ہم اس آرزو کو کسی بدنیتی، خباثت، یا شرارت پسندی پر محمول نہیں کر سکتے۔ گاندھی جی ایمانداری سے جس چیز کو صحیح سمجھتے ہیں، اُسے رائج کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے اِس سلسلہ میں گاندھی جی کو بُرا بھلا کہنا صحیح نہیں ہو سکتا۔ البتہ ہم کو یہ غور کرنا چاہیئے کہ اِن حالات میں مسلمانوں کا سیاسی رویہ کیا ہونا چاہیئے۔ یعنی آیا وہ ہندوستان کے دوسرے فرقوں کے ساتھ اس طرح مل جل جانا چاہتے ہیں کہ یہاں جاپان وجرمنی کی طرح ایک قوم پیدا ہوجائے یا وہ اپنی تہذیبی اور معاشرتی خصوصیتوں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر:۔ آیا آپ ہندوؤں کے ساتھ اتحاد واشتراک چاہتے ہیں یا ادغام وانضمام بھی۔

کچھ دن ہوئے، راقم الحروف نے اِن خطرات کو حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں پیش کر کے اُن سے دریافت کیا تھا کہ:۔

> مسلمان کانگرس میں صرف حصولِ آزادی کے مقصد میں ہندوؤں کے ساتھ اشتراک کرنے کے لیے داخل ہوئے ہیں، وہ نیشنلزم یا سوشلزم کے یورپی نظریوں کے قائل ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن آج نیشنلزم یا سوشلزم کا کھلا ہوا پرچار ہو رہا ہے، جس سے عام دماغ قدرتاً متأثر ہوتے ہیں، ایسی صورت میں مسلمانوں کا طرزِ عمل کیا ہو۔ آیا وہ کانگرس میں رہ کر اس قسم کے خیالات کی تردید کریں یا اُن پر سکوت اختیار کریں لیکن تردید کرنا بے سود ہے۔ اور سکوت کرنا مضر۔ پھر علاج کیا ہو ___؟

اس پر مولانا نے ارشاد فرمایا تھا کہ:۔

"دفاعی قومیت اسلام کے منافی نہیں، البتہ ہجومی رجارحانہ قومیت اسلام کے منافی ہے، مگر اسوقت ہماری جدّوجہد میں سوال ہجومی قومیت کا نہیں بلکہ دفاعی قومیت کا ہے۔ یعنی اسوقت ہمارے سامنے ہندوستان کو غاصبوں کے چنگل

سے نجات دلانے کا سوال ہے سو اس امر میں مسلمان کو ہندوؤں کے ساتھ ایک
قوم بنکر وفاع کی کوشش سے پرہیز نہ کرنا چاہیئے۔ اس قسم کی قومیت اسلامی
توسع کے خلاف نہیں۔ مسلمان کو صاف طور سے یہ اعلان کر دینا چاہیئے۔ اور اس
اعلان کو ہر در و دیوار پر نقش کر دینا چاہیئے۔ کہ وہ ہندویت میں جذب ہونے
کے لیئے ایک لمحہ کے واسطے بھی تیار نہیں۔ بحیثیت مسلمان کے اُن کی جو تہذیبی
خصوصیات ہیں ان کو وہ نہ صرف باقی رکھیں گے، بلکہ اُن کو ترقی دینگے۔ کانگریس
میں شریک ہونے اور مُلک کی آزادی کی جد و جہد میں حصہ لینے کے یہ معنی ہرگز
نہیں ہیں کہ مسلمان اپنی کسی ایک ملّی خصوصیت کو بھی چھوڑ دیں"۔

لیکن کرپلانی جی کے مذکورہ بالا اعتراف اور گاندھی جی اور اُنکے پرستاروں کے مسلسل عمل کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ مولانا کے اِن خیالات سے بالکل متفق نہیں ہیں۔

مولانا نے یہ بھی فرمایا تھا کہ :۔

"ہمیں اسوقت مستقبل کا پورا نقشہ ترتیب نہ دینا چاہیئے، بلکہ صرف راستہ کے پتھر ہٹانے
چاہئیں، یہ نہ سوچنا چاہیئے کہ پانی جو آرہا ہے وہ اپنا رُخ کدھر بنائے گا اور کون سا
راستہ اختیار کرے گا۔ اس چیز کو مستقبل پر چھوڑ دینا چاہیئے"۔

چنانچہ جو مسلمان کانگریس میں شامل رہے انھوں نے حصولِ آزادی کے سوا باقی اور تمام باتوں کو چھوٹی چھوٹی باتیں سمجھ کر نظر انداز کیا۔ لیکن اُسکا نتیجہ یہ ہُوا کہ آزادی کا سوال تو ہنوز ایک اُمیدِ بعید بنا ہُوا ہے۔ البتہ زندگی کا نقشہ روز بروز تیار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اور ہر ہندوستانی کے دماغ پر اس نقشہ کے نقوش منقش کیئے جا رہے ہیں، بالخصوص وزارتوں کے قبول کے بعد تو یہ کام کافی تیزی کے ساتھ جاری ہو گیا ہے۔ اس لیئے اب بھی مسلمانوں کا "صرف راستہ کے پتھر ہٹاتے رہنے" پر اکتفا کرنا اپنی ملّی ہستی کو فنا کے گھاٹ اُتارنے کے مترادف ہوگا۔

ہندو مسلم کشیدگی کا سبب کون ہے ؟

گاندھی جی نے ایبٹ آباد میں ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ

"مجھے اپنے باپ کا وہ زمانہ یاد آتا ہے جب راجکوٹ کے ہندو اور مسلمان آپس میں
شیر و شکر رہتے تھے اور ایک دوسرے کی خانگی تقریبات اور شادی بیاہ کی رسوم میں
حقیقی بھائیوں کی طرح شریک ہوتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ زمانہ پھر آئے گا۔"

لیکن گاندھی جی کتنے ہی بھولے نہیں، وہ اس حقیقت کو جھٹلانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے کہ انکے باپ زمانہ کے خوشگوار دنوں کو بدل کر ہندو مسلم اتحاد کو ہندو مسلم کشیدگی میں تبدیل کرنے کی زبردست ذمہ داری خود گاندھی جی پر عائد ہوتی ہے گاندھی جی نے کوشش کی کہ ہندوؤں کی قدیم معاشرت و تصورات کو زندہ کیا جائے اور پھر مسلمانوں سے اشتراک کے بجائے ادغام کا مطالبہ کیا جائے گا۔ گاندھی جی کے باپ کے زمانہ میں سیاست و معاشرت کو گڈمڈ کر کے یہ کوشش نہیں کی جاتی تھی کہ ہندو *مسلمان سب ایک ہی فلسفۂ زندگی کی اتباع کریں۔ اس زمانہ میں یہ کوشش نہ ہوتی تھی کہ چونکہ اُردو میں عربی فارسی کے الفاظ زیادہ ہیں۔ اس لیے اسے چھوڑ کر "ہندی اتھوا ہندوستانی" بولو، نہ اُس زمانہ میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ چونکہ فلاں لباس یا فلاں طریق بود و ماند مسلمانوں کا لایا ہوا ہے اسلئے اُسے ترک کرو، اس زمانہ کی کانگرس کے پنڈال میں "بھومنالہ" کے اندر "تپّوں پہ زُسولی پیرو سینے" کی کوشش نہیں ہوتی تھی ——— غرض اُس زمانہ میں اُن باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی نہ تھی۔ جو گاندھی جی کے طفیل سے اب پیدا ہوگئی ہیں۔ اور ابھی کیا ہے

شور و شغب کی راتوں کو ہمسائے تنہا رہے کیا روئیں
ایسے ویسے کتنے اُٹھیں گے میر جی تم جو سلامت ہو

کیا ہو؟

سوال یہ ہے کہ اِن حالات میں مسلمانوں کا رویّہ کیا ہو؟ یہ تو ظاہر ہے کہ مسلمان کانگرس میں اس لیے نہیں گئے ہیں کہ آچاریہ کرپلانی کے بیان کے بموجب گاندھی جی کے فلسفۂ زندگی کو دُنیا کے تمام دوسرے فلسفوں پہ ترجیح دیکر اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کریں۔

* ہندو مسلم اتحاد و اتفاق صرف اس لئے تھا کہ اُس زمانہ میں

اُنکا مقصد ہندوں کے ساتھ صرف سیاسی اشتراک ہے لیکن اسوقت مطالبہ ہے، سیاسی معاشرتی اور تہذیبی ادغام کا۔ آج کل کانگرس کی جدوجہد صرف یہی ہے۔ صرف اسی وجہ سے اُڑیسہ اور سی پی میں مُسلمان وزیر لینے سے انکار کیا گیا۔ اور اسی بنا پر مشترک انتخاب کو رائج کرنیکی کوشش ہے اسی طرح اور بہت سی باتیں ہورہی ہیں جنکی بنیاد صرف اس تصوّر پر ہے کہ مسلمانوں کی جُداگانہ تہذیبی حیثیت کو فنا کرکے ہندوستان کی متحدہ قومیّت میں انہیں جذب کرلیا جائے۔ اب تک مسلمان ان کوششوں کا مقابلہ کرتے تھے، لیکن اب کانگرس کے آئین کی ترمیم اور ڈسپلن کی سختی کے بعد یہ بھی ممکن نہیں۔ بائیں بازو سے مسلمانوں کو کچھ توقّع ہوسکتی تھی۔ لیکن اب یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ ترمیم شدہ آئین کی رُو سے شہر کے مقابلہ میں دیہات کے نمائندوں کی تعداد بڑھا کر ہمیشہ کے لیے یا کم از کم ایک غیر معیّن مُدّت کے لیے بائیں بازو کو منسوخ کردیا گیا ہے، سوبھاش چندر بوس کو اخراج کا فرمان مل ہی چکا ہے اور اسی طرح اور جو لوگ گستاخی کے مرتکب ہوں گے انکا کان پکڑ کر باہر نکال دیا جائیگا۔ گاندھی جی جو آج کل کانگرس کے آئینی ڈکٹیٹر ہیں اُنکا حال جو کچھ ہے ظاہر ہے۔ پھر کانگرس کو مسلمانوں سے پاک رکھنے کی جو منظم کوششیں کی جارہی ہیں وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ صاف طور پر یہ چاہا جاتا ہے کہ اگر مسلمان کانگرس میں آتے ہیں تو صرف اِس طرح آئیں ـــــــ

"جیسے دریوزہ گری کرنے کو گدا آتے ہیں!"

بہت سی بے عنوانیاں صرف اسی غرض سے کی جاتی ہیں جن میں سے بعض کو تو نادانستہ غلطی کہہ کر تسلیم کرلیا جاتا ہے اور بعض کی تاویل یہ کردی جاتی ہے کہ "کیا کریں مسلمان آتے نہیں اب ہم لوگوں کو کہاں تک روکیں"۔

سُبحان اللہ! پہلے تو مسلمانوں کو آنے سے روکا جاتا ہے اور جب وہ نہیں آتے تو پھر انہیں موردِ عتاب بنایا جاتا ہے +

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

(دوسری قسط۔ مدینہ مورخہ ۲۱ ۲۹ ۶)

پچھلے پرچہ میں جو کچھ کہا جا چکا ہے، اُس سے یہ حقیقت بخوبی روشن ہو جاتی ہے کہ اب کانگرس محض ایک سیاسی جماعت نہیں رہی بلکہ اب یہ معاشرتی، اخلاقی اور رُوحانی جماعت بھی ہوگئی ہے۔ اب یہ گاندھی جی کی رہنمائی میں سیاسی انقلاب بپا کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب و معاشرت اور آدابِ اخلاق میں بھی ایک انقلاب رُونما کر دینا چاہتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں نانگا پربت سے لیکر راس کماری تک ہماری معاشرت تہذیب و تمدّن زبان اور اخلاقی و رُوحانی ضابطہ بُنیادی اور اُصولی طور پر ایک اور صرف ایک ہو۔ اور آج سڑکوں، گلیوں، بازاروں میں ہندو مسلمان کے آداب معاشرت اور آئینِ اخلاق میں جو امتیاز نظر آتا ہے، وہ یک قلم فنا ہو جائے۔ یہ وہی تصوّر ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں نیشنلزم کہا جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مُسلمان اس چیز کو قبول کرنے کے لیئے تیار ہو سکتے ہیں؟ اسکا جواب صاف ہے۔ اُن چند مُسلم سوشلسٹوں اور نیشنلسٹوں کو چھوڑ کر جو اسلامی اُصول و آئین کو دفترِ پارینہ سمجھ کر "غرقِ مئے ناب" کر دینا چاہتے ہیں، یا اُن چند افراد سے قطع نظر کرکے جو تجدّد و انتہا پسندی کے شوق میں زمانہ کی رَو کے ساتھ بہتے رہنا ہی باعثِ فخر سمجھتے ہیں، باقی تمام مُسلمان اس قسم کی نیشنلزم کو قبول کرنے کے لیئے نہ تیار ہیں نہ ہونگے۔ اور نہ ہو سکتے ہیں مولانا ابوالکلام آزاد اسوقت مُسلمانوں میں سب سے زیادہ ممتاز و راسخ العقیدہ کانگرسی ہیں اور گزشتہ ۲۰ سال سے آج تک ایک لمحہ کے لیئے بھی انہوں نے کانگرس سے علیحدگی اختیار نہیں کی۔ لیکن پھر بھی وہ صرف دفاعی نیشنلزم کے قائل ہیں۔ ہندوستان کے تعمیری اور اصلاحی نظام میں ہندو مسلمانوں کو از روئے معاشرت و تہذیب ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مدغم کر دینا کہ مسلمانوں کی جُداگانہ ملی حیثیت فنا ہو جائے، مولانائے ممدوح کے نزدیک بھی صحیح نہیں ہے۔ یہی حال جمعیتِ علماء کے اُن مقتدر ارکان ہے جو کانگرس کی حمایت میں سب سے زیادہ بُلند آہنگی کے ساتھ پیش پیش ہیں۔ علاوہ ازیں عام کانگرسی خیال کے مسلمانوں کا بھی یہی نقطہ نظر ہے ———

لیکن افسوس ہے کہ اس کے باوجود آج تک اُن حضرات نے کبھی اس پر غور نہ کیا کہ موجودہ تبدیل شُدہ حالات میں انکا عملی پروگرام کیا ہونا چاہیئے۔ انھوں نے کانگرس کی حمایت کا اعلان آج سے بیس پچیس سال پہلے اُس زمانہ میں کیا تھا جب کانگرس خالص سیاسی جماعت تھی اور جب مسلمانوں کے جُداگانہ تہذیبی و معاشی امتیازات کو متحدہ قومیت میں جذب کرنے کا نصب العین کانگرس کے سامنے نہ تھا۔ لیکن اب کرپلانی جی جیسی ذمہ دار شخصیت اس اَمر کی شہادت دے رہی ہے کہ جب سے گاندھی جی کانگرس کے سیاہ و سفید کے مالک ہوئے ہیں یہ صرف سیاسی انقلاب ہی نہیں چاہتی، بلکہ زندگی کے ہر شعبہ کو بھی وطنیت و قومیت کے اُصول کے بموجب تبدیل کر دینا چاہتی ہے۔ ان بزرگوں کو اپنے سابقہ عقائد و خیالات کی نئے سرے سے جانچ پڑتال کرنی چاہیئے اور نئے ارادوں اور منصوبوں نے حالات میں جو انقلاب پیدا کر دیا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے ہر چیز کا جائزہ لینا چاہیئے۔

آزادی

اب صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ "پہلے آزادی لے لو پھر مستقبل کے نقشے بنانا۔" آزادی جتنی کچھ ملنا تھی مل چکی۔ اور ہندوستان کی عظیم اکثریت اُسے قبول بھی کر چکی۔ یہ خیال کہ فیڈریشن کے سوال پر کانگرس وزارتوں کو چھوڑ کر پھر انقلابی جدّ و جہد میں مصروف ہو جائیگی ایک خیالِ خام نظر آتا ہے اور پھر اگر ایسا ہو بھی جائے تب بھی یہ سوال اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے کہ مستقبل کے ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کا نقشہ کیا ہوگا؟ اس سوال پر غور کرتے وقت ہمیں محض پُرجوش جذبات یا دُور از کار موہوم تصوّرات سے کام لینا چاہیئے۔ ہم کبھی فنا نہیں ہو سکتے: ہم تو نو کروڑ ہیں۔ ہم نے بدر و حنین میں کم ہونے پر بھی فتح پائی ہے۔ شمال میں اسلامی ممالک کا ایک لمبا سلسلہ یُوروپ و افریقہ تک چلا گیا ہے جو ہر وقت ہماری مدد کریگا...... اس قسم کی جذباتی یا افسانوی باتوں سے قوموں کی تقدیریں بگڑا ہی کرتی ہیں بنا نہیں کرتیں۔

پھر یہ صحیح ہے کہ کانگرس میں بائیں بازو کے نام سے جو جماعت بن رہی ہے وہ یقیناً آگے چلکر طاقت حاصل کرے گی اور انقلابی جدّوجہد کے جس سررشتہ کو وزارت پسندوں نے چھوڑدیا ہے اُسے اپنے ہاتھ میں لے لیگی. لیکن اس جماعت کی انقلاب پسندانہ نکتہ چینیوں کو سُنکر ہمیں یہ بھول نہ جانا چاہیئے کہ اسوقت جو کچھ ہورہا ہے اُسے یہ جماعت ناپسند نہیں کرتی. بلکہ اس سے زیادہ کچھ اور چاہتی ہے بخلاف اسکے مسلمان موجودہ حالت کو ناپسند بھی کرتے ہیں'بایاں بازو قومیت و وطنیت کے مسئلہ میں گاندھی جی سے سو فیصدی متفق ہے. اس بارے میں اُسکا نظریہ بالکل وہی ہے جو گاندھی جی کا ہے. فرق صرف اتنا ہے کہ وہ موجودہ اختیارات کو ادھورے سمجھ کر زیادہ وسیع اختیارات چاہتا ہے. لیکن یاد رہے کہ ان اختیارات کے ملجانے پر اُسکا عمل بھی بجنسہٖ بلعینہٖ وہی ہوگا جو آج دائیں بازو کا ہے +

مسلمانوں کا نقطہ نظر

مسلمان کانگرس میں کیوں نہیں آتے ؟ ہم اس سوال کے جواب میں اکثر یہ کہا کرتے ہیں کہ ـــــ مسلمان بے حس ہیں' جاہل ہیں' سیاست سے ناآشنا ہیں' اب تک صرف مذہب کے نام پر اُبھارے گئے ہیں' اس لیے آج بھی یہی چاہتے ہیں' اُنکے لیڈر مکّار وغدّار ہیں' وہ انہیں مذہب کے نام پر دھوکا دیکر اپنا اُلّو سیدھا کرتے رہتے ہیں' مسلمان ہندوستان کو اپنا وطن نہیں سمجھتے' وہ ہر وقت ایران وعرب کے خواب دیکھتے رہتے ہیں' وہ واقعات کی دُنیا کے بجائے خیالی دنیا میں بسنا چاہتے ہیں اُنہیں پان اسلامزم (اخوتِ اسلامیہ) نے غلط توقعات دِلا رکھی ہیں' وہ انگریز کو اپنا مددگار سمجھتے ہیں' وغیرہ وغیرہ. اگر ان تمام باتوں کو صحیح مان لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ ہمارے لیڈروں نے اب تک ان کی اصلاح کیوں نہ کی ـ

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں !
گر میں نے کی تھی توبہ' ساقی کو کیا ہوا تھا ؟

اگر واقعی مسلمانوں کے کانگرس میں نہ آنے کی وجہ صرف اسی قسم کے چند غیر حقیقی اسباب ہوتے تو اُنکا دُور کر دینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ لیکن جب ایسا نہیں ہے تو پھر موجودہ حالات کا کوئی نہ کوئی حقیقی سبب تو ہونا چاہیئے۔

دل سے رُخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا۔

ہمیں اس بات کو تسلیم کرنے سے ہرگز انکار نہیں ہے کہ کانگرس یا کانگرسی حکومتیں مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرنا نہیں چاہتیں اور اس لیئے وہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ کانگرسی حکومتوں میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے، اذان دینے، قرآن کی تلاوت کرنے یا اسی قسم کے اور مذہبی معاملات کو بجالانے میں دقتیں پیدا کی گئی ہیں یا آئندہ کی جائیں گی۔ اصل سوال یہ ہے کہ آیا ازرُوے معاشرت، تہذیب و تمدّن اور سیاست و اخلاق مسلمان ہندوستان میں اس طرح ایک قوم بنکر رہیں جیسے انگلستان میں یہودی اور عیسائی رہتے ہیں یا اپنی تمام موجودہ امتیازی خصوصیتوں کے ساتھ اس طرح رہیں جیسے کناڈا میں انگریز و فرانسیسی رہتے ہیں یعنی آیا وہ ہندوؤں کے ساتھ معجونِ مرکّب بن کر ایک ہو جائیں یا اپنے تمام امتیازات کو باقی رکھتے ہوئے اُنکے ساتھ صرف اتّحاد و اشتراک کے پیوند سے منسلک ہو کر رہیں؟ سوال کی اصلی اور حقیقی نوعیت صرف یہی ہے اور ہمیں صرف اسی پر غور کرنا چاہیئے۔

اتّحاد کے امکانات

لیکن اسوقت صُورتِ حالات یہ ہے کہ اتحاد کے امکانات ایک ایک کر کے ختم کیے جارہے ہیں اور مسلمانوں کو صرف ادغام کی دعوت دی جارہی ہے۔ کبھی اُنہیں معاشی پروگرام کے نام پر بلایا جاتا ہے اور کبھی روٹی کے سوال پر، کبھی لینن کے اُصول دکھلا کر اور کبھی مارکس کا نام سُنا کر۔ حالانکہ ع

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا!
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

اور پھر مسلمان سب کچھ ہو سکتا ہے بشرطیکہ اِن اصلاحات و انقلابات کا قلم اُس کی قدیم روایات و تاریخ کی شاخ پر نصب کیا جائے۔ لیکن یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ماضی سے یکسر بے تعلق ہو کر صرف رامائن و مہابھارت کی زمین پر اپنی عمارت قائم کرنے پر وہ راضی ہو جائے۔

بہر حال اِس وقت سوال یہ ہے، اور یہ سوال کوئی ایسا سوال نہیں جو صرف آج پیدا ہو رہا ہے، دُنیا میں جہاں کہیں اس قسم کے حالات پیدا ہوئے ہیں، وہاں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا گیا ہے۔ کناڈا، سوئٹزرلینڈ، اور رُوس وغیرہ کی پچھلی ایک صدی کی تاریخیں اس قسم کے حالات کو دُہرا چکی ہیں، بنا بریں ہندوستان کے حالات کو آنکھیں بند کر کے انگلینڈ و امریکہ پر قیاس کر لینا اور پھر جمہوریت کا نام لے کر مسلمانوں کو اپنی ملی ہستی فنا کر دینے کی ترغیب دینا کبھی کارگر نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ عام کانگرسی مسلمانوں میں بالعموم اور علمائے کرام کے طبقہ میں بالخصوص بہت کم ایسے افراد ہیں جو مسئلہ کی اِس پیچیدہ و غور طلب نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اب اِس قسم کی سہل انگاری روز بروز نقصان رساں ہوتی جا رہی ہے۔ مسلم لیگ نے ہندوؤں پر بے جا بائیکاٹ کرنے کی جو رسم ڈال دی ہے وہ اگرچہ مسلمانوں کے لیے نقصان رساں ہے۔ لیکن پھر بھی اپیل کرتی ہے۔ اِسلئے اِس وقت اِس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کانگرس سے مندرجہ ذیل باتیں طے کرائی جائیں۔

(۱) ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیبی اور معاشرتی حیثیت بالکل جُدا رہے گی اور متحدہ قومیت کے اُصول کے بموجب ہندوستان کی دوسری اقوام میں اُن کو مدغم نہ کیا جائے گا۔

(۲) آچاریہ جی کے بیان کردہ نیشنلزم کے بموجب ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کو ایک ہی فلسفۂ زندگی کی زنجیر میں نہیں جکڑا جائیگا بلکہ اُنکے ملی و قومی امتیازات کو باقی رکھا

جائے گا۔"

(۳) بجز دفاعی قومیت کے مسلمانوں کے وجود کو قریب قریب ایک جدا قوم کے ہم پلہ سمجھا جائے گا۔ اور انکے ساتھ ادغام نہیں بلکہ اتحاد و اشتراک کا سلوک ہوگا۔ پھر صرف اس اعلان سے کام نہ چلے گا بلکہ ضرورت اس کی بھی ہے کہ ہمارے کانگرسی لیڈر ان چیزوں پر کانگرس اور کانگرسی حکومتوں سے عمل بھی کرائیں تاکہ ذہنیت کی تبدیلی کا علم عوام کو ہوسکے"۔

یہ ہے وہ تبصرہ جو آچاریہ کرپلانی کے بیان پر معاصر مدینہ نے اپنی دو اشاعتوں میں کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ آچاریہ جی کا بیان ہے ہی ایسا کہ جو شخص بصارت کے ساتھ کچھ بھی بصیرت رکھتا ہے وہ اربابِ کانگرس کے اصل منصوبوں کے متعلق مزید دھوکے میں نہیں رہ سکتا۔ بایں ہمہ معاصرِ مدینہ مستحقِ تبریک ہے کہ اُسنے اظہارِ حقیقت میں اتنی جرأت سے کام لیا۔ ورنہ مسلکِ قومیت پرستی کا تقاضا تو کچھ اس قسم کی مصلحت کوشی تھی جس کا ثبوت ہمارے بڑے بڑے نیشنلسٹ علما و زعماء کیطرف سے ایسے مقامات پر بالعموم ملا کرتا ہے۔ مثلاً آچاریہ جی کا بیان مسلم قومیت پرست حضرات میں سے ہر ایک کی نظر سے گزرا ہوگا۔ لیکن آقایانِ واردھا کی خوشنودیِ مزاج کا جذبہ کچھ اس انداز سے گلوگیر ہو رہا ہے کہ ان کی زبان سے ایک لفظ بھی اسکی نسبت نہیں نکل سکا۔

معاصرِ مدینہ نے اس بیان سے جو نتائج اخذ کیے ہیں اُن کی صحت میں کسے شبہ ہو سکتا ہے لیکن ہمیں افسوس ہوا کہ اس مشکل کا جو حل اُس نے تجویز کیا ہے وہ (اشربوا فی قلوبھم العجل) کے مطابق، کانگرسی دیوتاؤں کی اس عقیدت و محبت کا پردہ نہ ہوتا تو وہ دیکھ لیتا کہ جس طریق کار کیطرف وہ دعوت دے رہا ہے اس میں کس قدر اصولی اور منطقی غلطیاں ہیں۔ مثلاً علاج یہ تجویز کیا گیا ہے کہ "کانگرس سے پہلے کرا لیا جائے کہ ہندوستان میں مسلمانوں

کی تہذیبی اور معاشرتی حیثیت بالکل جداگانہ رہیگی اور متحدہ قومیت کے اصول کے بموجب ہندوستان کی دوسری اقوام میں ان کو مدغم نہ کیا جائے گا۔" اس کی بابت اُمورِ ذیل غور طلب ہیں :-

(۱) اس تجویز میں یہ نہیں واضح کیا گیا کہ کانگرس سے یہ باتیں طے کون کرائے۔ ظاہر ہے کہ طے کرانے والے مسلمان ہونگے۔ تو سب سے پہلے ہمارے معاصر نے غیر محسوس طور پر اس حقیقت کا اعتراف کر لیا کہ کانگرس کسی غیر مسلم ادارہ کا نام ہے۔ ورنہ اگر کانگرس کو ایک مشترکہ ادارہ تسلیم کیا جائے اور اس میں سے ایک عنصر (مسلمان) اس سے الگ ہو کر کچھ شرائط طے کرنا چاہیں تو کانگرس اسوقت مکمل کانگرس نہیں رہے گی۔ بلکہ "کانگرس منفی مسلمان" ہو گی۔ لہذا یہ منطقی طور پر غلط ہے کہ "کانگرسی مسلمان کانگرس سے یہ شرائط طے کرائیں"۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسا کہا جائے کہ "فلاں سوسائٹی کے ممبروں کو چاہیئے کہ سوسائٹی سے فلاں فلاں شرط طے کرالیں۔ جب تک مسلمان کانگرس سے الگ نہیں ہوتے۔ اور کانگرس کو ایک غیر مسلم ادارہ تسلیم کیا جاتا۔ اس سے شرائط طے کرانے کا سوال بے معنیٰ ہے :-

(۲) کانگرس اگر ایک مشترکہ ادارہ ہے تو اُس کی ہستی ہی متحدہ قومیت کے اصول پر قائم ہے آج کانگرس سے یہ حقیقت تسلیم کرا لیجئے کہ ہندوستان میں متحدہ قومیت نہیں بلکہ مختلف اقوام بستی ہیں۔ پھر دیکھئے کہ کانگرس کا وجود کس طرح ہوا میں غائب ہو جاتا ہے۔ یہی تو وہ مقام ہے جہاں پہنچکر کانگرس، مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتہ کرنے سے رُک جاتی ہے۔

(۳) کانگرس سے مجوزہ شرائط طے کرانے کے لیئے کوئی مقابل کی جماعت ہونی چاہیئے نہ کہ افراد۔ مسلم قومیت پرست حضرات اپنے آپ کو کتنی ہی اہمیّت کیوں نہ دے لیں یہ ظاہر ہے کہ ان کی حیثیت انفرادی ہے، جماعتی نہیں۔ مسلمانوں کی پوری جماعت (تھوڑے سے افراد کو چھوڑ کر) اُنکے مسلک کے خلاف ہے۔ اِس لیئے کانگرس سے اُنکا معاہدہ یا سمجھوتہ جماعتی حیثیت سے نہیں ہو سکتا۔ کانگرس سے معاملات طے کرنے کے لیئے نہایت ضروری ہے کہ :-

(۱) کانگریس کو غیر مسلم ادارہ تسلیم کیا جائے اور

(۲) اُسکے مقابلہ میں مسلمانوں کی ایک جُداگانہ غیر مخلوط جماعت ہو جس سے کانگریس سمجھوتہ کرے۔ پھر اور اس طرح

(۳) اِن دونوں جماعتوں میں من حیث الاقوام اتحادِ عمل ہو۔

یہی ہے وہ مسلک جس کی طرف ہم پہلے اُن سے دعوت دے رہے ہیں زیادہ نہیں تو کم ازکم ہمارا وہ پمفلٹ ہی مُلاحظہ فرمالیا جائے "جو مُسلم لیگ کا بُنیادی مطالبہ" کے عنوان سے بکثرت شائع ہو چکا ہے۔

(۴) معاصر مدینہ کو اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ "ایسے معاہدات کے لیئے صرف اعلان ہی کافی نہیں" لیکن کافی کیا ہے ؟ یہاں پھر معاصر موصوف نے یہ کہہ کر غلطی کھائی ہے کہ "ہمارے کانگرسی لیڈر کانگرس اور کانگرسی حکومتوں سے اسپر عمل کرائیں"۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ معاصر موصوف نے مُسلم قومیت پرست حضرات کی کانگرس میں بے بسی اور بے وقعتی کا کس بُری طرح سے اقرار کیا ہے۔ یعنی اُنکے پاس کوئی ایسی قوت نہیں، جس سے وہ اپنے مطالبات منوا سکیں۔ اور معاہدات کی پابندی کرا سکیں وہ اپنے آپ کو کانگرسی لیڈروں کے رحم وکرم پر چھوڑتے ہیں اور ان سے درخواستیں کی جاتی ہیں کہ وہ کانگرسی حکومتوں سے اِس بات پر عمل کرائیں تاکہ عوام کو اِس تبدیلیٔ ذہنیت کا علم ہو جائے !

ہم معاصر موصوف کی خدمت میں بادب گزارش کرینگے کہ معاہدات کی توقیر منت وسماجت سے نہیں ہوا کرتی بلکہ اپنے اندر قوت پیدا کرنے سے ہوتی ہے۔ اور قوت پیدا ہوتی ہے اپنی مرکزیت۔ اپنی اجتماعیت اور اپنی جداگانہ ملی تنظیم سے۔

(۵) معاصر موصوف نے یہ کہہ کر "مسلمانوں کے وجود کو قریب قریب ایک جُدا قوم کے ہم پلہ سمجھا جائے"۔ ایک طرف اپنی قائم کردہ عمارت کو بنیادوں سے ہلا دیا۔ اور دوسری طرف غیر شعوری طور پر اُس جذبۂ خوف کا مظاہرہ کیا ہے جو ہندوؤں کے سامنے اپنے آپ کو ایک

جُداگانہ قوم کی حیثیت میں پیش کرنے میں ہر قومیت پرست کے دل میں جاگزین ہے کیا معاصر موصوف کو مسلمانوں کے ایک مستقل۔ غیر مخلوط۔ پوری پوری جُداگانہ "قوم" کے وجود میں شُبہ ہے ؟ مسلمان قومیت پرست حضرات کی یہی ارتیابی کیفیت ہے جو اِن کو ہندوؤں کی غلامی سے نجات نہیں دِلا سکتی۔ اِن حضرات کو مسلمانوں کی جُداگانہ ملی حیثیت میں یقین نہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک افراد کو اپنے دعوے اور مسلک پر پُورا پورا یقین نہ ہو۔ قوم کا کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکتا ؎

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

(۶) سب سے بڑھ کر افسوسناک غلطی وہ ہے جو معاصرِ موصوف کو مولانا ابوالکلام آزاد کو "دفاعی قومیت" کے کھلونے سے لاحق ہوئی ہے۔ مولانا صاحب نے مسلکِ قومیت پرستی تو اختیار کر لیا لیکن چونکہ اِس مسلک سے اُنکا قلب کبھی ہم آہنگ نہیں ہُوا، اِس لیئے وہ ضمیر اور مصلحت کی کش مکش کو ہمیشہ لفظی گورکھ دھندوں میں چھپانے کی ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں اُن سے پوچھیئے کہ یہ "دفاعی قومیت" کس بلا کا نام ہے! سوال بالکل واضح ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں باہمی ادغام سے ایک قومیت کے رشتے میں پروئے جا سکتے ہیں یا نہیں! اگر اس سوال کا جواب اُنکے نزدیک مثبت میں ہے تو یہی متحدہ قومیت دفاعی بھی ہوگی اور جارحانہ بھی۔ اگر اسکا جواب نفی میں ہے تو ایسی قومیت نہ دفاعی ہو سکتی ہے نہ جارحانہ۔ اگر "دفاعی قومیت" سے مطلب صرف اتنا ہے کہ انگریز کے مقابلہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ محاذ قائم ہو تو اُسے بین الاقوامی معاہدہ کہا جائیگا۔ نہ کہ "دفاعی قومیت"۔ گزشتہ جنگِ عظیم میں جب چند اقوام باہمی معاہدہ سے دوسری اقوام کے خلاف متحدہ محاذ قائم کیئے ہوئے تھیں تو ان معاہد اقوام کے اتحاد سے کون سی نئی "دفاعی قومیت" پیدا ہو گئی تھی! اِن معاہد اقوام کا

نام "وفاقِ متحدہ" تھا۔ اسی طرح اگر ہندوستان میں مسلمان ایک جُداگانہ قوم ہیں اور ہندو الگ قوم۔ تو اِن دونوں کے اتحاد سے انگریز کے خلاف جو متحدہ محاذ قائم ہوگا تو اسکا نام زیادہ سے زیادہ "ہندو مسلم متحدہ محاذ" ہوسکتا ہے نہ کہ "دفاعی قومیت"۔ قومیت ہمیشہ باہمی ادغام سے اُسوقت وجود میں آتی ہے، جب وہ مختلف اقوام جو اس متحدہ قومیت کے عناصر ترکیبی ہوں، اپنا اپنا جُداگانہ ملی تشخص کھو دیں۔ اس کو اتحاد نہیں کہتے، بلکہ ادغام کہتے ہیں۔ اتحاد میں ہر قوم اپنا اپنا جُداگانہ قومی تشخص برقرار رکھتی ہے۔ لیکن یہ باتیں تو ہم اسے سمجھائیں جسے معلوم نہ ہوں جو سب کچھ جانتا بُوجھتا، دیدہ دانستہ چشم پوشی کرے، اُسے کون سمجھائے۔ سوتے کو جگانا آسان ہے، لیکن جو جاگتا آنکھیں بند کرلے اُسے کون جگا سکتا ہے۔ ورنہ کیا آپ باور کرسکتے ہیں کہ مولانا آزاد "قومیت" اور "اتحاد بین الاقوام" میں بھی فرق کرنا نہیں جانتے! وہ جانکر قومیت کا لفظ استعمال کرتے ہیں کہ اس سے ہندوؤں کا مطلب پُورا ہو جاتا ہے اور پھر اس کی تاویل سے مسلمانوں کو تھپکیاں دیکر سلانا چاہتے ہیں کہ میرا مطلب متحدہ محاذ سے ہے، ادغام سے نہیں۔ چلیئے!

گاندھی جی بھی خوش رہیں راضی رہے سرکار بھی

ہم اپنے معاصر موصوف اور اس طرح ہندوستان کے تمام مسلم قومیت پرست حضرات کی خدمت میں گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ اب جبکہ خود کانگرس کے اتنے بڑے ذمہ دار عہدہ دار کی طرف سے کانگرس کا نصب العین اور مسلک واضح الفاظ میں سامنے آچکا ہے۔ انہیں چاہئے کہ حقائق کا مردانہ وار اعتراف کرتے ہوئے اپنی تبدیلیٔ مسلک کا واضح الفاظ میں اعلان کردیں اور یہ مسلک اسکے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ

(۱) مسلمانوں کی اپنی الگ غیر مخلوط جماعت ہو۔

(۲) اپنا جُداگانہ مرکز ہو۔

(۳) کانگریس کو غیر مسلم ادارہ تسلیم کیا جائے۔

(۴) اِن دونوں جماعتوں میں من حیث الاقوام معاہدہ کرکے مشترکہ مقاصد کے حصول میں اتحاد وتعاون کیا جائے۔ اور

(۵) مسلمانوں کا نصب العین ہندوستان میں حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہو۔

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

طلوعِ اسلام
دسمبر ۱۹۳۹ء

اسلام اور جمہوریت
(ایک مسلمان)

یوں تو جس دن سے اسلام نے اپنے اوّلین گہوارہ سے قدم باہر نکالا اُسے قسم قسم کی طاغوتی مخالفتوں سے سابقہ پڑنا شروع ہو گیا، اسلیے کہ "آدم" اور "ابلیس" کی تخلیق ساتھ ہی ساتھ ہوئی تھی۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ جس قُوّت اور شدّت سے ابلیسانہ سازشیں اِس دَور میں اسلام کے خلاف مصروفِ پیکار ہیں، اِس سے بیشتر شاید ہی ایسا محاذ دیکھنے میں آیا ہوگا۔ بالخصوص اسلیے کہ آج مخالفانہ قوتیں کچھ اس قسم کے دلکش اور حسین نقابوں میں رُوپوش اور ایسے مشفقانہ اور ناصحانہ خرقوں اور لبادوں میں ملبوس سامنے آتی ہیں کہ حق و باطل میں تمیز مشکل ہو جاتی ہے۔ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ "اسلام آزادی کا مذہب ہے"۔ بجا اور دُرست! لیکن اس سے مفہوم کیا لیا جاتا ہے۔ یہ کہ انسان خدا کا منکر ہو، پکّا ملحد اور دہریہ بنجائے، یورپ کی مادّہ پرستی کو منتہائے نگاہ سمجھے، مذہب کی تضحیک اسکا شیوہ ہو، شعائرِ الٰہی کا استہزا، اسکا شعار ہو۔ یہ سب کچھ کرے، لیکن بایں ہمہ مسلمان کہلائے اور مُصر ہو کہ اُسے بہترین مسلمان سمجھا جائے۔ اسلیے کہ اسلام "آزادی" کا مذہب ہے۔ آواز اُٹھتی ہے کہ "اسلام مساوات کا مذہب ہے"۔ اس میں کسے کلام ہے۔ لیکن اسکا مطلب یہ پیش کیا جاتا ہے کہ رُوس کی بالشوزم عین اسلام ہے۔ قرآن کریم میں عفو اور درگذری کو بھی صفاتِ محمودہ میں شمار کیا گیا ہے، اس سے جھٹ اس نتیجہ پر پہونچ گئے کہ اسلام اہنسا کی تعلیم دیتا ہے۔ نبی اکرمؐ نے مدینہ کے یہودیوں سے معاہدہ کیا، اِس سے فوراً "متحدہ قومیت" کے جواز کا فتویٰ لے آئے۔ حضورؐ نے ہجرت کے وقت ایک غیر مُسلم کو مدینہ کا راستہ دکھانے کے لیے متعین فرمایا، اِس سے گاندھی جی کی سیاسی امامت کی دلیل مل گئی۔ عربی کا ایک مقولہ "حُبّ الوطن من الایمان" سن پایا، اس سے علی الاعلان یہ نظریہ پیش کر دیا کہ قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوا کہ

ہم نے مختلف زمانوں میں مختلف اقوامِ عالم کے اندر اپنے رسولؑ بھیجے۔ اِس سے فوراً یہ کلیہ قائم ہو گیا کہ عالمگیر سچائیوں کے اعتبار سے تمام مذاہب (جس حالت میں وہ آج ہیں) بالکل برابر ہیں۔

غرضیکہ ایک ایک غیر اسلامی نظریہ کو قرآن و حدیث کے الفاظ کا نقاب اُڑھا کر یکسر اسلامی اصُول و مبانی کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اور یوں کفر و باطل کی ان اسلام سوز آرزوؤں کو ایک ایک کرکے پُورا کیا جاتا ہے جو ایک عرصے سے خدا اور اُسکے دین کے دُشمنوں کے سینوں میں مچل رہی تھیں۔ "شرارِ بولہبی" کو حجازی فانوس میں رکھ کر اُسے "چراغِ مصطفویؐ" نام دیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی خدا کا بندہ اِس فانوسِ خیالی کو توڑ کر حقیقت کو بے نقاب کرنا چاہتا ہے تو کافرگری کے ترکشوں کے تیر چلّوں پر چڑھا لیے جاتے ہیں۔ اور مُرتد سازی کی نیاموں سے تلواریں سونت لی جاتی ہیں۔ توبہ! توبہ!!

چنیں دُورِ آسماں کم دیدہ باشد ۔۔۔ کہ جبریلِ امیں را دِل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا ۔۔۔ پرستد مومن و کافر تراشد

یہ دَور ہماری سیاسی تحریکات کا پیدا کردہ ہے اور انہیں کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا جا رہا ہے۔ اسی کا شاخسانہ ہے وہ بحث جو آجکل ہمارے "قومیّت پرست" جاں نثارانِ "ملّت" کے قلوب و اذہان کے لیے وجۂ صد پریشانی اور باعثِ ہزار کاوش بن رہی ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ پچھلے دنوں مسٹر جناح نے کہیں یہ کہہ دیا کہ ہندوستان کی موجودہ حالت کے پیشِ نظر جمہوری نظامِ حکومت مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ چونکہ مسٹر جناح کے اِس نظریہ کو تسلیم کر لینے سے ہندوؤں کے تمام مقاصد و عزائم جو "رام راجؐ" کی تشکیل و تمکین کے لیے اُنکے تصوّرات کو مرکوز کیے ہوئے ہیں، خاک میں ملجاتے ہیں، اسلیے سب سے پہلے گاندھی جی۔ مہاتمائیت کا چولہ پہنے، رام نام کی مالا جپتے، واردھا کی کُٹیا سے باہر نکلے۔ اور اپنی پوری شانِ "شیخ الاسلامی" کے ساتھ فرمایا کہ میں قرآن و سیرت کی روشنی میں علیٰ وجہ البصیرت اِس حقیقتِ کبریٰ کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناح کا یہ نظریہ یکسر اسلام کے خلاف ہے۔ وہ اتنا کہہ کر پھر کُٹیا میں تشریف لے گئے۔ اور اپنے

چیلوں کو اشارہ کر گئے کہ ہاں! ذرا زور سے۔ بس پھر کیا تھا۔ نیشلسٹ علماء کبار کا مقدس طائفہ ایک طرف سے یلغار کر کے آ گیا۔ "شری یت" قسم کے مسلمان دوسری طرف سے اُمنڈ آئے۔ اور ملک میں ایک شور برپا کر دیا گیا کہ:۔

اسلام جمہوریت کا مذہب ہے

جناح کا یہ نظریہ سرتاپا اسلام کے خلاف ہے!

ہم یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور دل میں کہہ رہے تھے کہ یا اللہ تو اپنے دین کا آپ ہی رکھوالا ہے اگر ان لوگوں کے بس میں ہو تو نہ معلوم کیا سے کیا کر دیں۔

ہمیں اعتراف ہے کہ مسٹر جناح کا ہر قول قرآنی نظریہ کی سند نہیں ہو سکتا۔ اور انہوں نے خود بھی کبھی اس امر کا دعویٰ نہیں کیا کہ وہ اسلامیات کے ماہر اور کتاب و سنّت کے عالم ہیں لیکن یہ اللہ کی دین ہے کہ اُس نے اس خلفشار کے زمانہ میں ملّتِ اسلامیہ کے اِس حقیقی دردمند کی نگاہوں کو وہ بصیرت عطا فرما دی ہے کہ وہ اپنی فطرتِ صالحہ کی مدد سے احوال و ظروف کے مطالعہ کے بعد جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں، وہ بالعموم قرآن کی تعلیم کے مطابق ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ اس کی سند میں قرآن کی کوئی آیت یا رسول اللہؐ کی کوئی حدیث نہ بھی پیش کر سکتے ہوں لہٰذا یہ دعوے کہ چونکہ یہ خیال ایک مسٹر کی طرف سے پیش کیا گیا ہے، قابلِ قبول نہیں ہو سکتا، حجت اور سند صرف وہی نظریہ ہو سکتا ہے جو کسی "مولانا" کی مُہرِ تصدیق سے منصّۂ شہود پر آئے۔ خالص برہمنیت ہے۔ مجرد قول نہ کسی مسٹر کا حجت ہو سکتا ہے نہ کسی مولانا کا، بلکہ صرف وہ جس کو خدا اور اسکے رسولؐ کی بارگاہِ عالیہ سے سند عطا ہو جائے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ مسٹر جناح نے کیا کہا اور اسلام کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے۔ حق تو یہ ہے کہ یہ وہ اہم مسئلہ تھا جس کی توضیح کے لیے آنکھیں رہ رہ کر اس مردِ حق آگاہ کو ڈھونڈھتی ہیں جو شاہی مسجد لاہور کے ایک گوشے میں محوِ خواب ہے لیکن ....

"اسلام جمہوریت کا مذہب ہے"! لاریب فیہ لیکن سوال یہ ہے کہ اُس جمہوریت کے معنے کیا

ہیں جسکا علمبردار اسلام ہے۔ کیا وہ یہی جمہوریت ہے جو مغرب کی ٹکسالوں سے نکلکر دُنیا کے بازاروں میں دراہم کا سدہ کی طرح ماری ماری پھرتی ہے یا اس سے کچھ الگ۔ جب تک یہ بنیادی مسئلہ طے نہیں ہو جاتا یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ مسٹر جناح نے کیا کہا ہے۔ اور اُنکے اعلان کی مخالفت کرنے والے قوم کو کدھر لیئے جا رہے ہیں۔

مروّجہ جمہوری نظامِ حکومت کے معنٰی یہ ہیں کہ عوام اپنے نمائندے منتخب کریں۔ اور ان نمائندگان کی کثرتِ آرا سے تمام اُمور کا فیصلہ ہُوا کرے اور یہ فیصلے مُلک میں قانون کی حیثیت سے نافذ کیئے جائیں۔ اِس نظامِ حکومت میں پہلا مرحلہ "انتخاب" کا ہے۔ چونکہ اُمیدواران اور رائے دہندگان دونوں کے پیشِ نظر معیارِ فضیلت جوہرِ ذاتی نہیں، بلکہ مختلف قسم کے دیگر رجحانات ہوتے ہیں، اِس لیئے معرکۂ انتخاب میں جو کچھ ہوتا ہے اور جس قسم کے نمائندے انتخاب میں کامیاب ہو کر آتے ہیں، اس کی حقیقت ہر اُس شخص کے سامنے ہے۔ جس کی نگاہ ہماری مختلف مجالس اور انکے عناصر ترکیبی پر ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ طریقِ انتخاب میں اصلاح ہو سکتی ہے۔ اور ایسی صورتیں پیدا کی جا سکتی ہیں، جن سے بہترین نمائندے ہی منتخب ہوا کریں۔ ہم اِسوقت اِس بحث میں نہیں اُلجھنا چاہتے کہ جس قسم کا ماحول مغربی نظامِ زندگی نے پیدا کر دیا ہے۔ اس میں اس قسم کی اصلاح کی کس قدر گنجائش ہے ہم تو صرف ان نتائج سے بحث کر رہے ہیں۔ جو اِس نظامِ زندگی سے آج کل پیدا ہو رہے ہیں جب مغربی نظامِ انسانیت کو اتنی بلندی پر لے جائیگا کہ عوام اپنے قلبی اور ذہنی رجحانات اور مادّی مفاد پر حقائق کو ترجیح دینے لگ جائیں، یہ اسوقت دیکھا جائیگا۔ اِسوقت نظامِ جمہوریّت کی دوسری شق کو لیجیے۔ یعنے کثرتِ آراء۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ اگر کسی مجلسِ قانون ساز میں یہ مسئلہ پیش ہو کہ خدا کا وجود ہے یا نہیں اور (۵۱) اراکین کی رائے نفی کی طرف ہو تو (۴۹) اراکین کو ماننا پڑے گا کہ (نعوذ باللہ) خدا کا وجود نہیں ہے۔ ہر چند خدا کی ہستی پر انکا ایمان ہو۔ اگر وہ ملک کے اس فیصلہ کے خلاف جو قانونی حیثیّت اختیار کر چکا ہوگا اپنے ایمان پر قائم رہیں تو وہ قانون کی نگاہ میں مجرم ہونگے

اور مستوجب سزا۔ یہ ہے مغرب کا وضع کردہ نظامِ جمہوریت۔ کہیئے کہ اس نظام کی رُو سے اقلیت یہ دعوے کر سکتی ہے کہ اُسے آزادی حاصل ہے؟ اس نظام میں اقلیت کی کیا حالت ہوگی، یہ ہم سے نہیں، پنڈت جواہرلال نہرو سے سنیئے۔ فرماتے ہیں:۔

"دراصل جمہوری حکومت کے معنے یہ ہیں کہ اکثریت اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے۔" (میری کہانی جلد دوم ص۴۵۵)

ہے کہ گاندھی جی لکھتے ہیں کہ "نظامِ جمہوری میں اقلیتوں کو کسی نہ کسی حد تک غیر مطمئن رہنا ہی پڑے گا۔" (اسٹیٹس مین ۱۱ جون) اور گاندھی جی کے یہ الفاظ ان دنوں کہے جا رہے ہیں، جب کہ انہیں ضرورت ہے کہ اقلیتوں کو یقین دلائیں کہ "آزاد" ہندوستان میں ان پر کسی قسم کا جور و استبداد نہیں ہوگا۔ اسی لیئے ذرا دبی زبان سے اس امر کا اقرار ہو رہا ہے کہ نظامِ جمہوریت میں اقلیت کو کس حد تک آزادی ملتی ہے۔ یہ ہے مغرب کا جمہوری نظام!

اب ذرا اس نظامِ حکومت کو ہندوستان کے موجودہ احوال و ظروف پر منطبق کر کے دیکھیئے کہ نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے۔ پہلا مرحلہ طریقِ انتخاب کا ہے۔ اگرچہ آج کل یہ طریق جُداگانہ انتخاب (SEPARATE ELECTORATES) کا ہے لیکن ظاہر ہے کہ آزاد ہندوستان میں سب سے پہلا قانون یہی پاس ہوگا کہ طریقِ انتخاب مخلوط (JOINT ELECTORATES) ہونا چاہیئے۔ اسلیئے کہ جُداگانہ انتخاب، متحدہ قومیت کی تشکیل میں سدِ راہ ہے۔ بہر حال طریقِ انتخاب کچھ بھی ہو، یہ ظاہر ہے کہ مجالسِ قوانین ساز اور حکومت کے دوسرے شعبوں میں مسلمان بہر کیف اقلیت میں ہونگے۔ اور چونکہ اس نظام کی رُو سے فیصلے اکثریت کی آراء کے مطابق ہونگے۔ اسلیئے ہوگا وہی جو ہندوؤں کی اکثریت چاہے گی۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہر وہ شخص جسے اللہ نے تھوڑی سی بصیرت عطا کی ہے۔ اسے بے نقاب دیکھ سکتا ہے۔

اب ہم پوچھتے ہیں گاندھی جی اور ان کی پوری جماعت سے جن میں ہمارے نیشنلسٹ علماء حضرات بھی شامل ہیں۔ کہ کیا نظامِ حکومت ایسا ہے جسے اسلام کے ساتھ کہیں دُور کا بھی

تعلق ہو۔ ہم چیلنج دیتے ہیں تو بت پرست علما کے پورے گروہ کو کہ کتاب و سنّت و آثار سے کوئی ایک سند ایسی پیش کریں جس کی رُو سے اسلام اپنے متبعین کے لیے اس قسم کے نظامِ حکومت کے ماتحت زندگی بسر کرنے کا نام آزادی قرار دیتا ہو۔ حیرت ہے کہ ان حضرات کی بصیرت و فراست کو کیا ہو گیا؟ انکے نزدیک کوئی شخص اکیلا ڈاکہ ڈالے تو وہ مجرم ہے، انسانیت کا دُشمن ہے لیکن اگر ڈاکوؤں کی جماعت بلکہ کثرت رائے سے کہیں ڈاکہ ڈالیں، تو یہ ڈاکہ (نعوذ باللہ) عین اسلام کے مطابق ہے۔ اس لیئے کہ یہ ڈاکہ جمہوری نظام کے ماتحت واقع ہوا ہے۔ انکا خیال ہے کہ اگر دُو آدمیوں کے مقابلہ میں ایک آدمی، دُو اور دو پانچ کہے تو یہ غلط ہو گا۔ لیکن اگر پانچ آدمی یہی کہہ دیں تو پھر یہ بالکل صحیح ہو جائیگا۔ اسلیئے کہ اب اُسے جمہوریّت کی سند حاصل ہو جائے گی۔ اگر کسی مسئلہ کی صحت کے لیئے یہی سند کافی ہے کہ اکثریت اُسکے حق میں ہے تو آپ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کو خدا کا بیٹا یا خود خدا ماننے والوں کے مسلک کی تردید کیوں کرتے ہیں، حالانکہ وہ اکثریّت میں ہیں۔ دُور کیوں جایئے، خود ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں، ہندو اکثریّت میں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حق وہی ہے، جسے اکثریت کی حمایت حاصل ہو تو پھر ہندوؤں کو حق پر ماننا پڑیگا۔ ممکن ہے آپ کہہ دیں کہ یہ تو مذہب کے معاملات ہیں، نظامِ حکومت سے اُنہیں کیا واسطہ! لیکن سوال یہاں مذہب اور حکومت کے شعبوں کا نہیں بلکہ اس بنیاد کا ہے جس پر جمہوری نظام کا نظریہ قائم ہے۔ اور وہ بنیاد یہ ہے کہ اکثریت اقلیّت کے مقابلہ میں برسرِ حق ہوتی ہے، یہ بنیاد ہی غلط ہے۔ اور جب بنیاد ہی غلط ہے تو جسقدر عمارت اسپر تعمیر ہو گی سب غلط ہو گی۔ خواہ اس میں حکومت کا کمرہ الگ ہو اور مذہب کا الگ۔

اب اسلام کیطرف آیئے۔ سوال کیا جاتا ہے کہ اسلام میں نظامِ حکومت جمہوریت ہے، یا آمریّت ہے؛ اور سوال کرنے وقت جمہوریّت اور آمریّت سے ذہن میں وہ نظام ہوتا ہے جو یورپ کی پیداوار ہے۔ لہٰذا اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ اسلام کا نظامِ حکومت نہ وہ جمہوریّت ہے جو آج کل مروّج ہے نہ وہ آمریت۔ اسلام ان نظام ہائے حکومت سے جو ذہنِ انسانی نے وضع کیئے ہیں۔ بالکل الگ

جُداگانہ اور مخصوص نظامِ حکومت کا پیامبر ہے اور یہی وہ فرق ہے جسے نظرانداز کردینے سے اسلام کے متعلق غلط تصوّرات ذہن میں قائم کرلیے جاتے ہیں۔ جمہوریّت سے مُراد یہ ہے کہ حکومت کا اختیار اکثریّت کو حاصل ہوتا ہے۔ اور آمریت سے مفہوم یہ ہے کہ یہ اختیار ایک فردِ واحد کی ذات میں مرکوز ہوتا ہے۔ لیکن اسلام میں حکومت کا اختیار نہ اکثریت کو حاصل ہے نہ ایک فرد کو، وہاں حکومت کا اختیار انسانوں سے بُلند و بالا ایک ذات کو حاصل ہے، جسے خدا کہتے ہیں ان الحکم الا للہ (حکومت کا اختیار صرف خُدا کو حاصل ہے)، اسلام کا بنیادی اُصولِ حکومت ہے۔ خدا کے سوا کسی اور میں حکومت کے اختیار کا عقیدہ اُسکے نزدیک شرک ہے اُسکے نزدیک ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی۔ باقی بتانِ آذری

حکومت، قوانین کے ذریعے قائم ہوتی ہے۔ اور ان قوانین کے اُصول وضوابط اللہ تعالیٰ نے خود مرتّب فرماکر اپنی زندہ جاوید کتاب میں محفوظ کردیے ہیں۔ اسلیے تمام اُمور کے فیصلے اِس ضابطۂ خداوندی کے ماتحت ہونگے جو ایسا نہ کریگا وہ حکومتِ الٰہی کا انکار کرنیوالا ہوگا۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ ۔ فاولٰئک ھم الکافرون ۔ (۵/۴۴)

(جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔ وہ لوگ انکار کرنیوالوں میں سے ہیں!)

ان قوانین کی تنفیذ انسانوں کے ہاتھ سے ہوگی اور انسانوں کا وہ گروہ جو ان کی تنفیذ کا ذمّہ دار ہوگا، حزب اللہ یا ملّتِ اسلامیہ کہلائیگا۔ یہی وہ جماعت ہے جو کتاب اللہ کی وارث قرار دی گئی ہے۔ قرآن کریم میں قوانینِ الٰہیہ چونکہ اصولی اور اساسی شکل میں ہیں، اسلیے اِس جماعت کا کام یہ ہوگا کہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانہ کے احوال وظروف کے مطابق جزئیات و فروعات کو ترتیب دے اور اسکے بعد ان قوانین کو دُنیا میں نافذ کردے۔ اِن مقاصدِ عالیہ کو بروئے کار لانے کے لیے ایک نظامِ عمل (نہ کہ نظامِ حکومت۔ بہ اصطلاحِ مروّجہ) کی ضرورت ہے۔ یہ نظام جیسا کہ کتاب وسنّت وآثار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، نہ تو خالصتًہ جمہوریّت ہے نہ آمریّت بلکہ

ان کو سمویا ہوا سا ہے۔ یعنی ان کی خوبیاں اس نظام میں موجود ہیں۔ اور ان کی برائیوں سے یہ منزّہ ہے۔ صحیح جمہوریت اور آزادی کے لیے مساوات اور اخوّت مقدّم ہے۔ اور مساوات اور اخوّت اسلام کی روح ہے۔ یہی اس نظام کے رگ و پے میں جلوہ فرما ہے۔ امیر کا انتخاب اس اصول پر ہوگا اور معیارِ فضیلت فقط تقویٰ ہوگا کہ یہ معیار خود ضابطۂ خداوندی کا متعیّن فرمودہ ہے۔ (ان اکرمکم عند اللہ اتقکم) اُمّت کے بہترین افراد اس امیر کی مجلسِ مشاورت کے اراکین منتخب کیے جائینگے۔ اور انکا انتخاب بھی تقویٰ اور مساوات کے معیار پر ہوگا۔ جُملہ اُمور میں مشورہ ضرور ہوگا کہ (امرھم شوریٰ بینھم) اُنکے خدا کا حکم ہے۔ لیکن باہمی مشاورت میں قرآنِ کریم کے اُصول وضوابط کی روشنی ہر مقام پر اُنکے لیے خضرِ راہ ہوگی۔ نہ امیر اس سے اِدھر اُدھر ہوسکے گا۔ نہ اس کی مجلسِ شوریٰ۔ معاملاتِ زیرِ نظر کے بہت سے ایسے گوشے جو ایک انسان کی نگاہوں سے اوجھل ہوسکتے ہیں، باہمی مشاورت سے اُبھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ اور یوں آخری فیصلہ تک پہنچنے میں بڑی آسانی ہوجاتی ہے۔ بایں ہمہ امیر اکثریت کی رائے پر مجبور نہیں ہوگا۔ پابندی صرف قرآنی اصول کی ہوگی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سامنے جب مرتدّین کے خلاف چارہ جوئی کا سوال آیا تو جماعتِ صحابہؓ میں سے ہر شخص کی یہی رائے تھی کہ انکے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جائے لیکن آپ کی رائے انکے خلاف تھی۔ چنانچہ آپنے اپنی رائے کے مطابق انکے خلاف جہاد کا فیصلہ کیا۔ اور صحابۂ کبار کو تسلیم کرنا پڑا کہ فی الواقعہ وہی فیصلہ منشائے کتاب اللہ کے مطابق تھا۔ اُسکے برعکس یہ منظر بھی ہمارے سامنے ہے کہ حضرتِ عمرؓ مہر کی رقوم پر کچھ پابندیاں عائد کرنا چاہتے تھے، لیکن مجمع میں سے ایک غریب بڑھیا اُٹھ کر آپ کی توجہ قرآنِ کریم کی ایک آیت کی طرف منعطف کراتی ہے اور آپ فوراً اپنا خیال ترک کر دیتے ہیں۔ ہم اسوقت اسلامی نظامِ حکومت کی تفصیلات سے بحث نہیں کرنا چاہتے۔ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اُصولی طور پر یہ نظام جمہوریت سے بالکل مختلف ہے جو یورپ کا وضع کردہ ہے۔ اسلامی نظامِ جمہوریت میں قوانین کے اُصول وضوابط پہلے سے متعیّن ہیں صرف ان کی جزئیات کی ترتیب باقی رہتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان جزئیات میں اگر بہ تقاضائے بشریّت

غلطی بھی ہو جائے تو وہ ایسی خطرناک نہیں ہوتی جتنی اُصول کی غلطی۔ لہٰذا اسلام کے نزدیک صرف وُہ نظامِ زندگی قابلِ قبول ہو سکتا ہے جس کا مقصدِ وحید دُنیا میں قوانینِ الٰہیہ کی تنفیذ و ترویج ہو۔ اور بس۔ اور یہ مقصد کبھی اِس جمہوریت سے حاصل نہیں ہو سکتا جس میں فیصلے اکثریت کی آراء کے مطابق ہوں اور اکثریت غیر مُسلموں کی ہو۔ اب آپ کہیئے کہ وہ نظامِ حکومت جسے ہندوستان میں قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اور اس کوشش کا نام آزادی کے لیے جہاد قرار دیا جاتا ہے، کس طرح مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ مُسلمان کے لیے مقدّم شئے اصُولِ حکومت Principle of Government ہے۔ ہیئت حکومت (Form of Government) کا سوال بعد میں پیدا ہوتا ہے۔ جب اصُولِ حکومت وہ نہیں جو قرآنِ کریم کا متعیّن فرمودہ ہے، تو ہیئتِ حکومت جمہوریت ہو یا ملوکیت، دونوں ناقابلِ قبول ہیں۔ مُسلمان کے نزدیک قوانینِ خداوندی، قوانینِ فطرت کی طرح اٹل اور غیر متبدّل ہیں اور دُنیا کی کوئی طاقت ان میں ردّوبدل کرنے کا اختیار نہیں رکھتی، خواہ وہ طاقت چنگیز خاں کی ہو یا ہٹلر کی۔ وائٹ ہال کی ہو یا واردھا کی۔ جب تک مُسلمان کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہوتی، وہ اپنے آپ کو آزاد نہیں کہہ سکتا۔ دُنیا کے پاس چونکہ ایسا ضابطہ خداوندی نہیں، اسلیئے وہ نظامِ حکومت کی مختلف شکلیں اپنے ذہن سے وضع کرتے رہتے ہیں۔ کبھی ایک قسم کا نظام قائم کیا، پھر اس سے تنگ آ گئے تو کوئی دوسری صُورت تجویز کر لی۔ وہ ناکام ثابت ہوئی تو کسی اور طرف چل پڑے۔ جب یہ حالت آزاد اقوامِ عالم کی ہو رہی ہے تو غلام قوموں کا تو پُوچھیئے ہی نہیں۔ خود ہندوستان میں دیکھیئے کہ یہ غلام آبادیورپ کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں کی طرف کس طرح لپک کر جاتا ہے۔ جس طرح ہندوستان کے بازاروں میں یورپ اور امریکہ کے اُترن کوٹوں کا استقبال یہاں کے مادّی افلاس کی پردہ دری کرتا ہے۔ اسی طرح ان کے اُترن نظریوں کا رواج یہاں کے ذہنی افلاس کی غمّازی کرتا ہے۔ لیکن افسوس ہے مسلمانوں پر کہ اُنکے پاس قوانینِ الٰہی کا ایسا درخشندہ اور تابناک ضابطہ موجود ہے اور یہ دوسروں سے بھیک کے ٹکڑے مانگتے پھر رہے ہیں۔

پھر کہا جاتا ہے کہ جب ہندوستان کے نظامِ جمہوریت میں اقلیتوں کو اُنکے مذہب کے تحفظ کی ضمانت دی جاتی ہے، تو پھر مسلمانوں کو اس نظامِ حکومت پر اعتراض کیا ہو سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا سادہ اور پُرکار حربہ ہے کہ بڑے بڑے دیدہ وراسکا نشانہ بنکے رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر ذرا نگہِ دُور رس سے دیکھا جائے تو حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ دُنیا کے نزدیک مذہب محض چند رسوم اور عبادات کا نام ہے۔ انکے علاوہ اور سب کام "دُنیاوی شعبہ" میں آجاتے ہیں۔ چنانچہ ابھی پچھلے دنوں گاندھی جی نے پھر اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ مسلمان آزادی سے نماز پڑھیں، روزے رکھیں، عیدین منائیں، انہیں کوئی نہیں روکے گا۔ یہ اس سے زیادہ اور کیا تحفظ چاہتے ہیں۔ اور یہ وہ گاندھی جی ہیں، جنہیں خیر سے یہ دعویٰ ہے کہ بیئے قرآن[1] بھی پڑھا ہے اور سیرت کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ لیکن انہیں کون سمجھائے کہ اسلام کے نزدیک مذہب کا دائرہ عبادات و رسوم سے کہیں وسیع تر ہے۔ اس میں دین اور دُنیا، چرچ اینڈ سٹیٹ دو مختلف شعبے نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہی کپڑے کے تانے بانے ہیں۔ اسلامی نظامِ زندگی میں مذہب کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسی نظامِ جسمانی میں سانس کی، کہ بظاہر اسکا تعلق صرف پھیپھڑوں سے معلوم ہوتا ہے، لیکن اعضاء و جوارح میں سے ہر ایک کی زندگی کا دار و مدار اسی پر ہے۔ اسلام میں زندگی کا کوئی معاملہ ایسا نہیں جو مذہب کی حدود میں نہ آتا ہو۔ پیدا ہونے سے مرنے تک ایک مسلمان کی زندگی کا ہر لمحہ، انفرادی ہو یا اجتماعی، مذہب سے وابستہ ہے اسلئے اس امر کی ضمانت بالکل بے معنی ہے کہ مسلمانوں کو "مذہبی معاملات" میں پُوری آزادی حاصل ہوگی، اور نظامِ جمہوریت صرف "غیر مذہبی معاملات" پر حاوی ہوگا۔ اسلام میں اس قسم کی تقسیم کا تصوّر ہی باطل ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کے نزدیک نظامِ حکومت صرف وہی قابلِ قبول ہو سکتا ہے، جس میں اُنکے تمام اُمور قوانینِ الٰہیہ کی روشنی میں طے پائیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انکی اپنی جماعت ہو، اپنا امیر ہو، اپنا قانون ہو، اپنی حکومت ہو۔ ہندوستان میں اس کی ایک ہی

[1] غالباً مولانا آزاد کی وہ تفسیر پڑھی ہوگی جسکا ہندی ترجمہ کانگرس کی طرف سے شائع ہُوا تھا۔

عملی شکل ہو سکتی ہے کہ مسلم انڈیا کو باقی حصۂ ملک سے الگ کر دیا جائے۔ اسکے علاوہ بحالت موجودہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آزادی کی کوئی صورت نہیں۔ جب مسلمان کو اس قسم کی آزادی حاصل ہو گی تو یہ اسوقت بتا سکے گا کہ کس قسم کا نظام حکومت انسانیت کی سرفرازی و سربلندی کا موجب ہو سکتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ مسلم انڈیا میں جو غیر مسلم اقلیتیں ہوں گی ان کی مذہبی آزادی کا تحفظ کس طرح ہو سکے گا۔ لیکن یہ مسئلہ بالکل واضح ہے، جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی لکھا ہے، اسلام کے سوا تمام ادیانِ عالم میں مذہب کا دائرہ صرف چند عبادات و رسوم تک محدود ہے۔ اسلیئے اِن مذاہب کے متبعین کے لیے مذہبی آزادی کی ضمانت کچھ مشکل نہیں۔ غیر مذہب کی عبادتگاہوں کا تحفظ تو ازروئے قرآن کریم مسلمانوں پر ضروری ہے۔ اسلیئے مسلم اکثریت کے علاقوں میں غیر مسلم اقلیت کو اپنے مذہب کی آزادی کے بارے میں کوئی شکایت نہیں ہو سکتی۔ مسلمان ہر مذہب والے کو تحفظ کی ضمانت دے سکتا ہے۔ لیکن دنیا کی کوئی حکومت مسلمان کو مذہبی تحفظ کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ مسلمان کا مذہبی تحفظ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ حکومت ان کی اپنی ہو کہ یہاں مذہب اور حکومت دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ دوسرا سوال یہ رہ جاتا ہے کہ غیر مسلم اکثریت کے علاقہ میں جو مسلمان باقی رہ جائینگے انکا نظام زندگی کیا ہو گا۔ سو ظاہر ہے کہ ان کی یہ حالت بالکل اضطراری ہو گی۔ اگر انہیں اسلامی نظام حکومت کے ماتحت زندگی بسر کرنا مقصود ہو گا تو انہیں اپنی اضطراری حالت سے جتنی جلدی ہو گا چھٹکارا حاصل کر کے مسلم اکثریت کے علاقوں میں آ جانا ہو گا، کہ غیر مسلم حکومت کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر قناعت کر جانا اسلامی زندگی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ البتہ اسلامی حکومت کے ایک فرد کی حیثیت سے وہ دنیا میں کہیں رہے، جب تک اسکا رشتہ اپنے مرکز سے جڑا ہوا ہے، اس کی پوزیشن بڑی ممتاز ہو گی۔ یہ ہے ہندوستان میں مسلمانوں کا مطمح نگاہ ور یہاں نصب العین کا حصول ہماری آزادی ہے۔ البتہ اس منتہیٰ تک پہنچنے کے لیئے ہمیں مختلف مراحل سے گزرنا ہو گا۔ اور ان مراحل میں جو کچھ ہم حاصل کرتے جائیں غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ ہم پہلی جست میں اس منتہیٰ تک نہیں پہنچ سکتے البتہ ہمیں اس امر کا یقین کر لینا چاہیئے۔ کہ ہمارا ہر قدم اسی نصب العین کی طرف اٹھ رہا ہے۔ اور یہی راستہ ہے جو آج

آئینی جدوجہد میں مسٹر جناح کے پیشِ نظر ہے"۔

اب آپنے ملاحظہ فرمالیا کہ مسلمانوں کے نزدیک وہ نظامِ جمہوریت جسے ہندو یہاں قائم کرنا چاہتے ہیں، کیوں ناقابلِ قبول ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ فقط اتنی بات کہ ہندو اس طرزِ حکومت کی اس قدر حمایت کررہا ہے اس امر کی کافی دلیل ہے کہ یہ طرز مسلمانوں کی ملّی خودکشی کا باعث ہوگا اسلئے کہ قرآنِ کریم کا واضح ارشاد ہے (ودوا ماعنتم) یہ تو صرف اس چیز کی خواہش کرینگے جس سے تمہیں نقصان پہنچے۔ یہ تمہارے فائدے کی کبھی سوچ ہی نہیں سکتے۔ اسلئے اگر یہ کبھی یہ بھی کہیں کہ فلاں نظریہ بالکل اسلامی ہے تم اسے اختیار کیوں نہیں کرتے تو بھی مسلمان کو ہزار مرتبہ سوچنا چاہیئے کہ اس میں کیا راز ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ شیطان ایک خضر صورت بزرگ کی شکل میں ایک عابد درزاہد کے پاس گیا اور اسکے سامنے پاپیادہ حج کرنے کے اتنے فضائل بیان کئے کہ وہ شخص حج کے لئے آمادہ ہوگیا۔ ایک دوسرے بزرگ تھے جنہیں معلوم تھا کہ یہ ناصحِ مشفق کون ہیں۔ انہوں نے شیطان سے پوچھا کہ تیرا کام تو ہمیشہ نیکی سے بہکانا ہے، آج خلافِ مسلک اس بزرگ کو حج پر کیوں آمادہ کیا جارہا تھا۔ اسنے کہا کہ مینے مسلک تو نہیں چھوڑا۔ جو کچھ مینے کیا بالکل ٹھیک تھا۔ مجھے معلوم ہُوا تھا کہ اسلامی لشکر جہاد کی تیاری کررہا ہے اور جو لوگ ادھر اُدھر عبادتگاہوں میں معتکف بیٹھے ہیں انہیں دعوتِ جہاد دے رہا ہے۔ اسلئے مینے یہ مناسب سمجھا کہ ایسے لوگوں کو پاپیادہ حج کے لئے روانہ کردوں تاکہ یہ جہاد میں شامل نہ ہوسکیں۔ کچھ اسی قسم کے ناصحانہ مشورے ہیں ہمارے ان برادرانِ وطن کے جو قرآن و سیرت کے مطالعہ کا دعوئے کرکے مسلمانوں کو انکا بُھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں کہ جمہوری نظامِ حکومت عین اسلامی نظام ہے' جو مسلمان اس سے انکار کرتا ہے قابلِ دار ہے۔ لیکن ہمیں ہندوؤں پر افسوس نہیں۔ اسلئے کہ انکا تو مطمحِ نگاہ ہی مسلمانوں کی تخریب ہے۔ افسوس ہے ان مسلمانوں پر جو گاندھی جی کی تفسیری شکر اُنکے راگ کو محراب و منبر اور حازنہ و مکبرہ سے اُونچے اُونچے سُروں میں الاپنا شروع کردیتے ہیں' اور نہیں سوچتے کہ ہم ملّتِ اسلامیہ کو تباہی و بربادی کے کس جہنّم کی طرف لئے جارہے ہیں۔ اور پھر قیامت یہ ہے کہ اپنے ان ملّت کش نظریوں

کی تائید میں کتاب و سنّت کو مسخ کرنے سے بھی نہیں شرماتے۔ کتنی بڑی ہے یہ جرأت اور کتنی زبردست ہیں وہ مصلحتیں جو انہیں اس جرأت پر آمادہ کر دیتی ہیں۔ (لیشترون بایات اللہ ثمناً قلیلاً)۔ حیرت ہے کہ یہ حضرات اگر کتاب و سنّت کی طرف سے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں تو کیا روزمرہ کے واقعات بھی اُنکے سامنے نہیں آتے۔ ان سے کہیے کہ ذرا اپنے کانگرسی آقاؤں سے اتنا تو پوچھیں کہ اگر نظامِ جمہوریت ہندوستان کے لیے بہترین نظام ہے تو آج جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں بھی نظام انہیں کانٹے کی طرح کیوں کھٹکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ دستور و آئین کی رُو سے پنجاب اور بنگال میں بھی وہی نظامِ حکومت رائج ہے۔ جو یُو۔پی اور بمبئی میں ہے (وزارتی استعفوں سے پیشتر سے مُراد ہے)، اور یہ نظام کم و بیش جمہوری نظام ہی ہے۔ یو۔پی اور بمبئی میں چونکہ ہندوؤں کی اکثریت ہے اسلیئے وہاں یہ نظام آسمانی سمجھا جاتا ہے۔ اور جب بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت نظر آتی ہے تو وہی نظام یہاں مردود بنجاتا ہے۔ اگر جمہوری نظام نعمت ہے تو یہی بنگال میں لعنت کیوں بنجاتی ہے؟ اور ہر کانگرسی ایڑی سے چوٹی تک کا زور کیوں لگاتا ہے کہ اس نظام کو اُلٹ کر اکثریت ان کی پیدا کی جائے جو کانگرسیوں کے ہم خیال ہوں۔ اس سے معلوم ہُوا کہ خود کانگرسی حضرات کے نزدیک بھی محض جمہوری نظام کوئی قابلِ قدر شئے نہیں۔ وہی نظامِ جمہوریت قابلِ قبول ہے جس میں اکثریت ان کی اپنی ہو۔ لیکن کانگرس وہی کچھ کہے تو حق و صداقت ہے اور مسلمان وہی کچھ کہیں تو ضد اور تعصّب! یہ ہے ہماری موجودہ سیاست! مسلمان بھی یہی کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک نظامِ جمہوریت اسلیئے قابلِ قبول نہیں کہ اس میں اکثریت ان کی ہوگی جو ہمارے ہم خیال نہیں۔ ڈاکٹر کٹجو (سابق وزیر یو۔پی) اس دعوے کی دلیل میں کہ جمہوریت عین اسلام کے مطابق ہے فرماتے ہیں:۔

> "مسلمانوں کا نماز کے لیے حیرت انگیز اجتماع مسلمانوں کی مروجِ جمہوریت کا بہترین مظہر ہے۔
>
> جمہوریت اور اسلام لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مسلمان جمہوریت کے خلاف آواز اُٹھاتے ہیں۔" (اسٹیٹس مین ۲۴؍۳)

دیکھیئے۔ جادو کس طرح سر چڑھ کر بولتا ہے۔ بالکل درست فرمایا۔ یہی ہے وہ نظام جو مسلمانوں کے

نزدیک قابلِ قبول ہے۔ یعنی خالص اپنی جماعت، اپنا امام اور اس امام کی اطاعت۔ ہم ڈاکٹر مُونجے سے پوچھتے ہیں کہ کیا انہوں نے کبھی ایسا بھی دیکھا ہے کہ نماز کی جماعت میں اکثریت غیر مسلموں کی ہو اور یہ اکثریت ایک ہندو کو امام منتخب کرے اور پھر مسلمان اس امام کے پیچھے نماز ادا کر رہے ہوں!

بس یہی ہے فرق اسلامی جمہوریت اور کانگرسی جمہوریت میں۔ اسلامی جمہوریت نماز کی اس شکل پر مرتب ہوگی جو چودہ سو سال سے چلی آرہی ہے۔ اور کانگرسی جمہوریت وہ دوسری شکل ہے جسے آج مسلمانوں کے سامنے اسلامی لیبل لگا کر پیش کیا جارہا ہے، حالانکہ وہ خالصتہً غیر اسلامی ہے۔ مسلمانوں کی جماعت خالص اسلامی جماعت ہوگی، متحدہ قومیت کی جمہوری جماعت نہیں ہوگی۔

اب آپ خود ہی فیصلہ فرمالیجیے کہ مسٹر جناح ہمیں کس قسم کی نماز کی طرف دعوت دے رہے ہیں اور جناب نوری اینڈ کو کدھر بلا رہے ہیں۔ ان لوگوں سے ہم سوائے اسکے اور کیا کہیں کہ مسٹر جناح نے جو کچھ کہا تھا وہ تو بالکل واضح تھا۔ لیکن

تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے!

طلوعِ اسلام
جنوری ۱۹۴۰ء

یومِ نجات

صدر مسلم لیگ نے ہندوستان میں "یومِ نجات" منانے کا اعلان کیا گیا۔ گویا بھڑوں کے چھتہ میں پتھر دے مارا۔ پریس جس کی قوت سے آج کی دنیا میں کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ہندوؤں کا اپنا ہے۔ اس لئے جا و بیجا شور مچانے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ ملک کے طول و عرض میں طوفان برپا کر دیا گیا۔ قریہ بہ قریہ اور دمبدم ایک آگ لگا دی گئی۔ کانگرسی۔ مہاسبھائی سرمایہ دار۔ سوشلسٹ۔ چھوٹے۔ بڑے۔ کس و ناکس۔ ہر ایک نے چلّانا شروع کر دیا۔ اور وہ ہلڑ مچا کہ توبہ بھلی۔ اور یہ سب کچھ کس بات پر؟ صرف اس جرم پر کہ مسلمان اُن زخموں پر سے کپڑا کیوں اٹھاتے ہیں؟ جو انہیں ان "برادرانِ یوسف" کے ہاتھوں گزشتہ دو تین برس میں لگے ہیں۔ گھاؤ کی تکلیف سے کراہتے کیوں ہیں۔ جو ان کم ظرف تازہ واردانِ بساطِ حکومت کی ہوسِ ستم رانی اور مشقِ ناوک افگنی کے صدقے اُنکے کلیجے میں ناسور ڈالے ہوئے ہے ان پر الزام یہ ہے کہ انکے سینے میں ایسا دل کیوں ہے جسے جور و استبداد کا احساس ہو انکی آنکھیں کیوں ایسی حسّاس ہیں۔ کہ ان میں وفورِ غم سے آنسو ڈبڈبا آئیں۔ ہندوؤں کو شکایت ہے کہ ہم مسلمانوں کو مارتے ہیں تو یہ روتے کیوں ہیں۔ ہم انہیں ذبح کرتے ہیں تو اُن کی رگوں سے ایسا رنگین خون کیوں نکلتا ہے، جو ہمارے دامنِ معصومیت کو داغدار بناد ے انہیں گلہ ہے کہ ہم انکا گلا گھونٹتے ہیں تو یہ سامنے سے آنکھیں کیوں دکھاتے ہیں، انہیں شکوہ ہے کہ ہم اُن کی متاعِ تہذیب و تمدّن اور سرمایۂ علم و دین کو لوٹتے ہیں۔ تو یہ ہمیں بلندیٔ اقبال اور علوِ مرتبت کی دعائیں کیوں نہیں دیتے۔ انہیں افسوس ہے کہ یہ بد ذوق "ہماری شمشیرِ جوہر دار کی روانی پر تحسین و آفرین کے نعرے بلند کیوں نہیں کرتے انہیں رنج ہے کہ یہ بسمل قاتل کو مرحبا کہنے کی بجائے تہِ خنجر تڑپتے کیوں ہیں انکی پیشانی شکن آلود کیوں ہو جب ہم تیغ بکف انکی طرف ہجوم کر کے آتے ہیں تو ان ناآشنایانِ آئینِ محبت کی طرف سے ہمارا استقبال ان الفاظ میں کیوں نہیں ہوتا کہ ؏

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!

اور انہیں بے حد قلق ہے کہ جب ہم چلّہ پر تیر چڑھا کر ان کے سینے کو چھلنی کرنا چاہتے ہیں

تو یہ ناواقفانِ دستورِ عشق یہ کیوں نہیں کہتے کہ

تو مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

ہاں! انہیں گلہ ہے اور بجا طور پر گلہ۔ انھیں صدمہ ہے اور بالکل برمحل صدمہ کہ یہ "بندگانِ وفا" اپنے اللہ کے حضور میں ہمارے ظلم و ستم کی فریاد لے کر کیوں پہنچے ہیں اور حق تو یوں ہے کہ ایک ہندو پر ہی کیا موقوف ہے۔ دُنیا میں کون سا ظالم ہے جو اپنے آپ کو ظالم کہلا کر خوش ہوتا ہے کون سا ستمگر ہے جو اپنے ستم و استبداد کے چرچے سن کر نعل در آتش نہیں ہو جاتا فرعون کو بھی حضرت موسےٰؑ سے یہی شکایت تھی کہ وہ بنی اسرائیل کو "شکرِ نعمت" کے بجائے "شکوہ جور و ستم" کا سبق دیتے تھے۔ جب سے دُنیا میں ظلم و ناانصافی کا وجود قائم ہوا ہے۔ ظالم کو ہمیشہ یہ گلہ رہا ہے کہ مظلوم اُسکے ظلم و استبداد کی شکایت کیوں کرتا ہے۔ لہٰذا آج ہندو مسلمانوں کے احساسِ مظلومیت کے مظاہرہ کے خلاف اگر اس قدر آتش در پیرہن ہے تو یہ کونسی نئی بات ہے۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے!

وہی فطرتِ اسد اللہی۔ وہی مرحبی وہی عنتری

ہندو پوچھتا ہے کہ یہ تو بتاؤ کہ تمہیں شکایت کیا ہے! ہم نے تم پر کون سے ظلم توڑے ہیں! کون سے ستم ڈھائے ہیں!! ذرا اس کی تفصیل تو بیان کرو۔

کانگرسی اربابِ حل و عقد کے مظالم کی فہرست میں ایک تو اس قسم کے واقعات و حادثات ہیں جن میں ان بھیڑ نما بھیڑیوں نے قوت و حکومت کے نشہ میں بدمست ہو کر نہتے مسلمانوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا۔ اس فردِ جرم میں دوری۔ ٹانڈہ۔ کانپور اور بلند شہر وغیرہ کے خون آلود ذرات ان کوتاہ آستینوں کی دراز دستیوں کی زندہ شہادت موجود ہیں۔ ان کے نامۂ اعمال کے اس حصہ میں اُن بیواؤں کی گریہ و زاری ہے جنکے سُہاگ لُوٹ لئے گئے۔ اُن یتیموں کی آہ و فغاں ہے جنکے سر سے باپ کا سایہ اٹھا لیا گیا۔ اُن ضعیف ماؤں کے بین ہیں جن کی زندگی کے آخری سہارے توڑ دیئے گئے۔ یہ وہ حصہ ہے کہ پیر پور کمیٹی، بہار کی تحقیقاتی کمیٹی اور حاجی عبداللہ ہارون کی زیرِ ترتیب رپورٹ کا ایک ایک لفظ جس کا آئینہ دار ہے۔ جُوں جُوں اس باب میں تحقیقات . . . . . . کی جائے گی ان کے نامۂ اعمال

کے اس حصّے کا ایک ایک پہلو بے نقاب ہوتا چلا جائے گا۔ یہ حصّہ سرِدست ہمارے موضوع سے خارج ہے، ہم ان کی کتاب عمل کا ایک اور باب سامنے لاتے ہیں۔ اور پوچھتے ہیں اربابِ بصیرت کے جذبۂ حق و انصاف سے کہ کیا مسلمانوں کی ملی ہستی کے استہلاک کے لیئے ان سے بڑھ کر کچھ اور بھی کیا جا سکتا تھا۔

مسلمان کا یہ دعوےٰ ہے، اور وہ از روئے قرآن اس دعوے کو اسلام کی ایک بنیادی حقیقت قرار دینے پر مجبور ہے کہ وہ دنیا میں ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ دنیا کی کسی دوسری قوم کے ساتھ مل کر ایک نئی قوم نہیں بنا سکتا اس اصول کی لازمی شق یہ ہے کہ مسلمانوں کی نمائندہ صرف وہی جماعت ہو سکتی ہے جو خالص مسلمانوں پر مشتمل ہو۔ کوئی مخلوط جماعت ان کی نمائندگی نہیں کر سکتی۔ لہٰذا ہر وہ تحریک جو مسلمانوں کے اس مسلک کے خلاف جائے گی۔ ان کے مخالف اور ان کے مذہب کی ضد ہوگی۔ ہر وہ کوشش جو ان کی جداگانہ ملّی ہستی کو مٹانے کے درپے ہوگی۔ ان کے نزدیک انتہائی ظلم ہوگا۔ اب ذرا دیکھئے کہ کانگرس نے اپنی قوت و حکومت کے زمانہ میں مسلمانوں کے اس مقدس مسلک کو توڑنے، کچلنے اور فنا کر دینے کے لیئے کیا کچھ نہیں کیا۔ انہوں نے صرف ان نام نہاد مسلمانوں کو اپنا رفیقِ کار بنایا جو اس عقیدہ کے خلاف قومیت پرستی کے عقیدہ کے حامل تھے صوبجاتِ متوسط میں کابینۂ وزارت میں شامل کرنے کے لیئے ایسا مسلمان نہیں ملسکا تو اس کرسی کو خالی رکھ لینا گوارا کر لیا گیا۔ لیکن مسلمانوں کا صحیح نمائندہ مسلمان وزیر متعین نہیں کیا گیا۔ انہوں نے اپنی انتہائی کوشش اور پوری قوت اس بات میں صرف کر دی کہ مسلمانوں کی غیر مخلوط جماعت (مسلم لیگ) کا کوئی امیدوار انتخاب میں کامیاب نہ ہو۔ انہوں نے مسلمانوں کی وزارتیں توڑنے کے لیئے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کیا۔ انہوں نے مسلمان زعمائے ملت کو ہر طرح سے بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ آسام کی اولین (سعد اللہ) منسٹری اور بنگال میں حق منسٹری کی مخالفت میں ہر ممکن کوشش کی گئی۔ سرحد اور سندھ میں مسلمانوں کے اس مسلک کو توڑنے کے لیئے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا دیا گیا۔ پنجاب کی وزارت اگرچہ ان کی نگاہ میں بے ضرر تھی، تاہم محض اس بنا پر کہ وزیراعظم مسلم لیگ کے جلسوں میں شرکت کرتا ہے، وہاں کی حکومت کے راستے میں روڑے اٹکائے

میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی گئی۔ ہم پوچھتے ہیں کہ وہ اربابِ حکومت جنکی مسلسل کوشش یہ رہی ہو کہ مسلمانوں کے اس مسلّمہ حق کو ان سے چھین لیا جائے کس منہ سے دعوےٰ کرسکتی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف کچھ نہیں کیا! یہ ذرا یاد کریں اس دور کو جب انگریز کی حکومت کانگریس کی حقِ نمائندگی کو تسلیم نہیں کیا کرتی تھی۔ جب وہاں سے کانگریسی خیالات کے لوگوں کی مخالفت ہُوا کرتی تھی۔ جب وہ اپنے قصرِ حکومت میں کانگرسی زعمار کو اذن باریابی نہیں دیا کرتے تھے تو اُس وقت کانگریسی حضرات کس طرح انگریز کو ظالم و جابر۔ قاہر و ستمگر اور اس کی حکومت کو شیطان کی حکومت کہا کرتے تھے اور اس حکومت کے خلاف کس طرح آئے دن مظاہرے کیے جاتے تھے اور یوم (DAYS) منایا جایا کرتے تھے۔ ہندو وہی کچھ کریں تو عین حق و انصاف اور حریت پسندی لیکن اُنہی حالات کے ماتحت مسلمان اسی قسم کا اقدام کریں تو قابلِ سوختنی اور سزاوارِ گردن زدنی۔

اور یہ بھی یاد رہے کہ کانگریس نے مسلمانوں کے اس مسلّمہ کے خلاف جو کچھ کیا وہ نشۂ حکومت کی بدمستی میں کیا۔ اس لیے کہ جس دن سے حکومت انکے ہاتھ سے چلی گئی ہے یہ بامِ غرور و تکبر سے بہت نیچے اُتر آئے ہیں۔ اب لیگ کو مسلمانوں کی بہت بڑی نمائندہ جماعت کہا جا رہا ہے، صدرِ مسلم لیگ کو حریت پرست تسلیم کیا جا رہا ہے، کانگریس کے دعوےٰ عالمگیر نمائندگی کو پس پشت ڈالا جا رہا ہے، وہی لیگ جو ٹوڈیوں کی جماعت کہی جاتی تھی اس کے متعلق اب اعلان بر اعلان ہو رہا ہے کہ نہیں جس طرح کانگریس آزادی کی حامی ہے اسی طرح لیگ بھی ہے، حتیٰ کہ مسلمانوں کے لیے جُداگانہ انتخاب کا حق بھی تسلیم کیا جا رہا ہے۔

کہیے کہ اگر مسلمان بارگاہِ رب العزت میں اس امر کا سجدۂ شکرانہ ادا کریں کہ اُس نے تھوڑی سی "مے" حکومت سے بہک جانے والے کم ظرف قدح خواروں کے ہاتھ سے ساغر و مینا چھین کر اُن کی مدہوشی کو ہوش سے بدل دیا۔ تو یہ کون سا ایسا جرم ہے جس کے خلاف محشر انگیز ہنگامے برپا کر دیے جائیں۔ یہ تو وہ موقع تھا کہ ہندو خود سجدۂ شکر ادا کرتے کہ اللہ نے انکے گم گشتہ حواس کو ٹھکانے لگا دیا۔ ورنہ معلوم لغزش پا انہیں تباہی و بربادی کے کون سے جہنم میں لے گرتی۔ لیکن اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ انسان بڑا ناشکر واقع ہوا ہے۔

پھر مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اسلام تمام مذاہبِ عالم پر افضلیت اور فوقیت رکھتا ہے اور دنیا کا کوئی مذہب عالمگیر سچائیوں کے اعتبار سے اسکے برابر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ دُنیا میں اسلام کے سوا کوئی مذہب یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ جس کتاب کو وہ آسمانی صحیفہ سمجھتا ہے۔ وہ لفظ لفظاً اور حرف حرف وہی ہے جبکہ اُن کے کسی سچے باقی مذہب کو خدا کی طرف سے ملی تھی، مسلمان کا یہی وہ عقیدہ ہے جو بقول مسٹر مہادیو ڈیسائی مسلمانوں کو ایک الگ قوم بنانے کا مُوجب ہے۔ اور اُسے کسی اور قوم میں جذب نہیں ہونے دیتا۔ لہٰذا کانگریسی زعمار کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کو اُن کے اس عقیدے سے بیگانہ کر دیا جائے اس باب میں کانگریسی دورِ حکومت میں جو کچھ ہُوا اُس کی زندہ شہادت رسوائے عالم "واردھا تعلیمی اسکیم" ہے، یہ وہ اسکیم ہے کہ جس کی ہر سچے مسلمان نے مخالفت کی۔ حتے کہ جمعیتہ العلماء جیسی کانگریس پرست جماعت نے بھی کُھلے کُھلے الفاظ میں اس کی تردید کی۔[1] لیکن کانگریس اپنے حکومتی اختیارات کے بل بوتے پر جس شدومد سے اس اسکیم کو برُوئے کار لائی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں! بعض صوبوں میں اس کا عملی نفاذ ہو گیا۔ بعض میں اسے بالاقساط اختیار کیا گیا، صوبہ بمبئی میں اس اسکیم کی روشنی میں ہندوستانی کی وہ کتابیں رائج کی گئیں جو اس اسکیم کی ٹکسال (جامعہ ملیہ) سے مرتب کرائی گئی تھیں۔ اور جنہیں اب موجودہ حکومتِ بمبئی نے، مسلمانوں کی پیہم مخالفت کی بنا پر منسوخ قرار دیدیا ہے۔

کہیئے کہ وہ حکومت جو مسلمانوں کے مذہب و تمدن پر اس طرح کُھلے بندوں ڈاکہ ڈالے۔ اُسے ڈاکوؤں کی حکومت کہنے میں کون سی زیادتی ہے۔ اور اس حکومت کے پنجۂ استبداد سے رہائی ملنے پر اگر خدا کی بارگاہ میں مسلمان سجدہ ریز نہ ہوں۔ تو اُن سے بڑھ کر اللہ کے احسان کا ناسپاس اور کون ہوگا

---

[1] جمعیتہ العلماء ہند نے اپنے اجلاس دہلی منعقدہ مارچ ۱۹۳۹ء میں واردھا اسکیم کے خلاف ریزولیوشن پاس کیا تھا اور ناظم صاحب نے کُھلے اجلاس میں کہا تھا کہ اگر کانگریس نے اس اسکیم کو واپس نہ لیا تو ہم سول نافرمانی کریں گے۔ یہ اسکیم بدستور جاری رہی۔ لیکن ہمارے حریت مآب علمائے کرام کے یہ الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہوئے۔

پھر کانگریس کو یہ بھی معلوم ہے کہ مسلمان جب تک اپنے ماضی سے وابستہ ہے وہ کبھی کسی دوسری قوم میں جذب نہیں ہو سکتا۔ اور وہ کڑی جو کسی قوم کے حال کو اس کے ماضی سے پیوست رکھتی ہے، زبان ہے۔ لہٰذا ان کی انتہائی کوشش یہ رہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح مسلمان کو اردو زبان سے بیگانہ بنا دیا جائے۔ اور اس کی جگہ وہ زبان رائج کی جائے جس سے مسلمان کا حال، حجاز کے ماضی سے وابستہ ہونے کی بجائے براہمن کے "تحت جگت" سے جا ملے۔ کانگریس کو یہ بھی معلوم ہے کہ مسلمان اردو کی معدومی اور ہندی عرف ہندوستانی کی ترویج کے کس قدر مخالف ہیں۔ لیکن باایں ہمہ کانگریس نے اپنے عہدِ حکومت میں جس بری طرح اردو کو ذبح کر کے اس کی جگہ ہندی کو رائج کیا اس کی قرار واقعی صدائے بازگشت "جکت پرانت" (صوبہ متحدہ) کے اسمبلی ہال میں آج تک "ولیشن سُدھ جنتر" اور "گرڑ سدھانک" کے جناتی لب و لہجہ میں ہر صاحبِ ذوقِ سلیم کی دل گرفتگی کا باعث بن رہی ہے۔ اگر کسی محکمۂ احتساب نے کبھی پڑتال کی تو اسے معلوم ہوگا کہ کانگریسی حکومتوں نے ہندی کی ترویج پر کس طرح پانی کی طرح روپیہ بہایا ہے۔ فرمائیے کہ تمدنِ اسلامی کے شجرِ طیب پر اس طرح بے محابا تیر چلانے والے کے ہاتھ شل ہو جانے پر اگر کسی کا قلبِ محزون "الحمد للہ" کہہ دے تو اس سے کون سی ایسی خطا ہو گئی کہ اسے یوں ہدفِ سبّ و شتم بنا دیا جائے۔

ہم اس قسم کے واقعات کی کون کون سی تفصیلات بیان کریں اور اپنے محسنینؒ کی کس کس نوازشِ بے جا کا تذکرہ کریں۔ یہاں تو یہ عالم ہے کہ

سینہ تمام داغ داغ پنبہ کجا کجا نہم

پھر اگر مشکل صرف داغہائے نمایاں کے گنا دینے سے ہی حل ہو جائے تو ہم یہ بھی کر دیں لیکن اس کا کیا علاج کہ ہزاروں زخم ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی نشان نہیں ہوتا۔ اور لاکھوں تیر ایسے چلائے جاتے ہیں جن کو کمان کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہم ان گولیوں کو گنا سکتے ہیں جن کے دھماکے کی آواز ہر سننے والے کان نے سنی ہو اور جن کے زخموں کا لہو ہر دیکھنے والی آنکھ نے دیکھا ہو۔ لیکن ہم تیر کی اس آن کو کیسے دکھائیں جو کسی کے ابروئے خشمگیں سے نکل کر دل کی گہرائیوں میں اتر گیا ہو۔ نہ کسی نے اس کی آواز سنی ہو نہ خون کا قطرہ دیکھا ہو۔ ہندو ہم سے فہرست مانگتا ہے ان زخموں کی جن کا تعلق صرف احساس سے ہے۔ کہیے کہ ہم ان زخموں کو

کیسے گنائیں اور کیسے دکھائیں۔

کسے بتائے کوئی خونِ آرزو کیا ہے!
انھیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے رنگ تو کیا ہے

کسی کو گالی دی جائے تو یہ گالی دینے والے کے خلاف ایک کھلا ہوا جرم ہے جسے گنایا جاسکتا ہے۔ بتایا جاسکتا ہے۔ لیکن جب کوئی یہ کہے کہ "اں جناب جناح صاحب! حضور کی کیا بات ہے! تو ان "جناب" اور "حضور" کے بظاہر تعظیمی الفاظ کے اندر طعن و تشنیع کے جو زہر آلود نشتر چھپے ہیں انھیں کوئی کس طرح دکھا سکے۔ ہندو دورِ حکومت کے اس اڑھائی سال کے مختصر عرصہ میں کانگریسی صوبوں میں ہندو مسلمانوں کو کس ذلت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس کا اندازہ نہ کوئی تحقیقاتی کمیشن لگا سکتا ہے نہ کسی عدالتِ عالیہ کا جج جسٹس۔ تنگ نظر ہندو کی بھچی ہوئی آنکھیں اپنی ایک ایک جنبش میں مسلمان سے علانیہ کہہ رہی تھیں کہ اب دیکھ! یہ اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام تجھ سے کس طرح لیتا ہے! کہیئے کہ اگر آج مسلمان ان زہر آلود نگاہوں کے جگر دوز تیروں کے پابندِ ترکش ہو جانے پر اطمینان کا سانس لے تو اس نے کون سا گناہ کر دیا؟!

پھر جیسا کہ ہر موقع پر ہوتا چلا آیا ہے قومیت پرست مسلمان نے اس ہنگامہ خیزی غوغا آرائی میں بھی اپنا حقِ نمک پوری طرح سے ادا کر دیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کانگریس نے اور ان لوگوں کو اپنے ساتھ ملا ہی اس غرض سے رکھا ہے کہ جب کبھی مسلمانوں کے خلاف کچھ کہنا یا کرنا ہو ان لوگوں کو آگے کر دیا جائے۔ نیشلسٹ مسلمانوں میں سب سے زیادہ دلچسپ اور تاسف انگیز بیان مولانا ابوالکلام آزاد کا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی ہستی ہر نصیحت حاصل کرنے والے قلب کے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستان اپنے اندر رکھتی ہے۔ وہ مولانا صاحب جن کی کبھی یہ حالت تھی کہ ان کا پنجہ ہمیشہ اس گلے پر ہوتا تھا جس سے مسلمانوں کے خلاف کوئی آواز اٹھے۔ آج انہی مولانا صاحب کی یہ کیفیت ہو چکی ہے کہ دشمنانِ اسلام نے مسلمانوں کے خلاف جو کچھ کہلوانا ہو وہ مولانا صاحب کی زبان سے کہلواتے ہیں۔

اتفاقات ہیں زمانے کے!

حیرت ہے کہ مولانا صاحب بھی دریافت فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو کیا شکایت ہے۔ اس کے

جواب میں ہم سوائے اس کے اور کیا کہیں کہ

شکر ہے پرسشِ غم کا مگر اصرار نہ کر
پوچھنے والے یہ تیرا ہی کہیں راز نہ ہو

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ مسٹر جناح نے یہ ایسی تجویز پیش کی ہے کہ جسے کوئی ایسا مسلمان اپنے ہم مذہبوں کے سامنے پیش نہیں کر سکتا جس کے دل میں ملّی خودداری کا ایک ذرہ بھی موجود ہو۔ چہ خوش!

بجا کہتے ہو۔ سچ کہتے ہو۔ پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو!

مولانا آزاد ——— اور ملّی خودداری!!

ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا!

بیس پچیس سال اُدھر کا ذکر ہے کہ مولانا صاحب کے منہ سے یہ الفاظ اپنے اندر ایک حقیقت رکھتے تھے۔ لیکن اب تو یہ فقط عہدِ گذشتہ کا ایک بھولا ہوا افسانہ بن چکا ہے۔ مولانا کی وہ متاعِ عزیز جسے ملّی خودداری کہا جاتا ہے عرصہ ہوا گنگا اور جمنا کے سنگم پر انندبھون کے سامنے ڈوب گئی۔

اب اسے ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لیکر

اب مولانا کے منہ سے 'ملّی خودداری' کے الفاظ ان کی اس قلبی کیفیت کی غمازی کر رہے ہیں جس میں حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

جگر میں ٹیس۔ لب ہنسنے پہ مجبور
کچھ ایسی ہی ہماری زندگی ہے

"بہت بڑا زور اس چیز پر دیا جا رہا ہے کہ اگر کانگریسی عہدِ حکومت میں فی الواقع مسلمانوں پر ظلم ہوئے تھے تو صوبوں کے گورنر اور جناب وائسرائے نے مداخلت کیوں نہ کی۔ ان کی عدمِ مداخلت سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں پر کوئی زیادتی نہیں ہوئی! لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ انگریز کے دل میں مسلمانوں کے لئے کون سی ایسی ہمدردی تھی جو وہ انکی خاطر اس جماعت سے بگاڑ پیدا کر لیتا۔ جو برسرِ حکومت تھی! جب کانگریسی دورِ حکومت شروع ہوا ہے تو گاندھی جی نے بتایا تھا کہ کانگریس کا اور انگریز کا باہمی شریفانہ معاہدہ (Gentlemans Agreement)

ہوگیا ہے۔ اس مُعاہدہ میں لامحالہ یہی کچھ ہوگا کہ جب تک ہندو انگریز کے حقوق کو محفوظ رکھیگا وہ مسلمان کے خلاف جو جی میں آئے کریں انگریز مُداخلت نہیں کریگا۔ کہا جاتا ہے کہ انگریز اب کیوں نہیں بولتا! سو ظاہر ہے کہ انگریز کو کیا پڑی ہے جو وہ اب اس امر کا اعتراف کرے کہ ہاں فی الواقع ہماری آنکھوں کے سامنے مسلمانوں پر مظالم ہوتے رہے اور ہم خاموش دیکھا کئے! اور یوں بھی مسلمانوں کو جن باتوں کی بڑی شکایت ہے وہ تو جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ایسے "زخم بے نشان" ہیں جو کسی قانون کی زد میں نہیں آسکتے۔ اس لئے انگریز کے لئے عذر بھی موجود ہے کہ ہم ان اُمور میں مُداخلت کیسے کرتے!

پھر عوام الناس کو یہ کہکر گمراہ کیا جاتا ہے کہ مُسلم لیگ کے اِن سجدہ ہائے شُکرانہ سے مفہوم یہ ہے کہ وہ خوش ہے کہ پھر سے انگریز کی حکومت آگئی۔ یہ ایک ایسا لغو اتہام ہے کہ ہمارا خیال ہے کہ اتہام لگانے والے خود اپنے دل میں بھی نادم ہوتے ہونگے کہ ہم زبان سے کیا کہہ رہے ہیں۔ مسٹر جناح متعدد بار اس امر کا اعلان کر چکے ہیں اور "یوم نجات" کے سلسلہ میں اپنے آخری بیان میں بھی انھوں نے اس کا اعادہ کیا ہے کہ ہم نہ ہندو کی غلامی پسند کرتے ہیں نہ انگریز کی، ہم وہ آزادی چاہتے ہیں جس سے ہمارا اسلام آزاد ہو۔ اور اب تو پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے کانگریسی حضرات اور نیشنلسٹ مسلمان مثل مسٹر ایس۔ ایے بریلوی وغیرہ بھی کھلے کھلے الفاظ میں اس امر کا اعتراف کر چکے ہیں کہ مسلم لیگ بھی آزادئ ہند کی اسی طرح متمنی ہے جس طرح کانگریس۔ لہٰذا اب یہ اتہام کہ مسلم لیگ انگریز کی واپسی پر خوشیاں منا رہی ہے سیاسی پروپیگنڈا کی ایک ایسی مکروہ صورت ہے جس کی نظیر صرف قومیت پرستوں کے ہاں ہی مل سکتی ہے۔ اور بعض نیشنلسٹ مسلمانوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مسٹر جناح کی یہ تجویز اور مسلمانوں کا یہ اقدام تکبیر اسلام کے خلاف ہے۔ اِنّا للہ واِنّا الیہ راجعون۔ پوچھے کوئی ان انوکھے مجتہدین سے کہ وہ کون سا اسلام ہے جس نے آپ کو یہ تعلیم دی ہے کہ ظالم کے ظلم سے نجات ملنے پر سجدۂ شکر ادا کرنا دین کے خلاف ہے۔ انھوں نے اگر قرآنِ کریم کو پڑھا ہو تو ہم اُن سے عرض کریں کہ زیادہ تفحص و تجسس نہیں۔ ذرا بنی اسرائیل کے واقعات کا ہی مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے کتنی مرتبہ اس قوم سے کہا ہے کہ ہم نے جو تمہیں فرعون کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائی ہے یہ ہماری بڑی رحمت اور نعمت ہے۔ اس نعمت پر سجدۂ شکر ادا کرو۔ اور

قرآنِ کریم میں کئی مرتبہ اس نعمتِ الٰہی کی یاددہانی کرائی گئی ہے۔ اگر عہدِ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرعون کے ظلم و استبداد سے نجات ملنا اللہ کی نعمت ہے تو عہدِ حاضرہ کے فراعنہ کے جور وستم سے نجات مل جانے پر تحدیثِ نعمت کس طرح قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ یہ تو عین منشائے الٰہی کے مطابق ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ یہاں تو

ہر لیمے راز دار دیں شدہ

پھر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ لیگ اور کانگریس میں اچھا بھلا سمجھوتہ ہو رہا تھا۔ مسٹر جناح نے اس تحریک سے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ اور مولانا آزاد نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں۔ جب کبھی ہندوؤں اور مسلمانوں میں صلح و مفاہمت کے آثار نمودار ہوتے ہیں مسٹر جناح کا ہاتھ ہمیشہ اس دروازہ کو بند کر دیتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کونسی صلح تھی جسے مسٹر جناح کی اس تجویز نے روک دیا۔ مصالحت سے معترضین کی مراد یہ ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو مسٹر جناح کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس تجویز سے وہ تیاری رک گئی۔ لیکن سنیئے کہ خود پنڈت جی اس باب میں کیا فرماتے ہیں۔ انھوں نے ۱۴ ردسمبر کو بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ فرقہ وارانہ مسائل سے مراد مساجد کے سامنے باجہ بجانا اور ذبیحہ گاؤ وغیرہ ہیں۔ لیکن اس ملک میں گذشتہ دو سال میں فرقہ وارانہ مسائل سے تو کچھ اور ہی مفہوم لیا جانے لگا ہے اور انھیں بڑی سیاسی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ مثلاً وزارتوں میں مسلم لیگ کی نمائندگی۔ یا مخلوط وزارتوں (Coalition Ministries) کی تشکیل۔ بھلا ان معاملات کو فرقہ وارانہ مسائل سے کیا واسطہ!"

(اسٹیٹسمین ۱۵ $\frac{12}{39}$)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ پنڈت جی کے نزدیک فرقہ وارانہ مسائل اور ہیں اور سیاسی مسائل اور۔ دہلی میں سیاسی مسائل پر گفتگو ہوئی تو متعدد کانگریسی حضرات نے اس امر کا اعلان کیا کہ چونکہ مسٹر جناح کی اولین شرط یہ تھی کہ لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے۔ اور یہ شرط کانگریس کو منظور نہ تھی لہٰذا گفتگوئے مصالحت پروان نہ چڑھ سکی

یہ حصہ تو یہیں ختم ہوگیا۔ اس کے بعد پنڈت جی مسٹر جناح کے ساتھ کن معاملات کے متعلق گفت و شنید کرنے جانا چاہتے تھے۔ اس کے متعلق وہ خود اپنی محولہ صدر تقریر میں فرماتے ہیں:۔

"دہلی میں جب میں مسٹر جناحؔ سے سیاسی معاملات
کے متعلق گفت و شنید کر رہا تھا تو میں نے ان سے کہا کہ
کہ میں اس بات کے لئے بھی تیار ہوں کہ کسی آئندہ تاریخ
پر فرقہ وارانہ مسائل کے متعلق بھی آپ سے گفتگو کروں"

(ایضاً)

یعنی پنڈت جی جس چیز کے متعلق مسٹر جناح کے پاس دوبارہ جانا چاہتے تھے وہ فرقہ وارانہ مسائل کے متعلق گفتگو تھی۔ اور یہ آپ نے دیکھ لیا کہ فرقہ وارانہ مسائل سے پنڈت جی کی مراد کیا ہے؟ گائے اور باجہ! تو گویا مسٹر جناحؔ کی اس تجویز سے (نیشنلسٹ حضرات کے قول کے مطابق) جس گفتگوئے صلح کا شیرازہ بکھر گیا وہ گفتگو صرف باجہ اور گائے اور ایسے دیگر مسائل کے متعلق تھی۔ فرمائیے! کہ کیا یہی وہ مسائل ہیں جن کے حل سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تمام اختلافات مٹ جائیں گے۔ اور اس سے مسلمانوں کے تمام مطالبات پورے ہو جائیں گے؟ اور تماشہ ہے کہ مولانا آزاد بھی فرماتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافی مسائل یہی گائے اور باجہ ہے۔

خضر کیونکر بتائے۔ کیا بتائے؟
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے؟

برادران! یہ ہے "یوم نجات" کی تجویز کا منشاء اور اس کے خلاف اعتراضات کا مختصر الفاظ میں جواب۔ اب آپ خود اندازہ فرمالیں کہ مسٹر جناحؔ کا یہ فیصلہ کس قدر برمحل، مناسب اور اسلامی تعلیم و آئین کے عین مطابق ہے۔

✓ اس میں شبہ نہیں کہ بدیشی حکومت کے ہاتھوں مسلمانوں کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بھی کچھ کم زہرہ گداز نہیں۔ اور سو مصیبت کی ایک مصیبت تو خود غلامی ہے۔ اس لئے اس غلامی کی زنجیر کے ٹوٹنے پر مسلمان جس قدر سجدہ ہائے شکر بجا لائیں گے اس کا ذکر تحصیلِ حاصل ہے۔ لیکن کانگریس کا تو یہ دعویٰ تھا کہ یہ سوراجی حکومت ہندوستانیوں کی اپنی حکومت ہے۔ یہ اس آزادی کا پہلا زینہ ہے جس کے حصول کے لئے ہم اس قدر جدّوجہد

کر رہے ہیں۔ لیکن واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ حکومت ہندوستانیوں کی نہیں بلکہ ہندوؤں کی تھی۔ اور جہاں تک مسلمان کا تعلق ہے یہ آزادی صرف اتنی ہی تھی کہ وہ انگریز کی غلامی سے نکلکر ہندو کی غلامی میں چلا گیا۔ لہٰذا اگر انگریز کی غلامی سے رہائی پر ہم سجدہ ہائے شکرانہ بجا لانے میں حق بجانب ہونگے تو ہندو کی غلامی سے نجات ملنے پر ہم ایسا کرنے پر قابلِ گردن زدنی کیوں قرار دیئے جائیں۔ یاد رہے! مسلمان دنیا میں صرف اپنے اللہ کا غلام بن کر رہ سکتا ہے۔ اور اس کے سوا کسی اور کی غلامی اس کے نزدیک جائز نہیں۔ خواہ وہ ہندو ہو یا انگریز۔ لہٰذا مسلمانوں کا جہادِ آزادی انگریز اور ہندو دونوں کی غلامی سے استخلاص کے لئے ہوگا۔ نہ کہ انگریز کی جگہ اپنے پاؤں میں ہندو کی غلامی کی زنجیریں پہن لینے کے مرادف۔ اور چونکہ جس قسم کی حکومت یہاں ہندو قائم کرنا چاہتا ہے وہ اکثریت کی حکومت ہوگی۔ جس کا مطلب ہندو کی حکومت ہے۔ اس لئے مسلمان اس حکومت کو بھی اپنے لئے ایسی ہی غلامی کی زندگی سمجھتا ہے جیسے انگریز کی حکومت کو۔ مسلمان آزاد ہونا چاہتا ہے اور اس کی آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا اسلام آزاد ہو۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ تمام مسلمان اپنی الگ۔ جُداگانہ غیر مخلوط جماعت کے ساتھ مل کر رہیں۔ اور اپنے مرکزِ ملت سے وابستہ ہو کر ہر قسم کی غلامی کے خلاف جہاد کریں۔ اللہ کی نصرت اور رحمت ان کے ساتھ ہوگی۔

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن۔

طلوعِ اسلام
فروری ۱۹۴۰ء

کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی

مؤتمرِ آئین ساز

"للشیخ الفاضل"

متاعِ معنیٔ بیگانہ از دُوں فطرتاں جوئی؟ | زموراں شوخیٔ طبعِ سلیمانے نمی آید!
گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو | کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

ہندوستان کے طول و عرض میں آج (Constituent Assembly) کا راگ گایا جا رہا ہے۔ کانگریسی پریس جو درحقیقت ہندو قوم کا نفسِ ناطقہ ہے۔ ہر جگہ اس اسمبلی کی تعریف میں ڈھول پیٹ رہا ہے اور اُسے ہندوستان کی تمام سیاسی بیماریوں کا واحد اور شافی علاج بتلاتا ہے۔ سیاسی حلقوں میں آج سے چند ماہ پہلے شاید ہی کسی نے ایسی اسمبلی کا نام سُنا ہو، نہ کسی اخبار میں اسکا ذکر، نہ کسی انجمن اور جلسہ میں اسکا نام۔ نہ کسی پلیٹ فارم پر اسکا تذکرہ غرضیکہ تمام مُلک اِس سیاسی اصطلاح سے نا آشنا تھا کہ یکایک کانگریسی مہاتما کو القا ہُوا۔ اور یہ سیاسی حربہ نہایت حسین پردوں میں ملبوس ملک کے سامنے رکھ دیا گیا تاکہ وہ مقاصد جو طاقت اور اکثریت عدم تعاون۔ عدم تشدد۔ مقاطعہ جُوئی وغیرہم کے ذریعے حاصل نہ کر سکی اُسے اِس نئے ہتھیار سے پُورا کرے۔ عوام ابھی تک اِس نئے "اقدام" کے معنے اور اسکے نتائج سے بے خبر ہیں، محدود دماغی وسعت رکھنے والوں کے علاوہ اچھے خاصے پڑھے لکھے افراد بھی انگشت بدنداں ہیں کہ اِس تمام شور و شغب کا کیا مقصد ہے! اور یہ مؤتمرِ آئین ساز کس نعمت کا نام ہے جس کی تعریف میں ہندوستان کے اخباروں کے کالم کے کالم سیاہ ہو رہے ہیں۔ آیئے ہم دیکھیں کہ نقاب اُٹھ جانے کے بعد اس مزعومہ "مسیحائے قوم" کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے۔ اِس مختصر مقالہ کے پڑھنے سے قارئینِ کرام پر واضح ہو جائے گا کہ مؤتمرِ جسے ہندوستان کی موجودہ مشکلات کا حل بتایا جا رہا ہے کس طرح تمام اقلیتوں اور بالخصوص

مُسلم اقلیت کی سیاسی زندگی کے لیے زہرِ قاتل ہے۔ پیشتر اسکے کہ ہم ہندوستان کے نقطۂ نگاہ سے اس مؤتمر کے رازہائے درونِ پردہ کا انکشاف کریں مختصر الفاظ میں اس کی اصلی نوعیت کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

سیاسی لغت میں مؤتمر قانون ساز Constituent Assembly اُس غیر سرکاری مجلس یا اسمبلی کا نام ہے جو اس غرض سے بُلائی جائے کہ وہ اُس مُلک کے آئندہ سیاسی نظام کے متعلق ایک ایسا ضابطۂ حکومت مرتّب کرے جو اُس ملک کے سیاسی۔ ملی۔ معاشرتی تعلیمی اور تجارتی وغیرہ حالات کے پیشِ نظر تمام اراکینِ مؤتمر کو اتفاق ہو۔ اور وہ طرزِ حکومت اُن کی رائے میں اُس مُلک کے لیے بہترین ہو۔ یقیناً وہی طرزِ حکومت بہترین قسم کا ہو سکتا ہے، جس سے امنِ عامہ کو پُورے اہتمام کے ساتھ قائم رکھا جا سکے جس سے ہر شہری امن کی زندگی بسر کر سکے اپنے حقوق کو قائم اور اپنے مذہبی اور ملّی وقار کو برقرار رکھ سکے، جسکے سامنے امیر اور غریب دونوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں اور جہاں اکثریت جبر و تشدّد اور کثرتِ تعداد کے بل پر کمزور اقلیتوں کے طرزِ حیات میں سدِّ راہ نہ بن سکے۔

سلطنتِ برطانیہ کی سیاسی تاریخ میں ایسی مؤتمریں وقتاً فوقتاً مختلف ممالک کے دستورِ سیاسی کو ترتیب دینے کے لیے بلائی گئیں۔ مثال کے طور پر ۱۸۶۴ء میں کیوبک کانفرنس نے کینیڈا کی طرزِ حکومت کو ترتیب دیا جو چند ضروری ترمیمات کے بعد برٹش پارلیمنٹ میں منظور ہو کر برٹش نارتھ امریکہ ایکٹ کے نام سے نافذ ہوا۔ اسی طرح آسٹریلیا کے طرزِ حکومت کو مرتّب کرنے کا فرض ۱۸۹۱ء میں آسٹریلین کنونشن نے انجام دیا ۱۸۹۷ء میں بھی آسٹریلیا میں ایک ایسی جماعت بلائی گئی جسنے سابقہ آئینِ حکومت میں مزید رد و بدل کرنے کا کام انجام دیا۔ اس کنونشن نے ایک بل مرتّب کیا جسے مسٹر چیمبرلین نے (جو اُسوقت سکریٹری آف اسٹیٹ تھے) منظور کیا۔ اور یہ بل کامن ویلتھ ایکٹ آف ۱۹۰۰ء کے نام سے مشہور ہُوا۔ کچھ سال بعد ۱۹۰۸ء میں جنوبی افریقہ کی چار Colonial Parliaments کلونیل پارلیمنٹوں نے مقام ڈربن پر ایک کنونشن یعنی کانفرنس بلائی جسنے ۱۹۰۹ء میں ایک بل مرتّب کیا۔ یہ بل بعدہٗ دوسری کنونشن میں

جو نیشنل کنونشن میں بلائی گئی ترمیم کیا گیا۔ اور بعد میں "کنسٹی ٹیوشنٹ ایکٹ آف ساؤتھ افریقہ آف ۱۹۰۹ء" کے نام سے نافذ ہوا۔ اس جگہ یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ کینیڈا آسٹریلیا اور ساؤتھ افریقہ میں جو (Constituent Assemblies) بلائی گئیں ان کے ارکان کی تعداد نہایت قلیل تھی آسٹریلیا میں جو ۱۸۹۱ء میں نیشنل کنونشن بلائی گئی۔ اس کے ارکان وہ لوگ تھے جنہیں آسٹریلیا کی نوآبادیوں کی لیجسلیٹو اسمبلیوں نے منتخب کر کے بھیجا تھا۔ یہ نمائندے براہِ راست عوام کے بھیجے ہوئے نہیں تھے بلکہ انہیں اسمبلیوں کے ممبروں نے منتخب کیا تھا۔ علاوہ ازیں دستورِ سیاسی مرتب کرنے کا کام بھی فی الحقیقت کنونشن کی چھوٹی چھوٹی سب کمیٹیوں میں تقسیم کیا گیا۔

سلطنت برطانیہ کے باہر ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کے بعد متحدہ طاقتوں (Allied Powers) نے یورپ کی کئی ایک نئی اور پرانی قوموں کو اس امر کی دعوت دی کہ وہ رائے بالغانہ (Adult Sufferage) کی بنا پر Constituent Assembly بلائیں تاکہ وہ اُن قوموں کے لیے جدید طرزِ حکومت تجویز کریں۔ اسی طرح سنہ ۱۹۱۷ء میں جب بغاوتِ روس زوروں پر تھی اور یہ بغاوت تمام ملک میں لینن اور ٹراٹسکی ایسے لیڈروں کی قیادت میں ایک مہیب طوفان کی صورت اختیار کر رہی تھی۔ ایک (Constituent Assembly) بلائی گئی جس کی نوعیت کا ذکر ایک مشہور انگریز مصنف ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"Constituent Assembly جو رائے بالغانہ کی بنا پر بلائی گئی تھی۔ کسانوں اور کاشتکاروں کا ایک انبوہ تھا جو سمجھدار اور تجربہ کار سیاستدانوں کے اثر و اختیار سے بالکل باہر تھا۔"

اس اسمبلی کے دوسرے بے شمار سخت گیر کارناموں کے علاوہ ایک مضحکہ خیز فیصلہ یہ بھی تھا کہ عین جنگِ عظیم کے دوران میں سزائے موت منسوخ کر دی گئی !!!

حال ہی میں ہسپانیہ میں جب شاہ الفانسو کو تخت سے برطرف کیا گیا تو ایک نیشنل اسمبلی بلائی گئی۔ اس اسمبلی کے انتخاب کے لیے حقِ رائے دہی اُن تمام مردوں اور عورتوں کو دیا گیا۔ جن کی عمر تئیس سال سے اوپر تھی۔ اور الیکشن کی بنا یہ تھی کہ آیا ہسپانیہ میں ریپبلک (جمہوریت) ہو یا ملوکیت (Monarchy

اِس الیکشن میں ریپبلک کے حامیوں کو بہت شاندار کامیابی ہوئی اور جولائی ۱۹۳۱ء میں ہسپانیہ کی اسمبلی (Cortes) کا پہلا اجلاس ہوا۔ اس اسمبلی نے جو دستورِ حکومت مُرتب کیا۔ اس میں اس امر کا بھی اعلان کیا گیا کہ ہسپانیہ ہر قسم کے مزدوروں کی ایک جمہوری ریپبلک ہے۔ حکومت سرکاری طور پر کسی مذہب سے تعلق نہیں رکھتی۔ اور رفاہِ عامہ کے لیے حکومت نجی جائیداد پر قبضہ کرسکتی ہے" وغیرہ وغیرہ حیثیت یہ دستور ترتیب پا رہا تھا۔ ہسپانوی لوگوں کو۔ جو ایک نہایت خودسر قوم واقع ہوئے ہیں اور جن میں سے ۷۵ فیصدی کم حیثیت کسان اور کاشتکار ہیں۔ یہ معلوم ہوگیا کہ یہ اعلانات اور اُن اعلانات کے مطابق مُرتب کردہ قوانین مائل بہ اشتراکیت (Socialistic) اور خلافِ مذہب ہیں جو کسی طرح عام رائے دہندگان کے جذبات یا خیالات کا آئینہ دار نہیں ہوسکتے نتیجہ یہ ہُوا کہ ان قوانین کے خلاف ایک طرف دورِ سابقہ کے برسرِکار اور صاحبِ اثر لوگوں کی طرف سے اور دوسری طرف کٹر قسم کے انارکسٹوں کی طرف سے شدید مخالفت رُونما ہوئی نئی حکومت نے اپنے عہد کے آغاز ہی میں ایک "ایمرجنسی لاء" (وقتی قانون) نافذ کردیا۔ جس کی رُو سے وہ بالکل مطلق العنان بن گئے۔ اِس حکومت کے کئی ایک کارناموں میں سے یہ بھی ہیں کہ انہوں نے بہت بڑے بڑے مالدار زمینداروں کو اپنی جائیداد سے محروم کردیا۔ مذہبی درسگاہیں بند کردی گئیں اور اُن کی جگہ سرکاری مدارس کھولے گئے اور وہ بھی اسقدر ناکافی تعداد میں کہ اُن سے مُلک کی تعلیمی ضرورت بھی پوری نہ ہوسکی۔ مذہبی اداروں کی تمام جائداد ضبط کرلی گئی۔ اور تمام مذہبی عُلماء کو دینی تعلیم دینے سے روک دیا گیا اس قسم کے قوانین سے مُلک کے طول و عرض میں ایک ہیجان برپا ہوگیا۔ اور ہر طرف سے مخالفت کے بادل اُمنڈ آئے نتیجہ یہ ہُوا کہ اس حکومت کو نومبر ۱۹۳۳ء کے جنرل الیکشن (انتخاب عام) میں شدید شکست اٹھا کر برطرف ہونا پڑا۔

ہم اِس تمہید کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتے۔ اِس سے اِس امر کا اظہار مقصود تھا کہ دُنیا میں مختلف زمانوں میں اور مختلف ممالک میں (حکومتِ برطانیہ کے اندر بھی اور باہر بھی) (Constituent Assemblies) بلائی گئیں۔ مگر یہ تمام اسمبلیاں ان مُلکوں میں منعقد ہوئیں جنہیں عام اصطلاح میں "مغرب" کہا جاتا ہے۔ یا جہاں مغربی تہذیب کے گہوارے میں پرورش یافتہ یا مغربی سفید فام نسل کے لوگ بستے تھے "مشرق"

آجتک ایسی اسمبلیوں سے نااتشنار ہای اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں اس کی مثال دُور بین لگاکر دیکھنے سے بھی نہیں ملتی۔ علاوہ بریں مندرجہ صدر اسمبلیوں کے حالات کا بتفصیل مطالعہ کرنے سے چند ایک اہم اُمور کا پتہ چلتا ہے ا۔

اوّل:۔ یہ کہ تجربہ Constituent Assemblies کے انعقاد کے کسی ملک کے تمام سیاسی علل و عوارض کا علاج نہیں ہوجاتا۔

دوئم:۔ جہاں کہیں بھی کوئی دستورِ سیاسی کسی Constituent Assembly کے ذریعے مرتّب کیا گیا۔ اس دستور کے مرتّب کرنے کا کام چھوٹی چھوٹی جماعتوں نے انجام دیا۔ اور باقیماندہ ممبر محض رائے دہی کے وقت ہاں یا نہ کرنے کا فرض ادا کرتے رہے۔

سوئم۔ اکثر و بیشتر اسمبلیاں ایسی ہوئی ہیں۔ کہ انکے ارکان وہ تھے جنہیں متعلقہ اور ملحقہ نوآبادیوں اور صوبہ جات کی اسمبلیوں کے ممبروں نے اپنے میں سے انتخاب کیا تھا۔ اور وہ براہ راست منتخب ہوکر نہیں آئے تھے۔

چہارم:۔ جس ملک میں پہلے قدامت پسندی کا دَور دَورہ ہو۔ اور وہاں رائے دہی کا حق ہر بالغ مرد اور عورت کو دے دیا جائے۔ جس سے تمام آبادی کا دو تہائی کم از کم نصف حصہ رائے دہندگان کی فہرست میں شامل ہوجائے تو ایسی Constituent Assembly کے بنائے ہوئے قوانین آئین ایسے ہی ہوں گے جنکا نمونہ ہسپانیہ کے سلسلہ میں اوپر درج کیا جاچکا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب ہم انڈین نیشنل کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے اس رزولیوشن کی طرف رجوع کرتے ہیں جس میں Constituent Assembly کے متعلق تجویز پاس کی گئی ہے۔ اس رزولیوشن کا ترجمہ ذیل میں درج ہے۔ اور یہ رزولیوشن ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو واردھا میں پاس ہوا۔

قومی مسئلہ کے آخری اور قطعی حل کے حصول کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ یعنی Constituent Assembly Constituent جسے کانگریس نے تجویز کیا ہے۔ اس تجویز کے ماتحت اقلیتوں کو جداگانہ رائے دہی کے ساتھ پوری نیابت دینے کا معاملہ پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ کانگریس کی جانب سے یہ پہلے ہی واضح

کر دیا گیا ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کا اقلیتوں کے حسبِ خاطر تحفظ کیا جائیگا۔ اور جہاں کسی بات میں اختلاف ہوگا وہ مسئلہ ایک غیر جانبدار عدالت (Tribunal) کے سامنے پیش کر دیا جائیگا۔"

کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے متعلق پہلا رزولیوشن دراصل الہ آباد میں پاس ہوا تھا۔ اور واردھا والے رزولیوشن میں اس اسمبلی کے متعلق دوبارہ اعادہ کیا گیا تھا۔ ۲۵ر نومبر ۱۹۳۹ء کے ہریجن میں مہاتما گاندھی نے "ایک ہی راستہ" کے عنوان سے Constituent Assemblies کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ (۱) صرف Constituent Assembly ہی اس ملک کے لیے خالص سودیشی دستور مرتب کر سکتی ہے۔ (۲) Constituent Assembly ہی ہمارے مذہبی اور دوسری بیماریوں کا علاج ہو سکتی ہے (۳) میں مسلمانوں کو الگ ووٹ دینے کا حق دونگا۔ مگر ہر ایک فرقہ ٹھیک اپنی تعداد کے تناسب کے لحاظ سے نیابت حاصل کریگا۔ (۴) اور ہندوستان کی سیاسی آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ انگریزی حکومت ہے۔

ان تمام باتوں کا فرداً فرداً جواب ہم بعد میں دینگے اسوقت انکے ذکر کرنے سے صرف اتنا مقصود ہے کہ (Constituent Assemblies) کا صحیح مفہوم کانگریس کے ذہن میں کیا ہے۔ مسٹر راجہ گوپال آچاریہ سابق وزیرِ اعظم مدراس۔ جو کانگریس کے ایک بہت بڑے ممتاز لیڈر ہیں، اور جنہیں مہاتما گاندھی کے "ضمیر بردار" ہونے کی شہرت بھی حاصل ہے، کے اُس بیان کا ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، جو انہوں نے ۳۰ر نومبر ۱۹۳۹ء کو بمبئی میں دیا۔ آپ نے ایک انٹرویو کے دوران میں فرمایا کہ "جداگانہ رائے دہی خطرناک ہے۔ ضروری بات تو صرف اتنی ہے کہ کچھ تھوڑا سا تحفظ قائم کر لیا جائے۔ جداگانہ رائے دہی کے مقابلہ میں۔ خواہ اُسکے ساتھ کتنی ہی سیاسی قابلیت شامل ہو وہ مخلوط انتخاب جسکے ساتھ نشستوں کا تعین کر دیا گیا ہو۔ اپنے اندر زیادہ تحفظات رکھتا ہے۔ جداگانہ انتخاب سے ناقابلِ توسیع اقلیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور چونکہ ہر پُرامن حکومت اکثریت کے ماتحت ہونی چاہیئے۔ اسلیئے ان ناقابلِ توسیع اقلیتوں میں بالکل علیحدگی اور بے تعلقی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے"! مہاتما گاندھی اور مسٹر راجہ گوپال آچاریہ کے مندرجہ صدر بیانات سے کانگریس کے حقیقی عزائم سامنے آجاتے ہیں، یعنی حکومت تو اکثریت ہی کے زیرِ اثر ہو گی، مگر اقلیتوں کو ایک "مجبوری مصیبت" (Necessary Evil) سمجھتے ہوئے تحفظ کے نام

سے کچھ دان کر دیا جائیگا +

پیشتر اسکے کہ ہم Constituent Assembly کے حسن و قبح پر بحث کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہندوستان کی وُسعت، آبادی اور مذاہب وغیرہ کے متعلق کچھ ذکر کریں جس کے لیے Constituent Assembly تجویز کی جارہی ہے، ہندوستانی اصلاحات کے سلسلے میں سلطنتِ برطانیہ کی مشترکہ ہوئی جائنٹ سیلکٹ کمیٹی کی رپورٹ - (حصہ اول) میں ان باتوں کا جامعیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے - درج ہے +

"ہندوستان کا یہ برِاعظم (برما کے علاوہ) جو ہمالیہ اور راس کماری کے درمیان واقع ہے ۱۸ لاکھ ۲۸ ہزار مربع میل کو محیط ہے ۔ اس کی آبادی ۳۰ کروڑ کے قریب پہنچ رہی ہے۔ اس رقبہ میں برطانوی ہند ۱۰ لاکھ ۹۴ ہزار مربع میل ہے اور ہندوستانی ریاستیں سات لاکھ مربع میل ان کی آبادی بالترتیب ۲۲ کروڑ اور آٹھ کروڑ ہے۔ یہاں بہت سی نسلیں اور فرقے آباد ہیں جو بڑی بڑی بارہ زبانیں بولتے ہیں جن کے ساتھ دو سو کے قریب معمولی قسم کی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ یہ آبادی ایک دوسرے سے بلحاظ اصل (Origin) رسومات اور طرزِ حیات ایک دوسرے سے ایسی مختلف ہیں جیسے یورپ کی مختلف اقوام۔ اس آبادی کا دو تہائی حصہ کسی نہ کسی شکل میں ہندو مذہب کی پیروی کا اقرار کرتا ہے۔ ساٹھ کروڑ ستر لاکھ سے زیادہ اسلام کے پیرو ہیں۔ اور ان دونوں قوموں میں جو اختلاف ہے، وہ فی الحقیقت محض مذہبی اختلاف ہی نہیں، بلکہ قانون اور تہذیب کا اختلاف بھی ہے۔ اس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں قومیں دراصل قطعاً الگ الگ اور مختلف تہذیبوں کی نمائندہ ہیں.......... آبادی کا اکثر حصہ زمین کی کاشت سے اپنی روزی حاصل کرتا ہے۔ اور کاشتکاری کے ایک ایسے طرز کا پابند ہے جو فی نفسہٖ مکمل ہے اور اکثر و بیشتر پرانی وضع کا ہے، اور اس ملک کی جملہ دولت بے بہا ہے۔ لیکن اس کی آبادی میں روز افزوں اور کثیر ترقی کے پیشِ نظر یہاں کے باشندوں کا معیارِ زندگی پست ہے اور یورپ کے کم از کم مہذب ملکوں کے ساتھ ان کا مقابلہ مشکل کیا جا سکتا ہے۔ شہری علاقوں میں بھی تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب بہت کم ہے۔"

یہ ہے اُس ہندوستان کی حالت جس کے لیئے یورپ اور سلطنت برطانیہ کے دوسرے ملکوں اور نوآبادیوں کی طرز پر Constituent Assembly کی دوائی تجویز کی جا رہی ہے۔ وہ ہندوستان جس کی صرف مسلمان آبادی ہی انگلینڈ، سکاٹ لینڈ، اور آئرلینڈ کی آبادی سے قریباً دوگنا ہو جس میں کم و بیش ۱۲ بڑی بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں، جہاں کی کل تعلیم یافتہ آبادی اندازاً آٹھ یا نو فیصدی سے زائد نہیں۔ اور جہاں کی بسنے والی دو بڑی قوموں کی یہ حالت ہے کہ وہ اپنے آئین حیات فلسفۂ زندگی، زاویۂ نگاہ، طرزِ ادا، مذہب و تہذیب کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں، اور فی الحقیقت دو جداگانہ تمدنوں کی نمائندہ ہیں اِس مُلک کے عوارض کا علاج "بدیشی" دوائیوں سے تجویز کرنا۔ ع

کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری۔

یہ علاج نہ صرف اِس مُلک کے طبیعت اور مزاج کے ہی ناموافق ہے، بلکہ بدیشی ہونے کی وجہ سے خود کانگریس کے مطمعِ نظر کے بھی خلاف ہے۔ آپ خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ جس مُلک کی تعلیم یافتہ آبادی تمام آبادی کا سات یا آٹھ فیصدی ہو اور پھر اُس آبادی کے کم و بیش پچاس فیصدی (یعنی بالغ مرد اور عورتوں) کو رائے دہی کا حق دے دیا جائے۔ تو وہاں کی Constituent Assembly کیا ہو گی اور اُس اسمبلی کے بنائے ہوئے قانون کیا!

اب ہم ذرا حق رائے دہی کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ۱۹۱۹ء کی منٹو مارلے ریفارمز کی رُو سے ہندوستان میں اندازاً ستر لاکھ مرد اور عورتوں کو رائے دہی کا حق دیا گیا تھا۔ یہ اُس وقت کی برطانوی ہند کی آبادی کا کوئی ۳ فیصدی حصہ تھا۔ سائمن کمیشن نے کل آبادی کا اندازاً ۱۰ فیصدی حقِ رائے تجویز کیا۔ اور اِس میں مرد اور عورت دونوں شامل تھے ۱۹۳۲ء میں دوسری اور تیسری گول میز کانفرنسوں کے درمیان ایک Franchise Committee مقرر کی گئی۔ اور اُسکے سپرد یہ کام ہُوا کہ وہ ایسی تجاویز پیش کرے جس سے سائمن کمیشن کے مجوزہ ۱۰ فیصدی نیابت میں اضافہ ہو جائے۔ مگر کل تناسب ۲۵ فیصدی سے زائد نہ ہونے پائے جیسا کہ پہلی گول میز کانفرنس میں منظور ہو چکا تھا۔ اِس کمیٹی کی رپورٹ کو چند ترمیمات کے بعد حکومتِ برطانیہ نے منظور کر لیا۔ اور یہ تجاویز بعدہٗ ۱۰ مارچ ۱۹۳۳ء کے وائٹ پیپر میں شامل کر دی گئیں۔ ان تجاویز کی رو سے

اندازاً دو کروڑ ۸۰ لاکھ اور ۲ کروڑ ۹۰ لاکھ کے درمیان مردوں اور ساٹھ لاکھ کے قریب عورتوں کو رائے دہی کا حق دیا گیا۔ یہ تعداد تمام برطانوی ہند کی آبادی کا ۱۴ فیصدی ہے۔ اگر آج کانگریس کے رزولیوشن کے مطابق برطانوی ہندوستان کے ہر بالغ مرد اور عورت کو رائے دہی کا حق دیدیا جائے تو اسکا تناسب اگر زیادہ نہیں تو کم ازکم ۴۰ فیصدی ضرور ہو گا یعنی موجودہ تناسب سے ۳ گنا زیادہ۔ گزشتہ الیکشنوں میں جہاں رائے دہی کا تناسب ۱۴ فیصدی سے زائد نہ تھا، جو نتائج برآمد ہوئے ہیں وہ سب پر روشن ہیں۔ بشمولہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت صوبہ جاتی اسمبلیوں کی نشستوں کے انتخاب میں جو ہڑبونگ مچا رہا ہے اور جس جہالت اور ناپختہ کاری کا مظاہرہ ہوتا رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اگر وہی نتائج اپنی برائیوں اور خرابیوں کے لحاظ سے آج چار گنا زیادہ کر دیئے جائیں تو بدنظمی اور انتشار کا جو عالم ہو گا اُسکا صحیح اندازہ کرنا ہمارے بس سے باہر ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ۱۹۳۵ء کے انتخابات کے وقت کُل رائے دہندگان کی تعداد قریب ۳ کروڑ تھی۔ لیکن ان میں سے ۵۰۰۵ فیصدی (یعنی قریب ڈیڑھ کروڑ) نے پولنگ اسٹیشن پر آکر رائے دی تھی اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ ۱۴ فیصدی سے ۴۰ فیصدی تناسب زیادہ کرنے میں جو اندازاً ۳۰ فیصدی کا اضافہ ہو گا وہ خالص ان لوگوں کا ہو گا جو تعلیم سے قطعاً بے بہرہ اور جہالت کی گہرائیوں میں غرق ہو گا۔ فی الحقیقت یہ جاہل کسانوں اور کندۂ ناتراش مزدوروں کا ایک طوفان بدتمیزی ہو گا۔ جو نہ کسی ضابطہ کی پابندی سے واقف ہو گا اور نہ کسی آئین کی بندش سے آشنا۔ اسپر طرّہ یہ کہ اس جہلِ مرکب کا بیشتر حصہ وہ لوگ ہوں گے جو قرنہا قرن سے توہم پرست اور مظاہرِ فطرت کو اپنا معبود سمجھتے چلے آرہے ہیں۔ ان کے نزدیک ایک پیپل کا درخت بڑے سے بڑے عقل و بصیرت والے انسان سے زیادہ واجب التعظیم اور پتھر کا ایک ٹکڑہ بڑے سے بڑے متقی سے بڑھ کر سزاوارِ عزت و تکریم ہے یقین مانیے کہ اگر یہاں کسی بڑے سیاستدان کے مقابلہ میں ایک سانڈ دیوتا بطور امیدوار کھڑے کر دیئے جائیں تو ہندوستان کی اس توہم پرستی سے کچھ بعید نہیں کہ یہ سانڈ دیوتا زیادہ آراء حاصل کرلے۔ یہ ہو گا وہ حلقۂ رائے دہندگان جسکے انتخاب سے اس مجلس آئین ساز کا وجود عمل میں آئیگا۔ البتہ ایک بات بالکل واضح ہے، کانگریس کے مسلسل پروپیگنڈا نے عوام کے دلوں میں مسٹر گاندھی کو ایک مہاتما کی حیثیت دے دی ہے اور وہ انہیں

ایک دیوتا کی حیثیت سے پوجتے ہیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ انتخاب میں صرف وہی لوگ آسکیں گے جنہیں مہاتما جی کے بابِ عالی سے موزونیت کی سند عطا ہوئی ہو، اور اس باب میں مہاتما جی کے ظرف کی وسعتیں کیا ہیں اس کی حقیقت تری پوری کانگریس کے زخم خوردہ دل سے پوچھیئے پھر یہی یاد رہے کہ یہ عوام وہ ہونگے جنکے نزدیک ایک اچھوت کا سایہ موت کے فرشتے سے زیادہ بھیانک اور ایک ملیچھ مسلمان کا نام "یم دوت" سے زیادہ مہیب ہے۔ ان لوگوں کی آراء سے منتخب شدہ ممبروں کے ہاتھ میں ملک کی لعنت پروے دی جائے گی !!

لارڈ زٹیلینڈ کے گزشتہ دو تین بیانات سے جو انہوں نے ہاؤس آف لارڈز میں دیئے ہیں یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ انگریزی حکومت ایسی Constituent Assembly کا نام تک بھی اپنی زبان پر لانے کو تیار نہیں۔ چہ جائیکہ وہ اس علاج سے ہندوستان میں خود اپنی ملی اور سیاسی زندگی نئے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس سے آپ اندازہ فرمایئے کہ حکومتِ برطانیہ سے یہ کہنا کہ آپ ایک Constituent Assembly بلا دیجئے اور یوں خود تاج و تخت سے دستبردار ہو کر زمامِ حکومت ہمارے ہاتھوں میں دے دیجئے کس قدر مضحکہ انگیز ہے اور کانگریسی زعماء کے افلاسِ تدبر کا آئینہ دار۔ اگر ایک لمحہ کے لیئے یہ تصور بھی کر لیا جائے کہ برطانوی پارلیمنٹ اپنے اختیارات سے علیحدہ ہونے کو تیار ہے (جو دراصل ناممکنات سے ہے) تو ہمیں دوسری منزل کا نتیجہ لینا چاہیئے جس سے ہمیں اسکے بعد گزرنا ہوگا، یہ تو بالکل واضح ہے کہ ہندوستان میں مغربی نمونے کی طرز جمہوریت قائم کی جائیگی۔ اب اسکے بعد سوچیئے کہ حقائق ہمیں کس طرف لئے جاتے ہیں۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہندوستان میں وہ شئے جسے اصطلاح عام میں "وطن پرستی" کہا جاتا ہے۔ جغرافیائی حدود کی پابند نہیں۔ بلکہ وہ مذہب اور فرقہ داری کے ماتحت ہے۔ اس ملک میں کم و بیش سات جداگانہ مذاہب ایک ساتھ چل رہے ہیں جن میں سے دو بڑے مذاہب اسلام اور ہندو دھرم ہیں۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ "وطن پرست" نہیں۔ بلکہ "آفاق پرست" ہیں۔ اور جغرافیائی حدود کی چار دیواری ان کے جذبہ اخوت و مودت میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتی۔ ان کی یہ "آفاق پرستی" اس یک رنگی اور یک جہتی کے ماتحت ہے جو ایک مشترکہ دین کے پیرو، اور ایک خدا اور ایک رسولؐ کے نام لیوا ہونے کی

حیثیت سے اُن میں موجود ہے۔ مشہور ہے کہ خون پانی سے گاڑھا ہوتا ہے مگر مسلمانوں کی حالت میں مذہب خون سے بھی زیادہ گاڑھا ہے، اِسکا عملی ثبوت حج بیت اللہ ہے۔ جہاں ہر سال دُنیا کے دُور دراز گوشوں سے کم و بیش ۲۰ ہزار کلمہ گو ایک جا جمع ہوتے ہیں اور اُن تمام جغرافیائی حدود کو عبور کر کے آتے ہیں جو دیگر اقوامِ عالم کے نزدیک قومیت کی تشکیل کا موجب ہوتی ہیں۔ ملتِ اسلامیہ کے اس محسوس مرکز میں چین کے مسلمان پیرو کے مسلمانوں سے اور یورپ کے سفید فام کلمہ گو افریقہ کے سیاہ رنگ حبشیوں سے بغلگیر ہوتے ہیں پھر جذبۂ اسلامی کا بے پناہ سمندر اپنی تمام حدبندیوں سے اچھل کر ایک ہو جاتا ہے اور ملتِ اسلامیہ کی وحدانیت کا عملی ثبوت دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اُس مذہب کے پیرو جو جغرافیائی حدود و ثغور سے آزاد ہیں۔ جو گورے کالے کی تمیز سے بلند ہیں۔ وہ بھلا ہندوستان میں مغربی طرزِ حکومت کے مطابق کس طرح اپنے آپ کو مختلف علاقوں میں تقسیم کر کے اپنی یک آہنگی اور یگانگت کو برباد کر سکتے ہیں۔ مسلمان کے لیے بنگالی۔ پنجابی یا مدراسی ہونا ایک ثانوی شے ہے۔ اسکے لیے باعثِ افتخار صرف ایک ہی بات ہے اور وہ یہ کہ وہ مسلمان کہلائے اور اول و آخر مسلمان سمجھا جائے۔ مسلمان کے نزدیک اِس بات میں کوئی دلچسپی نہیں کہ وہ ہندوستانی ہے یا چینی۔ اُسکے لیے مسلمان ہونا ہی بس ہے۔ جس قوم کا یہ حال ہو اُسے جغرافیائی حدود والی طرزِ حکومت بھلا کس طرح راس آسکتی ہے، اور جب تک مسلمان مسلمان کی حیثیت سے زندہ ہیں وہ اپنے آپ کو مختلف خطوں میں تقسیم کر کے اپنے دلوں میں ملت کی تڑپ کی جگہ وطنی پرستی کا جذبہ نہیں ٹھونس سکتے۔ اُنکے سامنے ہمیشہ تمام ملت کی سلامتی اور بہبود کا خیال قائم رہے گا۔ اور بیشتر اسکے کہ وہ کسی دستورِ سیاسی کو تسلیم کریں، وہ دیکھیں گے کہ اس سے اُن کی ملی اور مذہبی آزادی بھی قائم رہتی ہے یا نہیں اور کیا اُن کی ملی یگانگت مختلف خطوں کے اقتصادی اور سیاسی گورکھ دھندوں ہی میں تو ضائع نہیں ہو جاتی۔ مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ وطن پرستی کے قید و بند سے بالاتر ہے۔ اور اسیلئے مغربی طرز کی جمہوری حکومت جسکا انحصار وطن پرستی پہ ہے۔ اور جو اُسے جغرافیائی خطوں میں تقسیم کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی۔ مسلمان کے نزدیک کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

علاوہ بریں بالغانہ رائے دہی جو Constituent Assembly کا جُزوِ لازم سمجھا

جاتا ہے وہ اس سے بھی زیادہ فتنہ انگیز ہوگا۔ اسکا مقصد یہ ہے کہ نظامِ حکومت آبادی کے شمار سے متعین ہوگا۔ اسے تفصیل سے یوں سمجھئے کہ مثلاً ہر ۱۰لاکھ ووٹر ایک ممبر منتخب کریں، تو کل ۴۰۰ ممبروں میں سے ۲۵۰ ہندو ہونگے۔ ۹۰ مسلمان۔ ۶ عیسائی اور باقی مختلف تعداد میں دوسری قوموں اور فرقوں میں سے۔ جب اس Constituent Assembly کے اجلاس منعقد ہونگے تو یقیناً اسکے فیصلے کثرتِ آراء سے ہونگے اور ہندو اکثریت جو چاہے گی وہ اپنی کثرتِ آراء سے بلا شرکت غیرے خود منظور کرا لیگی پھر اس اسمبلی کے اندر جو اختلافات پیدا ہونگے وہ ایسے اختلافات نہیں جس طرح انگلستان کی مختلف پارٹیوں مثلاً کنسرویٹو، لیبر، لبرل وغیرہ کے درمیان ہوتے ہیں جو ایک ہی قوم کے مختلف الخیال لوگ ہیں بلکہ یہاں کے اختلافات کی نوعیت وہ ہوگی جو ایک مذہب اور دوسرے مذہب کے درمیان ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان اور ایک تہذیب اور دوسری تہذیب کے درمیان ہوتے ہیں۔ اگر اختلافات کی یہی شکل ہوئی جسکا ہونا ناگزیر ہے تو لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ۲۵۰ ہندو ووٹر دوسرے مذاہب اور فرقوں کے تمام ووٹروں کے مجموعے پر ہمیشہ ہمیشہ غالب رہینگے! اور یوں سوراج کے معنی خالص رام راج ہونگے اور ہندوستان کی تمام قومیں ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر ہوں گی۔ کانگریس چاہے ہزار دعوے کرے کہ وہ اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کرے گی۔ مسلمان آج ان دعوؤں سے مرعوب نہیں ہوسکتے۔ کانگریس کی گزشتہ سوا دو سالہ حکومت نے مسلمانوں کی مذہبی آزادی کو جس طرح برقرار رکھا۔ اسکا دستاویزی ثبوت مسلم لیگ کی پیرپور رپورٹ اور مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال کی حال ہی میں شائع کردہ "کانگریسی فردِ جرم" میں موجود ہے جس سے معلوم ہوگیا کہ کانگریس کے گزشتہ پچاس سال کے بلند آہنگ دعاوی کس طرح حکومت اور سلطنت کے ان سوا دو سالوں میں خس و خاشاک ہوکر رہ گئے۔ یوں تو Constituent Assembly کو ملک کے تمام عوارض کا علاج بتایا جارہا ہے لیکن واقعات یہ بتاتے ہیں کہ اس سے اقلیتیں وہ کچھ بھی ہاتھ سے کھو بیٹھیں گی جو انہیں Communal Award کی رو سے حاصل ہے مثلاً مہاتما گاندھی نے یہ کہا ہے کہ Constituent Assembly میں اقلیتوں کی نیابت ٹھیک ان کی آبادی کے تناسب سے ہوگی جب حالت یہ ہے تو کسطرح مسلمان اور دوسری اقلیتیں جنہیں ایوارڈ کے ماتحت ذرا زیادہ تناسب حاصل ہے

گاندھی جی کے اس نہایت ہی شفقت آمیز اعلان سے مسحور ہو سکتی ہیں، مثال کے طور پر یورپین فرقہ یک گوارا کر سکتا ہے کہ جو تناسب اُسے بنگال اور آسام کی اسمبلیوں میں اب ایوارڈ کے ماتحت حاصل ہے اُسے چھوڑ کر اپنے آپ کو ایک ایسی جماعت کے رحم و کرم پر چھوڑ دے جس جماعت کی ورکنگ کمیٹی میں انکا ایک ممبر تک بھی نہیں۔ ہم گاندھی جی سے پوچھتے ہیں کہ کیا کانگریس ورکنگ کمیٹی میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کا تناسب اسوقت بھی اُن کی تمام آبادی کے مطابق ہے یا کم۔ اس سوال کے جواب کے بعد قارئین کو خود بخود کانگریس کے دعا کی صحیح حقیقت معلوم ہو جائیگی۔ اس جگہ ہم قارئین کی توجہ اس امر کی طرف بھی مبذول کراتے ہیں کہ کانگریس کے گزشتہ سوا دو سالوں کے عہدِ حکومت میں اڑیسہ، اور سی پی میں کتنے مسلمان ممبر کیبنٹ میں لئے گئے اور اسکے مقابلہ میں صوبہ سرحد اور سندھ کی وزارتوں میں جہاں ہندو اسی طرح اقلیت میں ہیں جس طرح مسلمان اڑیسہ اور سی پی میں، کتنے ہندو وزارت میں موجود رہے۔ کانگرسی زعما کی عملی کارگزاریاں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے لئے کافی سے زیادہ سبق آموز بن چکی ہیں۔ کہ وہ اب اس جماعت سے بار بار فریب کھاتے رہیں +

اب ہم ہندوستانی ریاستوں کا ذکر کرتے ہیں جسکے بغیر یہ مقالہ ادھورا رہ جائیگا۔ ہندوستانی ریاستوں کی آبادی آج کل ۸ کروڑ میں سے کم دبیش نو کروڑ ہو گی۔ کل ریاستیں تعداد میں اندازاً ۶۰۰ ہیں۔ ان میں سے ۱۰۹ ایسی ہیں (مثلاً حیدر آباد، میسور، بڑودہ، کشمیر، گوالیار، ٹراونکور وغیرہ) جنکے فرمانرداؤں کو چیمبر آف پرنسز میں ایک ایک نشست حاصل ہے، ۱۲۶ ریاستیں ایسی ہیں جنکو مجموعی طور پر کل ۱۲ نشستیں حاصل ہیں، اور ۳۰۰ کے قریب معمولی قسم کی جاگیروں کے برابر ہیں کا کل رقبہ چند ایکڑوں سے زائد نہیں۔ اور وہ محض اس لیئے ریاستوں کے زمرے میں آتی ہیں کہ وہ برطانوی ہند کے علاقہ میں شامل نہیں۔ بڑی ریاستیں اپنے علاقوں کے اندرونی معاملات میں بالکل خودمختار ہیں لیکن اُنکے معاملاتِ خارجہ شاہِ انگلستان Paramount Power کے ہاتھ میں ہیں۔ دوسری ریاستوں کی اندرونی خودمختاری بھی ایک محدود درجہ کی ہے۔ اور ان میں اکثر و بیشتر تو ایسی ہیں۔ جہاں کی اندرونی حکومت بھی Paramount Power کے نام پر حکومتِ ہند انجام دیتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ Coutituent

میں ان ریاستوں کو بھی نمائندگی دی جائیگی یا نہیں؛ کانگریس اس بارے میں Assembly ابھی تک خاموش ہے، ایک ثانیہ کے لیے ہم یہ تصور کر لیتے ہیں کہ انہیں نمائندگی دی جائے گی کیونکہ اگر ان ریاستوں کو شامل نہ کیا گیا تو اس برِاعظم کی تمام مجوزہ یگانگت اور وحدت زائل ہو جائیگی۔ اگر Constituent Assembly نے ریاستوں کے نوابوں اور راجاؤں کو شامل ہونے کی دعوت دی تو سب سے پہلے اُن کو پیرامونٹ پاور سے اجازت لینی ہوگی جسکے ساتھ انکا چولی دامن کا ساتھ ہے، اور جسکے ساتھ مختلف معاہدوں کی بنا پر انکے سیاسی وجود کی سلامتی قائم ہے۔ ذی ہوش افراد خود خیال فرما سکتے ہیں کہ اگر راجے مہاراجے کسی طرح کانگریس کے بُلند بانگ دعاوی سے مرعوب ہو کر شمولیت کے لیے رضامندی کا اظہار بھی کر دیں تو پیرامونٹ پاور انہیں اس امر کی اجازت دیکر کس طرح اپنی شاہنشاہیت اور وقار کا خاتمہ کر سکتی ہے۔ اگر بفرضِ محال کانگریس حکومت برطانیہ کو ریاستوں کے Constituent Assembly میں شامل ہونے کے متعلق رضامند بھی کر لے تو ہندوستانی راجے خود شامل ہونے سے انکار کر سکتے ہیں۔ اور اگر Constituent Assembly اُن کی موجودگی کے بغیر ہی کوئی ایسا آئین حکومت مرتب کرے جو ریاستوں پر بھی اثرانداز ہونا ہو تو راجے مہاراجے اُس قانون کو تسلیم کرنے سے انکار کر سکتے ہیں۔ اِسوقت کوئی ایسا قانون موجود نہیں جو راجوں مہاراجوں کو Constituent Assembly میں شامل ہونے پر مجبور کر سکے، یا بصورتِ دیگر اُس اسمبلی کے بنائے ہوئے آئین کو اُنکے علاقوں میں نافذ کر سکے۔ راجے مہاراجے اس معاملہ میں قطعاً خودمختار ہیں اور پیرامونٹ پاور کے ساتھ اُنکا کوئی ایسا معاہدہ (Treaty) نہیں جس کی رُو سے خود پیرامونٹ پاور بھی دخل اندازی کر کے ہندوستانی راجاؤں کو اس قسم کے قانون کو تسلیم کرنے کے لیے مجبور کر سکے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ Constituent Assembly اُسی وقت اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکتی ہے اور تمام ہندوستان کے لیے ایک واحد اور ہمہ گیر قانون نافذ کر سکتی ہے جب ہندوستانی ریاستیں بھی اس میں شامل ہوں جو اپنی آبادی کے لحاظ سے کُل ہندوستان کی آبادی کا اندازاً چوتھائی حصہ اور بلحاظ رقبہ قریب قریب برطانوی ہند کے برابر ہیں۔ دوسرے ہندوستانی ریاستیں اسی وقت

Constituent Assembly میں شامل ہو سکتی ہیں جب پیرامونٹ پاور بھی ان کی شمولیت کے لئے رضامند ہو، کیونکہ ریاستوں کا تعلق براہِ راست پیرامونٹ پاور کے ساتھ ہے نہ کہ برطانوی ہند کی حکومت یا اسکے باشندوں کے ساتھ۔ اسلئے Constituent Assembly کی کامیابی کا انحصار اقلیتوں کے مسئلہ کے بعد ہندوستانی راجاؤں اور پیرامونٹ پاور کی رضامندی پر بھی ہے۔

اس بات کا جواب کہ یہ راجگان Constituent Assembly میں شمولیت کے لیے کہاں تک تیار ہونگے۔ خود کانگریس کی طرزِ عمل ہی سے ڈھونڈھنا چاہیئے۔ قارئین کی یاد سے راجکوٹ کا واقعہ ابھی تک محو نہیں ہوا ہوگا۔ کہ کس طرح گاندھی جی نے راجکوٹ کی پرجا پریشاد کو والی ریاست اور اسکے وزیرِ اعظم مسٹر ویروالا کے خلاف بھڑکایا۔ جلسے کرائے جلوس نکلوائے ہڑتالیں کرائیں۔ پیرامونٹ پاور کے ایجنٹ کو ریاست کے باشندوں میں ذلیل کیا۔ وزیرِ اعظم کو کھلی کھلی گالیاں دیں۔ غرضیکہ ہر ممکن "مہاتمائی" حربہ استعمال کیا گیا۔ اور ازاں بعد فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس سے ثالثانہ فیصلہ لیکر خود قلا بازی کھا گئے اور اپنے جرم کا اقبال کر لیا کہ ہاں زیادتی میری تھی۔ علاوہ بریں کانگریس کی طرف سے ریاست ٹراونکور میں جو ریشہ دوانیاں آج ہو رہی ہیں۔ وہ بھی سب پہ روشن ہیں۔ انصاف پسند اصحاب خود اس بات کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ کانگریس جو راجوں مہاراجوں اور پیرامونٹ پاور کو ہر ممکن طریق سے ذلیل کرنے کے درپے ہے اور انکے سر پر ایک عفریت کی طرح سوار ہے وہ کس طرح ان سے تعاون کی امید رکھ سکتی ہے۔

کانگریس نے اپنے رزولیوشن میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ:۔

"جہاں کسی بات پر اختلاف رائے ہو تو وہ مسئلہ غیر جانبدار عدالت (Tribunal) کے سامنے پیش کیا جائے۔"

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے بیان مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۹۳۹ء کو جو انھوں نے لارڈ زیٹلینڈ کے بیان کے بعد بمقام بمبئی دیا۔ یہ فرمایا:۔

"اگر کسی خاص مسئلہ کے متعلق سمجھوتہ نہ ہو سکے تو اسوقت صرف ایک ہی مناسب طریقہ ہے کہ وہ معاملہ کسی آزاد ثالثوں کے سامنے پیش کر دیا جائے، مثلاً لیگ آف نیشنز یا لیگ کی

بین الاقوامی عدالت"۔

پنڈت جی ایسے ماہر سیاسیات سے اس قسم کے بیان پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ سلطنت برطانیہ کی سیاسی روایات سے کس قدر بے بہرہ ہیں۔ ابھی ۱۹۳۲ء میں لگان آراضی (Land Annuities) کے سلسلے میں آئرلینڈ کے وزیراعظم مسٹر ڈی ولیرا نے انگریزی حکومت سے جھگڑا چھیڑا۔ برطانوی حکومت نے مسٹر ڈی ولیرا کو بہت سمجھانے بجھانے کے بعد یہ تجویز پیش کی کہ وہ اس قضیہ کو ایک عدالت میں پیش کر کے فیصلہ کرالیں۔ اور اس عدالت کے جج صاحبان کا انتخاب قلمرو برطانیہ کے مختلف علاقوں (Common wealth) میں سے ہو۔ ڈی ولیرا نے مطالبہ کیا کہ یہ معاملہ ہیگ کے بین الاقوامی کورٹ میں پیش کیا جائے۔ حکومت برطانیہ نے اس مطالبہ کو ٹھکرا دیا۔ کیونکہ وہ کسی بین الاول (Inter-Imperial) معاملہ کو عدالت ہیگ میں پیش کر کے ایک غلط مثال کی بنا ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ اس واقعہ کے پیش نظر کانگریس کی تجویز کہ متنازعہ فیہ معاملات کسی بین الاقوامی عدالت کے سامنے پیش کیے جائیں۔ جس قدر بے معنی ہے قارئین اسکا خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ حکومت برطانیہ کبھی اپنے داخلی معاملات کا فیصلہ کسی غیر ملکی ادارے کے ہاتھ دینا گوارا نہیں کر سکتی۔ اگر اس اصول کو تسلیم کرے تو اسے اُن قضیہ جات کو بھی عدالت ہیگ میں پیش کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑیگا جن میں وہ خود فریقین میں سے ایک ہو۔ مثلاً معاملہ فلسطین یا شمالی مغربی سرحدی صوبے میں پٹھانوں کا معاملہ جنہیں حکومت برطانیہ باوجود مسلسل کوششوں کے آج تک طے نہیں کر سکی۔ اس سے پیدا مخ ہو گیا ہو گا کہ کانگریس کی یہ تجویز حقیقت حالات سے بے خبری اور غالباً دانستہ چشم پوشی کا نتیجہ ہے +

یہاں ہم ڈاکٹر آر۔ پی۔ پرنجپائی کے خطبۂ صدارت کا جو انھوں نے انڈین نیشنل لبرل فیڈریشن کے اکیسویں جلسہ منعقدہ الہ آباد میں، ۲۷ دسمبر ۱۹۳۹ء کو دیا۔ ایک اقتباس درج کرتے ہیں تاکہ مسلمانان ہند اور ہندوستانی ریاستوں کے خیالات کے بعد لبرل فیڈریشن کے نقطۂ نگاہ کا بھی علم ہو جائے۔ یہاں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ فیڈریشن اکثر دبیشتر ہندو اور پارسی سرمایہ داروں کی ایک انجمن ہے اور اسکے اراکین روشن خیال، مدبر۔ اور پڑھے لکھے سیاستداں سمجھے جاتے ہیں ڈاکٹر پرنجپائی صاحب فرماتے ہیں:۔

"Constituent Assembly" پر مُصر رہنا محض کم اندیشی اور معاملہ ناشناسی کے مترادف ہے۔ یہ اسکیم اعتراضات کی بوچھاڑ سے چھلنی کی جا سکتی ہے۔ اور اس پر بحث و تمحیص کرتے رہنے سے مزید وقتیں پیدا ہو جانے کا امکان ہے یہ بات کہنے میں نہایت ہی شاندار معلوم ہوتی ہے کہ ایسی اسمبلی کو بالغانہ رائے دہی کی بنا پر اکٹھا کیا جائے، لیکن کیا کبھی کسی نے ذرا سنجیدگی سے اس امر پر بھی غور کیا کہ وہ ناتعلیم یافتہ دیہاتی جو رائے دہندگان کا ایک معتدبہ حصہ ہونگے۔ وہ ہندوستان جیسے وسیع مُلک کی حکومتی مشینری کے پیچ در پیچ مسائل پر اپنی رائے دینے کے قابل ہیں میرا خیال ہے کہ یہ بات زیادہ نامُلائم نہ سمجھی جائیگی۔ اگر ہم یہ کہیں کہ مسٹر گاندھی ایک ایسے طوفانی حملے کے ساتھ جس میں صداقت۔ اہنسا۔ چرکھا۔ دھرم۔ اچھوتوں سے میل ملاپ جیسے بلند آہنگ الفاظ اور اگر ضرورت پڑے تو اسکے ساتھ ہی ہرن برت کی دھمکی سیاسی نعروں (Slogans) کی شکل میں استعمال کیے جائینگے جاہل ووٹروں کو انکے پاؤں سے اکھیڑنا چاہتا ہے۔ تاکہ اُن کی طرف سے اُسے ایسے سیاسی اختیارات حاصل ہو جائیں کہ انکے بل پر وہ جو چاہے کر سکے۔ کیا یہ اغلب نہیں کہ ایسے طوفان سے فرقہ وارانہ فسادات رُونما ہونگے جب تک کے دوسری جماعتوں کے لیڈروں سے پہلے کوئی سمجھوتہ نہ کر لیا جائے بالغانہ رائے دہی کی اسکیم میں پہلے ہی سے کئی ایک ترمیمیں ہو چکی ہیں یعنی یہ کہ اقلیتوں کو اس اسمبلی کے انتخابات میں جُداگانہ انتخاب کا حق دیا جائیگا۔ مگر اسکے ساتھ پاسنگ (Weightage) کے معاملہ کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ مُہمل شکل میں رکھا گیا ہے۔ ہندوستانی ریاستوں کی نیابت کے سوال کو چھُوا تک بھی نہیں گیا۔ اس امر پر بھی کوئی اظہار خیال نہیں کیا گیا کہ اُن پارٹیوں کو جو بلحاظ رائے ایک الگ حیثیت رکھتی ہیں اور جو شو گاؤں (واردھا) کے شوالے کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوتیں اس اسمبلی میں کیا نیابت حاصل ہو گی۔ علیٰ ہذا القیاس کئی ایک دیگر مسائل کو آئندہ کے لئے اُٹھا رکھا گیا ہے، تاکہ ان کے متعلق مہاتما جی کی اندرونی روشنی اپنے اظہار کی تقریب پیدا کر لیا کرے بقول مسٹر گاندھی ان مسائل میں سے اکثر ایسے ہیں جن کا فیصلہ اسمبلی ہی میں مختلف جماعتوں کے لیڈروں کی باہمی مشاورت سے کیا جائے گا۔ یا

گورنمنٹ سے کوئی فیصلہ حاصل کیا جائیگا (ملاحظہ ہو) وہ گورنمنٹ جسکے وجود ہی کو نیست و نابود کر دینے کا
تہیہ ہو اگر Constituent Assembly جیسے اہم ابتدائی اور بنیادی نکتہ ماہر چند
لیڈروں کی باہمی مشاورت سے یا حکومت کی مشفقانہ انداز کے ذریعہ سے اتفاق ہو جانا ممکن ہے
تو پھر ایسی مشاورت سے یہاں کی طرزِ حکومت کے تمام مسائل کو طے کر لینے پر کیا اعتراض ہو۔ اگر یہ باہمی گفت
و شنید ایک معاملہ میں کامیاب ہو سکتی ہو تو اسکے دوسرے مسائل میں کامیاب ہونے میں کیا چیز حائل
ہے۔ مجھے اس جگہ اس بلند عزم کیمیاگر کا خیال آتا ہے جو ایک ایسا مرکّب دریافت کرنا چاہتا تھا جس
میں ہر ٹھوس چیز حل ہو جائے۔ جب ایک سادہ لوح آدمی نے اس ماہر کیمیاگر سے یہ پوچھا کہ پھر وہ اُس
مرکّب کو کس برتن میں ڈال کر رکھے گا تو وہ ششدر ہو کر رہ گیا کیا یہ حقیقت سے بعید ہوگا۔ اگر ہم یہ کہیں کہ
مسٹر گاندھی اسی دُوا ساز کی مانند ہے جو اپنی بلند پروازی میں عملی رکاوٹوں کو بھول جاتا ہے تمام
Constituent Assemblies. کی تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ جہاں کہیں بھی وہ کامیاب ہوئیں
وہاں ابتدائی مسائل تمام لیڈروں کے مابین باہمی گفت و شنید سے پوری طرح سے طے کر لئے گئے
تھے اور جب یہ ابتدائی ایک جہتی مکمل طور پر حاصل ہو گئی۔ اور ازاں بعد اگر یہ ضروری سمجھا گیا تو
Constituent Assemblies کے ذریعے سے (بشرطیکہ اسکا بلایا جانا ممکنات میں سے ہو)
ان طے شدہ امور پر مُہر تصدیق ثبت کر دی گئی"۔

"اسکے برعکس ایسی بلند پروازانہ سکیموں سے اکثر ہندی قسم کے اختلافات اور تنازعات پیدا ہو گئے اور
متعدد بار اُن سے کچھ بھی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا جیسا کہ بغاوت فرانس کے وقت۔ میرے خیال میں ہمارے
لیڈروں کیلئے سب سے مناسب طریق کار یہ ہوگا کہ وہ اُس راستے پر چلیں جس پر چلکر اگرچہ انہیں انجام کار ناکامی
ہوئی تھی مگر وہ بظاہر بہت اُمید افزا۔ میری مُراد ہے کہ وہ ایک غیر رسمی اور قابلِ انتظام مختصر سی ایسی
کانفرنس میں باہم اکٹھے ہو جائیں جنے نہرو رپورٹ کو ترتیب دیا تھا۔ شاید ہے کہ پنڈت جواہر لال
بھی اپنے باپ کی بیاض میں سے ایک ورق لینا گوارا کرلے"۔

اب آپ نے خود ایک ہندو جماعت کے صدر کی زبانی Constituent Assembly کی

تعریف سُن لی اور یہ بھی سُن لیا کہ ایسی اسمبلی سے کیا نتائج رُونما ہونگے۔ یعنی اگر اسمبلی میں ہندوؤں ہی کا شمار ہوگا (اگر ایسا نہ ہوا تو اُس اسمبلی کی حقیقت ہی کچھ نہیں) تو پھر اقلیتوں کی ہستی بے معنی ہوگی۔ اور انکی موجُودگی بے اثر۔ مہاتما گاندھی چاہے کتنا ہی کہیں کہ فرقہ وارانہ کش مکش کی وجہ سے ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیگا، مگر کوئی ذی ہوش انسان ہندوستان کی موجودہ سیاسی کش مکش میں فرقہ وارانہ خوف کے عنصر کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔ دُنیا کی کوئی طاقت بھی ہندوستان کے مختلف فرقوں، قوموں اور مذاہب کو ہموار نہیں کرسکتی جس سے تمام فرقہ وارانہ اختلافات کا وجود یک قلم نیست و نابود ہوجائے۔ اِن تمام باتوں کے پیشِ نظر ہندوستان کی سیاسی بیماری کا ایک ہی علاج ہے یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کی نمائندہ جماعتوں یعنی کانگریس اور لیگ کے نفوسِ ناطقہ پر مشتمل ایک مجلسِ مفاہمت جس میں کسی قوم کی قوت کا اندازہ سروں کے شمار پر نہ ہو۔ بلکہ اِن ہر دو اقوام کو مساوی حقوق حاصل ہوں! اِس ضمن میں ہمارے سامنے مجلسِ اقوام کی مثال ہے، جہاں ہر ممبر حکومت کا حقِ رائے دہی مساوی ہے، چاہے انکی آبادی میں کتنا ہی تفاوت ہو۔ مثلاً اِس مجلسِ اقوام میں وسطی امریکہ کے ایک چھوٹے سے علاقہ "کوسٹاریکا" Costa Rica ⊛ کو جسکا طول وعرض مشکل سے ۲۰۰ میل اور ۱۰۰ میل ہوگا وہی حقِ رائے دہی حاصل ہے جو فرانس ⊛ جیسے عظیم الشّان مُلک کو۔ اِسی طرح ہندوستان میں کسی مجلسِ آئین ساز میں مختلف قوموں کی نیابت کا انحصار اُن کی آبادی کے اعداد و شمار پر نہیں ہونا چاہیئے، بلکہ اُنکے علیحدہ وجود کو تسلیم کرتے ہوئے اُمورِ سلطنت میں اُنکا اثر اور حق مساوی ہونا چاہیئے۔ تاکہ کوئی زیادہ آبادی والی قوم محض اپنی آبادی کی کثرت کے باعث دوسری کم آبادی والی قوم پر غالب نہ آسکے جس سے اس کی انفرادی حیثیت میں کسی قسم کی دخل اندازی ہو۔ بنابریں ہندوستان کی موجودہ کش مکش کا علاج کانگریس کی پیش کردہ Constituent Assembly نہیں ہوسکتا جو اقلیتوں کے بارے میں مختلف النوع خطرات سے پُر ہے جسے نہ لبرل پسند کرتے ہیں اور نہ ہندوستانی ریاستیں تسلیم کرنے کو تیار ہوں گی۔

یہاں یہ امر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حکومتِ برطانیہ کے عندیے سے بھی قارئین کو آگاہ کیا جائے

⊛ آبادی۔ کوسٹاریکا = ۵ لاکھ۔
فرانس = ۴ کروڑ۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ مستند اور واضح بیان وہ ہے جو وائسرائے ہند نے بمبئی کی اورینٹ کلب (Orient Club) میں مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۳۹ء کو اپنی تقریر کے دوران میں دیا اس تقریر کا ایک مختصر اقتباس ذیل میں درج ہے۔

"حاضرین میں جانتا ہوں کہ آپ وائسرائے اور حکومتِ برطانیہ کی پوزیشن کی مشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں جو انہیں پُرزور اور متضاد مطالبات کی وجہ سے درپیش ہیں جو ایسے سیاسی اداروں اور سیاسی عناصر کی طرف سے پیش کیے جا رہے ہیں اور جن کی (سیاسی اور ملی) حیثیت پورے پورے غور و فکر کی مستحق ہے۔ مختلف پارٹیوں میں بالضرور انصاف ہونا چاہیے اور حکومتِ برطانیہ نے بھی اس امر کا عزم صمیم کر لیا ہے کہ انصاف ضرور ہو گا لیکن میں اپنے دوستوں سے جو مختلف پارٹیوں میں ہیں، یہ دریافت کروں گا کہ کیا وہ باہم یکجا نہیں ہو سکتے اور اپنے درمیان ایک ایسا متفقہ علیہ فیصلہ نہیں کر سکتے جس سے میرا اور حکومتِ برطانیہ کا کام آسان ہو جائے جو انہیں ہندوستان کے آئندہ دستورِ سیاسی کے نازک مسئلے کے متعلق درپیش ہے اور میں پھر اس امر پر زور دینے کی جسارت کرتا ہوں کہ باہمی سمجھوتہ کر لیا جائے تاکہ ان مسائل کی گتھی سلجھانے کا راستہ زیادہ ہموار ہو جائے جن سے ہم آج دو چار ہیں۔"

"جہانتک مطمح نظر کا تعلق ہے وہ بالکل واضح ہے۔ میں ہر اس عملی تجویز پر غور کرنے کے لیے تیار ہوں جس پر سب کو اتفاق ہو۔ اور وقت آنے پر میں ہر ممکن مدد دینے کے لیے تیار ہوں۔ جو میں ذاتی طور پر دے سکتا ہوں۔ حکومتِ برطانیہ ان عملی مشکلات کی طرف سے جو موجودہ سیاسی نظام تک جسے ڈومینین سٹیٹس (درجۂ نوآبادیات) کہتے ہیں ایک ہی قدم میں پہنچنے میں پیش آئیں گی ان سے غافل نہیں اور نہ ہی ہم یہاں ان سے ناواقف رہ سکتے ہیں لیکن یہاں میں پھر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انہیں اور مجھے یہ فکر دامنگیر ہے کہ ہم اس عرصے کو جو موجودہ دستورِ سیاسی اور درجۂ نوآبادیات کے قائم ہونے تک گزریگا جس قدر بھی ممکن ہو سکے کم کرنے میں کوئی کوشش اٹھا نہ رکھیں، ہماری طرف سے یہ پیشکش

آپ کے سامنے موجود ہے"۔

حکومتِ برطانیہ کا عندیہ صاف اور واضح ہے کہ پہلے مختلف پارٹیوں کے لیڈر ایک متفقہ علیہ فیصلہ پر پہونچنے کی کوشش کریں اور جب ایسا سمجھوتہ حاصل ہو جائے تو اُسے حکومت برطانیہ کے سامنے پیش کر دیا جائے دوسرے الفاظ میں۔ پہلے اہم مسائل کا باہمی فیصلہ کر لیا جائے اور ازاں بعد اُسکے مطابق ایک دستورِ سیاسی کو مرتب کر لیا جائے، یہ نہیں کہ دستورِ سیاسی وضع کرنے کے لیئے Constituent Assembly تو پہلے بُلائی جائے مگر متنازعہ فیہ اُمور کا فیصلہ اُسکے بعد کیا جائے اِس ضمن میں لنڈن کے مشہور اخبار ٹائمز کے مقالۂ افتتاحیہ سے ایک اقتباس بے محل نہ ہوگا۔ یہ مقالہ نومبر ۱۹۳۹ء کے آخری یا دسمبر ۱۹۳۹ء کے پہلے ہفتہ کی دوران میں شائع ہُوا۔ لکھا ہے:۔

"جب ہندوستان کے مختلف سیاسی عناصر اس دستورِ سیاسی کے متعلق متفق ہو جائیں جسکے ماتحت وہ رہنے کے لیئے تیار ہیں اُسوقت اُس مُلک کو محض اِس معمولی سی بات کی بناء پر ڈومنین سٹیٹس حاصل ہو جائیگا۔ کیونکہ برٹش گورنمنٹ میں نہ تو یہ طاقت ہوگی اور نہ ہی اسکی یہ خواہش ہوگی کہ وہ متفقہ علیہ مطالبہ کی تکمیل میں رکاوٹ ڈالے یا اُسے مُسترد کر دے"۔

گذشتہ چند ماہ کے دوران میں اور بالخصوص موجودہ جنگ کے آغاز سے حکومتِ برطانیہ اور انگلستان کے اخباروں نے پے در پے اِس امر کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ ہندوستان کے سیاسی مطالبات تسلیم کرنے کے لیئے تیار ہیں۔ بشرطیکہ ہندوستان کی مختلف جماعتیں، مختلف فرقے اور مختلف سیاسی عناصر پہلے آپس میں کسی ایک سمجھوتہ پر متفق ہو جائیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کانگریس کا لائحہ عمل اِس سے بالکل مختلف ہے، بلکہ یوں کہیئے کہ بالکل اُلٹ ہے اگر کانگریس اپنے عزائم اور دعاوی میں واقعی ایماندار ہوتی تو وہ اپنے تجویز کردہ طریق کار پر اسقدر ضد اور اصرار سے کام نہ لیتی۔ اور اپنی صداقت کے ثبوت میں اُسوقت دستِ تعاون بڑھا دیتی۔ جب وائسرائے نے جنابِ جناح اور مسٹر گاندھی کو بُلا کر اپنے اختلافات کو نظر انداز کر کے ایک سمجھوتہ پر پہونچنے کی دعوت دی تھی۔ اس زرّیں موقع کو ہاتھ سے کھو دینے کی تمام تر ذمہ داری کانگریس پر عائد ہوتی ہے، جسنے مُسلم لیگ کو واحد اسلامی نمائندہ جماعت ماننے سے انکار کر کے

ہندوستان کی سیاسی ترقی کو ایک نامتعین عرصہ کے لیئے پس پشت ڈالدیا۔

کانگریس کو اب بھی حقائق سے چشم پوشی نہیں کرنا چاہیئے۔ دُنیا خُوب جانتی ہے کہ کانگریس ایک ہندو جماعت ہے، اور اس میں دوسری قوموں کا جو حصّہ ہے وہ بالکل ناقابلِ ذکر ہے۔ مسلمان بحیثیت القوم آغاز ہی سے اِس میں جذب نہیں ہو سکے جسکا سب سے بڑا باعث ہندو قوم کی اکثریت ہے جسکی وجہ سے جس بات کو وہ چاہتے ہیں اپنی کثرتِ آرائے منظور کرا لیتے ہیں، چاہے اُس میں دوسری قوموں کی حیاتِ ملّیہ پر کتنی ہی زد کیوں نہ پڑتی ہو۔ اِس سلسلے میں بندے ماترم کا دل آزار گیت اور وار دھا کی تعلیمی اسکیم ہمارے سامنے ہیں؛ اسلیے اگرچہ مسلمان وقتاً فوقتاً اِس جماعت سے تعاون بھی کرتے رہے اور اسکے ممبر بھی بنتے رہے مگر یکے بعد دیگرے کانگریس اکثریت کے طرزِ عمل اور طریق کار سے دل برداشتہ ہو کر علیحدٰہ ہوتے چلے گئے اور اب تو صرف وہی انکے ساتھ رہ گئے ہیں جنکا اور کوئی ٹھکانہ نہیں! کانگریس کو اب اپنی کمزوریوں کا احساس کرنا چاہیئے اور ذرا چشمِ بصیرت سے اپنے آپ کا زائچہ لینا چاہیئے کہ کیا اُسے مسلمانوں کی نمائندگی حاصل ہے اگر نہیں تو اُسے اِس فضول دعوے کو کہ وہ ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت ہے ترک کر دینا چاہیئے تاکہ ہندوستان کی سیاسی ترقی میں جو سب سے بڑا سنگِ راہ ہے۔ دُور ہو جائے۔ جس روز اسنے اِس صداقت کو تسلیم کر لیا۔ ہندوستان کی مُشکلات کا خاتمہ ہو جائیگا۔ مگر ہمیں اندیشہ ہے، کہ طاقت کا وہ نشہ جو گزشتہ سوا دو سال کی حکومت سے اُسکے دماغ کو بدمست کر چکا ہے اُسکا اب آسانی سے اُترنا مشکل ہے؛ اس نشے کے زیرِ اثر کانگریس اپنے ہر قول و فعل اور اپنی سیاسی تجاویز کو تمام فرقوں اور جماعتوں کے لیئے یکساں مفید سمجھنے پر مُصر رہے گی۔ اور یوں ملک کی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط تر کرتی چلی جائیگی

اِس مضمون کو ہم قائدِ ملّت جناب جناح کے الفاظ میں ختم کرتے ہیں، یہ الفاظ اُنکے اہم بیان سے لیئے گئے ہیں جو انھوں نے Constituent Assembly کے سلسلے میں مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۳۹ء کو بمبئی میں دیا:۔

"مجھے مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ کیا ہی اچھا ہو اگر مہاتما گاندھی اپنے خیالات کی فضول نمائش چھوڑ دیں۔ ایسے خیالات جو روز بروز اور ہفتہ بہ ہفتہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور جنمیں

اگر کسی چیز کو ثبات ہے تو وہ اُن کا باہمی تضاد و تخالف ہے۔ انہیں چاہیئے کہ وہ اپنی تمام توجہ صرف ایک ہی مسئلہ پر مرکوز کردیں یعنی ہندو مسلمان مسئلہ کے سلجھانے میں کیونکہ تمام کانگرسی لیڈروں میں سے وہی ایک ہیں جو بوجوہ احسن ہندو قوم کی نمائندگی کر سکتے ہیں۔ اور ہندوؤں کی طرف سے سمجھوتہ کر سکتے ہیں اور یہاں دو بڑی جماعتوں میں یگانگت اور اتفاق پیدا کر سکتے ہیں۔ اور جب یہ ہوگیا تو دوسری باتیں خودبخود صاف ہوجائیں گی مجھے اِس امر کا اعادہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ مسلمانوں کی طرف سے میں اِس باعزّت سمجھوتہ کے حصول کے لیے اپنی تمام طاقت ہمّت کے ساتھ مدد کرنے میں تیار رہوں‘‘

بہتر ہو کہ جس نقطے سے ہم نے آغازِ مضمون کیا تھا اسی پر آکر یہ دائرہ ختم ہو جائے ؎

از غلامی فطرتِ آزاد را رُسوا مکن
تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جسکے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق!
طبِّ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری

اِس سرابِ رنگ و بُو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو
(اقبالؒ)

طلوعِ اسلام
مارچ ۱۹۴۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بہ شرفِ نظر

شیرِ بیشۂ بیباکی و حریّت ۔ ضیغمِ نیستانِ جرأت و بسالت ۔ شاہینِ افلاکِ تدبّر و سیاست ۔ پروانۂ شمعِ اخوّت و محبّت ۔ طرۂ کلاہِ ملک و ملّت ۔ لعلِ بے بدیلِ ہندیاں و قائدِ اعظمِ اسلامیاں ۔ عظمت مآب ۔ محترم المقام جناب محمّد علی جناح ۔ مدظلہ العالی ۔

بہ تقریبِ سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ ۔ بمقام لاہور

حُرّیت نواز! ذرا تصوّر میں لایئے ایسے وقت کو کہ ایک وحشت انگیز ہولناک بیابان میں راہ گم کردہ مسافروں کا ایک بکھرا ہوا قافلہ نشانِ منزل سے مایوس ہو کر ضعفِ عزیمت سے پاشکستہ بیٹھ چکا ہو ۔ ایک درماندہ راہرو کی صدائے دردناک جو آوازِ رحیل کا کام دے رہی تھی ۔ فطرت کے اٹل قوانین کے ماتحت خاموش ہو چکی ہو ۔ شام کا بھیانک سنّاٹا، سر پر منڈلانے والی شب تیرہ و تار کی ہیبت انگیزیوں کا پیامِ جانکاہ دے رہا ہو ۔ غاروں میں چھپے ہوئے درندوں کے پاؤں کی آہٹ ہٹ کو قریب تر لاتی نظر آ رہی ہو ۔ درختوں کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے رہزنوں کی ریشہ دوانیاں دامنِ صحرا پر پھیلتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ بڑھتی چلی آ رہی ہوں ۔ وہ لوگ جن کی قیادت و سیادت پر بھروسہ تھا، برادرانِ یوسف کی طرح اپنے قافلہ کی گراں بہا متاع دوسروں کے ہاتھ بیچ ڈالنے کی فکر میں ہوں ۔ غرضیکہ ہلاکت یقینی اور تباہی اٹل معلوم ہوتی ہو ۔ افرادِ قافلہ میں سے جن کے دلوں میں اِس الم انگیز کیفیت کا احساس ہو اُن کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اُٹھ رہی ہوں ۔ کہ دُور افقِ امید سے ایک شاہسوار رواں دواں ۔ اُمیدوں کی ایک دنیا اپنے ساتھ لئے ان سوختہ سامانوں کی طرف

بڑھتا چلا آئے۔ منتشر افرادِ کارواں کو پھر سے ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دے اور راہزنوں اور بیگانوں کی تیار کردہ ہلاکت و بربادی کی گھاٹیوں سے بچاتا ہوا انہیں کسی محفوظ مقام کی طرف لے جانے کی فکر کرے۔
اندازہ فرمایئے۔ کہ جو قلبی کیفیت اس وقت ان راہ گم کردہ مسافروں کی ہوگی، وہی حالت آج ملّتِ اسلامیہ (ہندیہ) کی ہے۔ تحریکِ آزادی کے آغاز میں مسلمانوں کی عمومی حالت یہ تھی کہ یہ ریت کے ذرّوں کی طرح بکھرے پڑے تھے کہ تیز ہوا کا جھونکا آتا اور انہیں اِدھر سے اُدھر اُڑالے جاتا۔ پانی کی رَو آتی اور انہیں اپنے ساتھ بہالے جاتی۔ اس کاروانِ بے سالار کی متاعِ گراں بہا کو لوٹنے کے لیے چاروں طرف سے قومیں ہجوم کر کے آرہی تھیں۔ غیر تو غیر۔ خود اپنوں کی یہ حالت تھی کہ ان کی سحر طرازیاں اور فسوں سازیاں۔ ملّتِ بیضا کو خدائے طُورِ سینا سے ہٹا کر گوسالہ پرستی کی دعوت دیتی تھیں۔ غرضیکہ حالت یہ تھی۔ کہ

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو ترس گئے تھے کسی مردِ راہ داں کے لیے

قوم کی صحیح راہنمائی کرنے والے ایک ایک کر کے چل بسے تھے۔ بزمِ ملّت کی آخری شمع جس کی ضیاپاشیوں سے لاکھوں آنکھیں پُرنور تھیں، ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو بجھ چکی تھی۔ اس کس مپرسی اور بیکسی کے عالم میں اللہ تعالیٰ نے اس منتشر قافلہ کی شیرازہ بندی کے لئے آپ کی ذاتِ گرامی کو چن لیا۔ اور آپ کی نگاہِ دُور رس نے اس قافلے کو بتایا۔ کہ ان کے گرد و پیش کس کس قسم کی خطرناک گھاٹیاں موجود ہیں۔ وہ گھاٹیاں کہ جن میں کہیں "متحدہ قومیت" کے دامِ ہمرنگِ زمین میں کبوترِ حرم کو پھانسنے کی تجویزیں ہو رہی تھیں۔ کہیں کسی منبر سے یہ آواز آرہی تھی کہ قومیتیں مذہب سے نہیں، اوطان سے بنتی ہیں۔ اور یوں اس طائرِ لاہوتی کے بال و پر کو غبار آلودۂ ارض و بوم بنا کر امّتِ رسولؐ کافّۃ النّاس کو جغرافیائی حدود کی آب و گِل میں محبوس کیا جا رہا تھا۔ کہیں "امرھم شوریٰ بینھم" کی حامل قوم کی نگاہوں میں مخلوط انتخاب کے سراب کو آبِ حیوان بنا کر دکھایا جا رہا تھا۔ کہیں اس "اولی الامر منکم" کی مامور جماعت کے لئے غیر مسلموں کی امامت و قیادت کو عین دین قرار دیا جا رہا تھا۔ کہیں انگریز کے خلاف "متحدہ محاذ" کے طلسم سے کفّار و مشرکین سے توَلّی کے جواز کے فتاویٰ شائع ہو رہے تھے۔ ایک طرف ایک مغنّیِ آتش نفس سُرود گاہِ وارد ھا کی مستعار لَے میں یہ خواب آور گیت گا رہا تھا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں اس لئے اسلام کو کسی دوسرے مذہب پر

کوئی فوقیت نہیں۔ دوسری طرف کچھ خداوندانِ مکتب، شاہین بچوں کے لئے۔ اہمساکی بازوشکن تعلیم کی اسکیمیں تیار کررہے تھے۔ ہندو اپنے ذہن میں "رام راج" کے قیام کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ اور اس کے لئے انگریز سے "شریفانہ معاہدے" Gentleman's agreement استوار کررہا تھا۔ ہندوؤں کے شوروغوغا سے تنگ انگریز بھی مسلمانوں کو بلا تامّل ہندو کے ہاتھ میں دیدینے پر آمادہ تھا۔ کہ وہ اپنی پانچ ہزار سالہ غلامی کا جذبۂ انتقام اس کے خون سے ٹھنڈا کرے۔ جو لوگ اغیار کی صفوں میں کھڑے ہو کر ملّتِ اسلامیہ کی نمائندگی کا دعوٰے کررہے تھے ان میں اتنا سمجھنے کی بھی استطاعت نہ تھی کہ بساطِ سیاست پر یہ آئینی مہرے کس طرح چلائے جارہے ہیں۔ ہندو خوش تھا کہ میں نے ۹ کروڑ فرزندانِ توحید کو اچھوتوں کی صف میں ملادیا۔ انگریز راضی تھا کہ وہ خنجرِ ہلال جس کے بے نیام ہونے کے خوف سے کلیجۂ صلیب میں ہمیشہ دھڑکن رہتی تھی اسے گنگا کی لہروں میں بہادیا گیا کہ اس کس مپرسی کے عالم اور اس خلفشار وتشتّت کے وقت آپ آگے بڑھے اور ہندوؤں اور انگریزوں کے ہر خفیہ منصوبے اور ہر پوشیدہ سازش کو ایک ایک کرکے بے نقاب کردیا اور یوں ان کے تصوّرات کی حسین دُنیا کو ایک خوابِ پریشان میں تبدیل کرکے رکھ دیا اور ساری دنیا پر اس حقیقتِ عظمٰے کو واضح کردیا کہ

آساں نہیں مٹانا نام ونشاں ہمارا

بطلِ جلیل القدر!

ہمیں خوب احساس ہے کہ آپ کی منزل کس قدر کٹھن اور راستہ میں کس قدر مشکلات کا سامنا ہے۔ جہاں تک غیروں کا تعلّق ہے مسلمان جیسی منتشر قوم کے مقابلہ میں ہندوستان اور برطانیہ کی دو بڑی قوتوں کا متّحدہ محاذ ہی کچھ کم سنگِ گراں نہیں لیکن غیروں سے کہیں زیادہ مہیب اور جانگداز مشکلات خود اپنوں کی پیدا کردہ ہیں ان "اپنوں" کو بھی چھوڑیئے جو محض اپنی سنہری اور روپہلی مصلحت کوشیوں کی خاطر نشر گاہ وارد ھا (Radio Station) کے آلاتِ مکبرالصّوت (Loud Speakers) بنے ہوئے ہیں۔ وہ تو اس مخالفت پر مجبور ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ ماتم تو ان "مخلص منافقین" کا ہے جن کی رفاقت وحمایت بیش ازیں نیست کہ

کافر نتوانی شد۔ ناچار مسلمان شو

جن کا مقصدِ وحید اپنے طرۂ وجاہت کا قیام وبقا ہے۔ خواہ یہ آستانۂ خواجۂ یثرب سے وابستگی ظاہر کرنے سے حاصل

ہو جائے یا لشکرِ بولہبی میں شمولیت سے۔ بایں ہمہ نہ ان غیروں کا ہجومِ مخالفت ایسا ہے کہ اس سے کچھ خوف کھایا جائے اور نہ اپنوں میں سے بعض کی نوازشہائے بیجا اور دوسروں کے طعنہ ہائے دلخراش ایسے کہ ان کا غم کھایا جائے۔ کہ جو حق پر ہو اسے کسی کی مخالفت کی کیا پرواہ ہوسکتی ہے۔

رہے ہیں اور ہیں فرعون تیری گھات میں ابتک
مگر کیا غم کہ تیری آستیں میں ہے یدِ بیضا

حُرّیت مآب!

ہمیں اس بات کا بھی علم ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ تگ و دوِ حیات میں جو نصب العین آپ کے سامنے ہے وہ وہی ہے جو ہر مسلمان کی نگاہوں کے سامنے ہونا چاہیئے جس کے دل میں بہ حیثیت مسلمان زندہ رہنے کی تڑپ اور اپنی نسلوں کو بہ حیثیت مسلمان رکھنے کی آرزو موجزن ہے اور کسے معلوم نہیں کہ وہ نصب العین ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (Moslim India) کی تشکیل کے سوا اور کچھ نہیں۔ جس طرح آپ احوال و ظروف کا صحیح جائزہ لیتے ہوئے قدم بقدم اس درخشندہ نصب العین کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں، وہ آپ کی بلند نگہی اور حُسنِ تدبر کا آئینہ دار ہے سطح بیں لوگوں نے آپ کو صرف ایک فاضل مقنّن اور دیدہ ور مدبّر کی حیثیت سے ہی پہچانا۔ لیکن جن لوگوں کو آپ کے قریب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ مبدء فیض نے آپکو اس قدر ذہنِ رسا کے ساتھ ساتھ کس قدر دلِ پرسوز و پُردرد کی نعمت سے نوازا ہے۔

خرد نے تجھ کو عطا کی نظرِ حکیمانہ — سکھائی عشق نے تجھ کو حدیثِ رندانہ

اور قلب و نظر اور عقل و عشق کا یہی امتزاج ہے جو ایک ناخدائے کشتیٔ ملّت کی متاعِ گراں بہا ہے۔

نگہ بلند۔ سخن دل نواز۔ جاں پُرسوز — یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

عالی مرتبت!

آپ یقین فرمایئے کہ جس قوم کی فلاح و بہبود آپ کی زندگی کا مُنتہٰی ہے۔ اس قوم کا سوادِ اعظم آپ کی قیادت و امارت پر کامل بھروسہ رکھتا ہے۔ اور ان کی خاطر آپ نے جو گراں قدر قربانیاں کی ہیں۔

ان کے دل میں ان کا پورا پورا احساس ہے۔ اس میں شبہ نہیں، کہ وہ سرزمین پنجاب جو ملّتِ اسلامیہ کے اس اجتماعِ عظیم کی تقریب پر آپ کی تشریف آوری سے سرفراز ہونے والی ہے۔ اس میں آئینی نقطۂ نگاہ سے Constitutionally ابھی پراونشل لیگ کا قیام بھی عمل میں نہیں آسکا، لیکن ہمیں امید ہے کہ یہ حقیقت آپ کی نگاہ سے مستور نہ ہوگی، کہ پنجاب کا ایک ایک قریہ اور اس قریہ کے ایک ایک فرد کا دل آپکی عظمت و عقیدت کا نشیمن بنا ہوا ہے۔ بس کسی ایک مردِ خود آگاہ و خدا دوست کے نعرۂ مستانہ کی دیر ہے یہ طوفانِ بلا انگیز کسی سے روکے نہیں رُکے گا۔ اس وقت بچے گا وہی جو کشتیٔ ملّت میں اخلاص و دیانت سے سوار ہوگا۔ اور پکارنے والا پکارے گا کہ

لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ إِلَّا مَنْ رَحِمَ

سیّد القوم!

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ جسے ہزارہا پرخلوص اور صحیح النظر مسلمانوں کی ترجمانی کا فخر حاصل ہے اجلاس لیگ کی صدارت پر آپ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتا ہے اور مستدعی ہے کہ جس نصب العین کی طرف آپ کا قدم اُٹھ رہا ہے۔ قوم کو اس کی طرف اور تیز گامی سے بڑھاتے جایئے۔ اس نصب العین کے حصول کے لئے اگر ضرورت پیش آئی تو آپ دیکھیں گے کہ قوم کس طرح کفن بردوش و سربکف آپ کی دعوت پر لبیک کہتی ہے۔

بانشۂ درویشی درسازو و مادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

اراکین ادارہ طلوعِ اسلام۔ دہلی

طلوعِ اسلام
مارچ ۱۹۴۰ء

صُبحِ اُمید

کھول کر آنکھیں مِرے آئینۂ گُفتار میں !
آنیوالے دَور کی دُھندلی سی اک تصویر دیکھ (اقبالؒ)

سنہ ۱۹۳۰ء کا ذکر ہے۔ مسلمانوں نے ایک مُدّت کی گہری نیند کے بعد کروٹ لی تھی۔ ایک عرصہ کے مُنجمد خون میں کچھ کچھ روانی کے آثار محسوس ہو رہے تھے۔ ایک زمانہ کے جمود و تعطّل کی بَرف کی سِلیں حوادثِ زمانہ کی تمازت سے ذرا پگھلنی شروع ہوئی تھیں۔ ایک دشت ناپیدا کنار بیابان میں کھوئے ہوئے قافلہ کے افراد میں اپنی متاعِ گُم گشتہ کا کچھ نہ کچھ احساسِ زیاں پیدا ہو رہا تھا لیکن فکر و نظر کی پریشانیوں کے باعث کوئی زِندہ و پائندہ راہِ عمل نظر نہیں آتی تھی۔ پاؤں آمادۂ سفر تھے لیکن نہ منزل کا کوئی پتہ تھا، نہ نشانِ راہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ عوام تو ایک طرف، کشتئ ملّت کے پختہ کار ناخدا بھی عام طور پر مسئلۂ جداگانہ انتخاب۔ اور تخصیصِ نشست و نیابت کے سود و زیاں کے پیچ در پیچ مسائل میں اُلجھ رہے تھے اُنکے مطالبات، مذہبی اور ثقافتی تحفظات کی حدود میں گِھر کر رہ چکے تھے۔ اور اُن کی نگاہیں جمہوری نظامِ حکومت کی بظاہر درخشندہ اُفق پر جا کر رُک چکی تھی۔ بالعموم یہ وہ حضرات تھے، جنہیں فطرت نے صرف "دانشِ بُرہانی" عطا فرمائی تھی۔ وہ دانش جو محض احوال و ظروف کے امیال و عواطف اور حوادث و واقعات کے تجارب و مشاہدات سے استنباطِ نتائج کے بعد ہی کسی فیصلہ پر پہونچا سکتی ہے۔ اِس سے آگے نہیں بڑھ سکتی لیکن اِس محشرستانِ انتشار و تشتت میں اللہ کا ایک ایسا بندہ بھی موجود تھا جسے مبداءِ فیض کی کرم گستری نے دانشِ برہانی کے ساتھ "دانشِ نُورانی" کی متاعِ گراں بہا سے بھی سرفراز فرمایا تھا یعنی وہ دانش جو قرآن کریم کے حقائق و معارف پر تدبّر و تفکر سے ایک مردِ مومن کی نگاہوں میں وہ بصیرت پیدا کر دیتی ہے، جس سے وہ ان نفسیاتی کیفیات کا مشاہدہ کر لیتا ہے جن سے اقوام و ملل کے مقدرات کے ستارے بنتے اور بگڑتے ہیں۔ اور ان مشاہدات سے اسکے آئینۂ ادراک میں آنے والے دَور کی ایک "دھندلی سی تصویر" نظر آ جاتی ہے۔ اسکی نگہ دُور رس

آشیانہ[1] کی نظر فریب پائداری کے بجائے اس شاخ کی نزاکت پر ہوتی ہے جس پر وہ آشیانہ اُستوار ہوتا ہے۔ اسلئے وہ عام لوگوں کی طرح کبھی خوش آئند الفاظ کے سحر سے مسحور اور بلند آہنگ دعاوی کے شور سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اسکی نگاہ حقائق پر ہوتی ہے اور وہ اپنی حقائق کی دُوربین سے پردۂ افلاک کے پیچھے چُھپے ہوئے حوادث کا نظارہ کرتا ہے۔

ہاں! تو اس ہنگامہ زار انتشار و خلفشار میں یہ مردِ مومن، جسے قسّامِ ازلی نے اس قسم کی روشن بصیرت سے نوازا تھا۔ اُٹھا، قافلہ کے چند بکھرے ہوئے افراد کو یکجا جمع کیا۔ اور کہا کہ آؤ! انہیں بتاؤں کہ قرآنِ کریم نے تمہاری منزل کون سی متعین کر رکھی ہے، اور ہندوستان کے احوال و ظروف کے پیشِ نظر اس منزل تک پہونچنے کے لیے کون سی صراطِ مستقیم ہے۔ اپنے گرد و پیش کے حالات کا تجزیہ کیا۔ اور اس کے بعد کہا کہ:۔

> اس سے ظاہر ہو گیا کہ ہندوستان جیسے مُلک میں ایک ہم آہنگ "کل" کی تشکیل کے لیے بلند سطح کی فرقہ پرستی بالکل ضروری اور ناگزیر ہے، برعکس یورپین ممالک کے۔ ہندوستان میں جماعتی تشکیل کی بنا جغرافیائی حدود نہیں۔ ہندوستان ایک ایسا برّاعظم ہے جس میں مختلف النسل۔ مختلف اللسان۔ مختلف المذاہب انسانوں کی جماعتیں آباد ہیں۔ اُنکے نظریۂ زندگی کی بنا کسی مشترک نسلی شعور پر نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ہندو بھی کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جسکے مختلف افراد میں فکر و نظر کی یکسانیت ہو۔ ہندوستان میں یورپین اصولوں کے مطابق جمہوریت کی تشکیل نہیں ہو سکتی، جب تک یہاں مختلف فرقوں کی جداگانہ ہستی کو تسلیم نہ کر لیا جائے۔ لہٰذا مسلمانوں کا مطالبہ بالکل حق بجانب ہے، کہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (MUSLIM INDIA) کو معرضِ وجود میں لایا جائے......

---

[1] تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا! (اقبالؒ)

.....میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ ہندوستان کو حکومتِ خود اختیاری زیرِ سایہ برطانیہ ملے، یا اس سے باہر، کچھ بھی ہو، مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے.........

ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقہ میں کہ جس کے بل بوتے پر یہاں کی برطانوی راج قائم ہے (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ سلوک نہیں کیا) اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخر الامر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دے گا...... یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انہیں بھی کہیں اپنے نشو و ارتقاء کا موقعہ ملے۔ اسلئے کہ اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اس وحدتِ قومی کے نظامِ حکومت میں قریب قریب ناممکن ہے جس کا نقشہ ہندو اربابِ سیاست اپنے ذہن میں لیے بیٹھے ہیں۔ اور جس سے مقصدِ وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل طور پر انہیں کا غلبہ اور تسلط ہو......"

(خطبۂ صدارت حضرت علامہ اقبالؒ علیہ الرحمۃ بتقریب سالانہ اجلاس مسلم لیگ الہ آباد منعقدہ ۱۹۳۰ء)

یہ ایک نئی آواز تھی جو ہندوستان کی فضا میں غلغلہ انداز ہوئی۔ یہ ایک انوکھا نصب العین تھا جو ہندی مسلمانوں کے سامنے رکھا گیا۔ نیا اور انوکھا اسلئے کہ مسلمان صدیوں کی غلامی سے یہ بھول ہی چکا تھا کہ قرآنِ کریم کی رُو سے ایمان و اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ استخلاف فی الارض ہے اور مسلمان دنیا میں صرف اسلئے زندہ ہے کہ وہ خدا کی اس وسیع و عریض زمین پر حکومتِ خداوندی قائم کرے۔ چونکہ یہ آواز کانوں کو بالکل نامانوس معلوم ہوئی۔ اس لیے کسی نے اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ کسی نے یہ کہہ کر

ٹال دیا کہ یہ ایک شاعر کے عالمِ تصور کے حسین خواب ہیں۔ کوئی یہ سمجھ کر ہنس دیا کہ یہ ایک فلسفی کے طرفہ زا دماغ کی اُپج ہے جو ہندوستان کو ایک مُلک نہیں بلکہ مجموعۂ ممالک قرار دیتا ہے، جو یہاں کے باشندوں کو ایک قوم نہیں بلکہ مختلف اقوام کا مجموعہ خیال کرتا ہے جو مسلمانوں کو ایک اقلیت نہیں بلکہ مستقل بالذات جُداگانہ قوم گردانتا ہے۔ جو اس بیسویں صدی میں جمہوری نظامِ حکومت کو ہندوستان کے لیے ناقابلِ عمل ٹھہراتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو ہندوستان کے دو ٹکڑے کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مستقل طور پر حدِ فاصل قائم کرنا چاہتا ہے۔

اُس نے یہ سب کچھ سُنا اور ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہو گیا۔

وقت گزرتا گیا۔ حالات بدلتے گئے۔ اور ابھی دس برس بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ واقعات نے یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ سیاستِ ہند کی گتھیوں کا حل سوائے اسکے اور کچھ نہیں جو ۱۹۳۰ء میں اس "دیدہ بینائے قوم" نے پیش کیا تھا (رحمۃ اللہ تعالیٰ) آج یہ مسائل ایک ایک کر کے واضح اور بیّن طور پر سامنے آ چکے ہیں کہ ہندوستان ایک مُلک نہیں بلکہ مجموعۂ ممالک ہے۔ مسلمان ایک فرقہ نہیں بلکہ جُداگانہ قوم ہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاسی کش مکش کا تصفیہ فرقہ وارانہ انداز پر نہیں بلکہ بین الاقوامی حیثیت سے ہو سکتا ہے بنا برین مغربی انداز کا نظامِ جمہوریت یہاں قابلِ عمل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اِن امراض کا واحد علاج تقسیمِ ممالک ہے۔ آج اسکے لیے گوشے گوشے سے آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ مختلف اسکیمیں اور تجاویز پیش ہو رہی ہیں۔ ہر شخص اسی نہج پر سوچتا اور اسی طریقِ عمل کو جادۂ مستقیم سمجھتا ہے۔ حتیٰ کہ خود ہندوؤں کا وہ طبقہ جو اپنے آپ کو فریب میں مُبتلا نہیں رکھنا چاہتا۔ وہ بھی تسلیم کرتا ہے، کہ ہندی مسائلِ سیاست کا حل اسکے سوائے اور کچھ نہیں۔ مثلاً مسٹر این سی۔ رت (سابق رکن آل انڈیا کانگریس کمیٹی) اپنے ایک مراسلہ میں لکھتے ہیں:۔

"ان حالات میں میرا خیال ہے کہ ہندو مُسلم قضیہ کا حل یہی ہو گا کہ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ لیا جائے۔ اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے ساتھ ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دیا جائے۔ مسٹر جناح نے حال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصور کو سراب کے لفظ سے

تعبیر کر کے جس خیال کا اظہار کیا ہے وہ میرے خیال میں اب نہیں تو کل حقیقت ہو کر رہے گا۔ بہرحال اگر یہ چیز بھی جلد طے ہو جائے تو کچھ برا نہیں۔ یوگوسلاویہ کے کروٹ اور سرب کی طرح اگر ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں میں بھی بحیثیت فرقہ کے نہیں، بلکہ بحیثیت دو قوموں کے سمجھوتہ ہو جائے اور مسلم اکثریت کے علاقوں میں ہندو اکثریت کے علاقے مداخلت نہ کریں۔ اور ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمان مداخلت نہ کریں۔ تب بھی ہندوستان کا اجتماعی مفاد محفوظ رہ سکتا ہے میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پاکستان کے خیال سے ڈرنا نہ چاہیے۔ البتہ اس میں مناسب ترمیم و اصلاح کر کے اُسے اپنے حسبِ حال بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔" (مدینہ یکم فروری ۱۹۴۰ء)

اس میں شبہ نہیں کہ حوادثِ زمانہ کا ستایا ہوا مسلمان ضعفِ عزیمت و شدتِ انتشار کی وجہ سے ہنوز اپنے بازوؤں میں وہ قوت محسوس نہیں کرتا جو اُن چٹانوں کو ریت کے ذروں میں تبدیل کر دے جو اس کی منزل کے راستے میں حائل ہیں لیکن جب اُس نے اپنا نصب العین متعین کر لیا ہے اور اُس کے دل میں اپنے نصب العین تک پہونچنے کا عزم راسخ ہو چکا ہے تو ان عارضی حوادث و موانع سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آپ اسی نہج پر قدم اُٹھاتے چلئے چند دنوں کے بعد آپ دیکھ لیجئے کہ توفیقِ ایزدی (اسی مردِ راہ بیں علیہ الرحمۃ کے الفاظ میں)

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش ... اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی
اسقدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار ... نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائیگی
آ ملینگے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک ... بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائیگی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود ... پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائیگی
نالۂ صیاد سے ہونگے نوا ساماں طیور ... خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائیگی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے
(اقبالؒ ۱۹۱۲ء)

طلوعِ اسلام
اپریل ۱۹۴۰ء

نظر بر خطبہ صدارت

راشٹرپتی مولانا ابوالکلام صاحب آزاد

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد | کہ جبریلِ امیں را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا | پرستد مومن و کافر تراشد

جیسا کہ ہم نے اشاعتِ سابقہ میں عرض کیا تھا۔ مولانا آزاد صاحب کے انتخابِ صدارت سے ہمیں ایک خوشی ضرور ہوئی تھی اور وہ یہ کہ اب خدا خدا کر کے وہ صبر آزما سکوت ٹوٹے گا جس نے بیس سال کر یہ کیفیت پیدا کر رکھی تھی کہ

دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد

چنانچہ لاہور کی تقریر کے بعد کانگریس کے اجلاس رام گڑھ کی تقریب پر مولانا صاحب کو خطبہ صدارت سنانا پڑا جس میں ان سے وہ سب کچھ کہلوا گیا جس کے کہنے سے وہ اتنا عرصہ پہلوتہی کرتے چلے آرہے تھے۔ ہم کانگریس کے اربابِ بست و کشاد کے رہینِ کرم ہیں کہ انھوں نے حضرت مولانا کو یہ اعزاز عطا فرما کر "سادگی و پرکاری" کے ان حسین و جمیل لفر فریب پردوں کو اٹھا دیا جن میں مولانا صاحب مدت سے چھپے بیٹھے تھے اور جن کی پُرفریب کاریوں کی بنا پر بہت سے ابلہ فریب حضرات بچارے سادہ لوح مسلمانوں کو دامِ تزویر میں پھنسا لیا کرتے تھے۔ اب حقیقت بے نقاب ہو گئی اور کسی کو یہ کہہ کر دجل و تلبیس کا موقع نہ ملا کرتا ہاں۔ حضرت مولانا نے بھی ہم سے تخلیہ کی گفتگو میں یہی فرمایا ہے کہ میرا عقیدہ بھی وہی ہے جو جمہور مسلمانوں کا ہے۔" اب پردے اٹھ گئے۔ اب مولانا صاحب کے خیالات کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی۔ کیا یہ کانگریس کے اربابِ حل و عقد کا کچھ کم احسان ہے!

اس خطبہ کو شروع سے اخیر تک دیکھ جائیے۔ آپ کو اللہ اور اس کے رسول کا نام کہیں دکھائی نہیں دیگا۔ وہ مولانا آزاد کہ جن کی عہدِ اسلامی میں یہ حالت تھی کہ ہر دوسرے فقرے کے بعد آیاتِ قرآنی اور ہر تیسرے جملے کے بعد کوئی حدیثِ مقدسہ آجاتی تھی۔ آج ان کی یہ حالت ہے کہ اللہ کا نام لیتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ جھجکتے ہیں۔ اور تو اور خطبۂ صدارت کی ابتداء میں بسم اللہ تک بھی نہیں لکھی گئی۔

انقلابات ہیں زمانے کے

کہہ دیا جائے گا کہ یہ خطبہ چونکہ مختلف مذاہب و ملل کے لوگوں کے اجتماع میں پیش کیا جانا تھا اس لئے اس میں قرآن و حدیث کی ضرورت نہ تھی نہ ہی اس امر کی حاجت کہ اس کا آغاز خدا کے نام سے کیا جائے۔ کیونکہ اس مجمع میں بہت سے ایسے سامعین بھی تھے جو سرے سے خدا کی ہستی ہی کے منکر ہیں ——بجا اور درست! یہی تو ہم کہتے ہیں کہ جب ایک مسلمان کو متحدہ قومیت کا چولہ پہننا پڑتا ہے تو اسے اپنے اسلامی مقام سے ہٹنا ضرور پڑتا ہے۔ اور مسلمان جب اپنے اصلی مقام سے ہٹا، تو پھر دنیاوی اصطلاح میں وہ کچھ بھی کیوں نہ بن جائے مسلمان تو باقی نہیں رہتا۔ مسلمان رہے تو اور کچھ نہیں تو آغازِ کلام تو اللہ کے نام سے کرے۔

ہم اشاعتِ طلوعِ اسلام کی اس دو سالہ مدت میں متعدد مقامات پر مولانا آزاد کے دورِ الہلال کے خیالات کو شرح و بسط سے پیش کر کے بتا چکے ہیں کہ ان کا موجودہ مسلک خود انہی کے سابقہ ذرے کے الفاظ میں کس قدر اسلام کے خلاف ہے۔ اگر ان تمام اقتباسات کو یکجا جمع کر دیا جائے جو ہم اس ضمن میں متفرق طور پر پیش کرتے رہے ہیں تو وہ ایک ایسا صاف آئینہ بن سکتا ہے جس میں حضرت مولانا کے صحیح خدوخال نمایاں طور پر نظر آسکتے ہیں۔ ان اقتباسات کے جواب میں ہمارے اکثر دوستوں نے ہمیں لکھا کہ مولانا صاحب اب ان پارینہ داستانوں سے تائب ہو چکے ہیں۔ یہ انسانی خیالات تھے۔ جن میں ہر آن تبدیلی ہو سکتی ہے۔ ہم ان کی خدمت میں عرض کیا کرتے تھے کہ مولانا صاحب اپنے اس وقت کے خیالات کی تائید میں ہمیشہ کتاب و سنت کی نصوصِ صریحہ

پیش کیا کرتے تھے۔ اور اب موجودہ خیالات کی تائید میں جو ان کے دورِ اول کے خیالات سے بالکل متضاد واقع ہوئے ہیں کبھی بھولے سے بھی قرآن و حدیث کی سند نہیں لاتے۔ اس لئے یہ غلط ہے کہ مولانا صاحب پر جن حقائق کا اب انکشاف ہوا ہے۔ اُن کے پیشِ نظر وہ اپنے سابقہ اسلامی خیالات کو باطل سمجھتے ہیں۔ بلے الحمد کہ مولانا نے ہماری مشکل بھی حل کر دی۔ اور اپنے اس خطبہ میں واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ میرا مسلک آج بھی وہی ہے جو الہلال کے زمانہ میں تھا۔ فرماتے ہیں

"مجھے معلوم نہیں آپ لوگوں میں کتنے ایسے آدمی ہیں جن کی نظر سے میری وہ تحریریں گذر چکی ہیں جو آج سے اٹھائیس برس پہلے میں الہلال کے صفحوں پر لکھتا رہا ہوں۔ اگر چند اشخاص بھی ایسے موجود ہیں تو میں ان سے درخواست کروں گا کہ اپنا حافظہ تازہ کر لیں"۔ (خطبہ صدارت ص۳)

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں۔

"میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ میں نے ۱۹۱۲ء میں جس جگہ سے انھیں مخاطب کیا تھا آج بھی میں اسی جگہ کھڑا ہوں۔ اس تمام مدت نے حالات کا جو انبار ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے اُن میں کوئی حالت ایسی نہیں جو میرے سامنے سے نہ گذری ہو۔ میری آنکھوں نے دیکھنے میں اور میرے دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ حالات صرف میرے سامنے سے گذرتے ہی نہ رہے۔ میں اُن کے اندر کھڑا رہا۔ اور میں نے ایک ایک حالت کا جائزہ لیا۔ میں مجبور ہوں کہ اپنے مشاہدے کو نہ جھٹلاؤں۔ میرے لئے ممکن نہیں کہ اپنے یقین سے لڑوں۔ میں اپنی ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتا۔ میں اس تمام عرصے میں ان سے کہتا رہا ہوں کہ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کے لئے صرف وہی ایک راہِ عمل ہو سکتی ہے جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں انھیں دعوت دی تھی۔" (ص۳)

حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ لوگوں کو چاہئے کہ اپنا حافظہ تازہ کر لیں۔ لیکن ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ حافظہ تازہ کرنے کی ضرورت مخاطبین کو ہے یا خود مولانا صاحب کو؟ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا صاحب کے پاس الہلال کا کوئی پرچہ بھی موجود نہیں ورنہ اس بلند آہنگی کے ساتھ یہ دعویٰ کبھی نہ کرتے کہ جو کچھ میں ۱۹۱۲ء میں کہتا تھا آج بھی وہی کہتا ہوں۔ آیئے ہم مولانا صاحب کو بتائیں کہ وہ ۱۹۱۲ء میں کیا کہتے تھے اور آج کیا کہہ رہے ہیں۔ مولانا صاحب ذرا توجہ سے سنیں کہ بڑی گہری

تفکر طلب باتیں ہیں۔

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اس تمام خطبہ میں کہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کا نام نہیں آیا۔ اسلام کے کسی بزرگ کی جلالت عظمت کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بھولے سے بھی کسی اسلامی تاریخی واقعہ کا اشارہ تک نہیں آنے پایا۔ لیکن اس میں اگر کسی کی عظمت کا اعتراف ہے تو (نعوذ باللہ) اس وجودِ اقدس و اعظم کی عظمت کا جو منزہ عن الخطاء قرار پا جانے کی وجہ سے نیشنلسٹ کے نزدیک خدائی صفات کا حامل قرار دیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا ہی ایک روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو کبھی جھکنے نہیں دیتا۔" (ص ۲۱)

مہاتما گاندھی۔ عظیم روح۔ اللہ اکبر!!!

کبھی مولانا صاحب روح کی عظمت و رفعت کا یہ معیار قرار دیا کرتے تھے۔

اولیاء اللہ کا گروہ جس قدر محبتِ الٰہی اور انقطاعِ ماسوی اللہ میں ترقی کرتا ہے اتنا ہی اس کے اعمال میں اخلاقِ الٰہی اور نورِ ربانی کا ظہور بھی ترقی کرتا ہے۔ اور ان کی روح فیضانِ الٰہی سے نزدیک تر ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ تکمیلِ مرتبۂ انسانیت تک اس کا ارتفاع ہو جاتا ہے۔ اور یہی "صراطِ مستقیم" اور "دینِ قیم" کا آخری مرتبہ ہے۔۔۔۔۔۔ (یہ) وہ قانونِ ارتقا ہے جسے محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا۔" (الہلال مورخہ ۹ اگست ۱۹۱۳ء ص ۱۳)

سن لیا آپ نے کہ مولانا صاحب اپنے پیر و مرشد گاندھی جی کے متعلق کیا ایمان رکھتے ہیں! اور ان کا مقام کن فلک پیما بلندیوں پر سمجھتے ہیں؟

ہندوؤں کا یہ دعویٰ ہے کہ کانگریس ملک کی "قومی جماعت" ہے۔ اور اس کے سوا اور جتنی جماعتیں ہیں وہ فرقہ وارانہ ہیں۔ ان فرقہ وارانہ جماعتوں کی جد و جہد اپنے اپنے فرقہ کے مفاد کے لئے ہے۔ اس لئے جو کچھ کانگریس کر سکتی ہے، یہ جماعتیں نہیں کر سکتیں۔ یہی الفاظ مولانا صاحب کی زبان سے کہلوائے گئے ہیں۔ لکھا ہے:۔

"بلاشبہ ملک میں ایسی جماعتیں موجود ہیں جو سیاسی جدّوجہد کے میدان میں وہاں تک نہیں جا سکتیں جہاں تک کانگریس کے قدم پہنچ گئے ہیں۔ وہ جماعتیں بھی جو اپنے طبقہ (کلاس) کے خاص مفاد کے تحفظ کیلئے مجبور ہیں کہ موجودہ سیاسی صورتِ حال کی تبدیلی کے خواہشمند نہ ہوں۔" (ص۲۲)

یعنی جو کچھ کانگریس کر سکتی ہے وہ فرقہ وارانہ جماعتیں نہیں کر سکتیں۔ اب سنئے کہ دورِ اوّلیں میں مولانا صاحب کیا فرماتے تھے:-

"کانگریس کمیٹیاں جو کام کر رہی ہیں ان میں ہندی مسلمان بھی ہندوؤں کے برابر کے شریک ہیں۔ لیکن خاص مسلمانوں کے اندر سرگرمئ عمل پیدا کرنے کے لئے کانگریس کا نظام کافی نہیں...... کانگریس کمیٹیاں کسی شہر یا بستی میں پچاس جلسے منعقد کر کے مسلمانوں سے کہیں کہ چرخہ چلاؤ اور ولایتی کپڑا چھوڑ دو تو وہ اثر پیدا نہیں ہوگا جو خلافت کمیٹی جمعہ کے دن مسجد میں ایک وعظ کر کے پیدا کر سکتی ہے۔"

(مضامین ابوالکلام آزاد ۱۹۲۱ء)

اس وقت یہ ارشاد تھا۔ آج اگر کوئی جماعت خاص مسلمانوں کے اندر سرگرمئ عمل پیدا کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے تو اُسے فرقہ وارانہ قرار دے کر حوالۂ دار و رسن کرنے کا فتویٰ صادر فرمایا جاتا ہے۔ اور اس پر دعویٰ ہے کہ میں اس مقام سے بول رہا ہوں جہاں دورِ الہلال میں کھڑا تھا۔

ہندوستان کی سیاسی کشمکش میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ میں جو بنیادی اختلاف ہے اُسے چند الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ

(۱) ہندو اس تمام ملک کو ایک "واحدِ کُل" (Single unit) قرار دے کر ایک ایسے طرزِ حکومت کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں جس میں مرکز (Centre) ایک ہو۔ اس نظامِ حکومت کا نام آل انڈیا فیڈریشن ہوگا، جو خالصۃً مغربی انداز کے نظامِ جمہوری کے قالب میں ڈھلا ہو۔

اس کے برعکس مسلمان یہ چاہتا ہے کہ ملک کے اس حصہ کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، الگ کر کے وہاں جداگانہ اسلامی حکومت قائم کی جائے۔

(۲) ہندو تمام ہندوستان کے باشندوں کو ایک قوم فرض کر کے وحدتِ قومی (Single Nationality)

کی بنیادوں پر نظامِ حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے آپ کو ایک الگ جداگانہ مستقل بالذات قوم قرار دیتے ہیں اور ہندوستان کے مسئلہ کو بین الفرق (Inter-Communal) نہیں بلکہ بین الاقوامی (Inter-National) مسئلہ سمجھتے ہیں۔ اور دو جداگانہ قوموں کی بنیادوں پر الگ الگ حکومتیں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ مسائل اس قدر وضاحت سے طلوعِ اسلام کے صفحات پر آچکے ہیں کہ ان پر اس وقت مزید بحث ضروری نہیں سمجھی جاتی۔ دیکھنا یہ ہے کہ مولانا صاحب ان مسائل کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

> "ہندوستان کا آئندہ دستورِ اساسی (Constitntion) اپنی تفصیلات میں خواہ کسی نوعیت کا ہو مگر اس کی ایک بات ہم سب کو معلوم ہے۔ وہ کامل معنوں میں ایک آل انڈیا وفاق (Federation) کا جمہوری دستور ہوگا۔ جس کے تمام طبقے (Units) اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خودمختار ہونگے۔ اور فیڈرل مرکز کے حصے میں صرف وہی معاملات رہینگے۔ جن کا تعلق ملک کے عام اور عمومی مسائل سے ہوگا۔ مثلاً بیرونی تعلقات، دفاع (Defence) کسٹم وغیرہ (۳۱-۳۲)

یہ ظاہر ہے کہ یہ وہی نظامِ زندگی ہے جو یورپ کی ٹکسالوں سے مضروب ہو کر آیا ہے اور ہندو اسے اس لئے اختیار کرنا چاہتا ہے کہ اس کی رُو سے وہ یہاں اپنی اکثریت کی بنا پر خالص ہندو راج قائم کرسکتا ہے۔ اب دیکھئے کہ یورپ کی نقالی میں نظامِ زندگی اختیار کرنے کے متعلق مولانا صاحب کبھی کیا فرماتے تھے۔ جمعیۃ العلمائے لاہور کے خطبۂ صدارت ۱۹۲۱ء کے دوران میں ارشاد ہے۔

> "قوم افراد سے مرکب ہے اور افراد کی قومی ہستی کے قیام و ظہور کے لئے ضروری ہے کہ ایک جماعتی مسلک میں تمام افراد منسلک ہوجائیں اور تفرقہ و تشتت کی جگہ وحدت و اتحاد پر افرادِ قوم کی شیرازہ بندی کی جائے۔ ہم اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور یورپ کے اجتماعی طریقوں کی نقالی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ آخر اسلام نے بھی حیاتِ اجتماعی کے لئے کوئی نظام ہمیں دیا تھا یا نہیں! اگر دیا تھا اور ہم نے ضائع کر دیا ہے تو یورپ کی دریوزہ گری کے پہلے اسلام کا قرار دادہ جماعتی نظام کیوں نہ قائم کریں۔"

کیا مولانا صاحب ارشاد فرمائیں گے کہ وہ کانگریس کے پلیٹ فارم سے جس قسم کی جامع نظام کے قیام کی تلقین کر رہے ہیں وہ یورپ کی نقالی ہے یا اسلام کا عطا فرمودہ نظامِ حکومت؟ کیا وہ نظامِ زندگی یا طرزِ حکومت کبھی اسلامی قرار پا سکتا ہے جو کفار اور مومنین کی متحدہ قومیت سے وجود میں آئے۔ اور جس میں فیصلے کفار کی اکثریت کے تابع ہوں! ذرا سوچیے تو سہی کہ آپ کس چیز کو اسلامی قرار دے رہے ہیں! کیا یہ وہی چیز نہیں جسے قرآن کریم طاغوتی نظامِ زندگی قرار دے رہا ہے اور جسے کانگریس نے یورپ کی دریوزہ گری سے حاصل کیا ہے! اس قسم کے فیڈرل نظام میں جہاں مختلف حلقے اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہوں گے وہاں مسلمانوں کی تہذیب و تمدن، ثقافت و معاشرت کی کیا حالت ہوگی؟ اس کی بابت پوچھیے ان سیاہ اوراق سے جن پر آپ کی کانگریس کے اڑھائی سالہ عرصۂ حکومت کی داستانیں لکھی ہوئی ہیں۔ اور پھر آپ کس بھولے پن سے ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

"مرکز کے حصہ میں صرف وہی معاملات رہیں گے جن کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا مثلاً بیرونی تعلقات۔ دفاع، کسٹم وغیرہ۔ ایسی حالت میں کیا ممکن ہے کہ کوئی دماغ جو ایک جمہوری دستور کے پوری طرح عمل میں آنے اور دستوری شکل میں چلنے کا نقشہ تھوڑی دیر کے لئے بھی اپنے سامنے رکھ سکتا ہے۔ ان اندیشوں کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائے جنہیں اکثریت اور اقلیت کے اس پُرفریب سوال نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔" (ص۱۳)

یعنی مولانا صاحب کے نزدیک بیرونی تعلقات اور دفاع (Defence) وغیرہ کچھ ایسے اہم مسائل نہیں کہ جن سے خواہ مخواہ کے اندیشے پیدا کئے جائیں۔ یہ "بیرونی تعلقات" جسے اب اکثریت اور اقلیت کے پرفریب سوال کا نتیجہ قرار دیا جا رہا ہے، اہتمال کے مولانا صاحب کے نزدیک کیا معنے رکھتے تھے۔ سنیئے۔ فرماتے ہیں:-

"پس اے عزیزانِ ملت! اور اے بقیہ ماتم زدگانِ قافلۂ اسلام!!
اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں پیروانِ اسلام کے سروں پر
تلوار چمک رہی ہے تو تعجب ہے اگر اس کا زخم ہم اپنے
دلوں میں نہ دیکھیں۔ اگر اس آسمان کے نیچے کہیں بھی ایک مسلم

پیروئے توحید کی لاش تڑپ رہی ہے تو لعنت ہے ان سات کروڑ زندگیوں پر جن کے دلوں میں اس کی تڑپ نہ ہو۔ اگر طرابلس میں ایک جانبازِ وطن کے حلقِ بریدہ سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے تو ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے منہ سے دل و جگر کے ٹکڑے نہیں گرتے؟ ایران میں اگر وہ گردنیں پھانسی کی رسیوں میں لٹک رہی ہیں جن سے آخری ساعتِ نزع میں اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کی آواز نکل رہی تھی تو ہم پر اللہ اور اس کے ملائکہ کی پھٹکار ہو۔ اگر اپنی گردنوں پر اس کے نشان محسوس نہ کریں۔ اگر آج بلقان کے میدانوں میں حافظینِ کلمۂ توحید کے سر اور سینے صلیب پرستوں کی گولیوں سے چھن رہے ہیں تو ہم اللہ، اس کے ملائکہ اور اس کے رسولؐ کے آگے ملعون ہوں اگر اپنے پہلوؤں کے اندر ایک لمحہ کے لئے بھی راحت اور سکون محسوس کریں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں! حالانکہ اگر اسلام کی روح کا ایک ذرّہ بھی اس کے پیروؤں میں باقی ہے تو مجھ کو کہنا چاہئے کہ اگر میدانِ جنگ میں کسی ترک کے تلوے میں ایک کانٹا چبھ جائے تو قسم ہے خدائے اسلام کی کہ کوئی ہندوستان کا مسلمان مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس کی چبھن کو تلوے کی جگہ اپنے دل میں محسوس نہ کرے۔ کیونکہ ملتِ اسلام ایک جسمِ واحد ہے۔ اور مسلمان خواہ کہیں ہوں اس کے اعضاء و جوارح ہیں۔ اگر ہاتھ کی انگلی میں کانٹا چبھے تو جب تک باقی اعضاء کٹ کر الگ نہ ہو گئے ہوں ممکن نہیں کہ اس کے صدمے سے بے خبر رہیں۔ اور یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں محض اظہارِ مطلب کا زورِ بیان ہی نہیں ہے بلکہ عین ترجمہ ہے اس حدیثِ مشہور کا

جس کو امام احمد و مسلم نے نُعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے کہ جنابِ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا:۔

مثل المؤمنین فی توادھم وتراحمھم وتعاطفھم مثل الجسد، اذا اشتکیٰ لہٗ عضوٌ تداعیٰ لہٗ سائر الجسد بالسھر والحمیٰ۔ (الحدیث)

مسلمانوں کی مثال باہمی مودّت و رحمت اور محبّت و ہمدردی میں ایسی ہے جیسے ایک جسمِ واحد کی۔ اگر اس کے ایک عضو میں کوئی شکایت پیدا ہوتی ہے تو سارا جسم اس تکلیف میں شریک ہو جاتا ہے۔"

اور اسی کے ہم معنی صحیحین کی وہ حدیث ہے جس کو ابو موسیٰ اشعری نے روایت کیا ہے کہ

المؤمن للمؤمن کالبُنیان یَشُدُّ بعضہ بعضاً۔

ایک مومن دوسرے مومن کے لئے ایسا ہے جیسے کسی دیوار کی اینٹیں کہ ایک اینٹ دوسری اینٹ کو سہارا دیتی ہے۔"

اور فی الحقیقت یہ خصائصِ مسلم میں سے ایک اوّلین اور اشرف ترین خصوصیت ہے۔ جس کی طرف قرآنِ کریم نے اپنے جامع و مانع الفاظ میں اشارہ کیا ہے:۔

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (۲۹:۴۸)

کافروں کے لیے نہایت سخت مگر آپس میں نہایت
رحیم اور ہمدرد۔

ان میں جس قدر سختی ہے، باطل اور کفر کے لئے
اور ان کی جس قدر محبت اور الفت ہے حق و صدق اور
اسلام و توحید کے لیے۔ فاعتبروا یا ایها
المسلمون ولا تکونوا کالذین
قالوا سمعنا وھم لا یسمعون"

یہ ہیں وہ بیرونی تعلقات جن کا آج یوں استخفاف کیا جا رہا ہے۔ سچ ہے یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ سیاست حاضرہ میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا ہندوستان کے تمام باشندے ایک قوم کے افراد ہیں یا مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں۔ ہندو تمام باشندگانِ ملک کو ایک "متحدہ قومیت" کے عناصر ترکیبی قرار دیتا ہے اور مسلمان کا دعویٰ ہے کہ

بِنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اس لئے مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ لیکن ہندو اسے تسلیم نہیں کرتا۔ اور مسلمان کو ایک اقلیت قرار دیتا ہے۔ مولانا صاحب نے اس باب میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ ان کی پریشانیٔ افکار کا ایک کھلا ہوا صحیفہ ہے جس کا لفظ لفظ اس کشمکش کا غماز ہے جو اُن کے ضمیر اور مصلحت کوشی میں جاری ہے۔ انہیں مسلمانوں کو اقلیت قرار دینے کے لئے کوئی دلیل نہیں ملتی اس لئے انہیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مسلمان اقلیت نہیں ہیں۔

"میں نے اس زمانہ (زمانۂ الہلال) میں بھی اپنے اس عقیدہ کا اظہار کیا تھا اور اسی طرح آج بھی کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں کہی گئی ہے، جس درجہ یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی

اقلیت کی حیثیت ہے۔ اور اس لئے انہیں ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق ومفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہئے۔ اس ایک بنیادی غلطی نے بے شمار غلط فہمیوں کی پیدائش کا دروازہ کھول دیا۔ غلط بنیادوں پر غلط دیواریں چنی جانے لگیں۔ اس نے ایک طرف تو خود مسلمانوں پر اُن کی حقیقی حیثیت مشتبہ کردی۔ دوسری طرف دنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کردیا جس کے بعد وہ ہندوستان کو اس کی صحیح صورتِ حال میں نہیں دیکھ سکتی۔

اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو تفصیل کے ساتھ بتاتا کہ معاملہ کی یہ غلط اور بناوٹی شکل گذشتہ ساٹھ برس کے اندر کیونکر ڈھالی گئی اور کن ہاتھوں سے ڈھلی! دراصل یہ بھی اُسی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کی پیداوار ہے جس کا نقشہ انڈین نیشنل کانگرس کی تحریک کے شروع ہونے کے بعد ہندوستان کے سرکاری دماغوں میں بننا شروع ہوگیا تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس نئی سیاسی بیداری کے خلاف استعمال کرنے کے لئے تیار کیا جائے۔ اس نقشہ میں دو باتیں خاص طور سے ابھاری گئی تھیں ایک یہ کہ ہندوستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو قوم ہے اور ایک مسلمان قوم ہے۔ اس لئے متحدہ قومیت کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جاسکتا دوسری یہ کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ اس لئے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہوجائے گی اور مسلمانوں کی ہستی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ ....

برطانوی سامراج نے ہندوستان کی سرزمین میں وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے اُن میں سے ایک بیج یہ تھا۔ اس نے فوراً پھول پتے پیدا کئے اور گو پچاس برس گذر چکے ہیں مگر ابھی تک اس کی جڑوں میں نمی خشک نہیں ہوئی!

سیاسی بول چال میں جب کبھی "اقلیت" کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری

تعداد سے کم ہو' لازمی طور پر "اقلیّت" ہوتی ہے۔ اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہیے۔ بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے جو تعداد اور صلاحیّت' دونوں اعتباروں سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لئے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔ اس حیثیت کے تصور کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو' بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو' اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جا سکے۔ ساتھ ہی اس میں تعداد (Number) کے ساتھ نوعیّت (Quality) کا سوال بھی کام کرتا ہے۔ فرض کیجئے۔ ایک ملک میں دو گروہ موجود ہیں۔ ایک کی تعداد ایک کروڑ ہے۔ دوسرے کی دو کروڑ ہے۔ اب اگرچہ ایک کروڑ دو کروڑ کا نصف ہوگا اور اس لئے دو کروڑ سے کم ہوگا مگر سیاسی نقطۂ خیال سے ضروری نہ ہوگا کہ صرف اس نسبتی فرق کی بنا پر ہم اُسے ایک اقلیّت فرض کر کے اس کی کمزور ہستی کا اعتراف کریں۔ اس طرح کی اقلیّت ہونے کے لئے تعداد کے نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل (Factors) کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

آپ ذرا غور کیجئے کہ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کر لیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے کہ اس کی نسبت "اقلیّت" کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکا دینا ہے۔

اس کی مجموعی تعداد ملک میں آٹھ کروڑ کے اندر ہے۔ وہ ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح معاشرتی اور نسلی تقسیموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ اسلامی زندگی کی مساوات اور برادرانہ یک جہتی کے مضبوط رشتے نے اسے معاشرتی تفرقوں کی کمزوریوں سے بہت حد تک محفوظ رکھا ہے۔ بلاشبہ یہ تعداد ملک کی پوری آبادی میں ایک چوتھائی سے زیادہ نسبت نہیں رکھتی لیکن سوال تعداد کی نسبت کا نہیں ہے خود تعداد اور اس کی نوعیّت کا ہے۔ کیا انسانی مواد کی اتنی عظیم مقدار

کے لئے اس طرح کے اندیشوں کی کوئی جائز وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی خود نگہداشت نہیں کر سکے گی!

یہ تعداد کسی ایک ہی رقبہ میں کٹی ہوئی نہیں ہے، بلکہ ایک خاص تقسیم کے ساتھ ملک کے مختلف حصّوں میں پھیل گئی ہے۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار صوبے ایسے ہیں جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے، اور دوسری مذہبی جماعتیں اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر برٹش بلوچستان کا بھی اس میں اضافہ کر دیا جائے تو چار کی جگہ مسلم اکثریت کے پانچ صوبے ہو جائیں گے اگر ہم ابھی مجبور ہیں کہ مذہبی تفریق کی بناء پر ہی "اکثریت" اور "اقلیت" کا تصور کرتے رہیں تو بھی اس تصور میں مسلمانوں کی جگہ محض ایک "اقلیت" کی دکھائی نہیں دیتی۔ اگر وہ سات صوبوں میں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں تو پانچ صوبوں میں انہیں اکثریت کی جگہ حاصل ہے ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ انہیں کو ایک اقلیت گروہ ہونے کا احساس مضطرب کر سکے۔"

ان تصریحات سے واضح ہے کہ مولانا صاحب کے نزدیک مسلمان اقلیت نہیں۔ اور اگر یہ اقلیت نہیں تو لامحالہ ایک جداگانہ قوم ہیں۔ لیکن ایسا کہنے سے تو ان کی نیشنل ازم کی تمام عمارت دھڑام سے گر پڑتی ہے۔ وہ ایسا کس طرح کہیں! اور کہنا بھی چاہیں تو وہ جن کی نظرِ کرم نے انہیں "راشٹرپتی" کے منصبِ جلیلہ پر فائز المرام کیا ہے۔ وہ ایسا کیوں کہنے دیں! اس باب میں مولانا صاحب جس مشکل میں جا پھنسے ہیں، ان کی حالت قابلِ رحم نظر آتی ہے۔ اپنے خُطبہ کے صفحات ۲۲ تا ۲۶ پر انہوں نے بار بار اس امر کی وضاحت کی ہے کہ کانگرس نے ہمیشہ اس بنیادی اصول کو سامنے رکھا ہے کہ ہندوستان میں جو دستورِ اساسی بنایا جائے اس میں اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کی پوری ضمانت ہونی چاہئے۔ اور ان تحفظات کے جج خود اقلیت ہوں۔ آگے چل کر فرماتے ہیں :-

" آج بھی اس نے (کانگریس نے) دستور ساز مجلس (کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی) کے سلسلہ میں اس مسئلہ کا اعتراف کیا ہے .... کہ تسلیم شدہ اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہیں تو خاص اپنے ووٹوں سے اپنے نمائندوں کو چن کر بھیجیں۔ "

قارئینِ کرام کو غالباً معلوم ہوگا کہ تسلیم شدہ اقلیتوں کی اصطلاح گاندھی جی کی وضع کردہ ہے اور اس کی تشریح میں

انھوں نے مسلمان اور سکھوں کا ذکر نمایاں طور پر کیا تھا۔

اَب ذرا اِس قضیّہ کے صغریٰ کبریٰ کو سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ نتیجہ کیا مرتب ہوتا ہے۔

(۱) مسلمان اقلیّت نہیں ہیں ـــــ مولانا صاحب خود بدلائل ویراہین ثابت کر رہے ہیں۔

(۲) مسلمان ایک الگ قوم بھی نہیں ہیں ـــــ کہ اس طرح دو قوموں کا نظریہ درست ماننا پڑتا ہے جو بقول مولانا صاحب سرکاری داعوں کا وضع کردہ نظریہ ہے۔

(۳) مسلمان ایک تسلیم شدہ اقلیت ہیں ـــــ کہ یہ مولانا صاحب کے راہنما گاندھی جی کا ارشاد ہے جو مولانا صاحب کے نزدیک وحیِ منزّل سے زیادہ واجب التسلیم ہے۔

تو پھر عقل حیران ہے کہ بالآخر مسلمان ہیں کیا؟

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے،

اگر یہ دانستہ فریب دہی نہیں تو خود فریبی کی اس سے زیادہ بیّن مثال بھی مشکل سے مل سکیگی۔

مولانا صاحب نے سب سے زیادہ زور اس اَمر پر دیا ہے کہ جب مسلمان اتنی بڑی جماعت رکھتے ہیں تو انھیں اپنے مفاد کے تحفّظات کے متعلق ڈرنے کی کیا وجہ ہے! یہ دلیل بظاہر جتنی خوش آئند ہے درحقیقت اتنی ہی زیادہ پُرفریب بھی ہے۔ یہ درست ہے کہ اتنی بڑی جماعت کو کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہئے لیکن مشکل تو یہ ہے کہ جس رستم کا نظامِ جمہوری آپ یہاں قایم کرنا چاہتے ہیں اس میں اتنی بڑی جماعت ایک چوتھائی کی اقلیّت بن کے رہ جاتی ہے۔ جب آپ ہندوستان کو ایک کل (Unit) مان لیں اور تمام ملک کا ایک مرکز (Centre) قرار دیکر جمہوری نظام قائم کردیں تو اِس مرکز میں مسلمانوں کی حیثیت چوتھائی سے زیادہ بڑھ کس طرح سکتی ہے۔ لہٰذا اکثریّت کے فیصلے غیر مسلموں کے فیصلے ہونگے۔ مولانا صاحب! مصیبت تو یہ ہے کہ یہاں لڑائی آپڑی ہے گنتی جس میں آدمی گنے جاتے ہیں، تولے نہیں جاتے۔ اگر تولے جانے کا مسئلہ ہوتا تو پھر ڈرنے کی کیا بات تھی!

آپ اس اہم موضوع پر آئیے۔ جو اس تمام خطبہ کا نقطۂ ماسکہ ہے یعنی یہ کہ مسلمان ایک الگ قوم نہیں بلکہ ہندوستان کی متحدہ قومیت کا جزوِ لاینفک ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں، جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی بناوٹ (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان کے لئے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی اور پھر ایک کے بعد دوسرا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی۔ اور اس کی فیاض گود نے سب کے لئے جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں ایک آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا۔ اور ہمیشہ کیلئے یہاں بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے۔ لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا، اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔" (صفحہ ۳۳-۳۶)

(۱) "کانگریس جو قدم بھی اٹھانا چاہتی ہے، ہندوستانی قوم کے لئے اٹھانا چاہتی ہے۔" (صفحہ ۲۲)

(۲) یہ تخیل کہ ہندوستان میں دو قومیں آباد ہیں، سرکاری دماغوں کا وضع کردہ ہے (صفحہ ۲۹-۳۰)

"متحدہ قومیت" کے اس اصول کی وضاحت مندرجہ صدر الفاظ میں کی گئی ہے۔

اس مُرصّع غزل کا آخری شعر بھی سُنتے جائیے۔ فرماتے ہیں:۔

"ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیّت کا سانچہ ڈھال دیا۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے، وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا۔ اور قسمت کی مُہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں۔ مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علیٰحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیئے۔ اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیئے۔" (ص ۳۹)

اللہ اکبر! کفار اور مسلمان ایک ملک میں رہنے کی وجہ سے ایک ناقابلِ تقسیم قوم بن جاتے ہیں! کفر و اسلام ایک جگہ اکٹھے ہو کر ایک نئی تہذیب میں تحلیل ہو سکتے ہیں! یہ قدرت کا اٹل قانون ہے! یہ تقدیر کا فیصلہ ہے! اس پر قسمت کی مُہر لگ چکی ہے۔ اس متحدہ قومیّت کو خود دستِ قدرت نے تیار کیا ہے! مسلم و کافر کی علیٰحدگی کا تخیل بناوٹی ہے!!

یا اللہ! یہ ہم کیا سُن رہے ہیں! اور کس سے سُن رہے ہیں!

یہ وہ آواز سُن رہے ہیں جس کے مٹانے کے لئے حضرت آدمؑ سے لے کر حضور خاتم النبیینؐ تک انبیاء کرام کا پورا سلسلہ پیغامِ خداوندی کو لے کر ظلمت کدۂ عالم میں آتا رہا۔ اور سُن رہے ہیں اس شخص کی زبان سے جس کی ساری اسلامی عمر اس پکار میں گذر گئی کہ یاد رکھو۔ قومیّت پرستی کی یہ آواز بالشائبہ تشکیک شیطان کی آواز ہے۔ اس کے فریب میں آجاؤ گے تو سیدھے جہنم کے عمیق گڑھوں میں جا گرو گے۔ اور ہاں! بد بختی یہ کہ یہ آواز اس کی زبان سے سُن رہے ہیں جو آج بھی دعویٰ کرتا ہے کہ

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں۔" (ص ۳۰)

ہم حیران ہیں کہ کفر و باطل کے اس اسلام سوز نظریہ کی تردید میں اقبالؒ کے کتنے اقتباسات پیش کریں۔ اس کے تو پورے کے پورے مجلّات اس ایک دعوت کے نقیب ہیں کہ:

"مسلمانوں کی قومیّتِ صادقہ کی بنیاد صرف شریعت کا علم و عمل ہے" (خطبۂ صدارت مولانا آزاد ۱۹۲۱ء)

اس کا تو ایک ایک ورق۔ ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ اس دجل و فریب کی دھجیاں بکھیرنے کیلئے تھا کہ دُنیا نے جس قدر قومیتوں کی بنیادیں وضع کی ہیں سب ابلیسانہ حیلہ کاریاں ہیں۔ مسلمانوں کی قومیت کا مدار صرف مذہب ہے۔ اللہ کا قانون ابدی ہے۔

اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

ہم فی الواقعہ متحیّر ہیں کہ کون کون سے اقتباسات پیش کریں اور کہاں کہاں کے حوالے دیں۔ چند ایک اقتباسات ملاحظہ کیجئے ـــــ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ انبیاء کرام کا سلسلۂ رشد و ہدایت اسی دعوت کے نشر و اشاعت کے لئے دنیا میں قائم ہوتا رہا ہے کہ وہ انسانی رشتۂ قومیت کے ان تمام غیر فطری معیاروں کو منہدم کر دے جو رنگ۔ نسل۔ وطن کی بولہبی تقسیمات سے وضع ہوتے ہیں اور ان کی جگہ صرف ایک معیارِ قومیّت کو باقی رکھے جو اللہ کا متعین فرمودہ ہے۔ اور وہ معیارِ حقہ ہے اشتراکِ عقائد۔ یعنی مذہب۔ عہدِ اسلامی کے مولانا آزاد اس باب میں فرماتے ہیں :۔

"قرآنِ حکیم میں اگر چہ نبوت کے عام اشتراکِ جنسی کی بناء پر تمام انبیاء کرامؑ کا نام ایک ساتھ اور ایک حیثیت سے آیا ہے۔ لیکن بعض خصوصیاتِ نوعی کے لحاظ سے اس نے انبیاءؑ کے جو مختلف طبقات قائم کر دیئے ہیں ان میں دو سلسلے عام طور پر ممتاز نظر آتے ہیں :۔

ایک سلسلہ ان انبیاء مؤسسینؑ کا ہے جنھوں نے اپنی دعوت کے ذریعہ نئی قومیّتوں کی بُنیاد ڈالی اور جو قدیم عمارتوں کی اصلاح کے لئے نہیں بلکہ از سرِ نو ایک نئی قومی عمارت بنانے کے لئے آئے تھے ـــــ دوسرا سلسلہ انبیاءِ مجدّدین و محدّثین (بالفتح) کا ہے۔ جنھوں نے کسی نئی اُمت کی بنیاد نہیں ڈالی۔ بلکہ کسی پیشتر کی قائم شدہ اُمتِ صالحہ کی مزید تکمیل و تبلیغ کی۔ یا امتدادِ عہد کے نتائجِ مفسدہ و استیلائے بدعات و محدثات سے اسے نجات دلا کر فرضِ تجدید و احیاء ادا کیا۔

پہلے سلسلہ کا وصفِ امتیازی یہ ہے کہ وہ تمام قدیم نظام، قدیم عقائد اور قدیم اخلاق

ومقومات کو مٹا کر ایک جدید قومیتِ صالحہ کی بُنیاد ڈالتا ہے۔ اور اس کو آب و ہوا اور جغرافیانہ حدود طبعیہ کے اثر سے الگ کر کے صرف مذہبی آب و ہوا میں ترقی اور نشوونما دیتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں خدائے تعالیٰ نے اس صنف کے ایک نمایاں سلسلے اور اس کی ممتاز کڑیوں کا ذکر متعدد موقعوں پر ایک ساتھ کیا ہے۔"

اسی سلسلہ میں آگے چل کر فرماتے ہیں :-

"انسان کی اجتماعی حیات یا قومیت دراصل ان تمام عقائد و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے جو نسل و وطن اور متوارث و متواصل علائقِ نسلی سے ترکیب پاتے ہیں۔ ان انبیائے کرامؑ کا مشن یہ ہوتا ہے کہ ان تمام نسلی اور قومی امتیازاتِ قدیمہ کو مٹا کر ایک نئی روحانی امتیاز وخصوصیت کی بنیاد پر نئی قومیت پیدا کریں۔ پس اس بنا پر ان کی دعوت کا اوّلین اسوۂ حسنہ یہی ہونا چاہئے تھا کہ خود بھی نسل و خاندان کے تمام رشتوں کو توڑ دیں اور اس طرح نسلی قربانی کا طاقتور حربہ تیار کریں۔ اس قربانی کا اثر ان کے تمام کاروبارِ دعوت میں سب سے زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ قوم دیکھتی ہے کہ کس طرح داعیِ الی الحق نے اپنے تمام رشتوں کے گھر کو اجاڑ دیا۔ اور اس عمارت کا ایک گوشہ بن گیا، جس کی چھت کے نیچے ہمیں جگہ دے رہا ہے۔

چنانچہ انبیائے کرامؑ و رُسلِ عظامؑ کے اس سلسلہ میں جنھوں نے نئی قومیتوں کی بُنیاد رکھی ہے سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا مقام ہے۔ اور چونکہ ان کی دعوت اسی پہلی قسم کی دعوت تھی اس لئے ضرور تھا کہ اس اوّلین قربانی کا بھی وہ اسوۂ حسنہ قائم کرتے۔ پس آیۂ کریمہ مندرجہ صدر میں جب انھوں نے اپنے بیٹے کے لئے خدا کو پکارا تو ارشاد ہوا کہ یہاں جسمانی رشتہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اگر تمہارا بیٹا عملِ صالح کے اس نئے گھرانے میں داخل ہو جاتا جس کی تم نے بنیاد رکھی ہے تو وہ تمہارا عزیز تھا۔ لیکن اس نے عملِ صالح کی جگہ عملِ غیر صالح سے رشتہ جوڑا۔ پس اب اس کا ذکر بیکار ہے۔ اور یہی بنائے قومیت کا وہ ناموسِ الٰہی ہے جس کا تمہیں علم ہونا چاہئے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِکَ اَنْ اَسْئَلَکَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ - حضرت نوحؑ نے عرض کیا اے میرے پروردگار میں اپنے ضعفِ بشری کا اعتراف کرتا ہوں اور تیری رحمت ومغفرت میں پناہ لیتا ہوں کہ جس چیز کی حکمت وحقیقت پر میری نظر نہ تھی میں نے اس کی نسبت تجھ سے سوال کیا!"

پھر ارشاد ہے:۔

"حضرت نوح علیہ السلام نے جس نئی امت کی بنیاد رکھی جا رہی تھی اگرچہ ضلالتِ عصر اور جہلِ انسانیت اس سے دست و گریبان رہی اور اس لئے مَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِیْلٌ (۱۱-۴۰) ان پر ایمان لانے کی سعادت نہیں ملی مگر ایک چھوٹی جماعت کو' تاہم مومن امتِ صالحہ کی اس عہدِ اولیٰ میں بنیاد پڑ چکی تھی وہ ضائع نہ گئی اور خدا کا کوئی حکم دعوت ضائع نہیں جا سکتا۔ اگرچہ خود حضرت نوحؑ پر بہت کم لوگ ایمان لائے کیونکہ انسانی مدنیت وعمران کا بالکل عہدِ طفولیت بلکہ اس سے بھی مقدم تر دور تھا۔ اور مذہب کا سلسلۂ ارتقاء ابھی ابھی اپنی ابتدائی کڑیوں سے ایک دو قدم آگے بڑھا تھا۔ لیکن جب حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے مصدقین و متبعین کی اولاد زمین کے مختلف گوشوں میں پھیلی تو وہ اپنے ساتھ اس نئی قومیت کے عقائد و اعمال بھی لے گئی۔

یہ در اصل اسی طرف اشارہ ہے کہ حضرت نوحؑ کی دعوت کسی خاص نسل اور قوم کو زندہ کر دینے کے لئے نہ تھی، بلکہ وہ اس قسم کی دعوت میں داخل تھی جو موجودہ نسلوں اور قوموں سے بالاتر ہو کر خود ایک نئی قوم پیدا کرتی ہے اور اس کی بنیاد محض اخوتِ دینی پر قائم ہوتی ہے پس وہ جغرافیہ و نسل سے ماوراء رہ کر ایک عالمگیر برادری بن جاتی ہے۔ اور زمین کا ہر ٹکڑا نوعِ انسانی کا ہر حصہ۔ اقوام و ملل کی ہر نسل اس کے دامن میں پناہ لے سکتی ہے" (ترجمان القرآن)

یہ حقائق کسی تبصرہ کے محتاج نہیں۔ آپ خود فیصلہ فرمایئے کہ خود انبیاء کرام علیہم السلام جس قومیت کی تاسیس کے لئے تشریف لاتے رہے کیا وہ وہی قومیت ہے جو اشتراکِ وطن سے تشکیل پذیر ہوتی ہے۔ اور مولانا صاحب

جس کے آج اس فخر و مسرت سے لاینفک عنصر بننے کا اعلان فرماتے ہیں یا یہ وہ قومیت ہے
جسے مٹانے کے لئے یہ سلسلۂ رشد و ہدایت جاری رہا تھا!

اب کوئی کفر کو اسلام کہنے لگ جائے تو اس کا کیا علاج!

یہ البلاغ کے مولانا آزاد تھے اور آج کے مولانا آزاد قومیت کا معیار وطن کی چار دیواری قرار دے رہے ہیں۔

الہلال والے ابوالکلام لکھتے ہیں:

"انسان کی یہ سب سے بڑی ضلالت اور خدا فراموشی تھی کہ اس نے رشتۂ خلقت کی وحدت کو بھلا کر زمین کے ٹکڑوں اور خاندان کی تفریقوں پر انسانی رشتے قائم کر لئے تھے۔ خدا کی زمین کو جو محبت اور باہمی اتحاد کے لئے تھی قوموں کے باہمی اختلافات و نزاعات کا گھر بنا دیا تھا۔ لیکن اسلام دنیا میں پہلی آواز ہے جس نے انسان کی بنائی ہوئی تفریقات پر نہیں، بلکہ الٰہی تعبد کی وحدت پر ایک عالمگیر اخوت و اتحاد کی دعوت دی۔ اور کہا کہ

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔

اے لوگو! ہم نے دنیا میں تمہاری خلقت کا وسیلہ مرد اور عورت کا اتحاد رکھا۔ اور نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا اس لئے کہ باہم پہچانے جاؤ۔ ورنہ در اصل یہ تفریق و انشعاب کوئی ذریعہ امتیاز نہیں۔ امتیاز اور شرف اسی کے لئے ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ متقی ہے۔

پس در حقیقت اسلام کے نزدیک وطن و مقام اور رنگ و زبان کی تفریق کوئی چیز نہیں۔ رنگ اور زبان کی تفریق گو وہ ایک الٰہی نشان ضرور تسلیم کرتا ہے "وَمِنْ آيَاتِهِ اخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ" لیکن وہ اس کو کسی انسانی تفریق و تقسیم کی حد نہیں قرار دیتا۔ انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔

اصلی رشتہ صرف ایک ہے۔ اور وہ وہی ہے جو انسان کو اس کے خالق اور پروردگار سے متصل کرتا ہے۔ وہ ایک ہے پس اس کے ماننے والوں کو بھی ایک ہی ہونا چاہئے۔ اگرچہ سمندروں کے طوفانوں، پہاڑوں کی مرتفع چوٹیوں، زمین کے دور دراز گوشوں اور جنس و نسل کی تفریقوں نے ان کو باہم ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہو۔

إِنَّ هٰذِهٖٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۔ وَّأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (۲۳/۵۲)

بے شک تمہاری جماعت ایک ہی اُمّت ہے اور ہم ایک ہی تمہارے پروردگار ہیں۔

اے برادرانِ ملّت! یہی اسلام کی وہ عالمگیر اخوّت اور دعوتِ اسلام کی وحدت تھی جس نے زمین کے دور دراز گوشوں کو ایک کر دیا تھا۔ اسلام نے ریگستانِ حجاز میں ظہور کیا۔ مگر صحرائے افریقیہ میں اس کی پکار بلند ہوئی۔ اس کی دعوت کی صدا جبلِ بوقبیس کی گھاٹیوں سے اٹھی۔ مگر دیوارِ چین سے صدائے اشہد ان لاالٰہ الا اللہ کی بازگشت گونجی۔ تاریخ کی نظر میں جس وقت دجلہ و فرات کے کنارے پیروانِ اسلام کے نقشِ قدم گن رہی تھیں عین اسی وقت گنگا اور جمنا کے کنارے سینکڑوں ہاتھ تھے۔ جو خدائے واحد کے آگے سربسجود ہونے کے لئے وضو کر رہے تھے۔

وہ تمام دنیا کی مختلف قومیں، زمین کے دُور دراز گوشوں پر بسنے والی آبادیاں گویا ایک ہی گھر کے عزیز تھے جن کو شیطانِ رجیم کی تفرقہ اندازیوں نے ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا۔ لیکن خدائے رحیم نے اُن صدیوں کے بچھڑے ہوئے دلوں کو ایک داعیٔ صلح کے ذریعے پھر ایک جگہ جمع کر دیا۔ اور ان کے رُوٹھے ہوئے دلوں کو اس طرح ایک دوسرے سے ملا دیا کہ تمام پچھلے شکوے اور شکایتیں بھول کر ایک دوسرے کے بھائی اور شریکِ رنج و راحت ہو گئے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَآءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ إِخْوَانًا ۝ (۳:۹۸)

اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو، جو تم پر نازل کی گئی، جبکہ تم اسلام سے پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ مگر اسلام نے تمہارے دلوں میں اُلفت و محبّت پیدا کر دی، اور دشمن کی جگہ ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہو گئے۔

"یہ برادری خدا کی قائم کی ہوئی برادری ہے۔ ہر انسان جس نے کلمہ لا الٰہ الاّ اللہ کا اقرار کیا، مجرّد اقرار کے اس برادری میں شامل ہو گیا۔ خواہ مصری ہو، خواہ الجریا کا وحشی ہو، خواہ قسطنطنیہ کا تعلیمیافتہ ترک۔ لیکن اگر وہ مُسلم ہے تو اس ایک خاندان توحید کا عضو ہے جس کا گھرانہ کسی خاص وطن اور مقام سے تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ تمام دُنیا اس کا وطن اور تمام قومیں اس کی عزیز ہیں۔ دُنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں۔ مگر یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ ممکن ہے کہ ایک باپ اپنے لڑکے سے رُوٹھ جائے بعید نہیں کہ ایک ماں اپنی گود سے بچّے کو الگ کر دے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کا دشمن ہو جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا کے تمام عہد مودّت۔ خون اور نسل کے باندھے ہوئے پیمانِ وفا و محبت ٹوٹ جائیں، مگر جو رشتہ ایک چین کے مسلمان کو افریقہ کے مسلمان سے، ایک عرب کے بدّو کو تاتار کے چرواہے سے اور ایک ہندوستان کے نَو مسلم کو مکّہ معظّمہ کے صحیح النسب قریشی سے پیوست و یک جان کرتا ہے، دنیا میں کوئی طاقت نہیں ہے جو اسے توڑ سکے اور اس زنجیر کو کاٹ سکے۔ جس میں خدا کے ہاتھوں نے انسانوں کے دلوں کو ہمیشہ کے لئے جکڑ دیا ہے۔" (الہلال ۱۲ نومبر ۱۹۱۳ء)

جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے۔ ہم چاہیں تو اس موضوع پر صفحات کے صفحات الہلال وغیرہ کے پیش کرتے جائیں۔ لیکن عدم گنجائش زیادہ طوالت کی مانع ہے۔ اس لئے اس عنوان پر مزید اقتباسات سے احتراز کیا جاتا ہے۔ ضرورت ہوئی تو انشاء اللہ کبھی پھر سہی۔ اس موضوع پر تفصیل بحث کے لئے ہمارا شائع کردہ پمفلٹ "متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب مدنی" ملاحظہ فرمایئے۔ اس وقت ضمناً دو تین باتیں اشارۃً عرض کرنا ضروری ہیں۔ متحدہ قومیت سے

مفہوم یہ ہے کہ ہندوستان کے نظامِ جمہوری میں اُمورِ مہمّہ کے فیصلے مسلم وغیر مسلم دونوں کی مشترکہ اکثریت سے نفاذ پذیر ہوں گے۔ مسلمانوں کی خالص جُداگانہ اکثریت کا اس میں کوئی سوال نہ ہوگا۔ کیونکہ اس وقت معیارِ فیصلہ قوم کی اکثریت ہوگا نہ کہ مسلمانوں کی اکثریت۔ اس لئے کہ جب دونوں مل کر ایک قوم ہو گئے تو پھر ان کی الگ الگ ہستی کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ لیکن دیکھئے کہ الہلال والے مولانا آزاد اس باب میں کیا فرماتے تھے۔

"اسلام میں حقِ اَمر و حکم کسی کو نہیں۔ وہ دُنیوی انتظام و حکومت میں جب کسی ایک فرد کے استبداد کو تسلیم نہیں کرتا اور کہتا ہے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ تو اس کے احکامِ دینیہ کیونکر تاریخ آمار یا شخص وجماعتِ مخصوصہ ہو سکتے ہیں! اس لئے یہ حق صرف قرآن کو دیا ہے یا پھر دُنیوی اُمور میں اس اجماع کو جو تمام مسلمانوں کی اکثریتِ رائے سے عبارت ہے"۔ (الہلال ۸ اکتوبر ۱۹۱۳ء)

آج ہم سے کہا جاتا ہے کہ دینی امور میں فیصلے مسلمانوں کی اپنی اکثریت سے ہونگے اور دنیاوی امور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ قوم کی اکثریت سے۔ لیکن خود مولانا صاحب کا یہ فیصلہ ہے کہ دُنیاوی اُمور میں بھی مسلمانوں کے فیصلے "وہ اجماع کر سکتا ہے جو تمام مسلمانوں کی اکثریتِ رائے سے عبارت ہے"۔ اس لئے کہ اسلام میں مذہب و سیاست۔ دین و دُنیا کوئی الگ الگ شعبے نہیں ہیں۔ ان میں تو باہمی ایسا التزام و امتزاج ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا ناممکن ہے۔ اب فرمائیے کہ مولانا صاحب کی "متحدہ قومیت" کی اکثریت کے فیصلے مسلمانوں کے نزدیک کس طرح قابلِ قبول ہو سکتے ہیں!

تاہم یہ وہ مولانا صاحب جن کا دعویٰ ہے کہ میں آج بھی الہلال کے مقام سے بول رہا ہوں۔ انہیں تو چاہیے تھا کہ اپنے خطبۂ صدارت سے پہلے فرماتے کہ "ہم وارد ھا کے ریڈیو اسٹیشن سے بول رہے ہیں۔ ابھی آپ کو مہاتما گاندھی کا ایک ریکارڈ سنایا جائے گا"۔

پھر مولانا صاحب نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں کی الگ قومیت کا تصور "سرکاری دماغوں" کا

پیدا کردہ ہے۔ قومیت پرست حضرات کا یہ ایک پرانا مرض ہے کہ جس کسی سے اختلاف ہوا، جھٹ کہہ دیا کہ وہ گورنمنٹ کا آدمی ہے۔ سرکار پرست ہے۔ ٹوڈی ہے۔ دشمنِ آزادی ہے۔ اور اسے یوں نکو بنا کر اصل موضوع سے الگ ہو گئے۔ ہمیں افسوس تھا کہ اس باب میں مولانا صاحب بھی اسی بازاری سطح پر اُتر آئے اور جب اور کوئی دلیل نہیں سوجھی تو کہہ دیا کہ مسلمانوں کی الگ قومیت کا خیال سرکاری دماغوں کا وضع کردہ ہے۔ صفحاتِ گذشتہ میں مولانا صاحب کی تحریروں کے جو اقتباسات پیش کئے جا چکے ہیں ان سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ مسلمانوں کی الگ قومیت کا تصور "سرکاری دماغوں" کا وضع کردہ ہے یا یہ تخیل سرکارِ مدینہ۔ رحمتِ دو عالم۔ حضور رسول کافۃ للناس پر نازل شدہ ضابطۂ خداوندی نے متعیّن فرمایا ہے۔ وہی چیز جو الہلال کے دور میں عین قرآنی تھی، اصل اسلام تھی، آج "سرکاری دماغوں کا وضع کردہ" بتائی جاتی ہے! ذرا سنئے کہ سرکاری دماغوں کا "پیدا کردہ" مسلمانوں کی جداگانہ "قومیّت" کا تصور ہے یا اس قومیت کا تصور جسے مولانا صاحب اشتراکِ وطن کے بدیہی معیار کے مطابق اب متشکل فرما رہے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جغرافیائی حدود کی بناء پر تخلیقِ قومیت کا نظریہ یورپ کا پیدا کردہ ہے اب دیکھئے کہ اس نظریہ کی طرف دعوت دینے والوں کے متعلق مولانا صاحب کا کیا ارشاد تھا۔ البلاغ جلد ۱ نمبر ۲ کے عربی افتتاحیہ میں فرماتے ہیں:۔

"وصاح بهم خطيب فتنة الافرنجية' ان لاحياة لكم بالرابطة
الاسلامية۔ لانها ممقوتة فى نظر اهل مدنية الغابية
وما اعتزبه المسلمون الاولون من آداب القرآن۔ فقد
نسخته مدنية اوربا فى هذا الزمان۔ فالافرنجية!
الافرنجية! التزموها تكونوا من الفائزين۔ والقومية
القومية! اعلنوها ان كنتم مومنين ...... فاولئك
حزب الشيطان۔ الا ان حزب الشيطان هم الخاسرون (٥٨:١٢)

(ترجمہ) اور فرنگیت کے خطیب پکار پکار کر چلا رہے ہیں کہ اگر زندگی چاہتے ہو تو مغربیت کی پیروی کرو۔ تمہاری حیات "رابطۂ اسلامی میں نہیں۔ اس لئے کہ مغربی تمدن کی نظروں میں رابطۂ اسلامی کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ اور مسلمانوں نے ازمنۂ گذشتہ میں جو قرآن کریم کی پیروی سے عزت و وقار حاصل کیا تھا تو وہ چیز اس زمانے میں کارآمد نہیں۔ اسے یورپین تمدن نے منسوخ کر دیا۔ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر فائز المرام ہونا چاہتے ہو تو فرنگیت کو مضبوطی سے تھام لو۔ اور قومیت پرستی کا زور و شور سے اعلان کرو اگر تم ایسا نہ کرو گے تو۔

لیکن یہ لوگ شیطان کے گروہ میں سے ہیں۔ اور یاد رکھو شیطان کا گروہ ہمیشہ ناکام و نامراد رہیگا۔

آج مولانا صاحب اشتراکِ وطن کی بناء پر متحدہ قومیت میں تمام مصائب کا حل بتاتے ہیں لیکن یہی مولانا صاحب اپنے اسلامی دور میں فرماتے تھے کہ

"ہمارے ملکی بھائی اپنے اندر صرف قومیت اور سیاست کی روح پیدا کر کے زندگی کی حرارت پیدا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اور قومیں بھی۔ لیکن مسلمانوں کی تو کوئی علیحدہ قومیت نہیں جو کسی خاص نسل و خاندان یا زمین کے جغرافیائی تقسیم سے تعلق رکھتی ہو۔ ان کی ہر چیز مذہب، یا بالفاظِ مناسب تر ان کا تمام کاروبار صرف خدا سے ہے۔ پس جب تک وہ اپنے تمام اعمال کی بنیاد مذہب کو قرار نہیں دینگے اس وقت تک ان میں نہ قومیت کی روح پیدا ہوگی اور نہ وہ اپنے بکھرے ہوئے شیرازہ کو جمع کر سکیں گے۔ آج دنیا "قوم" اور "وطن" کے نام میں جو تاثیر دیکھتی ہے مسلمانوں کیلئے وہ اثر صرف "اسلام" یا "خدا" کے لفظ میں ہے۔ یورپ میں "نیشن" کا لفظ کہہ کر ایک شخص ہزاروں دلوں میں حرکت پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن آپ کے پاس اس کے مقابلہ میں

اگر کوئی لفظ ہے تو خدا یا اسلام ہے۔"

اس وقت مسلمانوں کی ممدوح کو گرمانے والے الفاظ "اسلام" اور "خدا" کے تھے۔ آج اس کے اندر حرارت پیدا کرنے کے لئے "آشکدۂ وطنیت" کا راستہ بتایا جا رہا ہے! اس وقت کہا جاتا تھا کہ مسلمانوں کی کوئی قومیت زمین کی جغرافیائی تقسیم سے تعلق نہیں رکھتی اور آج انہی جغرافیائی تقسیم پر قائم شدہ قومیت کو قدرت کا فیصلہ بتایا جاتا ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اس قسم کے غیر اسلامی متحدہ قومیت کا اثر کیا ہوتا ہے خود مولانا صاحب کے الفاظ میں سنئے۔ اپنے خطبۂ صدارت کے صفحات ۲۰-۳۰ پر ارشاد فرماتے ہیں:-

ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بیشمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ گئی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں، مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے، مگر انہوں نے مل جل کر ایک سانچہ پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے، اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے۔ جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں، جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں۔ اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی اس گذری ہوئی تہذیب معاشرت

کو پھر تازہ کریں' جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں ان سے بھی کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے۔ کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے۔ اور حقیقت کی زمین میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے۔ میں اُن لوگوں میں ہوں جن کا اعتقاد ہے کہ تجدید (Revival) مذہب میں ضرورت ہے' مگر معاشرت میں ترقی سے انکار کرنا ہے۔"

ذرا الفاظ کی سحر طرازی ملاحظہ فرمائیے۔ "ایران اور وسط ایشیا" لکھ کر مولانا صاحب نے نہایت سادگی لیکن پرکاری سے ایک اہم اعتراض سے بچ نکلنے کی کوشش کی ہے گویا انھوں نے ظاہر یہ کرنا چاہا ہے کہ وہ اس تہذیب و معاشرت کی تجدید کے خلاف ہیں جو مسلمان عجم سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اسلامی تہذیب و معاشرت کے خلاف نہیں' لیکن مولانا صاحب نے یہ نہیں سوچا کہ صرف "ایران و وسط ایشیا" کے دو لفظ لکھ دینے سے آپ اپنے دامنِ تقدس کو بچا کر نہیں نکل سکتے۔ ذرا ان الفاظ کے سیاق و سباق پر نگاہ ڈالئے اور سوچئے کہ آپ زبان۔ رسم و رواج۔ شعر و ادب۔ معاشرت۔ ذوق اور روزانہ زندگی کی بےشمار حقیقتوں کے متنوع گوشوں میں سے کسی ایک گوشہ کے لئے بھی اس زمانہ کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے۔ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مسلمان یہ تمام کی تمام چیزیں وسط ایشیا اور ایران سے ہی اپنے ساتھ نہیں لائے تھے بلکہ ان کے تمدن و تہذیب کی آب و گل میں خاکِ پاک حجاز کا بھی کافی عنصر شامل ہے اور مسلمان اپنی عجمی تہذیب کا احیاء نہیں بلکہ خالص اسلامی تہذیب کا احیاء چاہتے ہیں جس کی نسبت مولانا صاحب کبھی فرمایا کرتے تھے :۔

"میرا عقیدہ ہے کہ آج حیاتِ ملت و حصولِ عظمتِ ملی کے لئے مسلمانوں کو اپنے اعمال کی کسی شاخ میں بھی "تاسیس" کی ضرورت نہیں بلکہ صرف تجدید کی ضرورت ہے کہ جن اصولوں کو ہم نے بھلا دیا ہے اُن کو دوبارہ زندہ کریں اور جس متاع کو حاصل کر کے گم کر دیا ہے اس کے سراغ میں پھر نکلیں۔ ہمارا جیب و دامن آج کی طرح ہمیشہ خالی نہ تھا۔ اگر آج اوروں کے پاس لعل و جواہر ہیں تو ہمارے پاس بھی اس کی کانیں تھیں۔ آج اگر ہم مفلس ہیں تو دوسروں کے لعل و

وجواہر کو نظرِ حسرت و طمع سے دیکھنے کی فرصت نہیں۔ ہم کو اپنی گم کردہ گاؤں کے سراغ میں نکلنا چاہیئے۔ جن کی دولت لازوال تھی اور ہمیشہ لازوال تھی۔"

مولانا صاحب کا ارشاد ہے کہ ہندو اگر اپنی ہزار سالہ پیشتر کی تہذیب کا احیاء کرنا چاہتے ہیں تو انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ وہ خواب ہے جو کبھی پورا نہ ہوگا۔ گویا وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ متحدہ قومیت میں ہندو بھی اپنی پرانی تہذیب کو ازسرِنو رائج نہیں کرسکتے۔ حالانکہ ہر وہ شخص جس کی نگاہوں سے اللہ تعالیٰ نے نورِ بصیرت سلب نہیں کرلیا۔ اچھی طرح سے دیکھ سکتا ہے کہ ہندو اپنی اس تہذیب کہنہ کا کتنا بڑا حصہ اس وقت تک ملک میں رائج کرچکے ہیں اور بقیہ کی ترویج و تنفیذ میں کس شدت سے کوشاں ہیں۔ کیا کانگریس کا اڑھائی سالہ دورِ حکومت محض اسی مقصد کے حصول میں صرف نہیں کیا گیا کہ کسی طرح پراچین کی پرانی تہذیب کا احیاء کیا جائے۔ اور مسئلوں کو چھوڑ دیجئے، ایک زبان ہی کو لیجئے۔ دیکھئے کہ اس دو تین سال کے عرصہ میں وہ کیسے کیا ہوچکی ہے اور کیا ہوتی چلی جارہی ہے۔ حتیٰ کہ خود ابوالکلام بھی "چناؤ" اور "سبھاؤ" جیسی پرشتو نما زبان لکھ رہا ہے۔ اور اس پر بھی مسلمانوں کو یہ کہہ کر دھوکا دینے کی کوشش کی جارہی ہے کہ نہیں، فکر نہ کرو۔ ہندو اپنی پرانی تہذیب کو رائج نہیں کرسکتے! دور کیوں جائیے مولانا صاحب سے صرف اتنا پوچھئے کہ جس کانگریس نگر سے آپ ابھی ابھی تشریف لا رہے ہیں وہاں آپ نے کیا منظر دیکھا! کیا اس میں پراچین تہذیب کی کوئی جھلک آپ کو نظر نہیں آتی تھی۔ جناب خود صدر سے "راشٹرپتی" بن چکے ہیں اور اس پر بھی آپ کو پراچین تہذیب کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔

خضر کیونکر بتائے۔ کیا بتائے؟
اگر ماہی کہے۔ دریا کہاں ہے!

اب حضرت مولانا صاحب کے خطبۂ صدارت کے مقطع کا بند بھی سنئے۔ سنئے اور سر پکڑ کر بیٹھ جائیے کہ یا اللہ! جب کوئی شخص تیرے پیامِ ابدی سے مذاق کرتا ہے تو اس کا کیا حشر ہوجاتا ہے! فرماتے ہیں اور وہی مولانا صاحب فرماتے ہیں جو ابھی ابھی اعلان فرما رہے تھے کہ "میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں کہ:

"آج ہماری ساری کامیابیوں کا دار و مدار تین چیزوں پر ہے :-

(۱) اتحاد

(۲) ڈسپلن اور ——— اور (سُنئے۔ سُنئے۔ ذرا کلیجہ تھام کر سُنئے)

"مہاتما گاندھی کی راہنمائی پر اعتماد۔ یہی ایک تنہا راہنمائی ہے جس نے ہماری تحریک کا شاندار ماضی تعمیر کیا۔ اور اسی سے ہم ایک تحمند مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں۔" (ص ۳۹)

پھر سُنئے ان الفاظ کو

"یہی ایک تنہا راہنمائی ہے"

یہ مولانا صاحب کا ایمان ہے۔ اور قرآن کا ارشاد ہے کہ

قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ (۲/۱۲۰)

کہدے کہ راہ نمائی صرف ایک ہے۔ اور وہ اللہ کی راہنمائی ہے۔

ایک انسان کی راہنمائی۔ اور پھر انسانوں میں سے بھی ایک غیر مسلم کی راہنمائی! استغفر اللہ ربی من هفوات الشیطان۔

سنئے کہ وہ اسلامی کے مولانا آزاد اس قسم کی راہنمائی کے متعلق کیا فرماتے تھے۔ ارشاد ہے :-

"اور ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل و اعتقاد کے لئے بھی اس کتاب کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا رہنما بنائے وہ مسلم نہیں بلکہ شرک فی صفات اللہ کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم اور اس لئے مشرک ہے۔ اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ کہ اس کے پیرووں کو پولٹیکل پالیسی قائم کرنے کے لئے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے۔ مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولٹیکل تعلیم کے آگے جھک کر نیا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنیوالے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں۔ وہ خدا کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو ساری دنیا اُن کے آگے کھڑی ہو جائے گی۔ اُن کا خود اپنا راستہ موجود ہے۔ راہ کی تلاش میں کیوں اوروں کے دروازوں پر بھٹکتے پھریں۔ خدا اُن کو سربلند کرتا ہے تو وہ کیوں اپنے سروں کو

جھکاتے ہیں؟ وہ خدا کی جماعت ہیں اور خدا کی غیرت اس کو کبھی گوارا نہیں کرسکتی کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والوں کے سر غیروں کے آگے جھکیں۔ "

لیکن غیروں کے آگے سر اسی وقت جھکتے ہیں جب انھیں قبلۂ حاجات سمجھ لیا جائے۔ جب انھیں "ان داتا" قرار دے لیا جائے۔ اُف۔

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

کوتاہی کیا! یہاں تو بازو ہی ٹوٹ گئے۔

وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ۔ (۲۲/۳۱)

"جو اللہ سے شرک کرتا ہے اس کی مثال یوں سمجھئے کہ گویا وہ آسمان (کی بلندیوں) کی (زمین کی پستیوں پر) آگرا۔ اسے کوئی (پنجے دار) بڑا پرندہ اُچک کر لے گیا۔ یا ہوا کا (تیز جھونکا) اُسے (پرکاہ کی طرح) کسی دُور دراز مقام کی طرف اُڑا کر لے گیا۔"

مولانا صاحب کبھی فرماتے تھے۔

" البتہ بطورِ تحدیثِ نعمت کے عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھکو یہ راہ سوجھائی کہ مسلمانوں کے پولیٹیکل نصب العین کو بھی قرآنِ کریم سے ماخوذ ہونا چاہیے۔ اور ان کو اس راہ میں بھی از روئے مذہب قدم رکھنا چاہیے۔ نہ کہ باتباعِ حریتِ جدیدۂ یورپ و تقلیدِ اخوانِ وطن، پھر یہ اُس کا ایک فضل ہے اور اس میں گلے شکوے کی گنجائش نہیں۔ آج چالیس برس سے مسلمان پالیٹکس پر انکار یا استرار کے لحاظ سے بحث کر رہے ہیں! لیکن براہِ کرم بتایئے کہ آجتک ایک صدا بھی تمام اسلامی ہند میں اس کی بُلند ہوئی ہے؟ آجتک مسلمانوں نے اور ان کے تمام لیڈروں نے پولیٹیکل آزادی کو ہمیشہ ہندوؤں کی آرزو اور یورپ کے نئے آزادانہ دَور کا نتیجہ سمجھا لیکن کسی نے اس پہلو پر نظر نہ ڈالی کہ خود اسلام بھی مسلمانوں کو ان کی سیاست کے لیے کوئی بُلند جگہ

دیتا ہے یا نہیں۔ اس کا دعویٰ کس کو ہے کہ نئی بات دکھلا دی، البتہ ایک کھوئی ہوئی
بصارت تھی جو آپ واپس آگئی۔" (الہلال ۲۰ دسمبر ۱۹۱۳ء)

لیکن افسوس کہ یہ بصارت مستقل طور پر مولانا کے پاس نہ رہی بینائی اور مولانا صاحب نے جا کر خدائے وارد ھا کے قدموں میں ڈھیر کر دی۔ اور خود اس کی لاٹھی پکڑ کر چلنا شروع کر دیا۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۔ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُونَ۔ (۲/۱۶ـ۱۷)

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت دے کر گمراہی خریدی۔ لیکن ان کی تجارت انہیں کوئی نفع نہ دیگی۔ یونہی راہ راست کھو بیٹھے۔ ان کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص آگ جلائے۔ اور جب اس سے اس کا ماحول روشن ہو جائے تو اللہ اس کی روشنی سلب کر کے لے جائے۔ اور وہ پھر اندھیرے میں اندھوں کی طرح رہ جائے (کہ دوسروں کی لاٹھی کا سہارا ڈھونڈتا پھرے)

وہی کفار جن کی راہ نمائی پر اعتماد کی تلقین کی جا رہی ہے کبھی ان کے متعلق ارشاد تھا۔

"کفار جو واقعات کو جھٹلاتے ہیں، حقیقتِ حال کو جھٹلاتے ہیں۔ اصلیت کو چھپاتے ہیں، ناجائز وترغ کو غلط بتاتے ہیں۔ نقضِ امن کرتے ہیں اور پھر اس کو حفظِ امن کا لباس پہناتے ہیں قتل کرتے ہیں اور اسے جاں بخشی دکھاتے ہیں۔ بات کچھ ہوتی ہے مگر اپنی بات کی پچ میں جمہور (پبلک) کو کچھ اور بتاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی اطاعت منع ہے۔ ان کی فرمانبرداری جرم ہے۔ گناہ ہے موجبِ عذاب ہے۔ اس قلادے کو توڑ دینا چاہئے۔ اس اطاعت سے تبریٰ فرض ہے۔ اس فرمانبرداری پر نافرمانی کو ترجیح ہے۔ ان کی تو خواہش ہے کہ مسلمان مداہنت کریں، خوشامد کریں، ریاکاری کریں، منافقت کریں تو انہیں بھی اظہارِ نفاق کا موقع ملے۔ مگر ظاہر ہے کہ مسلمانوں کیلئے یہ صورت کس قدر خطرناک ہے؟ کفار کے عہد و پیمان کا تمہیں بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔ تو

آبرو باختہ ہیں۔ عزتِ نفس و شرف کا انھیں لحاظ تک نہیں۔ قسمیں کھاتے ہیں، حلف اٹھاتے ہیں کہ یہ وعدہ استوار ہے اس میں دوام و استقرار ہے۔ یہ عہد محکم ہے، یہ قول و قرار قانونی حیثیت رکھتا ہے۔ زبان سے سب کچھ کہتے ہیں مگر ہاتھ سے کام لینے کے وقت کچھ یاد نہیں رکھتے۔ ایسے لوگوں کے مطیع رہنا ذلّت کی بات ہے۔ اسلام اپنے فرزندوں کو ان کی اطاعت سے باز رہنے کی ہدایت کر رہا ہے کہ خبردار یہ قسمیں کھانے والے ذلیل النفس ہیں۔ ان کے طعن پر نہ جانا۔ یہ اِدھر کی بات اُدھر لگاتے ہیں۔ قوم میں تفرقے پیدا کرتے ہیں۔ منعِ خیر کے لئے نہایت مبالغے کے ساتھ آمادہ رہتے ہیں۔ حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ تعدّی ان کا شیوہ ہے۔ تطاول ان کی عادت ہے۔ سرکشی ان کی خو ہے۔ .... [1] پھر ایسے لوگوں کی اطاعت کیونکر پسندیدہ ہو سکتی ہے؟ ان کو تو اپنے مال و اولاد کی فراوانی و کثرت یعنی فرطِ دولت و کثیر آبادی کی وجہ سے اتنا گھمنڈ ہو گیا ہے کہ آیاتِ قرآنی کو پرانے ڈھکوسلے کہنے لگے ہیں۔" (الہلال ۲۷ مئی ۱۹۱۴)

دوسری جگہ رقم طراز ہیں:۔

"کفار سے مسلمانوں کو ساز باز نہ رکھنی چاہئے۔ ان سے بے تعلق ہونا لازم ہے۔ جو ساز باز رکھتے ہیں۔ جنھیں ان سے بے تعلق رہنے میں اپنے اور اپنی قوم کے لئے مشکلات اور مصائب کا اندیشہ ہو، وہ غلطی پر ہیں۔ ان کو پشیمان ہونا پڑے گا۔ اسلام کو فتح نصیب ہوگی اور مسلمانوں کی بہبود و بہتری کا قدرتِ کاملہ کوئی اور و انتظام کر دیگی۔ اسوقت معلوم ہوگا کہ الآن قد ندمت ولا ینفع الندم۔ اس وقت تم نادم ہوئے جب ندامت مفید ہی نہ رہی" (مضامین آزاد حصہ سوم)

کہاں تک لکھتے چلے جایئے۔

سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لئے

---

[1] یہاں مولانا صاحب نے کفار کو بد اصل اور حرامکار تک لکھ دیا ہے۔ ہم نے یہ حذف کر دیا ہے۔ منہ

آنکھوں والے کے لئے اتنا ہی کیا کم ہے۔ وہ یہ کچھ دیکھ کر یقیناً متعجب ہوگا کہ بالآخر کیا بات ہے کہ مولانا صاحب یہ سب کچھ جانتے ہوئے آج گمراہی وضلالت کے اس قدر عمیق گڑھوں میں جاگرے ہیں اور اپنے ہی گرنے پر اکتفا نہیں، قوم کو بھی اسی جہنم کی طرف بلائے جارہے ہیں۔ یقیناً یہ سوال فطری طور پر آپ کے دل میں پیدا ہونا چاہئے۔ اس کا جواب بھی ہم سے نہیں خود مولانا صاحب سے سنئے۔ جب کوئی قوم کسی دوسری قوم کو اپنا غلام بنانا چاہتی ہے تو اس کی مقدم کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس قوم کے سوچنے والے دماغوں اور دیکھنے والی آنکھوں کو اپنے قابو میں کرلے۔ تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ زمانہ کی شہادات آپ کے روبرو ہیں۔ انھیں دیکھئے اور غور کیجئے کہ دنیا کس طرح اس اصول پر عمل پیرا ہوتی چلی آرہی ہے۔ یذبحون ابناءھم (بنی اسرائیل کے بیٹوں کا قتل) کچھ فرعونِ مصر کے ساتھ ہی مخصوص نہ تھا۔ دنیا میں ہر مستبد قوت اسی قسم کے قتل کرتی چلی آئی ہے اور کررہی ہے۔ فرق صرف آلاتِ قتل دوزاریخ انتقال میں ہے۔ یہی کچھ ہوتا چلا آیا ہے اور یہی کچھ آج ہورہا ہے۔ ہندو نے جب یہاں مسلمانوں کو غلام بنانے کی ٹھانی تو انھوں نے بھی سب سے پہلے اسی حربہ کو استعمال کیا اور مسلمانوں میں یذبحون ابناءھم شروع کردیا۔ ملتِ اسلامیہ کے ہونہار سپوتوں میں سے کچھ ایسے تھے جو ہندوؤں کے دامِ فریب سے بچ کر نکل بھاگے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ دنیا میں زنجیریں صرف لوہے کی ہی نہیں ہوتیں اور چیزوں کی بھی ہوتی ہیں۔ سنئے کہ مولانا صاحب کیا فرماتے ہیں۔

> سالکِ راہِ حریت وصداقت کے پاؤں میں اس کے دشمن لوہے کی زنجیریں ڈال دیتے ہیں تاکہ وہ اس شدہ کے منازل طے نہ کرسکے۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ زنجیر لوہے کی جگہ سونے کی ہوتی ہے۔ وہ اس طلسمی زنجیر کو دیکھ کر راہ ورسمِ منزلِ صداقت پرستی سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اس کی طرف دوڑ جاتا ہے اور مسکراتا ہوا خود دشمن کے ہاتھ سے لیکر اپنے پاؤں میں ڈال لیتا ہے۔ یہ طلسمی زنجیر کیا ہے؟ اسیرِ زر اور طمعِ جاہ!
>
> لیکن آہ! کس قدر دنی الوجود کم ظرف ہے وہ انسان جو صرف حُبِّ مال اور لعنتِ زر کے لئے خدا کی محبت کو ٹھکرا دیتا ہے اور ایک فانی شئی کے لیے

حق و صداقت کی باقی لازوال دولت کو ہمیشہ کے لئے کھو دیتا ہے۔ وہ چاندی سونے کے سکوں کو اگر خدا کے لئے اور اس کی سچائی کے لئے کھو دے تو خدا اُسے سچائی کے ساتھ واپس دلا سکتا ہے پر جو خدا کی محبت کو دولت کے لئے کھوتا ہے وہ تو اسے دولت نہیں دلا سکتی پھر انسانیت کے لئے کیسی دردانگیز موت ہے کہ انسان آسمان کی سب سے بڑی عزت کو زمین کی سب سے بڑی ذلت کے لئے کھو دے!

کتنے بڑے بڑے تاجدار، پرہیبت فاتح، عظیم الشان سپہ سالار، نامور، محبِّ وطن اور محبوب القلوب وملت پرست انسان ہیں جن کی حق پرستانہ عزائم کی استقامت کو اسی لعنتِ طمع نے ڈگمگا دیا۔ انھوں نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنی فوج اور در اصل اپنے خدا اور اس کی صداقت سے غداری کی، اور دشمنوں کے لئے دوستوں کو، غیروں کے لئے اپنوں کو، ظالموں کے لئے مظلوموں کو بے رحم فاتحوں کے لئے بیکس مفتوحوں کو، اور شیطان کے تخت کی زیب و زینت کے لئے خدائے رحمٰن کے دربارِ اجلال کی عزت و عظمت کو چھوڑ دیا!

تاریخ کے صفحات ہمیشہ سے اسی ذمہ کے ماتی ہیں۔ قوموں اور ملکوں کی داستانیں ہمیشہ اسی ناپاک سرگذشت پر خون کے آنسو بہاتی ہیں اور دولت پرستی کی طوقِ لعنت آغازِ عالم سے ناصیۂ انسانیت کے لئے سب سے بڑا بے عزتی کا داغ رہی ہے۔ فی الحقیقت راہِ حق پرستی کی سب سے بڑی آزمائش چاندی کی چمک اور سونے کی سُرخی ہی ہے اور اگر اس منزلِ پُرخطر سے تم گذر گئے تو پھر تمھاری ہمت بے پروا اور تمھارا عزم ہمیشہ کے لئے بے خوف ہے۔ یہی طمع کا خبیث دیو ہے، جس کا پنجہ بڑا ہی زبردست اور جس کی پکڑ قلبِ انسانی کے لئے بڑی ہی مضبوط ہوتی ہے۔ اسی نے فرزندانِ ملت سے غیروں کے آگے مخبری کرائی ہے۔ یہی پکڑ پکڑ کے ابنائے وطن کو لے گیا ہے اور غیروں کے قدموں پر اخلاق کی ناپاکی اور جذبات کی کثافت کے

کیچڑ میں گرا دیا ہے۔ تاکہ اپنے وطن، اپنی سرزمین، اپنے مذہب، اپنی قوم اور اپنے بھائیوں کے خلاف جاسوسی کریں! اسی نے بڑے بڑے تخیلاتِ مذمتِ ملک و ملت کی برسوں کی کمائی ایک آن کے اندر ضائع کر دی ہے۔ اور انہیں چارپایوں کی طرح گرا دیا ہے تاکہ برسوں کی تجارت کو ایک لمحہ کی طمع پر قربان کر دیں۔ آہ! یہی انسانیت کے لئے وہ زہرِ خبیث ہے جو بڑے بڑے پاک جسموں، بڑی بڑی مقدس صورتوں، بڑے بڑے پُرانوارِ علم و عمل والوں کے اندر حلول کر گئی ہے۔ اور فرشتہ سیرتوں نے شیطانوں کے، اور ملکوتی صفات ہستیوں نے خونخوار عفریتوں کے سے کام کئے ہیں۔

آہ! ہم یہ لکھ رہے ہیں اور ہمارا قلب خون ہو کر آنکھوں کے راستے بہ رہا ہے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا آ رہا ہے۔ ہاتھوں میں قلم کانپ رہا ہے! کہ اے اللہ! جو تیری درگاہ سے دُھتکار دیا جاتا ہے، اس کا انجام کیا ہوتا ہے! اے مالکُ الملک صدقہ اپنی رؤف الرحیمی کا! غربت و افلاس، بھوک اور پیاس کی زندگی دیدینا۔ لیکن طمعِ جاہ و ہوسِ زر کی نظر فریب افسونگرانہ کشش و جاذبیت سے بچائے رکھنا۔ کہ جو اس سحر سے مسحور ہو گیا۔ ہمیشہ کے لئے تباہ ہو گیا۔ اور جو تیرے در سے ٹھکرا دیا گیا اس کا کہیں ٹھکانا نہ رہا۔ لغزش تو ہر ایک کی خطرناک ہوتی ہے۔ لیکن ایک عالم کی لغزش تو وہ ہے جس کے متعلق خود نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ

"میں اپنی اُمت کے حق میں سب سے زیادہ جن باتوں سے ڈرتا ہوں وہ یہ ہیں

(۱) عالم کی لغزش

(۲) منافق کا قرآن سے استدلال

(۳) اور گمراہ کرنے والے سردار (لیڈر)

کہتے ہیں کہ حضرت امام اعظمؒ ایک دن بازار سے گزر رہے تھے۔ بارش ہو رہی تھی۔ اور راستہ

کیچڑ تھی۔ ایک لڑکا ادھر سے گذرا تو آپ نے فرمایا کہ بیٹا! احتیاط سے چلو۔ قدم نہ پھسل جائے۔ گر جاؤ گے۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور آپ کو پہچان کر کہا کہ حضور! میرے گرنے کی فکر نہ کیجیے۔ اپنے آپ کو سنبھالیے۔ میں گرا تو خود ہی گروں گا۔ اور اگر (خدانکردہ) آپ گر گئے تو ساری دنیا گر جائے گی۔

کس قدر صحیح تھا اس بچے کا یہ تبصرہ۔ زید و بکر گمراہ ہوں تو ان کی گمراہی ان کی ذات تک محدود رہیگی۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد صاحب صحیح راستہ چھوڑ جائیں تو پوری کی پوری قوم کو لے ڈوبیں۔ ایک لیڈر کی یہی لغزش ہے جس کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ۔ جَهَنَّمَ (14/28)

کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا۔ جنھوں نے اللہ کی نعمت کو ناسپاسی سے بدل دیا۔ اور اپنی قوم کو تباہی و بربادی کے جہنم میں لے گرے۔

لیکن اللہ کا شکر ہے کہ قوم بروقت متنبّہ ہو گئی اور جہنم میں گرنے سے بچ گئی۔ اے کاش آج بھی اللہ تعالیٰ ان جہنم میں گرنے والوں کی چھنی ہوئی بصارت انھیں واپس دیدے اور یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ فریبِ نفس نے انھیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ کہ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے، بشرطیکہ دلوں اور آنکھوں پر مہر ہی نہ لگ چکی ہو۔ وَمَن يُضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ۔

چہ گویم زاں فقیرے دردمندے
مسلمانے بہ گوہر ارجمندے
خدا ایں سخت جاں را یار بادا
کہ افتاد است از بامِ بلندے

(اقبالؒ)

طلوعِ اسلام
جون سنہ ۱۹۴۰ء

جہانِ نو

(علیحدگی کی اسکیم قرآنی روشنی میں)

در جہاں بال و پر خویش کشودن آموز
کہ پریدن نتواں باپر و بالِ دگراں
آتش از نالۂ مرغانِ حرم گیر و بسوز
آشیانے کہ نہادی بہ نہالِ دگراں

باب اوّل

اسلام کی حقیقت

عام طور پر مذہب سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ وہ انسان کی "روحانی ترقی" کا ذریعہ ہے۔ یعنی اسے دنیا جہاں کے دہندوں سے کوئی علاقہ نہیں۔ بلکہ جب انسان دنیاوی بکھیڑوں سے فارغ ہو جائے تو کچھ وقت کے لئے اپنے خدا۔ ایشور۔ پرماتا کی طرف بھی دھیان کر لے۔ اس "دھیان" سے اس کے اندر ایک کیفیت پیدا ہوگی۔ جسے آتما شکتی یا تسکینِ روح کہا جاتا ہے اسی کی ترقی کا نام نجات یا مکتی ہے۔ اس "تسکینِ روح" کے حصول کے ذرائع مختلف ہیں۔ ان ذرائع کو عبادت بھگتی یا (Prayer) کہا جاتا ہے۔ کسی نے محرابِ مسجد کے اندر سر جھکا لیا کسی نے مندر میں دیوی کی پوجا کر لی۔ کوئی گرجا میں چلا گیا۔ بس یہ ہے مذہب کا دائرہ اور یہ ہے اس کی کائنات! جب انگریزوں نے اپنے تسلط کے بعد ہندوستان میں "مذہبی آزادی" کا اعلان کیا ہے۔ تو ان کا مطلب بھی اسی آزادی سے تھا۔ اور آج جب بساطِ سیاست انگریزوں کی طرف سے سکڑ کر ہندو کی طرف بڑھتی جا رہی ہے۔ تو وہاں بھی مذہبی آزادی کا یہی مفہوم ہے۔

اور اسی کے تحفظات کی ضمانتیں دی جاتی ہیں۔ دوسرے مذاہبِ عالم میں مذہب کا جو تصور بھی ہو ہمیں اس سے واسطہ نہیں۔ لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے۔ مذہب کا مذکورہ صدر مفہوم قطعاً غلط ہے اسلام یہ بتاتا ہے کہ کائنات کی ہر شے ایک متعین ضابطۂ قانون کے ماتحت چل رہی ہے۔ اور اس میں ان کے ارادے اور اختیار کو کوئی دخل نہیں۔ وہ مقررہ نہج کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ اور اسی لئے یہ نظامِ کائنات ٹھکانے سے چلا جا رہا ہے۔ سو جب عالمِ موجودات کی ہر شے اس اصول پر عمل پیرا ہے تو کیا انسان جو خطۂ ارض پر سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی ہے، جو نظامِ کائنات کا ماحصل ہے، فطرت کے اس غیر متبدل قانون سے مستثنےٰ ہوگا؟ کیا اس کے لئے ضروری نہیں ہوگا کہ یہ بھی ایک متعین نظام کے ماتحت زندگی بسر کرے؟ ظاہر ہے کہ انسان کو بھی اسی اصول کے ماتحت زندگی بسر کرنی ہوگی۔ اس کو بھی ایک خاص نظام کے مطابق دنیا میں رہنا ہوگا۔ یہ نظامِ زندگی۔ یہ ضابطۂ قوانین۔ جس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے انسان کی تخلیق ہوئی ہے اسلام کہلاتا ہے۔

لیکن انسان اور دیگر اشیائے فطرت میں ایک بیّن فرق ہے۔ دیگر مخلوق۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اس قانون کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر مجبور و مقہور ہے۔ جو ان کے لئے بطور نظامِ حیات تجویز کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس انسان کو کچھ اختیار اور ارادہ بھی دیا گیا ہے اور اس معاملہ میں اسے ایک حد تک آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ کہ اس کی یہی آزادی اور اختیار ہے۔ جو اسے دیگر مخلوق (مثلاً حیوانات وغیرہ) سے ممتاز کرتا ہے۔ اسے شعور و ادراک عقل و دانش عطا کی گئی ہے، کہ وہ اپنی مرضی سے اس نظامِ حیات کے مطابق زندگی بسر کرے۔ جو اس کے لئے متعین کیا گیا ہے یہی امتیاز اس کی سرفرازی اور سربلندی کی دلیل ہے۔ اسی سے یہ دنیا میں اپنے آپ کو تمام مخلوقات سے اشرف و اعلیٰ تصور کرتا ہے۔ اور بجا طور پر تصور کرتا ہے۔ اس اختیار کے ساتھ اپنے آپ پر جبر کرنا۔ اس آزادی کے باوجود اپنے آپ کو قوانینِ متعینہ کے دائرہ حدود و قیود میں پابند کر لینا۔ اس کے اندر جوہرِ خودی کا استحکام پیدا کرتا ہے۔ اور

یہی استحکام منشائے فطرت ہے۔ اس سے یہ سلسلۂ ارتقا کی اگلی منازل طے کرنے کے قابل ہوگا۔ اس سے اس میں وہ صلاحیت پیدا ہوگی کہ یہ اس زندگی سے اگلی زندگی۔ اس سے نفیس ونطیف زندگی۔ اس سے ارفع و اعلیٰ زندگی بسر کر سکے۔ جسے اُخروی زندگی کہا جاتا ہے:

لیکن انسان اپنے اس اختیار و ارادہ کو غلط بھی استعمال کر سکتا ہے۔ اس سے قوانینِ فطرت کی خلاف ورزی بھی عمل میں آسکتی ہے۔ یہ اس نہج و اسلوب سے سرکشی بھی اختیار کر سکتا ہے جس پر چلنے کے لئے اسے تخلیق کیا گیا ہے۔ لیکن آپ سمجھتے ہیں کہ اس کی اِس سرکشی و تمرّد۔ اس عُدوان وطغیان کا نتیجہ کیا ہوگا! اس کے سمجھنے کے لئے کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں (فی انفسکم افلا تبصرون) فطرت کا قانون ہے کہ آپ کی زندگی کا مدار سانس پر ہے۔ ذرا اس قاعدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، ناک اور منہ بند کر لیجئے، خود سمجھ میں آجائے گا۔ کہ اس معصیت کا نتیجہ کیا ہے! وقس علیٰ ھذا۔ لیکن یہ حادثہ چونکہ یکسر مادی زندگی سے متعلق ہے جس میں انسان اور حیوان دونوں شریک ہیں۔ اس لئے اس کا نتیجہ، اس کا انجام، اس کی جزا، محسوس طریق پر سامنے آجاتی ہے۔ لیکن جب آپ ان قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں جن کا تعلق آپ کی انسانیت سے ہے۔ جس کی حدیں حیوانیت سے آگے بڑھ کر شروع ہوتی ہیں۔ تو اس کا نتیجہ غیر محسوس طور پر مرتب ہوتا ہے۔ اس لئے جلدی سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ جھوٹ بولنا، ایسی ہی فطرت کی قانون شکنی ہے، جیسے سانس روک لینا۔ لیکن جہاں سانس روک لینے سے انسان کی جان پر بن جاتی ہے۔ وہ تڑپنے۔ پھڑکنے۔ بلبلانے لگ جاتا ہے۔ جھوٹ بولنے سے وہ محسوس ہی نہیں کرتا کہ اسے کوئی تکلیف ہوئی ہے۔ لیکن وہ محسوس کرے یا نہ کرے۔ نتیجہ تو برآمد ہو کر رہے گا۔ یہی وہ نتائج ہیں، جن کا مجموعی اثر انسان کی تمدنی۔ عمرانی معاشرتی۔ معاشی اخلاقی۔ سیاسی۔ دینی۔ دنیاوی "غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کرتا ہے۔ اور انسان کی حیاتِ اجتماعیہ کو انہی نتائج وعواقب کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ اگر اس کی زندگی قوانینِ فطرت کے مطابق ہے تو اس کا فطری نتیجہ ہے کہ اس کی حیاتِ اجتماعیہ فردوس درآغوش ہو۔

اور اگر اس کی زندگی ان قوانینِ فطرت کے خلاف بسر ہو رہی ہے تو وہ عدمِ طمانیت وفقدانِ سکون کے شعلہ بار جہنم میں جل رہا ہے۔ جیسا کہ آج ہو رہا ہے۔

لہٰذا اس دنیا میں جنت کی زندگی سکون وطمانیت کی زندگی کا نظام قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ حیاتِ انسانی کو ان قوانین کے ماتحت چلایا جائے جس پر چلنے کے لئے وہ مخلوق ہوئی ہے۔ یعنی جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، وہ نظام جسے اسلام کہا جاتا ہے۔ انسان کو اس نظام پر چلانے کے لئے ضروری ہے کہ ایک تو وہ ضابطۂ قوانین موجود ہو جس کے مطابق اسے چلایا جائے گا۔ اور دوسرے کوئی ایسی قوت موجود ہو جس کی بنا پر انسان کو ان قوانین کی خلاف ورزی نہ کرنے دی جائے۔ اس ضابطۂ قوانین کا نام ہے، "ہدایتِ خداوندی" اور اس قوت کا نام ہے "حکومتِ الٰہی" یا خلافتِ ارضی۔ فرمایا۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ	یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایت
وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ	دے کر بھیجا۔ اور ان کے ساتھ ضابطۂ قوانین
لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا	(کتاب) اور میزانِ عدل نازل کی۔ تاکہ نوعِ
الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ	انسانی توازن پر قائم رہے۔ اور ہم نے (ان
لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ	چیزوں کی محافظت کے لئے) فولاد کی شمشیر
رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ	بھی نازل کی جس میں شدت کی سختی ہوتی ہے
عَزِيْزٌ ۵۷/۲۵	اور لوگوں کیلئے منفعت۔ تاکہ اللہ یہ جان لے

کہ کون اس کی اور اس کے رسولؐ کی غائبانہ مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ صاحبِ قوت وتدبیر ہے"

یہ بحث اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ اس نظامِ خداوندی میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے کہ ایک طرف انسان کو آزادی اور اختیار کی نعمت سے سرفراز کیا جائے۔ اور دوسری طرف اس "جبر" سے اس نعمت کو واپس لے لیا جائے۔ ہم یہ بحث کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ اس وقت صرف اتنا اشارہ ہی کافی ہے کہ اگر کسی اندھے کو کنوئیں میں گرنے سے

زبردستی روک لینا اس پر زیادتی نہیں ہے، کسی بچے کے ہاتھ سے بجبر چاقو چھین لینا، اس پر ظلم نہیں کہلا سکتا، کسی خودکشی کرنے والے کو گرفتار کر کے اس کے اِس اختیار کو اس سے سلب کرنا ناانصافی نہیں ہے، تو جاہل اور ظالم انسان کے لئے قوانینِ فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے کا انتظام کر دینا یقیناً جور و تعدی نہیں کہلا سکتا۔ بلکہ یہ تو اس کے ساتھ عین انصاف ہے۔ انصاف ہی نہیں، احسان بھی ہے۔ جب تقویم انسانیت کے نظم و نسق کا اسلوب و انداز یہ ٹھہرا۔ تو ضروری ہے کہ نوعِ انسانی میں ایک ایسی جماعت موجود رہے۔ جو ضابطۂ خداوندی کی وارث اور اس نظم و نسق کے قیام و بقا کی ذمّہ دار ہو۔ اور اس ذمّہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ جماعت صاحبِ قوت و اقتدار بھی ہو۔ کہ اس کے بغیر اس نظام کا قیام ناممکن ہے۔ چنانچہ ہم قرآنِ کریم میں دیکھتے ہیں کہ جس وقت سے اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ رشد و ہدایت شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی اِس اَمر کا بھی التزام رکھا کہ اس جماعتِ منتخبہ کو جو ضابطۂ قوانین کی وارث ہو، خلافتِ ارضی کی نعمت سے بھی سرفراز فرمایا جائے۔ سورۂ اعراف میں حضرت نوح علیہ السّلام کے بعد جہاں حضرت ہودؑ۔ حضرت صالحؑ اور حضرت شعیبؑ کے سلسلۂ تعلیم کا ذکر ہے۔ وہاں ان کی اقوام کے متعلق یہ بھی تصریح موجود ہے کہ انہیں قوت و اقتدار سطوت و حکومت بھی عطا فرمائی گئی تھی۔ انبیاءِ سابقہ علیہم السلام میں حضرت ابراہیمؑ کا گھرانہ خاص طور پر ممتاز ہے۔ ان کے متعلق فرمایا کہ انہیں کتاب و حکمت کے ساتھ "ملکِ عظیم" کا بھی مالک بنایا گیا تھا۔ حضرت یوسفؑ کے تمکن فی الارض کی صراحت سورۂ یوسف میں موجود ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی قوم کی کشورکشائی و جہانبانی کی شہادتیں قرآنِ کریم کے ورق ورق سے ملتی ہیں۔ لیکن یہ تمام سلسلہ کچھ اس نہج سے جاری رہا کہ یہ انبیاءِ کرام کسی خاص قوم، خاص ملک اور خاص زمانہ کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ ان کا ضابطۂ ہدایت کچھ وقت کے لئے محفوظ رہتا۔ پھر اس کے جدید ایڈیشن کی ضرورت پڑ جاتی۔ اسی طرح ان کی قوم بھی ایک خاص وقت تک حاملِ کتابِ الٰہی رہتی۔ اس کے بعد اس کی مخاطب کوئی دوسری قوم ہو جاتی۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا۔ تاآنکہ انسانیت ارتقائی منازل

طے کرکے عہدِ شعور تک پہنچ گئی۔ یہ اب اس قابل ہوگئی کہ اسے ایک ایسا ضابطۂ الٰہی دیدیا جائے جس میں کسی تغیّر و تبدّل کی ضرورت نہ ہو۔ بلکہ وہ تمام نوعِ انسانی کو اپنا مخاطب قرار دے جس کا دائرۂ نفوذ کوئی خاص خطّۂ ارض نہ ہو بلکہ اس کی ہمہ گیر تعلیم تمام روئے زمین کو محیط ہو۔ جس کا زمانۂ عمل کوئی خاص عہد نہ ہو۔ بلکہ اس کی حدیں ابدیّت سے ہمکنار ہوں۔ یہ وقت آیا تو خدائے ربّ العالمین کی طرف سے وہ رسولؐ رحمت اللعالمین مبعوث ہوئے جنہوں نے آکر تمام نوعِ انسانی سے کہا۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا۔

اے نوعِ انسانی۔ میں تم تمام کی طرف اللہ کا پیام لیکر آیا ہوں۔

اور یہ اعلان صرف اس زمانے کے انسانوں کے لئے نہیں تھا۔ بلکہ ان کے لئے بھی تھا جو ان کے بعد دنیا میں آنے والے تھے۔ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ ۵ (الجمعۃ)

اس نے اللہ کی اس کتاب کو نوعِ انسانی تک پہنچایا جس کی تعریف یہ تھی کہ

ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ۔

تمام دُنیا کے لئے نصیحت

اس ضابطۂ الٰہی کی وراثت کے لئے نوعِ انسانی میں سے ایک خاص جماعت کو منتخب کیا گیا۔

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا۔ (۳۵/۳۲)

پھر ہم نے اس کتاب کی وراثت کیلئے اپنے بندوں میں سے ایک جماعت کو منتخب کر لیا۔

اور اس جماعت کو قوانینِ خداوندی کی حفاظت و تنفیذ کے لئے حکومت و مملکت کی شمشیرِ خارا شگاف (حدید) سے بھی متمتع فرمایا۔

وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَمْ تَطَئُوهَا۔ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا۔ (۳۳/۲۷)

اور اس نے تم کو تمہارے دشمنوں کی زمینوں کا اور ان کے شہروں کا اور ان کے اموال کا مالک بنادیا۔ اور اس سرزمین کا بھی جہاں

تمہارے ابھی قدم بھی نہ پہنچے تھے۔ اور اللہ ہر شے پر قدرت اور اختیار رکھتا ہے"۔

اور اس کے ساتھ ہی اُن سے یہ بھی فرما دیا کہ یہ کوئی اتفاقی امر نہ تھا۔ کہ تمہیں یوں سطوت شوکت حاصل ہو گئی۔ بلکہ یاد رکھو کہ یہ ہمارا فیصلہ ہے۔ یہ فطرت کا غیر متبدّل قانون ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۚ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ۚ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (سورۂ نور)

"جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں۔ اور اعمال صالح کریں۔ اللہ نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ انہیں اس زمین کی حکومت عطا فرمائے گا۔ جس طرح ان سے پیشتر اس نے ان شرائط کو پورا کرنیوالوں کو حکومت عطا فرمائی تھی اور ان کے اس دین کو جو ان کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ متمکّن کردیگا۔ اور ان کا خوف امن سے بدل دے گا۔ (تاکہ) وہ صرف میرے ہی محکوم ہوں اور میری (حکومت) میں کسی اور کو شریک نہ کریں۔ اور جو اس کے بعد ناسپاس گزار ہوگا تو اس کا شمار فاسقین میں سے ہوگا"۔

اس جماعت کو کتاب و حکومت کا وارث بنانے کے بعد بتا دیا کہ ان کا فریضۂ حیات کیا ہے۔ فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ

"تم وہ بہترین قوم ہو جو تمام نوعِ انسانی کی (رہدایت) کی خاطر پیدا کی گئی ہو۔ تمہارا فریضۂ حیات یہ ہے کہ، تم قوانینِ الٰہیہ (معروف[1]) کا حکم کرو۔ اور ان لوگوں کو اس کے خلاف دوسری باتوں (منکر[1]) سے روکو"۔

---

[1] معروف کا ترجمہ بالعموم نیکیاں۔ اور منکر کا ترجمہ برائیاں کیا جاتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم کی رو سے نیکی وہ ہے جس کا قرآن حکم دے اور برائی وہ جس سے وہ روکے۔ یعنی نیکی اور بدی کا یہی ایک معیار ہے۔ اسلئے ہم نے ان الفاظ کا زیادہ واضح ترجمہ کیا ہے۔

دیکھئے! یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ تمہارا فریضہ یہ ہے۔ کہ تم لوگوں کو امورِ معروف کے متعلق وعظ و نصیحت کرو۔ بلکہ فرمایا۔ کہ تم ان باتوں کا حکم دو (تامرون) اور ظاہر ہے۔ حکم وہی دے سکتا ہے۔ جو صاحب حکومت ہو۔

یہ ہے اسلام اور یہ ہے ملّت اسلامیہ کا فریضۂ زندگی۔ اب ظاہر ہے کہ اگر اس مذہب سے حکومت کو الگ کر دیا جائے تو باقی وہی کچھ رہ جاتا ہے، جو انگریز اور ہندو نے مذہب کا مفہوم سمجھا ہے۔ یعنی ایشور بھگتی۔ خدا کی پوجا۔ گرجا کی (Prayer) عبادات و رسومات۔ لیکن یہ اسلام تو نہیں رہے گا۔ خلافتِ ارضی کے بغیر اسلام کا تصور ہی باطل ہے۔ اور مسلمان کہلاتے ہوئے کسی اور کا محکوم ہونا۔ اور اس محکومیت پر قانع ہو جانا عملی شرک ہے۔

پس جس طرح ضابطۂ خداوندی سے الگ ہو کر حکومت محض فرعونیت رہ جاتی ہے۔ اسی طرح "عصا" کے بغیر "کلیمی" بھی رہبانیت بن جاتی ہے۔ فرعون کی مملکت اور حضرت موسیٰؑ کا ضابطۂ شریعت۔ ان دونوں کا نام ہے۔ اسلام۔ وہ اسلام جو اپنی کامل و مکمل شکل میں اس وقت ظاہر ہوا۔ جب وہ مثیلِ موسیٰؑ، وہ دعائے خلیلؑ، وہ نویدِ مسیحؑ، دس ہزار قدوسیوں کی جماعت کے ساتھ مکہ کی وادیوں میں بایں شان و جلال جلوہ پیرا ہوا، کہ اس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں شمشیر تھی۔ تمام ملک میں قوانین الٰہیہ کا سکہ جاری تھا۔ خدا اور اس کے بندے کے درمیان کوئی دوسری طاقت حائل نہ تھی اس وقت اس نے پکار کر کہا۔ کہ ہاں۔

اِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ کَهَیْئَتِهٖ یَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (او کما قال رسول اللّٰہ)	آج زمانہ پھر پھرا کر وہیں آگیا۔ جہاں یہ آسمان و زمین کی پیدائش کے وقت تھا یعنی ہر شے قوانین فطرت کے مطابق عمل پیرا ہوگئی۔
بروایت ابوبکرہؓ	

یہ ہے اسلام جس میں زمام حکومت انسانوں کے ہاتھوں میں نہیں۔ بلکہ خود اللہ کے

ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جس کا فرمان ہے کہ ۱۷

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔ حکومت صرف اللہ کیلئے ہے۔ اور بس۔

لہٰذا اس حکومت کو نہ (انسانوں کی وضع کردہ) دستوری شہنشاہیت (Monarchy) سے کچھ واسطہ ہے نہ خود مختار ملوکیت (Autocracy) سے۔ نہ جمہوریت (Democracy) سے کچھ علاقہ ہے۔ نہ آمریت (Dictatorship) سے۔ نہ اس میں قوانین وضع کرنے کا اختیار اکثریت کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ نہ کسی ہائی کمانڈ کی تفویض میں۔ اس جماعت کا کام جو اس حکومتِ الٰہیہ کے قیام و بقا کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ قوانینِ خداوندی کی تنفیذ و ترویج۔ اور ان اصولوں کی روشنی میں فروعات کی ترتیب و تدوین ہوتا ہے۔ اور بس۔ اگر مسلمان کو اس قدر آزادی حاصل ہو تو پھر اس کا مذہب آزاد ہے۔ ورنہ نماز روزہ کی آزادی بے معنی ہے۔ آزادی وہی ہے جس میں حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہو سکے۔ اور حکومت بھی ایسی مستقل بالذات کہ داخلی اور خارجی تمام امورِ متعلقہ میں کسی دوسری طاقت کا دخل اثر نہ ہو۔ اس لئے کہ حکومتِ الٰہیہ میں انسانی قوت و اقتدار کا امتزاج تو ایک کھلا ہوا شرک ہے۔ پھر اس حکومتِ الٰہیہ کے قوانین کی رُو سے انسانوں کی تقسیم۔ عام انسانی معیار تفریق و تمیز۔ یعنی لسانی۔ نسلی۔ جغرافیائی حدود کے برعکس۔ ایک جداگانہ معیار کے مطابق طے پاتی ہے یعنی وہ تمام انسان جو اس حکومتِ الٰہیہ کے دائرہ میں آتے جائیں (بالفاظِ دیگر اسلام قبول کرتے جاتے ہیں) وہ بلا لحاظِ نسل۔ رنگ۔ وطن۔ ایک بنتے جاتے ہیں۔ اور ان کے مقابلہ میں تمام دوسرے انسان ایک الگ قوم قرار پاتے ہیں۔ (اولذکر جماعت کو ملتِ اسلامیہ۔ جماعتِ مومنین کہا جاتا ہے۔ اور ثانی الذکر غیر مسلم۔ جمعیتِ کفار کہلاتے ہیں۔ جس طرح کسی حکومت کے کاروبار میں کسی ایسے شخص کو باریابی نہیں ہو سکتی۔ جو اس حکومت کا باغی ہو اسی طرح حکومتِ الٰہیہ کے نظم و نسق میں کسی غیر مسلم کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے

۱۸

کہ مسلمانوں کے امورِ حکومت، شوریٰ بینھم ان کی آپس کے باہمی مشورہ سے طے پا سکتے ہیں۔ کوئی دوسرا ان کے معاملات میں دخل انداز نہیں ہو سکتا۔ اور اسی طرح ان کا صاحب امر بھی لامحالہ انہی میں سے ہو سکتا ہے۔ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا کہ اولی الامر منکم (تم میں سے) کی شرط لاینفک ہے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں اسلام کے عناصر ترکیبی اور اصول و مبانی۔ انہیں پیشِ نظر رکھئے۔ اور ان کی روشنی میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی مسائل پر غور کیجئے۔ بات خود بخود سمجھ میں آ جائے گی۔

باب دوم

سیاستِ ہندیہ اصولِ بالا کی روشنی میں

صفحات گذشتہ میں ہم نے اسلام و مسلمانوں کے متعلق جو کچھ حقائقِ قرآنی کی روشنی میں لکھا ہے۔ اس کی صحت میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا جب حقیقت وہی ہے۔ جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ تو یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں مسلمان جس حالت میں آج ہے وہ صرف نام کا مسلمان ہے۔ اپنی حکومت کے بغیر یہ کبھی صحیح معنوں میں مسلمان نہیں بن سکتا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ جن حالات میں ہم یہاں گھرے ہوئے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر ہم اس "عہدِ جاہلیت"۱ سے "عہدِ اسلامی" کی طرف کیسے آ سکتے ہیں۔ مسئلہ زیرِ نظر کا حل ایک بڑی حد تک اسی سوال کے صحیح جواب پر موقوف ہے۔ اور اس لئے دقتِ نظر کا طالب۔ اس مقصد کے لئے ذیل کی چند اہم شقوں کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

---

(۱) ہندو کا دعویٰ ہے (اور ہم اس وقت اس دعوے کی حقیقت پر بحث نہیں کرنا چاہتے)

کہ تحریک آزادی سے مقصود یہ ہے۔ کہ ہندوستان سے انگریزوں کی حکومت کا خاتمہ کر کے اس کی جگہ اپنی حکومت قائم کیجائے ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ مسلمان کسی کا محکوم رہ کر صحیح معنوں میں مسلمان کہلا ہی نہیں سکتا۔ اس لئے جہاں تک انگریزوں کی (سیاسی اور کی) حکومت کا تعلق ہے۔ مسلمان از رُوئے قرآن اس امر پر مامور ہے۔ کہ اس غلامی سے آزادی حاصل کرے۔ لہٰذا اس شق میں مسلمان ہندو سے بھی زیادہ اس امر کا متمنّی ہے کہ غلامی کا طوق لعنت اس کی گردن سے اُتر جائے۔

(۲) ہندو کا دوسرا دعویٰ یہ ہے۔ کہ ہندوستان ایک واحد ملک ہونے کی جہت سے ایک کُل (Unit) ہے۔ اور اس میں بسنے والے تمام انسان ایک "قوم" ہیں۔ موجودہ نظامِ حکومت کے بعد جدید طرزِ حکومت (یعنی دورِ آزادی کا طرزِ حکومت) جمہوری ہوگا۔ یعنی جملہ امور کے فیصلے اس مزعومہ "قوم" کے نمائندوں کی اکثریت سے طے پائیں گے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ اکثریت یہاں بہرحال ہندوؤں کی ہوگی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

(۳) ہندوستان کے مستقبل کے آئینی نظام کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں ایک تو یہ کہ انگریزوں کے زیرِ سایہ درجۂ نوآبادیات (Dominion Status) مل جائے (ہندو یہی چاہتا ہے) اور دوسرے یہ کہ انگریزوں کے عمل و دخل کے کلی انقطاع کے بعد ہندوستان کو مکمل آزادی مل جائے (قرائن و شواہد اس پر دال ہیں کہ ہندو یہ نہیں چاہتا) دونوں صورتوں میں سے کوئی شکل بھی پیدا ہو۔ ہندو کے ارادوں کے مطابق نظامِ حکومت کی تشکیل یوں ہوگی کہ تمام ہندوستان کا ایک مرکز (Centre) ہوگا۔ اور تمام اہم شعبہ ہائے نظم و نسق کے اصول اس مرکز سے متعین ہوں گے۔ اور جمہوری اندازِ حکومت کے ماتحت یہ فیصلے اکثریت کی آراء کے تابع ہُوا کریں گے

(۴) اس نظامِ حکومت میں مسلمانوں کو "مذہبی آزادی" دی جائے گی یعنی اس چیز کی آزادی جسے ہندو "مذہب" سمجھتا ہے۔ بعینہٖ جیسے آج کل انگریزوں کی حکومت میں مسلمانوں کو "مذہبی آزادی" حاصل ہے۔ یعنی اس چیز کی آزادی جسے انگریز "مذہب" سمجھتا ہے۔ نماز

روزہ کی آزادی۔ مدحِ صحابہ و تبریٰ کی آزادی۔ عُرسوں کی آزادی۔ تعزیہ کی آزادی۔ قرآن پڑھ پڑھ کر اس کے ایصالِ ثواب کی آزادی۔ سوا لاکھ مرتبہ آیت الکرسی پڑھنے کی آزادی۔ سبحہ شماری کی آزادی۔ ڈاڑھی بڑھانے کی آزادی۔ ختنہ کی آزادی۔ عقیقہ کی آزادی۔ غرضیکہ پُوری "مذہبی" آزادی ہوگی۔ البتہ امورِ دنیاوی کے فیصلے اکثریت کے ماتحت ہوں گے۔ یعنی ملک میں (جس میں مسلمان بھی شامل ہیں) اقتصادی نظام کیسا ہوگا۔ سُودی کاروبار کی نوعیت کیا ہوگی۔ دولت اور زمین کی تقسیم کیسے ہوگی۔ بیرونِ ہند کی اسلامی اور غیر اسلامی حکومتوں کے ساتھ امن و جنگ کی حالت میں تعلقات کیسے ہوں گے۔ صُلح کس سے ہوگی اور دشمنی کس سے۔ عدالتوں کا نظم و نسق کیسے ہوگا۔ ترازوئے عدل و انصاف کی تفویض کس معیار پر ہوگی۔ کسی فعل کو جُرم قرار دیئے جانے کا تعین کون کرے گا۔ جرائم کی سزا کیا ہوگی۔ غرضیکہ اس قسم کے تمام "امورِ دنیاوی" کے فیصلے اکثریت کی آراء کے مطابق ہوں گے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کے نظامِ حکومت میں مسلمانوں کی حالت کیا ہوگی! کیا وہ اس نہجِ زندگی میں اپنے آپ کو "آزاد مسلمان" (بلکہ یوں کہیئے کہ صحیح معنوں میں مسلمان) کہلانے کے مستحق سمجھیں گے؟ اس کے برعکس مسلمان کا یہ دعویٰ ہے کہ

(۱) ازرُوئے کتاب و سنت، مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں۔ ہندوستان کے تمام باشندے ایک "قوم" نہیں ہیں۔

(۲) تمام ہندوستان کو ایک "کل" (UNIT) فرض کر کے جمہوری انداز کا طرزِ حکومت مسلمانوں کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ کہ مسلمان کا نصب العین حکومتِ الٰہیہ کا قیام و بقا ہے، جو اس کی عملی زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہو۔ "دین و دنیا" کی تفریق اس کے نزدیک غیر اسلامی نظریہ حیات ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تمام ہندوستان کو ایک کل (Unit) اور یہاں کے

۲۱

تمام باشندوں کو ایک قوم تصوّر کر لینے کے بعد جس انداز کا نظامِ حکومت ہندو قائم کرنا چاہتا ہے، وہ مسلمانوں کے نقطۂ خیال سے ناقابلِ قبول ہے تو پھر، بحالاتِ موجودہ مسلمان کس انداز کا نظامِ حکومت چاہتے ہیں۔ اس کے لئے دو شکلیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو اس وقت جب نظامِ حکومت انگریزوں کی زیرِ سرکردگی درجۂ نوآبادیات کا ہو۔ (جیسا کہ سردست حالات بتا رہے ہیں) اور دوسرا اس وقت جب نظامِ حکومت بالکل آزاد ہو۔ (جو مسلمانوں کا ازرُوئے مذہب منتہائے نگاہ ہے) اوّل مسلمان چاہتا ہے۔ کہ اوالذکر صورت میں یہاں دو (یا دو سے زیادہ) الگ الگ مراکز (centres) قائم کئے جاویں۔ ایک ہندو انڈیا کے لیئے اور دوسرا مُسلم انڈیا کے لئے۔ یعنی ایک مرکز میں اکثریت ہندوؤں کی ہو۔ اور دوسرے مرکز میں مسلمانوں کی۔ اور ثانی الذکر صورت میں ہندوستان کے دو الگ الگ خطوں میں جُداگانہ آزاد سلطنتیں قائم ہوں۔ یہ ہے مسلمانوں کا مطمعِ نگاہ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس نظریہ کی عملی تشکیل کیسے ہو سکتی ہے۔ اتفاق ہے ہندوستان کے شمال مغربی۔ اور شمال مشرقی (بنگال، آسام) کے علاقوں میں دو بڑے خطے ایسے واقع ہوئے ہیں۔ جہاں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت ہے۔ اگر ہندوؤں اور انگریزوں کے نظریات کے مطابق اکثریت کو یہ حق پہنچتا ہے۔ کہ وہ اپنا نظامِ حکومت اپنے ہاتھ میں رکھے تو اس حصّۂ ملک کی اکثریت سے یہ حق کیوں سلب کر لیا جائے؟ مُسلم لیگ کی تجویز یہ ہے کہ جس دوران میں مُلک میں آئینی تبدیلیاں ہوں۔ ان خطوں میں ایک (یا دو) جُداگانہ مرکز قائم کر کے مسلمان اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے۔ اور جب مکمّل آزادی حاصل ہو جائے۔ تو یہی علاقہ آزاد اسلامی حکومت کی جولانگاہ بن جائے۔ اوّلالذکر اسکیم۔ مسلم لیگ کے ریزولیشن (لاہور) کا ماحصل ہے۔ اور ثانی الذکر ہمارے تصوّرات کی آماجگاہ۔ (اوّل الذکر بھی درحقیقت اسی ثانی الذکر کا پیش خیمہ ہے) اور دونوں کا سرچشمہ اس مردِ حق بین وحق آگاہ کی دانشِ نورانی وحکمتِ بُرہانی کا رہینِ منت ہے، جس نے سنہ ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر پُوری جرأت بسالت سے اس کا اعلان

فرمایا۔ نور اللہ مرقدہٗ و رفع اللہ مقامہٗ

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

بابِ سوم

اعتراضات

ہندوؤں کی طرف سے اس اسکیم کی مخالفت ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی ۔ کہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بو لہبی (اقبالؒ)

انھوں نے اس کے خلاف جس قدر ہنگامہ آرائی اور غوغا آرائی سے کام لیا۔ وہ کوئی غیر متوقع اور تعجب انگیز واقعہ نہیں۔ تعجب تو بلکہ اس پر ہوتا اگر وہ خاموش رہتے۔ ہندو کی تمام جدّوجہد اس امر کے حصول کے لئے ہے کہ وہ ہندوستان میں اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر ہندو راج قائم کرکے اپنی صدیوں کی غلامی کا انتقام مسلمان اور تنہا مسلمان سے لے ۔ اس نے جب دیکھا کہ اس اسکیم کی رُو سے اس کے یہ تمام منصوبے خوابِ پریشاں ہو رہے ہیں ۔ تو وہ تلملا اٹھا۔ اور اپنی قدیم روش کے مطابق "لوٹ لیا، مار لیا، دوڑیو، بچائیو" کے شور سے ایک ایسا ہنگامہ برپا کر دیا کہ جس سے وائسرے یگل لاج سے لے کر قصرِ بکنگھم تک کی دیواریں ہل جائیں ۔ یہ سب کچھ ہُوا اور ہو رہا ہے ۔ اور اس کا کوئی گلہ نہیں شکوہ نہیں۔ لیکن جس بات کا رونا ہے وہ اس سے الگ ہے ۔ جس قیامت کا ماتم ہے وہ کچھ اور ہی ہے۔ مصیبت یہ نہیں کہ ہندو اس کی مخالفت میں یوں آتش در پیرہن کیوں ہو رہا ہے ۔ مصیبت یہ ہے ۔ کہ یہ سب مخالفت خود غلام فطرت مسلمانوں کے ہاتھوں سے

کرائی جارہی ہے۔ مسلمانوں کو جو زخم غیروں کے ہاتھوں سے لگ رہے ہیں۔ تکلیف ان کی بھی ہوتی ہے۔ کہ زخم بالآخر زخم ہے۔ لیکن قیامت تو اس وقت بر پا ہوتی ہے۔ جب یہ دکھائی دے کہ جس ہاتھ میں خنجر ہے، وہ ہاتھ ایک مسلمان کا ہے۔ حضرت عمرؓ کو جب بحالت نماز زخمی کیا گیا، تو انھوں نے سب سے پہلے یہی دریافت فرمایا تھا کہ حملہ آور کون ہے۔ اور جب انھیں معلوم ہُوا کہ وہ مسلمان نہیں تو سجدۂ شکر بجالائے۔ کہ الحمد اللہ میرا قاتل کوئی مسلمان نہیں۔ ہٰلذا جب یہ دیکھا جائے۔ کہ ملّت کی رگِ جاں پر جو خنجر رکھا جارہا ہے۔ وہ خنجر ایک مسلمان کے ہاتھ میں ہے۔ تو اندازہ فرمایئے کہ یہ منظر کس درجہ کرب انگیز اور یہ حادثہ کیسا جانکاہ ہوگا، اور پھر یہ ننگِ اسلام "مسلمان" اس مخالفت میں چاروں طرف سے اس طرح یورش کرکے اُمنڈے ہیں گویا کسی نے بھِڑوں کے چھتّہ میں پتھر دے مارا ہو۔ ان کی ان ہنگامہ خیزیوں سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔ کہ جب قرآنِ کریم نے فرمایا تھا۔ کہ

وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ — جب اللہ کا بندہ ان لوگوں کو حق کی طرف
كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا — دعوت دینے کے لئے کھڑا ہُوا۔ تو مخالفین
نے اسے یوں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ کہ گویا ابھی اسے لپٹ جائیں گے"

تو یہ صرف کسی خاص واقعہ کا ہی بیان نہ تھا۔ بلکہ ایک حقیقتِ مستمرہ کا اظہار تھا۔ کہ جب اور جہاں کہیں کوئی اللہ کا بندہ اسلام کی سرفرازی و سربلندی کی طرف دعوت دیتا ہے تو مخالف قوتیں اسی طرح ہجوم کرکے اسے گھیر لیتی ہیں۔

بدل کے بھیس زمانہ میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم۔ جواں ہیں لات و منات (اقبالؒ)

اور پھر قیامت بالائے قیامت یہ کہ اس لشکرِ بلا انگیز کا مقدمتہ الجیش مشتمل ہے ان حضرات پر جو بڑے بڑے جبّوں اور عماموں سے آراستہ۔ طویل اور عریض عباؤں اور قباؤں سے مزیّن۔ پُشت پر کتابوں کا طُومار اٹھائے۔ بغلوں میں (قرآن نہیں بلکہ) قرآن کے جُزدان دبائے۔ حمایتِ

دین اور حفاظتِ اسلام کے نعرے لگاتے اس "ملحد و بے دین" کے تعاقب میں بڑھے جا رہے ہیں جس کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آزاد اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہی ہیں وہ قالب کہ جنہیں جعفر اور صادق کی روحیں تلاش کر کے اپنا نشیمن بنا لیتی ہیں۔ یہی ہے وہ طائفہ کہ جس نے اپنے زہد و تقدس اور علم و فضل کی نظر فریب قباؤں میں وہ خنجر و سناں چھپا رکھے ہیں۔ کہ ملتِ اسلامیہ کا پیکر نورسینہ جن سے ہمیشہ چھلنی ہوتا رہا ہے یہی ہے وہ گروہ جس کی یہ حالت ہے کہ

گاہ او را با کلیسا ساز باز — گاہ پیشِ دیریاں اندر نیاز
دینِ او آئینِ او سوداگری است — عنتری اندر لباسِ حیدری است
تا جہانِ رنگ و بو گردد دگر — رسم و آئینِ او گردد دگر
پیش ازیں چیزے دگر مسجودِ او — در زمانِ ما وطن معبودِ او
ظاہرِ او از غمِ دیں دردمند — باطنش چوں دیریاں زنار بند
جعفر اندر ہر بدن ملت کش است — ایں مسلمانے کہن ملت کش است
از نفاقش وحدتِ قومے دو نیم — ملتِ او از وجودِ او لئیم
ملتے را ہر کجا غارت گرے است — اصلِ او از صادقے یا جعفرے است

الاماں از روحِ جعفر الاماں
الاماں از جعفرانِ ایں زماں (اقبالؒ)

ہمیں اس تلخ نوائی سے معاف رکھئے کہ جب قرآن کو ڈھال بنا کر مسلمان کے سینہ میں خنجر گھونپا جاتا ہے۔ تو منہ سے بے اختیار چیخ نکل جانا کوئی جرم نہیں۔ آہ! ہم اپنا سینہ کسے دکھائیں اور کس سے ان رستے ہوئے ناسوروں کی مرہم طلب کریں۔ جو خود چارہ ساز کے نشتر کے رہینِ منت ہیں۔ بھڑک اٹھنے والی آگ کو تو ہر آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ لیکن اس آتشِ خاموش کو کوئی کیسے دکھائے جو اندر ہی اندر مغز استخواں تک کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دے۔

لیکن اس کا دھواں تک بھی سطح سے ابھرنے نہ پائے۔ ہم جب بھی اپنے بھائیوں کے خلاف کچھ لکھتے ہیں۔ تو شاید یہ سمجھا جاتا ہو۔ کہ ہمیں اس میں کچھ لطف آتا ہے۔ لیکن ہم کیسے اپنا دل چیر کر دکھائیں۔ کہ اس قسم کے شکوہ و شکایت سے خود ہم پر کیا گذرتی ہے۔ یقین مانئے ہم ہر بات کو دیکھتے ہیں اور چھاتی پر پتھر رکھ کر اسے برداشت کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں۔ کہ کوئی ایسی اصلاح کی صورت نکل آئے۔ کہ ہمیں حرف شکایت زبان پر لانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ لیکن جب پانی سر سے گزر جاتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں۔ کہ کشتی کے مسافر خود اپنے ہاتھوں سے کشتی میں سوراخ کر رہے ہیں۔ اور ہم سمجھتے ہیں اگر ہم چندے خاموش رہے تو پوری کی پوری کشتی غرق ہو جائے گی۔ جب ہم محسوس کرتے ہیں کہ گھر کے بسنے والے خود اپنے ہاتھوں سے گھر کو تباہ کر رہے ہیں يُخْرِبُونَ بُيُوتَهُم بِأَيْدِيهِمْ ۔ ۵۹ ۔ اور خیال کرتے ہیں کہ اگر ہم نے ان کا ہاتھ نہ پکڑا تو یہ بنیادوں تک کو منہدم کر دیں گے۔ تو اس وقت ہم زبان کھولنے اور ہاتھ پکڑ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں (اور بطور تحدیث نعمت عرض کرتے ہیں کہ ایسے وقت میں کسی ترغیب یا ترہیب کسی مصلحت کوشی یا جنبہ داری کے کانٹے آج تک ہمارے دامن کو نہیں الجھا سکے۔ یہ صرف اسی کا کرم ہے جسے وہ نوازے) ہم بھی جانتے ہیں کہ عفو و درگزر، مسامحت اور چشم پوشی اچھے اخلاق ہیں لیکن جب آپ دیکھ رہے ہوں۔ کہ ایک شخص مکان میں آگ لگا رہا ہے۔ تو اس وقت دیکھتے رہنا اور اس کا ہاتھ نہ روکنا۔ دنیا کے کسی معیار کے مطابق بھی مستحسن قرار نہیں دیا جائے گا۔ قومیں تباہ اس وقت ہوتی ہیں۔ جب انہیں غلط راستے سے روکنے والا کوئی باقی نہیں رہتا۔ ایسے وقت میں مختلف امیال و عواطف کا تقاضا بیشک کچھ اور ہوتا ہے لیکن فریضۂ خداوندی کچھ اور چاہتا ہے۔ اور مبارک ہیں وہ کہ ایسے وقت میں جن کے ادائیگی فرض کے راستہ میں مختلف رجحانات مزاحم نہ ہو جائیں۔ وذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ؕ

یقین مانئے۔ نہ ہمیں اشخاص سے کچھ تعلق ہے۔ نہ جماعتوں سے کچھ واسطہ۔ ہماری موافقت ہے تو اور مخالفت ہے تو سب ایک اصول کے ماتحت ہے۔ اور وہ اصول۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ صرف ایک ہے۔ کہ موافقت اس کی جو حق پر ہو اور مخالفت اس کی جو اس راہ کو چھوڑ کر باطل کے پیچھے لگ جائے۔ اگر عوام اس باطل کے راستے پر لگ جائیں تو زیادہ خدشہ نہیں ہوتا۔ کہ ایک تو عوام

کا فعل ان کی ذات تک محدود رہتا ہے اور دوسرے انہیں ہر وقت راہِ راست کی طرف بلایا جا سکتا ہے۔ لیکن جب کشتی کے ناخدا ہی اسے بھنور کی طرف دھکیل لے جائیں۔ جب انجن کا ڈرائیور ہی اسے پٹری پر سے اتار دے تو پھر ہلاکت سے بچنے کی کونسی شکل باقی رہ جاتی ہے۔ اس لئے ایسے وقت میں خطرہ سے آگاہی کے ناقوس کا زیادہ بلند آہنگ اور روکنے والے ہاتھ کی گرفت کا زیادہ شدید ہو جانا بالکل فطری ہے۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَ ہُوَ شَہِیۡدٌ ۝

اور یقیناً اس میں عبرت ہے اس کے لئے جو (سینہ میں) دل رکھتا ہو اور اسے کان دیکر سنے اور اس پر گواہ رہے۔

اعتراض اوّل اب آئیے اعتراضات کی طرف۔ جیسا کہ ظاہر ہوتا ہے۔ اس اسکیم کا نقطۂ ماسکہ پنجاب ہے۔ کہ پنجاب ہی اس اسلامی خطہ کا قلب ہوگا۔ پنجاب کا مسلمان اس خواب کی تعبیر کے لئے ہمہ تن اضطراب ہے اور اس نصب العین کے حصول کے لئے ہر ممکن قربانی کے لئے تیار۔ پنجاب کے مسلمان کے سینہ میں دل اور دل میں زندہ رہنے کے ولولے موجزن ہیں۔ اس کی رگوں میں خون اور خون میں ایمان کی حرارت ہے وہ زندہ ہے۔ متحرک ہے۔ بیتاب ہے ایک پیکر جذبات ہے جو تحفظِ ناموسِ اسلام کی خاطر ہر وقت کٹ مرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ لیکن افسوس کہ اس کا سیاسی شعور ہنوز اتنا بیدار نہیں ہوا کہ وہ اپنی نمائندگی کے لئے ایسے مسلمان منتخب کرے جن میں یہی جذبات بدرجہ اولےٰ موجود ہوں۔ اس لئے عام طور پر وہ بساطِ سیاست پر دھوکا کھا جاتا ہے۔ اور اس کا بُری طرح خمیازہ بھگتتا ہے۔ اسکیم زیرِ نظر کی جلد از جلد کامیابی کے لئے پنجاب کا ذرہ ذرہ مضطرب و بیقرار ہے۔ لیکن اس کمی کی وجہ سے جس کا ذکر سطورِ بالا میں کیا گیا ہے۔ باہر کی دنیا یہ سُنکر متعجب رہ گئی کہ اس کی مخالفت کی ابتدا بھی پنجاب ہی سے ہوئی۔ اور وہ بھی خیبر سے وہاں کے وزیرِ اعظم کی زبان سے۔ اس سے بڑھ کر کسی قوم کی بدبختی کی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہ اس کی "زبان" اس کے

"قلب" کی مخالفت پر اتر آئے۔ یہ اسکیم ابھی لیگ کے اربابِ بست و کشاد کے طبقہ میں گردش کر رہی تھی اور اسے اپنی آخری صورت میں ۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے کھلے اجلاس میں جلوہ پیرا ہونا تھا کہ اوائل مارچ میں جناب سر سکندر حیات خاں صاحب نے اسلامیہ کالج کے ایک جلسہ کی تقریب پر طلباء کو نصیحت فرماتے ہوئے کہا۔

"زندگی میں تمہارا نصب العین کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن یاد رکھو۔ تم نے کسی ایسی اسکیم کی تائید نہ کرنا جس کا منشا یہ ہو کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے مسلمانوں کے لئے الگ خطہ منتخب کر لیا جائے۔ یہ اسکیم نہ صرف اسلامی تعلیم کی صحیح رُوح کے ہی خلاف ہے۔ بلکہ اسلام کے اس بنیادی اصول کے بھی منافی ہے۔ جس کی رو سے ہر فرزندِ توحید پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے۔ کہ وہ اسلام کا پیغام دنیا کے ہر گوشہ تک پہنچا دے۔ (ہندوستان ٹائمز ۳ مارچ ۵)

یہاں سے ابتداء ہوئی اور اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ قومیّت پرست طبقہ بالخصوص احرار اور جمعیت العلماء کی طرف سے ہر چہار سمت سے یہی مصرع اٹھایا گیا۔ کہ ہاں! یہ اسکیم اسلام کے خلاف ہے لیکن حرام ہے جو اس وقت تک سر سکندر حیات خاں صاحب یا ان کے مقلّدین میں سے کسی اور نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کوئی ایک دلیل بھی پیش کی ہو۔ گویا یہ ایک فتویٰ تھا جو بلا دلیل و حجت بارگاہِ وزارت سے صادر ہو گیا۔ اور اس کے نیچے حضرات "علماءِ کرام" "الجواب صحیح" لکھ کر مہرِ تصدیق ثبت فرماتے گئے۔ ہم نے بابِ اوّل میں جو کچھ لکھا ہے۔ اسے ایک مرتبہ پھر پڑھ لیجئے اور اس کے بعد فیصلہ فرمایئے کہ کیا اس سے بڑا جھوٹ بھی ہے جو کبھی بولا گیا ہو اور اس سے بڑی تہمت بھی ہے جو اسلام پر لگائی گئی ہو کہ دنیا کے کسی خطہ میں مسلمانوں کی حکومت قائم کرنے کا خیال اسلام کے خلاف ہے۔ حیرت ہے کہ اگر مسلمان کی حکومت کا تصوّر اسلام کے خلاف ہے۔ تو پھر کیا غلامی کا نظریہ اسلام کے مطابق ہوگا۔ یہ حضرات جو کچھ ان کے جی میں آتا اس اسکیم کے خلاف کہتے۔ لیکن کم از کم اللہ کے دین کے خلاف اس کے پیامِ ازلی کے خلاف۔ اس کے ضابطۂ حکومت کے خلاف تو اس دیدہ دلیری سے کام نہ لیتے ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان پر اس لئے بھی اللہ کا عذاب طاری ہے۔ کہ اس نے اس کی کتابِ عظیم

کو (نعوذ باللہ) کھلونا بنا رکھا ہے۔ ہر شخص اپنے خیالات و خواہشات کی اتباع کرتا ہے۔ لیکن چاہتا یہ ہے کہ اسے قرآنِ کریم کے مقدس غلاف میں لپیٹ کر پیش کرے تاکہ ہر سننے والے کا سر خود بخود اس کے سامنے جھک جائے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کا تلعب بالدین" اللہ کے ہاں کسی رعایت کا مستحق ہو سکتا ہے؟ ہم چیلنج دیتے ہیں کہ ان حضرات میں سے کوئی صاحب آگے بڑھیں اور اپنے اس دعوے کے اثبات میں قرآنِ کریم کی کوئی ایک آیت پیش کریں۔

وَادْعُوا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿﴾ یونہی کہہ دینا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ سوائے فریب دہی کے اور کیا ہے! معلوم اِن لوگوں نے دین کو سمجھ کیا رکھا ہے کہ جس کے جی میں جو کچھ آئے۔ کہتا چلا جائے۔ کوئی پوچھنے والا ہی نہیں! اس میں شبہ نہیں کہ آج مسلمانوں کے پاس کوئی ایسی قوت موجود نہیں جس کی بنا پر وہ اِن لوگوں کو مجبور کر سکیں کہ یہ اپنے دعوے کو قرآنی دلائل سے ثابت کریں۔ لیکن انہیں اتنا تو معلوم ہونا چاہیئے کہ آخر ایک دن خدا کے سامنے پیش ہونا ہے وہاں کیا جواب بن پڑے گا! اللہ اکبر! انسان بھی کس قدر ظلوماً جہولا (ظالم و جاہل) واقع ہوا ہے۔ اگر ان لوگوں کا دعوے صحیح مان لیا جائے تو پھر قرآن کی رو سے (معاذ اللہ) اسلام کی صحیح تعلیم یہ ہوگی کہ مسلمان ریت کے ذروں کی طرح بکھرا پڑا رہے کہ ہوا کا ہر تیز جھونکا اسے اپنے ساتھ اڑا کر اور پانی کی ہر تیز رَو اپنے ساتھ بہا کر لیجائے۔ ان ذرات کا سمٹ کر ایک چٹان بن جانا کہ جو مخالف قوت اس سے ٹکرائے پاش پاش ہو جائے۔ خلافِ اسلام ہوگا۔ اِن کا اسلام انہیں یہ سکھاتا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں ذلت و خواری نکبت و زبوں حالی۔ بے کسی و بے لبی۔ عزبت و افلاس کی زندگی بسر کر کے گونڈ اور بھیل بن کر رہ جائیں۔ یہ تو گویا عین منشائے قرآنی کے مطابق ہے۔ لیکن اگر انہیں سرفرازی و سربلندی۔ عزت و وقار۔ شوکت و سطوت۔ عظمت و حکومت کی زندگی مل سکے تو یہ سب کچھ قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ غیر مسلم اکثریت کے ماتحت دن بسر کر کے شودروں کی زندگی بسر کریں یہ تو ان حضرات کے نزدیک عین مقصودِ اسلام ہے۔ لیکن ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک ذی عزت قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا یکسر غیر اسلامی زندگی ہے! اللہ اکبر۔ یہ ہے

ان لوگوں کا قرآن۔ اور یہ ہے اس قرآن کی تعلیم جو قرآنِ کریم چودہ سو برس سے مسلمانوں کے ہاں چلا آتا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک (نعوذ باللہ) ناقص ہے کہ وہ مسلمانوں کو عزت کی زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے۔

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

اقبالؒ

اسکیم زیرِ نظر میں ابھی یہ شق کہیں لازم نہیں رکھی گئی کہ ملک کے جن حصوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ وہ اپنا علاقہ چھوڑ کر (کہ جہاں انہیں غیروں کی حکومت میں زندگی بسر کرنا پڑے) اسلامی خطۂ ملک میں آجائیں لیکن اگر ان معترضین کے سامنے وہ قرآن ہوتا جو نبی صلعم پر نازل ہوا تھا تو اس میں تو یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ اگر کوئی وقت ایسا آجائے کہ تمہارے دین اور وطن میں آویزش ہو جائے۔ مسلمان اللہ کی حکومت میں زندگی بسر کرنے کے بجائے طاغوتی قوتوں کے زغہ میں گھر جائیں اور اس زغہ سے نکلنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو اس وقت بجائے اس کے کہ وہ اس غیر اسلامی زندگی پر مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں۔ ان پر فرض عائد ہو جاتا ہے کہ وہ اس علاقہ کو چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلے جائیں جہاں وہ اپنا سر خدا کے سوائے کسی اور کے سامنے جھکانے پر مجبور نہ کئے جائیں جہاں قانون صرف خدا کا ہو انسانوں کا نہ ہو۔ فرمایا:
يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ؁ (العنکبوت)

اے میرے وہ بندو جو ایمان لائے ہو۔ میری زمین تو بڑی وسیع ہے۔ پس (وہاں رہو کہ جہاں امر میری ہی حکومت ہو، کسی انسان کی حکومت نہ ہو)

یہی وہ اصولِ حقّہ تھا جس کے ماتحت جناب نبی اکرم صلعم نے مکّہ کو چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور ادھر اُدھر کے تمام منتشر مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے پہلے اس ایک نقطہ پر حکومتِ خداوندی کی بنیاد رکھی یہیں بیٹھ کر مسلمانوں نے اپنی بکھری ہوئی قوتوں کو مجتمع کیا۔ اور اس کے بعد اللہ کی نصرت کو اپنے جلو میں لئے ہوئے اس زور و قوت کے ساتھ پھیلے کہ روئے زمین کا گوشہ گوشہ ان کے قدموں کے نیچے آگیا۔ ان مسلمانوں کی پہلی اور دوسری زندگی کا موازنہ فرماتے ہوئے ان سے کہا گیا۔ کہ

وَاذْكُرُوٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِى الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (۸/۲۶)

ذرا اس وقت کو یاد کرو کہ تم اقلیت میں تھے۔ ملک میں ناتواں اور کمزور شمار کئے جاتے تھے (ہر وقت) اس خطرہ میں رہتے تھے کہ دشمن تمہیں نوچ کھسوٹ کر نہ لیجائیں سو اس حالت میں اللہ نے تمہاری حفاظت کی اور اپنی نصرت سے تمہیں تقویت دی اور تمہیں رزقِ طیب عطا فرمایا۔ تاکہ سپاس گزار بنو اور یہ حفاظت و نصرت اس شکل میں آئی تھی کہ مسلمانوں نے ایک خاص خطۂ ارض میں جمع ہو کر اپنی قوتوں کو مرکوز کیا اور وہاں سے پھر قوت و شوکت کے ساتھ چاروں طرف بڑھے۔ مسلمانوں کی منتشر قوتوں کا ایک خاص گوشہ میں جمع ہونے کا مسئلہ اتنا اہم تھا کہ اس وقت منافقین کے دعوے اسلام کے اثبات کی دلیل ہی یہ قرار دی گئی تھی کہ یہ مسلمانوں کے اس مرکز کی طرف آتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ مسلمانوں سے کہا گیا کہ دیکھنا! وہ منافق جو اسلام کی شوکت و عظمت کے حصول کی خاطر تمہارے اس طریق عمل پیرا نہیں ہو رہے۔ وہ تمہاری دوستی کے قابل نہیں ہیں۔

فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۸۹/۴) انہیں اپنا دوست نہ بناؤ تاوقتیکہ اللہ کے راستہ میں ہجرت نہ کریں۔

چند آیات کے بعد ارشاد ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے ایسے وقت میں مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور اسلامی مرکز کے بجائے غیر اسلامی علاقوں میں زندگی بسر کرنے پر قانع ہو گئے۔ اور بازپرس کے وقت یہ عذر بار دیں پیش کر دیا۔ کہ

كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِى الْاَرْضِ ۭ (ہم کمزور اور ناتواں تھے) "اگر غیر مسلموں کی محکومیت میں زندگی بسر نہ کرتے تو کیا کرتے! ہم میں قوت کہاں تھی کہ اپنی حکومت قائم کر سکتے تو ان سے کہا جائے گا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۭ فَاُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىھُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا (۴/۹۷) کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی۔ کہ تم اس میں ہجرت کر کے اس مقام کی طرف

چلے جاتے جہاں اللہ کی حکومت تھی) یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اور بہت بُری جگہ ہے رہنے کی۔
حیاتِ اُخروی کا جہنم تو بعد میں آئے گا۔ اس دنیا میں غیر اللہ کی حکومت میں زندگی بسر کرنا اگر جہنم نہیں تو اور کیا ہے۔

زدوزخ واعظا کافر گرے گفت ـ حدیثے خوشتر از وے کافرے گفت
نداند آں غلام احوالِ خود را ـ کہ دوزخ را مقامِ دیگرے گفت

اور منافقین تو ایک طرف وہ مسلمان جنہوں نے ضعفِ ایمان کی بنا پر ہجرت کرنے میں تامّل کیا۔ ان کے متعلق دوسرے مسلمانوں کو فرمایا۔ کہ

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰى یُهَاجِرُوْا ۸/۷۲

اور وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر انہوں نے ہجرت نہ کی۔ (اے مسلمانوں) تمہاری دوستی اور پشت پناہی میں ان کا کوئی حصّہ نہیں تاوقتیکہ وہ ہجرت کرکے تمہارے ساتھ نہ آملیں۔ اور قرآن کریم کی رُو سے مومن حقاً۔ سچے مومن کی تو تعریف ہی یہ ہے کہ

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا ۔۔۔۔۔۔۔۔ رِزْقٌ كَرِیْمٌ ۸/۷۴

اور وہ لوگ جو ایمان لائے انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے ان کو جگہ دی اور مدد کی ان کو بخشش ہے اور روزی عزت کی۔ یعنی قرآنِ کریم کی رُو سے کسی گوشۂ ارض میں حکومتِ الٰہیہ کے قیام و بقا کے لئے اگر گھر بار سب کچھ چھوڑ کر ہجرت بھی کرنا پڑے تو یہ جزء عین فریضۂ خداوندی اور جزوِ ایمان بلکہ شرطِ ایمان ہوجاتی ہے۔ اور یہاں یہ حالت ہے کہ ابھی ہجرت کا کوئی سوال ہی نہیں۔ صرف اپنے اس علاقہ میں جہاں مسلمان اکثریت میں بستے ہیں۔ اسلامی حکومت کے قیام کی تجویز ہے اور ہمارے یہ جدید "مفسرینِ کرام" اور "مجددینِ ملت" ہیں کہ اس کو بھی اسلام کے منافی اور قرآن کے خلاف بتا رہے ہیں محض اس لئے کہ ہندو اس اسکیم کو پسند نہیں کرتے۔

شیخِ ملّت با حدیثِ دلنشیں
برمراد او کنند تجدیدِ دیں (اقبالؒ)

دُوسرا اعتراض جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اگر مسلمان اس طرح ایک گوشۂ ارض میں سمٹ کر بیٹھ گئے تو اسلام کی اشاعت رُک جائیگی۔ اور یوں یہ اہم فریضۂ خداوندی ساقط ہو جائے گا۔ ان معترضین کے نظریہ کے مطابق گویا صُورت یوں قائم ہو گی کہ جب مُسلمان شمال مغربی خطۂ ملک میں الگ ہو کر بیٹھ جائیں گے تو پھر ان کے چاروں طرف بڑی بڑی خندقیں کھود کر انہیں آگ سے بھر دیا جائے گا۔ اور یہ حکم دیدیا جائے گا کہ جو شخص اس دائرہ آتشیں سے باہر جانے کی کوشش کرے گا۔ داخلِ جہنم کر دیا جائے گا! ہم اس اعتراض کے طفلانہ پن کے متعلق سوائے اسکے اور کیا کہیں کہ اگر یہ کھُلی ہوئی فریب دہی نہیں تو چھپی ہوئی خود فریبی ضرور ہے۔ انگریز دنیا کے ایک کونے میں۔ ایک چپّہ بھر جزیرہ کو اپنا مرکز بنائے۔ ساری دنیا میں تہذیب و معاشرت کی "تبلیغ" کر رہا ہے اور اس کی یہ "تبلیغ" قلوب و اذہان پر اس درجہ مسلّط ہو رہی ہے کہ لوگوں کے نہ کان اپنے رہے ہیں نہ آنکھیں نہ دل اپنے رہے نہ دماغ۔ وہ سُنتے ہیں تو ان کے کانوں سے دیکھتے ہیں تو ان کی آنکھوں سے سوچتے ہیں تو ان کے دل سے سمجھتے ہیں تو ان کے دماغ سے یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے! صرف اس عظمت و جلال کے زور پر جو اس قوم نے حاصل کر رکھا ہے۔ اور یہ صرف انہی علاقوں میں نہیں جہاں انگریز کی حکومت ہے۔ بلکہ جو علاقے خود مختار ہیں۔ وہاں بھی یہ حالت ہے کہ لوگ فرنگی تمدّن کو از خود مستعار لئے جا رہے ہیں اور یہ محض اس لئے کہ اس تمدّن کی حامِل قوم کی برتری اور فوقیت کا تصوّر لوگوں کے دلوں میں غیر محسوس طور پر جاگزیں ہو چکا ہے اب آپ خیال فرمائیے کہ اگر مسلمان ایک گوشۂ ارض میں بیٹھ کر شوکت و عظمت کی زندگی حاصِل کرلیں تو کہئیے اس کے بعد وہ کونسی "سدِ سکندری" ہو گی جو ان سے عبور نہ کی جائے گی۔ وہ کونسی خندقیں ہوں گی جو ان کے راستہ میں حائل ہوں گی کہ وہ باہر جا کر اشاعتِ اسلام نہ کرسکیں گے ذرا اشاعتِ اسلام کی تاریخ پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ دنیا کے اس قدر دُور دراز گوشوں میں شمعِ خداوندی کی نورانی کرنیں پہنچیں کس طرح! ذرا سے غور کے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ جب مسلمانوں کا ایک مرکز مضبوط ہوا تو اس سرچشمہ سے مختلف سوتیں پھُوٹیں اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں جوئے رواں بن کر پھیل گئیں۔ زندہ اور آزاد قوم کا کوئی فرد جہاں جائے گا۔ عزّت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اور اگر

وہ ایسے تمدن کا حامل ہو جس کی نظیر دنیا میں کہیں نہ مل سکے۔ اور خود اس تمدن کا ایک پیکرِ تمثیلی بھی ہو۔ تو پھر تو پوچھئے نہیں کہ وہ کس قدر گہرا اثر دلوں پر چھوڑ جاتا ہے۔ اسلام کی اشاعت کا سب سے بڑا ذریعہ اس قسم کے زندہ اور آزاد افراد تھے علیہ الرحمۃ خود آزاد ہوئے سرفراز ہوگئے اور اس کے بعد دنیا میں جہاں گئے۔ دنیا نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ اور جو ان کے حلقۂ اثر میں آ گیا۔ پھر نکل کر نہ جا سکا۔ لیکن جس کے اپنے اندر کوئی جاذبیت نہ ہو جو خود ذلت و نکبت کی زندگی بسر کر رہا ہو۔ وہ دنیا کے سامنے کیسا ہی شاندار پیغام کیوں نہ پیش کرے۔ دنیا حقارت کی ہنسی سے اس کا استقبال کریگی۔ آپ اتنے عرصہ سے انگلستان اور جرمنی میں اسلامی مبلغ بھیج رہے ہیں۔ وہاں مساجد تعمیر ہو رہی ہیں تبلیغی سوسائٹیاں کام کر رہی ہیں! کہیئے کہ اس کا کوئی جاذبِ نگاہ نتیجہ بھی سامنے آیا! یہ کیوں! کیا (نعوذ باللہ) آپ کا پیغام۔ فرنگی تمدن و معاشرت کے مقابلہ میں کمزور اور ناقص تھا؟ یہ وجہ تو نہ تھی! وجہ یہی تھی کہ غلام جہاں جائے گا۔ نفرت و حقارت سے دیکھا جائے گا۔ اس سے سب سے پہلا سوال یہی کیا جائے گا کہ اگر تیرے پاس یہ آبِ حیات موجود ہے تو خود اپنے اندر زندگی کی رمق پیدا کیوں نہیں کرتا! اگر یہ نسخۂ کیمیا تیرے قبضہ میں ہے تو دوسروں کے دروازہ پر گداگری کے لئے جھولی کیوں پھیلاتا ہے! دنیا میں اگر اسلام آج اس عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا جس کا یہ مستحق ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ اسلام کو پیش کرنے والے ہم ہیں جو غلامی کے ٹکڑوں پر گذارہ کر رہے ہیں آپ غیر مسلموں میں اسلام کا ذکر فرماتے ہیں اور ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اگر چند سے اور یہی حالت رہی تو نہ معلوم بھوک اور افلاس سے تنگ آ کر کتنے مسلمان دوسروں کے آغوش میں چلے جائیں گے۔ اور آپ کو کیا معلوم کہ پست درجہ کے افلاس زدہ قبائل میں یہ عملی ارتداد کس سرعت لیکن خاموشی کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ موجودہ صورتِ تشتت و انتشار میں۔ جسے آپ اسلامی زندگی بتا رہے ہیں۔ مسلمانوں میں وہ کونسی جذب و کشش باقی ہے۔ جس کی وجہ سے غیر مسلم کھنچ کر ان کی طرف آ جائیں ہندوستان کے کروڑہا اچھوت ہندو اہم جاتی کے پنجۂ استبداد سے تنگ آ کر بار بار اس امر کا ارادہ کر چکے ہیں کہ وہ کوئی ایسا مذہب اختیار کر لیں جو ان سے اخوت و مساوات کا سلوک کرے اور یہ ظاہر ہے کہ اسلام

سے سوا کونسا مذہب ہے جو ان کے ان داعیات کو پورا کر سکتا ہے وہ بھی جانتے ہیں کہ اسلام کے سوا کہیں اور جائے پناہ نہیں ہے۔ لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ مسلمان خود بھوکوں مر رہے ہیں۔ غربت و افلاس سے ان پر زمین تنگ ہو رہی ہے۔ تو وہ پھر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ اگر آپ کی قوم میں شوکت و سطوت، عظمت و حکومت ہوتی تو پھر دیکھتے کہ یدخلون فی دین اللّٰہ افواجا کا سماں کیسے جنّت نگاہ بنتا۔ اگر آج ملک کے ایک حصہ میں بھی اسلامی حکومت قائم ہو جائے تو پھر دیکھئے کہ یہ جَور و استبداد کے ستائے ہوئے۔ یہ ہر دَر و دَر سے دھتکارے ہوئے حقوق انسانیت سے محروم رکھے ہوئے انسان کس طرح پروانہ وار شمع اسلام کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اگر جرأت عرض معاف کی جائے تو ہم اس مقام پر ایک ذاتی سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔ سر سکندر حیات خاں صاحب فرماتے ہیں کہ موجودہ شکل میں اسلام کی اشاعت زیادہ ہو سکتی ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ سر سکندر حیات خاں صاحب خیر سے حکومتِ پنجاب کے بلند ترین منصب پر فائز المرام ہیں انہیں مذہبی آزادی بھی حاصل ہے۔ دولت بھی ان کے پاس ہے اور قوت بھی۔ ذرائع بھی بہت وسیع ہیں اور وسائل بھی۔ ان تمام امور کے باوجود وہ ذرا ارشاد تو فرمائیں کہ انہوں نے آج تک کتنے ہندوؤں کو مسلمان کیا ہے۔ ذرا سوچئے کہ یہ گہری تفکر طلب باتیں ہیں۔ جب ایک "اسلامی صوبہ" کے وزیر اعظم کی یہ حالت ہو تو یہ کہنا کہ موجودہ حالت میں اسلام کی اشاعت زیادہ زور سے ہو رہی ہے حقائق سے چشم پوشی نہیں تو اور کیا ہے! پھر یہ چیز بجائے خود غور طلب ہے کہ جس اسلام کو آپ آج اسلام کہہ رہے ہیں وہ اسلام کی نگاہ میں اسلام ہے بھی! کیا دنیا میں محکوم کا بھی کوئی مذہب ہوا کرتا ہے؟ اور کیا اسلام ایسے ہی مسلمان پیدا کرنا چاہتا ہے جو خود بھی غلام ہوں اور جو ان کی طرف آئے اسے بھی اپنے جیسا غلام بنا لیں۔ اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے، یقین مانئے کہ آزاد مسلمان تو اگر نو بھی ہوں تو نو کروڑ غلاموں کے مقابلہ میں اسلام کے لئے زیادہ گراں قدر متاع ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ اس بات کو آج کل سمجھایا کیسے جائے۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے تیرے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہئے

اور پھر آپنے اس چیز کو بھی سوچ لیا ہے کہ ہندوؤں کے منصوبے کیا ہیں! ڈاکٹر مونجے نے ابھی اگلے دنوں

اعلان کیا ہے۔ کہ ہندو مسلم مناقشات کے حل کا راز اسی میں ہے کہ مذاہب کی تبدیلی قانوناً ناجائز قرار دیدی جائے۔ یہ تو ہیں بے نقاب ہندو۔ لیکن اس کے ساتھ اگر انہیں بھی دیکھ لیا جائے جو "مہاتمائیت" کا نقاب اوڑھے ہوئے ہیں تو ان کے ارادے اور بھی بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ یہ واردھا کی تعلیمی اسکیم۔ جو ایک مسلمان کے ہاتھ سے مرتب کرائی گئی ہے اور یہ جدید تفسیر قرآن جو مولانا آزاد کے "برہمو سماجی اسلام" کی بنیاد ہے۔ اگر اشاعت اسلام کو روکنے کی تدابیر نہیں تو اور کیا ہیں! یہ تعلیم کہ "عالمگیر سچائیوں کے اعتبار سے تمام مذاہب یکساں ہیں۔ اسلام کو کسی اور مذہب پر کوئی فوقیت اور برتری حاصل نہیں۔" اسلام میں کونسی جذب و کشش باقی رکھ سکتی ہے جو آپ غیر مسلموں کو اسلام کے حلقۂ آغوش میں لے آئیں گے۔ اور پھر آپ کے نوجوانوں کے دلوں میں اس تعلیم کا راسخ کر دینا کہ نظامِ زندگی اخلاق کی بنیادوں پر نہیں بلکہ اقتصادیات کی بنیادوں پر استوار ہونا چاہیئے۔ ان کے اندر مذہب کے خلاف ایک کھلی ہوئی بغاوت کے جذبات پیدا کر دیتا ہے۔ یہ تمام تحریکیں اسی منظم پروگرام کے ماتحت بروئے کار لائی جا رہی ہیں کہ مسلمانوں کی آنے والی نسلیں مذہب سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ اس سے باغی ہو کر آئیں۔ اور یہ اس وقت ہو رہا ہے جب ابھی تمام اقتدار پورے طور پر ہندو کے ہاتھ میں نہیں آئی۔ جب تمام و کمال اختیارات ہندو اکثریت کے ہاتھ میں آ جائیں گے۔ اس وقت دیکھیئے گا کہ آپ کو اشاعت اسلام کے کس قدر مواقع دیئے جاتے ہیں۔

پھر یہ بھی سوچیئے کہ اگر ایک خطۂ زمین میں اسلامی حکومت ابتداءً اشاعت اسلام کے منافی ہوتی تو جب نبی اکرمؐ نے منتشر مسلمانوں کی قوتوں کو مدینہ منورہ میں مرکوز کیا ہے۔ اور دوسرے مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد کر دیا گیا کہ وہ ہجرت کر کے وہیں آ جائیں۔ تو اس وقت وہ مسلمان بھی یہ کہہ سکتے تھے کہ اگر ہم سب ایک مقام پر سمٹ کر جمع ہو گئے تو اشاعت اسلام کا فریضہ ساقط ہو جائے گا۔ لیکن انہوں نے یہ اعتراض بالکل نہیں کیا اس لئے کہ وہ خوب جانتے تھے کہ ایک طاقتور مرکز کے بغیر صحیح اسلام کی اشاعت کا تصور سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ جب مرکز مضبوط ہو گیا تو پھر وہاں سے مبلغ بھی نکلے۔ دعاۃ بھی مختلف مقامات میں پھیلے۔ سفیر بھی مختلف سلطنتوں میں پہنچے اور پھر ان مختلف حیثیتوں

سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ سیراب ہو گیا۔ یہ ہے اشاعتِ اسلام کی صحیح صورت۔

اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ سرِدست مسلمانوں کا سمٹ کر ایک گوشہ میں مرتکز ہو جانے کا تو سوال ہی کہیں نہیں۔ ابھی تو صرف اتنی تجویز ہے کہ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں ان علاقوں میں اکثریت کی حکومت قائم کر لی جائے۔ اس میں سمٹنے اور گوشوں میں محصور ہو جانے کا سوال کہاں سے آ گیا۔ حیرت ہے کہ یہ لوگ اس قدر فہم و بصیرت کے مدّعی بنتے ہیں اور باتیں ایسی طفلانہ کرتے ہیں۔

———(۵)———

تیسرا اعتراض | پھر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس اسکیم کی رُو سے ہندوستان کے ان مسلمانوں کو جو ہندو اکثریت کے صوبوں میں رہتے ہیں۔ کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دیا گیا ہے!

غور فرمائیے کہ یہ اعتراض ہندو دماغوں کی کتنی زبردست شاطرانہ عیاری کا آئینہ دار ہے۔

گویا اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو یہ کہکر بھڑکانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ دیکھو! یہ مُسلم لیگ جس کی کامیابی اور کامرانی تمہاری قربانیوں کی بدولت ہے۔ اس کی روش یہ ہے کہ تمہیں بیچارگی اور بے بسی کے عالم میں چھوڑ دیا اور اکثریت کے صوبوں میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس پروپیگنڈا کا لازمی نتیجہ تھا کہ سادہ لوح مسلمان واقعی اس دامِ فریب میں الجھ جاتا۔ لیکن الحمدللہ کہ مسلمان میں اب اتنی بصیرت پیدا ہوتی جارہی ہے کہ وہ دوست اور دشمن میں تمیز کر سکے۔ ذرا اس اعتراض کا حالات کی روشنی میں تجزیہ کیجئے اور دیکھئے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کا تناسب آبادی کہیں پانچ ہے۔ کہیں سات کہیں دس ہے کہیں چودہ۔ ان پر اگر بڑا کرم ہوا تو آبادی کے تناسب سے دو چار نشستیں زیادہ مل گئیں۔ لیکن سوچئے کہ اس سے فرق کیا پڑا۔ حکومت کا انداز جمہوریت ہوگا۔ فیصلے اکثریت کی آراء سے ہوں گے۔ اقلیت دس کی ہوئی تو کیا اور تیس کی ہوئی تو کیا۔ وہ تو اقلیت ہی رہے گی۔ دس بیس تو ایک طرف اقلیت تو ۴۹ کی بھی ہو تو بھی اقلیت ہی رہتی ہے۔ اس لئے دو چار نشستوں کی کمی بیشی سے اُن کی حالت پر کچھ فرق نہیں پڑتا یہ صُورت ہوگی الگ الگ صوبوں میں اور مرکز میں یہ حالت ہوگی کہ تمام ہندوستان کے مسلمان

مل کر کل آبادی کا قریب ایک چوتھائی ہوں گے۔ لہٰذا وہاں بھی یہ اقلیت میں رہیں گے۔ اور وہاں بھی فیصلے ہندو اکثریت کی رائے کے مطابق ہوں گے۔

اب لیگ کی اسکیم کو لیجئے۔ اس کی رُو سے ان صوبوں کا جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ ایک الگ مرکز ہوگا۔ اور ان صوبوں کا جہاں ہندو اکثریت میں ہیں جدا گانہ مرکز ہوگا۔ ہندو اکثریت کے مرکز میں مسلمان اقلیت میں ہوں گے۔ ایسے ہی اقلیت میں جیسے آج ہیں (یا جیسے تمام ہندوستان میں ایک مرکز ہونے کی صُورت میں اقلیت میں ہوں گے) لیکن اس کے برعکس مسلمان اکثریت کے صوبوں کے مرکز میں ان کی اکثریت ہوگی۔ اور وہاں کے فیصلے مسلمان اکثریت کی رائے کے تابع ہوں گے۔ لہٰذا صُورت حالات یوں ہوئی کہ

(۱) ہندو نظامِ حکومت کی رُو سے

(ا) اقلیت کے صوبوں میں مسلمان اقلیت میں رہیں گے۔

(ب) مرکز میں بھی مسلمان اقلیت میں رہیں گے

(۲) مسلم لیگ کی اسکیم رُو سے

(۱) اقلیت والے صوبوں میں مسلمان اقلیت میں رہیں گے اور

(ب) اپنے مرکز میں یہ اکثریت میں ہوں گے۔

اب خود ہی فیصلہ فرمایئے کہ اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کو مسلم لیگ کی اسکیم کے خلاف کیا شکایت ہوسکتی ہے۔ اگر یہ مسلمان اس اسکیم کی مخالفت کریں تو ان کا یہ طرزِ عمل کس قدر اسلام کی حمایت میں ہوگا! یوں سمجھیئے کہ قید خانہ کے کمرے میں دو قیدی ہوں۔ اور ایک ایسی تجویز درپیش ہو کہ جس سے ان میں سے ایک قیدی آزاد ہوسکتا ہو۔ اس وقت اگر دوسرا قیدی یہ کہہ کر اس تجویز کی مخالفت کرے کہ نہ بھائی! میں تو تمہیں آزاد نہیں ہونے دوں گا۔ تم چلے گئے تو میرا جی اداس ہو جاوے گا میں باتیں کس سے کروں گا۔ اس لئے بھیا میں اس تجویز کو کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ تو خیال فرمایئے کہ آپ اس رفیق کے جذبۂ رفاقت و ہمدردی کی کتنی داد دیں گے! اُسے تو

چاہیئے کہ اس تجویز کی پوری پوری قوت کے ساتھ تائید کرے کہ دو قیدیوں کے مقابلہ میں ایک قیدی اور ایک آزاد تو بہرحال اچھا ہے۔ یہ آزاد باہر نکل کر پھر اپنے دوسرے بھائی کی آزادی کے لئے بھی کوشش کر سکتا ہے! اس لئے اقلیت کے صوبہ کے مسلمانوں نے فی الواقعہ بڑی دانشں اطواری وجذبۂ اخوتِ اسلامی کا ثبوت دیا جب انہوں نے مسلم لیگ کے اجلاس میں اس ریزولیشن کی بلاشرط تائید کی۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے ایسی ہی امید رکھنی چاہیئے۔

یہ تو ہے تصویر کا ایک رُخ۔ اب دوسری طرف آیئے۔ اس وقت تمام ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور اکثریت کی طرف سے ان پر جو زیادتیاں ہو رہی ہیں۔ ان کی مدافعت کا کوئی سامان ان کے پاس موجود نہیں۔ اگر ملک میں دو الگ الگ مراکز ہوں تو جہاں ہندو اکثریت کے مرکز میں مسلم اقلیتیں آباد ہوں گی وہاں مسلمان اکثریت کے مرکز میں ہندو اقلیتیں ہوں گی۔ اس لئے اس وقت ہندو اپنی مسلم اقلیت پر دراز دستی کرتے وقت سو مرتبہ سوچے گا کہ اسے معلوم ہوگا کہ

میرے نشتر کی زد شریانِ قیس ناتواں تک ہے

آج جو کچھ ہندو کر رہا ہے اسے ذرا غور سے دیکھئے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ اس کا بنیا پن کس قدر کرشمہ زا ہے اُونچی ذات کا ہندو (CASTE Hindu) بڑی تھوڑی تعداد میں ہے۔ اس نے ربیخ ذاتوں کے اقوام (اچھوت) کو ہندو بنا کر اپنی تعداد ۲۳ کروڑ تک پہنچائی ہے اور اس تعداد کی حیثیت سے تمام حقوق و مراعات حاصل کر رکھے ہیں لیکن ان حقوق و مراعات میں اچھوت بیچارے ایک پائی کے بھی شریک نہیں۔ یعنی اچھوتوں کے صدقہ میں اکثریت حاصل کرتے ہیں۔ اور ان کو اس میں سے حقوقِ انسانیت بھی نہیں دیتے۔ یہ ہے ان کا قومی بنیا پن،،۔ اب ان کا ملکی "بنیا پن" ملاحظہ ہو یہ تمام ہندوستان کو ایک ملک اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم قرار دے کر حکومت حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن مسلمان کو اقلیت شمار کرکے حکومت پھر اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ اگر آج اچھوت اپنے آپ کو الگ قوم شمار کرلیں۔ تو ہندو مٹھی بھر اقلیت رہ جاتے اور اگر مسلمان آج اپنی جداگانہ قومیت کا دعوےٰ منوا کر اپنی اکثریت کے علاقہ میں اپنی حکومت قائم کرلے تو ہندوؤں کے رام راج کے منصوبے خوابِ پریشاں بن کر

رہ جائیں۔ ہندو اپنی پوری قوت اس باب میں صرف کر رہا ہے کہ کسی طرح اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو مشتعل کرکے اس تجویز کی مخالفت کرا دے تاکہ اپنی خانہ ساز اکثریت کا طلسم نہ ٹوٹنے پائے۔

اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کو یہ کہہ کر بھڑکایا جاتا ہے کہ تم سے تمہارا وطن چھڑایا جائے گا۔ تمہیں ہجرت کرکے مُسلم اکثریت کے صوبوں میں جانا پڑے گا۔ اور اس میں بڑی مصیبت کا سامنا ہوگا۔ سو اوّل تو سرِ دست لیگ کی اسکیم میں تبادلۂ آبادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن ہم تو یہ کہتے ہیں کہ جس ترکِ وطن سے مسلمان کو ڈرایا جاتا ہے۔ سوچئے تو سہی کہ وہ ترکِ وطن ہے کیا چیز!

باب اوّل میں ہم لکھ چکے ہیں کہ ایک مسلمان کے نزدیک اصولِ فطرت کے مطابق زندگی وہاں بسر ہوتی ہے۔ جہاں نظامِ زندگی قوانینِ الٰہیہ کے مطابق متعین ہو۔ اس کے علاوہ ہر مقام پر زندگی غیر فطری ہے۔ اب ایک مثال کے ذریعے یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ ترکِ وطن کیا ہے؟ کسی جنگل میں ایک گائے رہتی ہو۔ اِدھر اُدھر سبز سبز گھاس گھنے درختوں کا سایہ۔ ماحول سے مانوس گرد و پیش سے مالوف۔ یہ اس کا وطن ہے۔ اس وطن میں وہ خوش ہے۔ لیکن ایک وقت ایسا آگیا کہ وہاں پانی خشک ہوگیا۔ اس نے بہتیری کوشش کی کہ کہیں آس پاس پانی مِل جائے۔ لیکن ناکام رہی۔ اب اس کی فطرت کا تقاضہ ہے کہ وہ پانی کی تلاش میں نکلے۔ اور جہاں پانی ملے۔ وہیں زندگی بسر کرے۔ یہ ہے اُس کا ترکِ وطن جو عین تقاضائے فطرت کے مطابق ہے۔ اب اگر اس ہجرت کے وقت گرد و پیش کے سنگ ریزے جمع ہو کر اسے سمجھائیں کہ تم یہ کیا کر رہی ہو! ایک عمر یہیں گذاری۔ یہاں کے ذرّہ ذرّہ سے تمہیں اُنس تھا۔ اپنا گھر بنا کر بیٹھی تھیں۔ ہم تمہارے ساتھی دِل بہلانے کو موجود تھے۔ تم نہ جاؤ کیا تمہیں اپنے گھر سے محبت نہیں؟ اس کے جواب میں جو کچھ وہ گائے کہیگی ظاہر ہے۔ وہ کہے گی کہ بھائی! یہ سب کچھ درست لیکن مشکل یہ ہے کہ تم میرے ادعائے فطرت سے واقف نہیں ہو اب یہاں کی زندگی میرے لئے غیر فطری ہے۔ میری پیاس کا تقاضا ہے کہ میں پانی کے مقام پر پہنچوں یہ ماحول اسی وقت تک میرا وطن تھا جب تک میرے تقاضائے فطرت کو پورا کر رہا تھا میں نے اسے وطن بنایا ہی اس لئے تھا۔ اب اگر یہ سرزمین میری فطرت سے سازگار نہیں رہی اور اسے

سازگار رہنا میرے بس میں نہیں۔ تو میرے لئے اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں کہ میں اس مقام کو اپنا وطن بناؤں جو میرے تقاضائے فطرت کو پورا کرے کہ اِنَّ اَرْضَ اللّٰہِ وَاسِعَۃٌ۔ اب یہاں رہنا میرے لئے خودکشی کے مرادف ہے جو ایک ناقابلِ عفو جرم ہے۔ ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ اس وقت اگر اس ماحول اور ماحول کا انس دامنگیر ہو گیا تو میں نے اپنے آپ کو ہلاک کر دیا۔ اس لئے اب میرا یہاں سے جانا ہی بہتر ہے۔ جب یہاں پانی کی افراط ہو گی۔ پھر آ جاؤں گی۔ کہ اصل شے یہ خاک کے ذرّے۔ یہ فضا کی ہوا۔ یہ درختوں کے سائے۔ یہ خوشنما منظر نہیں بلکہ اصل شے پانی ہے کہ جس پر میری زندگی موقوف ہے۔ جہاں وہ ہے۔ وہ صحرا بھی گلشن۔ اور اگر وہ نہیں تو ایسی جنت بھی جہنم۔

اس مثال کو آگے بڑھائیے۔ یہ گھاس اور یہ پانی۔ مقتضیاتِ فطرت ہیں اور ان میں انسان اور حیوان دونوں برابر کے شریک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس بنا پر ترکِ وطن صرف اس گائے پر ہی موقوف نہیں۔ انسانوں کے خانہ بدوش قبائل عمر بھر یہی کچھ کرتے رہتے ہیں لیکن جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں انسان تو حیوانات سے ایک کڑی آگے ہے۔ اس اگلی کڑی (شرفِ انسانیت) کے لئے بھی تو کچھ مقتضیاتِ فطرت ہیں یہ مقتضیات وہاں پورے ہو سکتے ہیں۔ جہاں حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہو۔ اگر حالات ایسے ہیں کہ جس مقام پر کوئی مسلمان پیدا ہوا ہے۔ وہیں یہ سامان موجود ہیں جو اس کے تقاضائے فطرت کو پورا کرتے ہیں تو وہ خوش قسمت ہے کہ اسے پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نہیں جانا پڑا۔ لیکن اگر صورت یہ نہیں ہے تو محض اس لئے اس مقام سے چپکے رہنا کہ میں یہاں پیدا ہوا ہوں۔ میرے بڑے بوڑھوں کی ہڈیاں یہیں دفن ہیں۔ ایک غیر فطرتی زندگی پر قناعت کر جانا ہے۔ یہ تھا وہ مقام جہاں اسے قرآن کریم پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ مومن کا وطن وہی ہے جہاں یہ قوانینِ فطرت کے مطابق زندگی بسر کر سکے۔ اور یہی تھی وہ منزل جہاں اس کے ہادی برحق جناب نبی اکرمؐ کے نقوشِ قدم کا ایک ایک ذرّہ اسے کہہ رہا تھا کہ حضورؐ نے اپنا وطن "مکہ" بھی تقاضائے فطرت کے مطابق چھوڑا تھا۔ اب آپ نے اندازہ فرما لیا ہوگا کہ ایک مسلم اور غیر مسلم کے نظریۂ وطنیت میں کیا فرق ہے اور ایک مسلمان کا وطن کے ساتھ حقیقی تعلق کیا ہوتا ہے۔

اور کس وقت وطن کی آب و گِل کی پابندی اس کے لئے ہلاکت کا موجب بن جاتی ہے ۔ یہی وہ نظریہ ہے ہے جس کے مطابق ۔

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی — رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی — دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

یہ ہے ایک مسلم کا صحیح نظریۂ وطنیت لیکن مشکل یہ ہے کہ غیر مسلم اس فرق کو سمجھ نہیں سکتا جس طرح وہ سنگ ریزے اس گائے کے اقتضائے فطرت کا احساس نہیں کر سکتے تھے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک مدت کی غیر فطرتی زندگی سے خود ہماری فطرت بھی مسخ ہو چکی ہے ۔ اور جس طرح صفرائے مریض کو شہد بھی کڑوا معلوم ہوتا ہے ہمیں یہ ادعائے فطرت ایہ صحیح اسلامی زندگی، کچھ اجنبی سی نظر آتی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اس غیر فطری زندگی کو ہی فطری قرار دیدیں ۔ ہماری قوتِ ذائقہ بیشک مسخ ہو چکی ہے لیکن الحمدللہ کہ قرآنی آبگینوں میں وہ عسلِ مصفّٰی اسی طرح موجود ہے کہ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ (وہ قلوب و اذہان کی تمام بیماریوں کا علاج ہے) ۔ ان تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ جس وقت شمال مغربی خطۂ ملک میں اسلامی حکومت کا قیام ہو گا (اور لیگ کی اسکیم اسی کا مقدمہ ہے) اس وقت اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کے لئے یہ ادعائے فطرت ہو گا کہ وہ اس جہنم کو چھوڑ کر جس میں ہر طرف طاغوتی قوتوں کا پنجۂ استبداد کار فرما ہے ۔ اس جنتِ ارضی میں آجائیں جہاں بندے اور خدا کے درمیان کوئی دوسری قوت حائل نہ ہو ۔ اور پکارنے والا پکار کر کہے کہ

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْۤ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ یہ ہے وہ جنت (ارضی) جس کے تم اپنے اعمال کی بدولت وارث بنائے گئے ہیں ۔

چوتھا اعتراض پھر یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مستقبل کے اندازِ حکومت میں مرکز میں بہت کم اختیارات رہ جائیں گے مختلف صوبے اپنے اندرونی معاملات میں بالکل آزاد ہوں گے۔ لہٰذا جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں انہیں وہاں ہر طرح کا کامل اختیار و اقتدار ہو گا پھر ایک نئے مرکز کی ضرورت کیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ تعداد کے لحاظ سے مرکز میں بہت کم شعبے ہوں گے۔ لیکن ذرا اس پر بھی غور فرمائیے کہ کیفیت کے اعتبار سے وہ شعبے کیسے ہوں گے۔ مثلاً دفاع (Defence) یعنی شعبۂ فوج مرکز کے زیرِ اختیار ہو گا۔ امورِ خارجہ (بیرونی سلطنتوں سے تعلقات) مرکز کے متعلق ہونگے فنانس، مالیات (کی سب سے بڑی مد کسٹم (بحری چونگی) مرکز سے وابستہ ہوگی۔ سلسلۂ رسل و رسائل اور ذرائع آمد و رفت پر نگرانی مرکز کی ہو گی۔ خیال فرمایا آپ نے کہ اقتدارِ مرکز کی عمارت کیسے کیسے محکم ستونوں پر قائم ہوگی۔ یوں سمجھئے کہ کسی سے کہدیا جائے کہ تمہیں اپنے کان پر پورا اختیار ہے ناک تمہارے قبضہ میں ہے آنکھ کے معاملہ میں تم آزاد ہو۔ تمہارے ہاتھ پاؤں بھی کھلے ہیں ان سب معاملات میں تمہیں پوری آزادی ہے۔ البتہ تمہارے دل اور دماغ اور معدہ پر ہمارا قبضہ ہوگا۔ ان سے جس طرح ہم چاہیں گے کام لیں گے تو فرمائیے کہ یہ آزادی کس قسم کی ہوگی پھر ہمارے "علماء حضرات" کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ نہیں! ہم جدید نظامِ حکومت میں ایک ایسا شعبہ الگ قائم کرائیں گے جو تمدنی اور معاشرتی مسائل میں احکام نافذ کرے گا۔ اور اس میں کسی غیر مسلم کو دخل نہ ہو گا۔

بڑی مشکل یہ ہے کہ ان حضرات کو کیسے سمجھایا جائے کہ تمدن و معاشرت ہمیشہ حکومت کے سایہ میں پرورش پاتے ہیں۔ اور حکومت اسی کی ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں محکمۂ فوج۔ محکمۂ امورِ خارجہ اور محکمۂ مالیات ہوں۔ آج بھی مسلمانوں کے مقدمے "قانونِ محمدی" (Mahmaddan Law) کے ماتحت فیصل ہوتے ہیں۔ انگریز نے کبھی اپنا تمدن و معاشرت مسلمانوں پر بزورِ مسلط نہیں کیا۔ لیکن ان تمام "آزادیوں" کے باوجود آپ کے

مذہب۔ تمدن۔ معاشرت کی جو حالت ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ مشکل اندر مشکل یہ کہ ہمارے مولوی صاحبان کے نزدیک مذہب اعبادات ومناسک اور چند رسوم ومظاہر کا نام ہے۔ آج اگر ان سے پوچھا جائے کہ جس چیز کو آپ انگریز کی غلامی کہتے ہیں وہ ہے کیا؟ کونسی بات ہے جس میں انگریز نے آپ کو غلام بنا رکھا ہے؟ تو اس کے جواب میں وہ ہندوؤں سے سنی سنائی صرف اتنی بات کہہ سکیں گے کہ انگریز اس ملک کی دولت کو لوٹ کر لیے جا رہا ہے ہندوستان کے باشندے فاقوں مر رہے ہیں۔ یہاں کسی کو کپڑا نصیب نہیں ہوتا! چنانچہ یہ حضرت اپنی ہر تقریر اور ہر بیان میں اسی غلامی کا رونا روتے ہیں اور اپنے مسلک کی تائید میں اکثر یہی دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ جب انگریز یہاں سے نکل جائے گا تو پھر ملک میں خوشحالی اور فارغ البالی ہو جائے گی یعنی ان کے نزدیک غلامی کے معنی بھوک اور افلاس کے ہیں اور آزادی سے مقصد روٹی کی فراغت ہے ورنہ "مذہب" نہ آج غلام ہے نہ اس کے بعد ہندوؤں کے عہدِ حکومت میں غلام رہے گا۔

ملا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت
ناداں سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اگر ان حضرات کو معلوم ہوتا کہ "اسلام کی آزادی" کے کیا معنی ہیں تو وہ خود سمجھ جاتے کہ جس نظامِ حکومت میں دفاع (محکمۂ فوج) اور امورِ خارجہ جیسے اہم شعبے غیر مسلموں کے اختیار واقتدار میں ہوں۔ اور ایسے قوانین جن کا اطلاق ملک کے تمام باشندوں پر مشترکہ طور پر ہوتا ہو ان کی توضیع وتنقید بھی غیر مسلم کی اکثریت پر مبنی ہو۔ اس نظامِ حکومت میں اسلام کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔ اسلام۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ کا حکم دیتا ہے۔ (کہ حکومت خدا کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی) وہ لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖٓ اَحَدًا کا ارشاد نازل فرماتا ہے (کہ اللہ اپنے اس حقِ حکومت میں کسی اور کی شرکت جائز قرار نہیں دیتا) اس لئے وہی حکومت۔ حکومتِ خداوندی کہلا سکتی ہے جس کے کسی شعبہ میں (چہ جائیکہ ایسے اہم شعبوں میں) غیر مسلموں کی شرکت نہ ہو کر۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

پانچواں اعتراض ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں ہماری ہزارہا مساجد ہیں۔ علیحدگی کی اسکیم کے مطابق یہ تمام معابد چھوڑنے پڑیں گے۔ یہ اعتراض بھی اسی مفروضہ کے ماتحت کیا جاتا ہے کہ اس علیحدگی کی اسکیم کی رُو سے تمام ہندوستان کے کسی اور حصہ میں کوئی مسلمان نہیں رہے گا۔ حالانکہ جیسا کہ متعدد بار لکھا جا چکا ہے، اسکیم زیرِ نظر میں تبادلۂ آبادی کی کوئی شرط نہیں۔ سرِ دست جو جہاں ہے وہیں رہے گا۔ اور اسی طرح مسلم اکثریت کے علاقوں میں اسلامی حکومت کے قیام کا آغاز ہو جائے گا لیکن اگر علیحدگی کی اسکیم کی انتہائی شکل کو بھی سامنے رکھ لیا جائے جس میں اقلیت کے صوبوں کے مسلمان بطیبِ خاطر اسلامی حکومت کی زندگی بسر کرنے کے لئے مسلم اکثریت کے صوبوں میں آنا چاہیں تو اس وقت بھی یہ اعتراض کوئی وقعت نہ رکھے گا۔ نبی اکرم صلعم نے جب ہجرت فرمائی ہے تو کعبہ جیسے مقدس معبد کو کفار کے قبضہ میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ حالانکہ اس سے محبت اور عقیدت کا یہ عالم تھا کہ مدینہ منورہ پہنچ کر حضور کی نگاہِ آرزو رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھتی تھی (قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ) لیکن یہ چھوڑنا دراصل حاصل کرنے کا مقدمہ اور یہ دُور چلے جانا فی الحقیقت قریب آجانے کی تمہید تھا۔ گئے اس لئے تھے کہ پھر آئیں۔ اور آئیں تو اس انداز سے کہ دس ہزار قدوسیوں کی جماعت جلو میں ہو۔ اور فتح و ظفر آگے بڑھ بڑھ کر قدم چوم رہی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ معترض حضرات اس اصل کو سمجھ ہی نہیں سکے کہ جب کوئی قوم صاحبِ حکومت ہوتی ہے تو اس کی ہر شے ہر مقام پر محفوظ ہوتی ہے۔ عیسائی مشنریوں کو دیکھئے۔ دنیا کے ان دُور دراز مقامات میں جہاں ملک غیروں کا ہو۔ حکومت دوسروں کی ہو۔ یہ لوگ تنہا جاتے ہیں اور اپنے گرجے تعمیر کرتے ہیں۔ چونکہ صاحبِ حکومت و اقتدار قوم کے افراد ہوتے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں جو ان کے معابد کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ اس کے برعکس ایک آپ ہیں کہ نو کروڑ کی تعداد میں اس مُلک میں موجود ہیں لیکن اپنی آنکھوں کے سامنے آپ کی مساجد دوسروں کے قبضے میں چلی جاتی ہیں اور آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ مساجد موجود ہیں لیکن ان میں اذان اور نماز کی اجازت نہیں ملتی۔ لیکن آپ ہیں کہ نہایت خاموشی سے سب کچھ دیکھنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ یہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ آپ کی قوتوں

کا ہر ایک کو اندازہ ہے۔ حکومت اپنی ہو تو دیکھئے کہ کونوں اور گوشوں میں پڑی ہوئی مساجد کی بھی حفاظت کس طرح ہو جاتی ہے۔ مساجد کا وقار تو باندازۂ وقارِ اہلِ مساجد ہے۔

تو قدرِ خویش ندانی۔ بہاز تو گیرد   اگرنہ لعل درخشندہ پارہ سنگ است

چھٹا اعتراض

پھر کہا جاتا ہے کہ اقتصادیات کے نقطۂ نظر سے یہ اسکیم ناقابلِ عمل ہے۔ بلوچستان اور سندھ اپنا خرچ آپ پورا نہیں کر سکتے، اس لئے انہیں مرکزی حکومت سے امداد ملتی ہے۔ اگر یہ خطّہ الگ ہو گیا تو انہیں امداد کہاں سے ملے گی۔ پنجاب میں استطاعت کہاں ہو گی جو ان کی کفالت بھی کر سکے۔ نیز سرحد کی حفاظت کے سلسلہ میں جو اخراجات آج مرکزی حکومت برداشت کر رہی ہے وہ بھی اسی خطّہ کو اٹھانے پڑیں گے۔

یہ اعتراض اس مفروضہ پر کیا جاتا ہے کہ حکومت کی مشینری جس قدر (costly) گراں آج ہے اس وقت بھی ایسی ہوگی۔ لیکن یہ حضرات اتنا نہیں سمجھتے کہ اپنی اور غیروں کی حکومت میں اتنا ہی تو فرق ہے۔ ہمیں کیا ضرورت ہوگی کہ یہ بڑے بڑے "سفید ہاتھی" اس وقت بھی علیٰ حالہٖ باندھ رکھے جائیں۔ یہ آٹھ۔ دس ہزار روپیہ ماہوار کے گورنر یہ تین چار ہزار روپیہ ماہوار کے وزیرِ اعظم یہ وزراء۔ یہ چیف سیکرٹریز۔ یہ اسپیکرز۔ یہ ممبرز۔ یہ سب کچھ موجودہ نظامِ حکومت کے کرشمے ہیں۔ جب حکومت اپنی ہو تو پھر ان اخراجات کی کیا ضرورت ہوگی؟ جب کانگریس نے صوبوں کی حکومتیں سنبھالی ہیں تو گاندھی جی نے انہیں نصیحت کی تھی کہ دیکھو تمہارے سامنے حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کی مثال موجود ہے کہ انہوں نے کس طرح شہنشاہی میں بھی اندازِ فقیری کو قائم رکھا تھا۔ ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں کہ کانگریسی وزراء نے کس حد تک اس نصیحت پر عمل کیا۔ لیکن ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے اسوۂ حکومت کے اندر غیر مسلم اپنے لئے سامانِ موعظت دیکھتے ہیں تو خود مسلمان اس اسوۂ کی روشنی میں کیوں نہ چلیں۔ اور اگر مسلمان اس اندازِ حکومت کو اپنے لئے بطور نشانِ راہ قرار دے لیں تو پھر وہ کونسی اقتصادی مشکل ہو

جو حل نہ ہو سکے گی! یہ مشکلات جو آج مسلمان کو اس درجہ پریشان و متوحش کر رہی ہیں۔ بظاہر اقتصادی مشکلات ہیں لیکن بغور دیکھئے تو ان مصائب کا حقیقی سبب کچھ اور ہے یہ چیزیں تو علاماتِ مرض ہیں علتِ مرض نہیں ہیں۔ جب علتِ مرض کا علاج ہو جائے گا تو علاماتِ مرض خود بخود غائب ہو جائینگی۔

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

باب چہارم

غیر مسلموں کے اعتراضات

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں یار ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

سابقہ باب میں ہم نے جن چند موٹے موٹے اعتراضات کا ذکر کیا ہے۔ وہ بالعموم مسلمانوں کی طرف سے وارد کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ ——— کوئی اور بولتا ہے یہ میری زبان نہ سمجھو لیکن کچھ اعتراضات ایسے بھی ہیں جو ہندوؤں کی طرف سے خود ان کی زبان سے عائد کئے جاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان اعتراضات کا بھی تجزیہ کرکے دیکھا جائے کہ ان کی حقیقت کیا ہے

پہلا اعتراض اس باب میں سب سے پہلے مسٹر راجہ گوپال اچاریہ آگے بڑھے اور انہوں نے مختلف مقامات پر آہ وزاری کی کہ دیکھنا! یہ مسلمان کیا حرکت کر رہے ہیں؟ یہ تو بھارت ماتا کے ٹکڑے کر دینا چاہتے ہیں۔ اس اعتراض کی ابتدا گوپال اچاریہ صاحبؒ کی طرف سے ہوئی اور پھر اس کی صدائے بازگشت ملک کے مختلف حصّوں سے سنائی دی۔ چنانچہ اب ہر طرف

سے یہی آواز سنائی دیتی ہے کہ مسلمان بھارت ماتا کے حصے بخرے کر رہے ہیں اور اس چیر پھاڑ کا ماتم کچھ ایسے دردانگیز پیرایہ میں کیا جاتا ہے گویا بھارت ماتا سچ مچ کا ایک انسانی پُتلا ہے کہ مسلمانوں کی سبعیت و بہیمیت جس کی قطع و برید کر دینا چاہتی ہے اور "خون ریزی" کا یہ منظر اس ماتا کے سپوتوں کو لہو رلا رہا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ "بھارت ماتا" ہے کیا چیز! یہ ظاہر ہے کہ انگریزوں نے یہاں پہنچ کر کچھ علاقہ فتح کیا (یونہی کہیے کہ فتح کیا۔ اور کیا کہا جائے) اور اس مفتوحہ علاقہ کی حدود بندی کر کے اسے ایک ملک قرار دے دیا۔ اس ملک کا نام "بھارت ماتا" ہے یعنی یہ ایک اتفاقی امر تھا۔ (یا انگریز کی مصلحت کوشی) کہ انگریز درّہ خیبر تک کا علاقہ فتح کر سکے۔ اس لئے بھارت ماتا وہاں تک پھیل گئی اگر وہ دس میل ادھر رہ جاتے تو ماتا جی بھی سکڑ جاتیں اور وہ اگر دس میل اور آگے بڑھ جاتے تو یہ بھی ساتھ ہی پھیل جاتیں یعنی بھارت ماتا کا قد و قامت جسم اور جثہ اس حدود اربعہ کا نام ہے جہاں تک انگریز بڑھا ہے۔ اب فرمائیے جس بھارت ماتا کا وجود اس انداز سے عمل میں آیا ہو۔ اس کے متعلق یہ دہائی مچانا کہ اس میں کمی بیشی کرنا بڑی "ایتاچاری" ہے کس قدر ابلہ فریبی ہے۔ نیپال کو دیکھئے۔ ایک جنگلی جتنا علاقہ ہے۔ چونکہ انگریزوں نے اسے فتح نہیں کیا۔ ---- ---- اس لئے وہ بھارت ماتا نہیں بن سکا۔ حالانکہ ہر وقت بھارت ماتا کے سینے پر لٹک رہا ہے سیلون کو انگریزوں نے اپنی انتظامی مصلحتوں کی بنا پر الگ رکھا اس لئے بھارت ماتا بیچاری بغیر پاؤں کے ہی رہ گئی۔ کل تک برما بھارت ماتا کا جزو تھا۔ اسے الگ کر دیا گیا تو بھارت ماتا کا ایک بازو کٹ جانے پر بھی کچھ نہ بگڑا۔ کبھی آپ نے سوچا بھی کہ ہندوؤں نے برما کی علیحدگی پر کیوں اتنا واویلا نہیں مچایا، جتنا شمال مغربی علاقہ کی علیحدگی پر مچایا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ برما میں ہندوؤں کی اکثریت سے الگ ہونے پر بھی وہاں ہندوؤں کی حکومت قائم ہو سکتی ہے۔ برعکس اس کے شمال مغربی علاقہ کی علیحدگی پر اس لئے سینہ کوبی ہو رہی ہے کہ یہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ اور ہندو یہ برداشت ہی نہیں کر سکتا کہ مسلمان بھی کسی خطۂ ملک میں اپنی حکومت قائم کر سکیں۔ ہندو تو اس بنا پر بھارت ماتا کے ٹکڑے ہو جانے پر مصروفِ آہ و بکا ہے۔ لیکن ہم پوچھنا چاہتے ہیں ان قومیت پرست مسلمانوں سے جو اس شین و شیون میں ہندوؤں کے ہم نوا ہیں کہ اس تقسیم سے آپ کے دل میں کیا درد اٹھا ہے! محض اس لئے

کہ آپ نے بھی ہندوؤں کی دیکھا دیکھی اس ملک کو مادرِ وطن کہنا شروع کر دیا ہے! ذرا سوچئے تو سہی کہ اسلام کے دعوے کے ساتھ یہ مادرِ وطن کا نظریہ کیا معنی رکھتا ہے! قرآن تو حقیقی ماں باپ کے متعلق ارشاد فرماتا ہے کہ اگر وہ تمہارے خدا کے راستہ میں حائل ہو جائیں اور اس وقت ان کی کشش و محبت تمہارے دل کو ان کی طرف جھکا دے، تو تم مسلمان کہلانے کے مستحق ہی نہیں ہو۔ اور ایک آپ ہیں کہ خاک کے ذرّوں کو اپنی مادر بناتے ہو۔ اور پھر اس مادر کی محبت اس قدر تمہارے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتی ہے کہ اسے جزوِ ایمان قرار دے لیتے ہو! اواخر اپریل میں دہلی میں جو "آزاد" کانفرنس منعقد ہوئی ہے (جس کا تفصیلی ذکر کسی آئندہ باب میں آئے گا۔) اس کے پنڈال میں سٹیج کے سامنے بڑی نمایاں جگہ بڑے بڑے جلی حروف میں لکھا تھا کہ

حُبّ الوطن من الایمان

اور بائیں جانب اتنے ہی بڑے حروف میں تحریر تھا کہ "حیا اور وطن کی محبت ایمان کی نشانیاں ہیں" اور ان "قطعات" کے سایہ میں بڑے بڑے جید علمائے کرام کانفرنس منعقد فرما رہے تھے! کیا کوئی صاحب ان میں سے کسی سے پوچھ کر ہمیں بتا سکتے ہیں کہ آخر—— "حب الوطن من الایمان" یہ ہے کیا! خدا نکردہ کوئی آیتِ قرآنی ہے کوئی حدیث رسول اللہ ہے، خلافتِ راشدہ کا موٹو ہے۔ یہ کیا چیز ہے جسے اتنی اہمیت دی جاتی ہے کہ کلام اللہ کو چھوڑ کر اقوالِ رسول اللہ کو العوذ باللہ پسِ پُشت ڈال کر اسے سب سے نمایاں جگہ آویزاں کیا جا رہا ہے۔ اور پھر "حیا اور وطن کی محبت ایمان کی نشانیاں ہیں" لکھ کر جس سادگی و پرکاری سے عوام کو دھوکا دینے کی ناکام کوشش کی گئی ہے وہ بھی قابلِ غور ہے۔ "حیا ایمان کی شاخوں میں سے ہے"! یہ ایک مشہور حدیث ہے۔ اس کے ساتھ وطن کا ٹکڑا شامل کر کے ان مولوی صاحبان نے جس تدلیس و تحریف کا مکروہ ثبوت دیا ہے۔ وہ ان کی مقدس قباؤں اور متبرک عباؤں کے نیچے چھپے ہوئے دل کی حقیقت کو بے نقاب کر رہی ہے۔ ہم ان اجارہ دارانِ دینِ حنیف سے بادب دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ "وطن کی محبت" کو ایمان کی نشانی اللہ نے قرار دیا ہے یا اللہ کے رسولؐ نے قرار دیا ہے۔ بالآخر یہ کس کا فیصلہ ہے کہ وطن کی محبتِ ایمان کی نشانی ہے۔ حیرت

ہے کہ بازی بازی باریش بابا ہم بازی۔ یہ حضرات اب اس حد تک بے باک ہو گئے ہیں کہ نہ انہیں خدا کا خوف ہے نہ عاقبت کا ڈر۔ دین کے ساتھ مذاق کرتے ہیں اور اس درجہ کھلا ہوا مذاق۔ وطن کی محبت کو ایمان کی نشانی بتاتے ہیں اور پھر اس یکسر غیر اسلامی نظریہ کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں گویا یہ خدا و رسول کا فرمان ہے!

زمن بر صوفی و ملا سلامے کہ پیغام خدا گفتند مارا
ولے تاویلِ شان در حیرت انداخت خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را (اقبالؒ)

ہاں تو یہ ہے حقیقت ہندو کی "بھارت ماتا" اور ان کے ذلہ چین مسلمان کی "مادرِ وطن" کی یعنی اس کا وجود طوق غلامی کے اس حلقہ پر مشتمل ہے جو اسے انگریز نے پہنایا۔ اور اب اسے ایسا مقدس بتایا جاتا ہے کہ اس کے حدود کا تعین گویا خود ایشور پرماتما نے کیا تھا جس میں کوئی انسان ردّو بدل نہیں کر سکتا خودداری اور حمیت کا تو تقاضا یہ ہے کہ ان حدود و قیود کو جس قدر ممکن ہو توڑ کر رکھ دیا جائے کہ یہ حدود در اصل یادگار ہیں انگریز کے عہدِ حکومت کی جسے تم غلامی کا زمانہ کہتے ہو! لیکن جس کی آب و گِل میں خوئے غلامی پیوست ہو چکی ہو۔ وہ غلامی کی یادگار کو مٹائے گا کیوں! اسے مٹائے گا تو مسلمان ہی مٹائے گا جو فطرۃً آزاد ہے۔ اور غلامی جس کے ہاں مسخ شدہ فطرت کی نشانی ہے۔

گاندھی جی کے اعتراضات

اب ہم طوطی پس آئینہ۔ یعنی ان معترضین کے استادِ ازلی جناب گاندھی جی کے اعتراضات کا تجزیہ کرکے دیکھتے ہیں کہ وہ کس درجہ وقیع ہیں۔ وہ حسبِ معمول، اس میدان میں بھی اپنی شانِ مہاتمائیت کے ساتھ وارد ہوئے ہیں۔ چہرہ زرد۔ لب پہ آہِ سرد۔ غم سے نڈھال۔ دونوں ہاتھ سے کلیجہ تھامے۔ افتاں خیزاں تشریف لاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

"میں پوری جرأت و جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناح اور ان کے ہم خیال حضرات۔ اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے۔ بلکہ

وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظ اسلام کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے یہ کچھ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آجکل مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس سے میرے دل پر سخت ٹھیس لگ رہی ہے۔ میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کروں گا اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ بافی سے متنبہ نہ کر دوں جس کا اس نازک وقت میں ان میں پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ (ہندوستان ٹائمز ۸ جولائی ۴۶ء)

اللہ اکبر! مسلمانوں کا درد مہاتما جی کے قلب حزین کو کس درجہ ستا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس غم میں گھلے جا رہے ہیں کہ اسلام کے دامنِ تقدیس پر کوئی دھبہ نہ آجائے۔ مسلمانوں کو کوئی سیدھے راستہ سے بھٹکا نہ دے۔ اللہ رے انداز غمنوازی بھی تم دوست جس کے اس کا دشمن آسمان کیوں ہو۔

اس اثر و درد میں ڈوبی ہوئی تمہید کے بعد اعتراضات ملاحظہ فرمائیے۔ گاندھی جی علیحدگی کی اسکیم کے خلاف براہِ راست اعتراض نہیں کرتے بلکہ وہ اس اصول کے خلاف اعتراض کرتے ہیں جس پہ علیحدگی کی اسکیم مبنی ہے۔ یعنی وہ کہتے یہ ہیں کہ یہ نظریہ سراسر "غیر اسلامی" اور حقائق کے خلاف ہے کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور چونکہ علیحدگی کی اسکیم کی بنیاد ہی اس "مفروضہ" پر ہے کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں اس لئے اذافات الشرط فات المشروط۔ جب یہ ثابت ہو جائے کہ وہ جداگانہ قوم ہی نہیں تو پھر جداگانہ حکومت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا فرماتے ہیں۔

"دو قوموں کا نظریہ بالکل باطل ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت یا تو خود دوسرے مذاہب چھوڑ کر مسلمان ہوئی ہے یا ان کے آباؤ اجداد مسلمان ہوئے تھے۔ اس لئے محض مسلمان ہوجانے سے وہ ایک جداگانہ قوم نہیں بن سکتے۔ بنگال کا مسلمان وہی زبان بولتا ہے جو وہاں کا ہندو بولتا ہے۔ وہی کچھ کھاتا ہے۔ انہی چیزوں سے دل بہلاتا ہے۔ جن سے ان کا ہندو ہمسایہ دل بستگی کے سامان پیدا کرتا ہے۔ ان کا لباس ایک جیسا ہوتا ہے۔ میرے لئے اکثر بیرونی

۵۱

علامات کی بناء پر ایک مسلمان بنگالی اور ہندو بنگالی میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے ...... جب میں نے سر علی امام مرحوم کو پہلی دفعہ دیکھا۔ میں قطعاً محسوس نہ کر سکا کہ وہ ہندو نہیں ہیں۔ ان کی گفتگو۔ لباس۔ آداب و اطوار۔ خوراک سب وہی تھے جو ان ہندوؤں کے تھے جن میں وہ رہتے تھے ...... جب میں پہلی مرتبہ قائداعظم مسٹر محمد علی جناح سے ملا ہوں، تو پہچان ہی نہیں سکا کہ وہ مسلمان ہیں ...... ان کی قومیت تو ان کے چہرے اور آداب و اطوار پر لکھی ہوئی تھی۔ قارئین یہ سنکر حیران ہوں گے کہ میں کئی دنوں تک نہیں مہینوں تک مسٹر پٹیل (آنجہانی) کو مسلمان ہی سمجھتا رہا کیونکہ وہ ڈاڑھی رکھتے تھے اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے ...... پس ہندو اور مسلمان دو قومیں نہیں ہیں جنہیں خدا نے ایک بنا دیا ہو۔ انسان انہیں کبھی دو نہیں بنا سکتا ...... میری روح اس امر کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت دو مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ احیات) کے مذاہب ہیں۔ بس ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مرادف ہے کیونکہ میرا یقینی عقیدہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا خدا ہے۔ اور ہم تمام ایک ہی خدا کے عیال ہیں۔ خواہ ہم کسی نام سے کیوں نہ پکارے جائیں میں اس نظریہ کے خلاف یقیناً بغاوت کروں گا کہ وہ لاکھوں مسلمان جو ابھی کل تک ہندو تھے۔ اسلام قبول کر کے اپنی قومیت بھی بدل بیٹھیں؟ (ہندوستان ٹائمز، روم ۱۱ اپریل ۱۹۴۰ء)

ملاحظہ فرمایئے آپ نے وہ تمام دلائل جن کی بنا پر گاندھی جی کے نزدیک مسلمان ایک الگ قوم نہیں بن سکتے؟ یعنی (۱) ہندوستان کے مسلمان چونکہ نو مسلم ہیں۔ یا نو مسلموں کی اولاد ہیں۔ اس لئے تبدیلی مذہب سے قومیت کی تبدیلی بھی نہیں ہو سکتی۔

(۲) ہندو اور مسلمان چونکہ ایک زبان بولتے ہیں ایک جیسا لباس پہنتے ہیں۔ ایک جیسا کھاتے پیتے ہیں۔ بظاہر دیکھنے سے ایک دوسرے سے پہچانے نہیں جاتے۔ اس لئے ایک قوم کے افراد ہیں۔

(۳) زبان، لباس، خوراک، آداب و اطوار کی یکسانیت کی بناء پر خدا نے انہیں

ایک قوم بنا دیا ہے۔ اس لئے کوئی انسان ان کو الگ الگ قومیں قرار نہیں دے سکتا۔

(۴) قرآن اور گیتا کا خدا ایک ہے۔

(۵) ہم سب ایک ہی خدا کے عیال ہیں۔

(۶) ہندومت اور اسلام ایک ہی کلچر اور ایک ہی نظریۂ زندگی پیش کرتے ہیں۔

اگر آپ کو یہ نہ بتایا جائے کہ یہ دلائل کس کی طرف سے دئیے گئے ہیں تو آپ ان کے طفلانہ پن پر اپنی ہنسی نہ تھام سکیں۔ لیکن چونکہ یہ دلائل اس کی طرف سے ہیں جسے ایک قوم دنیا کا سب سے بڑا انسان مانتی ہے اس لئے مجبوراً انہیں درخورِ اعتنا سمجھنا پڑتا ہے گاندھی جی نے اکثر اس دعوے کا اعادہ کیا ہے کہ انہوں نے اسلام کا مطالعہ کیا ہے۔ قرآن بھی پڑھا ہے اور سیرتِ مقدسہ پر بھی عبور ہے۔ اگر ان کا یہ دعوے صحیح ہے تو حیرت ہے کہ وہ کونسا قرآن اور کونسی سیرت کی کتاب تھی جس کے مطالعے نے انہیں اس نتیجہ پر پہنچا دیا جس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد یہ دلائل انہوں نے اس شرح وبسط سے پیش فرمائے ہیں۔ ہم گاندھی جی کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ سب باتوں سے قطع نظر صرف اسلام کے اوّلین دور کی تاریخ کو سامنے رکھیں اور دیکھیں کہ وہ انہیں کس نتیجہ پر پہنچاتی ہے۔ اس حقیقت سے تو کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ نبی اکرم صلعم نے اسلام کے ذریعہ سے ایک جدید قوم تیار فرمائی تھی جسے ملّتِ اسلامیہ کہا جاتا تھا۔ وہ قوم جسے قرآنِ کریم نے کہیں خیر امتہ کہا۔ کہیں اسے امّتِ وسطیٰ قرار دیا۔ کہیں انہیں حزب اللہ (اللہ کے گروہ) کے لقب سے سرفراز فرمایا۔ اور ہر مقام پر یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (جماعت مومنین) سے مخاطب کیا۔ بہرحال یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ اسلام نے آکر ایک نئی قوم کی تخلیق کی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ نئی قوم بنی کیسے تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام کے تمام مسلمان یکسر نومسلم (Converts) تھے کفر کو چھوڑ کر ایمان لائے تھے۔ پھر ان کے بعد کے مسلمان انہی نومسلموں کی اولاد تھے سو آپ غور فرمائیے کہ اس کے بعد گاندھی جی کی دلیل میں کیا وزن رہ گیا کہ ہندوستان کے مسلمان چونکہ نومسلم ہیں یا نومسلموں کی اولاد ہیں۔ اس لئے وہ تبدیلی مذہب سے قومیت تبدیل نہیں کر سکتے۔ اگر حضرت عمرؓ بن خطاب

اسلام لانے کے ساتھ ہی ایک جدید قوم کے فرد بن گئے تھے اگر حضرت عبداللہ بن عمر ایک نومسلم (Converts) کی اولاد ہونے کے باوجود اُمّتِ مسلمہ کے فرد تھے - اور اپنے والد کی پرانی قومیت سے انہیں کوئی علاقہ نہیں رہا تھا - تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوستان کا نومسلم یا اس نومسلم کی اولاد تبدیلی مذہب کے بعد بھی قومیّت کے لحاظ سے ہندو کیسے رہے گی ! آپ نے غور فرمایا کہ یہ خیال کہ یہاں کے مسلمان کبھی ہندو ہوتے تھے - کس طرح گاندھی جی کے سینہ پر سانپ بنکر لوٹ رہا ہے اور وہ کس طرح تلملا رہے ہیں کہ یہ نومسلم - اگر مذہب کو سر دست نہیں چھوڑ سکتے - تو کم ازکم اپنے دامن قومیّت کو آباؤ اجداد سے وابستہ نہ رکھیں - اس کے بعد انہیں پھر سے ہندو دھرم کے آغوش میں لے لینا مشکل نہ ہوگا -

اب اس کے بعد ذرا زبان - لباس - خوراک - شکل و شباہت کی یکسانیت کو لیجئے جس کی بنا پر گاندھی جی ہندو - مسلمانوں کو ایک قوم قرار دے رہے ہیں اس کے لئے بھی آپ کو اسلام کے دورِ اولیٰ کی تاریخ پر نگاہ ڈالنی ہوگی - کفارِ عرب میں سے جو لوگ مسلمان ہوئے تھے - ان کی زبان وہی تھی - لباس وہی تھا - کھانے پینے کے انداز وہی تھے وہی کھجوریں اور وہی اونٹنی کا دودھ شکل و شباہت ایک جیسی تھی - میدانِ بدر میں ابوجہل اور ابوبکر صدیقؓ ایک جیسا لباس پہنے ایک جیسے ہتھیار باندھے - ایک سی زبان بولتے اور ایک جیسی شکل و شباہت لئے ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے - حتیٰ کہ مسٹر پٹیل آں جہانی کی طرح ابوجہل و ابولہب کی بھی ڈاڑھیاں موجود تھیں - لیکن ان تمام ظاہری یکسانیت کے باوجود ان دونوں (یعنی حضرت ابوبکرؓ اور ابوجہل) کے درمیان ایک اختلافِ عظیم تھا - ایک افتراقِ وسیع تھا - اور وہ اختلاف کفر و ایمان کا اختلاف تھا جو ان دونوں کو دو الگ الگ قوموں میں تقسیم کرکے نسل - رنگ - خون - وطن کے اشتراک کے باوجود شمشیر بکف ایک دوسرے کے مدِمقابل لے آیا تھا - اور اس انداز سے کہ باپ ایک طرف تھا اور بیٹا دوسری طرف - چچا ایک طرف اور بھتیجا دوسری طرف - داماد ایک طرف تھا اور خسر دوسری طرف یہ

تھا اسلامی نقطۂ نظر توموں کی تقسیم کے متعلق۔ ان میں کوئی ذاتی مخاصمت نہ تھی۔ تقسیم جائداد کے جھگڑے نہ تھے۔ خاندانی رقابتوں کی مناقشت نہ تھی۔ اختلاف تھا تو صرف ایک اور وہ تھا فقط کفر اور ایمان کا۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ ایک قوم ہونے کے جس قدر معیار گاندھی جی نے قائم کئے ہیں ان میں سے کونسا معیار تھا جو ابوجہل اور حضرت ابوبکر صدیقؓ میں مشترک نہ تھا۔ لیکن اس اشتراک کے باوجود کیا آج کوئی شخص ایسا ہے جو یہ کہہ سکے کہ (نعوذ باللہ) ابوجہل اور حضرت ابوبکرؓ ایک قوم کے فرد تھے! یہ جس قدر معیار گاندھی جی نے قائم کئے ہیں سب انسانوں کے وضع کردہ ہیں۔ لیکن جس معیار کے مطابق ابوجہل و ابوبکر صدیقؓ مختلف قوموں میں تقسیم ہو گئے تھے وہ معیار خدا کا قائم کردہ تھا۔ لہٰذا جنہیں خدا نے دو قوموں میں تقسیم کر دیا ہو۔ کونسا انسان ہے جو انہیں ایک قوم بنا سکتا ہے! یہ خدائی تقسیم کا ہی تو نتیجہ تھا کہ ایک ہی ملک۔ ایک ہی شہر کے باشندے۔ ایک نسل۔ ایک قبیلہ ایک خاندان کے فرد۔ ایک زبان بولنے والے۔ ایک جیسا لباس پہننے والے ایک جیسی ظاہری شکل و شباہت رکھنے کے باوجود۔ ابوجہل کی لڑکی کی شادی ابوبکرؓ کے لڑکے کے ساتھ نہیں ہو سکتی تھی۔ ناجائز تھی۔ حرام تھی۔ اس وقت بھی حرام تھی اور آج بھی (ایک مسلم اور مشرک کی شادی) حرام ہے لیکن اس کے برعکس۔ اختلافِ وطن۔ اختلاف نسل۔ اختلاف رنگ۔ اختلافِ زبان اختلاف لباس کے باوجود بلالؓ حبشی کے نکاح کے لئے بڑے بڑے سردارانِ قریش اپنے ہاں کے رشتے پیش کرتے تھے۔ یہ کیا تھا! وہی خدا کی تقسیم کہ جونہی ایک شخص نے کہا

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ وہ اپنے سابقہ تمام تعلقات کو منقطع کر کے ایک جدید قوم کا فرد ہو گیا۔ کہ جس طرح دنیا کی کوئی طاقت ایک قطرے کو سمندر سے الگ نہیں کر سکتی اسے بھی کوئی اس نئی قوم سے الگ نہیں کر سکتا!

یہ ہے مہاتما صاحب! اسلام کا معیارِ قومیت۔ یہ زمانہ علم و بصیرت کا عہد ہے اس میں نری مہاتمائیت سے ہندوؤں جیسی پتھر پوجنے والی قوم میں تو کام چل سکتا ہے۔ فہم و دانش رکھنے

والے اِن باتوں سے نہیں بھٹکائے جا سکتے۔ اگر ہو سکے تو کوئی ایسی دلیل پیش کیجئے جو علم و دانش کے معیار پر بھی پوری اترے اور اگر ظاہری یکسانیت ہی معیارِ قومیت ہے تو ذرا مہاتما جی سے پوچھئے کہ جرمنی کے یہودی اور وہاں کے ایک عیسائی میں شکل وصورت۔ لباس۔ وضع قطع۔ زبان وغیرہ میں کیا فرق ہے؟ اس کے باوجود وہ ایک قوم کے افراد نہ بن سکے۔ دور کیوں جائیے۔ ایک انگریز اور ایک جرمن کو لیجئے، کوئی شخص اِن کی ظاہری ہیئت سے ان میں تمیز ہی نہیں کر سکتا لیکن فرمائیے کہ کیا وہ دونوں ایک ہی قوم کے افراد ہیں۔ اور اس پر بھی وہ نہ سمجھے تو اس بُت سے خدا سمجھے۔

پھر آپ فرماتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک قوم ہونے کی یہ بھی دلیل ہے کہ قرآن کا خدا وہی ہے جو گیتا کا خدا ہے۔ سبحان اللہ۔ کیا لاجواب دلیل لاتے ہیں۔

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ذرا ان سے پوچھئے کہ کیا گیتا اور انجیل کا خدا ایک نہیں! اگر ایک ہی ہے تو پھر انگریز اور ہندو مختلف قوموں کے افراد ہیں یا ایک ہی قوم ہیں۔ انگریزوں اور ہندوؤں کو کیوں الگ الگ قومیں قرار دیا جا رہا ہے؟ اور اشتراکِ معبودیّت کے لئے صرف قرآن اور گیتا ہی کو کیوں مخصوص کیا گیا ہے؟ خدا ہی جانے یہ مہاتما جی کس آسمان سے بولتے ہیں۔

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

اور اس بیان کی آخری دلیل تو واقعی اس زمین کی نہیں۔ کسی آسمان سے اتری ہوئی ہے یعنی یہ کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی خُدا کے عیال (Children) ہیں۔ اس لئے ایک ہی قوم کے فرد ہیں۔ یعنی ہندو اور مسلمان ایک خدا کی "اولاد" ہیں۔ اور انگریز۔ جرمنی۔ فرانسیسی اطالوی۔ جبشی۔ روسی یہ نعوذباللہ الگ الگ خداؤں کی مخلوق ہیں۔ اس لئے الگ الگ

قومیت رکھتے ہیں! اور اگر یہ بھی اسی ایک ہی خدا کی مخلوق ہیں۔ تو ساری دنیا کے انسان ایک ہی قوم ہیں۔ ہندو اور مسلمانوں کی اس میں تخصیص کیا ہے! سچ فرمایا ہے شیخ سعدیؒ نے کہ

تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد

اور پھر یہ بھی سنا آپ نے کہ مہاتما جی فرماتے ہیں کہ "یہ تصور کہ اسلام اور ہندو مت دو الگ الگ کلچر اور نظریاتِ حیات کے مذاہب ہیں میری روح میں بغاوت پیدا کرتا ہے۔ یہ تصور خدا کی ہستی سے انکار کے مرادف ہے"

ذرا جمعیت العلماء کو آواز دینا! وہ فرماتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں ایک ایسا شعبہ قائم ہوگا جو مسلمانوں کے مخصوص کلچر اور نظریاتِ حیات کا محافظ ہوگا اور ان سے متعلقہ احکام صرف وہی شعبہ جاری کر سکے گا" ان کے رہبر کا تو فیصلہ یہ ہے کہ یہ خیال کہ اسلام کسی الگ کلچر کا حامل ہے۔ خدا سے انکار کا مرادف ہے!

چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما!

مثلاً مشہور ہے کہ "یہ نتھ بنوانے کو پھرے وہ ناک کاٹنے کو پھرے" یہ حضرات اسلامی کلچر کے تحفظ کے خواب دیکھ رہے ہیں اور مہاتما جی اس تصور ہی کو الحاد و زندیقیت قرار دے رہے ہیں۔ اس کے باوجود ان حضرات کا دعوٰے ہے کہ "تنہا مہاتما گاندھی کی رہنمائی ہمیں منزل مقصود تک پہنچا سکتی ہے"۔

(راشٹرپتی مولانا ابوالکلام آزاد)

یہ ہے برادران! گاندھی جی کے استدلات اور یہ ہے ان استدلات کی حقیقت۔

گاندھی جی اپنے ایک دوسرے مضمون میں لکھتے ہیں۔

"میں ایک تنگ نظر ہندو مت یا تنگ نظر اسلام کا تصور نہیں کر سکتا....

"ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے۔ اور ایک بہت بڑی قوم ہے جو مختلف تہذیبوں پر مشتمل ہے۔ اور یہ تہذیبیں اب ایک دوسری میں مدغم ہونی شروع ہو گئی ہیں..... لیکن مسلم لیگ نے مسلمانوں کو یہ سبق پڑھانا شروع کر دیا ہے کہ یہ تہذیبیں ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہو سکتیں" (ہندوستان ٹائمز مورخہ ۵ مئی ۱۹۴۲ء)

ہمارا خیال ہے کہ اس مضمون میں گاندھی جی نے ہندوستان کی موجودہ سیاسی کشمکش کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کے نقاط نگاہ کو واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ اسلام ایک جداگانہ تشخص رکھتا ہے۔ اپنا الگ امتیازی نشان رکھتا ہے اور یہی جداگانہ تشخص اور الگ امتیازی نشان ہے جسے اسلامی تہذیب کہتے ہیں۔ اور یہی تہذیب ہے جو ہر ہندو کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ اس لئے وہ چاہتا یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اسلام کا یہ امتیازی نشان مٹا دیا جائے۔

مسلمانوں سے پیشتر جتنے لوگ ہندوستان میں آئے۔ ہندوؤں نے ان کے ساتھ یہی کیا۔ ان کی تہذیب کو اپنے اندر مدغم کرنا شروع کیا۔ اور جب وہ اپنے جداگانہ تشخص کو یوں کھو بیٹھے۔ تو خود بخود ہندو قوم کا جزو بن گئے۔ یونانی۔ پارتھین۔ سھتین ہن کتنی مختلف قومیں یہاں آئیں لیکن آج ان کا کہیں پتہ نشان نہیں ملتا۔ ان سب کو یہ اکال الامم نگل گیا۔ مسلمانوں کے ساتھ بھی اس نے یہی کچھ کرنا چاہا لیکن یہ ہڈی ذرا سخت تھی۔ آسانی سے نگلی نہ گئی۔ بایں ہمہ ہندو نے اپنی کوشش نہیں چھوڑی۔ دینِ الٰہی۔ برھمو سماج۔ کبیر پنتھ۔ ست سنگ وغیرہ تحریکیں اسی کوشش ناکام کی مختلف شاخیں تھیں۔ اور یہی کوشش آج "ایک قوم" اور "ایک ملک" کے نئے لباس میں جلوہ پیرا ہو رہی ہے (واردھا کی تعلیمی اسکیم بھی اسی شاخ کا شگوفہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی برہمو سماجی تفسیر بھی اسی زنجیر کی ایک کڑی تھی)۔

یہ تو ہے ہندوؤں کا نقطۂ نگاہ۔ اس کے برعکس مسلم لیگ کا نظریہ۔ خود گاندھی جی کے الفاظ میں یہ ہے کہ مسلمان ایک الگ تہذیب رکھتے ہیں اور یہ تہذیب کسی دوسری تہذیب میں مدغم

نہیں ہو سکتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسلمان کسی دوسری قوم کا جزو نہیں بن سکتے۔ چونکہ لیگ کی یہ روش ہندوؤں کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا رہی ہے اس لئے یہ اس کا اتنا بڑا جرم ہے جو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ مسلم لیگ کا نصب العین کیا ہے! ہندو اس کی مخالفت کیوں کرتا ہے! یہ سب کچھ گاندھی جی نے اپنے ان چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ اب ہم اپنے قومیت پرست حضرات سے بالعموم اور ان میں سے حضرات علمائے کرام سے بالخصوص دریافت کرتے ہیں کہ اس کے بعد ان کے پاس اپنے مسلک کے جواز میں کونسی دلیل رہ جاتی ہے! یہ حضرات ہمیشہ اس امر کا اعلان کرتے ہیں۔ کہ ہم اسلامی تہذیب کے محافظ ہیں۔ ہم ہندوستان کے مستقبل کے نظامِ حکومت میں اسلامی تمدن و تہذیب کے تحفظ کا پورا پورا انتظام کریں گے۔ ذرا غور فرمایئے کہ جو کچھ گاندھی جی فرما رہے ہیں اس کے بعد اسلام کی جداگانہ تہذیب اور اس تہذیب کے تحفظ کا کوئی سوال باقی رہ جاتا ہے! کیا یہی وہ چیزیں نہیں جس کی بنا پر مسلم لیگ گردن زدنی قرار دی جا رہی ہے۔ ہم حیران ہیں کہ یا تو یہ حضرات اس قدر سادہ لوح ہیں کہ اتنی سی بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آسکتی اور یا یہ اتنی گہری سازش ہے جس کے یہ حضرات دیدہ دانستہ کل پرزے بنے ہوئے ہیں! اس کے سوا کوئی تیسری چیز تو ہماری سمجھ میں آتی نہیں

اس کے بعد گاندھی جی اپنے محولہ صدر مضمون میں فرماتے ہیں کہ

"مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ خدا اور بندے۔ اور انسان اور انسان میں رشتہ پیدا کر دے۔ کیا اسلام صرف ایک مسلمان ہی کو دوسرے مسلمان سے ملاتا ہے اور ہندو کی مخالفت سکھاتا ہے! کیا رسول اکرمؐ کا پیغام مسلمانوں کو اپنے اندر ہی امن و سلامتی کی تلقین کرتا تھا اور ہندوؤں اور غیر مسلموں کے ساتھ جنگ کرنا سکھاتا تھا! کیا ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں (کے قلوب) کی پرورش اس چیز سے کی جائے گی جسے میں زہرِ ہلاہل کے سوا اور کچھ قرار نہیں دے سکتا۔ وہ لوگ جو اس زہر کو مسلمانوں کے دلوں میں بھر رہے ہیں۔ وہ اسلام کے ساتھ بہت بڑی بدخواہی کر رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں

کہ اسلام یہ نہیں ہے۔ میں مسلمانوں میں ایک آدھ دن نہیں مسلسل بیس برس سے رہتا چلا آرہا ہوں۔ مجھے تو کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا نہیں بتایا کہ اسلام۔ ہندومت کے مخالف ہے" (ایضاً)

ہم گاندھی جی سے پوچھتے ہیں کہ ان کے اصول کے مطابق تمام انسان ایک جیسے ہیں۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ ان کا دھرم انہیں تمام انسانوں سے محبّت و امن اور سلامتی کی تلقین کرتا ہے! جب ان کا دھرم انہیں یہ سکھاتا ہے تو وہ ہندوستان میں رہنے والوں کو ایک الگ قوم قرار دے کر انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی کیوں لڑ رہے ہیں! کیا انگریز انسان نہیں اور کیا ان کی حکومت انسانوں کی حکومت نہیں ہے! پھر اس حکومت کو لعنت کیوں قرار دیا جارہا ہے۔ کیا یہ ہندوستانی اور انگریز کی تفریق۔ انگریزوں کے خلاف جذبۂ منافرت پیدا نہیں کرتی! کیا گاندھی جی جذبۂ منافرت کی زہر ہندوستانیوں کے دلوں میں نہیں بھر رہے! کیا یہ ایک انسان کو دوسرے سے جدا کرنا نہیں! کیا ان کا دھرم صرف ایک ہندوستانی کو دوسرے ہندوستانی کے ساتھ ملانے کا ہی سبق دیتا ہے۔ گاندھی جی کو یہ کہنا پڑے گا کہ ہندوستانی ایک جداگانہ قوم ہیں اور انگریز ایک جداگانہ قوم۔ اور ان کی یہ تمام جدوجہد انگریز کے خلاف نہیں بلکہ ہندوستانیوں کی تائید میں ہے۔ وہ ہندوستانیوں کو ان کا حق دلانے کی خاطر جنگِ آزادی لڑ رہے ہیں اور یہ کوئی جُرم نہیں! جُرم اس وقت تھا جب انگریز کے ساتھ ظلم کیا جاتا! اس جواب کے بعد مسلمانوں کی پوزیشن کو سمجھیے۔ گاندھی جی کے نزدیک ایک انسان کو دوسرے انسان سے متمیز کرنے کا معیار وطن ہے اس لئے ان کے نظریہ کی رُو سے ہندوستان کے رہنے والے ایک الگ قوم۔ اور انگریز ایک دوسری قوم ہیں۔ اور ایک قوم کو کوئی حق حاصل نہیں کہ دوسری قوم پر غلبہ و تسلّط حاصل کرے۔ اگر کسی نے ایسا کیا ہے تو اس کے خلاف جدوجہد کرنا کوئی جُرم نہیں اسی طرح اسلام نے بھی ایک انسان کو دوسرے انسان سے متمیّز کرنے کا ایک اصول قائم کیا ہے۔ وہ اصول وطنی حدود نہیں۔ بلکہ مذہب ہے۔ جو شخص اسلام قبول کرتا ہے وہ ایک الگ قوم کا فرد ہو جاتا ہے۔ اور جو نہیں کرتا وہ دوسری قوم سے متعلّق ہو جاتا ہے۔ بس اتنا فرق سمجھ لینے کے بعد باقی سب باتیں خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔ مسلمانوں

کے نقطۂ نگاہ سے چونکہ ہندو ایک الگ قوم ہیں اسی لئے وہ ہندوؤں کے غلبہ و تسلّط کو کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ جس طرح گاندھی جی انگریز کے غلبہ و تسلط کو "بدیشی" قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان بھی غیر مسلموں کے غلبہ و تسلط کو (خواہ وہ انگریز کا ہو یا ہندو کا) "بدیشی" (یعنی غیر اسلامی) سمجھنے پر مجبور ہیں۔ اور اس غلبہ و تسلّط کے خلاف پوری پوری جدّ و جہد کرنا ان کے نزدیک جہاد ہے، مقدّس فریضۂ مذہبی ہے۔ جس طرح گاندھی جی کے نزدیک یہ جدّ و جہد ایک قومی اور وطنی فریضہ ہے۔ مسلمانوں کی یہ جدوجہد نہ کسی کی مخالفت ہے، نہ امن و سلامتی کے منافی۔ اس لئے کوئی جرم نہیں۔ جرم اس وقت ہوتا جب یہ دوسروں کے حقوق کو غصب کرتے۔ ان پر ظلم کرتے۔

گاندھی جی انگریزوں سے اپنا حق چھیننے کے لئے یہ جدوجہد کریں تو وہ عین شرفِ انسانیت اور مسلمان ہندوؤں سے اپنا حق واپس لینے کے لئے جدّ و جہد کریں تو یہ انتہائی وحشت و بربریت!

بسوخت عقل زحیرت کہ این چہ بوالعجبی است

باقی رہا اسلام کا (Anti-Hindu) ہونا۔ سو اگر (Anti) کے معنی ایسی مخالفت ہے جس میں ظلم و عدوان پایا جائے۔ تو اسلام دنیا میں قطعاً Anti-Hindu نہیں۔ کسی مذہب کا بھی ایسا مخالف نہیں۔ کسی انسان کا بھی ایسا دشمن نہیں۔ اس لحاظ سے وہ سرتاپا امن و سلامتی کا پیغامبر ہے کہ وہ کسی کو اس کے حق سے محروم نہیں کرتا۔ لیکن اگر (Anti) سے مراد یہ ہے کہ وہ صرف اپنے آپ کو خدا کا سچا مذہب سمجھتا ہے۔ اور کسی کو حق پر نہیں مانتا۔ تو ہمیں اس امر کے اعلان کرنے میں قطعاً تامل نہیں کہ اسلام دنیا کے ہر مذہب۔ انسانوں کے وضع کردہ ہر نظریہ اور اپنے متعیّن کردہ نظام کے سوا دنیا کے ہر نظام کو باطل سمجھتا ہے۔ اس کا اعلان ہے کہ

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ط

اللہ کے نزدیک اگر کوئی دین ہے تو صرف اسلام ہے۔ جو اس کے سوا کسی اور دین کو دینِ حق سمجھتا ہے تو باطل پرست ہے۔ اس کا وہ دین قطعی قابلِ پذیرائی نہیں۔

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ جو اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرے گا تو اس کا وہ دین کبھی قبول نہیں کیا جاوے گا۔ اس نے اپنی بعثت کا مقصد ہی یہ بیان کیا ہے کہ وہ تمام ادیانِ عالم پر غالب آجائے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت یعنی دینِ حق کے ساتھ بھیجا کہ وہ دین تمام ادیان پر غالب آجائے خواہ یہ بات مشرکین کو کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے۔ اس نے آتے ہی اعلان کر دیا کہ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا حق آگیا اور باطل دُور ہو گیا۔ کہ باطل کی تو فطرت ہی یہ ہے کہ حق آئے پر وہ کافور ہو جائے۔

گاندھی جی کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر دس بیس برس کے عرصہ میں کسی مسلمان نے انہیں قرآنِ کریم کی یہ صریح آیات پڑھ کر نہیں سنائیں تو اس نے اسلام کے ساتھ غداری کی ہے۔ اور گاندھی جی کے ساتھ فریب کاری یہ یاد رہے کہ اسلام کا یہ دعوٰے کسی تنگ نظری یا تعصب پر مبنی نہیں۔ بلکہ جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں۔ اسلام دینِ فطرت ہے اور فطرت کا قانون ہمیشہ ایک ہوتا ہے۔ دو متضاد قوانین ایک ہی فطرت کے قانون نہیں ہو سکتے۔ لہذا اگر سنکھیا کے متعلق یہ کہنا کہ وہ ہلاکت کا موجب ہے۔ کوئی تعصب یا تنگ نظری نہیں تو کسی غیر اسلامی (یعنی غیر فطری) نظریۂ زندگی کے متعلق یہ کہنا کہ وہ زندگی بخش نہیں (لہذا باطل ہے) کوئی برائی نہیں "مذہبی جنون" نہیں حق کو حق کہنا عین انصاف ہے۔ خواہ اس سے ساری دنیا ناراض کیوں نہ ہو جائے۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

(مولانا محمد علی مرحوم)

پھر گاندھی جی فرماتے ہیں کہ ذرا ان مسلمانوں کو دیکھئے ان کے نزدیک۔

"ہندو حکومت کے ماتحت رہنا گناہ ہے حتیٰ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ حکومت بھی ان کے نزدیک ناقابلِ تصوّر ہے" (ایضاً)

لیکن مہاتما جی نے اتنا نہیں سوچا کہ خود ان کی اپنی کیا حالت ہے۔ پاکستان میں مسلمانوں کی حکومت کا تصوّر ان کا خون کھولا رہا ہے حتیٰ کہ انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ اس اسکیم کی مخالفت میں اپنے اہمسا کی پوری توتیں صرف کر دیں گے۔ حالانکہ گاندھی جی پر اس کے متعلق کوئی مذہبی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ہم باب اوّل میں لکھ چکے ہیں کہ ان کے نزدیک کسی غیر مسلم کی حکومت کے ماتحت رہنا گناہ ہی نہیں بلکہ غیر اسلامی زندگی ہے۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ حکومت کا تصور بھی روحِ اسلامی کے منافی ہے۔ اِس لئے مسلمان اگر ایسی حکومت کے ماتحت رہنے کو گناہ سمجھتے ہیں تو بالکل حق بجانب ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ویسی ہی غلامی ہے جیسی انگریز کی خواہ یہ خالص ہندوؤں کی حکومت ہو یا ایسی حکومت جس میں اکثریت ہندوؤں کی ہو دونوں قرآن کی رُو سے ناجائز اور اس لئے مسلمانوں کے لئے ناقابلِ قبول ہیں۔ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ؕ مصیبت یہ ہے کہ گاندھی جی۔ یا ان کے ہمنوا حضرات کو اسلام کے متعلق واقفیت تو کچھ ہے نہیں۔ اور دعوےٰ ہمہ دانی کا کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ مصیبت کہ مسلمانوں میں سے جو لوگ ان کے حاشیہ نشین ہیں وہ بھی یا تو روحِ اسلامی سے بالکل کورے ہیں یا اگر اس سے واقف ہیں تو اس جرأتِ ایمانی سے محروم ہیں جو ان میں حق گوئی کی قوت پیدا کر دے نتیجہ یہ کہ گاندھی جی آئے دن اس قسم کے فتاویٰ صادر فرماتے رہتے ہیں کہ فلاں چیز اسلام کے خلاف ہے اور فلاں نظریہ اسلام کے عین مطابق ہے۔ اور قومیّت پرست علماء کرام "سب کچھ سُنتے ہیں۔ اور ایک لفظ تک اپنی زبان پر لانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہندو اربابِ سیاست کو اسلام کی صحیح تعلیم سے آگاہ کیا جائے تو اس کے بعد وہ اپنے خفیہ منصوبوں کو اسلام کے نقاب میں پیش کرنے کی جرأت تو نہ کر سکا کریں۔ لیکن آج یہ کون کہے۔ ایک کہنے والے تھے

انہیں بھی کارپردازانِ قضا و قدر نے ہم سے چھین لیا۔ سچ کہا تھا اس مردِ قلندر نے کہ

از تب و تابم نصیبِ خود بگیر

بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر

(اقبالؒ)

پھر گاندھی جی فرماتے ہیں۔

"اگر پاکستان محض ایک دھمکی ہی نہیں بلکہ ایک قابلِ قبول (Desirable) نصب العین ہے تو پھر اس کی مخالفت کیوں کی جائے۔ لیکن اگر یہ ناقابلِ قبول (Undesirable) ہے اور اس سے مقصد محض یہ ہے کہ مسلمان اس کی آڑ میں زیادہ کچھ حاصل کریں تو پھر اس کا کوئی حل بھی ہو، وہ ناانصافی پر مبنی ہوگی اس لئے میں بیٹھا دیکھ رہا ہوں کہ کب یہ بتیا دُور ہو" (ایضاً)

"زیادہ حاصل کرنے" کا طعنہ بھی آپ نے سُنا؟ ایک کم تولنے والے بنیا سے اگر آپ لڑ جھگڑ کر پورے تول کا سودا خرید لیں۔ تو آپ کے معیار کے مطابق وہ پورا ہوگا۔ لیکن بنیا کے نزدیک وہ زیادہ ہوگا۔ مسلمان چاہتے کیا ہیں۔ فقط اتنا کہ جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہاں ہندوؤں کی حکومت ہو اور جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں مسلمانوں کی حکومت ہو اور گاندھی جی کے نزدیک مسلمان ڈرا دھمکا کر زیادہ کچھ حاصل کرنے کی ٹھان رہے ہیں۔ گاندھی جی کے نزدیک "پورا تول" تو اس وقت ہوگا جب مسلمان خاموشی سے اکثریت کی حکومت قبول کریں اور اس کو آزادی قرار دیدیں! لیکن گاندھی جی سے کہدیجئے کہ وہ سوداگر گئے جو اس قسم کے سودے کیا کرتے تھے۔

اس عہد میں ہے اور ہے جام اور ہے جم اور

ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور

غیر مسلم اقلیتیں

اس اسکیم کی مخالفت میں جو سب سے بڑا حربہ استعمال کیا جارہا ہے وہ غیر مسلم اقلیتوں کو یہ کہکر مشتعل کرنا ہے کہ اس اسلامی حکومت میں تمہارے حقوق پامال ہوجائیں گے۔ اس لئے تمہیں پُورے زور اور قوت کے ساتھ اس کی مخالفت کرنی چاہئے چنانچہ اس باب میں پنجاب کے سکھوں کو بہت زیادہ بھڑکایا جارہا ہے۔

قرآنی حکومت میں غیر مسلموں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا جاتا ہے۔ اس کا جواب ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں دینا چاہتے۔ یہ حکومت ضابطۂ قرآنی کے ماتحت ہوگی۔ اس لئے اس کے جواب کے لئے قرآنِ کریم کا مطالعہ کرلینا کافی ہے۔ قرآن کوئی "گپت ودیا" (علمِ مخفی) نہیں ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں اس کے تراجم موجود ہیں جس کا جی چاہے اٹھاکر دیکھ لے کہ اس کی رُو سے غیر مسلموں کو کس درجہ آزادی حاصل ہوگی۔ "اسلام اور مذہبی رواداری" ایک کتابچہ کا عنوان ہے اور اس عنوان پر ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے ایک مفصل پمفلٹ شائع ہوچکا ہے اس کے مطالعہ سے آپ پر یہ حقیقت بے نقاب ہوجائے گی کہ قرآنی حکومت میں غیر مسلموں کے ساتھ کس قدر عدل وانصاف کا سلوک ہوگا۔ ایسا سلوک کہ جب حمص کی عیسائی رعایا کو یہ معلوم ہوا کہ مسلمان اس شہر کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جارہے ہیں تو وہ روتے تھے اور منّتیں کرتے تھے کہ خدا کے لئے تم نے جلدی واپس آجانا۔ کہیں ہمیں دوبارہ رومیوں کے ماتحت نہ ہوجانا پڑے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ رومی کون تھے؟ عیسائی تھے! یعنی عیسائی رعایا یہ کہہ رہی ہے کہ ہم مسلمانوں کی حکومت میں رہنا چاہتے ہیں۔ عیسائیوں کی حکومت میں نہیں رہنا چاہتے۔ حسنِ سلوک اور تحفظِ حقوق کی اس سے بڑھکر اور کیا مثال ہوسکتی ہے!

قرآنِ کریم تو یہاں تک حکم دیتا ہے کہ

لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا۔ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو۔

یعنی اسلام تو دشمن سے بھی عدل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ چہ جائیکہ وہ لوگ جن کی حفاظت

کی ذمہ داری اس نے خود لے لی ہو۔ اس باب میں قرآنِ کریم۔ احادیث۔ آثار وشواہد اس کثرت سے موجود ہیں کہ ان کی موجودگی میں کسی شخص کو مجال انکار نہیں ہوسکتی کہ اسلام اپنی غیر مسلم رعایا سے کس حسن سلوک کا برتاؤ کرتا ہے۔

علاوہ بریں۔ ذرا ایک ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اگر تمام ہندوستان میں جمہوری نظامِ حکومت قائم کیا جائے تو ہندو اکثریت۔ اقلیتوں کے تحفظِ حقوق کی ذمہ دار ہوگی یعنی وہ ہندو جس کے مذہب میں کوئی غیر ہندو انسان بھی نہیں کہلا سکتا۔ اسے "ملیکش" کہا جاتا ہے۔ وہ غیر ہندوؤں کے حقوق کی نگہداشت کریں گے! وہ ہندو جن کی حالت یہ ہے کہ انہوں نے ہزارہا سال سے کروڑوں اچھوتوں کو انسانیت کے حقوق سے محروم کر رکھا ہے اور ان کا یہ سلوک ان کے ذاتی رجحانات کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کا مذہب انہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ ایسا ہی کریں۔ ان ہندوؤں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ان پر پورا پورا اعتماد کرو۔ یہ اقلیتوں کے ساتھ مساوات کا سلوک کریں گے۔ ان سے پوچھئے کہ آپ نے آج تک خود "اپنوں" کے ساتھ کیا کیا ہے جو دوسرے آپ پر بھروسہ کریں!

تو بہ خویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری
بخدا کہ لازم آید زتو احتراز کردن

ان ہندوؤں پر تو بھروسہ کرو لیکن مسلمانوں پر بھروسہ نہ کرو جن کا مذہب انہیں حکم دیتا ہے کہ وہ کبھی کسی حال میں بھی جادۂ عدل وانصاف سے ادھر ادھر نہ ہونے پائیں۔ وہ مسلمان جن کی تاریخ کے اوراق آج بھی دنیا کو بتا رہے ہیں کہ انہوں نے اپنی حکومت میں غیروں کے ساتھ کیا سلوک کیا! وہ مسلمان جن کی عطا کردہ جاگیریں آج بھی ہندوؤں کے سینکڑوں مندروں کی کفالت کا موجب ہیں۔ وہ مسلمان جن کا قرآن انہیں حکم دیتا ہے کہ غیر مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت بھی اسی طرح کرو جس طرح تم اپنی مساجد کی حفاظت کرتے ہو۔ القرآن وہ جن کا مذہب انہیں تلقین کرتا ہے کہ غیر مذہب کے معبودوں (بتوں تک) کو بھی گالی نہ دو۔

وہ مذہب جو انسانیت کا اس درجہ احترام سکھاتا ہے کہ اس کے نزدیک کسی ایک جان کا ناحق ضائع کرنا گویا تمام نوعِ انسانی کو ہلاک کر دینا۔ اور کسی ایک نفس کا بچا لینا۔ تمام انسانیت کو زندگی عطا کر دینا ہے (القرآن)

کہا جا سکتا ہے کہ جب مسلمان یہ کہتے ہیں کہ انہیں غیر مسلم اکثریت کی حکومت میں مذہب کی آزادی نہیں مل سکتی تو غیر مسلم اقلیتیں یہ کیسے باور کر لیں کہ انہیں مسلم اکثریت کی حکومت میں مذہب کی آزادی مل جائے گی۔ اعتراض بظاہر معقول نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے جواب کے لئے ذرا باب اوّل پر ایک نگاہ پھر سے ڈالئے اور دیکھئے کہ ایک مسلمان کے نزدیک "مذہب کی آزادی" کا مفہوم کیا ہے اور ایک غیر مسلم کے نزدیک مذہبی آزادی کسے کہتے ہیں۔ مسلمان کا مذہب اس کی حکومت ہے اور مذہبی آزادی سے مفہوم ایک آزاد حکومت کا قیام ہے۔ برعکس اس کے دیگر اہلِ مذاہب میں مذہب سے مفہوم چند عبادات و رسومات کی ادائیگی ہے۔ اس سے آگے امورِ دنیاوی کی حدود شروع ہو جاتی ہیں۔ آپ نے آج تک کسی ہندو۔ سکھ۔ پارسی وغیرہ کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا ہوگا کہ انگریز کے عہدِ حکومت میں انہیں مذہبی آزادی حاصل نہیں ہے! ملکہ وکٹوریا کے منشور (MAGNA CARTA) میں جس قسم کی مذہبی آزادی کا اعلان کیا گیا تھا۔ وہ آزادی تمام غیر مسلم اہلِ مذاہب کے معیار پر پوری اترتی ہے۔ اس قسم کی مذہبی آزادی اسلام بھی دیتا ہے اور صرف آزادی ہی نہیں دیتا بلکہ ان کی حفاظت بھی اپنے ذمہ لیتا ہے۔ برعکس اس کے مسلمان کو دنیا میں کوئی حکومت مذہبی آزادی نہیں دے سکتی کہ ان کا مذہب آزاد نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ حکومت بھی ان کے اپنے ہاتھ میں نہ ہو۔ یہ ہے بنیادی فرق اسلام کی آزادی اور دیگر مذاہب کی آزادی میں اس لئے تمام غیر مسلم اقلیتوں کو بالکل مطمئن رہنا چاہیئے کہ مسلمان تو از روئے مذہب مجبور ہے کہ وہ انہیں مذہبی آزادی دے۔ اور اس آزادی کی ضمانت کے لئے وہ جس قسم کی شرائط چاہیں ان سے لکھوا لیں۔ انہیں کسی قسم کا اعتراض ہی نہ ہوگا۔ بلکہ ان شرائط کی پابندی تو ان پر بطور فریضہ مذہبی لازم ہوگی۔ مسلمان حاکم نہیں ہوتا۔ تحفظِ حقوقِ انسانیت کے لئے چوکیدار ہوتا ہے! اور خوف

چور سے ہوتا ہے چوکیدار سے نہیں!

بابِ پنجم

آزاد مسلم کانفرنس کے اعتراضات

چہ گویمت ز مسلمانِ نامسلمانی — جز ایں کہ پورِ خلیل است و آزری داند

کانگریس نے مسلم لیگ کی اسکیم زیرِ نظر کی مخالفت فرداً فرداً ہر ایک قومیت پرست سے کرائی۔ لیکن اس نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ یہ انفرادی ہنگامہ آرائی بالکل بے نتیجہ ہے کیونکہ لیگ کی اسکیم کی تائید ایک اجتماعِ عظیم نے کی تھی جس میں اطراف و اکنافِ ملک کے مسلم نمائندے شامل تھے۔ اس لئے سوچا گیا کہ کوئی ایسی صورت اختیار کی جائے کہ ان قومیت پرست حضرات کی آواز کو بھی جمہور کی آواز بنا کر دکھا دیا جائے۔ لیکن اس تجویز کے راستہ میں سب سے بڑا روڑا خود قومیت پرستی کا لیبل تھا۔ کیونکہ یہ حقیقت اب ایک دنیا پر ثابت ہو چکی ہے کہ قومیت پرستی ہندو پرستی کا ہی دوسرا نام ہے۔

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز ہے

اس لئے سب سے پہلے گراموفون کے ان ریکارڈوں سے قومیت پرستی کا پرانا لیبل کھرچا گیا۔ اور اس کی جگہ "آزاد مسلمان" کا نیا لیبل لگایا گیا۔ پھر ان آزادگانِ مذہب و ملّت کو اواخر اپریل میں دہلی کے مرکزی مقام میں جمع کیا گیا۔ اور ہندو اخبارات نے چاروں طرف اس اجتماع کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا۔ کہیں سرخیلِ آزادگان جناب خان بہادر اللہ بخش کے متعلق لکھا

گیا کہ ایک ازدہامِ عظیم نے ان کا خیر مقدم کیا۔ حالانکہ ان بڑے بڑے مولوی صاحبان سے پوچھئے کہ سوائے ان سات آٹھ حضرات کے۔ جن کا فوٹو خان بہادر صاحب کے ساتھ چھپا ہے۔ کوئی اور اسٹیشن پر موجود بھی تھا؟ (واضح رہے کہ یہ بڑھ بڑھ کر فوٹو کھنچوانے والے حضرات وہی علمائے کرام ہیں کہ فوٹو کی حرمت کے متعلق جن کے فتاوی آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں) کہیں صدر کانفرنس کے جلوس میں چالیس ہزار نفوس بتائے گئے۔ کہیں جلسہ کے متعلق لکھا گیا کہ پنڈال کے اندر پچاس ہزار کا مجمع تھا۔ اور اگر پنڈال سے باہر کے لوگ بھی شامل کر لئے جائیں تو ایک لاکھ کا اجتماع سمجھئے (اس لئے کہ ان پروپیگنڈہ کرنے والوں نے دیکھا تھا کہ مسلم لیگ کے جلسہ میں اتنا ہی اجتماع تھا۔ اس سے انہوں نے یہ ثابت کرنا چاہا کہ یہ کانفرنس بھی لیگ سے کچھ کم نمائندہ حیثیت نہ رکھتی تھی) حالانکہ دہلی والے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے ان اجتماعات کو دیکھا تھا۔ خوب جانتے ہیں کہ پنڈال کتنا بڑا تھا۔ اور اس میں حاضرین کی تعداد کس قدر تھی۔ اور اگر ان میں سے عربی مدارس کے ان طالب علموں کو الگ کر دیا جائے جنہیں خاص طور پر جلسہ میں لایا گیا تھا۔ اور ہندوؤں کو بھی خارج کر دیا جائے تو پھر باقی یا تو پنڈال رہ جاتا ہے یا اس کے منتظمین دمندوبین۔ یہ اجتماع یوں منعقد کرایا گیا۔ اس کی غرض و غایت کیا تھی؟ یہ ان قاری صاحبؒ نے بتا دیا جنہوں نے جلسہ کی کارروائی کا افتتاح قرآنِ کریم کی ان آیاتِ مقدسہ سے کیا۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ ۝

اور یہ (حق سے) انکار کرنے والے (آپس میں) کہتے ہیں کہ اس قرآن (کی آواز) کو مت سنو بلکہ (ایسے وقت میں) خوب شور مچاؤ۔ شاید (اس طریقہ سے) تم کامیاب ہو جاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مولوی صاحبان قرآنِ کریم کو محض تبرکاً اور رسماً پڑھ دیتے ہیں۔ اس لئے معانی کی طرف کبھی ان کی نگاہ ہی نہیں اٹھتی۔ ورنہ وہ خود محسوس کرتے کہ ان کے اس شور و غوغا کے متعلق قرآنِ کریم کی بارگاہ سے کیا فتویٰ صادر ہو رہا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب قاری صاحبؒ اس سے آگے چوتھی آیت پر پہنچے ہیں تو ہم قرآنِ کریم کے اس اعجاز پر

وجد کر رہے تھے کہ وہ کس طرح ان حضرات کی زبان سے غیر شعوری طور پر حقیقت کا اعتراف کرا رہا ہے۔ انہوں نے پڑھا کہ

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ○

اور یہ (حق سے) انکار کرنے والے (قیامت میں) کہیں گے کہ یا اللہ! ذرا ہمیں جن وانس میں سے ان لوگوں کو دکھا دے جنہوں نے ہمیں گمراہ کر دیا تھا۔ کہ ہم انہیں اپنے پاؤں تلے روند ڈالیں اور انہیں یوں ذلیل وخوار کریں۔

اور پانچویں آیت میں تو حق پر چلنے والوں کے لیے تسکین وطمانیت کی ایک کھلی ہوئی بشارت تھی

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○

(اور) جن لوگوں نے کہدیا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اور پھر اس پر جم کر کھڑے ہو گئے (ان کے قلوب کو تسکین وطمانیت دینے کے لئے) ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ مت خوف کھاؤ۔ بالکل نہ گھبراؤ۔ اور اس جنت کی بشارت لو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

ان آیات کی تلاوت تو رسماً کرا دی گئی لیکن اس کے بعد (نہ حمدِ خدا نہ نعتِ رسول بلکہ) یکے بعد دیگرے وطن کے دیوتا کے چرنوں میں عقیدت وارادت کے پھول چڑھائے گئے۔

"جھنڈا رہے بلند ہمارا بڑھے وطن کی شان" اور "اے وطن اے وطن۔ اے وطن" کی قسم کے قومی ترانے گائے گئے۔ اور جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ ہم تین دن برابر دیکھا کئے کہ بالآخر یہ علماء حضرات کا مجمع ہے۔ اس میں کسی گوشہ سے قال اللہ۔ قال الرسول کی آواز بھی اٹھتی ہے۔ یا نہیں لیکن سنئے اور حیران ہو جئے کہ سارے جلسہ کی کارروائی میں کسی شخص کی زبان پر نہ اللہ کا نام آیا نہ اس کے رسول کا نام۔ نہ اسلام کا ذکر آیا نہ اس کی ناموس کا۔ "وطن پر مصیبت آگئی ہے" "بھارت ماتا گرداب بلا میں گھر چکی ہے" "قوم پر غربت

وافلاس کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ ہندی بھوکوں مر رہے ہیں اور اس قسم کے دیگر "مقدس "مقتضیات" تھے جن کی بنا پر، مسلمانوں کے جذبات ابھارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہم نے مضمونِ زیرِ نظر کی اشاعت کو مئی کے رسالہ سے قصداً روک لیا تھا کہ اس کانفرنس کے اعتراضات کو بھی دیکھ لیا جائے لیکن ہمیں اب افسوس ہوا کہ اس کی اشاعت میں یونہی تاخیر روا رکھی۔ کانفرنس میں لفظاً لفظاً انہی اعتراضات کو دہرایا گیا جو اس سے پیشتر مختلف کانگریسی لیڈروں کے زبان وقلم سے نکل چکے تھے البتہ فرق یہ تھا کہ اربابِ کانفرنس کے لب ولہجہ میں ہندوؤں کے مقابلہ میں تلخی زیادہ تھی۔ صدر استقبالیہ کمیٹی نے علیٰحدگی کی اسکیم کو "نامعقول" اور ایسے دماغ کی تخلیق قرار دیا جو "غصہ کی وجہ سے ماؤف ہو چکا ہو" اور اپنے فیصلہ کی تائید میں کسی ایک دلیل کے پیش کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ اسی طرح جنابِ صدر نے اسے "مہمل اور نقصان رساں" قرار دے کر یہ تصور کر لیا کہ انہوں نے دلائلِ قاطع وبراہینِ ساطع سے اس اسکیم کی تردید فرما دی ہے۔ جو کچھ ان تین چار روز میں کہا گیا ہے۔ اس کا ملخص حسبِ ذیل ہے۔ پہلے جنابِ صدر کے ارشادات کو لیجئے۔ وہ اپنے خطبۂ صدارت میں فرماتے ہیں۔

(۱) اسلام کا عالمگیر پیغام الگ الگ قوموں کو اپنا ہم خیال بنا کر ان کی قومی وحدتوں کو ختم نہیں کر دیتا۔ مثال کے طور پر اگر جرمنی۔ انگلستان۔ فرانس۔ جاپان کے رہنے والے مسلمان ہو جائیں تو کیا یہ لازم آئے گا کہ وہ اپنی قومیت سے دستکش ہو جائیں۔ اپنی معاشرت کو بدل دیں۔ اور اپنے تمدّن کو خیرآباد کہدیں۔ اسلام اگر تمام انسانیت کے لئے ہے اور اسلام کا خدا سب قوموں کا خدا ہے۔ تو کسی خاص نسل۔ یا قوم۔ یا ملک تک اس کی وسعت کو محدود کر دینا کیسے ممکن ہے۔ اسلام نسلوں سے بالاتر ہے۔ فرقوں اور قوموں سے بالاتر۔ اور جغرافی اور ملکی حدود سے بالاتر ایک عالمگیر نظام کا نام ہے۔ اور یہ ایک کھلا ہوا دھوکا ہے اور ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بے حد نقصان دہ اور تباہ کر دینے والا ہوگا اگر آج ہمیں مذہب کی بنیاد پر الگ الگ قومیں بنانے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ صث

ملاحظہ فرمالی آپ نے اس مفسرِ سندھی کی تفسیرِ اسلام ؟ افسوس خان بہادر صاحب پر نہیں کہ ان بچاروں کو کیا معلوم قرآن کیا ہے۔ افسوس ہے ان علماء عظام پر جو ان ارشادات کو سُن سنکر وجد و مسرّت سے جُھوم رہے تھے۔

جناب خان بہادر صاحب! جرمنی۔ انگلستان۔ فرانس یا جاپان کے رہنے والے اگر آج مسلمان ہو جائیں تو انہیں ان قومیتوں سے سب سے پہلے دستکش ہونا پڑے گا جن کی بُنیاد انسانی ہاتھوں نے نسلی اور جغرافیائی حدود پر رکھی ہوئی ہے جب اسلامی وحدت پیدا ہوتی ہے تو یہ غیر اسلامی تحزب و تشیع جسے آپ قومی وحدتیں قرار دے رہے ہیں سب فنا ہو جاتی ہیں۔ صہیبؓ رومی۔ بلال حبشیؓ۔ سلمان فارسیؓ حضرت عمر عربیؓ جب اسلام لائے تھے تو ان سب کی الگ الگ "قومی وحدتیں" اس ایک عالمگیر وحدت میں جذب ہوگئی تھیں جسے ملّتِ اسلامیہ کہتے ہیں۔ آج آپ کی سمجھ میں یہ بات اس لئے نہیں آسکتی کہ آپ نے مغرب کے معیارِ قومیت کو "خدائی قانون" مقرر کر رکھا ہے۔ اس لئے آپ جس وقت بھی سوچتے ہیں تو اسی قانون کی حدود و قیود کو سامنے رکھکر سوچتے ہیں۔ اگر آپ قرآن کو سامنے رکھکر کچھ سوچتے تو اس بات کا سمجھ لینا زیادہ مشکل نہ تھا

بیاں میں نکتۂ توحید آتو سکتا ہے ترے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہئے

لیکن یہ بُت خانہ انہی کے دماغ کا نہیں اس کی ابتدا تو اس دن ہوئی تھی جب ایک بہت بڑے شیخ الحدیث نے فتویٰ ارشاد فرمایا تھا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" اور پھر یہ بھی سُن رکھیئے کہ جب دُنیا کی کوئی قوم اسلام لائے گی تو اسے اپنی معاشرت و تمدّن کے ہر اس عنصر کو چھوڑ دینا پڑیگا جس کی رُوح۔ اسلام کی رُوح کے خلاف ہوگی۔ خواہ وہ معاشرت آپ کی نگاہ میں کیسی حسین و جاذب نظر کیوں نہ ہو۔ ہاں یہی تو وجہ ہے کہ اسلام وطن کی چار دیواری یا نسلی امتیازات کی آب و گل میں محبوس نہیں ہو سکتا کہ اس کا خدا تمام ملکوں اور قوموں کا خدا ہے۔ اور یہ پابندیاں اس کی لامحدود وسعت کو محدود کر دیتی ہیں۔ اسلام واقعی۔ جغرافیائی اور ملکی حدوں سے بالاتر ایک نظام کا نام ہے۔ "سوچئے آپ کیا کہہ رہے ہیں اور اس کے بعد نتیجہ کیا نکال رہے ہیں!"۔

اس کے بعد بھی آپ اگر سمجھتے ہیں کہ "مذہب کی بناء پر الگ الگ قومیں بنانے کی دعوت

ایک دھوکہ ہے۔ اور نقصان رساں اور تباہ کن دھوکا ہے۔ تو یہ آواز نئی نہیں ہے۔ یہ آواز بھی ظہورِ اسلام کے ساتھ ہی پیدا ہوگئی تھی۔ اس وقت بھی یہی کہا گیا تھا کہ

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ ۔۔۔ از دمِ اُو کعبہ را گُل شد چراغ!

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب ۔۔۔ از قریش و منکر از فضلِ عرب

در نگاہِ او یکے بالا و پست ۔۔۔ با غلامِ خویش بر یک خواں نشست

قدرِ احرارِ عرب نشناختہ ۔۔۔ با کلفتانِ حبش در ساختہ

احمراں با اسوداں آمیختند ۔۔۔ آبروئے دودمانے ریختند

(جاوید نامہ ۔ نوحہ رُوحِ ابوجہل درحرم کعبہ)

احمر و اسود کا یہی امتیاز تھا جسے قائم رکھنے کے لئے اس وقت واویلا کیا گیا تھا اور اسی امتیاز کو قائم رکھنے کے لئے آج یہ شور اٹھایا جارہا ہے کہ ایک انگریز اسلام لانے کے بعد اپنی قومیت سے دستکش نہیں ہوسکتا۔" غور فرمائیے! کیا ان دونوں آوازوں میں کچھ بھی فرق ہے۔

بدل کے بھیس زمانہ میں پھر سے آتے ہیں۔ اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

(۲) متحدہ قومیت کے متعلق دوسری دلیل ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے۔

"ہیر رانجھا۔ سسی پنوں کے قصے جن کے لکھنے والے مسلمان تھے۔ آج سندھ اور پنجاب مسلمان ہندوؤں سکھوں سب کا مشترکہ سرمایہ ہے اور سب بغیر کسی اختلاف کے ان کو پڑھتے۔ ان سے حظ اٹھاتے۔ اور ان کو اپنا سمجھتے ہیں (صفحہ ۹)۔

سبحان اللہ! کیا مسکت دلیل ہے! کیوں صاحب! اگر کوئی انگریز یہ کہدے کہ شکسپئر و ملٹن کو آج تمام ہندوستانی مزے لے لیکر پڑھتے ہیں۔ اور ان سے حظ اٹھاتے ہیں۔ اس لئے انگریز اور ہندوستانی ایک ہی قوم ہیں۔ لہٰذا انگریزوں کی حکومت کو اپنی ہی قومی حکومت سمجھو! تو فرمائیے جناب خان بہادر صاحب اس کا کیا جواب بن پڑیگا

(۳) پھر ارشاد ہے

"ہندوستان ایک نہ تقسیم ہونیوالی جغرافی وحدت ہے۔" اس کے لئے دلیل! کیا قرآن کریم میں ایسا لکھا ہے!

(۴) فرماتے ہیں:۔

"ہم سب اس سارے ملک کے مالک ہیں۔ اور کوئی تبلیغی ڈھونگ اور سیاسی فریب ہمیں اس عقیدہ سے نہیں ہٹا سکتا۔" (صفحہ ۱۵)

مالک تو ضرور ہیں لیکن جب ملکیت سے متمتع ہونے کا وقت آتا ہے تو پھر اسکی کیفیت اس گائے کی سی ہو جاتی ہے جس کے سینگ مسلمانوں کے حصہ میں آتے ہیں۔ اور دودھ ہندو دوہتا ہے۔ اور پھر آپ نے "تبلیغی ڈھونگ" اور "سیاسی فریب" کے الفاظ پر بھی غور فرمایا؟

---

(۵) اسلامی حکومت کے قیام کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"ہندو اور مسلم حکومت کے خواب جو آج بعض لوگ دیکھ رہے ہیں انکی پوشیدہ آرزوؤں کی آخری مُہر ہے..... یہ جاہ پرست طبقہ اپنی آنکھیں کھولے اور جاہ پرستی کا انجام دہلی کے کھنڈروں میں دیکھ کر اپنی حرکتوں سے باز آئے بدقسمتی سے دوسروں کو گرا کر خود آگے بڑھنے کی ہوس اور دوسروں پر کھُلم کھُلا کسی داؤ فریب سے حکومت کرنے کا ولولہ جاہل اور غیر مہذب لوگوں کو بہت پسند ہوتا ہے..... جو دوسروں کو اپنا سیاسی محکوم اور معاشی غلام بنانے کے خواب دیکھ رہے ہیں ایں نہایت خلوص سے ان کو مشورہ دونگا کہ وہ اس خواب و خیال کی دنیا کو جتنی جلدی ہو سکے چھوڑ دیں تو ان کے لئے بہتر ہے....... ضرورت ہے کہ اس بات کو جاہ پرست طبقے خوب اچھی طرح سُن لیں اور اپنے دلوں سے کسی ایسے نظام کا خیال نکال دیں جس کے ذریعہ مسلمان عوام کو اُلّو بنا کر سیاسی اور معاشی لُوٹ کھسُوٹ کو جاری رکھنے کے منصوبے سوچ رہے ہیں۔ (صفحہ ۱۲-۱۱)

سُن لیا آپ نے! جن باتوں کو مرلا کہنے سے ساورکروں اور دیر باشندوں کی زبانیں لڑکھڑاتی اور آنکھیں شرماتی تھیں۔ ان باتوں کو مسلمانوں کے اس اجتماع کے صدر کی زبان سے کس جرأت و بیباکی سے ادا کرایا جا رہا ہے! یعنی ہندو اگر اس ملک میں اپنی اکثریت کے بل بوتے پر اپنی حکومت قائم کرنیکے لئے جدّوجہد کرے تو وہ جنگِ آزادی ہے جہادِ حریّت ہے۔ انسانیت کا سب سے مقدّس فریضہ ہے۔ اور اگر مسلمان اسلامی حکومت کے جذبہ کو پرورش دیں تو وہ جاہ پرستی ہے۔ ہوسناکی ہے۔ داؤ فریب ہے۔ استبداد ہے۔ تغلب ہے۔ غصب ہے۔

غیر مہذب، قوموں کا شیوہ ہے۔ غرضیکہ عالمِ انسانیت کی ذلیل ترین حرکت ہے!

اور پھر ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ یہ جاہ پرستی کا طعنہ کون دے رہے ہیں! جناب خان بہادر اللہ بخش صاحب۔ کہ ہوسِ وزارت میں جن کی مضحکہ انگیز حرکتوں نے فضائے ہند کو اب تک کشتِ زعفران بنا رکھا ہے کہ آج بھی جب کہیں ان کا فوٹو سامنے آتا ہے تو بے اختیار ایک تأسف انگیز و عبرت آمیز ہنسی کا محرک ہو جاتا ہے۔

---

(۶) پھر ارشاد ہے:۔

"ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے کانگریس کی نمائندہ حیثیت تو سمجھ میں آتی ہے ...... لیکن جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے۔ سوائے ہنگاموں اور جلسوں کے اور آخر کس بُنیاد پر وہ ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت کی نمائندہ جماعت تسلیم کئے جانے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کی نمائندگی کا امتحان اسوقت ہوگا جب لیگ اپنے لاہور والے ریزولیشن کو مسلمانوں کے سامنے پیش کرے اور اس ایک مسئلہ پر از سر نو انتخاب لڑا جائے" (صفحہ ۲۶)

مُسلم لیگ کس بنا پر مسلمانوں کی اکثریت کی نمائندہ جماعت تسلیم کئے جانے کا مطالبہ کرتی ہے!

اس کا جواب اپنے آقایانِ نعمت جناب گاندھی جی و مسٹر کا م سے پوچھیئے جو بیس مرتبہ تسلیم کر چکے ہیں کہ لیگ مسلمانانِ ہند کی سب سے بڑی نمائندہ جماعت ہے۔ باقی رہا امتحان کا سوال۔ تو اس کے لئے جناب سیٹھ عبداللہ ہارون صاحب، خان بہادر صاحب کو پہلے ہی چیلنج دے چکے ہیں کہ وہ اسمبلی سے استعفےٰ دیکر آئیں اور لاہور والے ریزولیشن کے مسئلہ پر از سر نو انتخاب لڑیں۔ اگر ہمت ہے تو خان بہادر صاحب میدان میں آئیں۔ نتیجہ دنیا کے سامنے خود بخود آجائے گا

---

(۷) ایک دلیل بڑی دلچسپ ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"اس سلسلہ میں غور طلب اَمر یہ ہے کہ آج جو مسلمان مرکزی حکومت کے ماتحت مرکزی سروسوں میں ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ملازم ہیں۔ پاکستان کے قائم ہو جانے کے بعد انہیں غیر ملکی سمجھ کر ان کی خدمات سے

سبکدوش کردیا جائے گا۔ تو کیا پاکستان میں ان کے لئے جگہ نکل سکے گی"؟ (صفحہ ۷۲)

چہ خوش! مسلم لیگ کی "فرقہ پرستی" کی سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ یہ چند ملازمتوں اور نشستوں کیلئے لڑتی جھگڑتی رہتی ہے۔ یعنی ملازمتوں کا وہ مسئلہ جسے مسلم لیگ اٹھائے تو اسقدر ذلیل بنجاتا ہے۔ وہ مسئلہ لیگ کی اسکیم کی مخالفت میں استعمال کیا جائے تو اتنی اہمیت اختیار کرلیتا ہے!

مرکزی حکومت (یعنی ہندو اکثریت) کے ماتحت مسلمان ملازموں کا کیا حشر ہورہا ہے۔ اس کیلئے زیادہ نہیں تو اسمبلی کے کسی ایک سیشن کی روئداد اٹھا کر دیکھئے۔ ہندوؤں کی کشادہ ظرفی آئینہ کی طرح سامنے آجائے گی۔

یہ ہیں وہ دلائل جن کی بناء پر لیگ کی اسکیم کو مہمل۔ نقصان رساں۔ جاہ پرستی کا اندھا جذبہ۔ مُہمل اور دُور از کار قرار دیا گیا ہے۔ "جز گذری جو تو خدا نہ ہُوا"

دعا کیجئے کہ ان کی یہ مساعی مشکور قرار پائیں اور بارگاہ وارد ہا سے ان کی پچھلی تقصیریں معاف ہو کر انھیں "نجات" کا پروانہ مل جائے۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

مقتدی حضرات | یہ تو تھے خطبۂ صدارت کے جواہر ریزے۔ اب مختلف مقرّرین اور موئیدین حضرات کے ارشاداتِ گرامی میں سے بھی کچھ اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے:۔

(۱) یہ اسکیم آزادیٔ ہند کے راستہ میں روڑا اٹکاتی ہے۔ (خان بہادر اللہ بخش)

(۲) ہندوستان میں برطانوی تسلّط کو قائم رکھنے کا حیلہ ہے۔ (عبدالرحمٰن سرحدی)

(۳) یہ اسکیم برطانوی حکومت کو قائم رکھے گی اور برطانیہ عظمیٰ کے مفاد کے لئے ہندوستان اور بیرونی ممالک کے درمیان ایک Buffer State کا کام دے گی (مولانا حفظ الرحمٰن صاحب)

(۴) یہ اسکیم ان حضرات کے نزدیک کبھی قابلِ قبول نہیں ہوسکتی جن کے پیشِ نظر تمام ملک کا مفاد ہے۔ (مسر غلام حسین ہدایت اللہ)

(۵) ملک کے مفاد کے لئے بالعموم ، مسلمانوں کے مفاد کیلئے بالخصوص نقصان رساں ہے۔ (مولانا حبیب الرحمٰن)

(۶) ایک شکست خوردہ ذہنیت کا نتیجہ (سر غلام حسین ہدایت اللہ)

(۷) اس اسکیم نے یہ واضح کر دیا ہے کہ مسلم لیگ کے لیڈر مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ نہیں کر سکتے۔ (حافظ محمد ابراہیم)

(۸) یہ عوام کے مفاد کا تحفظ نہیں کرے گی۔ بلکہ خواص اس سے متمتع ہوں گے۔ (مسٹر محمد امین کھوتی)

(۹) کہا یہ جاتا ہے کہ کانگریسی صوبوں میں مسلمانوں پر جو مفروضہ مظالم ہوئے ہیں پاکستانی اسکیم انکا نتیجہ ہے۔ لیکن یہ مظالم تو پاکستان کے بعد بھی ویسے ہی ہوتے رہیں گے...... یہ جو کہا جاتا ہے کہ کانگریسی صوبوں میں مسلمانوں پر مظالم ہوئے ہیں تو اس الزام کی کوئی بنیاد نہیں۔ اگر ان صوبوں میں لیگ والے بھی صاحب اختیار ہوتے تو وہ مسلمانوں کے مفاد کے لئے اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتے جو کانگریس نے کیا ہے (حافظ محمد ابراہیم سابق وزیر یوپی)

(ایک ہی سانس میں دو متضاد باتیں۔ طلوع اسلام)

(۱۰) مالیات اور دفاع کے نقاطِ نگاہ سے یہ اسکیم ناقابلِ عمل ہے (خان بہادر اللہ بخش)

(۱۱) اس اسکیم میں اقلیتوں کے صوبوں کے مسلمانوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے (مولانا حبیب الرحمٰن)

(۱۲) اس اسکیم کے بعد اقلیتوں کے صوبوں کے مسلمان اپنے حقوق سے محروم رہ جائیں گے (عبداللہ القاضی بنگال)

(۱۳) اگر سرحد، بلوچستان اور سندھ کے مسلمان اس اسکیم سے الگ ہو جائیں تو پنجاب کا پاکستان ایک دیسی ریاست کے برابر رہ جائے گا (خان بہادر اللہ بخش)

(معلوم نہیں کہ پنجاب کو بھی اس اسکیم سے الگ کیوں نہیں کر دیا گیا۔ طلوعِ اسلام)

(۱۴) یہ بااختیار صوبوں کو دیسی ریاستوں کے درجہ تک پہونچا دیگی (مولانا حبیب الرحمٰن)

(۱۵) مسلمانوں پر یہ مذہبی فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلام کا پیغام دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہونچا دیں۔ لہٰذا وہ اپنے آپ کو منطقوں کے اندر مقیّد نہیں کر سکتے (مفتی کفایت اللہ)

(۱۶) کیا مسلمان اپنی مساجد وغیرہ کو غیر مسلم علاقوں میں چھوڑ دیں گے؟ (مسٹر یسین نوری)

(۱۷) ہم اسلام کی حفاظت اپنی قوت اور قربانی سے کریں گے۔ اسلام کی حفاظت پاکستان سے نہیں

ہو سکتی۔ مجلس احرار مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے پہلے ہی جدّ وجہد کر رہی ہے۔ اگر کبھی "اسلامستان" کا الگ وجود عمل میں آیا تو وہ مجلسِ احرار کے ہاتھوں عمل میں آئے گا۔ (مولانا حبیب الرحمٰن)

(یعنی مجوزہ "اسلامستان" اس لئے نا قابلِ قبول ہے کہ یہ لیگ کے ہاتھوں عمل میں آرہا ہے

جو اسلامستان مجلسِ احرار کے ہاتھوں وجود پذیر ہوگا۔ وہ قابلِ قبول ہوگا !)

(۱۸) اگر ہندوستان کی تقسیم مذاہب کی بُنیاد پر کی جاتی ہے تو ان لوگوں کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ سِکھّوں کو ایک "سِکھ استھان" بنانے سے روک دیں (مفتی محمد نعیم)

(۱۹) مسلمان ایک جُدا گانہ قوم نہیں ہیں کیونکہ

(الف) اس اسکیم کے مجوزین یقیناً ہندوستانی تھے۔

(ب) ہندوستان کے مسلمان۔ بیرونِ ہند میں ہندی۔ ہندوستانی یا انڈین کہلاتے ہیں۔

(ج) ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت اس مُلک کے قدیمی باشندوں کی نسل سے ہے۔ اور اس اعتبار سے ڈراوڈین اور آرین سے کسی طرح مختلف نہیں ہے۔

(د) تبدیلیٔ مذہب سے تو قومیت نہیں بدل سکتی۔ (خان بہادر اللہ بخش)

(ان اقتباسات کے حوالے کے لئے دیکھئے اسٹیٹسمین ہیں ۲۷ تا ۲۹ مئی ۱۹۴۰ء)

یہ اعتراضات کسی تبصرے کے محتاج نہیں ان میں سے کم و بیش ہر ایک کے متعلق اس سے پیشتر اصلاً یا ضمناً کچھ نہ کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ان اعتراضات کو ہم نے بالتفصیل اس لئے درج کر دیا ہے کہ قارئین اندازہ لگا سکیں کہ یہ کس قسم کی ذہنیت رکھنے والے حضرات تھے۔ جو اس کانفرنس میں جمع ہوئے۔ اور انہوں نے وہاں سوائے اس کے کہ ہندوؤں کے اعتراضات کو دُہرا دیا۔ اور کیا کیا! چار دن تک حضرات ایک قوم۔ ایک قوم کی رٹ لگاتے رہے اور کسی نے نہیں سوچا کہ ایک قوم بننے کے لئے اوّلین شرط دلی دوستی ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کے متعلق قرآنِ کریم کی یہ آیتِ مقدسہ ان حضرات کے پنڈال کے سامنے سب سے بڑے دروازہ پر جلی حرُوف میں لکھی ہوئی موجود تھی کہ

والذین کفروا اولیاءھم الطاغوت. کُفّار کے دوست شیاطین ہوتے ہیں

چنانچہ چار روز کے بعد یہ کانفرنس ختم ہوئی۔ اور اس کے فیصلوں پر ہندو مہاسبھا کے صدر جناب ساورکر کی طرف سے تبریک وتہنیت کا تار موصول ہوا (ہندوستان ٹائمز ۱۰؍ ستمبر ۳۴ء)

ان کی محنت برآئی۔ ان کی مساعی مشکور ہوئیں۔ جن کی رضاجوئی کے لئے اس قدر تگ و دو کی گئی تھی۔ انہوں نے اظہارِ خوشنودی میں مبارکباد کا تار بھیجدیا۔ اور یہ حضرات اس سارٹیفکیٹ کو گلے سے لگائے شاداں و فرحاں یہ کہتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے کہ

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

کانفرنس کی ناکامی | ہندوؤں نے یہ سمجھا تھا کہ اُدھر یہ کانفرنس ہوئی اور ادھر ایک طرف قیصرِ ابیض (وائٹ ہال) میں زلزلہ آگیا۔ اور دوسری طرف مسلم لیگ کی گردن فرطِ ندامت سے جھک گئی کہ ہیں! ہمارے دعوائے نمائندگی کا کس طرح پول کھل گیا۔ لیکن ہُوا یہ کہ نہ لندن ہی میں کوئی پتّہ کھٹکا اور نہ ہی مسلمانانِ ہند کو ہی احساس ہُوا کہ دہلی میں ہُوا کیا ہے۔ نہ برطانوی حلقۂ سیاست میں اس کا کوئی ذکر تک آیا۔ نہ ہی مسلم لیگ نے اس کو درخورِ اعتنا سمجھا۔ اسی مایوسی کا نتیجہ ہے کہ وہ ہندو پریس جو اس کانفرنس کے دعوئے ہمہ گیری کا ڈھول پیٹ رہا تھا اب اس طرح خاموش ہے کہ گویا

وہاں بر چہرہ زخمے بود و بہ شد

حتیٰ کہ گاندھی جی نے بھی ایک لفظ تک اس کے متعلق نہیں لکھا۔ اس تجربہ کی ناکامی سے جو دھکا ہندوؤں کے قلب پر لگا تھا اس کے صدمہ میں کچھ افاقہ ہوا تو حقیقت زبان پر آہی گئی۔

مسٹر ایم۔ این رائے لکھتے ہیں :۔

"ہم "ہندوستانی قومیّت" کی تقسیم کی اسکیم کے خلاف مسلمانوں کے افکار کی شیرازہ بندی کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ لیکن ہم کانگریسی لیڈروں کو متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ایسی کانفرنسوں یا مظاہروں کی قوّت یا وزن کے اندازہ کرنے میں حد سے نہ بڑھا کریں۔ جتنی رپورٹیں موصول ہوئی ہیں ان سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ آزاد مسلم کانفرنس کامیاب ضرور رہی لیکن یہ ایک ہلاکت انگیز تحریک ہوگی۔ اگر یہ

کوشش کی گئی کہ اُسے بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے۔ اور اسے خواہ مخواہ مسلم لیگ کی مدِ مقابل جماعت سمجھ لیا جائے۔ مُسلم لیگ کی قوّت اور اس کے ہم خیال طبقہ کی تعداد کو گھٹانے کی کوشش سے کچھ فائدہ نہیں۔ مُسلم لیگ آج اس ملک میں مسلمانوں کی بہت بڑی نمائندہ جماعت ہے۔ پاکستان ریزولیشن یا آزاد کانفرنس اس حقیقت کو کبھی بدل نہیں سکتے۔"

(انڈی پنڈنٹ انڈیا۔ ۱۲ مئی ۱۹۴۰ء)

آزاد کانفرنس کے منتظم حضرات اپنی مساعیٔ مشؤمہ کے اِن نتائج کو دیکھ کر یقیناً غم و غصّہ سے اپنی اُنگلیاں کاٹتے ہوں گے: کہ خسر الدُّنیا والاخرۃ ذالک ہو الخسران المبین۔ اُسے کہتے ہیں۔

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں!

لیکن انہیں افسوس کس بات کا۔ روپیہ کسی کا صرف ہُوا۔ ان کی چار دن ہوٹلوں میں تفریح ہو گئی۔ باقی رہی حیثیتِ ملّی۔ سو اگر وہ پاس ہوتی تو یہ کانفرنس منعقد ہی کیوں ہوتی۔

تھے یہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

باب ششم

کچھ اپنوں سے

اگر یک قطرہ خوں داری - اگر مشتِ پرے داری

بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

جب انتہائی شدت کی گرمی پڑتی ہے آسمان شعلہ باری کرتا ہے، زمین سے لُو کے بھبکے نکلتے ہیں۔ تو کہیں سے ایک سہانی بدلی نمودار ہوتی ہے جو پژمُردہ انسانوں کو پھر سے نوید حیات دیتی ہے۔ مُردہ دلوں جاگ اُٹھتے ہیں۔ نگاہوں میں شعاعِ اُمید سے تابندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ دنیا پھر سے جی اُٹھتی ہے۔ جب بادِ خزاں ہر باغ و راغ کو اُجڑے ہوئے بہشت کا نقشہ بنا دیتی ہے۔ ترو تازگی کا کہیں نشان باقی نہیں رہتا۔ نزہت و لطافت گُم ہو جاتی ہے۔ تو اس کے بعد بہار کا دور آتا ہے۔ شگوفے پھوٹتے ہیں۔ کلیاں مہکتی ہیں۔ غنچے چٹختے ہیں۔ زندگی ہر شاخ سے تڑپ تڑپ کر باہر آ جاتی ہے۔ بشاشت و شگفتگی اُبل اُبل کر پھوٹتی ہے۔ ہر طرف ایک نئی دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ ہر سمت ایک جہانِ نو کی تعمیر شروع ہو جاتی ہے۔

جب رات کی تاریکی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا، روشنی کا منفذ بند ہو جاتا ہے، نُور کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی۔ تو اس کے بعد خاورِ مشرق اپنی پوری شانِ جہاں تابی سے جلوہ افروز ہوتا ہے۔ تاریکیاں کافور ہو جاتی ہیں۔ اندھیرا گُم ہو جاتا ہے۔ ہر طرف نُور کی چادر بچھ جاتی ہے۔ ذرّہ ذرّہ کروٹ بدلتا ہے۔ حیاتِ تازہ انگڑائیاں لیتی ہے۔

نظامِ کہن کی بساط اُلٹ جاتی ہے اور ایک نیا دَور شروع ہو جاتا ہے۔

یہ فطرت کے اٹل قوانین ہیں۔ یہ نظامِ کائنات کے غیر متبدّل ضوابط ہیں۔ ان سے کسی کو مفر نہیں کوئی اس سے مستثنٰی نہیں۔

لیکن جب یہ قوانینِ فطرت۔ کائنات کی ہر شے کو محیط ہیں۔ تو کیا انسان جو چاروں طرف سے ضوابطِ فطرت کے حدود سے گھرا ہوا ہے۔ ان سے مستثنٰی قرار دیا جا سکتا ہے؟ نہیں! یہ بھی ان سے مستثنٰی نہیں۔ قوموں کی زندگیاں بھی انہی قوانین و ضوابط کے تابع ہوتی ہیں۔ جب کوئی قوم غلامی کی زنجیروں میں جکڑی جاتی ہے۔ وہ نکبت و ادبار کے گرداب میں پھنس جاتی ہے تو اس پر افسردگی اور پژمردگی چھا جاتی ہے۔ مایوسیاں اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں اور اُمید کی کوئی جھلک کہیں سے نظر نہیں پڑتی لیکن اس انحطاط و تنزل کے بعد ان کے اندر پھر سے زندگی کی تڑپ نمودار ہوتی ہے۔ اور وہ ایک بار پھر اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور لٹی ہوئی دولت کی وارث بن جاتی ہے۔ لیکن جس طرح قطراتِ بارش سے دوبارہ زندگی اسی زمین کو مل سکتی ہے جس میں ہنوز زندہ رہنے کی صلاحیت باقی ہو۔ بادِ بہاری سے وُہی شاخ گل پیرہن ہو سکتی ہے۔ جو اپنی اصل سے کٹ کر الگ نہ ہو چکی ہو۔ نورِ سحر سے وہی آنکھ فیض یاب ہو سکتی ہے جس کی بینائی باقی ہو۔ اس طرح دوبارہ زندگی بھی وہی قومیں حاصل کر سکتی ہیں جن میں زندہ رہنے کی تمنّا ہو اور ان کا رشتہ اپنے اصل سے منقطع نہ ہو چکا ہو۔ ہندوستان کے مسلمان ایک مدت سے افسردگی و پژمردگی۔ خستگی و بدحالی۔ نکبت و افلاس کے جہانِ نامساعد میں سسکیاں لے رہے تھے۔ نہ ان کے سینوں میں دل باقی تھے۔ نہ دل میں کوئی ولولہ۔ نہ رگوں میں خون باقی تھا نہ خون میں حرارت نہ زندگی کا کوئی نصب العین سامنے تھا نہ اس نصب العین کے حصول کی تڑپ۔ زندگی ان کے نزدیک محض نفس شماری کا نام تھا اور دُنیا سزا بھگتنے کا جیل خانہ۔ اس دوران میں کئی ایک چارہ ساز اُٹھے۔ اور مقدور بھر ان کے درد کا درمان سوچا۔ ان کی نیتیں نیک اور کوششیں مخلص تھیں۔ لیکن چونکہ مرض کہنہ اور پیچیدہ تھا، اس لئے کوئی صحیح علاج نہ ہو سکا۔ جب یہ درد بڑھکر اس انتہائی نقطہ تک جا پہنچا، جہاں سے قاعدۂ فطرت کے ماتحت ردِّ عمل شروع ہوتا ہے۔ تو قدرت نے اپنی کرم گستری سے ان کے اندر ایک ایسا مردِ مومن پیدا کر دیا

جس نے ان کے مرض کی صحیح صحیح تشخیص بھی کی اور اس کا علاج بھی سوچا۔

عُمرہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

اس نے اپنی بصیرتِ قرآنی سے بہت جلد محسوس کر لیا کہ مسلمان کی تمام مصائب و نوائب کا راز اس میں ہے کہ یہ اپنے مقام کو بھول چکا ہے۔ اپنے آپ کو فراموش کر چکا ہے۔ چنانچہ اس بیچارے اُمّت نے اپنی تمام عُمر اس جہاد میں صرف کر دی کہ وہ مسلمان کو اسکے صحیح مقام سے رُوشناس کر دے۔ حضرت علّامہ اقبالؒ کے کلام کو شروع سے آخیر تک دیکھ جایئے۔ ہر جگہ اسی حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ کہ مسلمان کا صحیح مقام کیا ہے! وہ اس سے کہتے ہیں کہ۔

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایّام ہے تُو زمانہ میں خدا کا آخری پیغام ہے

اور وہ اسے بتاتے ہیں کہ

افرنگ ز خود بے خبرت کرد وگرنہ اے بندۂ مومن تو بشیری تو نذیری

جب انسان اپنے صحیح مقام سے آگاہ ہو جاتا ہے تو پھر اس میں زندگی کی ایک نئی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ اب اس مقام پر اسے اپنے صحیح نصب العین کی تلاش ہوتی ہے اور وہ اسی تلاش میں تشنہ لب۔ مستانہ وار۔ اِدھر اُدھر دوڑتا ہے یہی زندگی کی علامت ہے۔ بلکہ عین زندگی ہے۔

زندگانی را بقا از مدعا است کاروانش را درا از مدعا است
زندگی در جستجو پوشیدہ است اصل او در آرزو پوشیدہ است
آرزو جانِ جہانِ رنگ و بو است فطرتِ ہر شے امین آرزو است
آرزو را در دلِ خود زندہ دار تا نگردد مشتِ خاکِ تو غبار

انہوں نے مسلسل تدبّر و تفکّر کے بعد مسلمان کے لئے ایک مکمل نصاب مرتّب کر دیا جس کے اتّباع سے وہ موجودہ پستی سے اُبھر کر اپنے صحیح مقام کی بلندی تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ ہماری بدبختی ہے کہ ہم نے اس نصاب کی طرف پُوری پُوری توجہ نہیں دی۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم ابھی تک یوں ذلیل ہو رہے ہیں۔ یہ نصاب قرآنِ کریم کی ہی تفسیر و تشریح ہے۔ اور جب تک ہم قرآن کی طرف نہیں لوٹتے ہماری کوئی

کوشش بارآور نہیں ہوسکتی) انہوں نے جب یوں زمین تیار کر لی تو اس کے بعد وہ مقام آیا جہاں پہنچ کر انہوں نے قوم کے لئے نصب العین مقرر کرنا تھا۔ جہاں ان کے مدعا کا تعین کرنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۳۰ء میں اپنے مشہور خطبۂ صدارت میں واضح اور غیرمبہم الفاظ میں اس حقیقتِ ثابتہ کو قوم کے سامنے رکھدیا کہ ہندوستان کے شمال مغربی حصہ میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے مسلمانوں کو حکومتِ الٰہیہ کی بنیاد رکھنی چاہیئے۔ اور اپنے تمام ذرائع واسباب کو اس مقام پر مرکوز کر کے اپنے اندر وہ قوت پیدا کر لینی چاہیئے جس سے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ہوسکے۔ یہ تھا وہ درخشندہ نصب العین جو انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ یہ کوئی نئی چیز نہ تھی۔ بلکہ اسی اصول کی عملی تشریح تھی جس کی طرف وہ اس وقت سے بہت پہلے اشارہ کر چکے تھے۔ جب فرمایا تھا کہ

مرد خود دارے کہ باشد پختہ کار — با مزاجِ او بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں — می شود جنگ آزما با آسماں
برکند بنیادِ موجودات را — می دہد ترکیبِ نو ذرات را
گردشِ ایام را برہم زند — چرخِ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوتِ خود آشکار — روزگارِ نو کہ باشد سازگار

(اسرار و رموز)

یہی "جہانِ نو" تھا جس کی تشریح انہوں نے ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر کی تھی۔ بشارتِ فردا کی یہ آواز شاید قبل از وقت سمجھی گئی۔ اس لئے اس پر وہ توجہ نہ دی گئی جس کی وہ مستحق تھی۔ قوم دس برس تک مصروفِ دشت نوردی و بادہ پیمائی رہی۔ اور اس کے بعد مارچ ۱۹۴۰ء میں۔ اسی مردِ قلندر کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر لفظاً لفظاً وہی کہا جو اس نے دس سال پیشتر الٰہ آباد میں کہا تھا۔ یہ ہے لیگ کا ریزولیشن جو ہمارا محلِ موضوع ہے۔ نصب العین متعین ہونے کے بعد اس کے حصول کی جدّوجہد ایسی ہی ہے جیسی ٹکٹ خرید لینے کے بعد گاڑی میں سوار ہونے کی تگ و دو۔ ورنہ اگر آپ ٹکٹ خرید کر آرام سے وہیں بیٹھے رہیں۔ تو منزلِ مقصود تک قیامت تک بھی نہیں پہنچ سکتے اس تگ و دو میں سب

سے پہلا اور سب سے اہم بنیادی مرحلہ ہے اس نصب العین پر یقین۔ ایسا محکم یقین جو ایمان کا درجہ لئے ہوئے ہو۔ ایسا غیر متزلزل ایمان جس کی کیفیت عشق تک جا پہنچی ہو۔ اگر آپ میں یہ یقین موجود ہے۔ تو پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اس نصب العین کے حصول سے روک نہیں سکتی۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا ۔۔۔ تو کرلیتا ہے یہ بال و پرِ رُوح الامیں پیدا

یاد رکھئے۔ قوموں کی موت و حیات کا فیصلہ ان کے یقین کے استحکام کے مطابق ہوا کرتا ہے یقین۔ اور ایک صحیح نصب العین کی صداقت کا یقین۔ ایمان اور قرآنِ کریم کی روشنی میں متعین کردہ مدعا کا ایمان۔ آپ سمجھ نہیں سکتے کہ اس سے قوموں میں کس قدر بے پناہ قوت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے کس درجہ کوہ شکن ہمت اور فلک پیما عزم پیدا ہوتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ

یہ ثُمَّ اسْتَقَامُوا کیا ہے وہی جسے ایمانِ محکم کہا گیا ہے وہی جو حصول نصب العین کا ناقابلِ شکست ارادہ ہے۔ وہی جسے انگریزی میں ریزولیشن (Resolution) کہتے ہیں اگر آپ اس کے صحیح معنی سمجھ لیں تو پھر فی الواقعہ دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اس کے حصول سے روک نہیں سکتی۔ اور تو اور خود گاندھی جی۔ جو اسکیم کے اس قدر شدید مخالف ہیں۔ وہ بھی اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ

> "اگر ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمان فی الواقعہ اس اسکیم کو نافذ کرنا چاہتے ہیں تو پھر اس خطۂ ارض پر کوئی ایسی قوت نہیں جو انہیں اس سے باز رکھ سکے۔ خواہ اس کی کتنی ہی تشدد آمیز یا عدم تشدد کے انداز کی مخالفت کیوں نہ ہو۔

(ہندوستان ٹائمز 5/40-5)

سوال صرف اتنا ہے کہ "آپ ایسا چاہتے ہیں یا نہیں"؟ اگر آپ "چاہتے ہیں" تو پھر یہ ہو کر رہیگا اور

تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہوں

یاد رکھئے! اگر یہ اسکیم (خدانکردہ) ناکام رہی تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوگی کہ ہندوؤں نے اس کی اس درجہ مخالفت کی تھی۔ انگریز اس کو پسند نہیں کرتا تھا۔ خود مسلمانوں میں سے ایک جماعت ہندو کی

ہم نوائی میں اس کے خلاف یورش کر کے اُمنڈ آئی تھی۔ اس ہجوم مخالفت سے یہ کبھی ناکام نہیں رہ سکے گی۔ وہ کون سا وقت تھا کہ حق کی مخالفت نہیں ہوئی! وہ کونسا زمانہ تھا کہ باطل اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے حق کے خلاف یلغار کر کے نہیں آتا رہا؟ یہ خیر و شر کی جنگ شروع سے چلی آرہی ہے۔ اس لئے یہ کشمکش اس اسکیم کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اگر یہ ناکام ہوئی تو اس لئے ہوگی کہ اپنے نصب العین کی صداقت پر آپ کا یقین۔ یقینِ محکم نہ تھا۔ آپ کا عہد۔ عہدِ استوار نہ تھا۔ آپ کا عشق۔ عشقِ صادق نہ تھا۔ ورنہ یہ مخالف اور مخالفوں کی قوتیں! ایمان کے سامنے ان کی حقیقت کیا ہے! ایمان والوں کی تو حالت یہ ہوتی ہے۔ کہ

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ ○

جب ان سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے مخالفین تو ایک ہجوم پیدا کر رہے ہیں۔ اس لئے اُن سے ڈرو۔ تو اس اطلاع سے ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو گیا۔ اور انہوں نے کہا کہ (یہ ہجوم اکٹھے ہوتے ہیں تو ہونے دو) ہمارے لئے اللہ کافی ہے۔ اور وہ بہترین سازگار ہے۔

اس کا نتیجہ کیا ہُوا۔

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِیْمٍ ○

پس وہ اللہ کے فضل و لغماء سے (جھولیاں بھر بھر کر) واپس لوٹے۔ اور انہیں کسی قسم کی کوئی گزند نہ پہنچ سکی (اس لئے کہ) انہوں نے اللہ کی رضا جوئی اختیار کی تھی۔ اور اللہ بہت بڑے عظیم الشان فضل و کرم کا مالک ہے۔

مومن کو مخالفین کی یورش و یلغار سے کیا خوف۔ فرمایا کہ

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّیْطٰنُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَهٗ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○

یہ تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے تمہیں ڈراتا ہے سو ان سے مت ڈرو۔ صرف مجھ ہی سے ڈرو۔ اگر تم صاحب ایمان ہو تو۔

اور یہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ "شیطان کے دوست" کون ہیں جن سے شیطان ڈرانے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے مقام پر اس کی تشریح میں فرمایا کہ اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَوْلِیٰٓـئُھُمُ الطَّاغُوْتُ 2/257 "کفار کے دوست شیاطین ہیں یعنی یہ کفار اور ان کی دوستی کا دم بھرنے والے سب ایک ابلیسانہ سازش کے ماتحت شور مچاتے رہتے ہیں کہ کسی طرح اس سے مسلمانوں کو مرعوب کر دیں اور ان کے دل پر خوف طاری ہو جائے لیکن قرآنِ کریم نے مومن کی نشانی یہ بتائی ہے کہ ایسے وقت میں اس کا ایمان اور بڑھ جائے اور اس کا عزم اور راسخ ہو جائے۔ اپنے نصب العین کی صداقت واضح ہو کر اس کے سامنے آ جائے۔ اپنے خدا پر بھروسہ قوی ہو جائے۔ مخالفت کے اس تمام ساز و سامان کو دیکھے اور انہیں استہزاء کی ایک خفیف سی ہنسی کے ساتھ دیکھتا ہوا مستانہ وار آگے بڑھ جائے۔ اس کا بھروسہ اس ساز و سامان اور اسباب و ذرائع پر تو ہوتا ہی نہیں۔ یہ تو اس کے نزدیک ثانوی چیزیں ہیں۔ اس کا بھروسہ تو اپنے خدا پر ہوتا ہے۔ اور خدا پر بھروسہ ہی وہ قوت ہے کہ جو اس کے ہاتھوں کی "کھجور کی ٹہنیوں" میں شمشیرِ جگر دار کے جوہر پیدا کر دیتا ہے۔ ایک مومن اور کافر میں یہی تو فرق ہے۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

یوں تو دنیا میں ہر زمانہ میں تغیرات ہوتے چلے آئے ہیں لیکن جس برق رفتاری کے ساتھ دورِ حاضرہ میں تغیرات رونما ہو رہے ہیں، اس سے پیشتر اس کی نظیر مشکل مل سکے گی۔ آج تو صبح اور شام میں قوموں کی تاریخ بدل جاتی ہے۔ زمین کا جغرافیہ بدل جاتا ہے۔ اس عظیم الشان انقلاب کے زمانہ میں ہر وہ قوم جو اپنے مستقبل سے ذرا بھی غافل ہوئی، پیس کر رکھ دی جائیگی۔ جو ذرا بھی کمزور ہوئی، کچل دی جائیگی۔ یہ اصولِ فطرت ہے۔ یہ قاعدۂ روزگار ہے۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

وہ لوگ جنھیں اللہ تعالیٰ نے نُورِ بصیرت سے نوازا ہے۔ وہ صاف صاف دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان کس قسم کے انقلابات کی آماجگاہ بنا ہُوا ہے۔ لہٰذا اگر مسلمان اس کشمکش میں اپنی زندگی چاہتا ہے تو اسے" فولادی بن کر جینا ہوگا۔ اور اس کی عملی شکل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تمام مسلمان ایک مرکز کے ساتھ وابستہ ہو کر رہیں۔ اور وہ اپنے اندر ہم آہنگی اور یک نگہی کے جوہر پیدا کریں۔ اپنے عسکری نظام کو پھر سے زندہ کریں۔ اور یوں ایک" بنیانِ مرصوص" بنکر دنیا کی ہر مخالفت کا مقابلہ کریں اور سب سے بڑھکر یہ کہ اسلامی حکومت کے قیام کا جو نصب العین ان کے سامنے رکھا گیا ہے۔ اس کی صداقت پر کٹ مرنے کا عزم پیدا کریں۔ اور یوں بساطِ سیاست کے اس نظامِ کُہن کو اُلٹ کر ایک جدید نظام کی طرح ڈالیں۔ کیا آپ نے نہیں سُنا کہ جب سیمرغ اپنے والہانہ جذبات میں مست ہو جاتا ہے تو خس و خاشاک کو اپنے گرد جمع کرکے۔ این و آن سے بیخبر آنکھیں بند کرکے اس ڈھیر کے اندر بیٹھ جاتا ہے۔ عشق کے دیپک کی شعلہ ریز موسیقی اس کے رگ وپے سے نکل کر اس کے گرد وپیش کی کائنات کو پھونک دیتی ہے۔ اور یہ سب کچھ راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ لیکن اس راکھ کے ڈھیر سے پھر ایک نیا سیمرغ پیدا ہوتا ہے جس کی رگوں میں خونِ شباب اور جس کے بازوؤں میں قوتِ شاہین موجزن ہوتی ہے۔ یہی حالت قوموں کی موت و زیست کی بھی ہے۔

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین وآسمانِ مُستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

یہ جہانِ نو تعمیر ہو کر رہے گا۔ یہ دنیائے جدید بن کر رہے گی۔ یہ زمانے کے مقدّرات ہیں۔ یہ فطرت کے اٹل قاعدے ہیں۔ اگر بقول حضرت علّامہ رح مسلمانوں نے اس کی قیمت جلد پیش کر دی تو یہ جلدی وجود میں آجائے گا۔ اور اگر کوتاہی کی تو اس میں دیر لگ جائے گی لیکن صرف دیر ہی ہو گی عمل میں یہ آکر رہے گی۔ کہ اللہ نے مسلمانوں سے اقوامِ زمین ایشیا کی پاسبانی کا کام لینا ہے۔ ان سے

دنیا کی امامت کا فریضہ سرانجام دلانا ہے۔ اس لئے اُس کی حکمت و رحمت سے بعید نظر آتا ہے کہ وہ نو کروڑ کی اس جمعیت کو یوں ورطۂ کفر میں ڈوب جانے دے۔ لیکن سوال یہ نہیں کہ مشیت خداوندی کیا ہے، سوال تو یہ ہے کہ اس مشیت کی تکمیل کے لئے تم کیا کرتے ہو۔ ظہور و تمکّنِ اسلام خدا کا لکھا ہوا نوشتہ تھا جسے پورا ہو کر رہنا تھا، لیکن اس کی تکمیل بدر و حنین کے اُن زندہ جاوید قدسیوں کے ہاتھوں ہوئی جن کا مقدّس خون شجرِ اسلام کی ہر شاخ کی نمی کا باعث ہے۔ آج اسلام کا شجرِ طیّب پھر اُسی نمی کا محتاج ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ سعادتِ ازلی کس کے حصّے میں آتی ہے۔

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
اب کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

مبارک ہیں وہ جو اپنے خدائے قدوس کی اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے سربکف وکفن بدوش میدان میں آجائیں کہ اسلام پنڈالوں کے اندر زندہ نہیں ہوتا میدانوں میں زندہ ہوتا ہے۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر — تیرا زُجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام — میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات — فطرت "لہو ترنگ" ہے غافل! "نہ جل ترنگ"

(بقیہ صفحہ ـــــــــــــــ) (طلوعِ اسلام)

طلوعِ اسلام
فروری سنہ ۱۹۴۱ء

قیاس کن تو کجائی و من کجا واعظ!

آپ کسی دیوانی عدالت میں جائیے جہاں مدّعی اور مدّعا علیہ دونوں مسلمان ہوں عدالت کی طرف سے سوال ہوگا کہ معاملہ متنازعہ فیہ کا فیصلہ قانونِ شریعت کی رُو سے کیا جائے یا رواج کے مطابق۔ مدّعی اس پر غور کرے گا کہ کونسے مسلک کے مطابق فیصلہ سے اسے زیادہ نفع پہنچ سکتا ہے اگر وہ سمجھے گا کہ رواج کے مطابق فیصلہ سے اسے زیادہ فائدہ کی اُمید ہے تو وہ بلا تامّل کہہ دے گا کہ وہ اپنے مقدمہ کا فیصلہ رواج کے مطابق چاہتا ہے۔

آپ ہندوستان کے کسی مولوی صاحب سے پوچھئے۔ کسی فرقہ کے عالم سے دریافت کیجئے، جمعیت العلماء کے کسی رکن سے فتویٰ طلب کیجئے۔ ہر ایک بلا ادنیٰ توقّف کہدے گا کہ مدّعی کا یہ فیصلہ اسلام کی کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ قانونِ الٰہیہ سے سرکشی ہے۔ شریعتِ حقّہ کی توہین ہے۔ اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتا ہوُا معاملات کے تصفیہ میں رواج کو شریعت پر ترجیح دے۔ اگر وہ اسلامی قانون کے مقابلہ میں رواجی مسلک کو پسند کرتا ہے تو اسے اپنی پیشانی سے "مسلمان" کا لیبل اُتار دینا چاہیئے۔ جب تک وہ اپنے آپ کو اسلامی نظام سے وابستہ سمجھتا ہے یا ایسا ظاہر کرتا ہے تو اس پر قانونِ شریعت کی پابندی لازمی ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان بھی کہلاتے اور اپنے معاملات کے تصفیہ کے لئے قانونِ شریعت کو اعلانیہ ٹھکرا کر۔ رواج کی پابندی اختیار کرے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ

(اے پیغمبر! تیرے رَبّ کی قسم کہ یہ ایماندار نہیں بن سکتے جب تک کہ اپنے متنازعہ فیہ امور میں سجھے (قانونِ شریعت کو) حکم نہ ٹھیرائیں۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ مسلمان وہی ہے جو اپنے معاملات کے تصفیہ کے لئے ہمیشہ خدائی قانون کی

طرف رجوع کریں اور اس کی اتباع اپنے اوپر لازم قرار دیں۔ یہ ایسا بنیادی اور متفقہ علیہ اصول ہے جس میں کسی جماعت، کسی پارٹی، کسی فرقہ، کسی گروہ کے عامی اور عالم کو کوئی شبہ یا اختلاف نہیں ہو سکتا

اب ذرا سوچئے کہ رواج کیا چیز ہے جس کا التزام ایک مسلمان کو مسلمان نہیں رہنے دیتا ہے۔ جس کی اتباع سے انسان خدائی عدالت سے ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ مردود قرار پاتا ہے۔ دھکّے دیکر نکال دیا جاتا ہے!!! رواج کسے کہتے ہیں؟ اس کا سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ شریعت اور رواج کا فرق ادنیٰ تدبر سمجھ میں آسکتا ہے۔ شریعت اس قانون کا نام ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوا اور جو اپنی محسوس و مشہود اکمل و احسن شکل میں عہد محمد رسول اللہ والذین معہٗ میں دنیا پر متمکن و مسلط ہوا۔

اس کے برعکس رواج اس قانون یا ضابطہ کو کہتے ہیں جو انسانوں کا وضع کردہ ہو اور کسی قوم یا فرقہ میں نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلا آرہا ہو مثلاً کئی برادریوں اور ذاتوں میں رواج ہے کہ وراثت میں لڑکی کو حصہ نہیں دیا جاتا۔ اب اگر آپ اس رواج کی تحقیق میں تاریخ کے اوراق کو پیچھے کی طرف اُلٹتے جائیں تو آخیر میں آپ کسی نہ کسی انسان تک جا کر رُک جائیں گے یعنی آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس قانون کی ابتداء فلاں گاؤں کے چودھری سے ہوئی۔ یا فلاں برادری کی پنچایت نے کی۔ اس کی ابتدا ایک انسان سے ہوئی ہو۔ یا انسانوں کے کسی گروہ سے۔ اصل دونوں کی ایک ہے کہ اس فیصلہ کو خدائی سند حاصل نہیں بلکہ یہ انسانوں کا فیصلہ ہے۔ لہٰذا شریعت اور رواج میں فرق یہ ہوا کہ شریعت خدائی فیصلہ کا نام ہے اور رواج انسانی فیصلہ کا نام ہے۔

اب اسی چیز کو ذرا آگے بڑھائیے۔ انسانی تمدن و عمرانیت کا تقاضا ہے کہ ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ واسطہ پڑے۔ اس کو باہمی معاملات کہتے ہیں معاملات و مقاصد کے اشتراک کی صورت میں باہمی اختلاف و تصادم بھی ناگزیر ہوگا ان اختلافات کے تصفیہ کے لئے ایک نظام قائم کیا گیا جسے نظامِ حکومت کہتے ہیں جس نظامِ حکومت میں معاملات کے فیصلے خدائی قانون کے مطابق ہوں۔ اسے حکومتِ الٰہیہ یا قرآنی سلطنت کہیں گے۔ اور جس نظام میں یہ فیصلے انسانوں

کی طرف سے ہوں وہ نظام رواجی کہلائے گا۔ یہ فیصلے ایک انسان کی طرف سے ہوں یا انسانوں کی جماعت کی طرف سے اصل پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑ سکتا۔ یہ فیصلے بہرکیف انسانی اور یہ نظام بہرحال رواجی ہو گا۔ خدائی نہ ہو گا۔ یہ فیصلے کسی مسلمان۔ یا مسلمانوں کی جماعت کسی غیر مسلم یا غیر مسلموں کی جماعت، یا مسلم و غیر مسلم کی مخلوط جماعت میں سے کسی کی طرف سے ہوں اس سے بھی اصل پر کچھ فرق نہیں پڑ سکتا جس نظام کے فیصلوں کی سند ضابطۂ الٰہی تک نہیں پہنچتی، وہ نظام رواجی ہو گا، خدائی نہیں ہو گا۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس رواجی نظام کے بعض فیصلے نظامِ خداوندی کے فیصلوں کے خلاف نہ ہوں لیکن اس سے بھی یہ نظام۔ نظامِ خداوندی نہیں بن سکتا۔ اس لئے کہ نظام چند قوانین یا ان کے مطابق فیصلوں کے مجموعہ کا نام نہیں ہوتا بلکہ وہ تو ایک ایسی فضا (Atmosphere) قائم کرتا ہے جس سے سوسائٹی کے رگ و ریشے تک متاثر ہوتے ہیں۔ وہ ایک ایسا قالب تیار کرتا ہے جس میں قوموں کی حیاتِ اجتماعیہ کی سیرت و کردار متشکل ہوتی ہے اس لئے کہ اگر کسی رواجی نظام کے بعض قوانین یا فیصلے خدائی ضابطۂ قوانین سے متصادم نہ بھی ہوں تو وہ نظام۔ خدائی نظام کا حریف ہی متصوّر ہو گا۔ مثلاً آج مروّجہ قانون کے کئی فیصلے شریعتِ اسلامی کے فیصلوں سے متصادم نہیں ہوتے۔ بایں ہمہ آپ اس نظام کو خدائی نظام نہیں کہہ سکتے یہ نظام بہ حیثیت انسانی اور رواجی ہی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی رواجی نظام میں مسلمان مرفہ الحالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہے ہوں لیکن اس پر بھی وہ نظام رواجی نظام ہی رہے گا۔ خدائی نظام نہیں بن جائے گا۔ اس لئے کہ خدائی نظام محض اقتصادی مشکلات کا حل ہی نہیں بتاتا بلکہ وہ اس سے کہیں آگے لیجاتا ہے۔ روٹی کا مسئلہ تو انسانی اور حیوانی زندگی کا مشترک مسئلہ ہے۔ خدائی نظام ان مسائل کا حل بھی پیش کرتا ہے جن کا تعلق خالص انسانیت سے ہے اور یہی بنیادی فرق ہے۔ ایک انسانی یا رواجی نظام اور خدائی یا قرآنی نظام میں۔

ہندوستان میں آج ایک نظامِ حکومت قائم ہے جسے آپ بلا ادنیٰ توقّف رواجی نظام کہیں گے ہندوستان کے رہنے والے اس کوشش میں ہیں کہ اس نظام کی جگہ ایک دوسرا نظام قائم کیا جائے۔

اس مقصد کی مدعی ایک طرف کانگریس والوں کی جماعت ہے۔ یہ اس نظام کو الٹنا چاہتی ہے اس لئے نہیں کہ اس کے بدلے وہ کوئی خدائی نظام قائم کرنا چاہتی ہے بلکہ محض اس بدیشی رواجی نظام کو اُلٹ کر اس کی جگہ ایک سودیشی رواجی نظام قائم کرے۔ اس جماعت کے نزدیک موجودہ نظام اس لئے مردود و ملعون نہیں کہ یہ انسانوں کا قائم کردہ نظام ہے بلکہ اس لئے تبدیلی کے قابل ہے کہ یہ نظام ان انسانوں کا قائم کردہ ہے جو ہندوستان کے رہنے والے نہیں بلکہ ایک اور ملک کے باشندے ہیں ان کے نزدیک اس نظام کی بڑی خرابی یہ ہے کہ یہاں کی دولت انگلستان پہنچائی جارہی ہے اور یہاں کے باشندے فاقوں مررہے ہیں وہ اس نظام کو اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتے ہیں تاکہ یہاں کی بھوک اور افلاس دُور ہو۔ وہ اس نظام کی جگہ اپنا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں اس کے متعلق ان کا دعوےٰ ہے کہ اس نظام میں ہندوستان کے تمام باشندے ہندو مسلم۔ سکھ۔ عیسائی۔ پارسی وغیرہ سب شریک ہوں گے۔ اس جدّوجہد کا نام ہے جنگِ آزادی۔

ظاہر ہے کہ جس بنیاد پر کانگریس والوں کے نزدیک موجودہ نظام ناقابلِ قبول ہے ......

......اپنا نظام قائم کرنے سے وہ علّت ضرور دُور ہو جائے گی۔ اس مقصد کے پیشِ نظر وہ اگر موجودہ نظام کا نام غلامی اور اپنے نظام کا نام آزادی رکھتے ہیں تو ایسا کرنے میں حق بجانب ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک یہ مسئلہ ایسا ہی ہے جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے۔ مسلمان کے نزدیک جملہ نظام ہائے عالم دو شقوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں۔ یا وہ نظام رواجی ہوگا یا خدائی۔ ان کے نزدیک ہر رواجی نظام ناقابلِ قبول اور الٹ دینے کے لائق ہے تاکہ اس کی جگہ خدائی نظام قائم کیا جا سکے۔ رواجی نظام کے قائم کرنے والے ولایت کے باشندے ہوں یا ہندوستان کے ہندو ہوں یا مسلمان۔ یا ہندو اور مسلمان مشترکہ۔ ایسا ہر نظام ان کے نزدیک مردود و ملعون ہے۔ ایسے نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنا ان کے زاویۂ نگاہ سے غلامی ہے۔ خواہ اس نظام کے قائم کرنے والے دوسرے ملک کے رہنے والے ہوں یا خود اپنے ملک کے۔ لہٰذا جس چیز کا نام کانگریس والوں کے نزدیک جنگِ آزادی ہے وہ ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے جنگِ آزادی نہیں بلکہ ایک رواجی نظام کی جگہ دوسرے رواجی نظام کا قیام ہے۔ کانگریس والوں کے نزدیک اس تبدیلیٔ نظام کا سب سے بڑا فائدہ معاشی مشکلات کا حل ہے یعنی اس سے

ملک کی دولت اہلِ ملک کے ہاتھوں میں رہے گی۔ اس لئے وہ لوگ جن کی نگاہوں میں زندگی کی حدود و قیود محض مادی حوائج و ضروریات کی چار دیواری ہے انہیں کانگریس کا ہمنوا ہونا چاہیئے۔ چنانچہ کچھ ایسے مسلمان جن کے نزدیک "روٹی کا مسئلہ" سب سے اہم مسئلہ زندگی ہے اس تبدیلیٔ نظام کی جدّ و جہد میں ہندوؤں کے ساتھ شامل ہیں اور ایسا ہونا ہی چاہیئے اس لئے کہ ہم نے جو رواجی اور خدائی نظام کا فرق بتایا ہے اس میں خدائی نظام کے قیام کی کوشش تو انہی کی طرف سے ہونی چاہیئے جو اس کی اہمیت کو محسوس کریں جن کے نزدیک زندگی کی کامرانیوں کا منتہیٰ اقتصادی اور معاشی مشکلات کا حل ہو۔ مذہبی نظام جن کے نزدیک عہدِ جاہلیت کی یادگار ہو جس کا اس تہذیب و تمدّن کے دور میں نام تک لینا بھی خلافِ فیشن تصوّر کیا جائے انہیں اس کی کیا پڑی ہے کہ خدائی نظام کے قیام کی فکر کریں۔ ان کے نزدیک ہر وہ نظام جس میں مادی زندگی کی شادکامی حاصل ہو جس میں روٹی آسانی سے مل سکے ہر لحاظ سے مستحسن اور قابلِ ستائش ہے۔ اس لئے ہر وہ کوشش جو کسی ایسے نظام کے قیام کے لئے بروئے کار لائی جائے ان کے نقطۂ نگاہ سے عین جہاد ہے۔ اس لئے اس طبقہ کے مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ شریک ہو جانا کچھ بھی تعجّب انگیز نہیں۔

سطورِ بالا سے ظاہر ہے کہ موجودہ جنگِ آزادی میں ہندوؤں کے ساتھ وہی مسلمان شریک ہو سکتے تھے جو ایک بُرے رواجی نظام کی جگہ اچھے رواجی نظام کے قیام کے خواہاں ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ وہی طبقہ ہو سکتا تھا جسے مذہب سے کچھ علاقہ نہ ہو مغرب کی مادّہ پرستی جس کی رگ و پے میں سرایت کر چکی ہو۔ اور اس کے برعکس وہ لوگ جو مذہب اور اس کی رُو سے قائم شُدہ نظام کی اہمیت سے واقف ہوں انہیں کچھ ایسی جدّ و جہد کرنی چاہیئے تھی جس سے موجودہ رواجی نظام کی جگہ خُدائی نظام کا قیام ہو سکتا۔ آپ جس شخص سے سوال کریں گے وہ بلا تامّل کہدے گا کہ اس قسم کی جدّ و جُہد علماء کے طبقہ کی طرف سے ہونی چاہیئے کہ وہ شریعت کے سب سے بڑے محافظ اور نظامِ خداوندی کے قیام و بقا کے سب سے اوّلین ذمّہ دار ہیں۔ بلکہ اگر حقیقت کو ذرا اور بے نقاب دیکھئے تو ان حضرات

کی ہستی ہی شریعت کے ساتھ قائم ہے۔ عدالت میں جب کوئی مسلمان شریعت کے مقابلہ میں رواج کے فیصلہ کو ترجیح دیتا ہے تو سب سے پہلے انہی حضرات کی طرف سے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہیئے۔ اس لئے موجودہ دور میں جب کہ ایک رواجی نظام کو الٹنے کی تحریک پیدا ہوئی تھی ان حضرات کو سب سے آگے بڑھ کر کوشش کرنی چاہیئے تھی کہ وہ اس تبدیلی سے فائدہ اٹھا کر رواجی نظام کی جگہ خدائی نظام کو قائم کر سکیں جس میں انہیں شریعت کا ضابطۂ قوانین نافذ کرنے کی پوری پوری آزادی ہو۔ مغرب زدہ فرنگی مآب۔ مادہ پرست اور مذہب سے متنفر طبقہ کی طرف سے ان کی مخالفت ہوتی تو یہ اس ہجوم مخالفت کی ذرّہ برابر پرواہ نہ کرتے اور ایک طرف انگریز اور دوسری طرف ہندو کو علانیہ بتا دیتے کہ ہمارے نزدیک نہ تمہارا قائم کردہ نظام قابلِ قبول ہے اور نہ وہ جسے ہندو قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک دونوں نظام رواجی ہیں اور اس لئے مردود ہیں۔ ہم دنیا کے کسی رواجی نظام میں آزاد نہیں ہو سکتے۔ ہماری آزادی اور اس آزادی کے بہترین نتائج صرف ایک نظام سے وابستہ ہیں اور وہ نظام۔ نظامِ خداوندی ہے۔ یہ حضرات اس جہادِ زندگی میں سربکف میدانِ عمل میں آ جاتے اور سچّے مسلمانوں کی جماعت کو ساتھ لیکر نظامِ خداوندی کی منزلِ مقدّس کی طرف والہانہ بڑھتے چلے جاتے۔ اللہ کی نصرت ان کے ساتھ ہوتی اور یوں اس خاکدانِ ہند میں وہ انقلاب پیدا ہو جاتا جسے دیکھنے کے لئے لاکھوں آنکھیں پُرنم اور ہزاروں قلوب بے تاب ہیں۔

یہ آواز علماء کی طرف سے اٹھنی چاہیئے تھی کہ ہم ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں ہم شریعتِ اسلامی کے ہر جُزئی اور کُلّی۔ اصولی اور فرعی قانون کو بلا مزاحمت نافذ کر سکیں۔ لیکن اللہ کی قدرت کہ آج تک کسی توثیت پرست عالِم دین کی زبان سے یہ الفاظ نہ نکل سکے اور نکلے تو اس کی زبان سے جس کی تصویر دکھا دکھا کر یہ علماء لوگوں کے جذبات کو بھڑکاتے رہتے ہیں کہ بتاؤ ایسی تصویر کسی مسلمان کی ہو سکتی ہے؟ ان عُلماء کبار سے جب کبھی دریافت کیا گیا کہ حضور یہ تو فرمائیے کہ یہ جدّوجہد بالآخر کس غرض کے لئے ہے تو ڈانٹ کر یہی جواب ملا کہ بس! مقصد صرف یہ ہے کہ

انگریز کو نکال دو! عرض کیا کہ حضور یہ درست ہے کہ انگریز کا قائم کردہ رواجی نظام مسلمان کے لئے کسی صورت میں قابلِ قبول نہیں لیکن یہ تو ارشاد ہو کہ انگریز کے نکال دینے کے بعد جو نیا نظام قائم ہوگا وہ بھی تو رواجی نظام ہوگا۔ وہ نظام مسلمان کے لئے کس طرح قابلِ قبول ہو سکتا ہے! ہمیشہ یہ جواب ملا کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس کی کچھ فکر نہ کرو۔ انگریز تمہارا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اسے نکال باہر کرو۔ گذارش کیا کہ حضور! ہمارا دشمن نہ کوئی گورا ہے نہ کالا۔ نہ ہندی ہے نہ ولائتی۔ ہمارا دشمن وہ ہے جو خدائی نظام کی جگہ رواجی نظام قائم کرتا ہے۔ آج رواجی نظام انگریز نے قائم کر رکھا ہے لہٰذا یہ دشمن ہے۔ کل رواجی نظام ہندو کی طرف سے قائم ہوگا لہٰذا وہ دشمن ہوگا۔ آج قوت انگریز کے ہاتھ میں ہے اس لئے یہ دشمن نظر آتا ہے۔ کل کو یہی قوت ہندو کے ہاتھ میں ہوگی۔ اس لئے وہ ان سے بھی بڑا دشمن ہو جائے گا! مسلمان کا دوست تو فقط وہ ہے جو ان کے خدائی نظام کے قیام میں مددگار ہو۔

.... اس کا جواب فتویٔ کُفر کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا!

اس طرف یہ ہو رہا تھا۔ دوسری طرف اللہ کا ایک ایسا بندہ کھڑا ہوا جس کے متعلق ان علماء حضرات کا ارشاد تھا کہ اس کی شکل صورت بھی مسلمانوں جیسی نہیں۔ وہ اٹھا اور اس نے برملا کہا۔ اعلانیہ کہا کہ یاد رکھو......

> ہندوؤں کی موجودہ جدّوجہد۔ انگریز کے رواجی نظام کو الٹ کر اپنا رواجی نظام قائم کرنے کے لئے ہے۔ جو مسلمان کے نزدیک ایسا ہی غلامی کا نظام ہوگا جیسا آج ہے۔ لہٰذا مسلمان کے نزدیک یہ جدوجہد آزادی کی جنگ نہیں۔ آقاؤں کی تبدیلی کی کوشش ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک آزادی صرف اس حکومت کا نام ہے جس میں وہ قوانینِ شریعت کو نافذ کر سکیں۔ ایسی آزادی کے حصول کی واحد صورت۔ بحالاتِ موجودہ یہی ہے کہ مسلمان اپنی اکثریت کے علاقوں میں اپنی جداگانہ حکومت قائم کریں۔

آپ تصور میں بھی لا سکتے ہیں کہ کوئی ایسا مسلمان جس کے دل میں مذہب کا کچھ بھی احترام۔ شریعتِ الٰہی کا کچھ بھی پاس اور خدا کا کچھ بھی خوف ہو وہ اس مسلک کی مخالفت کا خیال تک بھی دل میں لا سکتا ہے! لیکن حوادثِ زمانہ کی ستم ظریفی مُلاحظہ ہو کہ اس اصول و مسلک کی دشمنی سے مخالفت ہوئی اور ستم بالائے ستم

یہ کہ مخالفت اس طبقہ کی طرف سے ہوئی جو اپنے آپ کو شریعت مقدسہ کا محافظ اور قوانین الٰہیہ کا پاسبان قرار دیتا ہے۔ جلسے ہوئے جداگانہ کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ ریزولیوشن پاس کئے گئے۔ تقاریر ہوئیں مضامین لکھے گئے کس چیز کے خلاف؟ اس اعلان اور نظریہ کے خلاف کہ مسلمان ایسی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے جس میں اس کے خدا کا قانون رائج ہو جس میں شریعت کا سکہ رواں ہو۔ دور کیوں جایئے گذشتہ کرسمس کے ہفتہ میں مسٹر جناح نے کراچی اور احمد آباد وغیرہ میں اپنی مختلف تقاریر میں جب کھلے کھلے الفاظ میں اعلان کیا کہ مسلمان ایسی حکومت چاہتے ہیں جس میں ان کی شریعت کا قانون نافذ ہو۔ (ملاحظہ ہو طلوع اسلام بابت دسمبر ۱۹۴۰ء) تو ہمارے "قومیت پرست مسلمان" حضرات نے جن الفاظ و جذبات سے اس اعلان کا خیر مقدم کیا ہر اس مسلمان کے لئے درخور اعتنا ہیں جو اپنے سینے میں دل اور دل میں زندگی کی کوئی رمق رکھتا ہے۔ مثلاً بنگال کے سید حبیب الرحمٰن صاحب نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا۔

"ہندوستان میں کسی اکثریت یا اقلیت کی حکومت نہیں ہوگی بلکہ اس کی زمام حکومت ایسے ہندو اور مسلمان محبان وطن کے ہاتھوں میں ہوگی جو نہ صرف مسلمانوں کا ہی اعتماد رکھتے ہونگے بلکہ انہیں ہندوؤں اور دوسری جماعتوں کا بھی اعتماد حاصل ہوگا۔ بالفاظِ دیگر یہ جمہور کی حکومت ہوگی۔ جو جمہور کے لئے جمہور کے ہاتھوں سے وجود میں آئے گی۔ مسٹر جناح سخت مغالطہ میں ہوں گے اگر وہ یہ سمجھیں کہ کانگریس مجلس احرار۔ بنگال کرشک پرجا پارٹی جمعیت العلماء جمعیت المومنین وغیرہ کے قومیت پرست ان سے (مسٹر جناح) سے کسی طرح بھی مسلمانوں کے کم خیر خواہ یا کم محب وطن ہیں ......

نزاکت وقت کا تقاضا ہے کہ تمام قومیت پرست مسلم لیڈر جنہیں ہندوستانی مسلمانوں کی راہ نمائی کا فطری حق حاصل ہے آگے بڑھیں اور ہندوؤں کے ساتھ ایک ایسا سیاسی معاہدہ کریں جس سے مسٹر جناح اور ان کے ہمنوا مسلمانوں کی یا تو اصلاح ہو جائے یا ان کا خاتمہ ہو جائے۔" (ہندوستان ٹائمز ۲۴؍۱)

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ یہ کونسا خطرہ ہے جس کے مقابلہ کے لئے ہندوستان کے تمام قومیت پرست مسلمانوں کو یکجا ہو کر ہندوؤں سے رشتۂ مؤاخات استوار کرنے کی دعوت دی جارہی ہے؟ خطرہ یہ ہے کہ مسٹر جناح اور ان کے ساتھی، ہندوستان کے ایک گوشے میں ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں شریعتِ اسلامی کا ضابطۂ قوانین نافذ ہوگا! یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا۔

یوں تو نورِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی روزِ اوّل سے ستیزہ کار چلا آرہا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ ستاروں کی آنکھوں نے دنیا کے اسٹیج پر ایسا تماشا شاید ہی کہیں دیکھا ہو کہ مسلمان علماء کا گروہ۔ اپنے جبّوں اور قبّوں۔ عماموں اور قباؤں، تسبیحوں اور مصلّوں سے آراستہ پیراستہ۔ غیر مسلموں سے عہد و پیمان قائم کرکے۔ ایک متحدہ محاذ اس غرض سے قائم کر رہا ہو کہ ملک کے کسی گوشے میں کہیں ایسی حکومت نہ قائم ہو جائے جس میں شریعت الٰہی کا قانون نافذ ہو! اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝

اے محمدؐ گر قیامت را برآری سر زخاک سر برآر و ایں قیامت درمیانِ خلق ہیں

بھیڑیوں سے گلّہ کی حفاظت کی جاسکتی ہے لیکن جب خود چرواہا ہی انہیں پھاڑ پھاڑ کر کھانے لگ جائے تو اس گروہ کا خدا حافظ! ڈاکوؤں سے گھر کی محافظت کا انتظام کیا جا سکتا ہے لیکن جب اہلِ خانہ۔ اور ان میں سے بھی بزرگانِ خاندان گھر کو لوٹنے لگ جائیں تو اس کا انتظام کسی سے نہیں ہوسکتا۔ دریا کی بے پناہ موجوں سے کشتی کو بچایا جاسکتا ہے لیکن جب ناخدا ہی اسے ڈبونے پر تل جائے تو اس کشتی کے ساحلِ مقصود پر پہنچنے کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی! لیکن اس پر بھی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ دنیا نے آذر کے گھر میں ابراہیمؑ کو پیدا ہوتے اور فرعون کی گود میں موسیٰؑ کو پرورش پاتے دیکھا ہے جس کی حفاظت اللہ چاہے اس کے لئے وہ ایسے ایسے مقامات سے سامان و ذرائع پیدا کر دیتا ہے جو کسی کے وہم و گمان میں نہ ہوں! اس کا زندہ ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ آج علم و فضل کی بڑی بڑی گدیوں کے پجاری .... بڑے بڑے مُفتیانِ عظام و علمائے کرام۔ جیّد شیوخ الحدیث اور ائمہ دین متحدہ طور پر رواجی نظامِ حکومت کے قیام کی تائید اور خدائی نظامِ حکومت کے قیام کی ہر روز مخالفت کر رہے ہیں۔ اور گہوارۂ مغرب کا پروردۂ یافتہ۔ سرزمینِ سومنات کا ایک بیرسٹر شریعت الٰہیہ کے تمکّن و تنفیذ کے لئے مصروف

جہاد ہے۔ ذٰلِکَ فضل اللہ یؤتیہ من یشآء ہے جب وہ چاہے تو ایک خشک لکڑی سے موسےؑ کے اژدہا کا کام لے جو ساحرینِ فرعون کی تمام نظر فریب رسیوں کو نگل جائے۔ اس مقلب القلوب کو شرحِ صدر کرنے میں دیر ہی کیا لگتی ہے۔

ہمارے قومیت پرست علماء کبار کا ارشاد یہ ہوتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں ہمیں پوری مذہبی آزادی ہوگی اور ہم اسلامی کلچر کی حفاظت کے لئے ایک جداگانہ شعبہ قائم کرلیں گے مشکل یہ ہے کہ ان حضرات کے ذہن میں یہ چیز نہیں آسکتی کہ مذہبِ اسلام کیا ہے اور اس کی آزادی سے کیا مفہوم ہے۔ مذہبی آزادی سے ان کی مراد نماز۔ روزہ کی آزادی سے آگے کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک مذہب نام ہی ان چند ظواہر و رسوم کا ہے۔ اگر ان کی ادائیگی میں کوئی مانع نہ ہو تو ان کے نظریہ کے مطابق پوری پوری مذہبی آزادی ہوگی لیکن اگر یہی مذہبی آزادی ہے تو ایسی مذہبی آزادی تو آج کل بھی حاصل ہے! یہ تمام چیزیں درحقیقت اسی کہنہ عجمی تصوّر کی شاخیں ہیں جس کی رُو سے دین کو سیاست سے الگ کیا گیا تھا۔ ہمارے علماء حضرات نے سیاست میں حصّہ لینا بھی شروع کیا ہے تو ایک دینی فریضہ کی رُو سے نہیں بلکہ محض فیشن کے طور پر تاکہ یہ ماڈرن (Modern) قسم کے مولوی کہلائیں۔ ورنہ دین اور سیاست کی وہ تفریق اسی طرح باقی ہے۔ موجودہ "جنگِ آزادی" ان کے نزدیک ایک خالص دنیاوی مسئلہ ہے جسے مذہب سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس لئے ہمارے علماء کرام اس "جنگِ آزادی" میں ہندوؤں کے ساتھ شامل ہیں کیونکہ دنیاوی معاملات میں غیروں کے ساتھ اس قسم کے اشتراک و تعاون سے کوئی چیز مانع نہیں۔ چنانچہ یہ حضرات اپنے مسلک کی تائید میں دلائل بھی اس قسم کے پیش کیا کرتے ہیں کہ اگر ہم اپنی مسجد کا نقشہ ایک ہندو انجینئر سے بنوا سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنے امراض کا علاج ایک غیر مسلم ڈاکٹر سے کرا سکتے ہیں تو موجودہ سیاسی مسائل کے حل کے لئے ہندوؤں کے ساتھ مل کر متحدہ قومیت کیوں نہیں بنا سکتے! آپ بادنیٰ تدبّر محسوس کریں گے کہ ان تمام خیالات کی تہ میں وہی جذبہ پنہاں ہے کہ مذہب اور سیاست الگ الگ شعبے ہیں۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ دین سے مراد ہے۔ اطاعت۔ اقرار محکومیت جس کی حکومت ہوگی اسی کا دین ہوگا یا یوں کہئے کہ جس قسم کا نظامِ حکومت ہوگا اسی قسم کا دین ہوگا۔ شریعت سے مراد ہے قانون اور عبادت کے معنی ہیں اس قانون کی اتباع و اطاعت۔ اب ذرا اس بوالعجبی کو

دیکھئے کہ نظامِ حکومت تو ہوگا ہندوؤں اور مسلمانوں کا مخلوط جمہوری یعنی رواجی (جس میں اکثریت بھی غیر مسلموں کی ہوگی) اور دین کی "آزادی" ہوگی! "مذہبی آزادی" کی تفصیلات میں الجھے بغیر ایک بات تو بداہتہً سمجھ میں آسکتی ہے کہ قانونِ شریعت کا بیشتر حصہ ایسا ہے جس کا ایک سرا اگر ایک مسلمان کے دامن سے وابستہ ہے تو دوسرا کسی غیر مسلم کے گریبان سے مثلاً ابھی اگلے دنوں کلکتہ ہائی کورٹ نے ایک عجیب فیصلہ دیا ہے۔ ایک عیسائی خاتون نے اسلام قبول کرنے کے بعد درخواست دی کہ چونکہ اس کا خاوند اسلام قبول نہیں کرنا چاہتا اس لئے اس کا نکاح فسخ کر دیا جائے۔ عدالت نے کہہ دیا کہ یہ معاملہ ملک کے عام قانون کی رُو سے فیصل ہوگا جس میں ایسی صورت میں نکاح فسخ نہیں ہو سکتا۔ آپ کہہ دیں گے کہ یہ موجودہ غلامی کا نتیجہ ہے لیکن ہم یہ گذارش کریں گے کہ ذرا گاندھی جی سے پوچھئے کہ انگریز کے نکال دینے کے بعد جس قسم کا نظامِ حکومت یہاں قائم ہوگا اس میں اگر ایک ہندو عورت اسلام قبول کرنے کے بعد اس قسم کی درخواست دے گی کہ اس کے ہندو شوہر سے اس کا نکاح فسخ کر دیا جائے تو کیا اس وقت کا مروجہ قانون اس کی اجازت دے گا! ذرا دیکھئے تو سہی کہ وہاں سے کیا جواب ملتا ہے! یہ تو ایک مثال ہے اس قسم کے سینکڑوں معاملات ہیں جن میں آپ مخلوط، رواجی نظامِ حکومت کے ماتحت قوانینِ شریعت کو نافذ کر ہی نہیں سکتے۔ شریعت اسلامی ایک مکمل ضابطہ کا نام ہے جو پورے کا پورا نافذ ہوا کرتا ہے اس کے ٹکڑے نہیں کئے جاسکتے۔ پھر یہ سادہ لوحی بھی ملاحظہ ہو کہ اسلامی کلچر و ثقافت کے تحفظ کے لئے ایک الگ محکمہ قائم کیا جائے گا۔ گویا ثقافت ایک ایسی "جنس" ہے کہ غیر خدائی نظامِ حکومت کے اندر ایک شعبہ قائم کر دینے سے اس کی حفاظت ہو جائے گی۔ حالانکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ ثقافت تو نام ہی ان رجحاناتِ قلبی و ذہنی اور نظریاتِ زندگی کا ہے جو کسی نظام کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ہمارے ان علمائے کرام کا یہ خیال بھی اس لئے ہے کہ ان کے نزدیک ثقافت (کلچر) سے مفہوم چند معاشرتی تراش خراش اور قطع و برید کا مجموعہ ہے جس کی حفاظت ایک الگ محکمہ کے ذریعہ سے کی جاسکتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری ان معروضات کو یہ کہہ کر الگ کر دیا جائے گا کہ دین کے معاملہ میں "علمائے کبار" ہی سند ہو سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ انہیں دین کی باتیں سمجھائے! بہت اچھا یونہی سہی! لیکن ذرا دیکھئے کہ جو کچھ ہم نے گذارش کیا ہے اس کے متعلق خود علما حضرات کو اپنے ہاں سے کیا فتویٰ ملتا ہے۔ حضرت علامہ ابوالحامد محمد بن عبداللہ صاحب

انصاری مقیم کابل) نے جو مولانا محمد قاسم نانوتوی علیہ الرحمۃ کے نواسہ اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب علیہ الرحمۃ کے تلامذہ میں سے ہیں "اساسِ انقلاب" کے نام سے ایک مختصر لیکن نہایت عمدہ کتاب تحریر فرمائی ہے جس کا تعارف مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیت العلماء صوبہ آگرہ نے کرایا ہے۔ اس کتاب میں وہ ارشاد فرماتے ہیں

"اوّل وہ جماعت جو کہ اسلام کو بحیثیت ایک مذہب کے اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہے۔ یعنی یہ صرف خدائے کریم کی غیر سیاسی (انفرادی اور مذہبی) طور پر مالکیتؑ، حاکمیت اور توحید پر اور حضرت خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کی دینی (غیر دولتی) خاتمیت" اور آخرین قوتِ تبلیغی و اجرائی حکومتِ الٰہی ہونے" پر دل سے یقین رکھنے کے ساتھ ساتھ سیاسی طور پر ایک نہ ایک غیر الٰہی (شخصی یا دستوری یا جمہوری یا اشتراکی یا فسطائی یا ان کے سوا کسی) حکومت کی رعیت اور وفادار عبید و ملوکؔ ہی ہو ان مومنین کی بھیڑ۔ اگرچہ بحیثیتِ اجتماعی اسلام سے دور ہے لیکن ان کو مذہب اسلام (انفرادی طور پر پابندیٔ اسلام) کا حق ہر حکومت دیتی ہے اور میں بھی ان کو آزادی فردی کی رو سے مذہبی رنگ کا مسلمان سمجھتا ہوں۔ قابل تصریح ہے کہ مذہبی رنگ کا اسلام "جو کہ غیر الٰہی حکومتوں کے زیر سایہ غلامی کی زندگی بسر کرتا ہے" نام ہی کا اسلام ہے۔ اور اصل اسلام وہی اجتماعی یا سیاسی اسلام ہو سکتا ہے جس کی قوت نے دنیا کے کسی حلقے پر خدا ملیک و مقتدر کی حکومت کا جھنڈا رسولِ اکرمؐ اور صدیقِ اکبرؓ کے نمونہ پر کھڑا کر رکھا ہو۔ اس لئے یہ اصحابِ مذہب اسلام تاوقتیکہ خدا سے ملک الناس کی نسبت توحید حاکمیت کے عقیدہ کے ساتھ اس عقیدہ کی عملی تبلیغ اور اصلاحی جہاد اکبر کے لئے کوئی سیاسی مرکز پیدا نہ کریں اور اس سے سیاسی طور پر مربوطیت رکھتے ہوئے اس کے زیر اثر شورائی اصول پر امرایات نہ رکھتے ہوں اس وقت تک یہ رنگ اصلی اور مطلوب الٰہی اور ابراہیم علیہ السلام کے اصطلاحی اسلام سے محروم ہی رہیں گے اور ان کو ننگ اسلام سے زیادہ کوئی خطاب نہ دیا جا سکے گا۔[1] (صفحہ ۱۱۹-۱۲۰)

[1] اس کتاب کی زبان اسی قسم کی ہے۔ اس لئے بغور پڑھنے سے مطلب واضح ہو گا۔

طلوعِ اسلام
ستمبر ۱۹۴۱ء

لمحۂ فکریہ

یوں تو فرشتوں کی معصوم نگاہوں نے خون کے چھینٹے اور آگ کی چنگاریاں۔ آدم کے خمیر میں ہی بھانپ لی تھیں۔ لیکن اس آگ اور خون کا مظاہرہ جس شدّت اور بربریت سے آج ہو رہا ہے فرشتوں کی نگاہوں نے ایسا نظارہ اس سے پیشتر کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ تاریخ کے اوراق نے ہلاکو اور چنگیز کے نام کو ہلاکت اور خونریزی سلب و نہب قتل و غارتگری کے لئے بطور ضرب المثل محفوظ رکھا۔ ذہنِ انسانی نے نادر کی یاد بطور ایک ظالم اور سفاک کے قائم کی۔ لیکن ہلاکو اور چنگیز کے سیلابِ فنا کی زد میں کتنی دنیا تھی؟ نادر کے قتلِ عام کا منظر زیادہ سے زیادہ کتنے انسانوں نے دیکھا؟ دورِ وحشت و بربریت کے ہلاکت اور بربادی کے ان خونچکاں مناظر کی یاد کو تازہ کرو۔ اور پھر ان کے سامنے دورِ حاضرہ کے مہذب و متمدّن انسان کی خونابہ فشانی اور ہلاکت آفرینی کی داستان الم انگیز کو رکھو اور سوچو کہ خمیرِ آدم کے ان آتشیں اجزاء کے مظاہرہ کا اس سے شدید موقعہ انسانیت کی تاریخ میں کبھی پہلے بھی آیا تھا؟ پہلے بربادی اور ہلاکت ہوتی تھی تو کسی ایک قوم کی۔ اجڑتی اور تباہ ہوتی تھی تو کوئی ایک بستی مٹتی اور فنا ہوتی تھی تو کوئی ایک حکومت لیکن آج! سوچئے کہ دنیا کا کونسا گوشہ ہے جو خونِ ابنِ آدم سے لالہ زار نہیں؟ کونسا خطہ ہے جو جہنّم کی اس آگ کی لپیٹ میں نہیں آگیا؟ کونسی بستی ہے جو اس عالمگیر زلزلہ کے دھماکے سے محفوظ ہے؟ کچھ راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئیں کچھ گرتی چلی جا رہی ہیں جو ابتک بظاہر محفوظ ہیں۔ انہیں بھی اس پیکرِ اجل سیلِ آتش کا ہر وقت دھڑکا لگا ہوا ہے۔

بہت آگے گئے۔ باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

انسان کی بے بسی کی اس سے بڑھ کر عبرت انگیز مثال اور کیا ہوگی کہ جس شاخ پر بیٹھا ہے اسے اپنے ہاتھوں سے کاٹ رہا ہے۔ سمجھتا ہے کہ ہر لمحہ موت سے قریب ہوا چلا جا رہا ہوں۔ لیکن مجبوری کا یہ عالم کہ شاخ پر تیر برابر چلائے جا رہا ہے۔ "قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا" کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ ابلیس نے اپنا پورے کا پورا عفریتی لشکر پہاڑوں کے غاروں سے کھول دیا ہے۔ جو آتشیں کوڑوں کو ہاتھ میں لئے ٹڈی دَل کی طرح انسانوں کی بستیوں پر ٹوٹ پڑا ہے (مِّن کُلِّ حَدَبٍ یَنسِلُونَ) اور انہیں نہایت بے رحمی سے مسلتا۔ رگیدتا۔ کچلتا۔ روندتا۔ انگارے اچھالتا اور خون کے فوارے چھوڑتا۔ اپنے ازلی انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کر رہا ہے۔ یورپ کو اس کے جرائم کی سزا ملنی ضروری تھی۔ اس نے خدا فراموشی اور خود پرستی کا ایسا غیر فطری نظام دنیا پر مسلّط کیا جس سے انسانیت کا گلا گھُٹ گیا۔ اگر انسانوں کی عدالت میں ایک انسان کا گلا گھونٹنے والے کی سزا موت ہے تو میزانِ خداوندی میں انسانیت کا گلا گھونٹنے والوں کی پاداشِ عمل ہلاکت اور بربادی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ یہ پاداشِ عمل کہیں باہر سے نہیں آیا کرتی آتش بازی کی ہلاکت کا سامان تو خود اس کی دوکان کے اندر موجود ہوتا ہے۔ خارجی اسباب میں سے فقط ایک فتیلہ کی ضرورت ہوتی ہے اور بس۔ یہ جنگ قوموں کی جنگ نہیں۔ مُلکوں کی جنگ نہیں۔ بلکہ معاشی نظاموں کی جنگ ہے اور یہ معاشی نظام وہ ہیں جو یکسر غیر فطری بنیادوں پر انسان نے خود اپنے ہاتھوں سے وضع کئے ہیں۔ اقوام یورپ ان غیر فطری نظام ہائے معیشت کے شیشوں کی حفاظت میں سب کچھ کھو دینے پر آمادہ ہیں اور ان کے دلبستگانِ دامن ان کی تائید و معاونت میں سب کچھ قربان کر دینے پر تیّار۔ باہمی منافست و مسابقت یہ وہ فتیلہ ہے جو ان آتشبازوں کی دکان میں گرا۔ اور انہی کی متاعِ زندگی کو ان کی ہلاکت کا سامان بنا گیا۔ گھر کے چراغ سے خانہ سوزی کی اس سے زیادہ عبرت انگیز مثال کم ہی مل سکیگی۔

جب سڑک پر دو آدمی جھگڑتے ہوں تو تیسرا آدمی آکر انہیں چھڑا دیتا ہے۔ جب دس آدمی کسی کے مکان پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے ہجوم کر آئیں تو پولیس اس کی حفاظت کر دیتی ہے۔ اور مفسدہ پردازوں کو ان کی سرکشی کی سزا دیتی ہے۔ لیکن سوچئے کہ جب پولیس کے سپاہی آپس میں کشت و خون پر اُتر آئیں تو انہیں آکر کون چھڑائے۔ اور کون ان کی سرکشی کی سزا دلائے! اس سے آگے بڑھئے۔ جب دو قومیں ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو جائیں تو کوئی تیسری قوت جو ان سے زیادہ طاقتور ہو۔ درمیان میں آکر ان کی ثالثی کر سکتی ہے۔ لیکن جب تمام کی تمام قومیں ایک دوسرے سے اُلجھ جائیں تو ان میں

کون حکم بن سکتا ہے؟ یورپ کی آج یہی حالت ہو رہی ہے۔

رہیں نہ رند یہ زاہد کے بس کی بات نہیں   تمام شہر ہے۔ دو چار دس کی بات نہیں

ان حالات میں اقوامِ عالم میں حَکَم بننے کا فریضہ ایک قوم کے سپرد ہوا تھا جس کو اللہ نے اپنے قوانینِ فطرت کے ضابطہ کا وارث منتخب کیا تھا۔ لیکن انسانیت کی اس سے بڑھکر بدبختی اور کیا ہوگی کہ وہ مجسٹریٹ خود اپنی حفاظت اور بقا کے لئے ملزموں کے رحم وکرم کا محتاج ہو گیا۔ دنیا میں آج چالیس کروڑ مسلمان بستے ہیں لیکن آج کسی مقام کے مسلمان میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ ان ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے والوں میں صلح کرا سکے یا ملزموں کو ان کے جرائم کی سزا دے سکے۔ سوجس بستی کی پولیس اور عدالت کی بے بسی کا یہ عالم ہو، وہ بستی اگر درندوں کا بھٹ نہ بن جائے تو اور کیا ہو! یہ دنیا میں شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ" (تمام عالم انسان کے نگران مقرر کئے گئے تھے لیکن یہ دنیا کے نگران خود اپنی زندگی کے لئے دوسروں کی نگرانی کے محتاج ہو گئے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ ایسے نکمّے عمّالِ حکومت کی کیا سزا ہوتی ہے؟ یقیناً وہ مجرموں کے تمام جرائم کے ذمہ دار قرار دیئے جاتے ہیں۔ اور مجرمین سے کہیں زیادہ سزا کے مستحق! اور آج مسلمانوں کو یہ سزا ایسی شکل میں مل رہی ہے کہ اس سے بڑھکر ذلت آمیز عذاب (عَذَابٌ مُّهِيْنٌ) شاید ہی کسی کے حصہ میں آیا ہو۔ یورپ کی قومیں لاکھ آغشتہ خاک وخون سہی لیکن اپنے معاملات میں دوسروں کی دست نگر تو نہیں ہیں۔ وہ بیشک آج جہنم میں کود رہی ہیں لیکن اپنے فیصلوں سے کود رہی ہیں۔ لیکن ذرا مسلمانوں کی دنیا پر نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ کیسا قبرستانی منظر دکھائی دیتا ہے؟ ہندوستان کو چھوڑو کہ یہاں کا مسلمان کس گنتی اور شمار میں ہے! انہیں دیکھو۔ جنہیں آزاد کہتے ہو! غور کرو کہ دنیا کی بساطِ سیاست پر ان کی رفتار کا کیا عالم ہے! انہیں کوئی دھکا کا ہوا اور یہ بیچارے بہہ! نہ اپنی رائے ہے نہ اپنے فیصلے نہ اپنوں کی نظروں میں کوئی منزلت۔ نہ دوسروں کی نگاہوں میں کوئی وقعت۔ ہر وقت یہ دھڑکا لگا ہو کہ

اَب چھری صیاد نے لی اَب قفس کا دَر کھلا

لے دے کے آپ کی نگہِ تجسس ترکی پر جا کر ٹکے گی۔ لیکن سچ پوچھو تو یورپ کے بے پناہ عفریتوں کے مقابلہ میں اس کی بھی کیا حیثیت ہے۔ خالی جغرافیائی پوزیشن (ہماری ہزار مقدس آرزوں کے باوجود) آپ

مقاومت تو پیدا نہیں کرسکتی اسے اپنے تحفظ وبقا کے لئے بھی بالآخر کسی نہ کسی دوسری قوت کی ہی پناہ لینی پڑیگی۔ اس لئے واقعہ یہی ہے کہ آج تمام عالم اسلامی خدا کے ذلت آمیز عذاب میں گرفتار ہے۔ ملا بیچارے سے قرآن چھنا تو اس کے ساتھ ہی امور عامہ میں تدبر بھی چھن گیا۔ اس عالمگیر قیامت کا علاج سوچنا تو کجا اس مہم کا سمجھ لینا بھی اس کے بس کی بات نہیں اس نے "نجات" کے لئے نہایت آسان راستہ تلاش کر رکھا ہے ایک خاص قطع کا لباس خاص وضع کی تراش خراش۔ چندبے ذوق سجدے۔ کچھ بے روح رسوم ومظاہر لفظی انبار جیڑ ہاؤ کی مناظرانہ بحثیں۔ کچھ خواب آور افسانے۔ اندھی تقلید کی لاٹھی اور عوام کی جہالت۔ یہ ہیں اس غریب کا متاع دنیا اور سرمایۂ آخرت۔ یہ ارباب شریعت تھے۔ اہل طریقت ان سے بھی ایک قدم آگے ہیں۔ وہ زندہ انسانوں کے بجائے مُردوں کی دنیا سے اپنا دامن باندھے ہوئے ہیں۔ بھلا سوچئے! جس قوم کا زندہ۔ مردہ سے مدد کا طالب ہو۔ اس سے بڑھکر فریب خوردہ قوم بھی دنیا میں ہوسکتی ہے! جو "محسوس دنیا" کو تیاگ کر ایک "مثالی دنیا" کی تلاش میں بادہ پیمائی کر رہا ہو۔ اس سے بڑھ کر منزل سے دُور بھی کوئی اور ہوسکتا ہے! سوچئے! اور ماتم کیجئے اپنی اس حالت پر مسلمان ایک مدت سے انہی خود ساختہ "خداؤں" کی پرستش میں لگا ہوا ہے۔ اور اس کا زندہ اور پائندہ حیّ وقیّوم خدا اس سے منہ موڑے بیٹھا ہے۔ بایں ہمہ مسلمان سمجھ یہ رہا ہے کہ میں خدا کا سب سے زیادہ مقرب اور برگزیدہ ہوں۔ دنیا ساری جہنم میں چلی جائیگی اور میں جنت کا واحد مالک قرار دیا جاؤنگا۔ "جہنم کو دوسروں کا مقام بتاتا ہے۔ اور نہیں سوچتا کہ وہ خود جہنم میں کھڑا وعظ کہہ رہا ہے"۔ چونکہ مسلمان نے اس تن آسانی کی موت کو ہی صحیح زندگی سمجھ رکھا ہے۔ اسلئے جب کبھی کوئی زندگی بخش پیغام اس کے سامنے آتا ہے یہ اس سے آنکھیں بند کرلیتا ہے اور چونکہ اس زندگی بخش پیام میں اسکے معبودان باطل کی موت کا راز بھی پنہاں ہوتا ہے اسلئے وہ مسلمانوں کو بھڑکاتے ہیں اور انہیں اس پیام دینے والے کے پیچھے لگادیتے ہیں۔ ذرا تاریخ کے اوراق کو الٹو اور دیکھو کہ مسلمان نے جس وقت سے قرآن کو چھوڑا اس کے بعد کتنے مواقع آئے جب قرآن کے پیام حیات آور کو اسکے سامنے لانے کی کوشش کیگئی لیکن اس نے اس نور کو دیکھکر چمگاڈر کی طرح آنکھیں بند کرلیں۔ اور اسکے خودساختہ معبودوں نے اس نورِ مبین کے خلاف کس شدت وولولہ سے نبرد آزمائی کی۔ اور اس پر پردہ ڈالنے کی مساعیٔ نامشکور کو کن کن مقدس اصطلاحات کا رنگ

دیکر اس "جہاد" کو خدمتِ دینی بتایا۔ اور یوں بظاہر دوسروں کو لیکن فی الحقیقت اپنے آپ کو کھلے ہوئے دھوکے میں رکھا۔ "وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا كَانُوا يَشْعُرُونَ" گذشتہ ادوار کو چھوڑیئے خود اپنے زمانہ میں دیکھئے مسلمان فاسق و فاجر ہیں بد سے بدتر آلائشوں میں ملوّث ہیں عقائد و اعمال کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جس پر کوئی نہ کوئی دھبہ نہ ہو۔ ان سب کو برداشت کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جونہی کسی نے قرآن کو سامنے کیا، ہر عقیدہ کا مسلمان اس کی مخالفت کے "جہادِ عظیم" میں حصہ لینے کے لئے بڑھ کر نکل آیا۔ ہمارے سامنے ہندی مسلمانوں کو قرآن کے پیغام سے شناسا کرانے کے لئے دو جلیل القدر ہستیاں آگے بڑھیں، ایک حضرت علامہ اقبالؒ اور دوسرے علامہ مشرقی۔ ایک نے ذہنی دنیا کو اپیل کیا۔ دوسرے نے عملی دنیا کو حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنے پیغام کے لئے شاعری کو ذریعہ قرار دیا اس لئے مُلّا کی سنگ باری سے بچ گئے۔ کفر کے فتوے تو اُن پر بھی لگے لیکن خیر انہیں یہ کہکر "بخشدیا گیا" کہ یہ ایک شاعر ہیں اور شاعر کی کوئی بات قابلِ گرفت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ عجمی تصوّف نے اس سے بہت پہلے شاعر کو مرفوع القلم قرار دے رکھا تھا۔ جو بات آپ نثر میں لکھکر قابلِ سوختنی قرار پا جائیں۔ اس سے کہیں زیادہ بڑھ کر شعر میں کہدیجئے۔ سب مزے لے لے کر دھرائیں گے۔ ہر چند حضرت علامہؒ بار بار اعلان کرتے رہے کہ میں شاعر نہیں ہوں۔ لیکن انہیں شعرا ہی کی صف میں رکھا گیا۔ اور اس لئے ان سے کچھ زیادہ مواخذہ نہیں ہوا۔ شاعری کے چولہ نے اتنا فائدہ ضرور دیا لیکن اس کے ساتھ ہی نقصان یہ ہوا کہ جنہوں نے ان کے پیغام سے اثر قبول کیا انہوں نے بھی اس اثر کو "شاعری" تک ہی محدود رکھا۔ یعنی ذہنوں میں انقلاب ضرور ہوا لیکن وہ انقلاب عملی پیکر اختیار نہ کر سکا۔ حتیٰ کہ عقیدتمندانِ اقبالؒ کے اس وسیع حلقہ کے باوجود آج تک ان کی کوئی یادگار بھی قائم نہ ہو سکی حالانکہ یہی پیغام کسی زندہ قوم کے سامنے ہوتا تو وہ دنیا کا تختہ الٹ کر رکھدیتی۔ علامہ مشرقی نے قرآن کا پیغام نثر میں دیا۔ اس لئے مخالفت کھلکر سامنے آگئی۔ جس جوش و شدّت سے مذکرہ کے خلاف "جہاد" کیا گیا ہے شاید ہی اس کی نظیر مل سکے۔ ہندوستان بھر میں (جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے) ایک علامہ اسلم جے راج پوری تھے جن کی قرآنی بصیرت نے اس جوہر کو پہچان کر اس کی تائید کی۔ ورنہ دو دو روپے ماہوار کے "آئمہ مساجد" سے لے کر بڑے بڑے "مفتیانِ عظام" تک ہر ایک اس مخالفت کے ہجوم میں شریک ہو کر جنّت کا پروانہ حاصل

کرر ہا تھا! (اور یہ مخالفت آج تک جاری ہے) قوموں کی بدبختی ان کے ماتھے پر لکھی..... نہیں ہوتی۔ اعمال و افکار سے ظاہر ہوا کرتی ہے۔ اگر ہندی مسلمان اپنے عذاب کی مدت ختم کرنا چاہتا تو وہ علامہ مشرقی کی قدر کرتا اور اس کی قدر کرنے سے خود ہندی مُسلمان قرآن کو ساری دنیا کے سامنے پیش کر سکتا۔ مشیت کے بھیدوں سے کوئی واقف نہیں ہو سکتا۔ ورنہ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ اگر اقبالؔ اور مشرقیؔ جیسی ہستیاں کسی آزاد مُلک میں پیدا ہوتیں تو دنیا میں صحیح انقلاب پیدا ہو جاتا اور آج چاروں طرف سے ٹھکرایا ہوا انسان ایک" نئی دنیا" کی تلاش میں جو یوں مارا مارا پھر رہا ہے وہ" نئی دنیا" اُس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی۔ قرآن سے باہر اس وحاقیت کی" نئی دُنیا" کہاں مل سکتی ہے؟ ابلیس کے چیلنج کے مقابلہ میں آدم سے یہی کہا گیا تھا کہ اس کی طاغوتی قوتوں سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (جب ہماری طرف سے ہدایت آئے گی تو جو اس ہدایت کی اتباع کر گیا تو اس کے لئے کسی قسم کا خوف اور حُزن نہیں ہو گا۔) دنیا آج خوف و حزن سے پناہ ڈھونڈھ رہی ہے اور یہ پناہ اسے کہیں نہیں مل رہی۔ اس لئے کہ قرآن اس کی نگاہوں کے سامنے نہیں قیامت ہے کہ مسلمانوں کی اتنی اتنی بڑی حکومتیں موجود ہیں لیکن قرآنِ کریم کی آواز کہیں سے بلند نہیں ہوتی۔ ان کے اخبارات کو دیکھئے ان کے مشاہیر کے افکار کا مطالعہ کیجئے اُن کی سیاسی اور قانونی اور علمی اور معاشرتی مجالس و محافل کی رُوداد پڑھئے۔ ان کے ریڈیو پہ کان لگا کر بیٹھ جایئے۔ سب کچھ ہو گا۔ لیکن نہیں ہو گا تو قرآن اور یہ اس لئے کہ اگر قرآن سامنے آ جائے تو پھر یہ انسانی حکومتیں باقی کہاں رہیں؟ ہم تو جب اپنی قوم کی بوالعجبیو پر غور کرتے ہیں تو بے اختیار اندوہ و تاسف کی ہنسی آ جاتی ہے۔ ذرا سوچئے۔ بنی اُمیہ کا سب سے بڑا جُرم یہ تھا کہ انہوں نے خلافت کو ملوکیت میں تبدیل کر دیا۔ یعنی حکومت۔ وراثت میں ملنے لگی۔ باپ کے بعد بیٹا تخت کا مالک قرار پا گیا۔ یقیناً یہ بہت بڑا جُرم تھا۔ لیکن غور فرمایئے کہ اس وقت سے آج تک مسلمانوں کے ہر مُلک ہر خطہ۔ ہر خاندان میں سلطنت کا وہی طریقہ نہیں چلا آ رہا؟ لیکن مسلمان ان اربابِ سلطنت کے خلاف ایک لفظ بھی زبان تک نہیں لاتا؟ یہی نہیں کہ مخالفت کا ایک لفظ زبان تک نہیں لاتا بلکہ ان کی مدح و ستائش میں قصائد لکھے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے اولوالعزم علمائے کرام اور جلیل القدر مفتیانِ عظام ان بادشاہوں

کے درباروں میں مسندوں پر بیٹھے اور ان کی سلطنت میں منبروں پر جلوہ فرما انہیں ظلّ اللہ قرار دے رہے ہیں۔ ایدہ اللہ بنصرہٖ اور خلد اللہ ملکہ کے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ابھی تک سلاطین کا نام جمعہ کے خطبوں میں سر منبر لیا جاتا تھا۔ حالانکہ وہ سلاطین وہی تھے جنہیں سلطنت اپنے باپ دادا سے وراثتاً ملتی چلی آ رہی تھی۔ الغائے خلافت کے وقت مسلمانوں نے کہرام مچا دیا کہ مصطفےٰ کمال نے ایک بہت بڑے "اسلامی رکن" کو منہدم کر دیا۔ لیکن کسی نے اتنا نہ سوچا کہ جس رکن کو وہ "اسلامی" کہہ رہے تھے خود اسلام کے میزان میں اس کی حقیقت کیا ہے؟ آج بھی وہی حالت ہے۔ دنیا بھر کی مسلمانوں کی حکومتوں پر نگاہ ڈالو۔ (خواہ مکہ کی مقدس وادیوں میں ہو یا ہندوستان کی کسی ریاست میں) سلطنت اسی طرح وراثتاً منتقل ہوتی چلی آ رہی ہے جس طرح بنی امیہ میں تھی۔ طرفہ تماشا یہ کہ بنی امیہ کو آج گردن زدنی قرار دیا جا رہا ہے۔ اور ان شاہانِ اسلام کے لئے ہر مدرسہ اور ہر خانقاہ سے خیر و برکت کی دعائیں پکاری جاتی ہیں! کبھی مسلمان کا خیال اس طرف نہیں جاتا کہ جس جرم کی پاداش میں بنی امیہ گردن زدنی قرار پاتے ہیں وہی جرم ان کے ہاں بھی ہو رہا ہے۔ جن کے نام اس تقدیس و احترام سے لئے جا رہے ہیں۔ مسلمان کا خیال اس طرف کیوں نہیں آتا؟ اس لئے کہ قرآن اس کے سامنے نہیں۔ یہ حکومتیں قرآنِ کریم کو سامنے نہیں آنے دیتیں کہ وہ جانتی ہیں کہ جاء الحق و زھق الباطل قرآن کا نور آیا اور ملوکیت کی ظلمت نابود ہوئی۔ ملا قرآن کو سامنے نہیں آنے دیتا کہ اس کی روشنی میں اس کی برہمنیت ختم ہو جاتی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ حکومت اور ملّا کا تعلق ہی کچھ برہمن اور کشتری کا سا ہو چکا ہے۔ حکومت ملا کی محافظ ہے کہ وہ اس کی حفظ و بقا کے لئے دعائیں مانگتا ہے۔ اور ملا حکومت کا محافظ ہے کہ وہ اس کی کفالت کی ذمہ دار ہے۔ باقی رہے ارباب طریقت سو ان کا سارا دارومدار رجعیت پر ہے۔ قرآنِ کریم میں اس رہبانیت کی کہاں گنجائش؟ لہٰذا وہ کس طرح چاہیں کہ قرآن بے نقاب ہو جائے۔ ایک قرآن اور اس کے اوپر اتنے پردے۔ "ظلمات بعضہا فوق بعض" (نور ۲۴/۴۰) اس لئے جہاں کہیں قرآن سے پردہ اٹھنے کی کوشش ہوتی ہے یہ تمام قوتیں یورش کر کے امنڈ آتی ہیں۔ (شیطان چاروں طرف سے حملے کرتا ہے) بڑی بڑی حکومتیں تو ایک طرف یہ چھوٹے چھوٹے امراء، اور جاگیردار، رؤسا، اور زمیندار بھی اسی مخالفت میں برابر کے شریک ہوتے ہیں اسلئے کہ قرآن

کی روشنی میں ان کی یہ جاگیریں اور زمینداریاں کہاں باقی رہ سکتی ہیں؟ ایک ایک شخص کے قبضہ میں دس دس ہزار ایکڑ زمین! خدا کی زمین پر انسان کی ملکیت!! خدا کی بادشاہت میں اس کی کہاں اجازت؟ ان رؤسا و امراء کی "خدماتِ دینی" کی تفاصیل دیکھئے! فلاں مدرسہ کو وظیفہ دے رہے ہیں۔ فلاں دارالافتاء کی کفالت کر رہے ہیں۔ فلاں عالم کی "خدمت" ہو رہی ہے۔ یہ ان کی پرورش کرتے ہیں۔ اور اس کے معاوضہ میں اُن کی طرف سے اِن کی زمینداریوں اور جاگیروں کے جواز کے فتاویٰ ملتے رہتے ہیں۔ ذرا ان دینی مکاتب میں جا کر دیکھئے۔ ان علوم کی درس و تدریس ہو رہی ہے جن کو نہ دین سے کچھ علاقہ نہ دنیا سے کچھ واسطہ ایک ایک درجہ میں دس دس کتابیں ہوں گی لیکن اس سارے نصاب میں قرآن کا نام یونہی تبرکاً رکھا ہو گا اور برکت حاصل کرنے کے لئے سورۂ بقرہ کی تفسیر پڑھا دیں گے۔ کسی فارغ التحصیل مولوی صاحب سے بات کیجئے۔ "دین" کے متعلق ہدایہ۔ قسطی چلپی کے صفحے کے صفحات رٹے ہوئے سنا دیں گے لیکن قرآن کریم کے کسی حکم کا کوئی حوالہ یاد نہ ہو گا۔ "دنیا" کی طرف آیئے تو انہیں یہ بھی معلوم نہ ہو گا کہ خطۂ ارض پر براعظم کتنے ہیں۔ ادھر کسی رئیس زادہ سے ملئے تو انہیں شکاری کتوں کی بیسیوں قسمیں معلوم ہوں گی۔ لیکن نہ نماز آتی ہو گی نہ یہ معلوم ہو گا کہ آج کل وزیر ہند کون ہیں۔ اپنے علاقہ سے انتخاب میں کھڑے ہوں گے۔ اور اپنی رعایا کے ووٹوں سے "جمہور" کے نمائندے بن کر اسمبلی میں آ جائیں گے۔ وہاں اگر اپنے جیسے پانچ سات کو ساتھ ملا لیا تو وزارت دھری ہے۔ اب ان سے یہ توقع رکھنا کہ سرفرازئ اسلام کے لئے کوئی اقدام کریں گے بے معنی خوش فہمی ہے۔ یہ اسلام کے نمائندے تو ایک طرف۔ درحقیقت مسلمانوں کے نمائندے بھی نہیں کہلا سکتے۔ یوں نمائندہ بننے کو تو سر ظفر اللہ خاں صاحب بھی ان نو کروڑ مسلمانوں کے نمائندے بن سکتے ہیں۔ جنہیں کافر و دائرہ اسلام سے خارج سمجھنا ان کے عقیدہ میں داخل ہے۔ لہٰذا قرآن کی آواز نہ آپ کے ان دینی اور علمی مراکز سے اُٹھ سکیگی۔ نہ کسی دنیاوی گوشہ سے جب آج مرکزِ اسلام مکہ معظمہ کی یہ حالت ہو کہ وہاں کی گلیوں میں کھلے بندوں انسانوں کی خرید و فروخت ہوتی ہو۔ تو قرآن کا نور اور کہاں سے دکھائی دیگا!

دینی مدارس کے متعلق کہدیا جائیگا کہ وہ ہمارے قدامت پرستی کے مظاہرے ہیں۔ لیکن ہماری

جدّت پسند درسگاہوں کی حالت کونسی رشک آور ہے اینگلو مسلم ہائی اسکول اسلامیہ کالج مسلم یونیورسٹی کسی کو دیکھئے۔ اسلام اور مسلم کا نام اسی طرح تبرکاً لگا رکھا ہوگا جس طرح خط پر ۷۸۶ لکھدیتے ہیں نہ اسے نفسِ مضمون سے کوئی علاقہ نہ اسے روحِ تعلیم سے کوئی تعلق۔ وجہِ جوازِ ان درسگاہوں کی فقط اتنی ہے کہ غیر مسلم درسگاہیں مسلمان طلبار کو اپنے ہاں داخل نہیں کرتیں۔ قوم کو بہلانے کی خاطر وہاں دینیات بھی داخلِ نصاب ہوگا۔ لیکن دینیات کی حدود طہارت کے مسائل سے آگے نہیں بڑھیں گی۔ اگر کہیں زمانے کے مقتضیات سے مجبور ہو کر اس نصاب میں تبدیلی بھی کی جائیگی تو وہ بھی نظری مسائل کی چار دیواری میں محصور ہو کر رہجائیگی وہ جنوں انگیز مستی کردار جو قرآنی تعلیم سے رگ وپے میں برقی تپاں بن کر دوڑ جاتی ہے۔ کہیں محسوس نہ ہوگی۔ قوم کے نوجوان، یا تو چلتی پھرتی لاشیں یا پھر کیسر آتشیں مخلوق۔ نہ اول الذکر میں زندگی کے آثار نہ مؤخر الذکو میں اطاعت کا شعار۔ اس لئے کہ قرآنِ کریم نہ ان کے سامنے نہ ان کے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان حالات کے ماتحت ہمیں بالکل مایوس ہوجانا چاہئے؟ یہ تو غلط ہے قرآن کریم تکمیلِ شرفِ انسانیّت کا نصاب ہے۔ اس لئے جب تک دنیا میں انسان کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہے اسے قرآن کی ضرورت رہیگی۔ اور جب تک وہ انسانیّت کے معراج تک نہیں پہونچتا قرآن کا فریضہ ادا نہیں ہوگا لہٰذا مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ جب ہم عام انسانوں سے مایوس نہیں تو مسلمانوں سے کیسے مایوس ہو جائیں گے۔

سب سے پہلے تو یہ کہ ہم خود بھی کسی الگ مقام سے نہیں بول رہے۔ ہم بھی انہی مسلمانوں میں سے ہیں جن کی کیفیّت گذشتہ اوراق میں بیان کی گئی ہے۔ مسلمان ہزار گئے گذرے سہی۔ لیکن ہماری آنکھوں کا نُور اور دل کا سرُور ہیں۔ یہ محض جذباتی خوش عقیدگی کی بنا پر نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہے۔ غیر مسلم آئینِ خداوندی سے انکار، استہزاء اور سرکشی کا برتاؤ کرتا ہے لیکن مسلمان خواہ نام ہی کا مسلمان کیوں نہ ہو ایسی روش کبھی اختیار نہیں کرسکتا۔ ان لاکھوں میں ایک آدھ مستثنیات کو چھوڑ کر جن کی طرف سے استہزاء و سرکشی کے مظاہرے سامنے آجاتے ہیں مسلمان سرکشی کا تصوّر بھی نہیں کرسکتا۔ ان میں سے اکثریّت تو ان کی ہے جو محض جہالت کی بنا پر روحِ اسلام سے دُور ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جنہیں اتنی قوّتِ ایمانی نہیں کہ وہ اپنے ذاتی رجحانات اور مصالح و مقاصد کو آئینِ الٰہی

کے تابع رکھ سکیں۔ دانستہ سرکشی اور عمداً انکار و استہزار کی اصلاح نہیں کی جا سکتی۔ لیکن جہالت یا کمزوری کی اصلاح کی جا سکتی ہے اسلئے آج بھی جبکہ دنیا فساد در فساد کا ہولناک منظر بن رہی ہے۔ ہماری امیدیں اس گئی گذری قوم سے وابستہ ہیں جو آج فی الواقعہ زندہ قوموں کی صف میں شمار کئے جانے کے قابل نہیں۔ اور اس سوختہ بخت قوم میں سے بھی بالخصوص ہندی مسلمانوں سے۔ یہ امر غالباً آپ کو بظاہر مضحکہ انگیز تضاد نظر آئیگا۔ لیکن یہ بھی حقیقت پر مبنی ہے۔ دنیا کے باقی حصّوں میں مسلمانوں کی اپنی حکومتیں قائم ہیں۔ وہ حکومتیں اگرچہ غیر قرآنی خطوط پر متشکّل ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی اپنی حکومتیں ہیں۔ اس لئے انہیں اس اَمر کا احساس مشکل ہو سکتا ہے کہ ہم خدا کے عذاب میں گرفتار ہیں برعکس اس کے ہندوستان کے مسلمانوں کو احساس ہو رہا ہے کہ وہ غیروں کی غلامی میں زندگی بسر کر رہا ہے جو خدا کا عذاب ہے۔ اس لئے وہ موجودہ حالت پر مطمئن نہیں رہ سکتا۔ یہاں کے حالات ہر چند نامساعد ہیں۔ لیکن جو کچھ آج ساری دنیا میں ہو رہا ہے اس کے پیشِ نظر یہ معلوم کر لینا کچھ دشوار نہیں کہ فطرت ایک جہانِ نو کی تخلیق میں مصروفِ عمل ہے۔ دنیا نئے پیمانوں میں ڈھلنے کے لئے تیّار ہو رہی ہے۔ موجودہ نقشے مٹ رہے ہیں۔ نئے نقوش اُبھر رہے ہیں چشمِ بصیرت دیکھ رہی ہے کہ اس کے بعد نہ یہ نظامِ زندگی رہیگا نہ یہ دنیا کی تقسیم رہیگی۔ یہ زمین بدل جائیگی.........

.......یہ آسمان بدل جائیگا (تبدل الارض غیر الارض والسمٰوات) اور اس جدید ترقی میں ہندی مسلمان بھی اپنے آپ کو ایک نئی دنیا میں موجود پائیگا۔ اس تخریب و تعمیر کی رہ ہی میں ایک بڑا خطرہ یہاں کی تحریکِ توحید پرستی سے تھا جو مسلمان کو مسلمان کی حیثیت سے باقی نہیں رہنے دینا چاہتی تھی۔ اس مشئوم تحریک سے اللہ تعالیٰ نے مُسلمان کو بچا لیا۔ اور مسلم لیگ کی وکالت سے (کہ ہم جناب جناح کو مسلمانوں کا بہترین وکیل سمجھتے ہیں۔) وہ خطرہ دور ہو گیا۔ اس لئے اب ہمیں امید ہو گئی ہے کہ دنیا جب اس بحران سے نکلیگی تو ہندی مسلمان داستانِ پارینہ نہیں بن چکا ہوگا۔ لیکن اس آنے والے وقت کے لئے مسلمان کو آج ہی سے تیار رہنا چاہئے اگر اس تشکیلِ جدید میں کہیں بنیادیں غیر قرآنی رکھدی گئیں تو پھر ثریا تک عمارت غلط رکھتی چلی جائیگی۔ اور ہم ایک لعنت سے نکل کر دوسری لعنت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ جس میں باقی دنیا کے مسلمان گرفتار ہیں۔ یعنی قرآن کریم سے بُعد۔ اس کے لئے ضرورت صرف اتنی ہے کہ نوجوانوں کے

طبقہ میں قرآن پھیلا دیا جائے۔ اس کے لئے ہمیں موجودہ دینیاتی اور دنیادی درسگاہوں سے کوئی توقع نہیں ان کی بنیادیں ہی غلط ہیں۔ اور غلط بنیادوں پر قرآن کی عمارت کبھی اٹھ نہیں سکتی۔ اس کے لئے تو ایک نئی طرح ڈالنی ہوگی۔ یہ آثار نیک ہیں کہ نوجوانوں کے طبقہ میں بتدریج قرآن کی طرف رجحان پیدا ہو رہا ہے لیکن جب تک قرآنی تعلیم کا صحیح نظام اور اس نظام کی عملی تشکیل سامنے نہ ہو یہ رجحان اپنے فطری نتائج پیدا نہیں کرسکتا۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد یہ رجحان بھی مدھم پڑ جائے۔ قرآن ایک عملی نظامِ حیات ہے۔ اور ذوقِ عمل کی لذت ہی وہ چاشنی ہے جس سے اس کی جاذبیتیں نکھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ ہمارے نوجوانوں میں ذوقِ عمل بھی ہے۔ لیکن چونکہ اس کا محرک جذبہ صحیح قرآنی تعلیم کا پیدا کردہ نہیں۔ اس لئے ان کا جوش کروٹا محض سطحی اور عارضی بن کر رہ جاتا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ان کے اس ذوق اور تڑپ کو ایمان کی صحیح بُنیادوں پر استوار کر دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ جو کچھ سطورِ بالا میں گذارش کیا گیا ہے کیا آپ کو اس سے اتفاق ہے؟ اگر اتفاق ہے تو فرمایئے اس کیلئے آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ اور کیا کر سکتے ہیں؟ کیا آپ کے ذہن میں اس کے لئے کوئی عملی اسکیم بھی ہے؟ ہمارے سامنے تو بہت سی چیزیں ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آپ اس میں کس قدر حصہ لے سکتے ہیں؟۔ لیکن اگر آپ اپنی موجودہ حالت سے خوش۔ اور مستقبل سے بے نیاز ہیں تو پھر آپ سے تخاطب ہی فضول ہے۔

قائداعظم

اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

ایسی آنکھ جس کو مل سکے گی جو تاریکی کے جانے اور روشنی کے آنے کے درمیانی لمحہ کو بھانپ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ہر دو مراحل کے درمیان حد فاصل ہوتی ہی نہیں روشنی ایک چمک ہے۔ جونہی وہ پیدا ہوئی۔ اندھیرا غائب ہو گیا۔ خواہ وہ اندھیرا سالہا سال کا بھی پرانا کیوں نہ ہو۔ قلب و دماغ کی دنیا میں اس کا نام **انشراحِ صدر** ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ علم ہی وہ **نور** ہے جس کے آنے سے جہالت کی تاریکی کافور ہو جاتی ہے۔ لیکن علم کے لئے ضروری نہیں کہ وہ انسانوں کے متعین کردہ نصاب کے چکروں سے گذر کر ہی حاصل ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو قلبِ سلیم اور ذہنِ رسا عطا فرمائے تو ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کی وادیٔ نور سے ایک بار گذرنے سے ہی اس کی نگاہوں میں وہ بصیرت پیدا ہو جائے جو حقیقتِ اشیاء کو بے نقاب اور رموزِ دین کو اس طرح بے پردہ دیکھ لے جو دوسرے کو عمر بھر کی ورق گردانی کے بعد میسر نہ آ سکے۔ اس قسم کے انشراحِ صدر اور کشفِ غطا کی بہت سی مثالیں سامنے آ سکتی ہیں لیکن ان میں نزدیک ترین مثال وہ ہے جو ناخدائے کشتیٔ ملت جناب محمد علی جناح کی نگہِ حقیقت بیں میں بصیرتِ فرقانی بن کر چمکی ہے۔ جناب **جناح** کے خلاف، کتاب خوان طبقہ کی طرف سے جو اپنے آپ کو حقائقِ دینی کا واحد اجارہ دار سمجھتا ہے۔ ہمیشہ یہ اعتراض عائد کیا جاتا ہے کہ یہ **مسٹر کیا جانے دین** کسے کہتے ہیں؟ اس میں شبہ نہیں کہ اگر دین جاننے سے مفہوم یہ ہے کہ وہ **کافیہ** اور **قطبی** پڑھا ہوا ہے یا نہیں۔ تو بیشک مسٹر جناح دین سے ناواقف ہے۔ لیکن اگر سوال یہ ہے کہ وہ **دین** کی حقیقت سے واقف ہے یا نہیں تو بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس باب میں اپنے اس مخلص بندے کو وہ بصیرت عطا فرمائی ہے جس کے لئے بڑے بڑے "مدعیانِ علمِ شریعت" کو دعائیں مانگنی چاہئیں۔ ذرا غور فرمائیے کہ آج ہمارا علمائے کرام کا طبقہ اپنے اسی "علم دین" پر ناز کرتا ہے جو انہیں یہ سکھا رہا ہے کہ ہندوستان میں مغربی اصول جمہوری کی بنا پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ حکومت قائم کی جائے جس میں اکثریت کے فیصلے قانون کی حیثیت اختیار کریں۔ باقی رہا اسلام۔ سو اگر مسلمانوں کو نماز۔ روزہ کی اجازت حاصل ہو جائے تو بس مقصد حاصل ہو گیا! اس کے برعکس یہ دیکھئے کہ مذہب اور اس کے لوازم کے متعلق یہ **مسٹر** کیا کہتا ہے اور اس کے بعد فیصلہ کیجئے کہ رموزِ دین سے یہ طبقہ "علمائے کرام" واقف ہے یا مسٹر محمد علی جناح۔

۱۰ اگست ۱۹۴۸ء کو جناب جناح حیدر آباد تشریف لے گئے وہاں بعض نوجوان طلباء نے ان سے کچھ سوالات کئے اس مکالمہ کو مسٹر محمود علی صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) نے محفوظ کر لیا اور اب اورینٹ پریس کی وساطت سے شائع ہوا ہے۔ یہ مکالمہ انگریزی زبان میں ہو گا لیکن اخبارات میں اس کا اردو ترجمہ شائع ہوا ہے۔ ہمارے سامنے **انقلاب** ۱۳ فروری ۱۹۴۸ء کا پرچہ ہے ترجمہ کی زبان میں کہیں کہیں الجھاؤ نظر آتا ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ ان مقامات میں سلاست پیدا کر دی جائے۔ ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے کہ دین کے متعلق مسٹر جناح کے کیا خیالات ہیں۔

سوال۔ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں۔

جواب۔ جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی۔ سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطے سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

سوال۔ اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت وغیرہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

جواب۔ اشتراکیت۔ بالشویت۔ یا ہر اسی قسم کے سیاسی اور معاشی مسلک۔ دراصل اسلام اور اس کے نظام سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط و ضبط و توازن نہیں پایا جاتا

سوال۔ ترکی حکومت تو ایک مادی اسٹیٹ ہے کیا اسے اسلامی حکومت مخالف ہے؟ آپ کا اس باب میں کیا خیال ہے؟

جواب۔ ترکی حکومت پر میرے خیال میں مادی حکومت ( ) کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی اب رہا اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز سو یہ بالکل واضح ہے

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں

اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کے لئے تعمیل کا مرکز قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ جس نوعیت کی بھی چاہتے ہوں) بہرحال آپ کو علاقہ اور سلطنت کی ضرورت ہے۔

سوال۔ وہ سلطنت ہیں ہند میں کس طرح نصیب ہو سکتی ہے۔

جواب۔ مسلم لیگ۔ اس کی تنظیم۔ اس کی جدوجہد۔ اس کا رُخ۔ اس کی راہ۔ سب اس سوال کے جواب ہیں۔

سوال۔ جب آپ اسلامی اصول کے نصب العین اور طریق کار دونوں میں بہترین اور برترین حکومت کا یقین رکھتے ہیں اور اجمالاً یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو خود مختار علاقے اس لئے مطلوب ہیں کہ وہاں وہ اپنے ذہنی میلانات اور تصورات زندگی کو بلا روک ٹوک بروئے کار اور روبہ ترقی لاسکیں۔ تو پھر اس میں کونسا امر مانع ہے کہ مسلم لیگ زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ اپنی جدوجہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کردے۔

جواب۔ (وقت یہ ہے کہ) جب اس جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت بغیر اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت تقسیم عمل اور اس کے اصل حدود کیا ہیں۔ ان امور کو صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کرلیتی ہے۔ اور (اپنے حلقہ سے باہر) اہلیت و استعداد کے باوجود مجھ میں یا آپ میں (یعنی کسی اور میں) اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی حالانکہ اس منصب کی بجاآوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے انھیں میں ان مولوی صاحبان میں (الا ماشاء اللہ) نہیں پاتا۔ (اور پھر مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔

*

ان تصریحات پر غور فرمایئے اور پھر سوچئے کہ کیا دین یہ ہے جسے مسٹر جناح پیش کر رہے ہیں یا وہ جو خیر سے علماء کرام کی جمعیت کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ دین جس میں امتزاج بولہبی و مصطفوی سے ایک ایسی متحدہ قومیت کی تشکیل کی جا رہی ہے جس کی آزادی میں طاغوتی اکثریت کا نظام حکومت کار فرما ہوگا۔ اس کے برعکس مسٹر جناح کا دین یہ ہے کہ اطاعت و وفا کیشی میں مرجع صرف خدا کی ذات ہے۔ اور اس کی تعمیل کا مرکز قرآن کریم کے احکام۔ مسلمان نہ کسی بادشاہ

کا محکوم ہو سکتا ہے نہ پارلیمان کا۔ نہ کسی شخص کا نہ ادارہ کا۔ بلکہ وہ صرف اپنے خدا کا محکوم ہو سکتا ہے اس لئے اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی احکام و اصول کی حکومت ہے" اور یہی وہ حکومت ہے جس کے لئے مسلم لیگ برسرِ پیکار ہے۔ وہ حضرات علماء کرام یہ ہے مسٹر جناح۔

اگر یہ خدا کی دین نہیں تو اور کیا ہے۔ سچ کہا تھا کسی نے کہ

زسومنات جناح وزکاشمیر اقبالؒ

زدیوبند حسین احمدؒ ایں چہ بوالعجبی است

ان تصریحات کے بعد غور فرمایئے کہ مسلم لیگ کی مخالفت دین خداوندی کے تمکن و ترویج کی مخالفت ہے۔ یا کوئی نیک کام اور یہ بھی کہ ایک ایسی جماعت کی موجودگی میں جس کا نصب العین یہ ہو۔ کسی اور جماعت کی تشکیل ملت میں تشتت و افتراق ہے یا صلاح و خیر!

اپنی آنکھ

اور

قرآن کریم کی روشنی

(پرویز)

کسی نئی زبان کے سیکھنے میں کس قدر محنت درکار ہوتی ہے۔ لیکن انسان کے بچہ کو دیکھئے کہ وہ ان دشوار گذار مراحل کو کس آسانی سے عبور کر لیتا ہے۔ بچہ جب بولنے کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس طرح بے تکلف باتیں شروع کر دیتا ہے گویا یہ سب کچھ اسے پہلے ہی سے یاد تھا۔ لیکن بچہ وہی زبان بولتا ہے جو اس کے گرد و پیش بولی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ اسے پہلے ہی سے یاد نہ تھا بلکہ اس نے اپنے گہوارہ میں خاموش نگاہوں سے سب کچھ سیکھ لیا تھا اور سیکھا اس پختگی سے کہ نہ صرف الفاظ ہی ازبر ہو گئے بلکہ اس لب و لہجہ کی بھی پوری پوری نقل کر لی جو اس کے ماحول کی فضا کو متحرک کر رہا تھا۔ اور نقل بھی ایسی مکمل کہ دو لفظ بولنے سے معلوم ہو جائے کہ بچہ کس خطہ اور کس قبیلے سے متعلق ہے۔ بڑی عمر میں پہنچ کر جو زبان سیکھی جائے اس میں اہلِ زبان کا سا لب و لہجہ پیدا کرنا، ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے اور ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ یہ پہچانا ہی نہ جا سکے کہ اس کی وہ زبان مادری ہے یا بعد میں سیکھی ہوئی۔ لیکن بچہ اس نقل کرنے میں کمال کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ بچے کا ذہن کس قدر اخّاذ ہوتا ہے اور وہ نقوش جو بچپنے ہی میں اس کے لوحِ قلب و دماغ پر آغوش اور میں منقش ہو جاتے ہیں کیسے انمٹ اور دیرپا ہوتے ہیں لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بچے کے دماغ کی یہ اخّاذی اور اثر قبولی صرف زبان تک ہی محدود ہے! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ دماغ تو بہر حال دماغ ہے۔ جب وہ حروف و الفاظ اور لب و لہجہ کی حرکات و سکنات سے ایسا متاثر ہوتا ہے تو گرد و پیش کے دیگر احوال و کوائف سے اثر پذیر کیوں نہ ہو گا! زبان کی اثر پذیری چونکہ الفاظ کے محسوس پیکر میں ہمارے سامنے آجاتی ہے اس لئے ہم اسے ناپ لیتے ہیں۔ لیکن خیالات کی اثر پذیری چونکہ بچے کے قلب و دماغ میں غیر محسوس طور پر پرورش پاتی ہے اس لئے ہم اس کا احساس نہیں کرتے۔ کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ جنھوں نے کرنا چاہا انھوں نے ان غیر محسوس خیالات کو بھی ناپ اور تول کر دیکھ لیا۔ علم تجزیۂ نفس کی بنیاد بھی اسی اصول پر ہے۔ بہر حال ایک حقیقت ہے کہ انسان کا بچہ اپنے وراثتی اور ماحولی اثرات کا پیکر ہوتا ہے۔ اور یہی نقوش و اثرات آہستہ آہستہ وہ محکم چٹانیں بن جاتے ہیں جن پر اس کے نظریاتِ زندگی اور معتقداتِ حیات کی ثریا بوس عمارتیں قائم ہو جاتی ہیں۔

یہ اثرات جب توارث و تواتر سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے چلے آئیں تو ان کی ابتدا کتنی ہی غلط نہج پر کیوں نہ ہوئی ہو رفتہ رفتہ اس قوم کے نزدیک یہی صداقت و حقیقت کا معیار بن جاتے ہیں اس قوم کے فرد انتہائی خوش عقیدگی سے دل کے نازک ترین گوشوں میں چھپائے، سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں اور یہ غلط نظریات ان کے نزدیک ایسی گراں بہا متاع کی شکل اختیار کر جاتے ہیں کہ ان کا چھوڑنا تو ایک طرف، چھوڑنے کے تصور تک سے وہ اس طرح کانپ اٹھتے ہیں گویا ان کی کائنات لٹی جا رہی ہے۔ غلط نظریات و معتقدات کے یہ حسین نظر فریب پردے اتنے دبیز ہوتے ہیں کہ فطرتِ صحیحہ ان کے نیچے دب جاتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کا گلا اس طرح سے گھٹ جاتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کہیں زندہ بھی ہے یا نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان پردوں کو کون اٹھائے! اس خاص ماحول میں تو کم و بیش ہر ایک ان وراثتی اثرات سے متاثر ہوتا ہے۔ مبدا فطرت کی کرم گستری نے یہ انتظام اپنے ذمہ لیا کہ وقتاً فوقتاً ایسے پیغامات اس کی طرف سے آتے رہیں جو وراثت و ماحول کے تمام اثرات سے محفوظ و غیر متاثر اور انسان کی فطرتِ صحیحہ کے عین مطابق و موافق ہوں۔ دنیا میں سلسلۂ وحی و رسالت کی یہی لِم اور انتظام رشد و ہدایت کی یہی غایت ہے۔ یعنی انسان کی فطرتِ صحیحہ وراثت اور ماحول کے اثرات سے مسخ ہو جاتی ہے اور پیغامِ خداوندی ان غیر فطری اثرات کو دور کرنے کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ سعید روحیں فطرت سے ہم آہنگ پیغام کو جانی پہچانی ہوئی (معروف) آواز سمجھ کر اسے قبول کر لیتی ہیں۔ سرکش و متمرد انسان اپنے وراثتی معتقدات کو ایسا محکم اور یقینی خیال کر لیتا ہے کہ ان میں کسی قسم کے رد و بدل پر آمادہ نہیں ہوتا اور لاکھ ہزار دعوتِ غور و فکر دیجئے وہ اس پیغام کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتا۔ حق و باطل، خیر و شر، کفر و اسلام کی یہی کشاکش ہے جو روزِ ازل سے اس وقت تک ہر جگہ جاری و ساری ہے۔ سورۂ اعراف کے بائیسویں رکوع کو کھولئے اور دیکھئے کہ اس حقیقتِ کبریٰ کو کس بصیرت افروز انداز میں بیان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِىْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ڔ شَهِدْنَا ڔ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ

اور جب تمہارے رب نے بنی آدم سے، یعنی اس ذریت سے جو ان کے ہیکل سے پیدا ہونے والی تھی۔ عہد لیا تھا اور انہیں (یعنی ان میں سے ہر ایک کو اس کی فطرت میں) خود اس پر گواہ ٹھہرایا تھا (عہد یہ لیا تھا کہ) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا تھا کہ ہاں تو ہی ہمارا رب ہے۔ ہم نے اس کی گواہی دی۔ اور یہ اس لئے کیا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ تم قیامت

کے دن عذر کر بیٹھو کہ ہم اس سے بے خبر تھے۔

یعنی خدا کی ربوبیت کا اقرار خود فطرتِ انسانی کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیا گیا ہے اور انسان کی فطرتِ صالحہ کا تقاضا ہے کہ وہ دین کی اس صراطِ مستقیم پر رہے۔ اب اس سے اگلی آیت میں ہے کہ وراثتی اثرات انسان کو شرک کے غلط راستے پر ڈال دیتے ہیں۔

او تقولوآ انما اشرك اباؤنا من قبل وكنا ذرية من بعدهم افتهلكنا بما فعل المبطلون ٥

یا تم یہ عذر کر بیٹھو کہ شرک ہم سے پہلے ہمارے آباؤ اجداد نے کیا۔ ہم ان کی نسل میں بعد کو پیدا ہوئے اور (لاچار وہی چال چلے جس پر پہلوں کو چلتے پایا) پھر کیا تو ہمیں اس بات کے لئے ہلاک کرے گا (جو ہم سے پہلے) جھوٹی راہ چلنے والوں کی تھی! (۷/۱۷۳)

اب یہ واضح ہے کہ فطرتِ صالحہ کا تقاضا کچھ اور ہے اور غلط روی کے آبائی اثرات اس فطرت کو مسخ کر دیتے ہیں۔ احول و وراثت کے ان غیر فطری اثرات کو زائل کر کے فطرتِ صحیحہ کو بروئے کار لانے کا کیا طریق ہے؟ اس کے متعلق چار آیات بعد فرمایا کہ یہ صرف خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی ہدایت کے اتباع سے ہو سکتا ہے۔

من يهد الله فهو المهتدي ج ومن يضلل فاولئك هم الخسرون ٥

جسے اللہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق ہدایت دے وہی سیدھی راہ پر ہے۔ اور جس پر (اسی قانون کے مطابق) راہ گم کر دے۔ تو یہ لوگ خسارے میں ہیں۔ (۷/۱۷۸)

لیکن وہ قانون کیا ہے جس کی رو سے خدا کے نازل کردہ پیغام سے ہدایت حاصل کی جا سکتی ہے اور وہ روش کونسی ہے جس سے اس ہدایت سے مستفید نہیں ہوا جا سکتا؟ اس کی تشریح اگلی آیت میں فرما دی۔ جس میں ارشاد فرمایا کہ ہدایت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان خدا کی دی ہوئی عقل سے کام لے۔ ذہن و ادراک کی قوتوں کو کام میں لائے ڈھور ڈنگر کی طرح آنکھیں بند کر کے، جس ڈگر پر چلے آ رہے ہیں۔ اسی پر نہ چلتا جائے۔ اگر انسان نے فکر و نظر سے کام نہ لیا تو اس پر ہدایت کی روشنی گم ہو جائے گی۔ روشنی سے تو وہی مستفید ہو سکتا ہے جو اپنی آنکھیں کھول کر رکھے۔ آنکھیں بند کر کے، دوسروں کی لکڑی کے سہارے چلنے والوں کا انجام جہنم ہے فرمایا۔

ولقد ذرانا لجهنم كثيرا من الجن والانس لهم قلوب لا يفقهون بها ولهم اعين لا يبصرون بها ولهم اذان لا يسمعون بها اولئك كالانعام بل هم

اَضَلُّ ۚ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝

اور کتنے ہی جن اور انسان ہیں جنھیں ہم نے جہنم کے لئے پیدا کیا (یعنی ان کا بالآخر ٹھکانا جہنم ہونے والا ہے) یہ اس لئے کہ ان کے پاس عقل ہے لیکن اس سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے وہ (عقل و شعور کی قوتوں کو بیکار کرکے) چارپایوں کی مانند ہو گئے۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو یکسر غفلت میں ڈوب گئے ۷/۱۷۹

یہ ہیں وہ بنیادی خطوط جن پر حق و باطل کی کشمکش مسلسل ہوتی چلی آرہی ہے یعنی فطرت صالحہ پر خارجی اور وراثتی اثرات غیر فطری پردے ڈال دیتے ہیں۔ اس پر پیغام خداوندی۔ جو ماحول و وراثت کے تمام اثرات سے پاکیزہ و منزہ ہوتا ہے ان کے سامنے آتا ہے تقلیدی اثرات کا تقاضا ہوتا ہے کہ انسان اس دعوت پر غور و فکر نہ کرے بلکہ ضد سے اسی روش پر جائے جس پر اس کے آباؤ اجداد چلتے رہے ہیں اور جسے وہ وراثتی اور گردو پیش کے خارجی اثرات کے ماتحت صحیح راہ سمجھ رہا ہے۔ اس کا نتیجہ جہنم ہے اور ہلاکت۔ جس دن سے خدا کا پیغام دنیا میں آنا شروع ہوا۔ اس دن سے آج تک جہل و بصیرت اور تقلید و تجدید کی یہ کشمکش جاری ہے۔ قرآن کریم میں امم سابقہ کے احوال و کوائف بیان کرکے اس حقیقت اولیٰ کو بے نقاب کیا گیا ہے تاکہ آنے والے لوگ اس سے عبرت حاصل کریں چنانچہ مندرجہ صدر آیات میں مذکور ہے کہ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۷/۱۷۶) سو اے پیغمبر یہ حکایتیں لوگوں سے بیان کرو تاکہ وہ ان میں غور و فکر کریں۔

قرآن کریم کے بیان کردہ امم سابقہ کے ان قصص و حکایات کو سامنے لائیے اور پھر ان پر غور کیجئے آپ دیکھیں گے کہ بار بار اسی حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ آبائی تقلید سے انسان فطرت کے صحیح راستہ سے ہٹ جاتے تھے۔ اس کے بعد حضرات انبیاء کرام علیہ کی وساطت سے آسمانی پیغام ان تک آتا۔ لیکن ان میں سے اکثر اس سے محض اس لئے اعراض برتتے کہ وہ پیغام ان کے آباؤ اجداد کی روش کے خلاف ہوتا۔ حالانکہ اس پیغام کی دعوت سراسر عقل و بصیرت اور غور و تدبر پر مبنی ہوتی لیکن وہ لوگ غور و تفکر کے پاس نہ پھٹکتے اور جس راہ پر چلے آرہے تھے اسی پر چلے جانے میں عافیت سمجھتے۔ سب سے پہلے قوم حضرت نوحؑ کو لیجئے۔ ان تک پیغام خداوندی آیا۔ لیکن انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۝ ۲۳/۲۴ ہم نے اپنے اگلے بزرگوں سے ایسی بات کبھی نہیں سنی۔

یعنی انکار کی وجہ یہ ہے کہ یہ دعوت ان کے اسلاف کی روش کے خلاف تھی اور انھوں نے اپنے بزرگوں سے کبھی ایسی بات نہیں سنی تھی ۔

قومِ نوحؑ کے بعد حضرت ہودؑ کی قوم کو لیجیے۔ جب ان سے کہا گیا کہ ایک خدائے قہار کی عبودیت اختیار کرو تو انھوں نے کہا کہ ۔

أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآءُنَا (بے)

کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ ہم صرف ایک خدا کی عبودیت اختیار کریں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبودیت ہمارے آبا و اجداد کرتے چلے آئے ہیں

وہی سازکہن کہ جس روش پر اسلاف چلتے آرہے ہیں اسے چھوڑ کر اس نئی روش کو کس طرح اختیار کر لیا جائے یعنی اپنے مسلک کی تائید و صداقت میں کوئی دلیل نہیں کوئی برہان نہیں بس دلیل ہے تو فقط اتنی کہ یہ وہ راہ ہے جس پر ان کے آبا و اجداد چلتے آرہے ہیں ۔

قوم ہودؑ کے بعد حضرت صالحؑ کی قوم کو دیکھئے ۔ قوم کو اس مردِ صالحؑ سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں ۔ انھوں نے سمجھا تھا کہ یہ ہمارے باپ دادا کی روش پر چل کر ہماری پیشوائی کرے گا ۔ لیکن جب اس نے حق و صداقت کی ایسی بات کہہ دی جو ان کے آبائی مسلک و طریق کے خلاف تھی ۔ تو انھوں نے منہ پھیر لیا اور کہہ دیا کہ اف! کیسا افسوس کا مقام ہے ۔ اس شخص سے کتنی امیدیں وابستہ تھیں اور اس نے کس طرح ان سب کو خاک میں ملا دیا ۔

قالوا يصٰلح قد كنت فينا مرجوًّا قبل هٰذآ اتنهٰنآ ان نعبد ما يعبد

اٰبآؤنا وانّنا لفى شك مّما تدعونآ اليه مريب؟

انہوں نے کہا کہ اے صالح پہلے تو تو ایک ایسا آدمی تھا کہ ہم سب کی امیدیں تجھ سے وابستہ تھیں ۔ پھر کیا تو ہمیں روکتا ہے کہ ہم ان معبودوں کی عبودیت اختیار نہ کریں ۔ جن کی عبادت ہمارے آباء اجداد کرتے چلے آرہے ہیں ۔ ہمیں تو اس بات میں بڑا ہی شک ہے جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو کہ ہمارے دلمیں نہیں آتی ؟ 11/62

ایسا ہی جواب حضرت شعیبؑ کو اپنی قوم کی طرف سے ملا ۔ انھوں نے قوم کو اس غلط راستے سے روکا جس پر وہ آبائی تقلید کی رو سے آنکھیں بند کر کے چلے آرہے تھے ۔ تو قوم نے جواب دیا ۔

قالوا يشعيب اصلٰوتك تامرك ان نترك ما يعبد اٰبآؤنآ او نفعل فى

اموالنا ما نشٰؤُا ؕ انّك لانت الحليم الرّشيد ٥

قوم نے کہا کہ۔ اے شعیب۔ کیا تیری یہ نمازیں تجھے یہ حکم دیتی ہیں کہ ہمیں آکر کہے کہ ان معبودوں کو چھوڑ دو جن کی عبودیت تمہارے باپ دادا اختیار کرتے چلے آئے ہیں، یا یہ تمہیں اختیار نہیں کہ اپنے مال میں جس طرح کا تصرف کرنا چاہو۔ کرو۔ بس تم ہی ایک نرم دل اور راست باز آدمی رہ گئے ہو! 11/87

غور فرمائیے! اس جواب سے انکار و اعتراض کی راہ اختیار کرنے والوں کی نفسیاتی کیفیت کس طرح جھلک رہی ہے۔ یعنی ہمارے آباؤ اجداد سب غلط راستے پر تھے اور یہی ایک راہ راست پر ہے؟ "بڑا آیا کہیں سے تقدس مآب"؟ (معاذ اللہ) اسلاف کی راہ پر آنکھیں بند کرکے چلنے والوں کی بالکل یہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ ان کے قلوب پر بزرگوں کی عظمت و عقیدت اس درجہ چھا جاتی ہے کہ وہ انہیں معصوم اور منزہ عن الخطا سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ اور ایسے برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص ان کی روش کو غلط بتائے!

یہی کچھ فرعون کی قوم نے کہا۔ جب حضرت موسٰے اور حضرت ہارونؑ ان کے پاس خدا کی کھلی ہوئی نشانیاں لے کر گئے جن کا کوئی جواب ان کے پاس نہ تھا۔ تو بالآخر انھوں نے وہی جواب دیا جو اس سے پیشتر آبائی اثرات کے تحت ہر داعی الی الحق کو ملتا چلا آیا تھا۔ قالوا اجئتنا لتلفتنا عما وجدنا علیہ اباءنا

وتکون لکما الکبریاء فی الارض وما نحن لکما بمؤمنین ○

انھوں نے کہا کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ جس راہ پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو چلتے دیکھا ہے اس سے ہمیں ہٹا دو۔ اور ملک میں تم دونوں بھائیوں کے لئے سرداری ہو جائے ہم تو تمہاری بات ماننے کے نہیں! (10/78)

ملتِ حنیفہ کے موسس اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ نے بھی جب اپنی قوم کو اس غلط راہ سے روکا۔ جس پر ان کے آباؤ اجداد چلتے آرہے تھے تو انھیں بھی یہی جواب ملا کہ یہ وہ راہ ہے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا!۔

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ○ 21/53

انھوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو دیکھا۔ وہ انہی کی پرستش کیا کرتے تھے!

غرضیکہ جہاں جہاں اور جب کبھی پیغامِ خداوندی اپنی روشن دلیلوں کے ساتھ پہنچا تو ان لوگوں کی طرف سے جو اپنے آباؤ اجداد کے طور طریق پر چلے جانے میں ہی عافیت سمجھتے تھے اور ان کے ذہن میں یہ خیال جم چکا تھا کہ ان کے اسلاف کبھی غلطی نہ کر سکتے تھے۔ انھوں نے ہر جگہ اس پیغامِ حقیقت کی مخالفت کی۔ چنانچہ سورۂ ابراہیم میں تمام اقوام سابقہ کے متعلق جامع طور پر فرمایا کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی روش اختیار کی اور حضرات انبیاء کرامؑ سے یہی کہا کہ

تُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَصُدُّوۡنَا عَمَّا کَانَ یَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا - ۱۴/۱۰

تم چاہتے ہو کہ جن معبودوں کی عبودیت ہمارے آباؤ اجداد اختیار کرتے چلے آئے ہیں۔ ان سے ہمیں روک دو۔

پھر جب ایسا ہوا کہ وہی نورِ آسمانی جو پہلے مختلف اقوام و ملل کے پاس تنددیوں کی شکل میں آتا رہا۔ ایک مہرِ عالمتاب بن کر چمکا۔ تو شپرہ چشم لوگوں نے حسبِ معمول یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ ہم کبھی آنکھیں نہیں کھولیں گے اس لئے کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو اسی طرح آنکھیں بند کئے ہوئے دیکھا ہے۔

بَلۡ قَالُوۡۤا اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّۃٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِہِمۡ مُّہۡتَدُوۡنَ ۝

بلکہ انھوں نے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے اسلاف کو ایک راہ پر چلتے دیکھا اور ہم انہی کے نقشِ قدم پر چلے جا رہے ہیں۔ (۴۳/۲۲)

ایک دیدۂ بینا کے لئے یہ جواب یقیناً حیرت انگیز تھا کہ روشنی آجانے کے بعد اگر معلوم ہو جائے کہ جس راہ پر وہ اتنی مدت کے ماتحت چلے جا رہے ہیں وہ راہ ہلاکت و تباہی کے مہیب غاروں کی طرف لئے جا رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسی راہ پر چلنے پر اصرار کرنا اور اس کے لئے دلیل یہ لانا کہ ہمارے آباؤ اجداد اسی راہ پر چلا کرتے تھے کھلی ہوئی حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کے متعلق خود خالقِ فطرت نے بتایا کہ ان کی یہ روش کچھ انوکھی نہیں۔ بلکہ مسخ شدہ فطرتِ انسانی کا تقاضا ہی یہی ہے۔ جہاں جہاں روشنی آتی رہی۔ اسلاف کی تقلید میں آنکھیں بند کر رکھنے والے خفاش نما نے ہمیشہ اس کی طرف سے منہ موڑا۔

وَ کَذٰلِکَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡہَاۤ ۙ

اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّۃٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِہِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ ۝

اور اسی طرح (اے رسولؐ) تجھ سے پہلے بھی جس بستی میں ہم نے کوئی آگاہ کرنے والا بھیجا تو وہاں کے تن آسان لوگوں نے یہی کہا کہ بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک روش پر چلتے دیکھا ہے اور ہم انہی کے نقوشِ قدم کی پیروی کریں گے۔ (۴۳/۲۳)

جیسا کہ ظاہر ہے۔ یہ دلیل اتنی بودی اور یہ روش ایسی احمقانہ تھی کہ اس کی تردید کے لئے کسی بحث و تمحیص کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس کے جواب میں اتنا ہی کہا جا سکتا تھا کہ جس روش کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں وہ مسلک خواہ تمہارے آبائی مسلک سے کتنا ہی بہتر اور محکم کیوں نہ ہو۔ کیا تم پھر بھی اسی روشِ کہن پر ہی چلے جاؤ گے! یعنی اگر اس دعوتِ جدید اور آبائی مسلک کو دلائل و براہین کے ترازو میں رکھ کر تولنے کی کوشش کرو جب تو ہم بتائیں کہ

یہ دعوت کس قدر گراں ہوا ہے۔ لیکن اگر دلیل فقط اتنی ہو کہ یہ روش چونکہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے اس لئے سیدھی اور محکم ہے۔ تو اس کا کیا جواب؟

قالوا اولو جئتکم باھدٰی مما وجدتم علیہ اباءکم قالوا

انا بما ارسلتم بہ کفرون ۝

(ان پیغمبر نے) کہا کہ خواہ میں تمہارے پاس اس راہ سے جس پر تمہارے آباواجداد چلتے تھے کہیں زیادہ صحیح راہ لے کر آیا ہوں (تو کیا تم پھر بھی اس پرانی لکیر پر چلتے رہو گے؟) انھوں نے کہا کہ ہمارے پاس دلیل وحجت تو ہے نہیں لیکن) بات یہ ہے کہ ہم اس پیغام سے انکار کرتے ہیں جسے دیکر تم بھیجے گئے ہو۔ $\frac{43}{24}$

یہی جواب سلسلۂ انبیائے کرام کی پہلی کڑیوں کی طرف سے دیا جاتا رہا اور یہی جواب اس مقدس سلسلہ کی آخری اور مکمل کرنے والی کڑی کی طرف سے دیا گیا۔

واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ

اباءنا اولو کان اباؤھم لا یعقلون شیئاً ولا یھتدون ۝

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو ہدایت نازل کی ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اسی طریقہ پر چلیں گے جس پر اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اگر تمہارے بڑے بوڑھے عقل سے کورے اور ہدایت سے محروم رہے ہوں (تو تم بھی عقل وہدایت سے انکار کر دو گے؟) $\frac{170}{2}$

انسانی ضد اور جہالت۔ بے دانشی اور بے راہ روی۔ وراثتی اثرات کے ماتحت اسلاف کی اندھی تقلید کی یہ داستان ہمارے سامنے ہے جو انسان کی آنکھ کھولنے کے دن سے لیکر حضور خاتم النبیین صلعم کے عہد مبارک تک مذکور ہے۔ لیکن کیا اس کے بعد اس بے دانشی اور اسلاف کی کورانہ تقلید کا سلسلہ ختم ہو گیا؟ ختم کیسے ہو سکتا ہے! ابلیس نے تو اللہ تعالیٰ سے قیامت تک کے لئے مہلت لے رکھی ہے سو جب تک ابنِ آدم دنیا میں موجود ہے ابلیسانہ حربے بھی اس کی راہ میں موجود رہیں گے۔ پہلی امتوں میں کیا ہوتا تھا؟ کچھ وقت تک وہ لوگ اپنے رسول کے لائے ہوئے پیغام کی اتباع کرتے۔ اس کے بعد جب نفسانی خواہشات ان پر غالب آجاتیں تو وہ رفتہ رفتہ دوسری راہوں پر چل نکلتے۔ گمراہی کی یہ روش بالارادہ ہوتی۔ لیکن اس کے بعد آنے والی نسلیں غیر شعوری طور پر اپنے آباواجداد کے وراثتی اثرات کے ماتحت اس غیر فطری مسلک کو اختیار کئے جاتیں۔ اس کے بعد ایک اور رسول آجاتا۔ اس لئے کہ ان

لوگوں نے جہاں اپنے عمل کی راہ بدل لی تھی اس کے ساتھ ہی پیغامِ خداوندی میں بھی تحریف و الحاق شروع کر دیا تھا۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ پیغام حوادثِ ارضی و سماوی کے ہاتھوں ضائع ہو جاتا۔ بہرحال وہ پیغام اپنی شکل میں موجود نہ رہتا۔ اس لئے ایک دوسرا رسول آتا اور تجدیدِ دعوت کرتا۔ نبی اکرمؐ کے بعد کسی رسول کی ضرورت باقی نہیں رہی اس لئے کہ خدا کا آخری پیغام اپنی اصلی شکل میں دنیا میں موجود ہے اور موجود رہے گا۔ لیکن اس پیغام کی محض موجودگی اس بات کی دلیل نہیں کہ جس طرح پہلی قومیں راہ راست کو چھوڑ کر آہستہ آہستہ وراثتی اثرات کے ماتحت غلط راستے پر چل نکلیں۔ یہ قوم غلط روش اختیار نہیں کرے گی۔ غلط روش اختیار کرنے کے لئے سینکڑوں محرکات اور ہزاروں اسباب پیدا ہو جاتے ہیں اس روش سے حفاظت و ضمانت کا تو ایک ہی طریق ہے کہ انسان اپنے ہر ایک قدم کا جائزہ پیغامِ خداوندی کی روشنی میں لیتا رہے اور جونہی کوئی قدم غلط طریق پر اٹھنے لگے۔ اسے فوراً قرآن کی صراطِ مستقیم کی طرف لے جائے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسلمان غلط راستے پر چلے۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ فلاں فرقہ غلط راستے پر چلا اور فلاں صحیح روش پر گامزن رہا۔ لیکن بہرحال یہ واقعہ ہے کہ ایک فرقہ نہ سہی دوسرا سہی۔ غلط روش پر ضرور چلا اور چلے جا رہا ہے۔ ملتِ واحدہ کا فرقوں میں بٹ جانا خود اس امر کی دلیل ہے کہ ہر ایک صحیح روش پر نہیں رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر فرقہ یہی سمجھتا ہے کہ میں راہ راست پر ہوں اور دوسرے فرقے غلط روش پر ہیں۔ اب ذرا سوچئے کہ اگر پہلی امتوں میں سے کسی امت کی یہی حالت ہو جاتی جو ہماری ہو چکی ہے (اور آج سے نہیں ایک عرصہ سے ہو چکی ہے) اور ان کی اصلاح کے لئے کوئی رسول آتا اور خدا کا پیغام ان کے سامنے پیش کرتا۔ تو ان کی طرف سے کیا جواب ملتا! وہی جواب جو ملتا چلا آیا ہے۔ یعنی یہ کہ چونکہ جو کچھ تم کہتے ہو، وہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے اس لئے ہم تمہاری نہیں سنتے! اس کے جواب میں وہ داعی الی الحق لاکھ پیغامِ خداوندی کی روشنی کو پیش کرتا لیکن اس کا وہی جواب ملتا جو حضرت صالحؑ کی قوم نے دیا تھا کہ "ہاں ہمارے اسلاف سب غلطی پر تھے۔ بس تم ہی ایک راہ راست پر چلنے والے رہ گئے!" آج ہماری اصلاح کے لئے کوئی رسول نہیں آ سکتا لیکن جو شمع رسولوں کی وساطت سے آیا کرتی تھی۔ وہ تو ہمارے پاس موجود ہے۔ اب دیکھئے کہ آج بھی جو شخص قرآن کریم کی آسمانی قندیل کو سامنے لا کر قوم کو بتاتا ہے کہ اللہ کی متعین کردہ صراطِ مستقیم کونسی ہے! اسے وہی جواب ملتا ہے یا نہیں جو پہلی قوموں کی طرف سے ملا کرتا تھا؟ یعنی یہ کہ تم جو کچھ کہتے ہو وہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے اس لئے ہم اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ بھائی! میں تو کچھ نہیں کہتا۔ کہنے والی تو یہ خدا کی کتاب ہے! اس کا جواب کیا ملتا ہے؟ وہی سازِ کہن کی صدائے بازگشت!! کہ لو بھائی! یہ آ گیا کہیں سے بڑا معتبر

بھلا ہمارے بڑے بوڑھے قرآن جانتے تھے؟ وہ کہتا ہے کہ بھائی! اس میں بحث وجدل اور لڑائی جھگڑے کی کوئی بات نہیں یہ ہے قرآن اور یہ ہے تمہاری روش۔ تم خود پرکھ کر دیکھ لو کہ یہ روش قرآن کے مطابق ہے یا نہیں! اس کا جواب کیا ملتا ہے؟ وہی پرانا جواب کہ ہمیں پرکھنے کی ضرورت نہیں ہمارے آباؤ اجداد نے سب کچھ پرکھ لیا تھا! کہیے کہ اس کا کیا جواب؟ اور اس تمام مباحثہ ومجادلہ کے پیچھے جذبہ محرکہ وہی ایمان کہ ہمارے آباؤ اجداد غلطی نہیں کرسکتے تھے۔ وہ معصوم اور منزہ عن الخطا تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سے انسان کے جذبات کو بڑی ٹھیس لگتی ہے اگر اس سے کہا جائے کہ تمہارے بزرگ غلطی بھی کرسکتے تھے۔ بالخصوص جبکہ ان بزرگوں کے ساتھ عقیدت وارادتمندی کے مقدس جذبات بھی وابستہ ہوں۔ ایسی مقدس ہستی اور غلطی؟ توبہ۔ توبہ۔ یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟ لیکن انہیں کون سمجھائے کہ معصوم صرف رسول کی ذات ہوتی ہے۔ باقی ہر انسان سے غلطی کا امکان ہے اور غلطی سے کسی انسان کے تقدس اور بزرگی پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ ہم اپنے ہمعصروں میں غلطی کا امکان تسلیم کرتے ہیں۔ ان غلطیوں پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ یہی ہمعصر آئندہ نسلوں کے اسلاف بن جائیں گے۔ اس لئے اسلاف میں غلطی کا امکان نہ ماننا! انہیں تنقید کی حد سے بالاتر سمجھ لینا کس دلیل کے ماتحت ہوسکتا ہے؟ محض یہ واقعہ کہ ایک شخص ہم سے سو برس پیشتر وفات پاچکا ہے۔ اسے منزہ عن الخطا نہیں بنا سکتا! اس کی تحقیقات کو قرآنی روشنی میں پرکھ لینے سے اس کی کسی قسم کی تحقیر وتذلیل نہیں ہوجاتی۔ ہر شخص کا فہم۔ اور اس کی تحقیق اس کے ماحول اور زمانہ سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس لئے اگر زمانۂ مابعد کا انسان۔ اپنے کسی پیشرو کی تحقیق میں غلطی دیکھے تو درحقیقت اس سے اس پیشرو کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا وہ اپنے زمانہ اور ماحول میں گھرا ہوا تھا۔ اس نے جو محنت کی اور مشقت اٹھائی وہ ہمارے نزدیک درخور تحسین ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کی محنت کا ماحصل تمام کا تمام وحیٔ منزل کی طرح واجب التسلیم سمجھ لیا جائے۔ پھر یہ تنقید وتحقیق کسی شخص کی ذاتی رائے کے تابع نہیں ہوگی بلکہ قرآن کریم کے مطابق ہوگی۔ اگر زیر تنقید معاملہ قرآن کے مطابق ہوا تو ہوالمراد۔ اس کے صحیح تسلیم کرنے میں کسے انکار ہوسکتا ہے۔ اور اگر وہ قرآن کریم کے مطابق نہ نکلا تو اس سے رجوع کر لینے میں کونسی خفت ہوجائیگی۔ قرآن کریم تو وہ نصاب حیات ہے جس کی اتباع کا حکم خود ذات رسالتمآب کو بھی تھا۔

اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ (۶/۱۰۶)

اے رسولؐ جو کچھ تیرے رب کی طرف سے وحی کی گئی ہے۔ تم اس کی پیروی کرو۔

اس لئے قرآن کریم کی اتباع میں اگر کسی بڑے سے بڑے بزرگ کا اپنا خیال بھی ترک کردینا پڑے تو اس میں

ذرا سا تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ حق کو کبھی انسانوں کے ذاتی خیالات کے تابع نہیں ہونا چاہیئے۔ اور جب ایسا ہوتا ہے تو کوئی شے اپنی اصل پر قائم نہیں رہنے پاتی۔ آج ہم جادۂ اعتدال سے اس لئے ہٹے ہوئے ہیں کہ ہم نے حق کو انسانوں کی آراء کے تابع رکھ چھوڑا ہے اور یہ سب وراثتی اثرات کے ماتحت غیر شعوری طور پر ہو رہا ہے۔ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ (۲۳/۷۱) اگر حق لوگوں کی خواہشات کے تابع ہو جائے تو زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے درہم برہم ہو جائے۔ دین خداوندی کے اکمل اور آخری ہونے کی تو دلیل ہی یہی ہے کہ حق ہر وقت اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہوئی۔ اور یہی حق ہے جو ہر بات کے پرکھنے کا معیار ہے۔ اسی لئے اسلام کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت ہے اندھی تقلید کی بناء پر نہیں۔ کورانہ تقلید میں بصیرت کا کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ اور یہ عقل و بصیرت کو اپیل کرنے والی دعوت نہ صرف صاحب قرآن (صلعم) کا ہی خاصہ و امتیاز تھا بلکہ حضورؐ کے متبعین کی بھی یہی روش زندگی بیان ہوئی ہے۔ ارشاد ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (۱۲/۱۰۸)

(اے رسول) تم کہدو کہ میری راہ تو یہ ہے کہ میں اس روشنی (بصیرت) کی بناء پر جو میرے سامنے ہے۔ اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور جن لوگوں نے میری اتباع کی ہے وہ بھی (اسی طرح حق کی طرف) دعوت دیتے ہیں۔

فرمایئے کہ جو نظریات و معتقدات وراثت و ماحول کے اثرات کے ماتحت۔ اسلاف کی بے جا عقیدتمندی کے تابع۔ اختیار کئے جائیں۔ ان کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت کیسے قرار دی جا سکتی ہے!

لیکن مشکل یہ ہے کہ مسلمان یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ اسلاف پرستی اور کورانہ تقلید کے متعلق قرآنی تنبیہ و تنذیر امم سابقہ کے متعلق۔ یا زیادہ سے زیادہ نبی اکرمؐ کے زمانے کے منکرین کے متعلق ہے۔ ہم سے اس کا کچھ واسطہ نہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں اقوام گذشتہ کے قصص و حکایات اور احوال و کوائف کا ذکر آیا ہی اس لئے ہے کہ آنے والے ان سے عبرت حاصل کریں۔ لیکن ہم ہیں کہ قدم بقدم امم سابقہ کے نقوش و آثار پر چلے جا رہے ہیں اور دل میں خوش ہیں کہ ہم بالکل صراط مستقیم پر گامزن ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ راستہ ہمارے اسلاف کا ہے۔ ذرا غور فرمایئے کہ اگر کسی راہ کی صداقت کے لئے اتنا ہی کافی ہو کہ وہ مسلک اسلاف سے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے تو آپ

اپنے زمانہ میں پیدا شدہ فرقوں کے علاوہ کسی اور فرقہ کی کسی روش کی بھی تکذیب نہیں کرسکتے۔ اس لئے کہ وہ کون سا مسلک و مشرب ہے جو بڑے بوڑھوں سے منتقل ہو کر آئندہ نسلوں کو نہیں ملا۔ لہٰذہ حق و صواب کی راہ یہ نہیں کہ اس کے ساتھ اسلاف کے نقوشِ قدم کی سند ہو بلکہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کتابِ زندہ اس کی تائید کرے۔ جب قرآن کریم سامنے آجائے تو اس وقت کوئی چیز۔ خواہ وہ تمہارے اپنے علم و عقل کی پیداوار ہو یا اسلاف سے منتقل ہوتی چلی آرہی ہو کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ اس وقت حق و صداقت کا تقاضا ہے کہ خدائی سند کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا جائے خواہ اس سے آپ کے اپنے علمی تقاضہ کو ٹھیس لگے یا اسلاف کی غلط عقیدتمندی پر حرف کیوں نہ آئے۔ قرآن کریم نے اسی حقیقت کو سورۂ لقمان میں اس طرح بیان فرمایا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ○

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کی پیروی کرو۔ تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی روش کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آبا کو دیکھا ہے۔ خواہ (اس روش کے مطابق) انھیں شیطان جہنم کے عذاب کی طرف ہی دعوت کیوں نہ دے رہا ہو $\frac{31}{21}$

یہ تو ان کی کیفیت ہے جو اسلاف کے نقوشِ قدم پر بلا سوچے سمجھے چلے جانے ہی میں نجات و سعادت کی راہ خیال کرتے ہیں۔ اس سے اگلی آیت میں صحیح مسلک کا بیان ہے۔

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ○

اور جس نے اپنے آپ کو بخلوص قلب خدا (کے پیغام) کے سامنے جھکا دیا تو اس نے یقیناً ایک مضبوط شاخ کو پکڑ لیا اور انجام کار سب اللہ ہی کی طرف ہے۔ ($\frac{31}{22}$)

یعنی دینِ محکم نہ تو یہ ہے کہ تم اپنے خیالات کی ہی اتباع کرنے لگ جاؤ اور نہ یہ کہ جو کچھ اسلاف سے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے بغیر دیکھے پرکھے اس پر گامزن ہوتے چلے جاؤ۔ دینِ قیم یہ ہے کہ اپنے خیالات اور اسلاف کی طرف سے منتقل ہونے والے معتقدات سب کو قرآن کریم کے ترازو میں رکھ دو۔ جو وہاں سے پورا اترے وہ قابلِ تسلیم جس کا وہاں کچھ وزن نہ ہو۔ بلا تامل رد کر دینے کے قابل۔ یہ وہ عروۃ الوثقیٰ ہے جسے شکست و ریخت کا کوئی خوف نہیں۔ یہ وہ متاعِ گراں بہا ہے جسے کسی رہزن کا خطر نہیں۔ وتلک الامثال نضربها للناس لعلهم یتفکرون۔

جمعیت العلماء

انسان کی نفسیاتی کیفیت بھی عجیب ہے۔ اصولاً کسی سے پوچھئے تو بلا تامل کہدے گا کہ ہر شخص سے غلطی کا امکان ہے۔ لیکن بہت کم ایسے ملیں گے جو اپنی غلطی کا اعتراف کھلی پیشانی سے کرلیں۔ بالعموم ہوتا یہ ہے کہ اگر کسی سے کوئی غلط بات کسی وقت کسی جذبہ یا خیال کے ماتحت منہ سے نکل جاتی ہے تو اس کے بعد وہ پوری کوشش کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اسے صحیح تسلیم کرالے۔ اس سعی لاحاصل میں اس سے فریب خوردگی اور فریب دہی کے ایسے ایسے مظاہرے ہوتے ہیں کہ جس پر ساری دنیا ہنستی ہے لیکن اس سے اسے اور چڑھ پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ساری دنیا کے خلاف اس کے دل میں انتقام کی آگ شعلہ زن ہو جاتی ہے کچھ وقت کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ یا تو قلب میں سکون پیدا ہو جانے کی وجہ سے یا خارجی احوال و ظروف کی بناء پر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے۔ انسانی زندگی میں آزمائش کی یہ گھڑی بڑی نازک اور کٹھن ہوتی ہے۔ غلطی کے اعتراف میں اپنی خودی کے (غلط تصوّر) کو ٹھیس لگتی ہے جس شدومد سے اپنے غلط خیال کو صحیح ثابت کرنے میں تگ و دو کی تھی وہ تمام مراحل ایک ایک کر کے سامنے آجاتے ہیں۔ ہمہ نام کی شہرت۔ معتقدین کا خیال۔ گردوپیش کے کنکھیوں کے اشارے یہ تمام تصورات جمع ہو کر اعترافِ حقیقت میں گلوگیر ہو جاتے ہیں۔ ایسے وقت میں اگر اللہ کی توفیق شاملِ حال ہو جائے تو انسان ان تمام ذہنی موانع کو جھٹک کر الگ کر دیتا ہے اور نہایت کشادہ دلی اور وسیع النظری سے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتا ہے۔ اور اس کے بعد وہ دیکھتا ہے کہ جھوٹی عزت کا زعمِ باطل جو اعترافِ حقیقت میں یوں عنانگیر ہو رہا تھا اس کی اصل۔ اس کے اپنے دماغ کے بتکدہ سے باہر کہیں کچھ بھی نہ تھی۔ لیکن اگر اس کشمکش کے عالم میں یہی باطل تصورات انسان کے قلب و دماغ پر چھا جائیں تو وہ کبھی اعترافِ حقیقت نہیں کرتا۔ بلکہ اپنی غلط روش پر پہلے سے بھی زیادہ شدت سے کاربند رہتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ راہ اسے ہلاکت و بربادی کے مہیب غار میں دھکیل دیتی ہے۔

ارباب نظر دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے علماء کرام کی جماعت آجکل ایسی ہی نفسیاتی کشمکش میں گرفتار ہے۔ اور اس کی کھلی ہوئی دلیل جناب حسین احمدؒ صاحب مدنی کا وہ خطبۂ صدارت ہے جو انھوں نے جمعیت کے گذشتہ اجلاس (لاہور) میں ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ میں علاوہ اس پریشانی تحریر کے جو صاحبِ تحریر کی قلبی کیفیت کی غماز ہے۔ خیالات کا تضاد اس دوراہے کی طرف صاف صاف اشارہ کر رہا ہے جہاں پہنچکر انسان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر   کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

ہندوستان کا وہ کونسا مسلمان ہے جسے ۱۹۳۸ء کا وہ تاسف انگیز واقعہ نہ یاد ہوگا جب جناب مدنی نے یہ ارشاد فرما کر کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" اسلام سے پیشتر عہد جاہلیت کے بوالہبی افسانہ کہن کی پھر سے یاد تازہ کر دی تھی اور یہ بھی کسے نہ یاد ہوگا کہ حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ نے انھیں کس طرح اپنے مخصوص انداز میں اس پر تنبیہ فرمایا تھا لیکن قوم کی بدبختی کہ بجائے اس کے کہ جناب مدنی اس تنبیہ سے اپنی غلطی کا اعتراف فرما لیتے۔ انھوں نے ضد اور کد کی راہ اختیار فرمالی اور اس تین چار سال کے عرصہ میں مسلمانوں کی بہت سی کوششیں جو اپنی تعمیر میں صرف ہونی تھیں۔ ان کی اس غلط روش سے پھیلنے والے زہر کے ازالہ میں ضائع ہو گئیں لیکن ہمیں خوشی ہوئی کہ واقعات نے جناب مدنی کو ان کی غلطی کے احساس پر مجبور کر دیا اور انھوں نے بالآخر محسوس کر لیا کہ فی الواقعہ قومیں اوطان سے نہیں بنتیں بلکہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان اپنے جداگانہ تصورِ حیات (یعنی دینی اساس) کی بنا پر ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں چنانچہ انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمایا ہے۔

> ہندوستان کے داخلی مسائل میں مسلمانوں کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے گذشتہ ایک صدی سے ہندوستان میں برطانیہ کی حکمت عملی نے مسلمانوں کو بھی ہندوستان کی اقلیتوں میں داخل کر کے ان کے متعلقہ مسائل کو اقلیتوں کے مسائل سے وابستہ کر دیا ہے۔ برطانوی سیاسیین اور مدبرین ہمیشہ مسلمانوں کو ایک سیاسی اقلیت کی صف میں شمار کرنے اور ان کے معاملے کو اقلیتوں کے معاملات میں شامل کرنے کے عادی ہو گئے ہیں اور اسی بنا پر ہندوستان کی غیر مسلم قومیں بھی ہندوستان کے سیاسی مستقبل میں مسلمانوں کے متعلقہ مسائل کے ساتھ وہی سلوک کر رہی ہیں جو اقلیتوں کے مسائل کے ساتھ کرنے والی ہیں یہ خیال انگریزوں اور غیر مسلموں تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود مسلمانوں کے ایک طبقے کے دلوں میں بھی یہ احساس پیدا ہو گیا کہ وہ ہندوستان میں ایک سیاسی اقلیت ہیں اور اس وجہ سے وہ تمام اندیشے اور وسوسے اور خطرات ان کے دلوں پر چھا گئے جو ایک اقلیت کو اپنی زندگی اور انفرادیت کے متعلق اکثریت کی طرف سے پیش آتے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان کی مجموعی مردم شماری میں تعداد کے لحاظ سے مسلمان بھی عددی اقلیت میں ہیں لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ بجائے خود ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد یورپ کے کسی بڑے سے بڑے خطے کی آبادی سے کہیں زیادہ ہے نیز ہندوستان کی تعمیر میں ان کا حصہ سب سے زیادہ ہے ہندوستان میں ان کی تعداد نو اور دس کروڑ کے درمیان ہے۔ تہذیب اور ثقافت کے لحاظ سے وہ اہم

خصوصیات کے مالک ہیں جغرافیائی حیثیت سے انھیں قدرتی استحکام حاصل ہے۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار میں وہ اکثریت رکھتے ہیں اور اگر صوبوں کی ازسرِنو تحدید اور توسیع کی جائے تو وہ تیرہ موجودہ صوبوں میں سے چھ صوبوں میں اکثریت حاصل کر لیں گے ان تمام حالات میں بھی اگر مسلمانوں کو ایک سیاسی اقلیت قرار دے کر دیگر اقلیتوں میں انھیں شامل کر دیا جائے تو اس سے زیادہ سیاسی غلطی اور کیا ہو سکتی ہے اور اس سے بڑا اور کیا فریب دنیا کو دیا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۳۸ء میں یونہی جناب مدنی کے منہ سے ایک بات نکل گئی جس کی پچ میں وہ اڑ گئے۔ ورنہ وہ تو اس سے بہت پہلے (۱۹۲۰ء) میں بھی اس حقیقت کے قائل تھے کہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر متحدہ قومیت نہیں بنائی جا سکتی۔ چنانچہ جناب مدنی نے ۱۹۲۴ء میں جناب شوکت علی صاحب (مرحوم) کے نام اپنی ایک چٹھی میں تحریر فرمایا تھا۔

"چونکہ مسلمان ہندوستان میں اقلیت میں ہیں اور ہندو اکثریت میں اور ان کی اکثریت بھی غیر معمولی ہے اور تین اور ایک کی نسبت ہے۔ اور ان کی یہ حالت ہے کہ آج تک ڈاکٹر مونجے صاحب یہی فرماتے ہیں کہ یہ سرزمین کسی مسلمان یا کسی فرقہ کی زمین نہیں ہے یہاں جو راج قائم ہوگا وہ ہندو راج ہوگا۔ مجھے کروڑوں ہندو رضاکاروں کی ضرورت ہے" جو مظالم آئے دن دفتروں میں شہروں میں اور ریاستوں میں کئے جاتے ہیں اور جس تعصب اور عدم رواداری کا ثبوت حسب تصریح جناب ہندو دیوتا گاندھی جی اور نہرو صاحب نے دیا ہے ان کی بنا پر ہم کسی طرح بھی اپنے ابنائے وطن کے ساتھ متحدہ قومیت کی توقع نہیں کر سکتے۔"

یہ الگ بات ہے کہ جناب مدنی۔ ہندوؤں کی تنگ نظری اور شقاوت قلبی کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ان سے متحدہ قومیت کی توقع نہیں رکھی جا سکتی اور حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنی بصیرتِ قرآنی سے اس حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیا تھا کہ کفر اور اسلام (یعنی مسلم و غیر مسلم) کے امتزاج سے کبھی ایک قوم بن ہی نہیں سکتی۔ ایسا تصور یکسر غیر اسلامی (یعنی عجمی) ہے۔ بہرحال ہمیں خوشی ہوئی کہ جناب مدنی نے اب حقیقت کا احساس فرمایا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت ایک قوم کی ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک اب دوسرا مسئلہ لیجئے۔ ۱۹۳۰ء میں جناب مدنی نے ارشاد فرمایا تھا۔

"ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو مسلمان سکھ۔ عیسائی۔ پارسی سب شامل ہوں۔ حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہئے ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق

ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے" (زمزم۔ ۱۲ جولائی ۱۹۳۸ء)

یعنی جناب مدنی کے نزدیک ہندو۔ مسلمان۔ سکھ۔ عیسائی پارسی۔ (مسلم و غیر مسلم) کی مشترکہ حکومت مغربی انداز جمہوریت کی بنا پر اسلام کے اصول کے عین مطابق تھی۔ حضرت علامہؒ نے اس پر بھی تنبیہہ فرمائی تھی اور کہا تھا کہ اسلام خود ایک نظام حکومت ہے جس میں "قانون سازی کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے۔ اس لئے مسلم و غیر مسلم کی مشترکہ حکومت کسی صورت میں بھی اسلام میں جائز قرار نہیں دی جاسکتی۔ باقی رہی مغربی جمہوریت۔ سو وہ انسانیت کے لئے لعنت اور درحقیقت نقاب پوش استبداد ہے۔ جناب مدنی نے اس کی بھی بڑی شدت سے مخالفت کی اور ارباب ذوق سے پوشیدہ نہیں کہ اس مخالفت میں انھوں نے کیا کیا کہہ ڈالا۔ وہ ۱۹۳۸ء تھا اب دیکھئے کہ ۱۹۴۲ء میں آپ کا کیا خیال ہے۔ جمہوریت کے متعلق ارشاد ہے۔

> شخصی حکومتوں اور ملوکانہ جبر و استبداد اور حاکمانہ خود غرضیوں اور شہوت پرستیوں وغیرہ کی وجہ سے عالم انسانی پر جو بربادی اور ہلاکت کے پہاڑ ٹوٹا کرتے تھے اس سے تنگ آکر ابنائے دنیا نے انقلابات کے دروازے کھولے اور جگہ جگہ جمہوری نظام جاری کیا گیا۔ اگرچہ بعض ممالک میں شاہی خاندانوں کو بھی باقی رکھا گیا۔ مگر ان کو اس قدر بے دست و پا کر دیا گیا تھا کہ نظم و نسق اور عام رعایا کے متعلق کسی قسم کے تصرف کا اختیار باقی نہیں رکھا گیا تھا۔ یہ جمہوری نظام اگرچہ ظاہری نظر میں عام انسانوں کے لئے خوشکن تھا اور ممکن تھا کہ ابتدائی مراحل میں اس میں پوری طرح ہر عام و خاص غریب و امیر کا لحاظ بھی رکھا گیا ہو مگر اقتدار کے قائم ہوتے ہی بوالہوسی اور سرمایہ پرستی کا غلبہ ہو گیا غرباء اور مزدوروں کے خون و پسینہ سے ہولی کھیلی جانے لگی۔ نظام میں اس قدر سرمایہ پرستی خود غرضی اور یورپین قومیت کی لعنت گھس گئی کہ عام انسانی دنیا شخصی حکومتوں سے اس قدر ہلاکت اور بربادی کا شکار نہیں ہوئی تھی کہ اس فریب خوردہ جمہوریت اور نام نہاد خدمت خلق سے ہونے لگی بالآخر عالم انسانی میں دوبارہ انقلاب کا نشوونما ہوا اس غلط اور برباد کن جمہوریت کے نظام کو توڑنے اور اس کو مٹا دینے کے ولولے ظہور پذیر ہوئے۔

یعنی وہی جو ۱۹۳۸ء میں حضرت علامہؒ نے ارشاد فرمایا تھا۔ لیکن جناب مدنی کا سینہ احساس غلط روی اور اعتراف حقیقت کی جس کشمکش کی آماجگاہ بن رہا ہے اس کا مظاہرہ اس تضاد سے ہوتا ہے جو چند ہی صفحات کے بعد ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اپنے خطبہ کے صفحہ ۴۴ پر اٹلانٹک کے نوشتہ کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں

کہ جب مسٹر چرچل نے اعلان کیا تھا کہ جنگ کے بعد کمزور قوموں کو آزادی دی جائے گی تو

ہندوستان کی مردہ امیدوں میں پھر زندگی کی ایک لہر پیدا ہوئی اور یہ خیال کیا گیا کہ جنگ کے بعد دنیا میں زندگی۔ آزادی اور جمہوریت کا جو نیا نظام قائم کیا جائے گا ہندوستان بھی اس نظام میں اپنا باعزت مقام حاصل کرے گا۔"

یعنی ابھی ابھی مغربی جمہوریت کو انسانیت کی لعنت بتایا جا رہا تھا اور ایک ہی سانس کے بعد ارشاد ہے کہ اس احساس سے کہ جنگ کے بعد ہندوستان جمہوریت کے نئے نظام میں باعزت مقام حاصل کرے گا ہندوستان کی مردہ امیدوں میں زندگی کی ایک لہر پیدا ہو گئی۔

اب دوسری شق لیجئے۔ یعنی کیا مسلم و غیر مسلم کی مشترکہ حکومت کا تصور اسلامی ہو سکتا ہے اجناب مدنی صاحب کا سنہ ۱۹۳۹ء کا ارشاد ہم پہلے نقل کر چکے ہیں اب حکومت کے بارے میں آپ کا سنہ ۱۹۴۲ء کا خیال ملاحظہ فرمائیے ارشاد ہے۔

اس لئے اس خالق الکل رب العالمین کا بنایا ہوا انسانی نظام ہی ہر خاص و عام اور ہر فرد و جماعت کے لئے مفید اور کارآمد اور انتہائی منفعت کا کفیل ہو سکتا ہے نہ کہ انسانوں کا خود ساختہ نظام۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:۔

ان اصول نے صاف طور پر یہ بھی روشن کر دیا ہے کہ کوئی امیر اور سلطان نہ مطلق العنان ہے اور نہ صرف اپنے خاندان یا کسی پارٹی کا نمائندہ ہے اور نہ کسی استبدادی آمریت کا مالک ہے بلکہ وہ خداوند کریم کا نائب اور خدائی قانون کو نافذ کرنے والا حاکم ہے اور اسی کے قانون کے ماتحت جوابدہ اور مسئول ہے۔

پھر ارشاد ہے۔

بہر حال آج ہم تمام دنیائے انسانی کو دعوت دیتے ہیں کہ اگر وہ امن عام اور کارآمد ترقی اور حقیقی رفاہیت اور خوشحالی چاہتے ہیں تو صرف اسلامی نظام میں ہی پا سکتے ہیں۔ بالشویزم یا نازی ازم یا ریپبلک نیشنلزم ڈیموکریسی، یا اور کوئی نظام جو کہ انسانی عقل و دماغ کا اختراع کیا ہوا ہے ہرگز اس کی کفالت نہیں کر سکتا نہ رب العالمین کے حقوق کی کفالت ہے نہ مخلوقات اور اقوام و افراد انسانی کے حقوق کی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ جب اسلامی نظامِ حکومت وہ ہے جس کی تصریح ارشادات بالا میں کی گئی ہے تو پھر حضراتِ علمائے کرام نے اپنا موجودہ مسلک جس میں کفر اسلام کے امتزاج سے خالص انسانی حکومت۔ اور وہ بھی مغربی اندازِ جمہوریت کی۔ قائم کرنا مطمح نگاہ ہے کیوں اختیار فرمایا؟ اس کے متعلق ارشاد ہے۔

آپ کو تاریخ کے صفحات دیکھنے بالخصوص علمائے ہند کی شاندار ماضی کے دیکھنے سے پتہ چل جائے گا کہ علمائے ہند نے ہمیشہ سے اسی مقصد کی تکمیل کے لئے کوشش کی ہے (حالانکہ شاندار ماضی میں ان کی جدوجہد کے سمندر میں سے چند قطرے ہی دکھائے گئے ہیں) مگر وائے بدقسمتی کہ باوجود انتہائی جدوجہد اور بے شمار قربانیوں کے اصل مقصد حاصل نہ ہو سکا، تب موجودہ احوال اور گردوپیش کی انتہائی مشکلات جو کہ داخلی اور خارجی بیحد و بے شمار ہیں ضروری معلوم ہوا کہ اہون البلیتین کو اختیار کیا جائے اور ہندوستان کی آزادی کے لئے مشترکہ جدوجہد میں حصہ لیا جائے۔ اہون البلیتین کو اختیار کرنا شرعی اصول ہے اور ہر زمانہ میں معمول بہ رہا ہے۔ اور اگرچہ مشترکہ جدوجہد سے حاصل ہونے والی آزادی نظام اسلامی نہ کہلا سکے گی تاہم بہت سی مشکلات اور سخت موانع کے رفع ہو جانے سے حقیقی نصب العین کے لئے راستہ کھل جائے گا۔

یعنی حضراتِ علمائے کرام کا ہندوؤں کی آزادی کی تحریک میں حصہ لینا "دو مصیبتوں میں سے کمتر درجہ کی مصیبت اختیار کر لینے" کے شرعی اصول کے مطابق ہے۔ بہت اچھا! لیکن ذرا یہ بھی سنئے کہ ۱۹۲۰ء میں جناب مدنی کا اس قسم کی آزادی کے متعلق کیا خیال تھا۔ آپ نے جناب شوکت علی صاحب (مرحوم) کے محولہ بالا چٹھی کے دوران میں تحریر فرمایا تھا۔

"میں آنجناب کی توجہ ایک خاص طریقہ پر اور ایک حقیقت نفس الامری کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ آزادی کامل ہمارا مذہبی، سیاسی، اور وطنی نصب العین ہے۔ اور ہر حیثیت سے ہم کو اس کی کوشش کرنی چاہئے مگر اس کے ساتھ ہم اپنے مذہب اور قوم کو ضروری سمجھتے ہیں بلکہ آزادی کو بھی مذہب اور قوم کی وجہ سے ڈھونڈتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ مذہب برباد ہو جائے اور مسلمان فنا ہو جائیں تو ایسی آزادی سے کیا فائدہ ہے"

یعنی خود جناب مدنی صاحب کے نزدیک وہ آزادی جس میں مسلمانوں کا مذہب اور قوم باقی نہ رہے مسلمان کے نزدیک قطعاً قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ایسی تحریک میں شمولیت اور تعاون یکسر غیر اسلامی ہوگا۔

یہ چیز کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد، ملک کی متحدہ قومیت کے جمہوری نظام حکومت میں مسلمانوں کے مذہب اور قوم کی کیا حالت ہوگی! اب کسی تشریح کی محتاج نہیں رہی۔ اس آنے والی آزاد حکومت کے ارباب حل و عقد کھلے کھلے الفاظ میں بتا چکے ہیں کہ

"اب یہ ناممکن ہوگا کہ کوئی ایسا نظام حکومت قائم کیا جائے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اس امر کا اعتراف کرلیں۔ اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھدیا جائے اور انھیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تو تصور بھی ناممکن ہے کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظام حکومت قائم ہو سکتا ہے ....

عہدِ حاضر میں بہترین نظام حکومت کی بنا اس نظریے پر قائم ہو سکتی ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتہ میں منسلک ہو کر ایک متحدہ قومیت بن جائیں"

(ہندوستان ٹائمز مورخہ ۵ 9/۴۶)

یہ اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے لیڈر مسٹر ڈیسائی کے ارشادات ہیں۔ اس ضمن میں پنڈت نہرو کے ارادے بھی ملاحظہ فرما لیجئے۔

"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اسے ہندوستان میں یا دوسری جگہ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے تک کی آرزو کی ہے۔ قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بیجا فائدہ اٹھانے کا۔ قائم شدہ حقوق اور مستقل حقوق کی بقار کا حامی ہے"۔ (میری کہانی صفحہ ۱۱۲)

مسلم قومیت کے متعلق بھی سن لیجئے۔

"ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے جو یکجا نہیں منتشر ہے مبہم ہے۔ اور غیر متعین ہے اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ

بہت دور از کار ہے۔۔۔۔۔۔ مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں۔ بس مذہبی اخوت کا رشتہ ہی ایک چیز ہے" (میری کہانی جلد دوم صفحہ ۲۲۲)

پھر فرماتے ہیں۔

مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد ہوتا بھی تو حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا"

کس قدر تاسف سے لکھتے ہیں:۔

ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں، گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں"

اب اس کے بعد خود ہی اندازہ فرمائیے کہ یہ دلیل کہ علماء کرام نے "متحدہ قومیت" اور "مشترکہ حکومت" کا مسلک "اہون البلیتین" کے شرعی "اصول" کے ماتحت اختیار فرمایا تھا، کس قدر کمزور اور سست بنیاد ہے۔

اب اس مقام پر پہنچئے جہاں اس "دورلے" کی کشمکش اور بھی نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ ہندوستان کی موجودہ جدوجہد کے مطمح نگاہ کے متعلق فرماتے ہیں۔

آئندہ آزاد ہندوستان میں برطانیہ نے اپنے مقاصد میں استعمال کرنے کی غرض سے مسلمانوں کے لئے کونسا سیاسی مقام تجویز کیا ہے؟ میں اس وقت اس بحث کو چھیڑ کر تلخیوں میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا لیکن خود ہندوستان کے سیاسی مفکرین کے سیاسی تصورات کا جہاں تک تعلق ہے انھیں تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جو ہندوستان کے آئندہ آئین حکومت کی تشکیل اس طریق پر کرنا چاہتا ہے کہ فرقہ وارانہ اکثریت کی ایسی مستحکم مرکزی حکومت قائم ہو کہ مسلمانوں کو تمام ہندوستان میں ایک اقلیت کی جگہ ملے اور ان کی زندگی اور بقاء تمام تر ایک طاقتور اور ناقابل تسخیر اکثریت کی مرضی سے وابستہ ہو لیکن یہ تصور محض ایک پریشان خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو گا۔ یہ تصور مذہبی سیاست ہونے کے علاوہ صائب الرائے مفکرین کے نزدیک ناقابل عمل بھی ہے اس تصور کو جس قدر جلد دماغوں سے محو کر دیا جائے اسی قدر ہندوستان کے مجموعی مفاد کے لئے بہتر اور ہندوستانیوں کے لئے

مفید ہوگا۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو پہلے گروہ کے تصورات اور اس کے عواقب و نتائج سے گھبرا کر مسلمانوں کی نجات اور خوش عیشی کے لئے صرف یہ راستہ تجویز کرتا ہے کہ ہندوستان کی وحدت کو پارہ پارہ کرکے اپنا جداگانہ سیاسی منطقہ بنا کر براہ راست تاجِ برطانیہ کے ساتھ اپنی قسمت کو وابستہ کر دے۔ اس گروہ نے اپنے تقسیم ہند کے مطالبہ کو تو نہایت بلند آہنگی اور شدت کے ساتھ منظر پر لانا شروع کر دیا ہے لیکن اس کے کسی پہلو پر کبھی روشنی بھی نہیں ڈالی۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں مسلمانوں کی آبادی ان کے مذہبی مقدس شعائر، مساجد، مزارات، علمی ادارے، اوقاف وغیرہ اس قدر کثیر تعداد میں موجود ہیں کہ مسلمان کسی حالت میں ان کو نظر انداز نہیں کر سکتے اور تقسیم ہند کی صورت میں ان کا حشر کیا ہوگا اس پر مجوزین تقسیم بالکل خاموش ہیں۔ اس لئے جب تک یہ نظریہ پوری تفصیل کے ساتھ روشنی میں نہ آئے اس وقت تک اس پر کوئی بحث بے سود اور بے نتیجہ ہے۔

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ مجوزینِ تقسیم کے نزدیک بھی اسلامی منطقہ میں قائم ہونے والی حکومت کا دستورِ اساسی اسلامی اور الٰہی حکومت کا دستور نہ ہوگا۔ اس کی بنیاد بھی یورپین طرزِ حکومت پر ہوگی اور اپنے تحفظ کے اطمینان ہو جانے پر اسے قبول کرنے میں بھی وہی اہون البلیتین اختیار کرنے کا اصول برتنا ہوگا۔ نیز اس نظریہ کے ماتحت ہندو منطقے اور مسلم منطقے قائم ہو جانے کی صورت میں ہندو منطقوں میں مسلمان جن کی پوزیشن زیادہ سے زیادہ ۱۴ فی صدی اور اکثر صوبجات پانچ فی صدی ہوگی بالکل بے دست و پا اور زندہ درگور ہو جائیں گے اور مسلم منطقوں میں غیر مسلم جن کی تعداد ۴۵ فیصدی تک ہوگی مسلم حکومت کے لئے وبالِ جان ہوں گے۔

"پس مسلم منطقے ہندو منطقوں کے تقریباً ساڑھے تین کروڑ مسلمانوں کی تباہی اور ہلاکت کی دستاویز پر خود دستخط کرکے اور اپنی جگہ ایسی حکومت جس میں غیر مسلم متعصب مؤثر اقلیتیں ان کے لئے وبالِ جان ہوں حاصل کرکے ان کی فلاح و بہبود اور اطمینان و مسرت حاصل کر سکیں گے۔ کیا یہ غضب کچھ کم ہے کہ مسلم اقلیتوں کے مسلمانوں کی حفاظت کے لئے جو کام کیا گیا ہو وہ ایسے طور پر کیا جائے کہ بعض غریب بے کس مسلمانوں کی ساڑھے تین کروڑ کی تعداد ہلاک و برباد کر دی جائے

اور اپنی اکثریت بھی شدید خطرات میں مبتلا ہو جائے۔

تیسرا گروہ ہے جو ہندوستان کے آئندہ آئین کو وفاقی یا لامرکزی اصول پر مرتب کرنا ہندوستان کے لئے اور اس کے تمام صوبوں اور قوموں کے لئے مفید اور قابل عمل سمجھتا ہے۔ وفاق میں شامل ہونے والی حکومتیں اپنی اپنی جگہ کلیتہً آزاد اور خود مختار رہیں گی۔ مرکزی حکومت ان کی آزادی میں کوئی مداخلت نہیں کر سکیگی۔ مرکز کو صرف وہ اختیارات ملیں گے جو وفاق کے اجزاء اس کو اتفاق رائے سے سپرد کریں گے اور غیر مصرحہ اختیارات صوبائی حکومتوں کو حاصل رہیں گے۔ ہر حکومت میں اقلیتوں کے تہذیبی۔ سیاسی۔ مذہبی حقوق کی حفاظت کی جائیگی اور ان کی صوابدید کے موافق تحفظات دیئے جائیں گے۔ اکثریت اپنے حقوق اکثریت کی تقلید ہوگی اور اقلیتیں امن و اطمینان کی زندگی بسر کریں گی۔ غیر مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمان اقلیت کو کسی تکلیف اور بے انصافی کا خوف نہ ہوگا۔ ان کے تمام سیاسی اور مذہبی حقوق اور مقدس شعائر بجائے خود محفوظ ہو جائیں گے۔ اور مسلم اکثریت کے صوبوں میں غیر مسلم اقلیتیں امن و اطمینان سے زندگی بسر کریں گی۔ اور ان کے ساتھ کوئی بے انصافی نہ کی جائے گی۔ اور ان کے تمام سیاسی اور مذہبی حقوق اور شعائر محفوظ ہو جائیں گے۔ ہندوستان کے ذی بصیرت اصحاب رائے اس تجویز کو موجودہ ماحول میں قابل عمل اور ہندوستان کے پیچیدہ مسائل کے حل کرنے کا واحد راستہ سمجھتے ہیں۔"

آپ نے غور فرمایا کہ جناب مدنی کس طرح دوراہے کے بیچوں کے بیچ کھڑے ہیں۔ ایک طرف ہندوؤں کا مطالبہ کہ تمام ہندوستان کا مرکز ایک ہو۔ اور مستحکم ہو۔ دوسری طرف مسلمانوں کا مطالبہ کہ وحدت مرکز مسلمانوں کی ہلاکت کا استمراری پٹہ ہے۔ اس لئے مرکز بالکل اڑا دیا جائے اور ان دونوں کے درمیان ہمارے علمائے کرام کا یہ مطالبہ کہ مرکز رہے لیکن کمزور سا رہے ۔

مینا وہ اس کا ساغر ہے یاد ہے نظام
منہ موڑ کر اُدھر کو اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

بہرحال ہمیں خوشی ہوئی کہ یہ حضرات کچھ تو روبہ کعبہ ہوئے۔

اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

آپ ہنوز ترشرو ہونگے کہ یہ حضرات مسلمانوں کے مطالبہ کی کامل ہمنوائی کیوں نہیں کرتے جو کہ مسلمانوں کی آزادی کے مرادف ہے لیکن ہم خوش ہیں کہ یہ حضرات۔ غیروں سے کٹ کر ایک قدم اپنوں کی طرف تو بڑھے۔ بھلا ایک ہی جست میں کس طرح کاشی سے مکہ جا پہونچیں۔ ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھکر سوچئے کہ غلطی کے کھلے کھلے اعتراف کے لئے کس قدر ہمت اور حوصلہ کی ضرورت ہوتی ہے جلدی نہ کیجئے کسی کو مطعون کرنے سے پیشتر اس کی مجبوری پر ضرور نگاہ ڈالئے۔

اک عمر کا رشتہ ٹوٹا ہے! | مدت کا سہارا چھوٹا ہے!
دل سنبھلتے سنبھلتے سنبھلے گا! | صبر آتے آتے آئے گا

گھبرائیے نہیں ان حضرات کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے۔ اب انشاءاللہ آہستہ آہستہ ؎

آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک

ہم اس لئے پرامید ہیں کہ ان حضرات نے اپنے دعوے کے ثبوت میں جو دلیل پیش کی ہے وہ اس قدر بودی ہے کہ اسے محض منہ رکھنے کی خاطر دلیل کہا جا سکتا ہے۔ جب یہ حضرات ذرا اور ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں گے تو ان پر اس کی کمزوری خود بخود واضح ہو جائے۔ جھگڑا تو سارا مرکز کا ہے۔ اب دیکھئے کہ مرکز کے مفید اور مضر ہونے کے متعلق ان حضرات نے کیا فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ

(۱) ایک مستحکم مرکز کے ماتحت نظام حکومت مسلمانوں کے غلامی کے مرادف ہوگا۔

(۲) اس مرکز کو کمزور کر دیا جائے (جیسا کہ جمعیۃ العلماء کا خیال ہے) تو مسلمانوں کے مذہبی حقوق۔ مقدس شعائر خواہ وہ اقلیتوں کے صوبوں میں ہوں یا اکثریت کے سب محفوظ ہو جائیں گے۔ اور

(۳) اگر اس مرکز کو بالکل اڑا دیا جائے (جیسا کہ مسلمانوں کا مطالبہ ہے) تو اس سے جمعیۃ العلماء کے خیال میں مسلمان تباہ ہو جائیں گے۔ ان کے مذہبی حقوق پامال ہو جائیں گے ان کے مقدس شعائر منہدم ہو جائینگے وغیرہ وغیرہ

آپ نے اس منطق پر غور فرمایا کہ

(۱) مرکز کو مستحکم رکھنے میں مسلمانوں کی غلامی اور بربادی

(۲) اسے کمزور کرنے میں آزادی اور

(۳) اسے بالکل فنا کر دینے میں پھر غلامی اور بربادی یعنی

(۱) سانپ کو کھلا چھوڑنے میں ہلاکت۔

(۲) اسے زخمی کر کے چھوڑ دینے میں عافیت اور

(۳) اسے مار ڈالنے میں پھر ہلاکت

ہمارا خیال ہے کہ جناب مدنی صاحب نے جان بوجھ کر ایسا لغو مسلک پیش کیا ہے۔ تاکہ اگلا قدم اٹھانے میں آسانی رہے۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو اور ان لوگوں کا خیال غلط ثابت ہو جو ان حضرات کو ختم اللہ علی قلوبھم کی شق میں سمجھے ہوئے ہیں۔

اب ذرا پاکستانی اسکیم کے خلاف اعتراض ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے۔

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ مجوزین تقسیم ہند کے نزدیک بھی اسلامی منطقہ میں قائم ہونے والی حکومت کا دستور اساسی بھی اسلامی اور دینی حکومت کا دستور نہ ہو گا۔ اسکی بنیاد بھی یورپین طرز پر ہو گی"

ہم اس اعتراض کی تردید میں زیادہ کچھ عرض کرنا نہیں چاہتے۔ اس نظریہ کو حضرت علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں ان الفاظ سے ساتھ پیش فرمایا تھا۔

"ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔"

اور آج اس اسکیم کے علمبردار جناب جناح کا اسلامی حکومت کے متعلق کیا خیال ہے اس کے لئے طلوع اسلام کے اسی اشاعت کے ابتدائی اوراق (بعنوان قائد اعظم) ملاحظہ فرمائیے بات خود بخود واضح ہو جائے گی۔

یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ پاکستان سے کیا مفہوم ہے۔ ایک سچے مسلمان کی کیا روش ہونی چاہیئے یہ ہم سے نہیں خود مدنی صاحب سے سنئے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

اگر کسی جدوجہد کے نتیجہ میں خدا کی ایک فرمانبردار ملت کو دنیا کے کسی حصہ میں خدائی احکام کے مطابق یا اس سے قریب تر کوئی اجتماعی نظام قائم کرنے کے مواقع حاصل ہوتے ہوں تو اس کو اسلام کی تائید حاصل ہو سکتی ہے اور صرف اسی جدوجہد کو اسلام نے جہاد فی سبیل اللہ اور

قتال فی سبیل اللہ قرار دیا ہے۔

ہم اس جدوجہد کی طرف آپ کو دعوت دیتے ہیں مسلم لیگ اسی جدوجہد کی حامل ہے۔

اس کے بعد جناب مدنی فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات محض انگریز کے پیدا کردہ ہیں (یعنی وہی دلیل جو سلئے وارد ہاسے نازل ہوا کرتی ہے) ان سے پہلے کہیں اختلافات دکھائی نہیں دیتے تھے اس کے بعد کئی صفحات میں ایسے تاریخی شواہد پیش کئے ہیں جن سے ثابت کرنا چاہا ہے کہ انگریزوں سے پیشتر مسلمانوں اور ہندوؤں کے دور میں مسلمان اور ہندو سب شیروشکر ہو کر رہتے تھے۔ کہیں اختلافات و تنازعات نہ تھے۔ وغیرہ وغیرہ

لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے عہدِ حکومت میں اگر باہمی تنازعات نہ تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ جہاں مسلمان حاکم تھے۔ ہندو محکوم کی حیثیت سے رہتے تھے۔ اس لئے محکوم کا حاکم سے جھگڑا کیسا۔ اسی طرح جہاں ہندو حاکم تھے مسلمان ان کی رعایا تھے۔ راجہ اور پرجا میں لڑائی کیسی! جھگڑے اور تنازعے تو اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب قوت کی تقسیم کا سوال پیدا ہو آپ تو ہندوؤں اور مسلمانوں کی یاد دلاتے ہیں ذرا پچاس برس ادھر خود انگریز کے عہدِ حکومت ہی دیکھئے۔ کہیں ہندو مسلم سوال نظر آئے گا۔ اس لئے کہ قوت پوری کی پوری انگریز کے ہاتھ میں تھی۔ ہندو مسلمان دونوں رعایا تھے جھگڑا اس وقت شروع ہوا جب قوت انگریز کے ہاتھ سے منتقل ہو کر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آنے لگی۔ اس وقت ہندو نے تہیہ کر لیا کہ مسلمان سے اس کی آٹھ سو سالہ حکومت کا انتقام لیگا۔ جب تک مسلمان سویا رہا اور قومیت پرست حضرات نے اسے تھپکیاں دے دیکر اور بھی گہری نیند میں سلائے رکھا۔ ہندو اپنی من مانی کرتا رہا۔ کہیں لڑائی جھگڑا نہ تھا۔ لیکن جونہی مسلمان بیدار ہوا اور اس نے ہندو ہمسایہ سے کہا کہ مہاراج! خدا کی اس زمین میں دوسروں کو بھی زندہ رہنے کا حق دیجئے تو وہیں جھگڑا شروع ہو گیا۔ یہ ہے ہندو مسلم تنازعات کا پس منظر۔ چونکہ ہندوؤں نے ایک مدت سے شور مچا رکھا ہے کہ سب جھگڑے انگریز کے پیدا کردہ ہیں۔ اسے یہاں سے نکال دو سب جھگڑے طے ہو جائیں گے اس لئے آپ حضرات بھی ان کے دامِ فریب میں آ گئے۔ اور یہ نہ سوچا کہ ہندو ایسا کیوں کہہ رہا ہے!۔

اختلافات و تنازعات کی داستان دہرانے کے بعد جناب مدنی جس نتیجہ پر پہنچے ہیں - وہ یہی ساز کہن ہے کہ جداگانہ انتخاب بھی انگریزی کا کرشمہ ہے - ارشاد فرماتے ہیں -

"مسلمانوں کے ایک طبقے ذی اثر اور ماہر سیاست طبقہ کی رائے ہے کہ جداگانہ انتخاب مسلمانوں کیلئے زیادہ مضر ہے اور یہ تو یقینی ہے کہ اس کی موجودگی میں مختلف فرقوں کے درمیان آشتی اور سیاسی اور معاشرتی یگانگت اور اتفاق پیدا ہونا ناممکن ہے جو ہندوستان جیسے ملک کیلئے ناگزیر ہے جمعیۃ علماء ہند نے اس پر متعدد مجالس میں غور و بحث کر کے یہ سمجھا ہے کہ جمہوری اور نیابتی طرز حکومت کی صورت میں مخلوط انتخاب ہی پبلک کے درمیان رابطۂ مودت و اتحاد قائم رکھ سکتا ہے اور جداگانہ انتخاب ہمیشہ ہمیشہ باہمی اختلاف اور کشمکش بلکہ فتنہ و فساد پیدا کرنے کے سوا کسی مفید نتیجے پر نہیں پہنچا سکتا جمعیۃ علماء نے اپنے سہارنپور والے فارمولا میں مسلم حقوق کی حفاظت کے تمام ذرائع اور شرائط محفوظ کرتے ہوئے مخلوط انتخاب قبول کرنے کی تجویز اسی نظریہ کے ماتحت رکھی تھی -

ذرا اس ٹکڑے پر دوبارہ غور فرمائیے ا-

"جمیعۃ العلماء ہند نے اس پر متعدد مجالس میں غور و بحث کر کے یہ سمجھا ہے کہ جمہوری اور نیابتی طرز حکومت کی صورت میں مخلوط انتخاب ہی پبلک کے درمیان رابطۂ مودت و اتحاد قائم رکھ سکتا ہے"

یعنی (۱) وہی جمہوری حکومت جسے ابتدائی صفحات میں لعنت قرار دیا گیا ہے - اس کے استحکام کے لئے مخلوط انتخاب ضروری قرار دیا جا رہا ہے -

(۲) مخلوط انتخاب کا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں مودت کا رشتہ محکم ہوگا؟ کیا ہم جناب مدنی سے دریافت کر سکتے ہیں کہ کافر و مومن میں سلسلۂ مودت و مواخات قرآن کریم کی کونسی آیت اور اسوۂ نبی اکرمؐ کی کونسی شق کے مطابق جائز قرار دیا جا سکتا ہے -

اس کے بعد نفس مضمون پر آئیے یعنی مخلوط انتخاب میں مسلمانوں کے لئے کیا کیا خطرات ہیں - سو اس کی تفصیل ہم سے نہیں - جناب مدنی سے سنئے ! آپ نے ۱۹۲۸ء میں جناب شوکت علی مرحوم کے خط میں لکھا،

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے مخلوط انتخاب قبول کرنے سے حالانکہ وہ مشروط تھا فائدہ اٹھایا گیا اور قبل از تحقق اعلان کر دیا گیا کہ مسلمانوں نے مخلوط انتخاب قبول کر لیا ہے اب شرطوں کے

تعین کو بھی اٹھا دو اور اس حیلہ سے اٹھا دو کہ اکثریت کے لئے کسی جگہ نشستیں متعین نہ رہیں مسلمانوں کے لئے اپنی کمزوریوں کی وجہ سے مخلوط انتخاب ہی میں خطرہ تھا یعنی ہندو اثرات کی بنا پر ایسے مجلس بھر کے مسلمان منتخب ہوں جو بے دین، ایمان فروش اور ہندو پرست ہوں۔ صورت ظاہر میں مسلمان ہوں اور باطن میں ہندو ہوں۔ ان سے جن کی تعلیم یافتہ طبقوں میں کثرت ہے کس اسلامی مفاد کی امید کی جا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اب جبکہ نشستیں بھی اٹھ گئیں تب تو مسلمان کا کسی بھی صوبہ میں اپنی شمار کے موافق ان نشستوں کا حاصل کرنا مستحیل ہو گا۔"

یہ دلیل کسی اضافے کی محتاج نہیں۔ یہ حقیقت ہے اور واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ ہندو کو اعتماد بھی اس مسلمان پر ہوتا ہے جو بے دین، ایمان فروش، اور ہندو پرست ہو۔ اور جو نیشنلسٹ مجلس بھر کر ان کے ایجنٹ کی حیثیت سے ملتِ اسلامیہ سے غداری کرتا رہے!

ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں اور ہماری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں اس لئے کہ ایک سچے عالم کی جتنی قدر ہمارے دل میں ہے شاید ہی کسی اور طلب میں ہو گی۔ ہم ایسے عالم کی خاکِ رہگذر کو اپنی چشم بصیرت کا سرمہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمارا دل خون ہو کر رہ جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان حضرات نے اپنی غلط روی اور بے مہر بات کی ضد میں عالم کے صحیح مرتبہ کو خاک میں ملا دیا اور آج مولوی کا لفظ انتہائی جہالت اور تنگ نظری کا مظہر قرار پا گیا۔ ملتِ اسلامیہ کی اس سے بڑی بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے! آج وقت وہ تھا کہ یہ گروہ علمائے کرام۔ ہندوستان کی تحریک آزادیٔ اسلام میں سب پیش پیش ہوتا۔ ان کی ہر مجلس اور ہر محفل۔ ہر منبر اور ہر مسند سے یہ صدائے حق بلند ہوتی کہ ہم انسانوں کی حکومتوں کا خاتمہ کر کے۔ ہندوستان کے (کم از کم) ایک گوشہ میں خالص خدائی حکومت کو قائم کریں گے اور یہاں اپنی قوتوں کو مستحکم کر کے پھر سارے ہندوستان اور ساری دنیا میں لوائے محمد الرسول اللہ کو سربلند و سرفراز کریں گے۔ یہ کہتے اور مسلمانوں کو دعوتِ سرفروشی اور جاں سپاری دیتے۔ پھر دیکھتے کہ ان کی عزت اور قوم کی عظمت کا کیا رنگ ہوتا۔

لیکن اللہ کی شان کہ آج یہ سعادت اسے نصیب ہے جس نے عمر بھر کبھی کسی مکتب کی شکل نہیں دیکھی۔ آج وہ اعلان کر رہا ہے کہ اسلامی حکومت کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اطاعت کا مرجع خدا کی ذات اور اس کی عملی شکل قرآنی احکام کا عملی نفاذ ہے۔ اس کی طرف سے یہ آواز بلند ہو رہی ہے۔ اور علمائے کرام نے اس کی

مخالفت ہو رہی ہے۔ توبہ توبہ۔

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد۔

ہم ان حضرات کی خدمت میں مودبانہ گذارش کریں گے کہ ضد اور حسد کو چھوڑ کر اب حقیقت ثابتہ کا کھلے کھلے الفاظ میں اقرار کرلیں۔ اس میں کسی قسم کی تحقیر نہیں۔ غلطی کس سے نہیں ہو جاتی۔ آئیں۔ اور نہایت خندہ پیشانی سے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت میں بصدق دل شامل ہو جائیں جس کا نصب العین ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام و نظام ہے اس میں شامل ہوں اور پھر اللہ کی حکومت کے قیام کے لئے مسلمانوں کی قیادت کریں۔ دنیا میں بھی سرفرازی ہو اور عاقبت میں بھی سرخروئی۔

ہمیں یقین ہے کہ اب حضرات جب مسلمانوں کے مطالبے کے اس قدر قریب ہو چکے ہیں تو اس کے بعد ایک کر بچھڑے ہوئے بھائیوں کے گلے مل جانے میں کچھ حجاب ہوگا؟ خدا آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

جمعیۃ العلماء نے اپنے اجلاس لاہور میں چند تجاویز ایسی بھی پاس کی ہیں جنہیں دیکھ کر ہمیں خوشی ہوئی کہ اب ان حضرات کا قدم صحیح راستہ کی طرف اٹھتا دکھائی دے رہا ہے۔

تجویز (۱) جمیعۃ علماء ہند کا یہ اجلاس اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھی کہ فقہ اسلامی عبادات و معاملات تمدن اور معاشرت سیاست اور اقتصادیات کے تمام اصول پر حاوی ہے۔ دیکھ رہا ہے کہ عصری ایجادات اور غیر اسلامی اصول اقتصادیات کے رواج سے ایسی صورتیں پیش آرہی ہیں کہ ان کے جواز و عدم جواز کے بارے میں علماء مختلف الرائے ہو جاتے ہیں اور ان کا باہمی اختلاف مسلمانوں کے لئے موجب تشویش و پریشانی ہوتا ہے۔

اس لئے یہ اجلاس طے کرتا ہے کہ جمعیتہ علماء ایسے جدید پیش آنے والے مسائل میں علماء متبحرین کی معتمد جماعت سے تبادلۂ خیالات اور بحث و مباحثہ غور و فکر کے بعد ایسے فیصلے مرتب کرلے جن پر علماء متبحرین کی زیادہ سے زیادہ جماعت متفق ہو پھر ان فیصلوں پر عمل کرنے کے لئے مسلمانوں میں شائع کر دیا جائے"۔

یہ وہ مسلک ہے جس کی طرف ہم چار برس سے مسلسل دعوت دے رہے ہیں اور جس کی بناء پر ہمیں ہدف طعن و ملامت بنایا جا رہا ہے۔ الحمد للہ کہ ان حضرات کو اس ضرورت کا احساس ہو گیا۔ لیکن ہم ان کی خدمت میں ایک اہم گذارش ضرور سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ آپ لاکھ جتن کر لیجئے، کوئی متفق علیہ مسلک اختیار نہ کر سکیں گے تاوقتیکہ آپ اپنے اختلافی معاملات کا حل قرآن کریم سے طلب نہیں فرمائیں گے۔ اختلافات صرف قرآن کریم سے مٹ سکیں گے

کہ قرآن کریم کا مقصد ہی اختلافات کا مٹانا ہے۔

ایک دوسری تجویز میں کہا گیا

(۲) جمیعۃ علماء ہند کا یہ اجلاس مسلمانوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ وقت کی نزاکت اور باہمی افتراق والشقاق کی ہلاکت خیزی اور اس کے عواقب و نتائج شومہ کا پورا پورا احساس کریں اور ان مختلف فیہ مسائل میں جو دور اول یعنی حضرات صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) اور تابعین و ائمہ مجتہدین کے زمانہ سے مختلف فیہ چلے آتے ہیں، باہم دست و گریباں نہ ہوں۔ اپنی اپنی جگہ اپنے عقیدہ کے موافق مذہب راجح پر عمل کرتے ہوئے دوسرے خیال کے مسلمانوں پر زبان طعن دراز نہ کریں اور سب و شتم سے محترز رہیں۔ انما المومنون اخوۃ کے تحت بھائی بھائی کی طرح زندگی بسر کریں اور باہمی تعاون و تعاضد کر کے کالبنیان یشد بعضہ بعضاً ایک مستحکم اور مضبوط دیوار بن جائیں جس کو کسی مخالف کی دشمنی کسی قسم کا گزند نہ پہنچا سکے۔

اسی طرح یہ جلسہ موت و حیات کی کشمکش کے اس دور میں تمام مسلم جماعتوں سے دردمندانہ اپیل کرتا ہے کہ اسلام اور قوم کی فلاح و نجات کی خاطر آپس کے اختلاف کو دلائل و براہین کی روشنی میں تحقیق حق کے اصول پر وضع کرنے کی سعی کریں۔ اور اختلاف رائے کے باوجود باہمی منافرت اور توہین و تذلیل کا مذموم طریقہ اختیار نہ کریں کہ یہ اسلامی وقار اور قومی زندگی کے لئے تباہ کن اور اسلامی تعلیم کے سراسر خلاف ہے۔

یہ تجویز بھی موجب اطمینان ہے۔ اور مقام مسرت ہے کہ وہ حضرات جو اپنی ہستی کا راز فرقوں کے قیام میں دیکھتے تھے۔ آج زمانہ کے ہاتھوں اتنے مجبور ہو چکے ہیں کہ فرقہ بندی کی لعنت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی ضرورت محسوس فرما رہے ہیں خدا کا احسان ہے کہ اس نے ان حضرات کے دل میں یہ نیک خیال پیدا کر دیا۔ اس تجویز کے بارے میں ہم اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ بحالات موجودہ اس مسلک پر کاربند ہوتے کہ اصول دین میں اتفاق کر کے فروعات کے اختلافات کو اہمیت نہ دی جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ دین کے حقیقی نظام کے قیام کی فکر کیجئے۔ اور وہ نظام اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی اپنی حکومت ہو جس میں قرآن کریم کا قانون عملاً نافذ ہو اور اختلافات کی صورت میں مرکز ملت کی طرف رجوع کیا جائے۔ جب تک یہ نظام

قائم نہ ہوگا۔ دین اپنے صحیح اور حقیقی خطوط پر متشکل نہ ہو سکا جو حضور نبی اکرمؐ کے اسوۂ مقدسہ نے دنیا کے سامنے پیش کی تھی۔

ایک اور تجویز میں کہا گیا ہے۔

تجویز بابت مدارس عربیہ کا نصاب جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس مدارس عربیہ دینیہ کے مروجہ نصاب میں دورِ حاضرہ کی ضرورتوں کے موافق اصلاح و تبدیلی کی ضرورت شدت سے محسوس کرتا ہے اور مدارس عربیہ کے ذمہ دار حضرات اور تعلیمی جماعتوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ ماہرین تعلیم کی ایک کمیٹی اس پر غور کرنے کے لئے باہمی شورے اور تعاون سے مقرر کر کے ایک ایسا نصاب مرتب کرائیں جو دینی علوم کی تکمیل کے ساتھ ضروریاتِ عصریہ میں بھی مہارت پیدا کرنے کا کفیل ہو۔

اللہ کا شکر ہے کہ ان حضرات نے اس ضرورت کو بھی محسوس کر لیا۔ ورنہ ہم نے جب کبھی ان کے نصاب پر تنقید کی۔ ہمیشہ پیشانی کے تیوروں سے اس کا جواب ملا۔

ایک اور تجویز میں کہا گیا۔

جمعیۃ علماء ہند کا یہ جلسہ مسلمانوں سے اپیل کرتا ہے کہ ایک شہر میں بلا ضرورت دس دس بیس بیس مساجد میں نمازِ جمعہ قائم کرنے سے احتراز کریں۔ کیونکہ اس تعداد و انتشار سے نمازِ جمعہ قائم کرنے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور شوکتِ اسلامیہ کے اظہار میں خلل پڑتا ہے حتی الامکان ایک مسجد میں تمام مسلمان نمازِ جمعہ ادا کریں۔ صرف وسیع شہروں میں نہایت شدید ضرورت کی بنا پر دو یا تین مساجد میں جمعہ پڑھا جائے تو مضائقہ نہ ہوگا۔ غیر ضروری تعدد کو جس نے جمعہ کی نماز کو بھی پنجگانہ نمازوں کی حیثیت دیدی ہے، جہاں تک جلد ممکن ہو موقوف کر دیا جائے۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی فرما دیا ہوتا کہ جمعہ کا خطبہ اس زبان میں دیا جائے جسے سامعین سمجھتے ہوں۔ ورنہ اس کے بغیر خطبہ اور اس طرح جمعہ کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ مساجد اس صورت میں آباد ہوں گی کہ ان میں صحیح دینی کشش پیدا کی جائے اور مسلمانوں میں وحدت اس شکل میں پیدا ہوگی کہ اختلافی مسائل کو چھوڑ کر جمعہ میں دین کے اصول کے متعلق خطبات دئے جائیں۔

ہم ان تجاویز کو دیکھ رہے ہیں اور ہماری جبینِ نیاز اس درگاہِ صمدیت کے عتبۂ عالیہ پر بہ ہزار خشوع وخضوع جھک رہی ہے کہ اس نے ان ناتواں وضعیف بندوں کی آواز میں یہ اثر پیدا کر دیا کہ چار سال کے قلیل ترین عرصہ میں مولوی صاحبان کے گروہ میں یہ انقلاب نظر آرہا ہے۔ حالانکہ ان حضرات کے رسب شتم سے بظاہر یہ نظر آتا تھا کہ یہ کبھی اس راہ کی طرف نہیں آئیں گے لیکن صداقت کی آواز ضرور اثر کرتی ہے۔ یہ اللہ کا احسان ہے جس کے لئے ہم اس کے حضور سر بسجود ہیں۔

ایک اور تجویز میں کہا گیا۔

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس اسلامی ممالک خصوصاً عراق، ایران، شام، فلسطین وغیرہ کے موجودہ نازک ترین حالات کو نہایت خطرہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کہ ان اسلامی ممالک کو استعمار پسند طاقتیں کس طرح اپنے اغراض فاسدہ میں استعمال کرنے کے لئے مقہور ومجبور کر رہی ہیں۔ ان کی تسلیم شدہ آزادی کو پامال کیا جا رہا ہے یا ان کے فطری حق آزادی سے انہیں محروم کرنے یا رکھنے کے لئے کیسے کیسے حیلے تراشے جا رہے ہیں۔ جمعیۃ علماء بار بار اس امر کا اعلان کر چکی ہے اور آج بھی اس اعلان کا اعادہ کرتی ہے کہ اسلامی ممالک پر کسی اجنبی طاقت کا تسلط اور قہر وغلبہ مسلمانانِ عالم کسی طرح برداشت نہیں کریں گے اور جب تک اسلامی ممالک پر سے استعمار پسند طاقتیں اپنا تسلط بالکلیہ نہ اٹھالیں گی اور ان کو آزادیٔ کامل کی فضا میں سانس لینے کا موقعہ نہ دیں گی اس وقت تک مسلمان چین سے نہیں بیٹھیں گے اور مطمئن نہ ہوں گے۔

اس تجویز کی تائید میں جناب احمد سعید صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم سے اگر کہا جائے کہ تمہیں دوسری سلطنتوں کے رہنے یا جانے کا کیا فائدہ یا غم۔ تو ہم کہیں گے کہ تمام دنیا کے مسلمان اسلامی اخوت کے رشتہ میں منسلک ہیں۔ وہ غیر نہیں ہیں۔ اور جس طرح اگر کسی غریب آدمی کا کوئی رشتہ دار امیر ہو تو گو وہ اس کی دولت میں حصہ دار نہیں ہوتا لیکن پھر بھی اسے ہمیشہ یہ خوشی اور حوصلہ ہوتا ہے کہ میرا ایک رشتہ دار امیر ہے اور یہی اس کی عزت کا باعث ہے۔ دوسرے لوگ بھی اس کو کچھ کہنے یا نقصان پہنچانے سے ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ امیر رشتہ دار اس کی مدد کو آجائے۔ اسی طرح غلام مسلمان بھی ہمیشہ اس احساس سے سرشار رہتا ہے کہ میرے دوسرے بھائی برسر حکومت ہیں اور مجھے کسی دشمن سے گزند پہنچنے کا احتمال نہیں۔ اگر کوئی اس قسم کا ارادہ بھی کرے گا تو میرا آزاد مسلم

بھائی میری مدد کو آئے گا۔

اس تقریر کو سامنے رکھیئے اور اس کے بعد جناب حسین احمد صاحب مدنی کے خطبۂ صدارت کے اس حصہ پر غور کیجئے جو پچھلے صفحات میں نقل کیا جا چکا ہے اور جس میں انھوں نے پاکستان کی اسکیم کے خلاف یہ اعتراض عائد فرمایا ہے کہ اس سے ہندو منطقوں میں مسلمان جن کی پوزیشن زیادہ سے زیادہ ۱۴ فیصدی اور اکثری طور پر سات یا پانچ فیصدی ہو گی۔ بالکل بے دست و پا اور زندہ در گور ہو جائیں گے"۔

ہم جناب مدنی سے دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ جب جناب احمد سعید صاحب کے خیال کے مطابق۔ پنجاب کے غلام مسلمان کے لئے یہ امر باعث ہزار اطمینان ہے کہ افغانستان میں اس کا بھائی خوش حال آزاد اور طاقتور ہے اور اس کی وجہ سے یہاں کا کوئی دشمن اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ تو کیا پنجاب کے آزاد اور طاقتور ہونے کی صورت میں۔ یو۔پی کے مسلمان کو یہی اطمینان نصیب نہ ہو جائیگا کہ اس کا بھائی پنجاب میں طاقت اور حکومت کا مالک ہے۔ اس لئے اس کی طرف کوئی دشمن آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا! مسلم اکثریت کے صوبوں کی کامل آزادی اور اپنی جداگانہ حکومت جس میں دفاع۔ امور خارجہ۔ مالیات وغیرہ کا نظم ونسق سب اپنے ہاتھ میں ہوگا۔ اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کے لئے ہزار تقویت کا باعث ہوگا۔ اگر مدراس کے مسلمان کے پاؤں میں کانٹا چبھیگا تو پنجاب کے مسلمان کی آنکھ میں نیند حرام ہو جائیگی۔ اور جب کسی دست دراز کو یہ معلوم ہو کہ مظلوم بے کس و بے یار نہیں بلکہ اس کی تکلیف اس کے کروڑوں طاقتور اور آزاد بھائیوں کے لئے وجہ اضطراب ہو گی۔ تو وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے سے پیشتر سو مرتبہ سوچے گا۔

بہرحال جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے یہ امر موجب اطمینان ہے کہ ہمارے ان غلطی خوردہ بھائیوں کا قدم اب صحیح راستہ کی طرف اٹھ رہا ہے۔ خدا کرے کہ اب ان میں یہ توفیق پیدا ہو جائے کہ کشادہ ظرفی سے اپنی غلطی کا کھلے بندوں اعتراف کر کے بچھڑی ہوئی ملت سے پھر آملیں۔ اسی میں یقیناً ملت اسلامیہ کی بھی بہبود ہے۔ لیکن ملت سے زیادہ خود ان حضرات کے وقار کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔ اب وہ زمانہ گذر گیا کہ غیروں کو ان حضرات کی ضرورت تھی اب ہندو اور انگریز دونوں جانتے ہیں کہ ملت کا ساتھ چھوڑنے والوں کی مسلمانوں کی نگاہ میں کیا وقعت ہوتی ہے۔ اس لئے نہ تو اس اعتبار سے ہی انھیں ان کی ضرورت ہے اور نہ ہی ان کی سیاسی بصیرت کی بنا پر جس کے افلاس کی مثال خود جناب مدنی کا خطبۂ صدارت ہے۔ خدا کرے کہ ان حضرات کی سمجھ میں یہ بات

طلوعِ اسلام
جون ۱۹۴۲ء

لمعات

آسمان کی آنکھ نے ہبوطِ آدم سے لیکر اس وقت تک سطحِ ارض پر لاکھوں انقلابات دیکھے۔ عبرت انگیز۔ دیدہ کُشا۔ حیرت زا۔ اُبھرتی ہوئی قوموں کو دیکھا۔ الٹتی ہوئی سلطنتوں کو دیکھا۔ چمکتی ہوئی تہذیبوں کو دیکھا۔ مٹتے ہوئے تمدّنوں کو دیکھا۔ ثریّا رس محلّات کو دیکھا۔ پھر ان کے کھنڈرات کو دیکھا۔ ریت کے تودوں کو لالہ زار بنتے اور شگفتہ و شاداب گُلکدوں کو ویرانوں میں تبدیل ہوتے دیکھا۔ کہیں راکھ کے ڈھیر کے نیچے خوابیدہ چنگاریوں کو شعلۂ بیدار بنتے اور کہیں تڑپتی ہوئی بجلیوں کو راکھ کے ڈھیر میں منتقل ہوتے دیکھا۔ یہ سب تماشے فی الحقیقت حیرت انگیز اور عبرت آمیز تھے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ جو کچھ مسلمانوں پر (بلکہ صحیح الفاظ میں اسلام پر) اِس چشمِ فلک نے اس سے بڑا حیرت انگیز انقلاب شاید ہی کہیں اور دیکھا ہو۔ تفصیل میں الجھے بغیر ذرا تصوّر میں لائیے اس منظر کو کہ شہر کی عظیم الشّان مسجد کے منبر پر امام کھڑا ہے اور قرآن و حدیث۔ تاریخ و آثار کے حوالے دیکر بتا رہا ہے کہ صدرِ اوّل کے مسلمانوں نے کس قدر لرزہ انگیز جہاد کئے۔ کن کن میدانوں کو اپنے خونِ شہادت سے لالہ زار بنایا۔ غیر اللہ کی ہر قوّت کو مٹانے کے لئے کتنی کتنی بڑی قربانیاں دیں۔ اور تو اور۔ خود اس ذاتِ گرامی صفاتؐ نے جس کی نظیر آسمان کی آنکھ نے نہ پہلے دیکھی اور نہ بعد میں دیکھنے کا امکان ہے۔ کتنے غزوات میں بنفسِ نفیس سر آیا کا انصرام فرمایا۔ کتنے جیوش و عساکر کی قیادت فرمائی۔ کتنے زخم کھائے۔ کتنا مقدّس خون بہایا۔ اور یوں کس قدر جانفروشانہ قربانیوں کے بعد دنیا میں دین کو متمکّن اور قرآن کے احکام کو عملاً نافذ فرمایا۔ وہ کبھی جوش انگیز لہجہ اور کبھی رِقّت آمیز انداز میں ان واقعات کو بیان کرتا ہے۔ خود بھی روتا ہے اور سننے والوں کو بھی رُلاتا ہے اور اس کے بعد —— اور اس کے بعد نماز کی دو رکعتیں ادا کرکے وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ کی دعا مانگ کر اپنے حجرہ میں چلا جاتا ہے اور سننے والے اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہوجاتے ہیں اور سب کو اطمینان ہوجاتا ہے کہ دین کی طرف سے جو فریضہ ان پر عائد ہوتا تھا وہ بحمدہٗ ادا ہوگیا۔ وہ لرزہ انگیز اور رقّت آمیز کوائف وہ واقعات جو ابھی ابھی بیان

ہوتے تھے وہ صرف اس لئے تھے کہ گرمیٔ محفل کے لئے بطورِ داستان سرائی بیان کر دئے جائیں لسان سے اقرار (ایمان) یہ ہے کہ قرآن کے احکام کی تعمیل ہر مومن پر فرض۔ سنّتِ نبویؐ کی اطاعت واجب اور عملاً یہ حالت کہ قرآن کے احکام اور ان احکامات کی عملی شکل کے واقعات محض قصہ پارینہ جن کا ان سے گویا کچھ تعلّق ہی نہیں۔ بحث و جدل میں دیکھئے تو جیا لا جواب کہ مسلمان کے لئے چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی سُنّتِ نبویؐ کی خلاف ورزی جائز نہیں۔ یہ سب بجا اور درست۔ لیکن سُنّتِ نبوی کی اتّباع فقط آمین بالجہر اور رفع یدین تک رہ گئی۔ باقی رہی تمکّنِ دین (قیامِ حکومتِ الٰہیہ) کے لئے وہ تمام سرفروشی و جاں سپاری کی اہم سُنَن جو کُتبِ روایات میں تابندہ موتیوں کی طرح جگمگا رہی ہیں وہ سب معاذ اللہ قصّے کہانیاں ہیں۔ قرآن کی تلاوت "ثواب" کی غرض سے۔ والسارق و السارقۃ فاقطعوا ایدیھما (اور جو چور ہو خواہ مرد ہو یا عورت۔ تو اس کے ہاتھ کاٹ ڈالو) محض اس لئے ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ کے پڑھنے سے دس دس نیکیاں ملتی ہیں۔ یہ بحث کہ ہاتھ کہنیوں تک کاٹنے چاہئیں یا پہنچے تک۔ صرف اس لئے ہے کہ طالبِ علم تک "صحیح روایت" پہنچ جائے۔ اس سے آگے کچھ غرض نہیں کہ اس آیت کی تعمیل کس طرح ہوگی اور ان روایات کی اتّباع کی کونسی شکل ہے! جب ان سے مفہوم ہی ثواب ٹھہرا تو اس خار دار جھاڑی تک پہونچنے کی ضرورت کیا کہ یہ ایک حکم ہے منجانب اللہ جس کی تعمیل فریضہ ہے۔ جب اس کی تلاوت سے جنّت مل جاتی ہو تو پھر اور "دوسری" کیوں مول لیجائے۔ یہ حکم تھا رسول اللہ کے لئے۔ انھوں نے اس پر عمل کر کے دکھا دیا۔ اب ہمارا فریضہ یہ ہے کہ اس آیت کو تلاوت کے ذریعے سے محفوظ رکھیں اور اس سے متعلقہ روایات کو جرح و تعدیل کی بحوث سے کھنگال کر اس کے جزوِ دین ہونے پر ایمان رکھیں۔ اس سے خدا اور خدا کا رسول خوش ہوگا اور اس کی جزا جنّت ہوگی۔ بحث کو زیادہ بڑھائیے تو اس نقطہ تک پہونچ جائیے کہ یہ احکام اُسی زمانہ میں نافذ العمل ہونگے جب مسلمانوں کا **امام** اپنا ہوگا۔ اور جب پوچھئے کہ صاحب! مسلمانوں کا اپنا امام کب ہوگا تو اس کے لئے قربِ قیامت کا وقت بتا دیا جائے گا اگر کوئی یہ کہدے کہ صاحب! میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ احکام ہر وقت نافذ العمل ہونے کے لئے ہیں۔ اگر آج ہم میں ان کی تنفیذ و ترویج کی قوّت نہیں تو اس کے معنے اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہمارا **اسلام** وہ اسلام نہیں جسے نبی اکرمؐ نے متشکّل فرما کر دکھایا تھا۔ تو چاروں طرف سے دُہائی مچ جائے گی کہ دیکھنا اس

ملحد وزندیق کی نہ سننا۔ یہ مادہ پرست ہے۔ اس کی ذہنیت افرنگ زدہ ہے۔ یہ یورپ کی مادّی ترقّی سے متأثر ہوچکا ہے۔ اس کے نزدیک مذہب کے لئے دنیاوی قوت وشوکت ضروری ہے حالانکہ مذہب کا مقصود "روحانی ترقّی" ہے۔ آخرت کی نجات ہے۔ ایسا کہنے والے پر کفر کے فتوے چسپاں ہونگے اس کی تخریب وتذلیل میں ہر ممکن کوشش "جہادِ عظیم" قرار دی جائے گی اس پر مصیبت آئے گی تو مسرت کے شادیانے بجیں گے کہ بہت اچھا ہوا یہ فتنہ یوں کچلا گیا۔ اور اگر کہیں انسانی ہمدردی کی بنا پر دوسروں کی دیکھا دیکھی۔ اس کی اس مصیبت میں مدد کرنے کا سوال پیدا ہوگا تو اسے اس شرط سے مشروط کردیا جائے گا کہ اس سے کہیئے کہ پہلے اپنے "مردود عقائد" سے تائب ہوجائے اور وعدہ کرے کہ اس کے بعد اس قسم کے الحاد کا فتنہ مسلمانوں میں کبھی نہیں پھیلائے گا۔

کہیئے کہ آسمان کی آنکھ نے اس سے زیادہ عبرت انگیز اور اس سے بڑھ کر حیرت زا انقلاب کوئی اور بھی دیکھا ہے! خدائے قدوس کے فرشتے جنھوں نے اسلام کی اُس عالمگیر سطوت وشوکت کو دیکھا اور آج مسلمانوں کی ہمہ گیر سرنگونی اور کس مپرسی کو دیکھ رہے ہیں۔ اس پر گواہ ہیں کہ چشمِ فلک نے اس سے بڑا انقلاب کہیں نہیں دیکھا۔

اس منظر کو ذرا اور آگے بڑھائیے۔ ریگ زارِ ہند میں منزل فراموش کردہ منتشر قافلے کے افراد کے سامنے ایک مخلص للہ کے بندے نے صحیح اسلامی نصب العین رکھا یعنی ان کی اکثریت کے علاقہ میں ان کی اپنی آزاد حکومت جہاں شریعتِ خداوندی کے مطابق انھیں اپنی نشوو ارتقاء کا موقعہ مل سکے۔ ایک مخلص بندے نے یہ نصب العین دیا اور دوسرے بندے نے اسے اپنے خداداد تدبّر وفراست اور ایثار وخلوص کی بنا پر آگے بڑھایا۔ حالت یہاں تک پہونچ گئی کہ سخت ترین مخالف جماعت (کانگریس) کے ایک نہایت ذمّہ دار رکن (مسٹر راجگوپال آچاریہ) نے ملکی مفادِ کلّی کے پیشِ نظر اس نصب العین کی معقولیت کا اعتراف کیا اور اس حقیقت کو اپنی جماعت کے سامنے علانیہ پیش کردیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہاں آسمان کی آنکھ نے کیا دیکھا؟ دیکھا یہ کہ ایک متشدّد ہندو اس مطالبے کی حمایت کرتا ہے اور اس مطالبے کی حمایت کو اس قدر مبنی برصداقت سمجھتا ہے کہ وہ جماعت کی مجلسِ عاملہ سے الگ ہوجانے کو بھی گوارا کرلیتا ہے لیکن اس کے برعکس سب سے بڑی مخالفت اس کی

طرف سے ہوتی ہے جو کبھی مسلمانوں میں امام الہند۔ سرخیلِ گروہِ علماء اور اپنے جوشِ کلام و اندازِ تحریر کی بناء پر ابوالکلام اور قلم کا بادشاہ کہلاتا تھا! اور وہ مخالفت بھی کسی ملکی مفاد پر نہیں کرتا بلکہ کہتا یہ ہے کہ "پاکستان کا نظریہ اسلام کے خلاف ہے"۔ اللہ اکبر! کفر و اسلام کے امتزاج سے ایک متحدہ قومیت کا افسانوی تخیل عین اسلام۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک سے ایسی حکومت کا قیام جس میں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین نافذ ہوں (اور انسانوں میں بھی اکثریت غیر مسلموں کی) یہ عین اسلام اور مسلمانوں کی اپنی آزاد حکومت جس میں شریعتِ خداوندی کا نفاذ ہو۔ یکسر اسلام کے خلاف چشمِ بصیرت کے لئے یہ انقلاب کوئی چھوٹا انقلاب نہیں، اس تأسف انگیز واقعہ سے مسلمانوں کے دل میں غم و غصّہ کی لہر کا دوڑ جانا فطری امر ہے جب تک کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔ اس کی طرف سے ایسی کھلی ہوئی غدّاری ناقابلِ برداشت صدمہ ہے لیکن ہم مسلمانوں سے پوچھتے ہیں کہ وہ بھی ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر سوچیں کہ انھوں نے ایسے لوگوں کی روٹی کا کوئی انتظام کر رکھا ہے جن کا ذریعۂ معاش کچھ نہ ہو اور وہ اپنا وقت اجتماعی کاموں میں صرف کر دیں! مسلمان تو جناح جیسا لیڈر چاہتے ہیں جو ان کا کام بھی کرے اور اپنی گرہ سے کھلائے بھی۔ لیکن ہر شخص جناح تو نہیں ہو سکتا! ہمیں یقین ہے کہ اگر مسلمانوں نے اپنے ہاں اس قسم کا انتظام کیا ہوتا تو بہت سے لوگ جو آج غیروں کے کیمپ میں نظر آتے ہیں کبھی اپنوں سے الگ نہ ہوتے۔ یہ قوم کی بدبختی ہے۔ باقی رہا ان لوگوں کا اپنے مسلک کو برسرِ حق ثابت کرنے کی کوشش کرنا۔ سو ایسا کون ہے جو اس کا اقرار کرے کہ اس نے مجبوری اور بیچارگی سے فلاں مسلک اختیار کر رکھا ہے اور عام لوگوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ بھوک اور پیاس برداشت کر لیں گے لیکن صداقت کی راہ نہ چھوڑیں گے۔ تو یہ بہت بڑی سعادت ہے جو ہر ایک کے حصّے میں نہیں آیا کرتی یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف خود جناب آزاد صاحب کو بھی ہے سنئے کہ وہ اس کا اعتراف کن الفاظ میں کرتے ہیں: —

> سالکِ راہِ حریّت و صداقت کے پاؤں میں اس کے دشمن لوہے کی زنجیریں ڈال دیتے ہیں تاکہ وہ آیندہ کی منازل طے نہ کر سکے۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ زنجیر لوہے کی جگہ سونے کی ہوتی ہے، وہ اس طلسمی زنجیر کو دیکھ کر راہ و رسمِ منزلِ صداقت پرستی سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اس کی طرف دوڑ جاتا ہے اور مسکراتا ہوا خود دشمن کے ہاتھ

سے لپیٹ کر اپنے پاؤں میں ڈال لیتا ہے۔ یہ طلسمی زنجیر کیا ہے؟ امیدِ زر اور طمعِ جاہ!

لیکن آہ! کس قدر دنی الوجود کم ظرف ہے وہ انسان جو صرف حبِّ مال اور اُلفتِ زر کے لئے خدا کی محبّت کو ٹھکرا دیتا ہے اور ایک فانی شے کے لیے حق و صداقت کی باقی لازوال دولت کو ہمیشہ کے لئے کھو دیتا ہے۔ وہ چاندی سونے کے سکّوں کو اگر خدا کے لئے اور اس کی سچّائی کے لئے کھو دے تو خدا اسے سچّائی کے ساتھ واپس دلا سکتا ہے پر جو خدا کی محبّت کو دولت کے لئے کھوتا ہے وہ تو اسے دولت نہیں دلا سکتی پھر انسانیت کے لئے کیسی دردانگیز موت ہے کہ انسان آسمان کی سب سے بڑی عزّت کو زمین کی سب سب سے بڑی ذلّت کے لئے کھو دے؟

کتنے بڑے بڑے تاجدار، پُرہیبت فاتح، عظیم الشّان سپہ سالار، نامور محبِّ وطن اور محبوب القلوب وملّت پرست انسان ہیں جن کی حق پرستانہ عزائم کی استقامت کو اسی لعنتِ طمع نے ڈگمگا دیا، انھوں نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنی فوج اور دراصل اپنے خدا اور اس کی صداقت سے غداری کی اور دشمنوں کے لئے دوستوں کو، غیروں کے لئے اپنوں کو، ظالموں کے لئے مظلوموں کو۔ بے رحم فاتحوں کے لئے بیکس مفتوحوں کو اور شیطان کے تخت کی زیب و زینت کے لئے خدائے رحمٰن کے دربارِ اجلال کی عزّت وعظمت کو چھوڑ دیا! تاریخ کے صفحات ہمیشہ سے اسی دَرد کے ماتمی ہیں۔ قوموں اور ملکوں کی داستانیں ہمیشہ ناپاک سرگذشت پر خون کے آنسو بہاتی ہیں اور دولت پرستی کی ملعون نسل آغازِ عالم سے ناصیۂ انسانیّت کے لئے سب سے بڑا بے عزّتی کا داغ رہی ہے فی الحقیقت راہِ حق پرستی کی سب سے بڑی آزمائش چاندی اور سونے کی سُرخی ہی ہے اور اگر اس منزلِ پُرخطر سے تم گذر گئے تو پھر تمہاری ہمّت بے پروا اور تمہارا عزم ہمیشہ کے لئے بے خوف ہے یہی طمع کا خبیث دیو ہے جس کا پنجہ بڑا ہی زبردست اور جس کی پکڑ قلبِ انسانی کے لئے بڑی ہی مضبوط ہوتی ہے اسی نے فرزندانِ ملّت سے غیروں کے آگے مُجرئی کرائی ہے۔ یہی پکڑ پکڑ کے ابناءِ وطن کو لے گیا ہے اور غیروں کے قدموں پر اخلاق کی ناپاکی اور جذبات کی کثافت کے کیچڑ

میں گرا دیا ہے، تاکہ اپنے وطن، اپنی سرزمین، اپنے مذہب، اپنی قوم اور اپنے بھائیوں کے خلاف جاسوسی کریں! اسی لئے بڑے بڑے مدعیانِ خدمتِ ملک و ملت کی برسوں کی کمائی ایک آن کے اندر ضائع کر دی ہے اور انھیں چارپایوں کی طرح گرا دیا ہے تاکہ برسوں کی سچائی کو ایک لمحہ کی طمع پر قربان کر دیں۔ آہ! یہی انسانیت کے لئے وہ روحِ خبیث ہے جو بڑے بڑے پاک جسموں، بڑی بڑی مقدس صورتوں، بڑے بڑے رازِ علم و عمل دلوں کے اندر حلول کر گئی ہے اور فرشتہ سیرتوں نے شیطانوں کے، اور ملکوتی صفات ہستیوں نے خونخوار عفریتوں کے سے کام کئے ہیں۔

(مضامین آزاد حصہ سوم)

مسٹر راجگوپال اچاریہ کی اس تحریک سے کم از کم ایک فائدہ تو ضرور ہوا، معلوم ہوتا ہے کہ مسلم قومیت پرست حضرات کی اکثریت کانگریس کی مسلم کش پالیسی سے دل ہی دل میں بیزار ہو چکی تھی لیکن یہ لوگ اپنی ناک رکھنے کی خاطر اس سے الگ نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن موقعہ کی تلاش میں ضرور تھے۔ مسٹر اچاریہ کی جرأت نے یہ موقعہ بہم پہنچا دیا۔ ان میں سے کئی ایک نے تو ان کی کھلم کھلا حمایت کی بہت سے غیر جانبدار رہے اور اب باقیوں کی طرف سے آئے دن ان کی تائید میں بیانات شائع ہوتے رہتے ہیں بعض واضح اور غیر مبہم بعض کچھ ملتی قسم کے۔ لیکن ہر ایک ان کی قلبی کیفیت کا غماز۔ سوشلسٹ مسلمان پنجاب صوبہ کانگریس کا صدر۔ احرار و آزاد مسلم بورڈ کے سکریٹری۔ سرحد کے قومیت پرست جنگجو خود سرحدی گاندھی صاحب۔ ہر ایک کسی نہ کسی رنگ میں تائید کر رہے ہیں۔ اور یوں اس حقیقت کا اعتراف کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کا اپنی آزاد حکومت کا مطالبہ حق بجانب ہے۔ بعض اوقات حق کی تائید کے لئے کیسے کیسے عجیب سامان پیدا ہو جاتے ہیں!

لیکن مسٹر راجگوپال اچاریہ یا ان کے دیگر ہمنوا حضرات کی اس تائید کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے ہمارے مطالبے کا حق بجانب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ہمارا مطالبہ۔ بلکہ یوں کہئے کہ نصب العین تو پہلے دن سے حق پر مبنی ہے۔ اور حق حق ہی ہوتا ہے خواہ اس کی تائید کرنے والا کوئی بھی نہ ہو۔ اس لئے مسٹر اچاریہ کی تائید و حمایت ہمارے لئے باعث فخر و ناز نہیں۔ بلکہ یہ چیز خود ان کے لئے وجہِ افتخار

ہے کہ انھیں حق و صداقت کی حمایت میں جرأت و بیباکی کی توفیق نصیب ہوئی۔ البتہ اس سے ہم خوش ضرور ہیں کہ ایک شخص باطل کی ضد کو چھوڑ کر صداقت کے اعتراف کی راہ پر آگیا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے اطمینان کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ مسٹر سٹیفورڈ کرپس نے دبی زبان سے ہمارے مطالبے کو درخورِ التفات تسلیم کر لیا یا اب چند کانگریسی حضرات نے اس کی صداقت کا اعتراف کر لیا؟ کیا اس کے بعد اب ہمارے ذمہ اور کچھ باقی نہ رہا؟ کیا اب ہمارا مقصود خود بخود پکے ہوئے پھل کی طرح ہماری جھولی میں آگرے گا! کیا اب ہماری طرف سے یہ کانگریسی حضرات ہمارے مخالفین سے نبرد آزما ہو کر ہمارا مطالبہ منوا دیں گے؟ اگر مسلمان یہی سمجھ رہا ہے تو وہ اپنے آپ کو فریب دے رہا ہے اور جتنی جلدی وہ اس خود فریبی کو چھوڑ کر حقیقت آشنا ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے **پاکستان** نہ کسی کرپس کی تائید سے حاصل ہوگا نہ کسی اجاریہ کی حمایت سے۔ یہ حاصل ہوگا قوم کی اجتماعی قوت اور ایثار سے۔ اور یہ وہ راز ہے جسے مسلمان ابھی تک کماحقہ سمجھا نہیں۔ زندگی کا فلسفہ کیا ہے؟ اسے حضرت علامہ اقبالؒ نے دو مصرعوں میں اس جامعیت اور خوبصورتی سے بیان فرمایا ہے کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ وہ فرماتے ہیں ؎

زندگی انجمن آرا و نگہدار خود است

اے کہ در قافلہ۔ بے ہمہ شو۔ با ہمہ رو

انفرادی حفاظت کا جذبہ ہر حیوان میں پایا جاتا ہے۔ آپ ایک چیونٹی کو بھی پکڑنے یا مارنے کی کوشش کریں گے تو وہ بھی اپنے تحفظ کے لئے امکان بھر قوت صرف کرے گی اس لئے اگر انسان صرف اپنی انفرادی حفاظت ہی کی فکر کرتا ہے تو یہ تو محض تقاضائے حیوانیت ہے۔ اس کی انسانی زندگی اس سے آگے جا کر شروع ہوتی ہے اور وہ زندگی یہ ہے کہ اپنے انفرادی استحکام کے ساتھ ساتھ اجتماعی استحکام و تحفظ کی بھی فکر کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ انسانی زندگی اجتماعیت کی زندگی ہے۔ اسے حیوانوں کی طرح الگ الگ نہیں بلکہ آپس میں مل جل کر رہنا ہے اسلئے ایک فرد کی حفاظت جماعت کی حفاظت پر مبنی ہے۔ قافلہ کے ہر فرد کے لئے مضبوط و توانا ہونا نہایت ضروری ہے۔ یہ انفرادی خودی کا استحکام "بے ہمہ شو" کی زندگی ہے لیکن یہی مقصود نہیں۔ مقصود یہ ہے کہ اس انفرادی استحکام کے

ساتھ ۔ تمام قافلہ کی حفاظت کی بھی فکر کیجائے ۔ یہ حقہ "باہم رد" کی زندگی پر مشتمل ہے اگر بغور دیکھا جائے تو قافلے کی حفاظت درحقیقت افراد کی ہی حفاظت ہے قافلہ نام ہی افراد کے مجموعے کا ہے۔ لیکن جب تک قافلے کا ہر فرد ۔ اپنی ذاتی حفاظت کے ساتھ قافلے کے اجتماعی تحفظ کی فکر نہ کرے گا اس کی انفرادی حفاظت ناممکن ہے ۔ قافلے کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ افراد اپنی انفرادیت کو قافلہ کی اجتماعیت میں گم کردے ۔ امیر کارروان کی اطاعت ۔ جماعتی ربط وضبط کی پابندی ۔ فرائض متعلقہ کی سرانجام دہی ۔ ایثار ۔ جرأت ۔ شجاعت یہ تمام جوہر قافلے کی حفاظت کے لئے ضروری ہیں ۔ ذرا غور کیجئے اسپین میں مسلمانوں نے قریب تین سو سال حکومت کی اور اس شان وشوکت سے حکومت کی کہ آج تک اس کی یاد باقی ہے ۔ لیکن آج اسی اسپین میں ایک مسلمان باقی نہیں ہے ۔ زندہ مسلمان تو ایک طرف کسی قبر تک کا نشان باقی نہیں ہے ۔ ظاہر ہے کہ جب وہاں کے مسلمانوں پر ہلاکت وبربادی کے طوفان امڈے ہیں تو انفرادی طور پر ہر شخص نے اپنی اپنی حفاظت کا سامان کیا ہوگا ۔ اس لئے کہ جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے یہ تو تقاضائے فطرت ہوچکی ہے ۔ لیکن اس کے باوجود وہ سب مٹ گئے یہ کیوں ہوا ؟ اس لئے کہ انھوں نے انفرادی حفاظت کی کوشش کی قافلے کی حفاظت کی فکر نہ کی ۔ اگر وہ افراد مل کر کارواں کی حفاظت کی تدبیر کرتے تو اسپین پر آج بھی انہی کی حکومت ہوتی ۔

ہندوستان کے مسلمان کے سر پر بھی اسی قسم کے ادبار کے بادل منڈلا رہے ہیں اور وائے بدبختی کہ یہاں بھی ہر شخص اپنے انفرادی تحفظ کی فکر میں ہے **قافلہ** کی حفاظت کا خیال ہی دل میں نہیں آتا ظاہر ہے کہ حفاظت کی ان انفرادی کوششوں کا نتیجہ **ہلاکت** کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا ۔ لیکن اگر یہی انفرادی کوششیں ایک **کارواں** (اجتماعی) شکل اختیار کرلیں تو ہر فرد محفوظ رہے گا ۔ مثلاً مسلمانوں میں ہزاروں دولتمند ایسے ہیں جو اپنے خزائن ودفائن کی حفاظت کے لئے پاسبان ملازم رکھ رہے ہیں ۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ یہ پاسبان ان کی کوئی حفاظت نہیں کرسکتے لیکن اگر یہی حضرات ۔ زیادہ نہیں تو اپنے پاسبانوں کا خرچ **امینِ ملت** کی خدمت میں پیش کردیں تو وہ نہ صرف ان کے خزائن ودفائن کی حفاظت کا سامان مہیا کردے گا ۔ بلکہ ان کی جان ۔ عزت آبرو عفت وعصمت سب کچھ محفوظ رہ سکے گا ۔ اس لئے اس سے پورے کا پورا قافلہ محفوظ ہوجائے گا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اتنی سی آسان بات بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی تنظیم ہنوز بیحد کمزور ہے۔ لوگوں نے مسلم لیگ کو "اوروں" کی جماعت سمجھ رکھا ہے۔ مسٹر جناح نے اگلے دنوں قومی بیت المال کے لئے جو اپیل شائع کی ہے اس کے نتائج **روح افزا** لیکن نہایت حوصلہ شکن ہیں۔ روح افزا اس لئے کہ قوم کے غریبوں نے اس میں اس وقت تک پورے دو لاکھ روپیہ جمع کر دیا ہے لیکن حوصلہ شکنی اس لئے کہ امراء کا طبقہ بالکل بے تعلق بیٹھا ہے۔ حالانکہ یہی وہ طبقہ ہے جسے سب سے زیادہ حفاظت کی ضرورت ہے ہمارے پاس ملّی خدام کی کوئی جماعت موجود نہیں۔ خاکساروں کی تباہی پر ہر چشمِ عبرت خونابہ فشاں ہے۔ لیکن عسکریّت کے بغیر کسی قافلہ کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ ہم نے آئین شکنی کی کبھی تائید نہیں کی۔ نہ ہی اب آئین شکنی کی کسی روش کے مؤید ہیں۔ سنا ہے کہ علامہ مشرقی سے اب نقل و حرکت کی پابندیاں دُور ہونے والی ہیں خدا کرے کہ ایسا ہی ہو مشرقی بڑے جوہروں کا مالک ہے قوم کو چاہیئے کہ اپنی پُوری قوّت ان جوہروں سے مستفید ہونے میں صرف کر دے۔ مشرقی کی تنظیم مسلم لیگ کا میمنہ اور میسرہ بن سکتی ہے یہ وہ قوت ہو گی جس سے دنیا کے کسی شریف انسان کو خائف ہونے کی ضرورت نہیں۔ مسلمان کی قوت تو ہر ضعیف و ناتواں کے سپر ہوتی ہے اور وہ اَز روئے قرآن مامور ہے کہ اپنے دشمن سے بھی انصاف کرے اس لئے مسلمان کی قوت میں ڈر کا ہے کا یہ تو خدا کا سپاہی اور دنیا میں نیکی کا محافظ ہے۔ اس وقت سب سے اہم چیز قائد اعظم کی اپیل کے جواب میں جلد از جلد سرمایہ کی فراہمی اور نہایت پُر امن طریق سے اجتماعی حفاظت کے لئے مِلّت کی عسکری تنظیم ہے وقت وہ نہیں کہ اسے لفظی ریزولیشنوں اور بحث مباحثوں میں صرف کیا جائے ۔

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے

اس لئے اب تو کچھ کرنے کا وقت ہے۔ اب ــــــ اور اگر اب نہ ہوا تو پھر یہ موقع کبھی ہاتھ نہ آئیگا۔

سندھ کی سیاست۔ اسلامی ہند اور بالخصوص پاکستانی سیاست میں جتنی اہمیت رکھتی ہے باہر کی دنیا اتنی ہی اس سے ناواقف ہے۔ وہاں کوئی ایسا اسلامی اخبار نہ تھا جو سندھی مسلمانوں کے سامنے صحیح اسلامی سیاست کو پیش کرتا اور باہر کے مسلمانوں کو وہاں کے احوال و کوائف سے آگاہ

آگاہ کرتا۔ بارے سالِ گذشتہ ہمارے محترم سیّد علی محمد راشدی صاحب نے ہمت کی اور ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار (مسلم وائس) جاری کر دیا۔ راشدی صاحب اسلامی دنیا۔ بالخصوص مسلم لیگ کے حلقہ میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اللہ تعالےٰ نے انہیں حسنِ تدبر کے ساتھ عمدہ قلم بھی عطا فرمایا ہے۔ اس ایک سال میں مسلم وائس نے اپنے مقصدِ پیشِ نظر کو نہایت عمدگی سے سرانجام دیا ہے۔ لیکن اس منشور سے جو راشدی صاحب نے شائع کیا ہے یہ دیکھ کر بیحد رنج ہوا کہ اس اخبار کو سال بھر میں دو ہزار روپیہ کا نقصان اٹھانا پڑا۔ راشدی صاحب نے اپیل کی ہے کہ انہیں اگر اتنی حضرات ایسے مل جائیں جو ۲۵ روپیہ سالانہ (علاوہ زرِ چندہ) بطورِ عطیہ عنایت فرما دیں تو اخبار اپنے مشن کو آگے بڑھاتا جائے گا ورنہ اس گراں سالی میں اس قدر خسارہ برداشت کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ ہم ہندوستان بھر کے اربابِ خیر سے پرزور درخواست کریں گے کہ وہ راشدی صاحب کی اس اپیل پر لبیک کہیں۔ مسلم وائس کا زندہ رہنا پاکستانی سیاست کے لئے نہایت ضروری ہے بڑھیے اور اسے زندہ رکھنے میں امداد فرمائیے۔ پتہ یہ ہو گا مدیر مسلم وائس۔ رام باغ روڈ۔ کراچی

در سینہ تا بچند برآرم فسردہ برم!
این ہمہ قطرہ خوں کہ ز مژگاں چکیدنی است

طلوعِ اسلام کا سابقہ پرچہ اپریل و مئی کی مشترکہ اشاعت تھی اس سے ایک غرض یہ بھی تھی کہ ہمیں ایک ماہ کی فرصت مل جائے گی کہ ہم ان نامساعد حالات پر قابو پانے کی کوشش کریں جو جنگ کی وجہ سے گراں باری کا باعث بنتے چلے جا رہے ہیں ہمیں توقع تھی کہ ہماری کوشش بارآور ہو گی لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا حالات کی نامساعدت اس حد تک پہونچ چکی ہے کہ اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ کچھ وقت کے لئے طلوعِ اسلام کی اشاعت ملتوی کر دی جائے۔ لکھنے کو تو ہم یہ چار الفاظ لکھ ہی گئے ہیں لیکن اس سے ہمارے دل پر کیا قیامت گذری ہے اس کا اندازہ ہم ہی لگا سکتے ہیں ہمیں اس کا بھی خوب احساس ہے کہ اس فیصلے سے ان احباب کے دل پر کیا گذرے گی جن کی کیفیت یہ ہے کہ اگر کبھی رسالہ دو چار دن کی تاخیر سے شائع ہوا ہے تو ان کی بیتابی تمنا استفسارات کے خطوط سے چھلک پڑی ہے ان کے لئے مساعدتِ حالات تک طلوعِ اسلام کی غیر حاضری یقیناً

جگہ پاش ہو گی۔ لیکن ہم درخواست کریں گے کہ ہماری مجبوریوں پر نگاہ رکھتے ہوئے ہماری معذرت قبول فرما دیں۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ اس وقت جو حالات رُونما ہو رہے ہیں ان کے پیشِ نظر بالخصوص طلوعِ اسلام کی اشاعت میں التوا نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن ہم کیا عرض کریں کہ آسمان سے کتنے عرصہ کی مسلسل لڑائی کے بعد ہمیں سپرانداز ہونا پڑا ہے۔

بہرحال ایک مجبوری ہے جس میں ہم اور آپ سب شریک ہیں۔ طلوعِ اسلام نے اپنے معاملات میں ہمیشہ خدا کو درمیان میں رکھا ہے اور (سوائے کسی نادانستہ غلطی کے) آج تک حُسنِ معاملہ کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ اب مجبوراً اس کی اشاعت ملتوی کرنی پڑی ہے ہم حُسنِ معاملہ کو پھر ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتے۔ آپ حضرات کا بقایا زرِ چندہ (ایک ماہ کا ہو یا سال بھر کا) ہمارے پاس امانتہً محفوظ رکھا ہے جو حضرات چاہیں وہ ہمیں ایک کارڈ لکھ دیں (جس میں نمبر خریداری ضرور درج ہو) بقایا زرِ چندہ بلاتامّل واپس کر دیا جائے گا۔ اسے اچھی طرح سے سمجھ لیجئے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ اس بقایا کے بدلے طلوعِ اسلام کا شائع کردہ لٹریچر خرید لیں یا سابقہ پرچے جو آپ کو مطلوب ہوں منگا لیں (ان کی فہرست الگ دی جاتی ہے) لیکن اس کے لئے آپ مجبور نہیں ہیں آپ بلاتکلف اپنا بقایا واپس منگا لیجئے۔ ہمیں اس کی خوشی ہوگی۔ ہم بتیقن یہ نہیں کہہ سکتے کہ طلوعِ اسلام دوبارہ کب حاضرِ خدمت ہوگا اس لئے آپ کسی قسم کی غلط فہمی میں نہ رہیئے اور اپنے فیصلے سے ہمیں پندرہ تاریخ تک مطلع فرمایئے۔ تاکہ ہم مہینے کے آخر تک ان معاملات کا فیصلہ کر سکیں۔

معارف القرآن کے لئے اب جناب مؤلف (چودھری غلام احمد صاحب پرویز) ۵۱۱ نور جہاں روڈ نئی دہلی کے پتہ پر لکھئے تو بہتر ہوگا۔

سرِدست یہ آخری سطور ہیں جو احباب کے چشمِ منتظر کے سامنے حاضر ہیں یہ سطور روشنائی سے نہیں بلکہ خونِ دل سے لکھی جا رہی ہیں۔ چار برس کی مسلسل ملاقاتوں کے بعد یہ خلا ایک ایسی کمی پیدا کر رہا ہے جس کے تصور سے آنکھوں میں آنسو چھلک آتے ہیں۔ اس چار برس میں ہم نے جو کچھ کیا صرف اللہ کے لئے کیا کسی اور جذبہ کے ماتحت کچھ کہنا ہمارے نزدیک شرک کے مرادف ہے۔ اس میں جو کچھ صحیح اور درست تھا وہ قرآنِ کریم کے تصدق میں تھا۔ جو کچھ غلط تھا۔ اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں اس کے لئے ہم بحضور ربّ العزت دست بدعا ہیں کہ وہ ہماری ان نادانستہ غلطیوں کو معاف کرے۔ آپ احباب سے بھی معذرت خواہ ہوں کہ ہماری طرف سے جو کچھ کوتاہیاں اور سہل انگاریاں ہو گئی ہوں۔ اس سے معاف فرما دیں۔ خدا حافظ!

اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ

ہندو کیا ہے —— اور کیا کرنا چاہتا ہے؟

پرویز

روزنامہ نوائے وقت بابت ۲۰ جولائی ۱۹۸۰ء میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی:-

گزشتہ برس بھارت میں سابقہ برسوں کی نسبت فرقہ وارانہ صورت حال سنگین ترین تھی۔ بھارت کی وزارتِ داخلہ نے ۸۰-۱۹۷۹ء کے بارے میں جو رپورٹ جاری کی ہے اس میں بتایا گیا کہ ۱۹۷۹ء میں (۳۹۴) واقعات ہوئے جن میں (۲۶۱) افراد ہلاک ہوگئے۔ رپورٹ کے مطابق، ۱۹۷۶ء میں (۱۷۹) فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جبکہ ۱۹۷۷ء میں یہ تعداد (۸۸) اور ۱۹۷۸ء میں (۲۳۰) ہوگئی۔ ۱۹۷۶ء میں (۱۳۰) افراد ہلاک اور (۹۴) زخمی ہوئے جبکہ ۱۹۷۷ء میں (۳۶) افراد ہلاک اور (۷۹۴) زخمی ہوئے۔ اور ۱۹۷۸ء میں (۱۱۰) ہلاک اور (۱۸۵۳) زخمی ہو گئے۔ وزارتِ داخلہ میں فرقہ وارانہ خیر سگالی کے بارے میں مستقل طور پر معلومات جمع کرنے کے لئے ایک سیل قائم کر دیا گیا ہے۔

اس سے تھوڑا عرصہ پہلے، وہاں، جمشید پور میں مسلمانوں کے خون سے جو ہولی کھیلی گئی۔ پھر علی گڑھ میں جس طرح انہیں ہلاک اور تباہ و برباد کیا گیا۔ اور اواخر جولائی ۱۹۸۰ء میں سری نگر میں ان کی بے پناہ ہلاکت کی جو خبریں نشر ہوتی رہیں، ان سے مسلمانانِ پاکستان کا حساس طبقہ تلملا اٹھا اور ہمیں مختلف گوشوں سے یہ کہا گیا کہ ہم اس موضوع پر تفصیل سے لکھیں۔

اس ضمن میں سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ بھارت کی طرف سے اس قسم کی خون ریزیوں اور ہلاکت خیزیوں کو جو "فرقہ وارانہ فسادات" کہہ کر پکارا جاتا ہے، تو یہ حقیقت پر پردہ پوشی کی سعیٔ ناکام ہے۔ یہ فرقہ وارانہ فسادات نہیں بلکہ وہاں کے حکمران طبقہ کی طرف سے خود اپنی رعایا کے خلاف ظلم اور زیادتی کے واقعات ہیں۔ یہ نقطہ غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔

ہندوؤں نے اپنے ہاں جمہوریت کا ڈھنڈورا پیٹ رکھا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہاں جمہوری نظام ہے ہی نہیں۔ جمہوریت ان کے مذہب کے خلاف۔ ان کی روایات کے خلاف اور ان کے مزاج کے خلاف ہے۔ ہندو دھرم میں انسانوں کی تقسیم ورنوں (ذاتوں) کی رو سے ہوتی ہے، اور یہ ورن خود برہما کے متعین کردہ ہیں جنہیں کوئی بدل نہیں سکتا۔ ان ورنوں کے مطابق تعلیم و تدریس۔ قانون سازی اور عدلیہ کے مناصب برہمنوں کے سپرد ہوتے ہیں، اور انتظامیہ (اور دفاعیہ) کشتریوں کی تحویل میں۔ باقی دو ورن (ویش اور شودر، جن کی ان کے ہاں اکثریت ہے) پہلے دو ورنوں کی خدمت گزاری کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ اور شودروں کو انسانیت کا کوئی حق حاصل نہیں ہوتا۔ اس سے واضح ہے کہ ان کے ہاں خود اپنی قوم کے اندر بھی جمہوری نظام کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ جہاں تک ملکی جمہوریت کا تعلق ہے، وہاں

ہندو اکثریت میں ہیں اور مسلمان اقلیت ہیں اور ان کی یہ اقلیت (MINORITY) کسی صورت میں بھی اکثریت (MAJORITY) کی حیثیت حاصل نہیں کر سکتی۔ اس لئے وہاں ہندو مستقلاً حاکم اور مسلمان مستقلاً ان کے محکوم رہتے ہیں اور محکوم رہیں گے۔ ہندو جو تقسیم ملک کے اس قدر مخالف تھے تو اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد ان کی گرفت سے نکل جائے۔ پاکستانی مسلمان تو (بحمدہٖ) ان کی گرفت سے نکل گئے لیکن وہاں کے مسلمان ان کے آہنی شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ لہٰذا، جنہیں "فرقہ وارانہ فسادات" کہہ کر دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکی جاتی ہے وہ درحقیقت وہاں کی اکثریت (ہندو حکمران طبقہ) کے، وہاں کی اقلیت (محکوم مسلمانوں) پر مظالم ہیں۔ اور یہ کوئی ہنگامی یا حالیہ واقعات نہیں۔ ان کا سلسلہ تو تقسیم ہند کے فوری بعد سے شروع ہو گیا تھا۔

اصل یہ ہے کہ کسی قوم کی ذہنیت کی ساخت، اور اس کی سیرت و اخلاق کی تشکیل میں اس کے مذہبی عقائد کا بڑا گہرا دخل ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ قوم بظاہر اپنے مذہب کو تیاگ بھی دے لیکن اس کے پیدا کردہ اثرات اس کے تحت الشعور میں نسل در نسل تک پیوست رہتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ہندو مذہب کا بنیادی عقیدہ ورنوں کی تفریق و تقسیم ہے۔ اس سے ان میں خود اپنے ہی جیسے انسانوں کے خلاف نفرت کے جذبات پرورش پاتے رہتے ہیں۔ جب ان کی خود اپنے لوگوں کے خلاف نفرت کا یہ عالم ہے تو مسلمانوں کے خلاف، جنہیں وہ انسان نہیں بلکہ ملیچھ (ملیکش یعنی وحشی درندے) سمجھتے ہیں، ان کی نفرت اور عناد کی کیا کیفیت ہوگی۔ ظاہر ہے!

ہم اپنی قوم کے متعلق شکوہ کرتے رہتے ہیں کہ انہوں نے اسلام کو چھوڑ دیا ہے۔ ان میں دنیا بھر کی برائیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ ان کے اخلاق بگڑ گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود، اسلام کی تعلیم کے جو اثرات ان کے تحت الشعور میں جاگزیں ہیں ان کا نتیجہ یہ ہے کہ اس تیس سال کے عرصہ میں (جبکہ ہندوستان میں مسلم کش فسادات کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی ہے) پاکستان میں کسی ہندو کے خلاف محض اس کے ہندو ہونے کی بناء پر انگلی تک نہیں اٹھائی گئی۔ وہ یہاں نہایت امن و سکون اور مرفہ الحالی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی ذہنیتوں کے فرق کو سمجھنے کے لئے ہم اس مقام پر دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ہندوؤں کی فوجوں نے شکر گڑھ کے علاقہ میں جو قیامت ڈھائی تھی اس کی ایک خبر روزنامہ امروز کی اشاعت بابت ۲۰ ستمبر ۱۹۷۲ء میں ان الفاظ میں شائع ہوئی تھی۔

> زرعی یونیورسٹی کے تھرڈ ایئر کے ایک طالب علم اعجاز احمد نے نمائندہ امروز کو نوجوان لڑکیوں کے ساتھ بھارتیوں کی زیادتی کی داستان سناتے ہوئے کہا کہ ہمیں ۱۲ دسمبر کو صبح ۹ بجے موضع بھاگڑہ سے ہندوستانی فوج پکڑ کر نزدیک ہی نینے کوٹ تھانے میں لے گئی وہاں سے ہمیں گورداسپور جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ ہمارے ساتھ موضع بھگواڑی، بہائی پورشانے اور دولے چک کی تقریباً سو نوجوان لڑکیاں بھی تھیں۔ ان لڑکیوں کو گورداسپور جیل میں ہمارے ساتھ والے چھوٹے سے بلاک میں رکھا گیا تھا۔ آدھی رات کے وقت اچانک زور زور سے رونے اور دل ہلا دینے والی چیخیں سنائی دیں۔ بعض لڑکیاں کہہ رہی تھیں کہ خدا کے واسطے ہمیں چھوڑ دو۔ ہمیں کچھ نہ کہو۔ ہم سمجھ گئے کہ ان لڑکیوں سے زیادتی کی جا رہی ہے۔ ان کی آبرو پر حملہ ہو رہا ہے لیکن ہم بےبس تھے۔ رات بےچینی میں گزری۔ صبح اٹھتے ہی جب ہم نے اس چیخ و پکار کے بارے میں جیل کے ملازمین سے دریافت کیا۔ تو انہوں نے کہا کہ "بعض لڑکیاں پاگل ہیں اور وہ بلاوجہ چیخیں مار رہی تھیں۔"

اعجاز نے کہا کہ مجھے یقین نہیں آیا اور حقیقت جاننے کے لئے جستجو کرتا رہا۔ ایک تیرہ سالہ لڑکی پر نظر پڑی تو اس کی جو حالت دیکھی وہ میں بتا نہیں سکتا۔ اس رات کے بعد ان لڑکیوں کو نہ جانے جیل حکام کہاں لے گئے۔ (بحوالہ طلوع اسلام بابت اکتوبر ۱۹۷۱ء)

اس کے برعکس ۱۹۶۵ء کی جنگ کے سلسلہ میں بھارت کے (اس زمانے کے) وزیر دفاع مسٹر چوان نے وہاں کی پارلیمان میں علی الاعلان کہا تھا کہ اس سترہ روزہ جنگ میں کوئی ایک واقعہ بھی ہمارے نوٹس میں نہیں آیا جس میں پاکستانی فوج کے کسی فرد نے ہماری کسی عورت کو میلی نگاہوں سے دیکھا ہو۔ (بحوالہ طلوع اسلام۔ بابت اکتوبر ۱۹۷۱ء۔ صفحہ ۳۱)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ بھارت میں مسلم کش حوادث کی اصل و بنیاد کے سمجھنے کے لئے ضروری ہوگا کہ اس قوم کے مذہب، تاریخ اور روایات پر گہری نگاہ ہو۔ فطرت نے پرویز صاحب کو اسی قسم کی نگاہ عطا کی ہے اس لئے وہ اس موضوع پر اکثر لکھتے رہے ہیں۔ اب جبکہ اس سلسلہ میں ملک گیر تقاضے موصول ہوئے ہیں، انہوں نے اپنی ان نگارشات کو ایک جامع خطاب کی شکل میں قلمبند کر دیا ہے جسے پیش خدمت قارئین کیا جاتا ہے۔

پرویز صاحب کا خطاب

ہماری نئی نسل، جو یا تو تقسیم ہند کے وقت جھولوں میں تھی، اور یا اس کی پیدائش تشکیل پاکستان کے بعد ہوئی، اس اعتبار سے تو ایک گونہ خوش قسمت ہے کہ اسے ہندو کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں پڑا، لیکن یہی چیز قوم کے حق میں بڑی مضرت رساں ہے کہ اس نژادِ نو کو معلوم ہی نہیں کہ ہندو کیا ہے؟ اس باب میں ہمارے ارباب حل و عقد اور اعیانِ دانش و بینش نے بھی جو مجرمانہ تغافل برتا، فطرت اسے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ انہوں نے نہ تو ان نوجوانوں کی تعلیم کا کوئی ایسا انتظام کیا جس سے وہ اس حقیقت کو سمجھ لیتے کہ ایک الگ مملکت کا وجود کس طرح ہمارے دین کا بنیادی تقاضا اور بہ حیثیت قوم ہمارے زندہ رہنے کا واحد ذریعہ تھا —— یعنی اپنی آزاد مملکت کے بغیر ہم اس قابل ہی نہیں ہو سکتے تھے کہ اسلام کے مطابق زندگی بسر کر سکیں —— یا بہ حیثیت مسلم قوم باقی رہ سکیں۔ اور نہ ہی کوئی ایسی تاریخ مرتب کی گئی جس سے انہیں کم از کم اتنا ہی معلوم ہو جاتا کہ ہندو کیا ہے اور کوئی شریف انسان اس کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی تاریخ مرتب کرنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم اپنے نوجوانوں کے دل میں ہندو کی طرف سے خواہ مخواہ جذبۂ نفرت ابھارنا چاہتے ہیں۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ ہندو، ان کے سامنے بے نقاب ہو کر آ جائے تاکہ یہ اُسے، اپنے جیسا انسان سمجھ کر، اس کے دامِ فریب میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ غالب نے ایک جگہ کہا ہے کہ ؎

فغانِ من دلِ خلق آب کرد، ورنہ ہنوز
نہ گفتہ ام کہ مرا کار با فلاں افتاد

یعنی فقط میری حالت دیکھ کر خلقت کے دل سینوں میں پگھل گئے۔ جب انہیں معلوم ہوگا کہ میرا پالا کس سے پڑا ہے تو نہ معلوم ان پہ کیا گزرے ؟

ہماری دشواری یہ ہے کہ ہماری نئی نسل کو ہندو کے ساتھ کبھی پالا نہیں پڑا —— اور خدا کرے کہ ایسا کبھی

نہ ہو۔۔۔۔۔۔ اور نہ ہی ہم نے، جنہیں ان کے ساتھ مدتوں پالا پڑتا رہا۔ انہیں یہ بتانے کی زحمت گوارا کی ہے کہ ہندو کیا ہے؟ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ہم ہندوستان میں اچھے بھلے بستے رہتے تھے، ان سے الگ ہو کر ہم نے خواہ مخواہ ایک مستقل خطرہ کیوں مول لے لیا؟ اس کی ضرورت کیا تھی؟ وہ ایسا سمجھنے اور کہنے میں کسی حد تک حق بجانب ہیں۔ حیوانات کے لئے آسانی یہ ہے کہ وہاں ہر نوع

انسان فریب میں آسکتا ہے

کی شکل و صورت جداگانہ ہوتی ہے جس سے انہیں ایک دوسرے کی پہچان میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ کسی بکری کو اس میں مغالطہ نہیں لگ سکتا کہ جو جانور سامنے سے آرہا ہے وہ درندہ ببر ہے یا بے ضرر ہرن۔ لیکن انسانوں کے معاملہ میں صورت یہ نہیں۔ یہاں انسانی پیکر سب ایک جیسے ہوتے ہیں' اس لئے اس باب میں تمیز کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ جو دوسرا انسان کھڑا ہے وہ رہزن ہے یا راہ نما۔ ہندوؤں کی شکل و صورت چونکہ انسانوں ہی جیسی ہے اس لئے ہمارے نوجوان انہیں انسان ہی سمجھتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ جنہیں وہ (محض پیکروں کے دھوکے میں) انسان سمجھتے ہیں' وہ درحقیقت کیسے کیسے خونخوار درندے' مہیب نہنگ و اژدر یا مکار لومڑیاں ہیں۔ ان نوجوانوں کے سامنے ہندو کی ایک خفیف سی جھلک، ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران آئی تھی، لیکن ایک تو وہ حادثہ ہی برق کی چشمک یا شرار کی چمک سے زیادہ دیرپا نہیں تھا، دوسرے ہم نے ابھی تک اس کی بھی کوئی صحیح اور مکمل تصویر ان کے سامنے آویزاں نہیں کی، اس لئے وہ خفیف سی جھلک بھی ان کے آئینہ ذہن سے محو ہوتی چلی جارہی ہے۔ میں آج کی نشست میں اس "بھیرویں ماتا" اس "کالی دیوی" کے چند ایک روپ آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں ۔۔۔۔۔ چند ایک اس لئے کہ اس کی مکمل تصویر کھینچنے کے لئے کئی ایک مجلدات درکار ہوں گی ۔۔۔۔۔ سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے ۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ انہی چند ایک جھلکیوں سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارا معاملہ کس کے ساتھ پڑا ہے۔

ہندوؤں کی ساری تاریخ میں' ۔۔۔۔۔ اگر بھان متی کے اس پٹارے کو تاریخ کہا جاسکے ۔۔۔۔۔ صرف ایک سیاسی فلاسفر پیدا ہوا ہے، نام تو اس کا چانکیہ تھا، لیکن وہ اپنے آپ کو نہایت فخر سے کوٹلیا کہتا تھا۔ اور ہندو

ہندو اصولِ سیاست

بھی اسے اسی لقب سے پکارتے ہیں۔ کوٹلیا کے معنی ہیں مکار اور فریب کار۔ اس لقب سے ہی آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہ ذاتِ شریف تھے کیا؟ اس نے اصولِ سیاست پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے ارتھ شاستر۔ یہ کتاب سنسکرت میں تھی لیکن اب اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ اس میں سیاست کے جو چند اصول بطور ضابطہ ہدایت دیئے گئے ہیں' وہ قابلِ غور ہیں۔ انہیں توجہ سے سنیئے:۔

پہلا اصول ۔۔۔۔۔ حصولِ اقتدار اور ملک گیری کی ہوس کبھی ٹھنڈی نہ ہونے پائے۔

دوسرا اصول ۔۔۔۔۔ ہمسایہ سلطنتوں سے وہی سلوک روا رکھا جائے جو دشمنوں سے رکھا جاتا ہے۔ تمام ہمسایوں پہ ہمیشہ کڑی نگرانی رکھی جائے۔

تیسرا اصول ـــــ غیر ہمسایہ سلطنتوں سے دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔
چوتھا اصول ـــــ جن سے دوستی رکھی جائے، ان سے دوستی میں ہمیشہ اپنی غرض پیشِ نظر رہے اور مکارانہ سیاست کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔
پانچواں اصول ـــــ دل میں ہمیشہ رقابت کی آگ مشتعل رکھی جائے۔ سرحانہ سے جنگ کی چنگاریاں سلگتی جاتی رہیں۔ جنگ میں انتہائی تشدد سے کام لیا جائے حتیٰ کہ خود اپنے شہریوں کے مصائب و آلام کی بھی پرواہ نہ کی جائے۔
چھٹا اصول ـــــ دوسرے ملکوں میں مخالفانہ پراپیگنڈہ، تخریبی کارروائیاں، ذہنی انتشار پیدا کرنے کی مہم جاری رکھی جائے۔ وہاں اپنے آدمی ناجائز طریقہ سے داخل کر کے، ففتھ کالم بنایا جائے۔ اور یہ سب کچھ مسلسل اور متواتر کیا جائے۔
ساتواں اصول ـــــ رشوت اور دیگر اسی قسم کے ذرائع سے اقتصادی جنگ جاری رکھی جائے۔ اور دوسرے ملکوں کے غداروں کو خریدنے کی کوشش کی جائے۔
آٹھواں اصول ـــــ امن کے قیام کا خیال تک بھی دل میں نہ لایا جائے خواہ ساری دُنیا تمہیں اس پر مجبور کیوں نہ کرے۔

یہ ہیں، مختصر الفاظ میں سیاست کے وہ اصول جو ان کے ایک مہاتما نے انہیں دیئے۔ یہ مہاتما، ان کے ست جگ کے زمانے کی پیداوار ہے ـــــ یعنی وہ زمانہ جس میں (ان کے عقیدہ کے مطابق، بھارت میں) سچائی کا دور دورہ تھا۔ اس کے بعد کل جگ میں ایک اور مہاتما پیدا ہوئے۔ جنہیں گاندھی جی کہا جاتا ہے۔ انہیں سچائی کا مجسمہ اور اہنسا (عدم تشدد) کا اوتار کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ان مہاتما جی کی کیفیت کیا تھی، اس کے متعلق قائد اعظمؒ

گاندھی جی

کی زبان سے سنئے جنہیں ان کے ساتھ رات دن واسطہ پڑتا تھا۔ قائد اعظمؒ نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن (جالندھر) کے اجلاس (منعقدہ نومبر ۱۹۴۲ء) میں پبلک پلیٹ فارم پر سے کہا تھا کہ

> (مشکل یہ ہے کہ) گاندھی جی کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں اور جوان کا درحقیقت مقصد ہوتا ہے اسے کبھی زبان پر نہیں لاتے۔ (تقاریر قائد اعظمؒ۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۴۸۹)

اسی طرح انہوں نے ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو بمبئی کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

> ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ جب ان کے (یعنی مہاتما گاندھی کے) مفید مطلب ہوتا ہے وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے نمائندہ نہیں، وہ محض انفرادی حیثیت سے گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ کانگریس کے چار آنہ کے ممبر بھی نہیں۔ اور جب ضرورت ہوتی ہے تو سارے ہندوستان کے واحد نمائندہ بن جاتے ہیں۔ جب اور حربوں سے کام نہیں چلتا تو مرن برت رکھ لیتے ہیں جب کوئی دلیل بن نہیں پڑتی تو "اندرونی آواز" کو بلا لیتے ہیں۔ کہئے کہ ایسے شخص سے ہم کس طرح بات کر سکتے ہیں۔ وہ تو ایک چیستان ہیں، معمہ ہیں۔ (تقاریر قائد اعظم۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۸۲)

ان کی "مہاآتمیت" کا یہ عالم تھا کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران، جب انگلستان پر دن رات بمباری ہو رہی تھی اور جاپانی کلکتہ تک بڑھ آئے تھے، وہ وائسرائے کے ہاں گئے اور کہا کہ جب میں لندن پر بمباری کی خبریں پڑھتا

ہوں اور وہاں کے جوانوں، بوڑھوں، بچوں، عورتوں پہ جو کچھ گذرتی ہے، اسے سُنتا ہوں تو میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ ایسے نازک حالات میں، میں انگریزوں کے لئے ہندوستان میں کسی پریشانی کا موجب نہیں بننا چاہتا۔ میں تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر، جنگ کے سلسلہ میں بلا مشروط تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔ یہ کہتے کہتے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ وائسرائے بہت متاثر ہوئے اور ان کی ہمدردی اور تعاون کا شکریہ ادا کیا۔

مہاتما جی نے اُدھر یہ کیا اور ادھر کانگریس کی مجلسِ عاملہ سے ریزولیوشن پاس کرادیا کہ اگر حکومت، ملک کے اختیارات، کانگریس کی طرف منتقل کرنے کا وعدہ نہیں کرتی تو ہم ملک کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے، یہاں کے نظم ونسق کو تہ و بالا کر کے رکھ دیں گے، انگریزوں کو یہاں سے نکال باہر کریں گے ـــ اور جب وائسرائے نے گاندھی جی سے پوچھا کہ یہ کیا؟ تو انہوں نے نہایت معصومیت سے فرمایا کہ میرا کانگریس پر کیا اختیار ہے۔ میں تو اس کا چار آنے کا ممبر بھی نہیں۔

اہمسا کا اوتار

مہاتما گاندھی اپنے آپ کو اہمسا کا اوتار کہا کرتے تھے۔ اہمسا کے معنی یہ ہیں کہ خواہ کچھ بھی ہو، کسی کے خلاف تشدد کا استعمال نہ کیا جائے۔ انجیل کی ـــ ایک گال پر طمانچہ کھاکر، دوسرا گال سامنے کردینے کی ـــ تعلیم پر عمل کیا جائے۔ لیکن انہی مہاتما جی کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۳۹ء کے اواخر کی بات ہے، سندھ میں مسجد منزل گاہ کے سلسلہ میں ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں پر بے حد مظالم ہوئے۔ ہندوؤں نے یہ سب کچھ بھی کیا اور کوٹلیا کے اصولِ سیاست کے مطابق، مہاتما جی کو تار دے دیا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں ہمارا کچھ بھی محفوظ نہیں۔ مہاتما جی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ نہ کسی تحقیق کی ضرورت سمجھی نہ تفتیش کی اور اپنے اخبار میں لکھ مارا کہ

> اہمسا ایک دن میں نہیں سیکھا جاتا۔ دوسرا طریق وہ ہے جسے ساری دنیا برتتی چلی آرہی ہے یعنی جان و مال کی حفاظت ہتھیاروں کے ذریعے کی جائے۔ سندھیوں کو چاہیئے کہ لٹیروں اور حملہ آوروں سے اپنی حفاظت کا ڈھنگ سیکھیں۔ (ہریجن۔ بابت ۱۲/۱۲/۳۹)

یہی مہاتما جی ہیں جنہوں نے جنگ کے دوران انگریزوں سے کہا تھا کہ ہٹلر کا مقابلہ ہتھیاروں سے نہ کرو۔ اہمسا کے ذریعہ کرو۔ اور سرحدی گاندھی عبدالغفار خاں کو اپدیش دیا تھا کہ پٹھانوں سے چاقو چھین لو تاکہ اہمسا میں ذرا سی بھی ہنسا کی لاگ نہ رہے۔ اور دوسری طرف کلکتہ کی ہندو عورتوں سے تاکیداً کہا جاتا تھا کہ اپنے پاس پستول اور بندوق رکھیں اور فائر کرنا سیکھیں۔ گاندھی جی بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ

> میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں ویدوں، اُپ نشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں۔ اوتاروں کا قائل ہوں اور تناسخ کے عقیدہ پر یقین رکھتا ہوں۔ میں گاؤ رکھشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور بُت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔ میرے جسم کا رواں رواں ہندو ہے۔ (ینگ انڈیا۔ ۱۲/۱۰/۲۱)

جو گاؤ رکھشا ان کے دھرم کا جزو تھی، اس کے متعلق انہوں نے ۱۹۱۸ء میں کہا تھا کہ

> یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ یوروپین کے لئے گاؤکشی جاری رکھنے کی بابت ہندو کچھ بھی محسوس نہیں کرتے۔ میں جانتا ہوں کہ ان کا غصّہ اس خوف کے نیچے دب رہا ہے جو انگریزی عملداری نے پیدا کر دیا ہے۔ مگر ایک ہندو بھی، ہندوستان کے طول و عرض میں ایسا نہیں جو ایک دن اپنی سرزمین کو گاؤکشی سے آزاد کرانے کی اُمید نہ رکھتا ہو۔ ہندو مت، عیسائی یا مسلمان کو تلوار کے زور سے بھی مجبور کرنے سے تامل نہیں کرے گا کہ وہ گاؤکشی کو بند کر دیں۔ (الفضل۔ 9/3/18۔ بحوالہ اسٹیٹسمین)

یہ تھی سچائی کے اوتار اور اہنسا کے دیوتا گاندھی جی کی کیفیت۔ گاندھی جی کیا تھے، اس کے متعلق قائدِ اعظمؒ نے ایک فقرہ میں وہ سب کچھ کہہ دیا تھا جس کے لئے کتابوں کی کتابیں بھی کافی نہیں ہو سکتیں۔ بات یوں ہوئی کہ ایک دن گاندھی جی شوگرام آشرم میں، اپنی کٹیا میں بیٹھے پرارتھنا میں محو تھے کہ ایک کونے سے ایک سانپ اندر گھس آیا۔ مہاتما جی خاموشی سے پرارتھنا میں مصروف رہے۔ اس نے کٹیا کا چکر کاٹا اور آہستہ سے باہر چلا گیا۔ ہندو اخبارات نے اسے مہاتما جی کی کرامت قرار دے کر بہت اچھالا۔ صبح کو یہ خبریں اخبارات میں شائع ہوئیں تو ایک اخبار کا رپورٹر قائدِ اعظمؒ کے پاس گیا اور اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد، ان سے پوچھا کہ آپ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے سر ہلایا اور نہایت سنجیدگی سے کہا:۔

YES; PROFESSIONAL ETIQUETTE

یہ وہ ریمارکس ہیں جن کا بس لطف لیا جا سکتا ہے۔ سمجھایا نہیں جا سکتا۔

ہندو مت کا ضابطۂ اخلاق

جس قوم کے "مہاتما" ایسے ہوں، اس کے عام افراد جس سیرت و کردار کے مالک ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مسٹر سری پرکاش پاکستان میں، بھارت کے پہلے ہائی کمشنر تھے۔ انہوں نے ۱۲/ نومبر ۱۹۴۷ء کی شام تھیا سوفیکل ہال کراچی میں ایک تقریر کی تھی جس کا عنوان تھا "ہندو مت ایک ضابطۂ اخلاق کی حیثیت سے"۔ اس تقریر میں انہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہندو مت کوئی مستقل اخلاقی ضابطہ متعین کرتا ہے جس پر سوسائٹی کی بنیاد رکھی جا سکے، وہ ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ ہندو مت، انسانی زندگی کے لئے کوئی غیر متبدل اصول و اقدار پیش نہیں کرتا بلکہ وہ ہر موقعہ اور ہر مقام کے لحاظ سے، مختلف اصول وضع کرتا ہے جو ایک دوسرے سے یکسر متضاد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً وہ سوسائٹی کے ایک طبقہ (براہمنوں) کو اہنسا (عدم تشدد) کی تعلیم دیتا ہے تو دوسرے طبقہ (کھشتریوں) کو قتل و خون ریزی سکھاتا ہے۔ وہ پنڈتوں سے کہتا ہے کہ سچ بولو۔ لیکن ویشیں (تجارت پیشہ لوگوں) کو کبھی اس کا پابند نہیں ٹھہراتا کیونکہ وہ کہتا ہے کہ سچ بولنے سے تجارت میں نقصان ہوتا ہے، اس لئے وہ انہیں جھوٹ بولنے کی اجازت دیتا ہے۔ مختصراً یہ کہ وہ ایک قسم کے حالات میں سچ اور دیانت کی تاکید کرتا ہے تو دوسری قسم کے حالات میں جھوٹ اور فریب کو جائز قرار دیتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ

> کسی کو یہ بات اچھی لگے یا نہ لگے، لیکن یہ حقیقت ہے جس کا کھلے بندوں اعتراف کرنا چاہیئے کہ ہندو مت

میں کوئی اصولِ زندگی قطعی (ABSOLUTE) نہیں۔ ہر مصلحت کے لئے اس کا الگ اصول ہے۔ ہندومت ایک عملی مذہب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر موقع پہ دیانت اور سچائی سے کام نہیں چل سکتا، اس لئے وہ کبھی ایسی تعلیم نہیں دیتا جو ناممکن العمل ہو۔ یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر ہندومت ہزارہا سال سے، مختلف حالات اور متبائن ماحول میں زندہ رہا ہے اور زندہ رہے گا۔

(طلوعِ اسلام۔ بابت دسمبر ۱۹۴۸ء)

لال بہادر شاستری

یہی ہے وہ ہندو دھرم جس کے سب سے بڑے عالم اور ہندوستان کے (اس زمانے کے) وزیرِاعظم، مسٹر لال بہادر شاستری نے، جنوری ۱۹۶۵ء میں بنارس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

ملک میں لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے۔ لیکن غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا یہ رویہ ہماری روایات کے مطابق ہوگا؟ ہمارے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک تو یہی راستہ ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے اور دوسرا راستہ امن و خوشحالی کا ہے جو قوم کے باپو، مہاتما گاندھی نے ہمیں سکھایا ہے۔ امن اور عدمِ تشدد کا جو راستہ ہمیں گاندھی جی نے سکھایا ہے وہ نہ صرف فطری طور پر مناسب ہے بلکہ عملی نقطۂ نگاہ سے بھی مفید ہے۔ جب ہم پوری دنیا میں امن و صلح کی تبلیغ کرتے ہیں تو ہم کس طرح دوسرا راستہ اختیار کر سکتے ہیں؟

(اخبار مدینہ۔ بجنور بکیم جنوری ۱۹۶۵ء بحوالہ طلوعِ اسلام۔ فروری ۱۹۶۵ء)

یہ کچھ انہوں نے پبلک پلیٹ فارم سے، جنوری میں کہا، اور اسی سال ستمبر میں، چوروں کی طرح، اکیس ڈویژن فوج، پاکستان کے سر پہ لاکھڑی کر دی۔ سچ ہے۔ اس قسم کے "باپو" کے اسی قسم کے سپوت ہونے چاہئیں!! یہی تھے وہ بہادر شاستری جی، جن کی حکومت سے خود ہندوستان کے صحافی، تنگ آکر چیخ اٹھے تھے کہ

شاستری حکومت ایک سانپ ہے جس کے سینکڑوں منہ ہیں اور ہر منہ میں زبان الگ الگ بولی جاتی ہے اور ہم فانی انسان اس کا فیصلہ ہی نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کس کی بات سرکاری اعلان ہے اور کس کی نہیں۔ حساس طبائع نے اندازہ لگایا ہوگا کہ حکومت کا سربراہ —— مسٹر شاستری —— خود اس کا ایک منجھا ہوا فنکار ہے۔

(نیوایج۔ بحوالہ ہندوستان ٹائمز ۵/۱ طلوعِ اسلام ستمبر ۱۹۶۶ء)

یہ ہے ہندو دھرم۔ اور یہ ہیں اس دھرم کے پجاری —— کوٹلیا سیاست کا امام مہاتما گاندھی، ستیا کے اوتار اور شاستری (آنجہانی) اس باپو کے نامور سپوت!

یہ ہے ہندو دیوتا کے مجسمہ کا ایک روپ۔ اب آگے بڑھئے!

؎ شاستری، بہت بڑے عالم کو کہتے ہیں۔ یعنی جو شاستروں کا علم رکھتا ہو۔

مذہب کے متعلق

مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اس دعویٰ پر تھی کہ اسلام کی رُو سے، ہندوستان میں بسنے والے مسلمان، اپنے دین کی بناء پر ایک الگ قوم ہیں اور وہ اپنے دین کے مطابق اسی صورت میں زندگی بسر کر سکتے ہیں جب ان کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں وہ قوانینِ خداوندی نافذ کر سکیں۔ یہ دعویٰ مسلمانوں کا تھا جس کا تعلق مسلمانوں کے "مذہب" سے تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں کسی غیر مسلم کو دخل دینے کا حق ہی نہیں پہنچتا تھا۔ لیکن دیکھئے کہ ہندوؤں کا اس باب میں رویہ کیا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے آل انڈیا نیشنل کانگریس منعقدہ مارچ ۱۹۳۶ء کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا:۔

> ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دُنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔
>
> (طلوعِ اسلام۔ بابت جون ۱۹۳۸ء)

یہ تو رہا، دو قومی نظریہ کے متعلق۔ خود مذہب کے سلسلہ میں انہوں نے اپنی کتاب "میری کہانی" میں لکھا:۔

> جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں، اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے تک کی آرزو کی ہے۔ قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ اٹھانے کا، قائم شدہ حقوق اور مستقل حقوق کی بقاء کا حمایتی ہے۔ (بحوالہ طلوعِ اسلام۔ جون ۱۹۳۸ء)

آپ کہیں گے کہ پنڈت جواہر لال نہرو دہریہ تھے اس لئے مذہب کے متعلق ان کا یہ طرزِ عمل حق بجانب تھا۔ وہ سیکولر نظام کے حامی تھے، اس لئے ان کی اس مخالفت میں، اسلام کی خصوصیت نہیں، وہ تمام مذاہب کے مخالف تھے۔ لیکن اوّل تو آپ نے اس اقتباس میں "منظم مذہب" کی تخصیص پر غور نہیں فرمایا۔ منظم مذہب ـــــ یعنی وہ مذہب جو مذہب کی بنیاد پر ایک جداگانہ تنظیم کا حامی ہے (جسے قوم کہا جاتا ہے) ہندو مت نہیں، اسلام ہے۔ دوسرے یہ کہ پنڈت جواہر لال ہندو مت کو سرے سے مذہب ہی قرار نہیں دیتے تھے۔ وہ اپنی کتاب "میری کہانی" میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

> ہندو مت کے دائرے میں بے حد مختلف اور متضاد خیالات و رسوم داخل ہیں۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندو مت پر صحیح معنوں میں، مذہب کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ ممکن ہے ایک شخص کھلم کھلا خدا کا منکر ہو (جیسے قدیم فلسفی چارو ک) لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں، ہندو مت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں برہمن پیدا ہوا تھا اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں، چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور اعمال کچھ ہی ہوں۔

اب ظاہر ہے کہ جب پنڈت نہرو کے نزدیک ہندو مت کوئی مذہب نہیں تھا، تو اسے مٹانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو اسلام تھا جو ان کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا اور جسے وہ مٹانا چاہتے

تھے۔ چنانچہ اس کی تصریح، نہرو کے ہم مرتبہ ایک کانگریسی لیڈر مسٹر ولبھائی ڈیسائی نے ان الفاظ میں کر دی کہ

> اب یہ ناممکن ہو گا کہ کوئی ایسا نظام قائم کیا جائے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آ چکا ہے کہ ہم اس امر کا اعتراف کر لیں اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رہنے دیا جائے۔

(ہندوستان ٹائمز ۵/۲ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ اگست ۱۹۳۸ء)

قرآنی حکومت کے خلاف

اور اگر آپ اس سے بھی واضح تر الفاظ میں سننا چاہتے ہیں تو وہ بھی سن لیجئے۔ ۱۹۴۱ء میں "اکھنڈ بھارت کانفرنس" کا اجلاس لدھیانہ میں منعقد ہوا جس کی صدارت مسٹر منشی نے کی۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ تمہیں اس کا علم ہے کہ نظریۂ پاکستان کا مفہوم کیا ہے؟ اس کا مفہوم یہ ہے کہ

> مسلمان اپنے لئے ایسے مساکن بنائیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اُردو ان کی قومی زبان بن سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایسا خطۂ ارض ہو گا جس میں اسلامی حکومت قائم ہو گی۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ

> ہندو قوم خواہ کتنی ہی بزدل اور غیر منظم کیوں نہ ہو وہ کبھی اسے برداشت نہیں کر سکتی کہ مسلمان اس قسم کی حکومت قائم کر لیں۔ اس حکومت میں ہندو قوم کے افراد شمشیر و سناں کا نشانہ بنائے جائیں گے، ان کی عورتوں کی عصمت دری اور ان کے مقدس مقامات کی بے حرمتی ہو گی۔

(بحوالہ طلوعِ اسلام۔ دسمبر ۱۹۴۱ء)

یہ خیالات تنہا مسٹر منشی کے نہیں تھے۔ یہ ترجمانی کر رہے تھے ہندوؤں کے تمام بڑے بڑے سیاسی لیڈروں کے خیالات اور جذبات کی۔ مثلاً کانگرس کے سب سے بڑے ترجمان، ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۴/نومبر ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں لکھا تھا:-

> حکومت الٰہیہ کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور مسلمانوں کا یہ فعل عبث ہو گا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں۔

یہاں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ہندو نہیں چاہتا تھا کہ مسلمان ہندوستان میں اسلامی حکومت کے احیاء کی کوشش کریں۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ جب تقسیمِ ہند کا فیصلہ ہو گیا اور پاکستان کی مملکت وجود میں آ گئی تو اس وقت بھی

اسلامی حکومت کے خلاف

ہندوؤں کی پکار یہ تھی کہ مسلمانوں نے اپنی الگ مملکت قائم کر لی تو خیر، لیکن ہم (یعنی ہندو) اسے برداشت نہیں کر سکیں گے کہ وہ وہاں اسلامی حکومت قائم کر لیں۔ قائدِ اعظمؒ کی وفات کے بعد، ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۹/اکتوبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت کے اداریہ میں لکھا تھا:-

> پاکستان، بالخصوص مشرقی بنگال کی اقلیتوں کو اتنا خوف و ہراس اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا جتنا اس

حقیقت سے کہ پاکستان کے راہنماؤں نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اصول و روایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد اس نے اسی مقالۂ افتتاحیہ میں) کہا کہ

اگر کشمیر کا مسئلہ پُرامن طریق سے طے ہو جائے اور پاکستان اسلامی سٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔

اکتوبر ۱۹۴۸ء میں محترم لیاقت علی خاں (مرحوم) نے لندن میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

پاکستان ایک اسلامی سٹیٹ ہے اور ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ ان اصولوں پہ قائم کی جائے گی جو ہمیں اسلام نے سکھائے ہیں۔ (ہندوستان ٹائمز۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۸ء)

اس پر اسی اخبار نے اپنی ۲۸ اکتوبر کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا کہ

تقسیم ہند کے وقت سے ہندوستان کے نیتاؤں نے اِس امر کا اعلان کر رکھا ہے کہ ہندوستان میں سیکولر حکومت ہوگی لیکن سرحد کے اس پار کے لیڈر پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ پاکستان اسلامی سٹیٹ ہوگا...... چنانچہ ابھی پچھلے دنوں مسٹر لیاقت علی خان نے کہا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی سٹیٹ ہے۔

لیکن تماشہ یہ ہے کہ ایک طرف مسلمانوں کے متعلق تو یہ کچھ کہا جا رہا تھا اور دوسری طرف ہندوؤں سے یہ کہا جاتا تھا کہ

ہندوستان کو نظریہ اور عمل دونوں لحاظ سے ایک ہندو سٹیٹ ہونا چاہیئے جس کا کلچر ہندو جس کا مذہب ہندو ہو اور جس کی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو (طلوعِ اسلام۔ دسمبر ۱۹۴۸ء)

یہ الفاظ ڈاکٹر رادھا مکرجی کے تھے جو ہندو مہا سبھا کے نائب صدر اور بنگال میں کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے۔ یہ الفاظ انہوں نے آل انڈیا ہندو ویدک یوتھ کانفرنس (لاہور) کے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمائے تھے۔

اور مسٹر ساورکر نے یہ کہہ کر سارا ٹنٹا ہی ختم کر دیا تھا کہ

لفظ ہندو سے عبارت ہے ہر وہ شے جو ہندوستان کی ہو۔ مثلاً کلچر، نسل اور روایات وغیرہ۔ اور ہندو کے معنی ہیں ہر وہ شخص جو ہندوستان کا رہنے والا ہو۔

(سٹیٹسمین ۲ فروری ۱۹۳۹ء۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ اپریل ۱۹۳۹ء)

آپ غالباً متعجب ہوں گے کہ اس باب میں گاندھی جی کا "ذکرِ خیر" آیا ہی نہیں۔ کیا وہ خاموش بیٹھے تھے! جی نہیں۔ گاندھی جی ایسے اہم معاملہ میں خاموش کیسے رہ سکتے تھے۔ لیکن ان کا بات کرنے کا انداز اپنا تھا۔ سنیئے کہ اس باب میں وہ کیا کرتے اور کیا کہتے تھے۔

مسٹر گاندھی کا اپدیش

مسٹر گاندھی نے ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء کو قائداعظم کے نام ایک خط میں لکھا تھا جس میں کہا تھا:-

میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو' وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کرے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان' اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہیئے۔ خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

پھر انہوں نے اپنے اخبار "ہریجن" کی ۹ فروری ۱۹۴۶ء کی اشاعت میں لکھا :-

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو بالکل الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم' میں اس کے لئے اپنی جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ' مذہب' ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔

آپ کہیں گے کہ مسٹر گاندھی سیکولر نظامِ حکومت کے قائل تھے' اور سیکولر نظامِ حکومت کے قائل کو مذہب کے متعلق یہی عقیدہ رکھنا چاہیئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مسٹر گاندھی واقعی سیکولر نظامِ حکومت کے قائل تھے؟ اس کا جواب ہم سے نہیں' اس خط کے الفاظ سے لیجئے جو قائد اعظمؒ نے مسٹر گاندھی کو یکم جنوری ۱۹۴۰ء کو لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے (مسٹر گاندھی سے) کہا تھا :-

آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کے تعین میں مذہب کو کوئی دخل ہونا چاہیئے۔ لیکن جب خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ آپ کا زندگی میں مقصد کیا ہے۔ آپ کے نزدیک وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جو ہمیں کسی کام کے کرنے پر آمادہ کرتا ہے ——— کیا وہ جذبہ' وہ مقصد' مذہبی ہے یا معاشرتی' یا سیاسی ——— تو آپ نے کہا تھا کہ "خالص مذہبی"۔

یعنی اپنی سیاسی جدوجہد کا جذبۂ محرکہ خالص مذہبی' اور دوسروں کو تلقین کہ وہ مذہب کو سیاست میں دخیل کار نہ ہونے دیں۔ یہی تھی مسٹر گاندھی کی وہ دورخی پالیسی جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

نگہ دارد برہمن کارِ خود را	نمی گوید بکس اسرارِ خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر	بدوشِ خود برد زنّارِ خود را

اور مسلمانوں کا یہ طعن کسی مفروضہ پر مبنی نہیں تھا' ایک حقیقت تھا۔ مسٹر گاندھی اِدھر ان سے یہ کہہ رہے تھے کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھو۔ اور اُدھر' ہندوستان میں وہ جس قسم کی سیاست رائج کرنا چاہتے تھے' اس کے متعلق' کانگریس کے جنرل سیکرٹری' اچاریہ کرپلانی نے' اگست ۱۹۳۹ء میں' اپنے ایک طویل بیان میں کہا تھا کہ

ہندوستان کی حکومت

گاندھی جی نے کانگریس کو بتایا کہ ہمارا کام صرف یہ نہیں کہ ملک کی سیاسی باگ ڈور انگریز کے ہاتھ سے چھین کر اہلِ ملک کے ہاتھ میں دے دیں۔ بلکہ سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اپنی تمام جدوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ حیات پر رکھیں جس کے دائرہ میں ہماری معاشرت' اخلاق اور روحانیت

ہندو مذہب کیا ہے' اس کے متعلق کسی دوسری نشست میں عرض کیا جائے گا۔

سب کچھ داخل ہو۔ بالفاظِ دیگر، ہماری تحریک کو صرف سیاسی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسے روحانی اور اعلیٰ فلسفۂ زندگی کے ماتحت ہونا چاہیئے تاکہ اس جد وجہد سے نہ صرف ہماری سیاسی زندگی متاثر ہو، بلکہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ اس سے اثر پذیر ہو اور ہماری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو جسے ہم تاریخ کا نیا دَور کہہ سکیں۔ زندگی کا یہی نیا باب اور نیا دَور ہے جسے گاندھی جی کانگریس کے ذریعے ہندوستان میں لانا چاہتے ہیں۔

مسٹر گاندھی کو سب سے بڑا ڈر یہ کھائے جا رہا تھا کہ مسلمان بچوں کے دل میں یہ عقیدہ راسخ ہوتا ہے کہ اسلام، باقی

واردھا اسکیم

مذاہب کے مقابلہ میں، افضل ہے۔ ان کی سکیم یہ تھی کہ مسلمان بچوں کے دل سے اس خیال کو نکال دیا جائے تاکہ ان کے ذہن سے اپنے مذہب کی عظمت و اہمیت کا احساس مٹ جائے۔ اس کے لئے انہوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین خان (مرحوم) کے مشورہ اور تعاون سے ہندوستانی بچوں کے لئے ایک مشترک تعلیم کی سکیم مرتب کی (جو واردھا کی تعلیمی سکیم کے نام سے مشہور ہوئی) اس سکیم کا مقصد کیا تھا، اس کا اندازہ مسٹر گاندھی کے اس وضاحتی بیان سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے اس سلسلہ میں اخبارات کو دیا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا:-

> مختلف طبقات و مذاہب کے بچوں میں، رواداری اور دوستی کی جو روح پیدا ہو رہی ہے، اس کے پیشِ نظر میں اس بات کو سخت مہلک اور خطرناک سمجھتا ہوں کہ ان کو یہ سکھایا جائے کہ ان کا مذہب دیگر تمام مذاہب پر برتری رکھتا ہے یا جس مذہب کے وہ قائل ہیں بس وہی مذہب سچا ہے۔
>
> (ہندوستان ٹائمز ۲۸ء؍۱۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ اگست ۱۹۳۸ء)

[طلوعِ اسلام نے اُسی زمانے میں اس انتہائی شر انگیز تعلیمی سکیم کے خلاف کس قدر ملک گیر مہم چلائی اور کس طرح اسے، اور اس کے تحت مرتب کردہ نصاب کی کتابوں کو غرقِ سمندر کرا دیا، یہ ایک الگ داستان ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں]

لیکن جب، اور ان کے چیلوں چانٹوں کی ان تمام سازشوں اور روباہ بازیوں کے باوجود، تحریک

مطالبہ پاکستان کی مخالفت

پاکستان آگے بڑھتی گئی، حتیٰ کہ مارچ ۱۹۴۰ء میں حصولِ پاکستان کا ریزولیوشن پاس ہو گیا تو مسٹر گاندھی کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ کھل کر سامنے آ گئے۔ انہوں نے، ۷ اپریل ۱۹۴۰ء کو اپنے ایک بیان میں کہا:-

> میں پوری جرأت و جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناح اور ان کے ہم خیال حضرات اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سر انجام نہیں دے رہے بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظ "اسلام" کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے یہ کچھ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آج کل مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میرے دل پر سخت ٹھیس لگ رہی ہے۔ میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کروں گا اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ بافی سے متنبہ نہ کردوں جس کا اس نازک وقت میں ان میں پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔
>
> (بحوالہ طلوعِ اسلام۔ جون ۱۹۴۰ء)

پھر انہوں نے اسی سلسلۂ مضامین کی دوسری قسط میں (۱۴ اپریل ۱۹۴۰ء کو) لکھا:۔

> میری روح اس امر کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت دو مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ حیات ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مترادف ہے۔ میں اس نظریہ کے خلاف یقیناً بغاوت کر دوں گا کہ وہ لاکھوں مسلمان جو ابھی کل تک ہندو تھے، اسلام قبول کر کے اپنی قومیت بھی بدل بیٹھیں۔ (ایضاً)

پھر انہوں نے ۵ مئی ۱۹۴۰ء کو لکھا کہ

> میں ایک تنگ نظر ہندومت یا تنگ نظر اسلام کا تصور نہیں کر سکتا۔ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے اور ایک بہت بڑی قوم جو مختلف تہذیبوں پر مشتمل ہے اور یہ تہذیبیں اب ایک دوسرے میں مدغم ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ لیکن مسلم لیگ نے مسلمانوں کو یہ سبق پڑھانا شروع کر دیا ہے کہ یہ تہذیبیں ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہو سکتیں۔ (ایضاً)

آپ نے غور فرمایا۔ کہ مسلمانوں کے متعلق، ہندوستان کے ہندوؤں کے عزائم کیا تھے؟ مولانا حالیؒ نے بھارت

اکال الامم

کو "اکال الامم" کہا ہے۔ یعنی وہ کالی دیوی جو ان تمام قوموں کو نگل گئی جو زمانہ قبل از تاریخ سے لے کر مسلمانوں کی آمد تک باہر سے آئی تھیں۔ جب وہ قومیں ہندوستان میں آئی تھیں تو ان کا جداگانہ تشخص، جداگانہ قومیت، جداگانہ مذہب، جداگانہ تہذیب تھی، لیکن اس کے بعد دیکھئے کہ ان کے جداگانہ وجود کا نشان تک اس طرح مٹ گیا گویا وہ کبھی دنیا میں موجود ہی نہ تھیں۔ وہ سب ہندو بن گئیں۔ لیکن ان سب میں مسلمان سخت ہڈی کے نکلے۔ یہ ہندوؤں کی تمام چالوں کے باوجود ان میں جذب نہ ہوئے اور ان کی یہی سخت جانی تھی جو ہندو کے لئے خارِ پہلو بن رہی تھی۔ مہاتما جی اور ان کے چیلوں کی، مسلمانوں کے غم میں، یہ تمام دردناک آہیں اور جگر گداز نالے، اسی کانٹے کی کھٹک کا نتیجہ تھیں۔ پہلے انہیں یہ غم ستا رہا تھا کہ یہ ایک الگ قوم کی حیثیت سے زندہ کیوں ہیں اور اب یہ صدمہ مار رہا تھا کہ یہ شکار ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ چنانچہ ان کے بڑے بڑے مہاپُرش، اپنی جاتی کے سپوتوں سے للکار للکار کر کہہ رہے تھے کہ دیکھنا، یہ کہیں جانے نہ پائیں۔ سردار پٹیل نے مارچ ۱۹۴۲ء میں احمد آباد میں ایک تقریر کے دوران کہا:۔

> جو لوگ ایک جداگانہ قومیت کے متمنی ہیں، ان میں سے نوے فیصد وہ ہیں جو اس ملک کی مٹی کی پیداوار ہیں۔ اس لئے اگر یہ لوگ پھر اپنی اصل میں جذب نہیں کئے جا سکتے تو یہ ان لوگوں کا قصور ہے جن سے نکل کر یہ لوگ الگ ہوئے تھے۔ (طلوعِ اسلام۔ اپریل ۱۹۴۲ء)

ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کے وجود کو ختم کر دینے کے یہ خیالات اور عزائم تحریکِ پاکستان کے پیدا کردہ نہیں تھے۔ وہ زمانہ دراز سے انہی خطوط پر سوچ بھی رہے تھے اور گامزن بھی تھے۔ اس تفصیل میں جانے کے لئے تو مجھے ہندوستان کی تاریخ کے سینکڑوں صفحات سامنے لانے پڑیں گے (جو سرِدست مشکل ہے)۔ میں صرف سیواجی کے حوالے سے چند ایک واقعات پر اکتفا کروں گا۔ لیکن اس کے لئے بھی پہلے اس حقیقت کی وضاحت ضروری ہے کہ

... ہندو شاستروں کی تقسیمِ عمل کی رو سے سلطنت کی حفاظت کا ذمہ کھشتریوں کا ہوتا ہے اور (بظاہر) حکومت کے سربراہ بھی وہی ہوتے ہیں لیکن زمامِ حکومت درحقیقت برہمنوں کے ہاتھ میں رہتی ہے اور ان کے فیصلوں کے خلاف کوئی راجہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ اس لئے مسلمانوں کی سلطنت کے خلاف جتنی سازشیں ہوئیں وہ سب کی سب کسی نہ کسی شکل میں برہمنوں ہی کی پیدا کردہ تھیں ــــ آج بھی ہندوستان کی حکومت براہمنوں ہی کے ہاتھ میں ہے ــــ

سیواجی

مغلیہ سلطنت کے انحطاط پر، سب سے پہلے، اس کے خلاف مرہٹوں کو ابھارا گیا۔ سیواجی ابھی نوعمر ہی تھا کہ سمرتھ رامداس نامی براہمن نے مسلمانوں کے خلاف اس کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ اس نے (لالہ لاجپت رائے کے الفاظ میں، جنہیں انہوں نے[1] اپنی تصنیف، سیواجی کی سوانح حیات میں قلمبند کیا ہے) "سیواجی کو بار بار اسلام کے خلاف جنگ کرنے کا اُپدیش دیا۔ اس امر کی شہادت اس خط سے بھی ملتی ہے جو سیواجی نے راجہ جے سنگھ کے نام لکھا تھا۔ اس میں اس نے تحریر کیا تھا:-

> میری تلوار مسلمانوں کے خون کی پیاسی ہے۔ افسوس صد ہزار افسوس کہ یہ تلوار مجھے ایک اور ہی مہم کے لئے میان سے نکالنی پڑی۔ اسے مسلمانوں کے سر پر بجلی بن کر گرنا چاہیئے تھا جن کا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ ہی انہیں انصاف کرنا آتا ہے۔ ...... میری بادلوں جیسی گرجنے والی فوجیں مسلمانوں پر تلواروں کا وہ مینہ برسائیں گی کہ دکن کے ایک سرے سے لے کر دوسرے تک سارے مسلمان اس سیلابِ خون میں بہہ جائیں گے اور ایک مسلمان کا نشان بھی باقی نہ رہے گا۔

سیواجی اپنے مذموم ارادوں میں ناکام رہ کر دنیا سے چل بسا، تو اسی برہمن، سمرتھ رامداس نے اس کے بیٹے سنبھاجی کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا شروع کیا۔ اس نے اس سے کہا کہ

> آپس میں محبت سے رہو لیکن اپنے مسلمان دشمنوں کو ڈھونڈ کر اپنے راستے سے ہٹا دو ......
> لوگوں کے دل میں ان ملیچھوں کا مقابلہ کرنے کا خیال پیدا کرو۔ (تاریخ مہاراشٹر۔ بھائی پرمانند)

سنبھاجی کے بعد، اس کا بیٹا، ساہو برسرِ اقتدار آیا تو اسے ایک اور برہمن ــــ باجی راؤ ــــ نے مسلمانوں کے خلاف مشتعل کیا اور کہا کہ "ان ملیچھوں کو بھارت ورش کی پوِتر بھومی (مقدس سرزمین) سے نکال باہر کرنا، تمہارا دھارمک (مذہبی) فریضہ ہے"۔ اس کی تقریر کا یہ فقرہ آج تک ہندوؤں کے ہاں دہرایا جاتا ہے کہ

> کاٹو۔ درخت کو تنے سے کاٹو تو شاخیں خود بخود گر جائیں گی۔ میری بات کو مانو تو میں اٹک کی دیوار پر مرہٹوں کا جھنڈا نصب کر دوں گا۔ (تاریخ مہاراشٹر۔ بھائی پرمانند)

لیکن اس منصوبے کو احمد شاہ ابدالی نے خاک میں ملا دیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد، مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ مسلمان قعرِ مذلت میں گر گئے۔ لیکن ہندوؤں

---

[1] بحوالہ ویر کیشری شواجی، مصنفہ پنڈت نند کمار شرما۔ اور سیواجی مصنفہ لالہ لاجپت رائے۔

کے دل میں ان کے خلاف نفرت و عداوت کی جو آگ تھی وہ بجھ نہ سکی۔ یہ اس لئے کہ اس قدر انحطاط اور زوال کے باوجود، مسلمان ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے باقی تھے۔ وہ ہندو قوم کا جزو بننے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے، اب ہندو کے سامنے جنگ کا میدان نہیں تھا، سیاست کی بساط تھی۔ اور اس

تلک اور دیانند

بساطِ سیاست کے اوّلین شاطر، پھر دو برہمن تھے ــــ ایک بال گنگا دھر تلک، اور دوسرا سوامی دیانند سرسوتی (آریہ سماج کا بانی) ان کا جامع منصوبہ یہ تھا کہ مسلسل اور وسیع پیمانے پر پراپیگنڈہ کے ذریعے، ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کے خلاف، نفرت اور انتقام کی آگ بھڑکائی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کو منظم کر کے، ایک متحدہ محاذ کی شکل دے دی جائے۔ اس سازش کے جال اس قدر وسیع اور اس کے عزائم اس قدر خطرناک تھے کہ خود حکومت کو ان کی تحقیق کرنے کے لئے ایک کمیٹی بٹھانی پڑی جو اس کے صدر (مسٹر جسٹس ایس۔ اے۔ ٹی۔ رولٹ) کی نسبت سے رولٹ کمیٹی کے نام سے متعارف ہوئی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی تو اس سے عجیب و غریب کوائف کا انکشاف ہوا۔ تلک نے ہندوؤں کے دو میلے منعقد کرنے کی طرح ڈالی تھی۔ یہ تحریک بظاہر بڑی معصوم سی تھی لیکن اس میں کس قدر خطرات پوشیدہ تھے اس کا اندازہ کمیٹی کی رپورٹ سے لگایا جاسکتا ہے جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوا تھا۔

گنپتی کا میلہ

مغربی ہندوستان میں اس تحریک کے آثار ابتداء میں دو سالانہ میلوں میں رونما ہوئے جن میں ایک تو ہندو دیوتا گنپتی کے اعزاز میں منعقد ہوتا ہے اور دوسرا مرہٹہ سردار سیواجی کے اعزاز میں جس نے اہلیانِ دکن کو مسلمان حکمرانوں کے خلاف متحد کیا تھا۔ گنپتی کے میلے کی دھوم دھام سے منائے جانے کی رسم تازہ معلوم ہوتی ہے۔ خیال غالب ہے کہ بمبئی میں ۱۸۹۳ء میں جو فساد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا اس کے بعد مفسدوں نے ہندو مسلمانوں میں نفاق ڈالنے کا بہترین ذریعہ یہ سوچا کہ گنپتی کا میلہ اعلیٰ پیمانے پر منعقد کیا جائے ..... اس سے مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو زخمی کیا جائے ..... اس خیال کو لے کر ستمبر ۱۸۹۴ء میں مفسدوں نے اس معمولی پوجا کو عالمگیر نمائش بنانے کے انتظامات کے لئے میلے کی ایسی جگہ منتخب کی جہاں عوام بآسانی جمع ہوسکیں۔ نیز ایسا انتظام کیا گیا کہ جو لوگ گتکا بازی اور دیگر جسمانی ورزشوں کے ماہر ہوں وہ گنپتی کے حضور اپنے فن کا مظاہرہ کریں۔ متواتر دس دن تک نوجوانوں کے گروہ گلیوں اور بازاروں میں ایسے اشعار گاتے پھرے جن سے مسلمانوں اور حکومت کی مخالفت مقصود تھی ..... قدرتاً اس تہوار سے بدامنی اور فساد کی کئی وارداتیں ہوئیں۔ چنانچہ ایک موقعہ پر ساٹھ ستر آدمیوں کے جلوس نے ایک مسجد کے قریب سے گزر کر مسلمانوں کے مذہبی مراسم میں دخل اندازی کی۔

گنپتی کے اس میلے میں اس قسم کے اشلوک گائے جاتے تھے:-

---

[1] پاکستان کے محاب اوّل، سرسیدؒ نے یہ بات اعلانیہ کہہ دی تھی۔

بدطینت لوگ قصائیوں کی مانند جلادوں کی سی بے رحمی سے گائیوں اور بچھڑوں کو ذبح کرتے ہیں۔
اٹھو اور گائے ماتا کی مدد کرو!

دوسری طرف، سیواجی کے جنم دن اور تاجپوشی کے دن کی تقاریب پر پونا میں اسی قسم کے میلے منعقد کئے جانے لگے جن میں جی بھر کر مسلمانوں کے خلاف نفرت اور انتقام کے جذبات بھڑکائے جاتے تھے۔ ان میلوں میں اس قسم کے شلوک پڑھے جاتے تھے:۔

یاد رکھو! محض سیواجی کی کہانی سنا دینے سے آزادی حاصل نہیں ہو جاتی بلکہ ضروری ہے کہ لوگ سیواجی اور باجی راؤ کی مانند اولوالعزمانہ جانبازی دکھانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اب تم کو ڈھال تلوار سے مسلح ہو جانا چاہیئے کہ ہم نے دشمن کو برباد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہم دشمنوں کو مار کر مر بن گے تم عورتوں کی طرح بیٹھے کہانیاں سنتے رہو گے۔

اسی میلہ کے ایک اجلاس میں خود تلک صدارت کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے صدارتی ریمارکس میں کہا:۔

سوال یہ ہے کہ کیا سیواجی نے افضل خاں کو قتل کر دینے میں کوئی پاپ کیا تھا؟ اس کا جواب مہابھارت کے اوراق میں ملے گا۔ بھگوان کرشن کا صاف اپدیش ہے کہ تشکام کرم ہوتے ہوئے بیشک اپنے گورو اور رشتے دار تک کو ہلاک کر دو۔ تم پر کوئی الزام عائد نہیں ہوگا۔ افضل خاں کے قتل میں سیواجی کی ذاتی اغراض پوشیدہ نہ تھیں۔ اس نے جو کچھ کیا رفاہِ عام کی خاطر کیا تھا۔ اس کے قتل کو گناہ نہیں کہا جاسکتا۔ اگر ہمارے مکان میں چور داخل ہو جائیں اور ہم دیکھیں کہ ان کو نکالنے کے لئے ہم میں کافی قوت نہیں ہے تو چاہیئے کہ انہیں اندر بند کر کے مکان کو آگ لگا دیں اور ان کو زندہ جلا دیں۔

آریہ سماج

ہم نے پہلے بتایا ہے کہ مسلمانوں کو ختم کرنے کی تحریک کے بانی بال گنگا دھر تلک اور سوامی دیانند تھے: تلک کے عزائم کی ایک جھلک ہمارے سامنے آگئی۔ سوامی دیانند نے ہندوؤں کی ایک ملک گیر تنظیم کی بنیاد رکھی جس کا نام آریہ سماج تھا۔ اس کے قیام کا مقصد، اس تنظیم کے ایک معروف لیڈر، لالہ دھنپت رائے نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا:۔

ہندوستان میں سوائے ہندو راج کے دوسرا راج ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتا۔ ایک دن آئے گا کہ ہندوستان کے سب مسلمان شدھ ہو کر آریہ سماج ہو جائیں گے اور اس طرح آخر یہاں ہندو ہی رہ جائیں گے۔ یہ ہمارا آدرش (نصب العین) ہے۔ یہی ہماری آشا (آرزو) ہے۔ سوامی جی مہاراج نے آریہ سماج کی بنیاد اسی اصول کو لے کر ڈالی تھی۔ (اخبار پرکاش۔ لاہور۔ ۲۶ اپریل ۱۹۲۵ء)

گئو رکھشا

عوامی سطح پر مسلمانوں کے خلاف جذبات نفرت و انتقام کی آگ بھڑکانے کے لئے۔ سوامی دیانند نے گئو رکھشا (گائے کی حفاظت) کا شاخسانہ کھڑا کیا۔ واضح رہے کہ ویدوں اور شاستروں کی رُو سے گائے کا گوشت کھانا نہ صرف جائز ہے بلکہ اسے دیوتاؤں کے استھان پر بطور نذر نیاز چڑھانے کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ لہٰذا، گئو رکھشا کا سوال محض مسلمانوں کے خلاف جذبات نفرت مشتعل کرنے کا ایک عوامی حربہ تھا جیسا کہ اخبار پرتاپ کے ایڈیٹر، مہاشہ کرشن نے اس باب میں لکھا تھا کہ

گئور کھشا کے سوال کا آریہ سماج کے ساتھ بہت سمبندھ (تعلق) ہے کیونکہ اس پر بھارت ورش کا جیون نربھر (زندگی کا دار و مدار) ہے۔ گئو رکھشا پر سب سے پہلے لیکچر رشی دیا نند ہی نے دیئے تھے..... اور وہ چاہتے تھے کہ گاؤ کشی کو قانوناً بند کرا دیا جائے۔
(پرتاپ۔ لاہور۔ ۱۹؍ ستمبر ۱۹۲۰ء)

اور اخبار ملاپ نے اپنی ۲۷؍ اکتوبر ۱۹۲۹ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

گئو ہتیارے (گائے پر ظلم کرنے والے) کو سیسہ کی گولی سے اڑا دینے کے لئے شاستروں میں آگیا (حکم) ہے۔

آریہ سماجی عام جلسوں میں اسی قسم کی اشتعال انگیز تقریریں کیا کرتے تھے۔ مثلاً ۱۹۲۶ء میں سکھر کے ایک جلسہ میں مہاشہ پرتاپ سنگھ نے تقریر کرتے ہوئے کہا :-

گائے ماتا کے گلے پر چھری پھیرنے والوں کے لئے تمہارے دل میں رحم کا کوئی جذبہ نہیں ہونا چاہئے بھیشم کے سپوتو! ارجن کے دلاورو! اگر تم ایک گائے کی خاطر، کراچی سے مکہ تک تمام مسلمانوں کو (بھی ختم کر دو) تو بھی تھوڑا ہے۔

مہاتما گاندھی

(مہاتما) گاندھی کو اہنسا (عدم تشدد) کا دیوتا کہا جاتا ہے۔ اس باب میں ذرا ان کا دیا کھیان بھی سن لیجئے جسے پہلے بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ انہوں نے ۱۹۱۸ء میں کہا تھا کہ

ہندوستان کے طول و عرض میں ایک ہندو بھی ایسا نہیں جو ایک دن اپنی سرزمین کو گائے کشی سے آزاد کرانے کی امید نہ رکھتا ہو۔ ہندو مذہب کو جیسا کہ میں جانتا ہوں، عیسائی یا مسلمان کو بزورِ شمشیر بھی گاؤکشی کو چھوڑنے پر مجبور کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔
(سٹیٹسمین۔ بحوالہ الفضل۔ ۹؍ مارچ ۱۹۱۸ء)

ان اشتعال انگیز بیانات اور تقاریر کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں جگہ جگہ گاؤکشی کی بناء پر ہندوؤں نے فسادات برپا کئے اور ان کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

مسلمانوں کو ہندو جاتی کے اندر جذب کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو شدھ کرکے، ہندو بنا لیا جائے۔ واضح رہے کہ کسی غیر ہندو کو ہندو مذہب میں داخل کرنے کا تصور یکسر ہندو مذہب کے خلاف ہے۔ ہندو

شدھی کی تحریک

مذہب تبلیغی ہے ہی نہیں۔ ہندو وہی ہو سکتا ہے جو ہندوؤں کے گھر پیدا ہو جس مذہب میں پیدائشی ذات (ورن) تک نہ بدلی جا سکتی ہو اس میں تبدیلیٔ مذہب سے کسی کو ہندو بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کو ختم کرنے کے لئے، شدھی کو بھی جائز قرار دیا گیا اور یہ تصور بھی سوامی دیانند ہی کا ایجاد کردہ تھا۔ چنانچہ لالہ لاجپت رائے، سوامی دیانند کی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ

سوامی دیانند پہلا شخص تھا جس نے ہندوؤں کو شدھی کی طرف راغب کیا۔

شُدھی سے اصل مقصد کیا تھا، اس کی بابت؛ ایک اور ہندو کی زبان سے سنیئے۔ اخبار پرتاپ (لاہور) کے ایڈیٹر نے ۱۴ جنوری ۱۹۲۶ء کو لکھا تھا:۔

ہندو کیا کریں جب کہ دنیا کا نظام ہی تعداد کے سہارے چل رہا ہو۔ اس ملک کی حکومت صرف تعداد کے اصول پر قائم ہے جس کے لئے ہندوستانیوں کا باوا آدم نرالا ہے۔ یہاں کونسلوں میں ادھیکار (اختیارات) بھی تعداد کے لحاظ سے ملتے ہیں۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے وہاں عملی طور پر مسلم حکومت ہے۔ ہم پنجاب میں رہتے ہوئے جانتے ہیں کہ مسلم حکومت کیا ہے؟ اس وقت شدھی ہندوؤں کے لئے زندگی اور موت کا سوال بن رہی ہے۔ مسلمان نفی سے سات کروڑ تک پہنچ چکے ہیں۔ عیسائی چالیس لاکھ ہو چکے ہیں۔ سات کروڑ مسلمانوں کے سامنے بائیس کروڑ ہندوؤں کا رہنا مشکل ہو رہا ہے۔ اگر کہیں ان کی تعداد بڑھ گئی تو نہ معلوم کیا ہوگا۔ دھرم کو دھرم کے لئے ہونا چاہیئے لیکن ہندوؤں کو تو دوسری ضروریات نے مجبور کر دیا ہے کہ اپنے بھولے بھٹکے بھائیوں کو گلے لگائیں اور جو ان کے بھائی بننا چاہیں ان کو اپنا بھائی بنائیں۔ ہندو اگر اب بھی نہ جاگے تو ان کا کام ختم ہے۔

واضح رہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب اہلِ ہند کو سیاسی اصلاحات کی رُو سے کچھ اختیارات مل رہے تھے اور یہاں جمہوری نظام کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی۔ شُدھی کی تحریک اسی کی پیش بندی کے لئے اختیار کی گئی تھی۔

دہلی سے شائع ہونے والے اخبار تیج نے ۱۹۲۶ء میں؛ اپنے کرشن نمبر میں لکھا تھا:۔

جن گائیوں کو بھگوان کرشن؛ شردھا (عقیدت) کے ساتھ جمنا ندی کے پوتر استھان (مقدس مقام) پر چراتے تھے، آج تم ان کی رکھشا کرو اور ان کو گئو ہتیا کاروں کے مظالم سے بچاؤ۔ یہ سب کچھ جب ہی ہو سکتا ہے جب آپ شدھی، سنگھٹن اور دلت ادھار کا اپنے دل میں نشچے (عہد) کرلیں ....

یہی گوپال (گائیوں کے پالنے والے کرشن) کی سچی بھگتی ہوگی۔ اسی سے ہمارا راشٹر بنے گا۔ اسی سے ہمارے اختلافات مٹیں گے۔ اسی سے باجا اور مسجد کا سوال حل ہوگا۔ اسی سے ہمیں ہماری سوتنترتا پراپت (آزادی حاصل) ہوگی۔ دُنیا میں پھر آریہ دھرم کا جھنڈا بلند ہوگا۔ بھارت؛ چکرورتی راج، (عالمگیر حکومت) کا سوامی (مالک) بنے گا۔

اچھوتوں کو جذب کرنا

گئو رکھشا اور سنگھٹن کی تحریکوں کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس میں؛ دلت اُدّھار کا بھی ذکر آیا ہے۔ یہ بھی جمہوریت کا توڑ تھا۔ دلت ادھار کے معنی ہیں اچھوتوں کی اصلاح۔ ہندو دھرم کی رو سے اچھوت (یا شودر) وہ چوتھا ورن ہے جس میں جنم لینے والے کسی اونچی ذات کے ہندو کو چھو بھی نہیں سکتے۔ وہ پیدائشی ناپاک ہوتے ہیں اور ساری عمر ناپاک رہتے ہیں یہ درحقیقت ہندوستان کے قدیم اصلی باشندے تھے جنہیں ہندوؤں نے اپنی خدمت کے لئے غلام بنا رکھا تھا۔ یہ کبھی ہندوؤں کا جنؤ نہیں بن سکتے تھے۔ ان کا جنؤ بننا تو ایک طرف، منوسمرتی میں لکھا ہے کہ

اگر کوئی شودر کسی دوِج کے برابر بیٹھے تو اس کی کمر میں داغ دے کر اسے گاؤں سے نکال دینا چاہیئے۔ یا اس کے چوتڑوں کو تھوڑا سا کاٹ ڈالنا چاہیئے۔

اچھوت تو ایک طرف، پنڈت مدن موہن مالویہ جیسا تعلیم یافتہ، بین الاقوامی شہرت کا لیڈر، بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ

> میں جب کسی انگریز سے ملتا ہوں تو ملنے کے بعد پانی سے ہاتھ دھو لیتا ہوں۔

اچھوتوں کو ہندو قرار دینے سے مقصد کیا تھا، اس کے متعلق اخبار ملاپ نے اپنی ۲۲ جنوری ۱۹۲۶ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

> ہندوؤں کے لئے اچھوت آدھار کا مسئلہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ مردم شماری میں ہندوؤں کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ جب کہ مسلمان اور دیگر اقوام ترقی کر رہی ہیں۔ ایک ہندو کا فرض ہونا چاہئے کہ وہ اپنے وقت اور دھن کا کچھ حصہ اچھوت ادھار کے لئے صرف کرے۔

اسی اخبار میں، مسٹر کیلکر جیسے ہندو لیڈر نے لکھا تھا کہ

> خود غرضی کے خیال سے بھی ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اچھوت ادھار کے کام کو ہاتھ میں لے کر اچھوتوں کو جلد از جلد اپنے اندر ملالیں کیونکہ موجودہ حکومت میں تعداد ہی ایسی چیز ہے جس پہ حکومت میں نمائندگی کا دارومدار ہے۔

اچھوتوں میں تبلیغ کا کام مسلمانوں نے بھی شروع کیا تھا۔ ہندو اسے کس نگاہ سے دیکھتے تھے، اس کے متعلق، اور تو اور، خود (مہاتما) گاندھی کی زبان سے سنیئے۔ جب انہوں نے سنا کہ مسلمانوں نے کچھ اچھوتوں کو مسلمان بنا لیا ہے تو

> انہیں یہ سن کر بہت دکھ ہوا اور کہنے لگے کہ "مجھے تو اس کا پتہ تک نہیں۔ آپ کی غلطی ہے جو اب تک خاموش رہے۔ یہ بہت برا ہوا۔ کم از کم مجھے اس کی اطلاع ملنی چاہیئے تھی۔ اچھوت اودھار کا کام صرف ہندوؤں کا ہے۔" (پرتاپ ۲۴-۱۲-۲۰)

ہندو سنگھٹن

ایک طرف اچھوتوں کو ہندو قرار دے کر جمہوری طریق سے ہندو راج کے منصوبوں کو تقویت پہنچائی جا رہی تھی اور دوسری طرف، ہندو تنظیم (سنگھٹن) کو مستحکم کر کے، بزورِ شمشیر ہندوؤں کی حکومت قائم کرنے کی کوششیں جاری تھیں چنانچہ تحریک سنگھٹن کے مشہور رہنما، لالہ ہردیال نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ

> ہندو سنگھٹن کا مقصد یہ ہے کہ بھارت ورش میں ایک ایسی مضبوط، زبردست، متحد اور بیدار سیاسی جماعت قائم کی جائے جو ایک آزاد ہندو ریاست کے آدرش (نصب العین) تک پہنچنے کی کوشش کرتی رہے۔ گورو گوبند سنگھ جی نے اپنے زمانے کی ضرورت کے مطابق ایک ایسا دل بنایا تھا۔ آج بھی سوراج پارٹی، انڈی پینڈنٹ پارٹی، لبرل پارٹی وغیرہ سیاسی جماعتیں قائم کی جا رہی ہیں۔ ہندو سنگھٹن کا مقصد یہ ہے کہ ایسا ہندو قومی دل قائم کیا جائے جو ایک آزاد قومی ریاست کی بنیاد ڈالے۔ جب انگلستان کچھ عرصہ بعد ہوم رول یعنی (۷۵) فیصد سوراجیہ ہمیں پیش کرے تو وہ ہندو قومی دل کے ساتھ عہد و پیمان کرے۔
>
> ہندو سنگھٹن کا آدرش (نصب العین) یہ ہے کہ ہندو قومی سنستھاؤں (انسٹی ٹیوشنز) کی بنیاد

پر ہندو قومی ریاست قائم کی جائے۔ ہندو قومی سنستھائیں یہ ہیں: مثلاً سنسکرت بھاشا، ہندو قوم کا اتہاس (تاریخ)، ہندو تہوار، ہندی مہا پرشوں کا سمرن (ہندو سورماؤں کا تذکرہ) ہندوؤں کے دیش یعنی بھارت یا ہندوؤں کے ستھان (ملک) کا پریم، ہندو قوم کی ساہتیہ (تحفظ) کا پریم وغیرہ وغیرہ۔ جو لوگ آج کل نیم عربی، نیم ایرانی مسلمانوں کو قومی تحریک میں خواہ شامل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس صداقت کو نہیں سمجھتے کہ ہر ایک قومی ریاست پرانی سنستھاؤں پر قائم کی جاتی ہے جن سے لوگوں میں یگانگت کا بھاؤ (رجحان) پیدا ہوتا ہے۔ آج کل کے ہندی مسلمان تو محض جملہ معترضہ ہیں۔ ان کا یہی مستقبل ہے کہ آہستہ آہستہ شدھی کے ذریعے دوبارہ ہندو قوم کے اندر شامل ہو جائیں۔ راج نیتی شاستر (ضابطہ سیاست) کے مطابق مجھے کوئی اور راستہ نظر نہیں آتا۔

(ملاپ 25/5/25)

انہوں نے اپنے ایک اور مضمون میں جو اخبار تیج کی ۲۱ مارچ ۱۹۲۵ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ لکھا تھا:۔

ہندو سنگھٹن کے لئے ہندو سوراجیہ (حکومت) کا آدرش (نصب العین) ضروری ہے۔ پنجاب میں ہندو سوراجیہ قائم کرنے کے لئے آدرش ہی سے لوگوں میں قربانی کی طاقت پیدا کی جا سکتی ہے۔ ہندو سنگھٹن کا یہ اصول ہونا چاہیئے کہ جب تک ہندوستان بالخصوص پنجاب بدیشی مذہبوں سے پاک نہیں ہوگا ہمیں کبھی چین سے سونا نہیں ملے گا۔ جو ہندو اس آدرش کو نہیں مانتا وہ کپوت ہے، بے جان ہے، مُردہ دل ہے، بے سمجھ ہے۔ اس نے ہندوؤں کو مزید مشتعل کرنے کے لئے لکھا: "پنجاب اور ہندوستان میں دو قومیں نہیں رہ سکتیں۔ یا سب ہندو اسلام قبول کر لیں یا سب مسلمانوں کو شدھی کے ذریعے ہندو بنا لو۔ یہی اس سوال کا حل ہے۔ مذہب اسلام ایک ایسی انوکھی چیز ہے کہ مسلمان کسی ملک میں دوسری قوموں کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے۔ اتفاق اور امن کے لئے ضروری ہے کہ یا صرف اسلام ہو یا اسلام بالکل نہ ہو۔ بیس فیصد اسلام سے صرف بلوہ فساد ہوں گے۔ بیس فیصد اسلام کے روڑے کو کوئی ملک ہضم نہیں کر سکتا۔ جس ملک نے اس پتھر کو نگل لیا اس کے پیٹ میں ہمیشہ درد رہے گا۔ پس اسلام کی تاریخ اور مزاج کو جان کر ہمیں ہندو اتحاد کی کوشش شروع کر دینی چاہیئے۔ اب تو صرف ذاتی طور پر شدھی کرنی چاہیئے سوراج ملنے پر ریاست کی مدد سے شدھی کی تحریک کو ترقی دینی چاہیئے۔"

لالہ ہردیال اپنی اس تحریک کو ہندوستان تک ہی محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ وہ افغانستان کو بھی ہندو دائرے کے اندر سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہی دنوں انہوں نے اپنے ایک اور مضمون میں لکھا:۔

افغانستان کوئی جدا ملک نہیں۔ یہ ہندوستان، پنجاب کا ایک حصہ ہے۔ افغانستان میں ہماری مورتیاں، بُت اور مندروں کے کھنڈرات آج تک پائے جاتے ہیں جب تک افغان اور سرحدی قبائل کے مسلمان بھی ہندو قوم میں شامل نہیں کئے جائیں گے، اس وقت تک ہمارے ملک کی حفاظت کا پورا پورا انتظام نہیں ہو سکتا۔ تاریخ ہند سے ظاہر ہے کہ ان پہاڑی علاقوں سے ہم کو بہت

دُکھ پہنچ سکتا ہے۔ مگر اس دُکھ کا اندیشہ صرف اس وقت تک ہے جب تک یہ بہادر لوگ اسلام کے پیرو اور مسلمان ہیں۔ مگر جب ہم ان کو ہندو بنالیں گے تو یہ خطرہ جاتا رہے گا۔ لہٰذا، افغان اور سرحدی مسلمانوں کو ہندو بنا دینا ہمارا بہت ضروری فرض ہے۔ تمام ہندو قوم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر ہندو کے سامنے یہ تین اصول ہر وقت رہنے ضروری ہیں۔ ایک تو ہندو سوراج، دوسرے ہندوستان کے سب مسلمانوں اور عیسائیوں کو ہندو بنانا، تیسرے افغانستان اور سرحد کو ختم کرنا اور وہاں کے باشندوں کو ہندو بنانا۔

اس کے بعد وہ افغانستان سے بھی آگے بڑھے اور کہا کہ

جب ہندو قوم میں پورا پورا جوش پیدا ہو جائے گا تو سوراج، شُدھی اور افغانستان کی فتح کے علاوہ ممکن ہے کہ ہم مشرقی افریقہ، فجی اور دوسرے ملکوں پر بھی قابض ہو جائیں جہاں ہندو بھائی آباد ہیں کیونکہ اس وقت ہم کسی ہندو بھائی کو غلامی کی حالت میں نہیں چھوڑیں گے۔ پس ہندوستان کو اگر کبھی آزادی ملے گی تو یہاں ہندو راج قائم ہوگا بلکہ مسلمانوں کی شُدھی، افغانستان کی فتح وغیرہ باقی آدرش بھی پورے ہو جائیں گے۔ (اخبار ملاپ۔ ۳۰ ، جون ۱۹۲۵ء)

اُسی زمانے میں ہندوؤں کے ایک اور مشہور لیڈر، سوامی سیتہ دیو نے اپنی ایک تقریر میں واضح الفاظ میں کہا تھا کہ

جب ہم طاقتور ہو جائیں گے تو ہم مسلمانوں کے سامنے یہ شرائط رکھیں گے :۔

(۱) —— قرآن کو الہامی کتاب مت مانو۔
(۲) —— محمدؐ کو خدا کا نبی مت مانو۔ (معاذ اللہ)
(۳) —— مکہ کے ساتھ اپنا کوئی تعلق نہ رکھو۔
(۴) —— سعدی اور رومی کی بجائے کبیر اور تلسی داس کو پڑھو۔
(۵) —— اسلامی تقریبات کی بجائے ہندوؤں کی تقریبات مناؤ۔
(۶) —— وہ تمام تقریبات مناؤ جن کا تعلق رام کرشن اور دوسرے دیوتاؤں سے ہے۔

(اخبار وکیل۔ امرتسر۔ ۹ ، دسمبر ۱۹۲۵ء)

اور پروفیسر رام دیو نے اس پر اضافہ کرتے ہوئے فرمایا :۔

ہندوستان کی ہر ایک مسجد پر ویدک دھرم یا آریہ سماج کا جھنڈا بلند کیا جائے گا۔

(گرو گھنٹال۔ ۱۰ ، جنوری ۱۹۲۶ء)

یہ تھے ہندو کے وہ عزائم جن کے علی الرغم ہندوستان میں تحریکِ پاکستان کا آغاز ہوا۔ آپ سوچئے کہ جس قوم کے یہ عزائم ہوں وہ اس تحریک کو ٹھنڈے پیٹوں کس طرح برداشت کر سکتی تھی؟ وہاں کے لیڈروں نے ایک طرف تو بساطِ سیاست پر اس کی مخالفت شروع کی اور دوسری طرف مسلمانوں کے خلاف فسادات کا آغاز کر دیا۔ ان فسادات میں مسلمانوں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا جاتا تھا، اس کی تفصیل طول طویل ہے۔ (مسلم لیگ

کی طرف سے متعین کردہ پیر پور کمیٹی کی رپورٹ اس پر شاہد تھی) ۔ میں اِس مقام پر صرف ایک واقعہ کے تذکرہ پر اکتفا کروں گا ۔ ۱۹۴۰ء میں سی ۔ پی کے تعلقہ چاندور میں، ہندو بلوائیوں نے مسلمانوں کو بُری طرح سے قتل کیا

مسلمانوں کا قتلِ عام

اور لوٹا ۔ اور وہاں کی کانگرسی حکومت نے، خود مسلمانوں کو گرفتار کر کے انہیں جیل میں ٹھونس دیا ۔ اس سلسلہ میں ان پر کس قدر تشدد کیا گیا اس کے متعلق، وہاں کے سیشن جج نے اپنے فیصلے میں لکھا تھا ۔

> تمام مسلمانوں کی ذلت کے ساتھ شہر کی سڑکوں پر تشہیر کی گئی ۔ اور پھر سکول کے ایک کمرے میں ۱۴۵ مسلمان بند کر دیئے گئے ۔ یہ کمرہ تیس فٹ لمبا اور بیس فٹ چوڑا تھا جس میں یہ مسلمان، رات بھر مقفل رکھے گئے ۔ ان لوگوں کی تشہیر کے لئے جب انہیں سڑکوں پر گھمایا گیا تو وہ دوپہر کا وقت تھا اور چونکہ یہ سخت ترین گرمی کا زمانہ تھا اس لئے اس وقت گرمی یقیناً زیادہ ہوگی ۔ جو مجسٹریٹ اس تشہیر کے وقت ساتھ تھا اس نے تسلیم کیا ہے کہ اس وقت اتنی شدید گرمی تھی کہ اس تشہیر میں کئی لوگوں کو قے آگئی .... حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو ذلت کے ساتھ برسرِ عام کھڑا کر کے ان کی جانچ کرنے سے لے کر ۱۴۵ آدمیوں کو ان کے جیل بھیجنے کے وقت تک پولیس کا جو عمل رہا ہے اسے دیکھ کر آج کل کے نازی جرمنی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے ۔
>
> (مدینہ ۔ ۲۵/۷ ۔ بحوالہ طلوعِ اسلام ۔ ستمبر ۱۹۴۰ء)

یہ تھا کانگرس حکومت کے تحت مسلمانوں کی اقلیت کا حشر!

کہا یہ جاتا ہے ـــ اور خود اُس زمانے کے مسلمان نیشنلسٹ، جو حصولِ پاکستان کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل تھے، کہا کرتے تھے ـــ کہ ہندو، وہاں اپنی حکومت قائم نہیں کرنا چاہتا تھا، جمہوری نظام قائم کرنا چاہتا تھا ۔ میں یہاں اس بحث میں نہیں اُلجھنا چاہتا کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے خود مغربی جمہوریت ہی کس قدر ملعون و مردود نظامِ مملکت ہے، اگر مغربی نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے، تو ہندوستان کی جمہوریت بھی نرالے قسم کی ہوتی ـــ اور ہے ـــ مغربی اندازِ جمہوریت میں، ہوتا یہ ہے کہ جو پارٹی آج اقلیت میں ہے اس

جمہوری نظام

کے لئے امکان ہے کہ وہ کل کو اکثریت بن کر اپنی حکومت قائم کر لے ۔ لیکن ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں تھے اور چونکہ یہ اقلیت مذہب کی بنیاد پر تھی، اس لئے اس کے لئے اس کا امکان ہی نہیں تھا کہ یہ کبھی اکثریت بن کر اپنی حکومت قائم کر سکے ۔ لہٰذا، اسے مستقلاً ہندو اکثریت کی محکومی کی زندگی بسر کرنی پڑتی ۔ ہندو کی محکومی کس قسم کی ہوتی، اس کا جواب ہم سے نہیں، خود وہاں کے اربابِ سیاست کی زبان سے سُنئے ۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے، اس ضمن میں لکھا تھا کہ

> دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر، اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے ۔
>
> (میری کہانی ۔ جلد دوم ۔ صفحہ ۴۵۵)

اس اکثریت کی حکومت کے تابع مسلمانوں پر کیا گزرتی، اس کے متعلق، متحدہ قومیت کی سب سے بڑی مؤید جماعت

جمعیت العلماءِ ہند — کے سیکرٹری، مولانا احمد سعید (مرحوم)، نے ۱۹۲۶ء میں کہا تھا کہ

اسلامی حکومت کے زوال پر اِس ملک میں ہندوؤں کی حکومت قائم ہو جاتی تو مسلمانوں کو چھٹی کا کھایا یاد آجاتا — جو قوم موجودہ غلامی کی حالت میں یہ ستم ڈھا رہی ہے، حکمران بن کر خدا جانے مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتی۔ (الجمعیۃ۔ بابت ۱۰ ارجنوری ۱۹۲۶ء)

مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم)، نے ۱۹۲۸ء میں مولانا شوکت علی (مرحوم) کو ایک خط میں لکھا تھا:-

چونکہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور ہندو اکثریت میں' اور ان کی اکثریت بھی غیر معمولی ہے اور نَو اور ایک کی نسبت ہے اور ان کی یہ حالت ہے کہ آج تک ڈاکٹر مونجے صاحب یہی فرما رہے ہیں کہ "یہ سرزمین کسی مسلمان یا کسی فرقہ کی زمین نہیں ہے۔ یہاں جو راج قائم ہوگا وہ ہندو راج ہوگا مجھے کروڑوں ہندو رضاکاروں کی ضرورت ہے"۔ جو مظالم آئے دن یہاں دفتروں میں، شہروں میں اور ریاستوں میں کئے جا رہے ہیں۔ اور جس تعصّب اور عدم رواداری کا ثبوت حسب تصریح جناب "ہندو دیوتا" گاندھی جی اور نہرو صاحب نے دیا ہے، ان کی بنا پر ہم کسی طرح بھی اپنے اہلِ وطن کے ساتھ متحدہ قومیت نہیں بنا سکتے۔

(طلوعِ اسلام۔ بابت اپریل ۱۹۴۲ء)

ہندوؤں کے عزائم انگریز کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد' ہندوؤں کے عزائم کیا تھے، اس کا انکشاف' قائدِ اعظمؒ نے' دسمبر ۱۹۴۱ء میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس میں ان الفاظ میں کیا تھا:-

ساورکر (صدر ہندو مہا سبھا) کی اسکیم یہ ہے کہ جب (انگریز کے جانے کے بعد) میدانی، بحری اور فضائی فوج میں ہندوؤں کو ۷۵ فیصد حصّہ مل جائے گا تو پھر ہندو راج قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی، ان مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا جو شمال مغرب اور شمال مشرق میں بستے ہیں۔ ان کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ سرحدوں پر ہندو فوج اس طرح بٹھا دی جائے گی جس طرح اب برطانوی فوج متعین ہے۔ اور یہ فوج اس کا خیال رکھے گی کہ مسلمان سر نہ اٹھا سکیں۔

(تقاریر قائدِ اعظمؒ۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۳۵۶-۳۵۵)

یہ تھا وہ ہندو جس کے پنجۂ استبداد سے نجات حاصل کرنے کے لئے، ملّتِ اسلامیہ کے محسنِ اعظم محمد علی جناحؒ نے دس سال تک مسلسل لڑائی لڑی اور ہندو اور انگریزوں کے علاوہ' خود نیشنلسٹ مسلمانوں کی مسلسل مخالفت کے علی الرغم، پاکستان حاصل کر لیا۔ اس پر ہندوؤں کے دلوں کے اضطراب کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے

پاکستان بن جانے کے بعد

کہ ایک طرف' ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی یہ کہہ رہے تھا کہ

ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا حصّہ بنا لیا جائے۔ اس حقیقت کے متعلق میرے دل میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا خواہ یہ معاشی دباؤ سے

سوشلسٹ اپنے آپ کو بڑا منصف مزاج اور تعصب سے بالاتر قرار دیا کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک مسلمانوں کی مخالفت کا تعلق ہے' اس میں ہندو مہاسبھا اور سوشلسٹ پارٹی میں کوئی فرق نہیں۔ چنانچہ اس پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے اپنی کتاب "اگلا قدم" میں لکھا تھا کہ

> ہم زیادہ عرصہ تک انتظار نہیں کر سکتے۔ شاید دو تین سال کے عرصہ ہی میں امرتسر اور پاکستان کی درمیانی حدِ فاصل مٹ جائیگی۔ ہمیں پاکستان کے اس زہر کو ختم کر کے تقسیم ہند کو معدوم کر دینا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مصنوعی تقسیم ختم ہو جائے گی اور پاکستان اور ہندوستان پھر سے ایک ملک ہو جائیں گے۔

میرا خیال ہے کہ آپ اس انتظار میں ہوں گے کہ اس باب میں "بڑے میاں" (مسٹر گاندھی) نے کیا دکھیان دیا ہے۔ وہ بھی سن لیجئے۔ انہوں نے پاکستان بننے کے تین دن پہلے کہا تھا کہ

> اگر سارا ہندوستان جل کر راکھ ہو جائے' ہم پھر بھی مطالبۂ پاکستان منظور نہیں کریں گے خواہ مسلمان اسے بزورِ شمشیر ہی کیوں نہ طلب کریں۔ (دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا۔ صفحہ ۱۶۱۔ مصنفہ ای۔ ڈبلیو۔ آر۔ لومبی)

○

یہ اس داستان کا پہلا باب ہے۔ اب دوسرا باب ملاحظہ فرمائیے کہ تشکیل پاکستان کے بعد ہندو کس روپ میں سامنے آیا۔ اس روپ کے دو حصے ہیں' ایک یہ کہ ہندو نے خود اپنے ہاں کے بسنے والے مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا اور دوسرے یہ کہ پاکستان کی طرف آنے والے مسلمانوں کو کس طرح اپنی ہوسِ خون آشامی کی تسکین کا سامان بنایا۔

○

باب دوم

(تشکیل پاکستان کے بعد)

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء (بروز جمعۃ الوداع) ہندوستان اور پاکستان کی دو الگ الگ مملکتوں کا وجود عمل میں آیا اور اس کے دو روز بعد' مسلمانوں نے آزادی کی فضا میں پہلی عید منائی۔ لیکن ہنوز نمازِ عید کی تکبیریں بھی پوری نہیں ہوئی تھیں کہ مشرقی پنجاب اور اس کی ریاستوں — نابھہ۔ پٹیالہ۔ کپورتھلہ۔ فریدکوٹ سے مسلمانوں کے منظم اور وسیع پیمانے پر قتلِ عام کی خبریں آنی شروع ہو گئیں۔ اس قتل و غارت گری میں ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار گیا۔ عورتوں کو اغوا کیا گیا۔ بچوں کو سنگینوں کی نوک پر اچھالا گیا' عصمت دری کے واقعات عام ہونے لگے۔ بعض شہروں میں' مردوں کو ختم کر کے' نوجوان عورتوں کے برہنہ جلوس نکالے گئے' چند ہی ہفتوں کے اندر اندر تقریباً پانچ لاکھ مسلمان قتل کر دیئے گئے۔ اس کے بعد قتل و غارت گری کی اس آگ کا رُخ دہلی کی طرف پھرا اور ہندوستان کے دارالسلطنت میں پورا ستمبر کا مہینہ اس قسم کے قتلِ عام میں گزرا جس کی مثال تاریخ کے اوراق میں کہیں نہیں ملتی۔ ایک اندازہ کے مطابق اس خونی تماشہ میں بھارت میں قریب دس لاکھ مسلمان قتل و غارت گری کی نذر ہو گئے۔ اور قریب

مسلمانوں کا قتلِ عام

ہو یا سیاسی دباؤ سے، یا اس کے لئے دیگر ذرائع استعمال کرنے پڑیں۔ (آرگنائزر ۲ ؎)

دوسری طرف، دیوان چمن لال جیسے (بظاہر اعتدال پسند ہندو) یہ کہہ کر ہندوؤں کی ڈھارس بندھا رہے تھے کہ

> میں نا اُمید ہونے والوں میں سے نہیں ہوں، اس لئے مجھے یقین ہے کہ تقسیم ہند ایک عارضی سا حادثہ ہے، اس کے باوجود ہمیں تیس کروڑ ہندوؤں کو اس مقصد کے حصول کے لئے جان تک دے دینے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ یہ بہت غلط ہوگا کہ ہم (اپنی قوم کو) امن اور شانتی کی لوریاں دے دے کر اسی طرح سلائے رکھیں جس طرح ہم نے انہیں اس وقت تک سلائے رکھا اور جس کا نتیجہ اب ہمارے سامنے ہے۔ ہم میں بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم ضرورت سے زیادہ امن پسند واقع ہوئے ہیں۔ (ایضاً)

اور تو اور، جب تقسیم ہند کا بل منظوری کے لئے برطانوی پارلیمان میں پیش ہوا تو برطانیہ کے وزیر اعظم لارڈ اٹیلی (جو اُس وقت میجر اٹیلی تھے) اپنی تقریر میں فرما رہے تھے کہ

> ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے۔ لیکن مجھے اُمید واثق ہے کہ یہ تقسیم زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکے گی۔ اور یہ دونوں مملکتیں جنہیں ہم اس وقت الگ کر رہے ہیں، ایک دن پھر آپس میں مل کر رہیں گی۔

پاکستان ــــــ انگریز، کانگریس اور مسلم لیگ کے باہمی سمجھوتے سے وجود میں آیا تھا۔ اس سلسلہ میں آپ نے اس سمجھوتہ کے ایک فریق (انگریز) کے خیالات سُن لئے۔ اب کانگریس کی سُنئیے۔ ۳۔جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا اعلان ہوا، اور ۱۶جون کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے، حسب ذیل ریزولیوشن پاس کیا۔

> آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آجائے گی تو ہندوستان کے مسئلہ کا حل، صحیح صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار پاجائے گا

کانگریس کی طرف سے، تقسیم ہند کے فیصلہ پر دستخط پنڈت جواہر لال نہرو نے کئے تھے۔ وہ ایک طرف اس فیصلہ پر دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ رہے تھے کہ

> ہماری سکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت جناحؒ کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جُھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔
>
> (پاکستان فیسز انڈیا۔ صـ۹۹)

اس کے بعد، راجہ مہندر پرتاپ نے (۱۹۵۰ء میں) اپنی قوم کو مشورہ دیا کہ

> جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا، ہمارا ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا چلا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ لابینفک ہوگئی ہے۔ بنابریں میں حکومتِ ہند کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر پاکستان کو ختم کر دے۔
>
> (ویر بھارت۔ ۲۱/۵/۱۷)

ایک کروڑ مسلمان، انتہائی کسمپرسی کے عالم میں کسی نہ کسی طرح، جان بچا کر پاکستان پہنچ پائے۔ ان تارکین وطن کے ساتھ راستے میں کیا گزری، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ نومبر ۱۹۴۷ء میں ضلع انبالہ کے کرالیا کیمپ سے پانچ ہزار پناہ گزینوں کا قافلہ لائل پور (حالیہ فیصل آباد) کے قریب پہنچا۔ ان میں سے دو ہزار مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے۔ ان میں ہیضہ کا مرض عام تھا۔ اس کیمپ میں انہیں جو آٹا کھانے کو دیا جاتا تھا، جب اس کا کیمیاوی تجزیہ کیا گیا تو اس میں نیلا تھوتھا کا زہر ملا ہوا تھا۔ ایک گاڑی، ۱۱ نومبر کو دہلی سے لاہور پہنچی تو اس میں سفر کرنے والی عورتوں اور لڑکیوں نے بتایا کہ حکومتِ ہند نے جو سپاہی ان کی حفاظت کے لئے گاڑی میں متعین کئے تھے، انہوں نے کس طرح راستے میں ان کی عصمت دری کی۔ ایک ٹرین میں قریب ڈیڑھ ہزار پناہ گزین دہلی سے آ رہے تھے۔ امرتسر کے قریب ان سب کو ختم کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ ہندوستان میں ہندوستانی حکومت کی طرف سے وہاں سے آنے والے مسلمانوں کے خلاف ہو رہا تھا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے ہندوؤں کی طرف سے کیا واویلا مچایا جا رہا تھا۔ ان کی طرف سے مسلسل چیخ و پکار ہو رہی تھی کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کو تباہ و برباد کر دیا ہے، ان کے گھر لوٹ لئے ہیں، ان کی عورتوں کو اغوا کر لیا ہے۔ یہ تھا وہ واویلا جس کی طرف اشارہ کرنے کے بعد، مہاتما گاندھی نے ۲۶ ستمبر ۱۹۴۷ء کی اپنی شام کی پرارتھنا کی میٹنگ میں کہا تھا کہ

> اگرچہ میں نے جنگ کی ہمیشہ مخالفت کی ہے لیکن اگر اس سلسلہ میں پاکستان سے انصاف حاصل کرنے کا کوئی اور طریق کارگر نہ ہوا تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ ہندوستان، پاکستان کے خلاف جنگ کرے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ "میں چاہتا تھا کہ اپنی فوجیں پاکستان پر حملہ کرنے کے لئے بھیج دوں۔ لیکن ہندوستان کے اندرونی خلفشار نے اس کی اجازت نہ دی"۔

یہ تھا ہندو لیڈروں کی طرف سے، مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دینے والے قیامت خیز واقعات کا جواب! خدا خدا کر کے کسی نہ کسی طرح یہ آگ فرو ہوئی تو ۱۹۵۰ء میں بنگال میں فسادات شروع کرا دیئے گئے جس کے نتیجہ میں، قریب ڈیڑھ لاکھ مسلمان، اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ کر نہایت کسمپرسی کی حالت میں، مشرقی بنگال کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم اس سمت میں آگے بڑھیں اور دیکھیں کہ ہندو نے پاکستان کے خلاف اپنے عزائم کو بروئے کار لانے کے سلسلہ میں کیا کیا، ہمیں پیچھے مڑ کر یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس نے خود ہندوستان میں، اپنی "قوم" کے افراد (مسلمانوں) کے ساتھ کیا کیا۔

ہندوؤں نے اپنی حکومت قائم ہونے کے بعد، پہلا کام یہ کیا کہ سومنات کی جامع مسجد کو، جو ایک ہزار سال سے وہاں ایستادہ تھی، مسمار کر کے اس کی جگہ مندر بنا دیا۔ یہ تقریب بڑے جوش و خروش سے منائی گئی اور اس "مقدس رسم" کی ادائیگی کے لئے، سیکولر حکومت کے صدر، بابو راجندر پرشاد کو بلایا گیا[1]۔ اس کے

---

[1] آپ کو معلوم ہے کہ ہم (پاکستان کے مسلمانوں) نے اس کا جواب کیسے دیا تھا؟ یہ تقریب ۱۱ مئی کو منعقد ہوئی تھی۔ یہاں کے مسلمانوں نے فیصلہ کیا تھا کہ ۱۱ مئی کو قوم میں جس قدر لڑکے پیدا ہوں ان کا نام محمود رکھا جائے۔ چنانچہ ایسا کرنے سے ہم خوش ہو گئے کہ ہماری قوم میں اتنے محمود پیدا ہو گئے ہیں۔ کس قدر خود فریب واقع ہوئے ہیں ہم؟

بعد جو وہاں مسجدیں ڈھانے کی طرح پڑی ہے تو پھر ایسے واقعات کا کوئی انت شمار ہی نہیں رہا۔ حالانکہ تقسیم ملک سے متعلق آئین میں، اقلیتوں کے مذہب اور ثقافت کی حفاظت کی ضمانت دی گئی تھی۔ اخبار مدینہ کی ۲۸ رجولائی ۱۹۷۵ء میں شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق اُس وقت تک ایک شہر لدھیانہ کی ۱۱۷ مساجد میں سے ۹۰ میں گردوارے بن چکے تھے۔ ۱۵ میں مندر۔ اور باقیوں میں رہائش۔ (طلوعِ اسلام۔ فروری ۱۹۷۶ء)

اسلامک کلچر کا خاتمہ

جہاں تک ثقافت کا تعلق ہے۔ ہندوستان کے پہلے جشنِ آزادی کی تقریب پر، یو۔پی کانگریس کمیٹی کے صدر اور وہاں کی اسمبلی کے اسپیکر، مسٹر ٹنڈن نے پورے جوش و خروش سے کہا کہ

> ہندوستان یونین میں، جداگانہ زبان اور جداگانہ کلچر کی آواز کہیں سے نہیں نکلنی چاہیئے۔ جو لوگ کسی خاص فرقے کے لئے جداگانہ زبان یا کلچر کی حمایت کرتے ہوں، ان کے لئے ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں۔ اگر یہ لوگ اپنا نظریہ نہ بدل سکیں تو انہیں ہندوستان چھوڑ کر کہیں اور چلے جانا چاہیئے۔ مذہب اور کلچر دو مختلف چیزیں ہیں۔ چین، جاپان اور دیگر ممالک میں بھی مسلمان بستے ہیں، نہ ان کی جداگانہ زبان ہے نہ جداگانہ کلچر۔ ان کا کلچر وہی ہے جو ان کی مادرِ وطن کا کلچر ہے۔ اگر مسلمان ہندوستان میں رہنے کے خواہش مند ہیں تو انہیں ہندی کو بطور زبان اور ناگری کو بطور رسم الخط اختیار کرنا ہوگا انہیں اپنی تہذیب اور تمدن کے لئے عرب یا پاکستان کی طرف نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ بھارت ورش کے کلچر کو اپنا کلچر بنانا چاہیئے۔
> (ہندوستان ٹائمز۔ ۱۶ر اگست ۱۹۴۸ء)

سی۔ پی کے وزیر اعظم، مسٹر شکلا نے بھی یہی کچھ فرمایا اور کہا کہ

> میں ان مسلمانوں کو جن کے دماغ میں ابھی تک مسلم لیگی ذہنیت موجود ہے یہ چیلنج دینا چاہتا ہوں کہ آج ایک زبان اور ایک تہذیب کے خلاف جو کوششیں ہو رہی ہیں انہیں نہ تو ہم برداشت کریں گے اور نہ ہی کامیاب ہونے دیں گے۔
> (ملاپ۔ ۱۲ر دسمبر ۱۹۴۸ء)

اور انڈین پارلیمنٹ کے اسپیکر، مسٹر مولنکر نے ایک جلسہ میں کہا کہ

> ہم اس وقت سخت کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اگر اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلے کہ کسی ایک فرقہ کی زبان اور تمدن تباہ ہو تو اصول کا تقاضا یہ ہے کہ اقلیت کے فرقہ کی زبان اور تمدن کو تباہ ہو جانا چاہیئے ..... اقلیت کے فرقہ کو اس کا احساس ہونا چاہیئے کہ وہ ایک بڑے خاندان کا ممبر ہے اور اسے بڑے خاندان میں اپنی ہستی کو ضم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔
> (الجمعیۃ، دہلی۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ بابت فروری ۱۹۴۹ء)

جب مسلمانوں نے ہندوؤں کے معتدل مزاج لیڈروں کی توجہ ان تقاریر کی طرف دلائی تو پنڈت سندر لال جیسے لیڈر نے، جو بڑے فخر سے اپنے آپ کو ایک طرح کا مسلمان کہا کرتے تھے، جامع مسجد دہلی میں مسلمانوں سے کہا کہ اگر ان کے ساتھ کسی قسم کی سختی ہوتی ہے تو انہیں اس سختی کو ان لوگوں کی طرف سے کفارہ سمجھ کر برداشت کر لینا چاہیئے جنہوں نے پاکستان بنوایا تھا۔ آخر تمہیں میں سے وہ لوگ تھے جو "لے کے رہیں گے پاکستان" اور "بٹ

کے رہے گا ہندوستان" کے نعرے لگایا کرتے تھے۔ (صدق۔ ۱۰؍ دسمبر ۱۹۴۸ء)

یہ ۱۹۴۸ء کی باتیں تھیں۔ اور ۱۹۶۶ء میں ہندو مہا سبھا نے الیکشن کے سلسلہ میں جو اپنا منشور شائع کیا۔ اس میں واضح الفاظ میں لکھا کہ

> مہا سبھا، دستور میں اس قسم کی ترمیمات کے حق میں ہے جو ہندو کلچر کی روایات کے مطابق ہوں اور جس کے نتیجے میں ملک صحیح معنوں میں ایک جمہوری ہندو ریاست بن سکے۔ اگرچہ اقلیتیں کلچر اور مذہب کے معاملہ میں آزاد ہوں گی لیکن انہیں ہندو قومیت کے خاص دھارے میں سمو جانا چاہیئے اور مذہب اور کلچر کے نام پر علیحدہ قومیت کے تصور کو خیرباد کہہ دینا چاہیئے۔
>
> ("مدینہ" بجنور۔ ۲۵؍ اکتوبر ۱۹۶۶ء)

یہ کچھ وہاں موجود مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا تھا۔ جہاں تک وہاں کے مسلمانوں کی آنے والی نسلوں کا تعلق ہے' ان کے لئے نظامِ تعلیم ایسا وضع کر دیا گیا جس سے وہ بھول جائیں کہ وہ کسی جداگانہ قوم کے افراد ہیں۔ (یہی مسٹر گاندھی کی واردھا کی تعلیمی سکیم کا مقصد تھا) اس' سلسلہ میں ۱۹۶۶ء میں مولانا ابوالحسن ندوی نے' ہندوستان میں رہنے والے اپنے ایمانی بھائیوں کے نام ایک اپیل میں کہا تھا کہ

> دل پہ پتھر رکھ کر لیکن آنکھوں کی پٹی کھول کر یہ بات عرض کرنی پڑتی ہے کہ اب اس بات کے سمجھنے میں کسی دوربینی یا فراستِ ایمانی کی ضرورت نہیں کہ سرکاری سکولوں میں جو نصاب (بالخصوص ہندی اور سنسکرت میں) پڑھایا جاتا ہے اس کے بعد کسی مسلمان بچے کا، کم سے کم معنی میں بھی مسلمان رہنا عقلاً اسی طرح ممکن نہیں جیسے دریا میں کودنے اور غوطہ لگانے کے بعد جسم کا خشک رہنا اور دامن کا تر نہ ہونا، ممکن نہیں۔ (طلوعِ اسلام۔ نومبر ۱۹۶۶ء)

یہ کچھ وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ ذہنی اور نفسیاتی طور پر کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ وہاں متواتر تئیس سال[1] سے جو فسادات کا سلسلہ جاری ہے اور جن میں' مسلمانوں کی جان، مال، عزت، آبرو، عصمت

فسادات

کچھ بھی محفوظ نہیں رہتی، ان کا حد و شمار ہی نہیں۔ سید بدرالدجیٰ، مغربی بنگال کے ایک مسلم راہنما ہیں۔ بہت پرانے کانگریسی۔ آزادی کی جنگ میں ہندوؤں کے چوٹی کے لیڈروں کے ہمراہ شانہ بشانہ لڑنے اور جیل جانے والے۔ (۱۹۶۸ء میں) وہ وہاں کی مرکزی پارلیمان کے رکن تھے۔ انہوں نے، ایک دفعہ پارلیمان کے بھرے اجلاس میں ایک طویل تقریر میں تفصیل سے بتایا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ آزادی کو حاصل کئے انیس سال ہو گئے ہیں۔ ان انیس سالوں میں' (مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے) پولیس کی بے امتیاز فائرنگ انگریزوں کی ڈیڑھ سو سالہ روایات کو پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ پورے ملک میں قتل و غارت گری' چھوٹی بڑی بغاوتیں' لوٹ مار کے دلدوز مناظر، ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام، بلا کسی امتیاز کے لاکھوں کی گرفتاری' آسام اور مغربی بنگال سے بے دخلیاں' اور اس قسم کے دوسرے ہزار ہا واقعات مسلمانوں سے موجودہ سیکولر حکومت

---

[1] اسے ذہن میں رکھئے کہ یہ خطاب پہلے ۱۹۶۸ء میں اور پھر مئی ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا تھا۔

کے "جانبدارانہ" سلوک کے ثبوت ہیں۔ انہوں نے اپنی تقریر میں انکشاف کیا کہ پاکستان اور بھارت کی جنگ کے دوران پچاس ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو پاکستان کا جاسوس قرار دے کر غداری کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ مغربی بنگال میں ۵۴ ہزار پاکستانی موجود تھے۔ ان میں سے دس ہزار نظربند کر لئے گئے جو مسلمان تھے۔ ہندوؤں کو پاکستانی ہونے کے باوجود کچھ نہیں کہا گیا۔ (طلوعِ اسلام۔ جولائی ۱۹۶۶ء)

واضح رہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی یہ حالت، ہندوؤں کی حکومت کے دس بیس سال بعد جا کر نہیں ہوئی تھی۔ اس کا آغاز تقسیم ہند کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ اس کی ایک خفیف سی جھلک طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت فروری ۱۹۴۹ء میں پیش کی گئی تھی۔ اس کے چند ایک اقتباسات درج ذیل ہیں:-

> میں مسٹر ..... کی تجویز سے اختلاف کرتا ہوں ..... ہندوستان سے ہندو اور مسلمان قسم کے الفاظ یکسر نابود کر دینے چاہئیں۔ یہ تفریق، ترقی کی راہ میں سنگِ گراں ہے۔ جونہی ہم نے محسوس کر لیا کہ ہم (فقط) "ہندوستانی" ہیں، موجودہ تصادم کی جگہ خوشحالی اور خیرسگالی آجائے گی۔
> (مسٹر ایم، ایس، ایچ قریشی کا خط جو ۳۰ نومبر ۱۹۴۸ء کے سٹیٹسمین میں شائع ہوا)

اس خط سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں پہ کیا گزر رہی تھی!

> یہاں کے مسلمان اگر انڈین یونین کے وفادار رہنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیئے کہ ہندی کو اپنائیں اور ہندوستان کی تہذیب اختیار کریں۔ اُن کے اپنے تمدن اور زبان کی اب ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

یہ صوبہ متحدہ کے صدرِ کانگریس اور صوبہ اسمبلی کے اسپیکر راج ٹنڈن جی نے اپنی لکھنؤ اور دہلی کی تقریروں میں بار بار فرمایا اور ایسا ہی فرماتے ہی رہتے ہیں۔ بھولے بھالے مسلمان اب جا کر سمجھے کہ اُن کا اطمینانِ قلب قبل از وقت تھا، جب وہ واقعۂ حیدرآباد کے بعد پنت جی وزیرِ اعظم یوپی کی زبان سے یہ سُن کر خوش ہو گئے تھے کہ "اب مسلمانوں سے وفاداری کے کسی مزید مطالبہ کی ضرورت نہیں"۔ ابھی تو اپنا تمدن چھوڑنے اور اپنی زبان ترک کرنے کے مطالبات باقی ہیں!

ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں

اور ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ ایسی تقریریں، گاندھی جی کے یومِ پیدائش کے موقع پر، عین ہندو مسلم اتحاد کے سلسلہ میں کی جاتی ہیں۔ (صدق۔ لکھنؤ ۳ دسمبر ۱۹۴۸ء)

معاصر الجمعیت دہلی کے صفحات میں ایک مراسلہ:-

> جیسا کہ اندیشہ تھا آخر وہ گھڑی آ کر ہی رہی اور کل راجستھان یونین کا حکم آ گیا کہ ٹونک کے محکمۂ شریعت کو ختم کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں اب تک انفرادی اور اجتماعی جو کوشش کی گئی تھی اور جمعیت العلمائے ہند نے بھی اس میں نمایاں حصہ لیا تھا افسوس وہ بے سود رہا۔ ان چھ ماہ میں تعطیلِ جمعہ اور اسلامی تعطیلات کی منسوخی، ذبیحہ گاؤ کی بندش اور بہت سے ملازموں کی برطرفی اور اردو کی جگہ ہندی کو مسلمان پورے صبر و سکون سے برداشت کرتے رہے۔ لیکن اب محکمۂ شریعت کے خاتمہ نے ان کو حد سے زیادہ روحانی تکلیف میں مبتلا کر دیا ہے۔

نئی دہلی۔ ۳۰ر دسمبر۔ آج دستوری اسمبلی میں جب حقوقِ مذہب زیرِ بحث تھے تو ایک ممبر مسٹر تجمل حسین نے یہ عجیب و غریب تجویز پیش کی کہ آئندہ سے اس ملک میں کوئی شخص نہ ایسا لباس پہنے، نہ ایسا نام رکھے نہ ایسی وضع قطع اختیار کرے جس سے اس کے مذہب کا پتہ چل سکے۔ (خبر)

بہ صرف اتنا کر لیجئے کہ اس تجویز کے اس "دو قومی نظریہ" کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے والی تجویز کے پیش کرنے والے کوئی غیر مسلم نہیں۔ ایک ہندی مسلمان، صوبہ بہار کے مسلمان ہی تھے! ...... خدا معلوم توجہ عالی صرف نام، وضع و لباس ہی تک کیوں رہی؟ کیوں نہ ارشاد ہو گیا کہ اپنے کو سرے سے کسی مذہب سے منسوب کرنے ہی کا شمار غداری میں ہوگا۔ (صدق۔ ۱۷ر دسمبر ۱۹۴۸ء)

ان مسلمانوں کو جن کے دماغ میں اب تک مسلم لیگی ذہنیت موجود ہے یہ چیلنج دینا چاہتا ہوں کہ آج ایک زبان اور ایک تہذیب کے خلاف جو کوششیں ہو رہی ہیں انہیں نہ تو ہم برداشت کریں گے اور نہ کامیاب ہونے دیں گے۔ مسلمان بھائی یا دوسرے لوگ اگر اس دیس میں رہنا چاہتے ہیں تو انہیں ہندی کو راشٹر بھاشا بنانا ہوگا۔ انگریز کے راج میں جو اختلاف تھا ہم اسے باقی نہیں رہنے دیں گے۔ لوگوں کو چاہیئے کہ پرانی باتوں کو بھول جائیں اور یہ محسوس کریں کہ انھیں نہ صرف اس دیس کی زبان بولنی ہوگی بلکہ جس طرح اس دیس کے لوگ رہتے ہیں اسی طرح رہنا ہوگا۔ متضاد اور مخالف تہذیبوں کے لئے ہمارے دیس میں اب کوئی جگہ نہیں۔

(مسٹر شکلا، وزیر اعظم سی۔ پی، بحوالہ ملاپ ۔ ۱۲ر دسمبر ۱۹۴۸ء)

یہ تمام اقتباسات طلوعِ اسلام بابت فروری ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئے تھے۔

یہ ہوگئی تھی ہندی مسلمانوں کی حالت تقسیم ہند کے فوری بعد۔

○

جہاں تک فسادات کا تعلق ہے، ان کی کیفیت بڑی دلدوز اور جگر سوز ہے۔ کلکتہ سے شائع ہونے والے اخبار (NOW) کی ۱۲ر جنوری ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں منجملہ دیگر امور کہا گیا تھا۔

تقسیم ہند کے بعد کم از کم پانچ سو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہیں جن میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد پچاس ہزار سے بھی زائد ہے۔ لیکن یہ تخمینہ بہت پرانا ہے اور نظر ثانی کا محتاج، یہ تمام فسادات سیکولرازم کے پردے میں ہوئے ہیں اور یہ سیکولرازم اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس برہمن ذہنیت کی حفاظت کی جائے جس کی نمائندگی جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس جیسی فاشسٹ جماعتیں کر رہی ہیں۔ ظاہر میں جن سنگھ فسادات کراتی ہے لیکن پسِ پردہ اس کو کانگریس کی پوری تائید حاصل ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں مسٹر نراد۔ سی۔ چودھری لکھتا ہے کہ "واقعہ یہ ہے کہ ہندو روایت جس قدر متشدد آج ہے، اتنی آزادی کے وقت نہ تھی۔ اور جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے، اس میں مسلمانوں کے بارے میں، اور بھی زیادہ شدت آرہی ہے۔"

(بحوالہ ایشیا ۔ ۲۱ر جولائی ۱۹۶۸ء)

۱۹۶۸ء میں بھارت کے وزیر داخلہ نے اپنی رپورٹ میں تسلیم کیا تھا کہ ملک کے مختلف حصوں میں جو فسادات ہوئے ہیں' ان کی تعداد ۱۹۶۶ء میں (۱۳۳) اور ۱۹۶۷ء میں (۲۶۷) تھی۔ ۱۹۶۸ء میں جو اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال کے صرف چار ماہ میں مسلمانوں کے خلاف (۱۰۳) فسادات ہو چکے ہیں۔ خونریزی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ۱۹۶۵-۶۶ء تک مقتولین کی تعداد کا جو اوسط تھا ۱۹۶۷ء کے صرف پہلے ۹ ماہ میں مقتولین کی تعداد اس سے دگنی ہو چکی تھی۔ (بحوالہ ایشیا۔ ۲۱ جولائی ۱۹۶۸ء)

فسادات کی لرزہ انگیز تفصیلات

اوائل ۱۹۷۱ء میں راولپنڈی سے شائع ہونے والے' ہفتہ وار جریدہ **ھلال** میں' ایک صاحب' این۔ بی۔ نقوی کا ایک مبسوط مقالہ متعدد اقساط میں شائع ہوا تھا جس میں ان خون ریزیوں اور فساد انگیزیوں کی الم انگیز داستانیں تفصیل سے بیان کی گئی تھیں جو تقسیم ہند کے بعد' ہندوستان کے مسلمانوں کے خلاف برپا ہوئیں۔ (یہ مضمون ایک انگریزی پمفلٹ کا ترجمہ تھا جسے معارف لمیٹڈ کراچی نے شائع کیا تھا) ہم اس حقیقت کشا مقالہ کے جستہ جستہ مقامات' درج ذیل کرتے ہیں:-

(۱) "بھارتی لوک سبھا کے ایک رکن اسحاق سنبھلی کے مطابق ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۶۶ء کے آخر تک بھارت میں ساڑھے سات ہزار مسلم کش فسادات ہوئے۔ یعنی بھارت نے اپنی آزادی ہی کے دن سے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل کر اپنی 'آزادی' کی ابتداء کی تھی۔ بھارت کی وزارتِ داخلہ کی ایک سالانہ رپورٹ کے مطابق ۱۹۶۵ء میں ملک بھر میں تین سو چھیالیس فسادات ہوئے۔ ۱۹۶۶ء میں یہ تعداد بڑھ کر پانچ سو تک پہنچ گئی۔ ہزارہا مسلمان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اس خونِ ناحق پر ایک ممتاز بھارتی مبصر ایس مل گاؤنکر یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ" اس سال فرقہ وارانہ کشمکش کے سیاہ ترین بارہ ماہ گزرے۔" مسلم کش فسادات کی رفتار یہ ہے کہ لوک سبھا کے ایک ممبر جیوتر موئی باسو کے مطابق ہر تین گھنٹے بعد بھارت میں ایک فرقہ وارانہ فساد رونما ہوتا تھا۔

حالیہ برسوں میں بھارت کے بڑے بڑے شہروں میں ہونے والے فسادات کا ماحصل مسلمانوں کو قتل کرنے کے علاوہ اُن کے مال اسباب کا لوٹنا اور ان کی جائیدادوں کو آگ لگانا رہا ہے۔ اب ہر سن اور ہر شہر کی مثالیں گنتے چلئے:- جبل پور (۱۹۶۱ء) کلکتہ' جمشید پور اور راوڑکیلا (۱۹۶۴ء) رانچی اور سرسند (۱۹۶۷ء) اندور اور احمد آباد (۱۹۶۹ء) اور بھوانڈی اور مہاراشٹر کا پورا صوبہ (۱۹۷۰ء)۔ تشدد کے ان تمام واقعات کی بنیادی بات یہی رہی کہ ــــ خونِ مسلم کی ارزانی ہوئی۔ اُن کا مال و اسباب لوٹا گیا ــــ اور ان کی جائیدادوں کو آگ لگا کر تباہ کیا گیا ــــ اور دوسری خاص بات یہ ہے کہ بھارت کا قانون حسبِ دستور اندھا بنا رہا۔ اس نے کسی ہندو مجرم کو بیڑیاں پہنا کر دار و رسن تک نہ پہنچایا۔"

(۲) "ہندوستان ٹائمز" کا نامہ نگار سبرتا بینرجی فسادات کی مجموعی صورتِ حال کے بارے میں یکم نومبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں لکھتا ہے: "ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے' میں حیران ہوں کہ لوگوں کا وہ محدود طبقہ جو نسلی فسادات کے خلاف ہے' اس سے تجاہلِ عارفانہ سے کام کیوں لے رہا ہے۔ میں احمد آباد سے یہ تاثر لے کر لوٹا

ہوں کہ وہاں جو کچھ ہوا ہے اس کا مقابلہ بآسانی ہٹلر کے جرمنی کے ان منصوبوں سے ہو سکتا ہے جو یہودیوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے تیار کئے گئے تھے۔ یا امریکہ کے انتہائی جنوبی علاقے میں جن طریقوں سے سیاہ فام لوگوں کو ختم کیا جا رہا ہے۔"

بھارتی ہندو، مسلم کش فساد کی تیاری کس طرح کرتے ہیں اور مسلمانوں کے قتلِ عام اور لوٹ مار کے منصوبے پر کس طرح عملدرآمد کرتے ہیں، اس کا جواب ذیل کے اقتباس سے مل جائے گا جو نئی دہلی سے شائع ہونے والے انگریزی ہفت روزہ "لنک" کے ۳۱ مارچ ۱۹۶۹ء کے شمارے میں چھپنے والے ایک مضمون سے لیا گیا ہے۔

"مسلمانوں کے قتلِ عام کا ایک اور قابلِ ذکر پہلو بھی ہے۔ امرت ناتھ نے جسے حکمران جماعت کانگریس نے تحقیق و تفتیش کے لئے مقرر کیا تھا، الٰہ آباد کے واقعات کے بارے میں اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ چاقوزنی کی وارداتیں اس وقت شروع ہوئیں جب افواہوں کے زور سے پھیلنے والا لوگوں کا پاگل پن ٹھنڈا پڑ چکا تھا چنانچہ بیس آدمی جن پر چاقو سے حملہ کیا گیا وہ تمام نہ صرف مسلمان تھے بلکہ سوائے ایک دو کے ان سب کو کسی ایک خفیہ شخص لے اپنا نشانہ بنایا تھا۔ ہر مضروب کے معدے میں اس طرح چاقو گھونپا گیا تھا کہ یا تو اس کی نوک پھیپھڑوں تک یا دل تک پہنچ جائے۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس طرح کی چاقوزنی باقاعدہ تربیت یافتہ آدمیوں ہی کا کام تھا۔ رانچی، میرٹھ اور کلکتہ میں ہونے والی وارداتوں سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔"

(۳) "ہندوستان ٹائمز" کے نامہ نگار سبرتا بینرجی نے رانچی، رڑکیلا، ناگپور، جبل پور، اندور، اورنگ آباد، احمد آباد کے علاوہ جگا دل (نزد کلکتہ) کے حالیہ فسادات کے بارے میں اپنی ایک رپورٹ میں لکھا:-

منظم طریق

"ہر جگہ فسادات کا انداز ایک ہی رہا۔ لیکن بہانہ یہ نہیں تھا کہ ایسے ہی فسادات پاکستان میں بھی ہوئے ہیں بلکہ ہر مرتبہ بات کا بتنگڑ بنا کر قتل و غارت گری، آتشزنی اور لوٹ مار کی داستانیں دہرائی گئیں اور اس سلسلے میں سوچی سمجھی سکیموں اور منظم طریقوں پر عمل کیا گیا۔"

"بظاہر اتفاقیہ" واقعات جن کے متعلق خیال یہ ہے کہ ان کی وجہ سے احمد آباد میں فسادات کی آگ بھڑکی تھی، سبرتا بینرجی نے اُن کے پسِ منظر سے پردہ اٹھایا اور اپنی رپورٹ میں لکھا ہے:-

"اس قسم کے واقعات یہاں ہر سال ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ فساد کی وجہ یہ تھی کہ ہندوؤں کے ایک مندر سے کچھ ڈھور ڈنگر نکل کر مسلمانوں کے ایک عرس کی تقریب میں جا گھسے۔ اس واقعہ کے فوراً بعد مبینہ طور پر تین سو آدمیوں کے ایک ہجوم نے جگن ناتھ مندر پر گیس کے بلبوں سے حملہ کر دیا۔ لیکن جب میں مندر دیکھنے گیا تو میرے تعجب کی حد نہ رہی۔ مندر کے صدر دروازے کے صرف تین شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ لیکن ان شیشوں کے پیچھے جو بُت نصب تھے انہیں خراش تک نہ آئی تھی۔ تین سو افراد جو گیس کے بلبوں سے مسلح ہوں کچھ نہ کچھ نقصان تو کر ہی سکتے ہیں۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس بات کا سراغ نہیں ملتا کہ وہ تین سو حملہ آور مسلمان تھے یا کون تھے ____ دوسری بات یہ ہے کہ مندر پر مبینہ حملے کے فوراً بعد وہاں سے چھ میل کے فاصلے پر ایک مسلمان دھوبی کی دکان پر حملہ ہوا اور دکان تباہ کر دی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مندر پر

حملے کی خبر بہت ہی تیزی کے ساتھ پھیلی۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جگن ناتھ مندر کے ساتھ والی بستی میں تشدّد کا ایک بھی واقعہ نہ ہوا۔ وہاں ہندو اور مسلمان فسادات کے پورے عرصے کے دوران پُرامن طور پر رہتے رہے۔"

اب سُبرتا بنرجی ہی کی زبانی فسادات کی نوعیت کے بارے میں بھی سُن لیجئے۔ وہ آگے چل کر لکھتا ہے :۔

"کہا یہ جاتا ہے کہ جگن ناتھ مندر کے واقعہ سے لوگوں کے ذہن مشتعل ہوئے اور پھر وہی کچھ ہوا جو ایک ہجوم کی دیوانگی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک مشتعل ہجوم کی یہ نام نہاد دیوانگی ایک مخصوص اور منظم طریقے سے ظاہر ہوئی۔ مسلمانوں کے گھروں کا پتہ لگانے کے لئے انتخابی فہرستیں استعمال کی گئیں۔ اور پھر ان کے گھروں پر حملہ کرنے کے لئے وہاں مخصوص نشان لگا دیئے گئے۔ جب مسلمان دکانداروں پر حملہ کیا گیا تو اس بات کا خیال رکھا گیا کہ اگر دکان کسی ہندو کی ملکیت ہے تو پھر صرف سامان لوٹا گیا، عمارت کو بالکل نہیں چھیڑا گیا۔ لیکن اگر دکان کسی مسلمان کی ملکیت تھی اور دکاندار ہندو تھا، تو اس صورت میں دکاندار اور اس کے مال و اسباب کو ہاتھ تک نہیں لگایا گیا لیکن عمارت تباہ کر دی گئی —— یہ تھا ایک مشتعل ہجوم کا پاگل پن !

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ احمد آباد کے مشتعل ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملوں کے دوران جو ابتدائی قسم کی فوجی چالیں اور حربی طریقے اپنائے تو انہوں نے لاشعوری طور پر ایسا کیا۔ لیکن یہ بھی ایک بے بنیاد بات ہے۔ ایسے لوگ جو فوجی تربیت سے کوسوں دور ہوں، بلا سوچے سمجھے فوجی چالیں کیسے اپنا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے قدم قدم پر بڑی عمدہ تنظیم اور تیز فہمی کا بھی ثبوت دیا۔

مسلمانوں کو احتیاط سے تلاش کرنے کے دوران ہندوؤں نے مشہور و معروف لوگوں پر خاص طور پر توجہ دی جن کے متعلق یہ خیال تک نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ فرقہ پرست یا غدار ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر جناب غلام رسول قریشی پر متواتر حملوں کی کیا وجہ بیان کی جا سکتی ہے ؟

مشتعل ہندوؤں نے قتل و غارت گری کے جو طریقے اختیار کئے، ان کے بارے میں سُبرتا بنرجی لکھتا ہے :۔

"یہ بھی ایک خاص بات ہے کہ مشتعل ہجوم نے اپنی دیوانگی کے باوجود اتنی سمجھداری سے کام لیا کہ اس نے کچھ صنعتی ادارے جو مسلمانوں کی ملکیت تھے، تباہ کر دیئے۔ چنانچہ یہ یقین کر لینا کہ یہ فسادات ایک عام دیوانگی کا "بے ساختہ" نتیجہ تھے، سراسر غلط ہوگا۔ پہلے سے کی گئی منصوبہ بندی، تربیت اور تنظیم کے بغیر یہ سب کام اور اتنے وسیع پیمانے پر کئے نہیں جا سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ احمد آباد کا پورا شہر مسلح ہندو فرقہ پرست جتھوں اغلباً راشٹریہ سیوک سنگھیوں کے ہاتھوں میں کئی روز تک رہا۔ اس سلسلے میں خاص بات یہ ہے کہ نہایت منظم اور باقاعدہ طریقے سے افواہیں پھیلائی گئیں۔ بلکہ یہ کام فسادات کے بعد بھی جاری رہا۔ معمولی واقعات کو اس طرح ہوا دی گئی کہ یہ ظاہر ہو سکے کہ مسلمان لڑنے مرنے پر آمادہ ہیں۔ احمد آباد میں یہ افواہ زوروں پر تھی کہ نوراتری کے تہوار کے موقع پر مسلمانوں نے ہندوؤں کے قتلِ عام کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس بات کو سچا ثابت کرنے کے لئے اجمیر شریف کے عرس سے واپس آنے والے مسلمانوں کے ایک گروہ کو احمد آباد میں ٹرین سے اتار لیا گیا۔ اور ہندو فرقہ پرستوں نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے مسلمانوں کی سازش کو بے نقاب کر کے ناکام بنا دیا ہے۔"

فسادات کے پسِ پردہ تنظیم اور منصوبہ بندی کے بارے میں دہلی سے شائع ہونے والے انگریزی ہفت

مین سٹریم (MAIN STREAM) نے اپنی ۴ر اکتوبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں لکھا :-

" احمد آباد کے ہنگاموں کے طریقوں سے اس امر کی تصدیق ہوجاتی ہے۔ اس سے پہلے کے فسادات کا اگر بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ایسے طریقے استعمال کئے جاتے تھے کہ کشیدگی بڑھے۔ اقلیتی فرقے کو پہلے وار کرنے پر اکسایا جائے۔ فسادات میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ملوث کیا جائے۔ فسادیوں کے نزدیک یہ طریقہ وار کرنے کے سامنے سا تھ دفاع کا بھی ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ ہجوم جب منتشر ہوجاتا ہے تو فسادی لوگ وسیع علاقے میں چاقو زنی کی وارداتیں کرتے ہیں اور انفرادی میں ان کی یہ حرکت ظاہر نہیں ہونے پاتی۔ انہیں چاقو زنی کی خاص تربیت ملی ہوتی ہے۔ زخموں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وار اس طرح کئے گئے کہ زخم کھاکر مجروح بچنے نہ پائے۔ احمد آباد میں جو کشیدگی پائی جاتی ہے اس کے بڑھنے اور پھیلنے میں دو سال کا عرصہ لگا اور اس عرصے کے دوران پورے صوبہ گجرات میں بے شمار فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ مسجد الاقصیٰ پر اسرائیلیوں کی دراز دستی کے خلاف احمد آباد کے مسلمانوں نے جب احتجاجی جلوس نکالا تو یہ کشیدگی پھیلنے کا ایک اور بہانہ بنا۔ اس طرح کہ ایک چھوٹا سا واقعہ رونما ہوا اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے ایک گروہ اور چند سادھوؤں کے درمیان ایک جھڑپ ہوگئی۔ بس اسی بات کو پورے احمد آباد شہر میں فساد کی آگ لگانے کے لئے کافی بنا لیا گیا۔ شہر کے مہذب علاقے بھی نہیں چھوڑے گئے مسلمانوں کے مکانوں کی پوری کی پوری قطاریں جلادی گئیں۔ اور چاقو زنی کی بجائے سفاک فرقہ پرستوں نے یہ کیا کہ جلتے ہوئے مکانوں میں سے جو کوئی بھی جان بچانے کی خاطر بھاگ کر باہر آتا تو اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اُسے آگ میں دوبارہ ڈال دیا جاتا۔ اسی طرح اِکا دُکا لوگوں کو چاقو مارنے کی بجائے ایک ہی دفعہ سب کو آگ میں زندہ جلا دینے کا طریقہ اختیار کیا گیا "۔

(۴) ان فسادات سے قبل، ان کے دوران اور ان کے بعد مقامی حکام نے جو کردار ادا کیا، اس کی داستان

حکام کا کردار

بہت افسوسناک ہے۔ اس سلسلے میں احمد آباد کے فسادات کی مثال دی جاتی ہے۔ وہاں کے فسادات کے دوران پولیس نے جو کردار ادا کیا، اُس کے بارے میں سُبترا بینرجی نے اپنی رپورٹ میں لکھا :-

" فساد زدہ علاقوں کے دورے کے دوران میں نے سوگز کے فاصلے پر ایک مسجد دیکھی اور وہیں سے ایک تھانہ بھی صاف نظر آرہا تھا۔ مسجد تباہ ہوچکی تھی۔ پولیس کے رویّے کے بارے میں مجھے مختلف داستانیں سنائی گئیں کہ کس طرح اس نے مسلمانوں کو پناہ دینے والے لوگوں کو مار پیٹا۔ یہ کوئی نرالی بات نہ تھی کیونکہ پہلے بھی فرقہ وارانہ فسادات میں پولیس ملوث رہ چکی ہے اور آج بھی مسلح پولیس اور سیکورٹی فورس کے لوگ جگن ناتھ مندر میں روزانہ آتے جاتے ہیں۔ وہاں بیٹھے ہوئے سادھو انہیں فسادات کی انتہائی مبالغہ آمیز داستانیں سناتے ہیں۔ چنانچہ اُن سے فرض کی ادائیگی اور مسلمانوں کے تحفظ کی توقع ہی فضول ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ مندر کو پولیس اور سیکورٹی فورس والوں کے لئے خارج از حدود (آؤٹ آف باؤنڈ) قرار دیا جائے "۔

اگر نام نہاد فرقہ وارانہ فسادات کو منظم قتل و غارت گری کہا جائے تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انتظامیہ اور بالخصوص پولیس اس دوران کیا کردار سرانجام دیتی ہے۔ مقامی حکام کے رویّے کے بارے میں دہلی سے شائع

ہونے والے انگریزی ہفت روزہ لنک (LINK) نے اپنی ۳۱ مارچ ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں لکھا :-

" جب فسادات رونما ہوتے ہیں تو انتظامیہ سے متعلق افراد عموماً یہ کرتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک یکساں تعداد کو حالات و واقعات سے منہ موڑ کر گرفتار کر لیتے ہیں تاکہ دونوں فرقے برابر کے شریک سمجھے جائیں۔ کس نے کس پر حملہ کیا، کس نے کس کو قتل کیا یا لوٹا، اس سے انہیں کوئی غرض نہیں ہوتی ——— یہی کچھ الٰہ آباد میں بھی ہوا ———!"

پارلیمنٹ کے ایک کانگرسی رکن امرت ناتھ نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو اپنی رپورٹ میں لکھا :-

" وہ ہندو جو ہولی کے موقع پر ضلع کے دور دراز علاقوں میں غیر فرقہ وارانہ فسادات کے دوران زخمی ہوئے انہیں بھی اُن مسلمانوں کے ساتھ ہسپتال میں داخل کر دیا گیا جنہیں شہر میں ہونے والے فسادات کے دوران چاقو مار کر زخمی کر دیا گیا تھا۔ ہندو اور مسلمان زخمیوں کو ساتھ ساتھ رکھنے کا مقصد یہ غلط تاثر پیدا کرنا تھا کہ دونوں فرقوں کا نقصان برابر رہا ———"

کسی پر مقدمہ نہیں چلایا گیا

(۵) مختلف فرقہ وارانہ فسادات کے حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے پس منظر میں کوئی ہمہ گیر پاگل پن نہ تھا، اور نہ عام لوگوں کا اُن میں ہاتھ تھا بلکہ یہ چھوٹے چھوٹے مگر منظم گروہوں کی کارستانی تھی لیکن ان کا پتہ لگا کر انہیں بے اثر بنایا جا سکتا تھا۔ انہی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ہفت روزہ "لنک" نے اپنی رپورٹ میں لکھا :-

"لیکن حکام ان گروہوں کا پتہ لگانے میں ناکام رہے۔ آزادی کے بعد بیس برس کے عرصے میں جتنے فسادات ہوئے ان میں قتل و غارت گری کے الزام میں ایک بار بھی کسی بھی شخص کو گرفتار کر کے مقدمہ نہیں چلایا گیا، نہ سزائے موت دی گئی، نہ عمر قید سنائی گئی"۔

اس رسالے نے پولیس اور حکام کی جانبداری کی مثالیں دیتے ہوئے آگے چل کر پارلیمنٹ کے کانگرسی ممبر امرت ناتھ کی اس رپورٹ کا ایک حوالہ دیا ہے جو اس نے الٰہ آباد کے فسادات کے بارے میں لکھی تھی :-

" ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے انہیں (پارلیمنٹ کے ممبروں کو) بتایا کہ ہلاک ہونے والے افراد میں سے دو مسلمان تھے۔ لیکن جب ممبروں نے مرنے والے غیر مسلم کا نام دریافت کیا تو اس موقع پر جتنے بھی پولیس افسر موجود تھے، سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے اور سرگوشیاں شروع کر دیں بالآخر ہمیں بتایا کہ وہ نام سے ناواقف ہیں۔ صاف ظاہر تھا کہ ہندو کی موت کی کہانی من گھڑت تھی ———"

اعداد و شمار

(۶) ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۶۰ء تک فسادات کی تعداد بتدریج کم ہوتی رہی۔ لیکن بعد کے برسوں میں یہ آگ پھر بھڑکنے لگی۔ مرنے والوں کی تعداد، تباہ ہونے والی جائدادوں کی مالیت اور جن طریقوں سے مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا، اگر ان سب باتوں کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ تشدد کے واقعات کی نہ صرف شدت بلکہ پھیلاؤ میں بھی بہت اضافہ ہوا۔ صرف ۱۹۶۵ء میں جب کہ بھارت اور پاکستان کی جنگ ہوئی، مسلم کش فسادات میں خاص کمی پیدا ہوئی۔ اس کی وجوہات اور تھیں۔ ۱۹۶۴ء میں فسادات اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ اس سال تشدد کے

ایک ہزار ایک سو ستر واقعات ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں یہ تعداد کم ہو کر چھ سو چھتر رہ گئی۔ ۱۹۶۶ء میں اگرچہ فسادات کے واقعات کی تعداد ایک سو چوالیس تھی لیکن اپنی ہلاکت خیزی اور شدت کے اعتبار سے یہ واقعات بہت بڑے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں گڑبڑ کے دو سو بیس واقعات ہوئے اور ان میں کشت وخون کے جہاں اور واقعات شامل ہیں وہیں رانچی کا وہ فساد بھی ہے جس کی خون آشامی نے ساری دنیا کو چونکا دیا تھا۔ ۱۹۶۸ء میں مار دھاڑ کے تین سو چھیالیس واقعات ہوئے۔ میرٹھ، رانی گنج، اندور، کلکتہ، الٰہ آباد اور جبل پور میں ہونے والی قتل وغارت گری اسی سال کے دوران ہوئی۔ یہ سلسلہ جب ۱۹۶۹ء تک پہنچا تو اس کے واقعات کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو سکی۔ تاہم اس کے نو ماہ میں دو سو دس بار مسلمانوں کی خونریزی ہوئی۔ احمد آباد کی وہ خونریزی بھی اس میں شامل ہے جس میں بلا مبالغہ ہزارہا مسلمان ذبح کئے گئے۔

یہ تو تھی واقعات کی گنتی اور شماری۔ اب ذرا یہ بھی دیکھ لیجئے کہ کتنے بے گناہ انسان ان واقعات کی بھینٹ چڑھے۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۲ء تک نو سال کے عرصے میں اہمسا پرستوں نے تین سو سولہ بے خطا انسانوں کی جان لی۔ صرف ۱۹۶۷ء میں تقریباً تین سو افراد فرقہ وارانہ فسادات کی نذر ہو گئے۔ ۱۹۶۸ء بھی اپنی خون آشامی کے لئے کچھ کم نہ تھا۔ اس کے پہلے چھ ماہ کے دوران ہی تقریباً تین سو بے گناہوں کا خون اہمسا پرستوں کے تعصب کی بھینٹ چڑھا۔ اگلے چھ ماہ کی داستان تو اور بھی درد انگیز اور خون سے رنگین ہے۔

(۷) محولہ بالا مقالہ میں اس قسم کے فسادات کی ابھی بہت سی تفاصیل باقی ہیں جن کے درج کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ لیکن احمد آباد کے فساد کی تفصیل اس قدر درد انگیز اور حیا سوز ہے کہ اسے سامنے لائے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس میں لکھا ہے کہ

احمد آباد کا فساد

"ہندوستان ٹائمز" کے نامہ نگار اجیت بھٹا چارجی کی ایک رپورٹ ۵ راکتوبر ۱۹۶۹ء کو شائع ہوئی۔ اس میں اس نے لکھا:۔

شہر کی کچھ بستیاں اس طرح ہموار ہو گئیں جیسے بیک وقت آگ اور طوفان کی لپیٹ میں آ گئی ہوں۔ عیدگاہ کی بستی میں ایک لمبے چوڑے تکونے علاقے میں جو کچھ بچا وہ یہ تھا: ایک دیوار کا کچھ حصہ، سیاہ اور مڑی تڑی لوہے کی چادریں، کچھ کاٹھ کباڑ اور راکھ کے ڈھیر۔ ایک جگہ بجھتے ہوئے چنوں کا ڈھیر لگا تھا اور اس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ قریب کے چند دکانداروں نے مجھے بتایا کہ وہاں چنے کی دکان تھی جو ایک مسلمان کی ملکیت تھی۔ کچھ شرپسندوں نے اسے آگ لگا دی اور جلد ہی شعلے لکڑی کے گوداموں تک پھیل گئے جو ہندوؤں کے تھے۔ اس وقت فساد عروج پر تھا۔ چنانچہ آگ بجھانے کی اپیل پر نہ تو پولیس نے کان دھرے اور نہ ہی فائر بریگیڈ نے کوئی عملی قدم اٹھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورا بلاک جل کر ختم ہو گیا۔

درمیانے درجے کے مکانوں کی ہر قطار جل کر تباہ ہو گئی۔ ہر مکان کے دروازے اور کھڑکیاں جل گئی تھیں بجلی کی اشیاء اکھڑ لی گئی تھیں۔ ہر گھر کا فرنیچر اور سامان یا تو توڑ دیا گیا تھا یا جلا دیا گیا تھا۔ سڑک پر جلی ہوئی چیزوں کے ڈھیر میں ایک جلے ہوئے رکشا کا ڈھانچہ صاف پہچانا جا رہا تھا۔ میرے ساتھ ایک رہبر تھا۔ اس نے فساد کے دوران بہت سے مسلمانوں کو پناہ دی تھی۔ اس نے ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہاں شرپسندوں

کے ہجوم نے ایک مسلمان کو زندہ جلا دیا تھا۔ پھر اس نے اپنے کاندھے پر مجھے ایک نیلا نشان دکھایا جو لاٹھی کی ضرب لگنے سے پڑ گیا تھا۔ یہ چوٹ ایک مسلمان بچی کو فسادیوں کے ہاتھوں بچانے کا صلہ تھا۔"

فساد کے دوران کس قدر جانیں ہلاک ہوئیں، اس کے بارے میں اجیت بھٹاچارجی کا خیال ہے کہ اصل تعداد کا پتہ چل ہی نہیں سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹے، ان میں سے اکثر تو مر گئے اور کچھ لوگ بھاگ گئے۔ بہت سی لاشیں موقع پر جلا دی گئیں۔ ایک اور بڑا مسئلہ جو صوبائی حکومت کو درپیش ہے وہ یہ ہے کہ جن مسلمان خاندانوں کے کمانے والے فساد کی آگ کی نذر ہو چکے ہیں، انہیں اگر امداد مہیا کی جائے تو مرنے والوں کی تعداد اس طرح خود بخود متعین ہو جائے گی جب کہ حکومت کسی لاش یا کسی اور قانونی ثبوت کے بغیر ایسا نہیں چاہتی۔

تاہم مقامی حکام نے یہ تسلیم کیا کہ ڈیڑھ سو کے لگ بھگ افراد فساد کے دوران جان بحق ہوئے۔ بعد میں جب مرکزی حکومت کے وزیر داخلہ مسٹر چاون نے شہر کے فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا تو انہوں نے اندازہ لگایا کہ مرنے والوں کی تعداد ساڑھے تین سو سے لے کر چار سو تک ہوگی۔ لیکن اخبارات نے اس سے بھی بڑی تعداد کی خبریں شائع کیں۔ برطانیہ کے کچھ اخبارات نے لکھا کہ احمد آباد میں ایک ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ اس پر بھارتی اخبارات یہ تعداد ہزاروں میں بتانے لگے۔ حتیٰ کہ بھارت کے بائیں بازو کے ایک کثیر الاشاعت ہفت روزہ "بلیٹز" نے اس رپورٹ کے کچھ حصے شائع کر دیئے جو بھارت کی قومی اتحاد کونسل کے ممبر پروفیسر سنتیما رائے نے وزیر اعظم اندرا گاندھی کو ارسال کی تھی۔

اخبار مذکور نے پروفیسر رائے کے حوالے سے لکھا ہے کہ انہوں نے ایک محتاط اندازے کے مطابق مرنے والوں کی تعداد چار ہزار لکھی ہے۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں ہفت روزہ "بلیٹز" نے لکھا:-

"پروفیسر رائے کا کہنا ہے کہ صرف ہسپتال کی رپورٹوں ہی کے مطابق ۱۲ سے ۲۱ ستمبر تک دو ہزار اڑتالیس لاشیں سول ہسپتال لائی گئیں۔ اس تاریخ کے بعد لاشوں کو ڈھڈلیشوار کے قبرستان میں لے جایا گیا۔ وہاں انہیں بڑے بڑے گڑھوں میں ڈال کر مٹی سے ڈھانپ دیا گیا۔ جائدادوں کے نقصان کے بارے میں مختلف اداروں کے اندازے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ گجراتی جریدے نے اس نقصان کا اندازہ پینتیس کروڑ کا لگایا ہے لیکن پروفیسر رائے کے مطابق اصل نقصان پچاس کروڑ روپے سے بھی اوپر ہوا۔"

احمد آباد میں مسلمان مردوں اور عورتوں پر جو ہولناک ظلم و تعدی ہوا، پروفیسر سنتیما رائے اس کے چند نمونے قلم بند کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انہیں پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کس قدر وحشی اور ذلیل ہو سکتا ہے۔ پروفیسر کی رپورٹ کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:-

"ایک زخمی عورت نے جسے ہسپتال میں داخل کیا گیا، بیان دیا کہ جمعہ کی رات قتل و غارت گری کی رات تھی۔ نو بجے سے بلوائیوں نے کئی کئی سو کے جتھوں میں اکٹھے ہو کر حملے شروع کر دیئے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔ فسادیوں نے سب سے پہلے ہمیں ہمارے گھروں سے باہر گھسیٹا۔ اس کے بعد ہمارے گھر کی تمام اشیاء کو جلا دیا گیا، ہمارے مردوں اور بچوں کی لاشوں کے ٹکڑے کئے گئے اور انہیں آگ میں ڈال دیا گیا۔

بلوائی شراب کے نشے میں تھے۔ انہوں نے ہم پر مجرمانہ حملے کئے۔ کئی عورتوں کو قتل کر دیا۔ کچھ عورتوں کی تلواروں سے چھاتیاں کاٹ دیں۔ پھر وہ ہمیں بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے وہاں سے لے گئے۔ ہم سب کو ننگا کر دیا۔ کچھ غنڈوں نے ہماری شرمگاہوں پر تیز دھار تلواریں چلائیں۔ ہم روئیں، چیخیں اور ان غنڈوں سے رحم کی بھیک مانگی اور کہا کہ ہمیں مار دو، ٹکڑے کر دو، لیکن ہمیں بے عزت نہ کرو۔ لیکن ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ ہمیں ایک خالی مکان میں لے گئے اور وہاں ہم پر مجرمانہ حملے کئے۔ اس کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو خود کو ہسپتال (سول ہسپتال احمد آباد) میں پایا۔ یہاں مجھے یہ دھمکی دی گئی کہ اگر میں نے کسی کو کچھ بتانے کی کوشش کی تو مجھے ہسپتال سے نکال دیا جائیگا۔

ایک اور عورت نے بھی اسی قسم کا بیان دیا۔ اس کی داستان یوں ہے: ہمارے کچھ مرد تو بلوائیوں سے لڑتے ہوئے مارے گئے اور کچھ بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ تقریباً تین یا چار سو کے ایک گروہ نے مجھے پکڑ لیا۔ انہوں نے مجھے گھر سے باہر گھسیٹ کر ننگا کر دیا اور مجھ پر مجرمانہ حملے کئے۔ صبح سے پہلے ان میں سے کسی نے میری چھاتیاں کاٹ دیں اور میرے ہاتھ پیر باندھ کر لٹا دیا۔ اس کے بعد میرے گال کاٹ دیئے۔ پھر ایک آدمی نے میری پیشاب گاہ پر ایسڈ ڈال دی۔ میں روئی، چیخی، حتیٰ کہ میں بے ہوش ہو گئی۔ اور جب آنکھ کھلی تو میں سول ہسپتال میں تھی"۔

بھوانڈی میں

(۸) "بھوانڈی میں ۷ مئی کو فساد شروع ہوئے اور پھر یہ آگ دوسرے شہروں کنیھری، کولابہ، مہاد، مائراں، جلگاؤں، کولیاں، دیماوالی، دیلبر اور تھانہ تک پھیلتی چلی گئی۔ یہ تمام شہر بھوانڈی سے دو سو چالیس میل سے لے کر چار سو میل دور تک واقع ہیں۔ لیکن ان سب مقامات پر فسادات کا ایک وقت شروع ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ ایک سوچی سمجھی سکیم تھی اور اکثریتی فرقے کے لوگوں کا "وقتی اُبال" نہ تھا۔

بجلی کاٹ کر سارے شہر میں اندھیرا کر دینے کے بعد بھالوں، مالوٹوف، کاک ٹیل، پٹرول، آگ کے گولوں اور تیروں کا استعمال بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ ظلم کے ہاتھ کس قدر منظم اور ان کی جنبش کتنی ہم آہنگ تھی اور نمایاں بات یہ ہے کہ یہ عرنی ڈرامے کرفیو کے اوقات کے دوران ہوئے جبکہ پولیس اور فوج کے دستے بھی گشت پر ہوتے ہیں۔

کچھ سرکاری اور نیم سرکاری اعداد و شمار کے مطابق جو اگرچہ درست نہیں ہوتے' اموات کی علاقہ وار تفصیل یہ ہے:۔ بھوانڈی میں ترلیسٹھ، جلگاؤں میں بیالیس' اور تھانہ میں چار۔ ۱۲ مئی تک زخمی ہونے والوں کا سرکاری تخمینہ تین سو انتیس کا ہے۔

یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا کے مطابق دو کروڑ روپے کی جائداد تباہ ہوئی۔ تقریباً دو سو کرگھے، پچاس دکانیں اور اتنے ہی مکان' ان کے علاوہ کئی کارخانے جلا کر راکھ کر دیئے گئے۔ بنارس کی ریشمی ساڑھیاں تیار کرنے کا ایک مرکز بھی تباہ ہو گیا"۔

نئی دہلی سے شائع ہونے والے جریدے "مین سٹریم" نے متاثرہ علاقوں کے سروے کے بعد ایک رپورٹ شائع کی جس میں یہ انکشاف ہوا کہ شہر کی ایک لاکھ چالیس ہزار کی آبادی میں سے تقریباً چالیس ہزار بے گھر ہوئے۔

چالیس ہزار برقی کھڈیوں میں سے آٹھ ہزار جلا دی گئیں جس سے کوئی دس ہزار افراد بے روزگار ہو گئے۔ تقریباً سوا سو افراد مارے گئے اور دو ہزار کے قریب زخمی ہوئے۔

ایک المناک واقعہ یہ ہوا کہ جوشی پورہ میں شرپسندوں نے تیئیس افراد پر مشتمل ایک برات کو مکان میں مقفل کر دیا اور اس کے بعد آگ لگا دی۔ سب کے سب جل کر بھسم ہو گئے۔

بھارت کی سپریم کورٹ کے ایک سینئر ایڈووکیٹ ایس۔ پی۔ سنہا نے ملک میں اقلیتوں پر ہونے والے ظلم و تشدد کے بارے میں ایک مضمون لکھا جو "ریڈینس" کی ۷ رجون ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ اس میں ایس۔ پی سنہا نے لکھا :-

"رانچی، جمشید پور، اندور، مئو، الہ آباد، میرٹھ، احمد آباد، چیپاسا اور جلگاؤں ــــ اس فہرست کی طوالت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ان شہروں میں جو کچھ ہوا اس نے تمام سابقہ ریکارڈ مات کر دیئے۔ جان و مال کا نقصان بے اندازہ ہوا۔

پرانا طریقہ فسادی لوگ فساد برپا کرنے کے لئے ایک ہی طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ جن سنگھ کا کرائے کا آدمی ہندوؤں کے کسی جلوس پر کوئی چیز پھینک دیتا ہے اور اس کے فوراً بعد پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق مسلمانوں پر حملہ کر دیا جاتا ہے۔ حملے کے دوران نہ بچوں کو معاف کیا جاتا ہے نہ بوڑھوں کو، اور نہ کمزوروں کو۔

اگر فساد کی ابتداء کرنے کے لئے کرائے کا کوئی ایجنٹ نہ ملے تو پھر بہانہ یہ بنا لیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے مندر پر حملہ کیا تھا۔ احمد آباد میں ایک مسجد کو اس بہانے سے تباہ کر دیا گیا کہ مسلمانوں نے جگن ناتھ مندر پر مبینہ طور پر حملہ کیا۔ حالانکہ وہ حملہ نہ تھا بلکہ یہ چند جوانوں کی شرارت تھی جسے رائی کا پہاڑ بنا کر حملہ قرار دے دیا گیا۔ اس "حملے" کے دوران مندر کے دروازے کے صرف شیشے ٹوٹے لیکن بعد میں مسلمانوں کو اس کی بھاری قیمت چکانی پڑی۔ بے شمار جانیں ہلاک ہوئیں اور ان کی جائیدادیں راکھ کا ڈھیر بنا دی گئیں"۔

یہ ہے مختصر سا جائزہ اس "سلوک" کا جو ہندوؤں کی طرف سے خود ان کی مملکت میں رہنے والے مسلمانوں کے خلاف روا رکھا جا رہا ہے۔ ان مسلمانوں کے خلاف جو وہاں کی مملکت کے باشندے اور انڈین نیشنلز ہیں۔

اس سلسلہ میں ہم صرف ایک سوال پوچھنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ کیا اس قسم کے مسلسل واقعات کی مثال دنیا کی کسی اور قوم کی تاریخ میں بھی ملتی ہے؟ اور قتل و غارت گری اور وحشت و بربریت کا یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ جس وقت یہ سطور (اپریل ۱۹۷۱ء میں) قلمبند کی جا رہی ہیں، برہان پور کے تازہ ترین فسادات کی دل دوز اطلاعات موصول ہو رہی ہیں۔

یہ واقعات ۱۹۷۱ء تک کے ہیں۔ اس کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں پر کیا گزری، ہمیں افسوس ہے کہ اس کی تفصیلات اور اعداد و شمار (سرِ دست) ہمارے پاس موجود نہیں۔ البتہ ان پر ۱۹۷۹ء میں کیا بیتی اس کے متعلق روزنامہ نوائے وقت (لاہور) نے اپنی اشاعت بابت ۲ اپریل ۱۹۸۰ء میں حسب ذیل رپورٹ شائع کی تھی :-

سیکولرازم کے دعویدار ملک بھارت میں یکم جنوری ۱۹۷۹ء سے ۳۱۔ دسمبر ۱۹۷۹ء تک یعنی صرف ایک سال میں متعصب ہندوؤں نے بڑی فراخدلی سے اور بڑے وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا شکار کیا، اُن کے خون سے ہولی کھیلی۔ ان کے مال و منال کو برباد کیا اور ان کی عزت آبرو پہ ہاتھ ڈالا۔ بھارت کے وزیر مملکت برائے امور داخلہ یوگندر مکوانہ نے ۲۹۔ مارچ کو نئی دہلی میں بھارتی پارلیمنٹ کے ایوانِ بالا (راج سبھا) میں اعلان کیا کہ گزشتہ سال بھارت میں تین سو چار مرتبہ مسلم کش فسادات برپا ہوئے۔ یہ بات سُن کر بعض متعصب ہندو دل میں تلملائے ہوں گے کہ سال کے دن تین سو پینسٹھ اور مسلم کش فسادات صرف تین سو چار آخر اکسٹھ دن ہندو کیوں اس نیکی سے محروم رہے اور اتنے دن مسلمان بھارت میں لُٹنے پٹنے اور کٹنے مرنے سے کیوں بچے رہے؟

یوگندر مکوانہ نے جو تفصیل بیان کی ہے اس کی رُو سے گزشتہ برس آندھرا میں چوالیس مرتبہ، بہار میں ۴۳ مرتبہ، گجرات میں ۲۷ مرتبہ، مدھیہ پردیش میں ۲۴ مرتبہ، مہاراشٹر میں ۲۴ مرتبہ، مغربی بنگال میں ۲۲ مرتبہ، آسام میں ۲۰ مرتبہ، تامل ناڈو میں ۱۲ مرتبہ، مقبوضہ کشمیر میں ۱۱ مرتبہ، کرناٹک میں ۱۰ مرتبہ، راجستھان میں ۱۰ مرتبہ، اڑیسہ میں ۷ مرتبہ، کیرالہ میں ۷ مرتبہ، دہلی میں چھ مرتبہ۔ منی پور، مشرقی پنجاب، ہماچل، میگھالہ، سکم اور تری پورہ میں ایک ایک مرتبہ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی لیکن مکوانہ نے بھارت کے اس سب سے بڑے صوبے کے اعداد و شمار پیش نہیں کئے جو بھارت کا سب سے بڑا صوبہ ہی نہیں مسلم تہذیب کا سب سے قدیم گہوارہ تھا یعنی یوپی کے بارے میں صرف اتنا کہا کہ وہاں سب سے زیادہ تعداد میں مسلم کشی ہوئی۔ اگر مکوانہ کے پیش کردہ مندرجہ بالا اعداد و شمار کو اکٹھا کیا جائے تو صوبہ یوپی کو چھوڑ کر باقی صوبوں میں ۲۷۳ دن مسلمانوں پر قیامت ٹوٹی اور اگر مکوانہ کے قول کے مطابق یوپی میں سب سے زیادہ مرتبہ مسلمان تعصب کا شکار ہوئے تو ظاہر ہے کہ ان کی تعداد بہرحال آندھرا اور بہار کے اعداد سے زیادہ ہوگی اگر اسے ہم ساٹھ مرتبہ بھی شمار کریں تو مجموعہ تین سو چار کی جگہ تین سو تنتیس ہو جاتا ہے۔ (نوائے وقت ۱۲۔ اپریل ۱۹۸۰ء)

۱۹۸۰ء میں کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرا جس میں وہاں سے خونِ مسلم کی ارزانی کے ہولناک واقعات کی خبریں موصول نہ ہوئی ہوں۔ یہ واقعات وہ ہیں جو کسی نہ کسی طرح پبلک کے سامنے آگئے ہیں چند سال ادھر کی بات ہے، ہندوستان کے ایک ممتاز شہری مسٹر گابا' نے انگریزی زبان میں ایک کتاب شائع کی تھی جس کا عنوان تھا " دبی ہوئی آہیں" ۔اس میں انہوں نے وہاں کے مسلمانوں کے ان جانسوز حالات کا ذکر کیا تھا، جنہیں کسی کی زبان تک نہیں آنے دیا جاتا ۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہاں کے مسلمان مسلسل ایسی آگ میں جل رہے ہیں جس کا دھواں اُبھرنے نہیں دیا جاتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کتاب کا ایک ایک نسخہ ہمارے ان (حقیقت ناآشنا فریب خوردہ) نوجوانوں کے ہاتھ میں دینا چاہیئے جو اٹھتے بیٹھتے شکوہ سنج رہتے ہیں کہ ہم نے ہندوؤں سے الگ ہو کر بڑی حماقت کی! مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے یہ مظالم کسی ہنگامی یا وقتی جذبہ کا نتیجہ نہیں ہیں۔

نراد چودھری کا تبصرہ

ایک بنگالی نژاد ہندو ہے —— NIRAD C. CHAUDHURI ——
عمر رسیدہ اور بڑا فاضل۔ اس نے ہندو ذہنیت کا مطالعہ ایسی گہرائی سے کیا ہے کہ باید و شاید۔ اور اسے پھر اپنی شہرۂ آفاق کتاب (THE CONTINENT OF CIRCE) میں بڑی خوبصورتی سے بے نقاب کیا ہے۔ وہ اس میں، ہندو مسلم فسادات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

ہندوستان میں ہندو مسلم تعلقات کے سلسلہ میں جو اصل حقیقت ہے اور اسے جس انداز سے پیش کیا جاتا ہے، اس سے بڑا تضاد میں نے ساری عمر کہیں اور نہیں دیکھا۔ میں نے ہندو مسلم فسادات کے ضمن میں قتل و غارت گری، لوٹ، عصمت ریزی کے واقعات نہایت وسیع پیمانے پر دیکھے بھی ہیں اور ان کی روئداد بھی پڑھی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بیانات بھی اپنی آنکھوں سے پڑھے ہیں کہ ایسے واقعات کے لئے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کیونکہ ہندو اور مسلمان تو نسلی اور ثقافتی اعتبار سے ایک ہیں (اور جو ایک ہوں ان میں عداوت اور تنافر کیسے ہو سکتا ہے) (صفحہ ۳۹)

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے جذباتِ نفرت و عداوت کو چھوڑیئے۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کا ادنیٰ ذات کے ہندوؤں کے ساتھ جو برتاؤ ہے اس کا اندازہ رامائن کی اس حکایت سے لگائیے جس میں کہا گیا ہے کہ

ایک دن رام کو بتایا گیا کہ فلاں جگہ ایک برہمن کا اچانک انتقال ہو گیا ہے اور اس قسم کے ناشدنی واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک میں کہیں مہا پاپ (بہت بڑا گناہ کا کام) ہوا ہے۔ شری رامچندر جی مہاراج معاملہ کی تحقیق کے لئے نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک شودر، ایشور کی بھگتی اس طریق سے کر رہا ہے جو اعلیٰ ذات کے آریوں کے لئے مختص ہے۔ اس پر اس شودر کا سر قلم کر دیا گیا۔ اور جونہی اس کا سر بدن سے جدا ہوا، وہ برہمن زندہ ہو گیا۔ اس پر دیوتاؤں نے رامچندر جی پر تبریک و تحسین کے پھول برسائے کہ انہوں نے اس ضربِ کاری سے آریائی ثقافت کی حفاظت کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ (صفحہ ۱۲۷)

پاکستان کو ختم کرنے کی سازش

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہندوؤں نے، تقسیم ہند کا اصول تسلیم کرنے کے ساتھ ہی اعلان کر دیا تھا کہ ہم کسی نہ کسی طریق سے پاکستان کے جداگانہ وجود کو ختم کر کے اسے پھر سے ہندوستان کا حصہ بنا لیں گے۔ اس سلسلہ میں کیا گیا، اسے بھی غور سے سنیئے:۔

تقسیم کے معاہدہ کی رُو سے ایک لاکھ پینسٹھ ہزار ٹن فوجی سامان پاکستان کے حصہ میں آیا تھا۔ اس میں سے ہندوستان نے (۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء تک) صرف (۴۷۰۳) ٹن سامان پاکستان کو دیا۔ باقی سب خود ہڑپ کر گیا۔

ترکہ کی تقسیم

تقسیم کے وقت، چار ارب روپیہ نقد ہندوستان میں موجود تھا جس میں سے ایک ارب روپیہ پاکستان کے حصے میں آتا تھا۔ ہندوستان نے اس رقم کے دینے سے بھی انکار کر دیا اور دسمبر ۱۹۴۷ء میں بمشکل اس پہ رضامند ہوا کہ پاکستان کو (۷۵) کروڑ روپیہ دیا جائے۔ اس میں سے بیس کروڑ روپیہ پاکستان کو پہلے مل چکا تھا۔ ہندوستان، بقایا ۵۵ کروڑ دبا کر بیٹھ گیا۔ اس کے لئے پاکستان کو ہزار جتن کرنے پڑے اور جب بین الاقوامی دباؤ کے ماتحت ہندوستان کو یہ روپیہ ادا کرنا پڑا تو اس میں سے بھی پانچ کروڑ روپیہ ڈنڈی مار کر رکھ لیا جو آج تک نہیں دیا۔ (جس زمانے میں، ہندوستان، پاکستان کے حصہ کا روپیہ دبا کر بیٹھا ہوا تھا، ہندوستان کے حصہ کے نوتے جنگی ہوائی جہاز پاکستان میں پڑے تھے۔ پاکستان نے نوتے کے نوتے بحفاظت ان کے حوالے کر دیئے)۔

لیکن ہندو کی آتشِ انتقام اس سے فرو تھوڑے ہو سکتی تھی، وہ تو پاکستان کو سرے سے ختم کر دینے کی فکر میں تھا۔ تقسیم کے بعد، پاکستان جس حالت میں تھا، اور ہندوستان اسے کمزور سے کمزور تر کرنے کے لئے

جنگ کی تیاریاں

جو کچھ کر رہا تھا، اسے پیشِ نظر رکھئیے، اور اس کے بعد وہاں کے سابق چیف جسٹس مسٹر مہاجن کا یہ انکشاف ملاحظہ فرمائیے کہ ہندوستان نے دسمبر ۱۹۴۷ء میں فیصلہ کر لیا تھا کہ پاکستان پر حملہ کر دیا جائے لیکن بعض داخلی مصالح کے پیشِ نظر اس فیصلہ پہ عملدرآمد نہ ہو سکا۔ جب ۱۹۵۰ء میں بنگال میں فسادات کرائے گئے تو اس کے ساتھ ہی وہاں پاکستان پر فوجی حملہ کرنے کی ایک تحریک چلائی گئی جس کی تائید وہاں کے بڑے بڑے لیڈروں ـــ مثل پنڈت نہرو، جے پرکاش نرائن۔ آر۔ کے چودھری وغیرہ نے کی۔ وزیرِ اعظم پاکستان ـــ نواب زادہ لیاقت علی خاں (مرحوم) نے صلح کا ہاتھ بڑھایا۔ لیکن پنڈت نہرو نے اس پیشکش کو نہایت بے اعتنائی سے ٹھکرا دیا۔ ابتدائے ۱۹۶۵ء میں، ہندوستان نے "رن آف کچھ" میں چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تو وہاں کے ہوم منسٹر نندا نے لوک سبھا میں اعلان کیا کہ ہم نے پوری آٹھ لاکھ فوج کو تیاری کا حکم دے دیا ہے۔ اور وزیرِ اعظم نے یہ کہہ کر اس کی تائید کی کہ آج ہندوستان کی پینتالیس کروڑ آبادی ہر قربانی کے لئے تیار کھڑی ہے۔ ادھر رن آف کچھ کے علاقے میں یہ ہو رہا تھا، اور اُدھر، بنگال میں انہوں نے پاکستانی علاقہ، واہگرام پر دھاندلی سے قبضہ کر لیا ـــ اور پھر، ستمبر ۱۹۶۵ء میں جو کچھ ہوا، اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ واقعہ تو ہماری موجودہ نسل کی آنکھوں کے سامنے ظہور میں آیا تھا۔

میں نے اس سلسلہ میں مسئلہ کشمیر کا ذکر قصداً نہیں چھیڑا کیونکہ وہ ہندو ذہنیت کی فی ذاتہٖ مکمل تصویر ہے اور اس کی تفصیل میں جانے کے لئے کافی وقت چاہیئے۔ لیکن میں اس ضمن میں، کم از کم ایک مثال ضرور پیش کروں گا جس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ہندو کس قدر کمینہ فطرت واقع ہوا ہے۔ کوئی دو سال ادھر کا ذکر ہے (یعنی ۱۹۶۶ء کا) کہ جمعیت العلماء ہند کے ناظم عمومی، (اور مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے صاحبزادہ مولانا سید اسعد مدنی نے اپنا ایک خط اخبارات میں شائع کیا تھا جو انہوں نے کسی وقت لال بہادر شاستری کو لکھا تھا۔

لے نہ ہی حیدرآباد، جوناگڑھ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

اس خط میں انہوں نے مسٹرٹ سنزی سے کہا تھا:۔

میں نے اخبارات میں شائع شدہ آپ کی ایک تقریر پڑھی جس میں آپ نے این۔سی۔سی کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ پاکستان جو ہمیشہ اسلام کی اصطلاح میں سوچتا ہے اس دھوکے میں ہے کہ وہ کشمیر کو اس لئے ہڑپ کر لے گا کہ وہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ یہ پاکستان کی خام خیالی ہے۔ ہندوستان میں پانچ کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ اگر پاکستان یہ سوچتا ہے کہ وہ مسلم اکثریت کے بل پر کشمیر کو لے سکتا ہے تو اسے اچھی طرح سوچ رکھنا چاہیئے کہ اس صورت میں ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا۔

(ماہنامہ "تذکرہ"۔ دیوبند۔ بابت دسمبر ۱۹۶۵ء۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ جون ۱۹۶۶ء)

آپ سوچئے، کہ کیا دنیا میں دنائت اور بدنہادی کی اس سے بدتر مثال کوئی اور بھی ہوسکتی ہے؟ یعنی اگر پاکستان نے کشمیر کے مسئلہ کو اٹھایا تو ہندو، ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کو ختم کر دے گا! یا للعجب!

جنگ کے بعد

۱۹۶۵ء کی جنگ میں استخواں شکن شکست کھانے کے بعد، ہندو نے اپنا پینترا بدلا، اور جو مقصد کھلے میدان میں جنگ کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا تھا، اُسے زمین دوز سازش کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس زمین دوز سازش کی تفصیلات میں گئے بغیر اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ ۱۹۷۱ء کی جنگ اور مشرقی پاکستان کے سقوط اور علیحدگی کی شکل میں دُنیا کے سامنے آئی۔ ہم اس جنگ کی تفاصیل میں بھی نہیں جانا چاہیئے۔ بتانا صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس "فتح" کے بعد، ہندو زعما کے وہ جذبات جنہیں وہ اتنے عرصہ تک منافقت کے پردے میں چھپائے چلے آرہے تھے کس طرح ابھر کر سامنے آگئے۔ مسز اندرا گاندھی نے نومبر ۱۹۷۱ء میں، علی گڑھ کے طلباء اور اساتذہ کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

میرے پتا۔ پنڈت نہرو تحریکِ آزادی کے ایک عظیم رہنما تھے۔

وہ میرے سب کچھ تھے۔ وہ میرے شفیق باپ بھی تھے، استاد بھی اور راہنما بھی۔ یہ سب اپنی جگہ درست ہے لیکن بھارت کی تاریخ ان کے اور ان کی جماعت، انڈین نیشنل کانگریس کے ایک بھیانک جرم کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ وہ جرم ہے بھارت کی تقسیم۔ انہوں نے سردار پٹیل اور ہندو مہاسبھا کے دباؤ میں آکر ایک ایسا فیصلہ قبول کر لیا جس نے بھارت ماتا کے جسم کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ بات مجھے بڑے دُکھ سے کہنی پڑ رہی ہے، اس لئے کہ وہ میرے پتا تھے۔ لیکن اس سے زیادہ وہ بھارت کے ہر دلعزیز رہنما بھی تھے۔ آج مجھے اس حقیقت کا اظہار کرنا پڑ رہا ہے تو میں اُن کی بیٹی سے زیادہ، بھارت کی وزیرِ اعظم کی حیثیت سے بھی بات کر رہی ہوں۔ میں یہ بات نہ بھی کہوں تو بھارت کی موجودہ نسل اور آنے والی نسلیں ہمیشہ کہتی رہیں گی۔ وہ پنڈت نہرو اور انڈین نیشنل کانگریس کے اس جرم کو کبھی معاف نہیں کریں گی۔

(بحوالہ مشرق۔ ۱۵ اپریل ۱۹۷۲ء)

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھارت نے بہت بڑا جشن منایا۔ پارلیمان نے اس کامیابی پر مسز اندرا گاندھی کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ مسز اندرا گاندھی نے اس کے جواب میں کیا کہا تھا؟ اُس نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم نے بہت بڑا میدان مارا ہے۔ اُس نے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ ہم نے ایک ملک فتح کرلیا ہے۔ اُس نے کہا یہ تھا کہ

> یہ کامیابی، نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہی حکومت کی کامیابی، یہ کامیابی ہے حق پر مبنی نظریہ کی، اُس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریکِ پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ اُن کا نظریہ غلط ہے۔ یہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب پچیس سال کے تجربہ نے بتا دیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے وہ حق تھا اور اُن کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔

کیا اس کے بعد بھی کسی شبہ کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کی اس کشمکش کی بنیاد نہ سیاسی ہے نہ معاشی۔ یہ خالصتاً نظریاتی ہے اور ہندوؤں نے (سابق) مشرقی پاکستان میں اپنے مسلسل پروپیگنڈہ کے ذریعے وہاں کے مسلمانوں کو نظریاتی طور پر اپنے ہمنوا کر لیا تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد جب مسز اندرا گاندھی وہ کچھ کہہ رہی تھیں تو دوسری طرف اس زمانے میں بنگلہ دیش کے قائم مقام صدر، مسٹر نذرالاسلام یہ فرما رہے تھے:۔

> ہماری یہ فتح، نہ کسی فوج کی فتح ہے، نہ کسی ملک کی۔ یہ فتح ہے حق کی باطل پر۔ یہ فتح ہے ایک صحیح نظریہ کی غلط نظریہ پر۔ تقسیم ہند سے پہلے، سرپھرے مسلمانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ قومیت کا مدار مذہب کا اشتراک ہے، وطن کا اشتراک نہیں۔ اور حکومت کی بنیاد مذہب پر ہے، سیکولر نہیں۔ وہاں ان لوگوں کو لاکھ سمجھایا گیا کہ یہ نظریہ غلط ہے اور ناممکن العمل، اس پر اصرار نہ کرو۔ لیکن وہ نہ مانے اور اپنے غلط مفروضہ کی بنیاد پر ایک جداگانہ قوم بن کر ایک الگ مملکت کے بانی بن گئے لیکن چوبیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ جو نظریہ یہ لوگ پیش کر رہے تھے وہ باطل تھا اور حق وہی تھا، جو ان کے مخالفین پیش کر رہے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ نے اس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ اب یہ شہادت، تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لئے منقوش رہے گی۔ ہم ان راہ گم کردہ لوگوں سے اب بھی کہیں گے کہ وہ اس باطل نظریہ کو ترک کر کے وطن کے اشتراک کی بناء پر پھر سے ہندوستانی قوم کا جزو بن جائیں اور مذہب کو سیاست میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کریں۔ ورنہ جو حشر آج مشرقی پاکستان کا ہوا ہے وہ کل مغربی پاکستان کا بھی ہوگا۔ حقائق کسی کے جھٹلانے، جھوٹے ثابت نہیں ہو جایا کرتے۔

خود مجیب الرحمٰن نے پاکستان سے رہا ہونے کے بعد ڈھاکہ پہنچنے پر کہا کہ

> میری قوم سیکولرازم، سوشلزم اور جمہوریت کے نظریات کی حامی ہے۔ مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ میری پالیسی اور اندرا گاندھی کی پالیسی میں اس قدر توافق کیوں ہے؟ اس کا جواب صاف اور

واضح ہے کہ ہم دونوں کے نصب العین، زاویۂ نگاہ، اور اقدارِ حیات ایک ہیں۔

(پاکستان ٹائمز۔ ۱۱ر جنوری ۱۹۷۲ء)

ڈھاکہ سے شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبار (FORUM) نے اپنی ۳۰ر جنوری ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

۷ر دسمبر ۱۹۷۰ء تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ اہلِ پاکستان میں وجۂ جامعیت مذہب ہے۔ انتخابات نے اِس ملمع کی قلعی کھول دی اور نظریہ پاکستان کی وہ تمام نگاہ فریب خوشنمائیاں جنہیں قدیم رجعت پسند اور استحصال پسند طبقہ اس شدّ و مد سے پیش کرتا تھا، افسانہ بن کر رہ گئی ہیں۔

اس کے بعد اس نے اپنی ۲۷ر فروری ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

جب اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ مشرقی اور مغربی پاکستان کو متحد نہیں رکھ سکے تو پھر سوچیے کہ بلوچ، پٹھان اور پنجابیوں کو کون سا رشتہ متحد رکھ سکے گا۔ اسلام کی یاد تو یقیناً ایسا نہیں کر سکے گی۔

اس قسم کے مسلسل پراپیگنڈہ نے (سابق) مشرقی پاکستان کے نوجوانوں کے دل میں پاکستان ہی نہیں بلکہ خود اسلام کے خلاف کس شدت سے زہر بھر دیا تھا اس کا اندازہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایم۔اے کے ایک طالب علم عزیز الرحمٰن کے اس خط سے لگایئے جسے اس نے ۱۹۶۹ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا:-

مشرقی پاکستان کی بے باکیاں

ہم شری چیتنیا، خودی رام، سبھاش بوس، بیجائے سنگھ جیسے اپنے قومی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے تھے اور ان کی جگہ خالدؓ۔ طارقؒ۔ موسےٰؑ اور علیؓ جیسوں کو اپنا ہیرو سمجھنے لگ گئے تھے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا تھا اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی خدا —— اللہ کو اپنا معبود تصور کر لیا تھا۔ اب ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے اسلامی قومیت کے بندھن ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔

اس کے بعد اس نے لکھا تھا کہ

مشرقی بنگال کی اس روش کے تتبع میں، مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اولاد میں اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔

سندھ میں اس کا ردِ عمل کیا ہوا اس کے متعلق، ایک سندھی طالبہ، مس نسیم تھلو کا وہ خط ملاحظہ فرمایئے جو کراچی کے روزنامہ حریت کی ہفتہ وار اشاعت بابت ۴ر نومبر ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا:-

وہ اسلام اور پاکستان جو ہم سے ہمارا سندھ اور سندھی زبان چھینے، ایسے اسلام اور پاکستان کو ہم اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ سندھ صرف اسلام اور اسلامی فلسفہ کی وجہ سے عظیم ہے۔ سندھ کی عظمت، سندھ کے سادہ لوح بہادر عوام ہیں۔ سندھ موہن جو داڑو، کوٹ ڈی جان کے آثارِ قدیمہ اور لطیف، سچل، ایاز جی۔ ایم۔ سید کی طرح کے شاعروں دانشوروں کی وجہ سے عظیم ہے۔

اور سندھ ہی کی ایک اور بیٹی ـ غزالہ بلوچ ـ نے اپنے خط میں جو کراچی کے اخبار ڈیلی نیوز کی ۱۹ اگست ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، لکھا تھا :-

بہاریوں کی بدقسمتی دراصل اُس دن سے شروع ہوتی ہے جب انہوں نے ۱۹۴۶-۴۷ء میں پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اگر بہاری مسلمان ہندوستان کے ہندوؤں میں جذب ہو جاتے تو وہ آج بہار میں آرام اور چین سے زندگی کے دن گزار رہے ہوتے۔ ہندوؤں کے اندر جذب ہونے کے لئے انہیں صرف اس قدر کرنا پڑتا کہ اسلام چھوڑ کر ہندو دھرم اختیار کر لیتے۔ اگر وہ ایسا کر لیتے تو دو قومی نظریہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ ہندوستان میں ایک ہندو قوم ہوتی۔ اب بھی پاکستان میں بسنے والے مہاجرین کے سامنے دو راستے کھلے ہیں۔ یا تو وہ ہندو دھرم اختیار کر کے ہندوستان واپس چلے جائیں اور وہاں ایک عظیم ترقی پسند قوم کا جزو بن کر رہیں اور یا پاکستان میں سندھی بن کر رہیں جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایک بہت چھوٹی سی قوم کا جزو بن جائیں۔

اور کم و بیش انہی الفاظ کی صدائے بازگشت ہے جو ہم آج کل (۱۹۸۰ء میں)، ان نوجوانوں کی زبان سے سن رہے ہیں جن کے حوالے سے اس مقالہ کا آغاز کیا گیا ہے۔

اور سچ پوچھئے تو اس میں ان نوجوانوں کا اتنا قصور نہیں جتنا قصور ہمارا ہے۔ اس کے مجرم ہم ہیں جنہوں نے،

(۱) نوجوانوں کی اس نسل کو بتایا ہی نہیں کہ ہم نے ہندوستان سے علیحدگی کا مطالبہ کیوں کیا تھا۔

(۲) ہم نے انہیں یہ بھی نہیں بتایا کہ نظریہ پاکستان کیا ہے اور یہ کس طرح مملکتِ پاکستان کی بنیاد قرار پاتا ہے۔

(۳) جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ہم نے انہیں یہ بھی نہیں بتایا کہ ہندو کی ذہنیت کیا ہے اور وہاں مسلمانوں کے ساتھ کیا بیت رہی ہے۔ اور اگر ہم وہاں رہتے تو ہمارا حشر کیا ہوتا۔

(۴) انہیں یہ بتایا نہیں کہ اور یہاں وہ نظام قائم نہیں کیا جس کے متعلق ہم تیس سال سے مسلسل کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اس نظام کا قیام، ہندوستان سے ہماری علیحدگی کا حقیقی مقصد تھا۔ اس نظام کا قیام تو ایک طرف ہم نے تو انہیں یہ تک بھی نہیں بتایا کہ وہ نظام ہے کیا اور وہ کس طرح اس نظام سے مختلف ہے جو ہندوستان (یا دنیا کے کسی اور ملک) میں رائج ہے، اور اس کی منفرد خصوصیات اور خوشگوار نتائج کیا ہوں گے۔ اگر وہ نظام یہاں قائم ہو جاتا تو اس قسم کے کوئی شکوک و شبہات پیدا ہی نہ ہوتے جو اس وقت ہماری نئی نسل کے قلب و دماغ کے لئے وجۂ صد اضطراب بن رہے ہیں۔ وہ نظام قائم ہو جاتا تو یہاں کے نوجوانوں کا مطمئن اور شکر گزار ہونا تو ایک طرف دنیا بھر کے نوجوان کشاں کشاں اس کی طرف لپک کر آتے۔

یہ تھا اس نہایت اہم مسئلہ کا حقیقی حل جس سے ہم اس قدر تغافل برتا ہے۔ بایں ہمہ میں نے جو حقائق اور واقعات گزشتہ صفحات میں پیش کئے ہیں، مجھے اُمید ہے کہ جو نوجوان بھی ان پر سنجیدگی سے غور کرے گا، وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ پاکستان جیسا کچھ بھی ہے، اس کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرنا بہر حال ہندو جیسے دشمنِ انسانیت کی محکومیت سے ہزار درجہ بہتر ہے اس لئے اس خطۂ زمین کا محفوظ و مستحکم رہنا از بس ضروری۔ اس مملکت کا حصول، بانیانِ پاکستان کا ہم پر احسانِ عظیم ہے۔ خدا انہیں اس کا اجرِ جلیل عطا فرمائے اور اس خطۂ زمین کو ہر خطرہ سے محفوظ رکھے،

والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام اور پاکستان کے خلاف

گہری سازش

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ

عزیزانِ گرامی قدر۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، میرے اس خطاب کا موضوع ہے، اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش۔ سازش کے لفظ سے ذہن کسی ایسے انقلاب کی طرف منتقل ہوتا ہے جس کا مقصد کسی حکومت کا تختہ اُلٹنا ہو — خواہ وہ انقلاب ملک کے اندرونی خلفشار کے ذریعے برپا کیا جائے اور خواہ کسی بیرونی طاقت کے ایما یا بل بوتے پر۔ لیکن جس سازش کا انکشاف میرے اس خطاب کا مقصود ہے، وہ اس سے مختلف ہے۔ اس کا مقصد کسی حکومت کا تختہ الٹنا نہیں۔ اِس سے مقصود یا تو مملکتِ پاکستان کا سرے سے وجود ہی ختم کر دینا ہے اور یا اُس غرض و غایت کا ختم کر دینا جس کے لئے اِس مملکت کا قیام عمل میں آیا تھا اور جو اِس کے وجود اور بقا کی اصل و اساس اور وجہ جواز ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی انقلاب کا مقصد، برسرِ اقتدار حکومت کا تختہ الٹنا ہو تو اس سے مملکت بہرحال قائم رہتی ہے، صرف حکومت تبدیل ہوتی ہے۔ لیکن جس سازش کا مقصد خود مملکت کا وجود ختم کر دینا ہو — خواہ وہ بیک جست ہو یا بتدریج — اس سے بڑھ کر خطرناک سازش کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ اِس سے آپ اِس موضوع کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اصل موضوع تک آنے سے پہلے، میں اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اُن خوش بخت

افراد میں سے ہوں جو نظری طور پر ۱۹۳۰ء کے پاکستانی ہیں جب علامہ اقبالؒ (علیہ الرحمۃ) نے الٰہ آباد کے مقام پر، مسلمانانِ ہند کے لئے ایک جُداگانہ مملکت کا تصور پیش کیا تھا۔ اس مملکت کی غرض و غایت کو انہوں نے چار لفظوں میں، اس اختصار اور جامعیت کے ساتھ سمٹا دیا تھا جو اقبالؒ ہی کا حصہ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ:۔

> اِس سے اسلام کو موقعہ مل جائے گا کہ وہ اُن اثرات و نقوش سے آزاد ہو کر، جنہیں عربی شہنشاہیت نے اس پر ثبت کر رکھا ہے، اپنے قوانین، اپنی تعلیم، اپنی ثقافت کو متحرک کر کے انہیں ایک طرف ان کی حقیقی اور اصلی روح سے قریب تر لے آئے اور دوسری طرف، عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر دے۔

مَیں اپنے اِس خطاب میں اِس امر کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ:۔

(۱) اسلام کی حقیقی اور اصلی روح سے مفہوم کیا ہے؛

(۲) عربی شہنشاہیت نے (یعنی مسلمانوں کی ملوکیت نے: خواہ وہ عرب ممالک کی ہو اور خواہ غیر عرب ممالک کی) اس روح کو مسخ کر کے اِسے کس طرح مروجہ مذہب میں تبدیل کر دیا۔

(۳) اقبالؒ نے اس حقیقی اور منزّہ اسلام کے احیاء کی کیا صورت تجویز کی اور وہ کس طرح پاکستان کے لئے ایک خطۂ زمین کی شکل میں عمل میں آئی ـــــ اور

(۴) اس مقصد اور غایت کو تباہ کرنے کے لئے کونسی سازش کی گئی، اور کی جا رہی ہے۔

اپنے اُسی خطبہ میں، انہوں نے اس امر کی وضاحت بھی کر دی تھی کہ:۔

> اسلام، نہ تو (خدا اور بندے کے مابین) کسی نجی معاملہ کا نام ہے اور نہ ہی یہ کوئی کلیسائی نظام ہے (جس کی بنیاد تھیاکریسی پر ہوتی ہے)۔ یہ ایک ایسی مملکت (سٹیٹ) کا نام ہے جس کا اظہار، دوسو سے بھی بہت پہلے، ایک ایسی شکل میں ہوا جو عقدِ اجتماعی کی پابند تھی اور جس کی بنیاد ایک اخلاقی نصب العین پر تھی۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

علامہ اقبالؒ کی طرف سے پیش کردہ اسلام کا یہ تصوّر، درحقیقت قرآنِ کریم ہی کی مختلف آیات کی تفسیر ہے۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ:۔

اسلامی مملکت کی خصوصیات

(۱) انسانی ذہن نے اجتماعی نظام کا جو تصوّر بھی پیش کیا ہے اس میں یہ چیز بطور قدرِ مشترک پائی جاتی ہے کہ بعض انسانوں کو حق حاصل ہوتا ہے، یا وہ ایسی پوزیشن اختیار کر لیتے ہیں جس سے انہیں یہ اقتدار حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ دوسرے

انسانوں پر حکومت کریں۔ قرآن کریم نے کہا کہ یہ تصوّر کفر ہے، باطل ہے۔ وجۂ تذلیلِ انسانیت اور باعثِ تحقیرِ آدمیت ہے۔ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ خواہ وہ اقتدار اعلیٰ یا قوانین وضع کرنے کا اختیار بھی کیوں نہ حاصل کرلے حتیٰ کہ اُسے خواہ نبوت بھی کیوں نہ مل جائے۔ اُسے کسی انسان پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں ہو سکتا۔ (۳/۷۹) اقتدار مطلق کی شکل سابقہ ادوار میں ملوکیت کی تھی۔ (جس نے عصر حاضر میں ڈکٹیٹر شپ کا لبادہ اوڑھ لیا ہے) اور قانون سازی کے حق نے آجکل جمہوریت کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ جہاں تک نبوت کا تعلق ہے اس اختیار کو مذہبی پیشوائیت اپنے لئے مختص کر لیتی ہے۔ اسے تھیاکریسی سے تعبیر کیا جاتا ہے یہ سب تصورات غیر اسلامی ہیں۔

(۲) قرآن کریم کی رُو سے، حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے جس کی عملی صورت یہ ہے کہ اس کی نازل کردہ کتاب میں دیئے گئے اصول و احکام کی اطاعت کرائی جائے۔ یہی کفر اور اسلام میں خطِ امتیاز ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (۵/۴۴) اس کا واضح ارشاد ہے۔ یعنی جو لوگ قرآن کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی تو کافر ہوتے ہیں۔

(۳) جو لوگ اِس اصول کو تسلیم کر لیں اُنہیں مومن کہا جاتا ہے۔ انہی مومنین پر مشتمل ایک قوم متشکل ہوتی ہے جسے اُمتِ مسلمہ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ اُمت، امتِ واحدہ ہوتی ہے۔ اس میں نہ کوئی مذہبی فرقہ ہوتا ہے نہ سیاسی پارٹیاں۔ نہ حزب اقتدار و حزب اختلاف کا وجود ہوتا ہے، نہ گروہ بندانہ تصورات و مفادات۔ ایک اُمت، اس کی ایک مملکت، اس مملکت کا ایک ضابطۂ قوانین اور اس کی ایک مرکزی اتھارٹی۔ کوئی غیر مسلم اُس امت (قوم) کا فرد نہیں ہو سکتا۔ دنیا بھر کے مومن، بلا لحاظِ وطن و نسل، اس اُمت کے فرد ہوتے ہیں اور تمام غیر مسلم دوسری قوم کے افراد۔ اسے دو قومی نظریہ کہتے ہیں جو اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔

مملکتِ اسلامیہ کی سب سے پہلی مرکزی اتھارٹی خود رسول اللہؐ تھے۔ اس لئے آپؐ کی صورت میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ انہیں یہ مقام کس طرح حاصل ہو گیا۔ وہ مامور من اللہ تھے۔ چونکہ نبوت یا ماموریت من اللہ، حضورؐ کے ساتھ ختم ہو گئی اس لئے آپؐ کے بعد، اس کا انتخاب اُمت کے باہمی مشورہ سے ہو گا۔ (۴۲ : ۳۸) اور اس کے لئے بنیادی شرط (QUALIFICATION) سیرت و کردار

کی بلندی اور پاکیزگی، اور اہلیت ہوگی۔ (۸/۲۸ و ۱۳/۴۹)

(۴) قرآنِ مجید میں کچھ احکام، متعین شکل میں دیئے گئے ہیں اور باقی' اصول یا اقدار کی شکل میں۔ ان اصول و اقدار پر عمل درآمد کے طریق، اُمت کے مشورہ کے مطابق طے پائیں گے۔ انہیں آپ جزئی احکام کہہ لیجئے۔ قرآنی اصول و اقدار تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن ان پر عمل درآمد کے طور طریق، مختلف زمانوں کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے جنہیں مملکتِ اسلامیہ متعین کرے گی۔

یہ تھا مملکت کا وہ تصوّر، جسے قرآنِ مجید نے پیش کیا۔ اس کی بنیادی خصوصیت، یا یوں کہیئے کہ اس کے نتائج یا ماحصل کو، علامہ اقبالؒ نے ایک شعر میں سمٹا کر رکھ دیا ہے، جب کہا کہ :-

کس دریں جا سائلِ محروم نیست عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اس میں نہ کوئی حاکم ہوگا نہ محکوم۔ نہ ہی کوئی شخص اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم ہوگا اور نہ ہی ان کے حصول کے لئے کسی انسان کا دست نگر۔ ان کا مہیا کرنا، مملکت کا فریضہ ہوگا۔ اس سے' انسانی اقتدار کے تصوّر (خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔) اور نظامِ سرمایہ داری کی جڑ کٹ جائے گی۔

یہ تھا اسلام کا وہ نقشہ، جسے قرآنِ کریم نے پیش کیا اور جس کے مطابق اُمتِ مسلمہ کی سب سے پہلی مملکت قائم ہوئی (حضورؐ کے بعد) اِسے خلافتِ راشدہ کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی قرآنی قوانین و حدود کے مطابق حکومت۔

کچھ عرصہ کے بعد وہ خلافت، ملوکیت میں بدل گئی، یعنی وہ قرآنی حدود کی پابند نہ رہی۔ میں اس مقام پر یہ بحث نہیں چھیڑنا چاہتا کہ یہ کیسے ہوا اور اس کا ذمہ دار کون تھا۔ میں اسے اپنی کتاب ــــ شاہکارِ رسالتؐ ــــ میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ جو احباب اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں، وہ اس کا مطالعہ فرما لیں۔

غیر قرآنی مملکت

اس (غیر قرآنی) نظامِ حکومت میں دینؔ (اسلامی نظام) کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ــــ یعنی مذہب اور سیاست میں ــــ مذہب سے مفہوم رہ گیا نظری عقائد اور عبادات (نماز۔ روزہ۔ وغیرہ) اور پرسنل لاز (نکاح، طلاق وغیرہ سے متعلق امور)۔ حکومت نے اِنہیں مذہبی علماء کی تفویض میں دے دیا، اور امورِ مملکت ــــ پبلک لاز ــــ اپنے ہاتھ میں رکھ لئے۔ اس طرح سلاطین اور مذہبی پیشواؤں کے دو الگ الگ دوائرِ اقتدار وجود میں آ گئے۔ اِس کے ساتھ ہی نظامِ سرمایہ داری بھی پھر سے زندہ ہو گیا۔ چونکہ اس نظام (دینؔ) کی مرکزی اتھارٹی باقی نہ رہی، اِس لئے ایک طرف مذہبی فرقے پیدا ہو گئے اور دوسری طرف مسلمانوں کی مختلف سلطنتیں وجود میں آ گئیں۔ اس کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ نہ ایک اُمت رہی، نہ ان کا

ایک ضابطۂ قوانین۔ نہ ایک مملکت رہی نہ ایک اقتصادی۔ یہ ہیں وہ نقوش، جو علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں "عربی شہنشاہیت" نے اسلام پر ثبت کردئیے اور جن کی وجہ سے وہ اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں باقی نہ رہا۔ انہی غیر اسلامی نقوش کو مٹا کر، اسلام کو پھر سے اس کی حقیقی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے انہوں نے مملکتِ پاکستان کا تصور پیش کیا۔ اسے نظریۂ پاکستان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ مملکت جس میں قرآن کی حکمرانی ہو۔

اسلام پر ان غیر اسلامی نقوش کے ثبت کرنے اور انہیں قائم رکھنے کے ذمہ دار یہ تین عناصر ہیں۔ (۱) نظامِ ملوکیت۔ (۲) نظامِ مذہبی پیشوائیت، جس میں اربابِ شریعت (مُلّا) اور اصحابِ طریقت (صوفی) دونوں شامل ہیں۔ اور (۳) نظامِ سرمایہ داری کے علمبردار ــــ علامہ اقبالؒ کی ساری زندگی ان عناصر کے خلاف جہاد میں بسر ہوگئی۔ ان کا سارا کلام اِن پر تنقید اور ان کی تردید کا آئینہ دار ہے۔ یہ تو اِن عناصر کا تجزیہ ہے۔ لیکن اگر سمٹا کر دیکھا جائے تو اقبالؒ کا مشن درحقیقت اُس نظام کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنا تھا جسے دورِ حاضر میں سیکولرازم سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو اِس وقت ساری دنیا میں رائج ہے۔ اِس میں مسلم اور غیر مسلم ممالک کی بھی کوئی تخصیص نہیں کی۔ اس نظام میں، حقِ حکومت (یعنی قانون سازی کا اختیار) انسانوں کو حاصل ہوتا ہے (خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو) اور مذہب کے متعلق کھلی چھٹی ہوتی ہے کہ جس کے جو جی میں آئے کہے اور جو دل چاہے کرے۔ حکومت اس میں دخل نہیں دیتی، بلکہ اِسے "مذہبی آزادی" کہہ کر، مذہب پرست طبقہ کے سر پر اپنا عظیم احسان دھرتی ہے۔ یہی ہے وہ غیر اسلامی نظام، جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ کہتا ہے کہ :ــــ

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو　　جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

وہ مُلّا کے اسلام کے متعلق کہتے ہیں :ــــ

متاعِ شیخ اساطیرِ کہن بود　　حدیثِ اُو ہمہ تخمین و ظن بود
ہنوز اسلامِ او زنار دار است　　حرم چوں دَیر بود، او برہمن بود

یعنی اس کا پیش کردہ اسلام، زمانہ قبل از اسلام (جاہلیت کے زمانے کا) اسلام ہے، جب کعبہ ایک بُت خانہ تھا اور اس کے متولی اس کے پجاری۔ وہ اُمتِ مسلمہ (مسلمان) کے متعلق کہتے ہیں :ــــ

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری　　اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری

دوسری جگہ ہے :۔

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر　　سود خوار و والی و مُلّا و پیر

وہ مُلّا کو ایک جگہ ــــ کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد ــــ کہتے ہیں۔ دوسرے مقام پر کہتے ہیں :ــــ

دین کافر فکر و تدبیرِ جہاد　　دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد
مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب　　کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

لیکن علامہ اقبالؒ نے مروّجہ اسلام اور اس کے علمبرداروں کے خلاف منفیانہ تنقید پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ انہوں نے حقیقی اسلام کے احیاء کے سلسلہ میں مثبت نظریات اور تعمیری اقدامات بھی پیش کئے۔ انہیں معلوم تھا کہ صدرِ اوّل کے بعد آج تک، اسلامی حکومت کسی جگہ اور کسی زمانے میں بھی قائم نہیں ہوئی۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اگرچہ اِس وقت دنیا میں بکثرت مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کے لئے آمادہ نہیں ہوگی کہ اپنے ہاں قرآنی نظام رائج کرلے۔

پاکستان کیوں؟

اس بنا پر انہوں نے سوچا کہ ایسا نظام کسی ایسے خطۂ زمین ہی میں رائج ہو سکتا ہے جہاں پہلے سے کوئی نظام رائج نہ ہو۔ یعنی وہاں پہلی بار کوئی مملکت قائم ہو تاکہ اس میں، قرآنی نظام باآسانی رائج کیا جا سکے۔ پاکستان کے خطۂ زمین کا مطالبہ ان کی اسی بالغ نظری کا رہینِ منت تھا۔ حالات کا ایسا تجزیہ اور قرآنی نظام کے احیاء کے لئے اس قسم کا عملی حل، اقبالؒ جیسا دیدہ ور ہی پیش کر سکتا تھا۔ لیکن کسی ایسے خطۂ زمین کے حصول کے ساتھ ساری مشکل حل نہیں ہو جاتی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اس خطۂ زمین میں پہلے سے کوئی مملکت قائم نہ بھی ہو تو بھی اس میں مسلمان تو بہرحال بستے ہوں گے۔ یہ مسلمان مختلف فرقوں سے وابستہ ہوں گے جن میں سے ہر فرقہ کی اپنی اپنی فقہ ہوگی۔ لیکن اسلامی مملکت تو اسے کہا جائے گا جس میں تمام مملکت میں ایک ہی ضابطۂ قوانین رائج ہو، جس کا اِطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ یہ تھی اصل دشواری۔ لیکن انہوں نے اس مشکل ترین سوال کو ویسے ہی نہیں چھوڑ دیا۔ وہ "شاعر" نہیں تھے جو تخیلات کی دنیا میں بستے ہیں۔ وہ نرے "مفکر" بھی نہیں تھے جن کی ساری عمر تصوّرات کی فضاؤں میں بسر ہو جاتی ہے اور عملی دنیا سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس قسم کی تجریدی فکر کے وہ سخت خلاف تھے۔ اِسی بنا پر انہوں نے کہا تھا کہ: ؎

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے بُری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

وہ حکیم الامت بھی تھے اور مقنن بھی۔ اس لئے انہوں نے اس سوال پر بڑی گہری نظر سے غور و فکر کیا کہ دورِ حاضر میں اسلامی مملکت میں قانون سازی کا اصول اور طریق کیا ہونا چاہیئے۔ اس موضوع پر انہوں نے اپنے معرکہ آرا مجموعۂ خطبات کے چھٹے خطبہ میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ میں اسے نہایت مختصر الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔ لیکن اس سے پہلے میں ایک بار پھر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلامی مملکت کی تشکیل کے راستے میں وہ کونسی مشکل تھی جس کا حل علامہ اقبالؒ کے پیشِ نظر تھا۔ جب حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اسلامی مملکت کی تشکیل فرمائی تو وہ ایسے افراد پر مشتمل تھی جو ہماری طرح، پہلے سے "مسلمان" نہیں تھے بلکہ پہلے پہل حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ لہٰذا ان میں کوئی باہمی اختلاف نہ تھا۔ نہ ان کے الگ الگ فرقے تھے، نہ جداگانہ فقہیں۔ وہ کتاب اللہ کو ضابطۂ ہدایت مان کر اسلام لائے تھے۔ بنا بریں ان سب نے بلا تردد و تامل کتاب اللہ کو اپنی مملکت کا ضابطۂ قوانین قرار دے لیا جس کی عملی تعمیل مملکت

کی مرکزی اتھارٹی (نبی اکرمؐ) کی وساطت سے ہوتی تھی۔ یہ صدرِ اوّل کی بات تھی۔ لیکن اب صورتِ حال یہ تھی کہ جس مملکت کی تشکیل کی تجویز زیرِ غور تھی اس میں بسنے والے مسلمان مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان میں شیعہ اور سُنّی تھے۔ پھر سُنیوں میں اہلِ حدیث بھی تھے اور اہلِ فقہ بھی۔ اہلِ فقہ بالعموم چار فرقوں میں منقسم ہوتے ہیں۔ یعنی حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی۔ لیکن مجوزہ پاکستان میں اکثریت حنفیوں کی تھی، اگرچہ یہ بھی دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ یعنی دیوبندی اور بریلوی۔ ان میں سے ہر فرقہ کی فقہ الگ الگ تھی۔ اہلِ حدیث براہِ راست احادیث ہی کو قانونِ شریعت مانتے ہیں لیکن اہلِ فقہ کا مسلک یہ ہے کہ ان کے ائمہؒ نے قرآن اور حدیث پر غور و فکر کے بعد جو ضابطۂ قوانین شریعت مرتب کیا تھا، وہی اسلامی قانون ہے۔ ان میں سے کوئی فرقہ بھی اپنی فقہ کے سوا کسی ضابطۂ قوانین کو اسلامی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ یہ دشواری علامہ اقبالؒ کے پیشِ نظر تھی۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اگر اس صورتِ حال کو بجنسہٖ قائم رہنے دیا جائے تو وہ مملکت متشکل ہی نہیں ہو سکتی کیونکہ مملکت کے وجود کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ اس میں ایک ضابطۂ قوانین نافذ ہو جس کا اطلاق تمام افرادِ مملکت پر یکساں ہو سکے۔ سیکولر نظام نے تو اس دشواری کا حل یہ سوچ لیا کہ پرسنل لاز ہر فرقہ کے الگ الگ تسلیم کر لئے گئے اور پبلک لاز حکومت کے خود ساختہ قوانین قرار پائے جن کا اطلاق تمام باشندوں پر یکساں ہو، لیکن اسلامی مملکت   تو پرسنل لاز اور پبلک لاز میں تفریق نہیں کی جا سکتی، اور دوسرے اس میں خود پبلک لاز کی حیثیت بھی قوانینِ شریعت کی ہوتی ہے۔ عام ملکی قوانین کی سی نہیں ـــ سوال

بنیادی دشواری

قانون سازی کے اصول

یہ تھا کہ کیا ان حالات میں ایسی اسلامی مملکت قائم کی جا سکتی ہے جس میں ایک ہی ضابطۂ قوانین تمام مسلمانوں پر یکساں نافذ ہو سکے۔ یہ تھا وہ سوال، جس کا جواب علامہ اقبالؒ نے اپنے مجموعۂ خطبات کے چھٹے خطبہ میں نہایت شرح و بسط سے دیا۔ انہوں نے سب سے پہلے اس غلط فہمی کو دور کیا کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اس وقت جو قوانین؍ احکامِ شریعت کے نام سے رائج ہیں وہ سب کے سب غیر متبدل ہیں۔ انہوں نے کہا کہ :-

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلّی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس، اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا

بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں ـــــ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ـــــ تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع قطع اور ترکیب میں کونسا اصولِ حرکت کارفرما ہے۔ یہ اصول وہی ہے، جسے اجتہاد کہتے ہیں۔

انہوں نے اس حقیقت کو، اِس خطبہ کی آخری سطور میں، اِن الفاظ میں دہرایا:۔

زندگی کی روحانی بنیاد، مسلمان کا ایمان ہے۔ ایسا ایمان جس کی خاطر ہم میں سے کم سے کم پڑھا لکھا آدمی بھی بلا توقف و تامل اپنی جان تک دے دینے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختمِ نبوت کے) اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیلِ جدید کرے اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل و غایت ہے۔ لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔

اِس اصول کو بیان کرنے کے بعد انہوں نے کہا کہ اسلامی ضابطۂ قوانین میں غیر متبدل صرف خدا کی کتاب ہے۔ اس کی روشنی میں جس قدر قوانین و ضوابط مرتب کئے جائیں گے، ان میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی کی جا سکتی ہے، اور یہ تبدیلی اسلامی مملکت کرے گی۔ انہوں نے اِس نقطہ کی وضاحت کرتے ہوئے اُسی خطبہ میں کہا:۔

آیئے اب ایک نظر اُن اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی

رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس، ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہ نمائی سے ہمارے قدیم فقہانے، قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے۔ اور اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ انہی فقہا کی بالغ نظری کا رہینِ منت تھا۔ چنانچہ فان کریمر اس سلسلے میں لکھتا ہے کہ:-

> رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (اربعہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہادِ مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے (پچھلے صفحات میں) ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیائے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکرِ انسانی کی نشو و ارتقاء سے وجود میں آگئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہبِ فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو قطعی، کامل، مختتم اور سہو و خطا سے مبرّا سمجھا؟ کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصولِ اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل، میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عملِ ارتقاء ہے، اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتی ہے لیکن اسلاف کے فیصلے اس کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔

اِس کے بعد سوال احادیث کی صحیح پوزیشن کا آتا ہے۔ یہ سوال جس قدر اہم ہے، اسی قدر نازک بھی ہے۔

نازک اس لئے کہ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس و اعظم کے ساتھ عقیدت و محبت مسلمان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہے (اور ایسا ہونا ہی چاہیئے) اس لئے جس چیز کی نسبت بھی حضورؐ کی طرف کر دی جائے، وہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتا کہ کوئی اسے چھوئے تک بھی — اسی جذبہ کے تحت ہمارے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ جس نظریہ یا مسلک کی تائید میں کوئی حدیث پیش کر دی جائے، اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ ہر فرقہ اپنے مسلک کی تائید میں کوئی نہ کوئی حدیث پیش کر دیتا ہے، اس لئے اس کے نزدیک اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بنا بریں علامہ اقبالؒ کے نزدیک، بنیادی سوال یہ تھا کہ احادیث کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔

احادیث کی پوزیشن

اِس موضوع پر انہوں نے اپنے مذکورہ بالا خطبہ میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ غور سے سنیئے کہ اس باب میں وہ کیا فرماتے ہیں۔ لیکن ایسا کرتے وقت اسے فراموش نہ کیجئے کہ یہ کچھ کہنے والا نہ منکرِ حدیث ہے نہ منکرِ شانِ رسالتؐ — (قلبِ اقبالؒ تو عشقِ محمدیؐ میں گداز تھا) وہ اِس نازک ترین مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

> احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے علیٰ حالہ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسولؐ اللہ نے علیٰ حالہ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذالعمل رکھنا مقصود تھا۔ اِس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریقِ تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسولؐ کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اوّلین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبرؑ کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے، کیونکہ نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں، اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلکِ زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور

خمیر استعمال کرتا ہے۔ اِس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن ان اصولوں کا نفاذ اُس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اُس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رُو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں۔ اور چونکہ اِن احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امامِ اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانہ میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ یہ صحیح نہیں کم از کم امام مالکؒ اور زہریؒ کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحب تک پہنچ نہیں پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں تو اگر امام صاحب اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، مَیں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق، جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔

ان تفصیلی مباحث کے بعد انہوں نے کہا کہ اب جو اسلامی مملکت قائم ہو اس میں قانون سازی کی صورت یہ ہونی چاہیئے کہ قرآن کریم کی غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے، مملکت جزئی قوانین (BY - LAWS) خود مرتب کرے۔ لیکن انہیں اس کا بھی احساس تھا کہ ایسا کرنے کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہوگی کیونکہ جذبانیت کی وجہ سے اس کی سخت مخالفت ہوگی۔ اس باب میں انہوں نے کہا کہ:۔

وہ سب سے بڑا سوال جو اس وقت ترکوں کے ——— اور جو زود یا بدیر

حسبنا کتاب اللہ

دیگر مسلم اقوام کے ___ سامنے آنے والا ہے۔ یہ ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقا کی گنجائش ہے یا نہیں؛ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہیئے، بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ:۔

حسبنا کتاب اللہ

(ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے)

اقبالؒ نے یہ نظریہ ۱۹۲۸ء میں پیش کیا اور اس کے بعد وہ ۱۹۳۰ء میں مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کا تصور سامنے لے آئے۔ اس وقت سطح بین لوگوں نے اسے ایک فلسفی کے فریب تخیل یا ایک شاعر کے حسین خواب سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ لیکن جب بعد میں نظر آیا کہ یہ خواب ایک عملی تعبیر

اسلامی مملکت کے قیام کی مخالفت

کی شکل اختیار کر رہا ہے تو چاروں طرف سے مخالفت کا ہجوم اُمنڈ کر آ گیا۔ اس مخالفت میں (یعنی تصورِ اقبالؒ کی اسلامی مملکت کے قیام کی مخالفت میں) اگرچہ ہندو اور انگریز پیش پیش تھے، لیکن اس قسم کی مملکت کا قیام دنیا کی کسی قوم کے لئے بھی خوش آئند نہ تھا۔ لہٰذا اس کے قیام کی مخالفت بالواسطہ یا بلاواسطہ ہر گوشے سے ہوئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہندو نہیں چاہتا تھا کہ انگریز سے آزادی حاصل کر لینے کے بعد جس پورے ملک پر وہ اپنی اجارہ داری قائم رکھنا چاہتا ہے اس کا اتنا بڑا ٹکڑا اس کے خیطۂ اقتدار سے نکل جائے۔ دوسری طرف انگریزی سیاست کی مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ہندوستان ایک غیر منقسم ملک رہے۔ اس لئے ان دونوں کی طرف سے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت لازمی تھی۔ ان کی مخالفت کی یہ وجوہات بھی ایک حد تک قابلِ فہم تھیں۔ لیکن اس کی بنیادی وجہ کچھ اور تھی، اور وہ یہ کہ دنیا کی کوئی قوم، کوئی مملکت اور کوئی مذہب بھی اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ (ساری دنیا میں نہ سہی) اس کرۂ ارض کے کسی ایک خطہ میں بھی قرآنی نظام قائم ہو جائے۔ اس لئے کہ اس نظام کے قیام سے نہ ملوکیت باقی رہتی ہے نہ سیکولرازم۔ نہ وطنی قومیت کا وجود باقی رہتا ہے نہ امپیریلزم کا۔ نہ ڈکٹیٹرشپ باقی رہتی ہے نہ مغربی جمہوریت۔ نہ سرمایہ داری کا نظام قائم رہتا ہے نہ کمیونزم اور اشتراکیت جیسی ازمز۔ نہ مذہبی پیشوائیت باقی رہتی ہے نہ تھیاکریسی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے۔ دنیا نے دیکھ لیا تھا کہ جب (چودہ سو سال پہلے) ایک خطۂ ارض میں قرآنی نظام قائم ہوا تھا تو جہانِ سیاست اور دنیائے مذہب کے تمام بت کس طرح ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے تھے۔ اسی خطرہ کے پیشِ نظر قریش نے اس نظام کے

قیام کی اس درجہ مخالفت کی۔ اور اس کے بعد جب یہ نظام قائم نہ رہا تو ساری دنیا کی کوشش یہ رہی کہ یہ نظام دوبارہ قائم نہ ہو جائے۔ ہمارے زمانے میں اقوامِ عالم کا یہ اندیشہ اور بھی زیادہ لرزہ انگیز ہو گیا ہے کیونکہ دنیا نے مختلف قسم کے نظام ہائے سیاست و معیشت کو آزما کر دیکھ لیا ہے کہ وہ انسانی مشکلات کے حل میں کس طرح ناکام ثابت ہو گئے ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے علامہ اقبالؒ نے "ارمغانِ حجاز" کی اُس نظم میں ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے جو میرے نزدیک ان کی قرآنی بصیرت اور سیاسی دُوررسی کا نچوڑ ہے۔ اس میں منظر یہ پیش کیا گیا ہے کہ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ (کابینہ) کا اجلاس ہو رہا ہے جس میں ابلیس کا ہر مشیر، اپنے اپنے دائرۂ کار پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بتاتا ہے کہ اس کے نزدیک ان کے نظام، یعنی ابلیسی نظام، کے مستقبل کو خطرہ کس کس گوشے سے ہے۔ کوئی نازی ازم کو خطرہ کا موجب بتاتا ہے، کوئی فاشزم کو۔ کوئی جمہوریت کو، کوئی کمیونزم کو۔[1] ابلیس ہر ایک کی رپورٹ کو بغور سُنتا ہے لیکن ان کی آراء کو مسترد کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اُن سے کہتا ہے تمہیں مَیں بتاتا ہوں کہ ابلیسی نظام کے مستقبل کے لئے حقیقی خطرہ کون سا ہے :-

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اِس اُمت سے ہے — جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اِس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ — کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

اس کے ساتھ ہی اس نے کہا کہ :-

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں — بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں!

انہوں نے پوچھا کہ پھر اس کا علاج کیا ہے۔ اس نے کہا کہ علاج اس کا بڑا آسان ہے۔ تم اِس اُمت کو اِس قسم کے مسائل میں اُلجھائے رکھو کہ :-

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے — ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے — یا مجدد، جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم — امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں — یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟

---

[1] یہ نظم ۳۷-۱۹۳۶ء میں لکھی گئی تھی۔

کرنے کا کام یہ ہے کہ :-

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو، مزاجِ خانقاہی میں اسے

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے — تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام — چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر — جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں — ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

یہ تھا وہ حقیقی خطرہ، جس کی بنا پر ہندو، مطالبۂ پاکستان کی مخالفت میں اس قدر متشدد تھا۔ ہم عزیزانِ من! اسلامی نظام کی خصوصیات کو اجاگر کرنے کے لئے دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں۔ مسجّع نظمیں لکھتے ہیں۔ مرصّع مقالات تحریر کرتے ہیں۔ لیکن اس سے کسی قوم کو، کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ یہ سب شاعری ہے۔ لیکن اقبالؒ کی اسکیم میں یہ شاعری حقیقت بن رہی تھی۔ ہندو اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر ہندوستان کے دیوار بدیوار ایک ایسی مملکت قائم ہوگئی جس میں قرآن کا نظام نافذ ہوگیا تو اس کے درخشندہ نتائج اس قدر دلکش اور انسانیت ساز ہوں گے کہ ان کے سامنے ان کے ہاں کا مذہبی اور سیاسی نظام ایک دن بھی نہیں ٹھہر سکے گا۔ بنابریں وہ مسلمانوں کی الگ مملکت کے اس قدر مخالف نہیں تھے جس قدر وہ مسلمانوں کی ایسی مملکت کے خلاف تھے جس میں صحیح اسلامی نظام قائم ہو۔ اِس ضمن میں، مَیں ان کے چند ایک چوٹی کے لیڈروں کے خیالات آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ انہیں غور سے سنیئے۔ واضح رہے کہ یہ الفاظ فضا میں پھیل تو رہے تھے ہندو لیڈروں کی زبان سے، لیکن یہ درحقیقت ترجمان تھے اس خطرہ کے، جسے دنیا کی تمام بڑی بڑی قومیں یکساں طور پر محسوس کر رہی تھیں کہ ——— ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں ——— سُنیئے کہ ہندو لیڈر اس باب میں کیا کہتے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح حیات (میری کہانی) میں لکھا تھا کہ :-

ہندوؤں کی طرف سے مخالفت

> جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہا جاتا ہے، اِسے ہندوستان اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہوگیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت، اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو کی ہے۔ (صفحہ ۱۶۱)

ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے سب سے بڑے لیڈر، مسٹر گاندھی، جنہیں ہندو ایشور کا اوتار کہا کرتے تھے، بار بار کہتے تھے :-

> اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو بالکل الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم! میں اس کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی

معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ۔ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے...... مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔

(ہریجن مورخہ ۹ر دسمبر ۱۹۴۶ء)

وہ کہا کرتے تھے کہ مذہب کو سیاست کے ساتھ پیوست کر دینے کا نتیجہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ قومیں قرار دیا جا رہا ہے اور اسی بنا پر مسلمانوں کے لئے جداگانہ مملکت کا مطالبہ کیا جاتا ہے:-

اگر مذہب کو اس کے مقام پر رہنے دیا جائے ـــــ یعنی ایک نجی کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق، تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں اور ان کی راہِ عمل بھی مشترک ہو۔

(ہندوستان ٹائمز۔ ۹ر جون ۱۹۴۰ء)

کانگریس کے ایک اور چوٹی کے لیڈر، مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے ایوانِ اسمبلی میں، جس میں وہ کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے، پکار کر کہا کہ:-

اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آ چکا ہے کہ ہم اعتراف کر لیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام، یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے، اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم نہ سکتا ہے۔ عصرِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت اس نظریے پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔

(ہندوستان ٹائمز ۵ستمبر ۱۹۳۸ء)

جب پاکستان کا تصور زیادہ وسعت کے ساتھ پھیلنے لگا تو انڈیا کے اہم نیشنلسٹ اخبار ـــ ہندوستان ٹائمز ـــ نے اپنی ۴ار نومبر ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں لکھا کہ:-

حکومتِ الٰہیہ کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور مسلمانوں کا فعل عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش

کریں، جہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں یا اِس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامت خوش آئند ہے کہ خود مسلمانوں کے ذمہ دار راہ نما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے۔

مسلمانوں کے ذمہ دار راہ نماؤں" سے مراد تھی نیشنلسٹ علماء اور کانگریسی مسلمان یہ خیال اور احساس کہ مسلمان دین کی بنیادوں پر مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں، اُس وقت ہندوؤں کے دل میں کس قدر گہرا ناسور بن گیا تھا، اس کا اندازہ اِس سے لگائیے کہ ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ پر بھارت نے بہت بڑا جشن منایا۔ پارلیمان نے اِس کامیابی پر مسز اندرا گاندھی کی خدمت میں ہدیۂ مبارکباد پیش کیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اُس نے اِس کے جواب میں کیا کہا تھا۔ اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم نے بہت بڑا میدان مارا ہے۔ اس نے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ ہم نے ایک ملک فتح کر لیا ہے، اس نے کہا یہ تھا کہ :-

یہ کامیابی نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہی حکومت کی کامیابی۔ یہ کامیابی ہے حق پر مبنی نظریہ کی، اُس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریکِ پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے۔ یہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب پچیس سال کے تجربے نے بتا دیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے وہ حق تھا، اور ان کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔

(ہندوستانی پارلیمان کی روئیداد)

ہندوؤں نے تقسیمِ ہند کو دل پر پتھر رکھ کر تسلیم تو کر لیا لیکن مملکتِ پاکستان کے خلاف ان کے دل میں عداوت اور مخالفت کے شعلے برابر بھڑکتے رہے اور ان کی طرف سے اِس قسم کے اعلانات ہوتے رہے کہ اگر مسلمان، پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے کا خیال چھوڑ دیں تو ہم ان کی مخالفت نہیں کریں گے۔ مثلاً ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت کے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھا کہ :-

اگر کشمیر کا مسئلہ پُرامن طریق سے طے ہو جائے اور پاکستان اسلامک اسٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے، تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائیگا۔

ہندو لیڈروں کے ان اعلانات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اگرچہ وہ سیاسی طور پر بھی

تقسیمِ ہند کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن ان کی اصل وجہِ مخاصمت یہ تھی کہ مسلمان پاکستان کو اسلامی مملکت بنانا چاہتے ہیں۔ اِس تصوّر کے ماتحت راجہ مہندر پرتاب نے ۱۹۵۰ء میں اپنی قوم کو مشورہ دیا تھا کہ:-

> جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا، ہمارا ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ لابدی ہو گئی ہے۔ بنابریں میں حکومتِ ہند کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو ساتھ ملا کر، پاکستان کو ختم کر دے۔
> (ویر بھارت۔ مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۵۰ء)

ملک گیر سطح پر ہندوؤں نے پاکستان کے خلاف یہ جنگ ۱۹۶۵ء میں چھیڑی اور اس میں شکست کھانے کے بعد وہاں کے وزیرِ دفاع مسٹر چاوّن نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ:-

> پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اُسی دن سے مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس دن پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ اختلاف اور دشمنی مہینے یا ہفتہ بھر کی نہیں۔ بلکہ سالہا سال تک رہے گی۔ بھارت کو اِس کے لئے ایک تازہ اور فیصلہ کن جنگ کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ (طلوعِ اسلام۔ ستمبر ۱۹۷۴ء)

مطالبۂ پاکستان کی مخالفت ہندو اور انگریز دونوں کی طرف سے ہو رہی تھی۔ ہندوؤں کے خیالات ہم نے اوپر دیکھ لئے۔ جہاں تک انگریز کا تعلق ہے وہ بھی اس تصوّر کو ایک لمحہ کے لئے برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ دنیا کے کسی حصّے میں اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ چنانچہ آج سے بہت پہلے لارڈ کرومر نے کھُلم کھُلا کہا تھا کہ:-

> اگر مسلمان ممالک آزاد ہونا چاہیں تو ہم ان کو آزاد کر دیں گے لیکن اگر وہ اپنی اسلامی حکومت قائم کرنا چاہیں تو ہم یہ ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔
> (ہفتہ وار ایشیا۔ مورخہ ۱۸ جولائی ۱۹۷۶ء)

ہندوؤں کا یہ اندیشہ کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت قائم کرنے کے لئے حاصل کیا جا رہا ہے، کسی قیاس پر مبنی نہیں تھا۔ علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں اِس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں بیان کیا اور پھر وہ اپنی عمر کے آخری لمحات تک اسے دہراتے چلے گئے۔ اس ساتھ قائدِاعظم محمد علی جناحؒ بھی واشگاف

قائدِاعظمؒ کی تصریحات

الفاظ میں پکار پکار کر کہتے رہے کہ پاکستان سے مقصود ہی یہ ہے کہ اُس میں قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم کی جائے گی۔ بس عزیزانِ من! اس موضوع پر اتنا کچھ لکھتا چلا آ رہا ہوں کہ میرے خیال میں اُسے دُہرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اِس مقام

پر صرف دو ایک حوالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ انہوں نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس منعقدہ ۱۸ رمارچ ۱۹۴۴ء میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

> پاکستان کا مطالبہ اب کروڑوں مسلمانوں کے نزدیک جزوِ ایمان بن چکا ہے۔ یہ اب ایک نعرہ نہیں رہا۔ مسلمانوں نے اِس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ان کی حفاظت، نجات اور مقدر کا واحد ذریعہ پاکستان ہے۔ وہ پاکستان کہ جب وہ وجود میں آگیا تو ساری دنیا میں یہ آواز گونج اٹھے گی کہ ہاں! اب ایک ایسی مسلم اسٹیٹ کا قیام عمل میں آگیا ہے جو اسلام کے ماضی کی درخشندہ عظمت و شوکت کا احیاء کرے گی۔
>
> (تقاریرِ جناح۔ جلد دوم۔ صفحہ ۸۵)

متفرق طور پر تو انہوں نے اِس حقیقت کو بار بار اور مختلف مقامات پر دہرایا لیکن انہوں نے جن جامع الفاظ میں اِسے اگست ۱۹۴۱ء میں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد (دکن) کے طلباء کے ایک سوال کے جواب میں سمجھا دیا، وہ اِس موضوع پر حرفِ آخر اور قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ:۔

> اسلامی حکومت کے تصوّر کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عمل ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً، نہ کسی بادشاہ کی اطاعت، ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت' دوسرے الفاظ میں' قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی کا نام ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ (بحوالہ اورینٹ پریس اوف انڈیا)

اِس موضوع پر مجھے اِس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت اِس لئے بھی نہیں کہ خود ہندو لیڈر واضح الفاظ میں اس کا اعتراف اور اعلان کرتے تھے۔ مثلاً یکم نومبر ۱۹۴۱ء کو لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت ہندوؤں کے مشہور راہنما مسٹر منشی نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:۔

> تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سُن لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مسکن بنالیں جہاں طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اُردو ان کی قومی زبان بن سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا وہ خطۂ ارض ہوگا، جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔

ہندوؤں نے جب دیکھا کہ پاکستان کا مطالبہ اسلام کے نام پر کیا جا رہا ہے تو انہوں نے اِس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ اس کی روک تھام کا اس کے سوا مؤثر طریقہ کوئی نہیں کہ خود اسلام کے نام پر اس کی مخالفت کی جائے۔ اِس کے لئے انہوں نے نیشنلسٹ علماء کو آگے بڑھایا۔ اِن میں (بہ استثنائے چند) علمائے دیوبند شامل تھے جن کے سربراہ مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنا لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ علمائے دیوبند، ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرنے کے مؤید کبھی بھی نہیں تھے۔ وہ متحدہ قومیت اور سیکولر نظام کو عین مطابقِ اسلام سمجھتے تھے۔ اخبار مدینہ (بجنور) کی ۱۷ اپریل ۱۹۴۳ء کی اشاعت میں، اسرار احمد آزاد صاحب کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ جس کی جلی سُرخیاں یہ تھیں۔

نیشنلسٹ علماء

(۱) علمائے اسلام اور دارالعلوم دیوبند کا جنگِ آزادی میں حصّہ۔

(۲) یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علمائے ہند اس ملک میں سلطنتِ اسلامیہ کے لئے کوشاں رہے۔

اِس دعویٰ کے ثبوت میں اُس مقالہ میں لکھا تھا:۔

> دارالعلوم دیوبند کے ساتھ تعلق رکھنے والے علماء نے آزاد ہندوستان کی جو پہلی جلا وطن حکومت کابل میں قائم کی تھی، اس کا صدر راجہ مہندر پرتاپ کو مقرر کیا تھا جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دارالعلوم کے قیام کے بعد پچاس سال کی مدت میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں ان کے ماتحت، دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اِس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کے قیام کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔

سیکولر جمہوری نظام کا یہی تھا وہ تصوّر جسے تحریکِ آزادی کی تائید میں نیشنلسٹ علماء پیش کرتے تھے۔ (مثلاً) مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کا ارشاد تھا کہ "ایسی جمہوری حکومت، جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی۔ سب شامل ہوں، حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصولوں کے عین مطابق ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے۔" (زمزم۔ مورخہ ۷ رجولائی ۱۹۳۸ء)

جہاں تک ہندوستان کی سیکولر جمہوری حکومت میں مذہبی آزادی کی ضمانت کا تعلق تھا، مولانا مرحوم اس سلسلے میں فرماتے تھے کہ:۔

> کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہب اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ لگے۔
>
> (مولانا کا پمفلٹ۔ متحدہ قومیت اور اسلام۔ صفحہ ۶۱)

اصل یہ ہے کہ ان حضرات کے سامنے اسلام بحیثیت دین کے تھا ہی نہیں۔ وہ اسے دیگر مذاہب کی طرح، ایک مذہب ہی سمجھتے تھے اور مذہبی آزادی سے ان کی مراد تھی نماز روزہ، نکاح طلاق کی آزادی۔ اِسی بناء پر علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ :-

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت — ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

نیشنلسٹ علماء کے ساتھ احرار، سرحد کے خدائی خدمت گار، آزاد انصار وغیرہ جماعتیں بھی تحریک پاکستان کے خلاف متحدہ محاذ میں شریک تھیں۔ لیکن کانگریس کے بے پناہ فنڈز کے باوجود انہیں کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اس لئے کہ، پہلے علامہ اقبالؒ اور ان کے بعد قائدِاعظمؒ نے اسلامی مملکت اور دو قومی نظریہ کے متعلق اس شرح اور بسط سے خیالات کو عام کیا تھا کہ متحدہ قومیت اور سیکولر جمہوری نظام مسلمانوں کو اپیل ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس مقام پر ہندوؤں (اور میرا خیال ہے کہ ان کے ساتھ انگریز کو بھی) سوچنا پڑا کہ تحریکِ پاکستان کی مخالفت کے لئے متبادل انتظام کیا کیا جائے ؟ ظاہر ہے کہ اس کے لئے کوئی ایسا شخص ہی موزوں ہو سکتا تھا جس کا ماضی تو کانگریس کے ساتھ وابستہ ہو لیکن وہ نیشنلسٹ علماء کی صف میں شریک نہ ہو، اور اپنے آپ کو وہ اقبالؒ کے نظریات کے مؤید کی حیثیت سے متعارف کرائے۔ قرآئن کی شہادت اور متقبل میں پیش آنے والے واقعات، قیاس کا رُخ اس طرف منتقل کرتے ہیں کہ اس کے لئے اُن کی

مودودی صاحب

نگہِ انتخاب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب پر پڑی۔ مودودی صاحب چھوٹی عمر میں صحافت کے پیشے سے منسلک ہو گئے تھے۔ چنانچہ خود ان کی اپنی روایت کے مطابق، 1919ء میں، جب "خلافت اور ستیہ گرہ" کی تحریک کا آغاز ہوا، تو انہوں نے اس میں بھی حصہ لیا۔ اُسی زمانے میں انہوں نے گاندھی جی کی سیرت پر بھی ایک کتاب لکھی۔ مگر ابھی وہ زیرِ طبع تھی کہ ان کے ایک عزیز نے پولیس سپرنٹنڈنٹ سے اس کی شکایت کی اور اُسے ضبط کرا دیا۔ (مولانا مودودی ——— دعاوی اور عمل۔ شائع کردہ۔ سندھ ساگر اکاڈیمی۔ لاہور۔ ص ۳) اِس کے بعد مودودی صاحب جبل پور (سی۔ پی) کے ایک نیشنلسٹ اخبار "تاج" کے ایڈیٹر ہو گئے۔ اُس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ "کچھ مدت تک یہ اخبار ہفتہ وار نکلتا رہا، پھر روزانہ ہو گیا اور میں تنہا اس کو چلاتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے وہاں عملاً سیاسی کام بھی کیا۔ جبل پور میں خلافت کی تحریک کا آغاز اور وہاں کے مسلمانوں کو کانگریس کے ساتھ شریک کرنے والوں میں ایک میں بھی تھا۔" (ایضاً) اس کے بعد کیا ہوا۔ اس کے متعلق بمبئی کے مشہور کانگریسی اور احراری لیڈر علی بہادر خان کے اخبار "ہلالِ نو" کے اس اقتباس کو دیکھئے۔

۲۸ برس قبل، جب جبل پور میں، مولانا مودودی کے ایک مقالہ پر تاج کے پرنٹر پبلشر گرفتار ہوئے تو مولانا مودودی جو تاج کے ایڈیٹر

> مجھے گرفتاری سے بچنے کے لئے یکایک دہلی روانہ ہو گئے اور ان کے اِس فعل کی وجہ سے راقم الحروف کا مستقبل کچھ سے کچھ ہو گیا۔ جبل پور کے قوم پرست مسلمانوں اور کانگریسی ہندوؤں نے مجھے تاج کی ادارت پیش کی۔ اور میں نے قبول کر لی۔ یہاں سے میری صحافت کا دور شروع ہوتا ہے۔ نہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اس اخبار کو لاوارث چھوڑ کر یکایک جبل پور سے روانہ ہو جاتے، نہ میں اس پیشہ میں قدم رکھتا۔ ان کے جیل سے بچنے کے جذبہ نے میری زندگی کو بدل ڈالا۔
>
> (ہلالِ نو۔ بمبئی۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۵ء۔ بحوالہ جماعت اسلامی پر ایک نظر ص ۱۴)

۱۹۲۴ء میں مودودی صاحب، جمعیت العلمائے ہند کے اخبار "الجمعیۃ" سے وابستہ ہو گئے۔ یہ اخبار نیشنلسٹ علماء کا سب سے مشہور ترجمان تھا۔ وہ ۱۹۲۹ء تک اس اخبار سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد جب اس اخبار کی مالی حالت خراب ہوئی تو وہ حیدر آباد (دکن) چلے گئے جہاں ان کے برادرِ بزرگ، محترم ابوالخیر مودودی صاحب سررشتۂ تالیف و ترجمہ سے وابستہ تھے۔ (غالباً) ۱۹۳۳ء میں مولانا مودودی صاحب نے ماہنامہ ترجمان القرآن کی ادارت کا فریضہ سنبھالا۔ وہاں یہ کانگریسی خیالات کی تبلیغ نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے اس رسالے میں ایسے مضامین لکھنے شروع کئے جن سے علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ نظریۂ قومیت کی تائید ہوتی تھی۔ اُس زمانے میں ابھی طلوعِ اسلام کا اجراء عمل میں نہیں آیا تھا، اس لئے اگر کسی گوشے سے بھی اسلامی نظریۂ قومیت کی تائید ہوتی تھی تو تحریکِ پاکستان کے حلقوں میں وہ آواز بڑی مقبول ہو جاتی تھی۔ اِس طرح "اقبالی حلقہ" میں مودودی صاحب فکری طور پر متعارف ہوئے۔ یہاں سے ایک ایسے مرحلہ کا آغاز ہوتا ہے جہاں اس ہیچمیرز کا نام بھی شریکِ داستان ہو جاتا ہے۔ اِس کے لئے میں احباب سے معذرت خواہ ہوں۔

طلوعِ اسلام کا اجراء

جب نیشنلسٹ علماء کی طرف سے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت شدت تک پہنچ گئی تو ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی ایسا آرگن ہو جو ان کی طرف سے اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب خدا اور رسولؐ کے ارشادات کی روشنی میں دے۔ اس کے لئے قرعۂ فال اس "دیوانے" کے نام پر پڑا اور قائداعظمؒ کے ارشاد کی تعمیل میں[1] ماہنامہ طلوعِ اسلام کے اجراء کی تجویز زیرِ غور آئی۔ میں مرکزی حکومتِ ہند کی

---

[1] محترم میاں بشیر احمد (مرحوم) نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے محرک علامہ اقبالؒ تھے۔ حضرت علامہ کے ارشاد کی تعمیل میں پہلے طلوعِ اسلام محترم سید نذیر نیازی صاحب کے زیرِ اہتمام اور زیرِ ادارت شائع ہوتا تھا۔ لیکن چند ہی شماروں کے بعد وہ بند ہو گیا تو ۱۹۳۸ء میں اسی نام سے یہ رسالہ جدید اہتمام کے تحت شائع کیا گیا۔

ملازمت سے منسلک تھا اس لئے ضابطہ کی رو سے اس مجلہ پر کسی حیثیت سے میرا نام نہیں آ سکتا تھا۔ اگرچہ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ مجھے قائدِاعظمؒ کی خدمت میں شرف باریابی بھی حاصل تھا اور فکرِ اقبالؒ کے شیدائی اور مبلغ ہونے کی بنا پر تحریکِ پاکستان کے فروغ کے لئے میری مساعی کا بھی عام چرچا۔ اس زمانے میں تو مجھے ایسا سوچنے کا ہوش ہی نہیں تھا۔ لیکن جب میں آج اس دَور پر نگاہِ بازگشت ڈالتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ میں اس آگ سے کس طرح بیباکانہ کھیلتا رہا جس کے قریب تک جانے کی بھی ملازمین سرکار جراُت نہیں کرتے تھے۔ میں نے تو کبھی اس کا ذکر کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا، لیکن پیر علی محمد راشدی صاحب نے اس دَور کے واقعات قلمبند کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کا ایک مبسوط مقالہ، روزنامہ جنگ (کراچی) کی ۸ نومبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا۔

> ۱۹۳۸ء سے لے کر آخر ۱۹۳۹ء تک میں دہلی میں رہا۔ میں اس کمیٹی سے وابستہ تھا (بلکہ اس کا سیکرٹری) تھا جو پاکستان اسکیم بنا رہی تھی۔ آخر ۱۹۳۹ء سے وسط ۱۹۴۰ء میں لاہور میں رہا جہاں وہ تاریخی اجلاس ہوا، جس میں قراردادِ پاکستان منظور ہوئی۔ یہ سارا عرصہ مجھے یہ ضرورت رہی کہ مسلمان سرکاری افسروں کے تعاون سے پاکستان اسکیم کے سلسلے میں ضروری معلومات حاصل کروں اور اگر ہو سکے تو لیگ کے اجلاس کو کامیاب بنانے کے سلسلے میں ان کی مدد سے فائدہ اٹھاؤں۔ مگر مجھے سارے ہندوستان میں سوائے تین کے اور کوئی بڑے عہدے پر لگا ہوا مسلمان افسر نہیں ملا جو نظریۂ پاکستان کا حامی ہو یا اس نظریہ کو صحیح ثابت کرنے اور اس کو پھیلانے کے کام میں مدد دے سکے۔ یہ تین افسر تھے۔
>
> (۱) مرحوم و مغفور جسٹس شاہ سلیمان۔ جو اُس وقت فیڈرل کورٹ کے جج تھے۔
>
> (۲) غلام احمد صاحب پرویز، جو اس زمانے میں مرکز کے کسی محکمہ میں ملازم تھے۔ اور
>
> (۳) خواجہ عبدالرحیم صاحب، جو اُس زمانے میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھے۔
>
> مجھے کبھی فرصت ملی تو اُس دَور کے واقعات تفصیل کے ساتھ لکھوں گا جس سے من حیث الجماعت مسلمان افسروں کی انتہائی سردمہری کی نشاندہی ہو گی۔

اسی سلسلۂ مضامین کی ایک کڑی میں جو ۲۰ مارچ ۱۹۷۲ء کے روزنامہ جنگ (کراچی) میں شائع ہوئی تھی۔ انہوں نے چند ایک دانشوروں کے نام لکھے جنہوں نے پاکستان کی اسکیم کی تیاری میں مدد دی تھی۔ (ان میں بھی میرا نام شامل تھا) اور اس کے بعد لکھا!

> ایک بات خاص طور سے نوٹ کرنے کے قابل تھی۔ وہ یہ کہ جن حضرات کے اسمائے گرامی، میں ابھی بتا چکا ہوں، ان کے سوا کسی اور مسلمان سرکاری افسر نے اس زمانے میں ہماری کوئی مدد نہیں کی بلکہ ان میں سے اکثر تو پاکستان کے تخیل کا مضحکہ اڑاتے تھے اور اس ڈر کے مارے کہ انگریز یا ہندو ان سے خفا نہ ہو جائے وہ ونڈسر پلیس کے راستے سے (جہاں یہ اسکیم مرتب کی جا رہی تھی) گذرتے ہی نہیں تھے۔

بہرحال، یہ تھے وہ حالات، جن میں، مجلّہ طلوعِ اسلام کے اجراء کا قرعہ اس دیوانے کے نام پڑا۔ مودودی صاحب کے مذکورہ بالا مضامین کی وجہ سے ان کے ساتھ میرا تعارف ہی نہیں، مراسم بھی تھے۔ ان کے رسالہ میں میرے مضامین بھی شائع ہوتے تھے اور وہ جب دہلی تشریف لاتے (جو ان کا وطن تھا) تو ان سے اکثر ملاقاتیں بھی رہتیں۔ انہی مراسم کی بنا پر انہوں نے مجھے لکھا کہ حیدرآباد میں ان کی مالی حالت بڑی سقیم ہو چکی ہے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ انہیں طلوعِ اسلام سے وابستہ ہونے کے لئے دہلی آ جانے کی دعوت دوں۔ اسی دوران میں ایک اور واقعہ رونما ہو گیا۔

دارالاسلام ۔ پٹھانکوٹ

علامہ اقبالؒ ایک قرآنی مرکز قائم کرنا چاہتے تھے جس میں دنیائے اسلام کے ممتاز اہل علم و تحقیق، مختلف موضوعات پر ریسرچ میں مصروف ہوں، مذاکروں کا اہتمام ہو، خطبات کا انصرام ہو۔ طلباء تعطیلات گزارنے وہاں آئیں اور اس علمی فضا سے بہرہ یاب ہوں۔ ان کے ایک والہانہ عقیدت مند، چوہدری نیاز علی خاں نے (جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔) اس مرکز کے لئے، یوں کہیئے کہ، ایک جاگیر وقف کر دی۔ اس کا نام دارالاسلام تھا۔ حضرتِ علامہؒ کا ارادہ خود وہاں منتقل ہو جانے کا تھا لیکن جب اس کے ابتدائی مراحل طے ہو گئے تو ان کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ انہوں نے تجویز کیا کہ سرِدست وہاں کوئی ایسا شخص بٹھا دینا چاہیئے جو اس کے مبادیات کی دیکھ بھال کر سکے۔ پہلے خیال ہوا کہ میں، ملازمت چھوڑ کر، وہاں چلا جاؤں۔ لیکن قائدِاعظمؒ نے مجھے اس کی اجازت نہ دی۔ چنانچہ میرے اور چوہدری صاحب مرحوم کے مشورہ سے طے پایا کہ اس کام کے لئے مودودی صاحب کو بلا لیا جائے۔ انہوں نے (غالباً حضرت علامہؒ کے استصواب سے) مودودی صاحب کو دارالاسلام آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ مودودی صاحب ان کی اس دعوت پر دارالاسلام جانے کے لئے حیدرآباد سے

پہلے دہلی آئے۔ میرے ہاں ان کی نشستیں بھی رہیں۔ عام طور پر مشہور کیا جاتا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے مودودی صاحب کو دعوت دی تھی کہ وہ ایک جدید فقہ کی تدوین کریں، اور اسی مقصد کے لئے وہ حیدر آباد سے اِدھر منتقل ہوئے تھے۔ اس کا تو مجھے علم نہیں۔ لیکن اتنا علم ضرور ہے کہ مودودی صاحب، دہلی سے سیدھے دارالاسلام (پٹھانکوٹ) چلے گئے تھے۔ اور راستے میں حضرتِ علامہؒ سے ملاقات کے لئے لاہور ٹھہرے بھی نہیں تھے۔ نہ ہی وہ وہاں سے ان کی عیادت کے لئے لاہور آئے تھے (حالانکہ اس زمانے میں علامہؒ یوں کہئے کہ مرض الموت میں مبتلا تھے) اور نہ ہی اپریل ۱۹۳۸ء میں ان کی وفات کے بعد ان کی تعزیت کے لئے۔ حتیٰ کہ انہوں نے ان کی وفات پر اپنے رسالہ ترجمان القرآن میں ایک لفظ تک نہیں لکھا تھا — ایک جگہ ضمناً یہ کہا تھا کہ اقبالؒ ان کے لئے ایک مادی سہارا تھا، وہ بھی نہ رہا۔ بہرحال اس طرح یہ حیدر آباد سے منتقل ہو کر دارالاسلام پہنچ گئے۔ مجھے اس کا احساس ہے، اور اب جب میں اس پر نگاہِ بازگشت ڈالتا ہوں، تو اس کوتاہی پر میرا سرِ ندامت جھک جاتا ہے کہ ہم نے اس وقت مودودی صاحب کے متعلق کسی تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہ سمجھی اور ان کے چند ایک مضامین سے یہ سمجھ لیا کہ وہ فکرِ اقبالؒ کے دلی ہم نوا اور تحریکِ پاکستان کے قلبی مؤید ہیں۔ ان نشستوں میں جو میرے ہاں ہوئی تھیں، مجھے ان میں انانیت کے جراثیم کی جھلک نظر آئی تھی لیکن میں نے اسے چنداں اہمیت نہ دی۔ اِدھر آنے کے بعد انہوں نے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا جس میں تحریکِ پاکستان کے بنیادی اصولوں کی تائید ہوتی تھی۔ (یہ ۳۸-۱۹۳۷ء کی بات ہے۔) اس سے ان کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا، ورنہ اس سے پہلے (کم از کم اِن علاقوں میں) انہیں کوئی جانتا تک نہیں تھا۔ بعد میں یہ مضامین ان کی کتاب — مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش۔ حصہ اوّل و دوم — میں شائع کر دیئے گئے۔ ("حصہ اول اور دوم" کی تخصیص کو خاص طور پر ذہن میں رکھئے کیونکہ اس کے بعد حصہ سوم میں یہ اپنی نقاب اُلٹ کر سامنے آگئے تھے)۔ واضح رہے کہ تحریکِ پاکستان کے بنیادی اصول دو ہی تھے — دو قومی نظریہ، جس کے معنی یہ تھے کہ مسلمان اپنے دین کی بنیادوں پر ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ کسی دوسری قوم میں مدغم نہیں ہو سکتے۔ اور دوسرا اصول یہ کہ اسلام کا احیاء مسلمانوں کی اپنی جداگانہ مملکت ہی میں ممکن ہے۔ ہندوستان کا جمہوری نظام لادینی ہوگا جو ان کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ مودودی صاحب کے مذکورہ بالا مضامین کے چند ایک اقتباسات آپ کے سامنے پیش کر دوں تاکہ اِس سے یہ واضح ہو جائے کہ وہ اِن اصولوں کی کس شدومد سے تائید کرتے تھے۔ میرے سامنے اس کتاب کے حصہ اول اور حصہ دوم کا چھٹا ایڈیشن ہے جو تقسیمِ ہند سے پہلے شائع ہوئے تھے۔ میں اِن اقتباسات کو مسلسل مضمون کی شکل میں پیش کر

رہا ہوں۔ لیکن ساتھ کے ساتھ ان کتابوں کے حوالے بھی دیئے جاتا ہوں۔
میں نے حوالے چیک کر لئے ہیں۔ اگر کوئی صاحب انہیں چیلنج کریں، یا یہ کہیں (جیسا کہ یہ اکثر کہہ دیا کرتے ہیں) کہ یہ اقتباس سیاق و سباق سے الگ کر کے، توڑ مروڑ کر دیا گیا ہے، تو آپ ان سے کہیئے کہ وہ متعلقہ کتاب دکھا دیں۔ کتاب دیکھتے وقت اس کے ایڈیشن کا ضرور خیال رکھیئے۔ کیونکہ ان کے ہاں بالعموم کتاب کے نئے ایڈیشن میں کافی ردّ و بدل کیا ہوتا ہے اور اس کا ذکر نہیں کیا ہوتا کہ اس میں اور سابقہ ایڈیشن میں فرق ہے۔ اس لئے حوالہ کے لئے ایڈیشن کا دیکھنا ضروری ہے۔ بہرحال، مودودی صاحب نے (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصّہ اول و دوم میں) لکھا:۔

"پچھلے باب میں ہم نے محض سرسری طور پر مسلمانوں کو اُس انقلاب سے آگاہ کیا تھا جو عنقریب ہندوستان میں رونما ہونے والا ہے اور جس کے آثار اب پوری طرح نمایاں ہو چکے ہیں۔ ہمارا اصل مقصد مسلمانوں کو اس نئے آنے والے انقلاب میں اپنے قومی تشخص اور اپنی تہذیب کی حفاظت کے لئے تیار کرنا ہے۔ (جلد اول۔ ص۱۹)

مودودی صاحب کا پہلا روپ

ہمارے کان خود اپنی قوم کے لوگوں کی زبان سے جب کمیونزم کا پروپیگنڈہ سنتے ہیں۔ متحدہ ہندی قومیت میں جذب ہو جانے کی دعوت سنتے ہیں اور یہ آوازیں بھی سنتے ہیں کہ اسلامی کلچر کوئی جداگانہ کلچر ہی نہیں، تو ہمارا حافظہ ہم کو یاد دلاتا ہے کہ کچھ اِسی نوعیت کی آوازیں اُس وقت بھی بلند ہونی شروع ہوئی تھیں جب سرکارِ برطانیہ کی غلامی کا زریں پھندا ہمارے گلوں میں پڑ رہا تھا۔ (جلد اول صفحہ ۲۲-۲۱)
ہندو کو ہر ایسی قومیت اور ہر ایسے قومی امتیاز سے چڑ ہے جس کی بنیاد مذہب پر ہو... ....ہندوستانی قومیت کا جو نقشہ ان کے پیشِ نظر ہے اس میں مذہبی جماعتوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ وہ تمام امتیازی حدود کو توڑ کر وطنیت کی بنیاد پر ایک ایسی قوم بنانا چاہتے ہیں جس کی اجتماعی زندگی ایک ہی طرز پر تعمیر ہو۔ (جلد اول ص۲۴) صاف سُن لیجئے کہ اِس مرحلہ پر مسلمانوں کو کانگریس کی طرف دعوت دینا دراصل ان کو خودکشی کا مشورہ دینا ہے۔ (جلد اوّل۔ ص۴۰) مسلمانوں کی حیاتِ قومی کو برقرار رکھنے کے لئے وہ چیز بالکل ناگزیر ہے جس کو آجکل سیاسی اصطلاح میں "سلطنت کے اندر ایک سلطنت" (STATE WITHIN STATE) کہا جاتا ہے۔ ان کی سوسائٹی، جن بنیادوں پر قائم ہے وہ استوار ہی نہیں رہ سکتیں جب تک کہ خود ان کی اپنی جماعت میں کوئی قوتِ ضابطہ اور ہیئتِ حاکمہ موجود نہ ہو۔ ایسی ایک مرکزی طاقت کے بغیر کسی غیر مسلم نظامِ حکومت میں رہنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کا اجتماعی نظام رفتہ رفتہ مضمحل ہو کر فنا ہو جائے گا اور وہ بحیثیت ایک مسلم قوم کے زندہ ہی نہ رہ سکیں۔ (جلد اوّل۔ ص۱۴۱) اس وقت مسلمانوں کی جو حالت ہے اس کو دیکھتے

ہوئے شاید بعض لوگ یہ خیال کریں گے کہ ایسا ہونا محال ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ابھی اس قوم کو سنبھالنے کا موقعہ، آخری موقعہ، باقی ہے۔ ہمارے خواص خواہ کتنے ہی بگڑ چکے ہوں مگر ہمارے عوام میں ابھی ایمان کی دبی ہوئی ایک چنگاری موجود ہے اور وہی ہمارے لئے آخری شعاعِ امید ہے۔ (جلد اول ص۲۴) ہندوؤں کا پہلا حملہ اسلامی قومیت پر ہے۔ وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم سرے سے کوئی قوم ہی نہیں ہو۔ یہ محض برطانوی سامراج کا ایک داؤں اور چند سامراجی ایجنٹوں کا پروپیگنڈہ ہے جس نے تمہارے دماغ میں یہ ہوا بھر دی ہے کہ تم ایک قوم ہو۔ حالانکہ سیاسی اور معاشی نقطۂ نظر سے ہندوستان میں صرف ہندوستانی قوم ہی پائی جاتی ہے۔ اور اس قوم کے اندر ایک دوسری قوم کا موجود ہونا، سراسر ایک لغو تخیل ہے۔ (لیکن انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ) مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ ایک قومیت بنانے اور اس میں جذب ہو جانے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ (جلد دوم ص۵) ——— (نیشنلسٹ مسلمان) اس خیالِ خام میں مبتلا ہیں کہ دنیائے اسلام کو انگریزی امپیریلزم کے پنجے سے چھڑانے کی اِس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ آزادیٔ ہند کی اس تحریک کا ساتھ دیا جائے۔ اب اگر اِس میں ہندوستان کی مسلمان قوم ختم ہو جائے تو پرواہ نہیں۔ (جلد دوم صفحہ ۱۹۲) یہاں نظامِ حکومت کا نشو و ارتقاء واحد قومیت کے مفروضے پر جمہوری طرزِ ادارہ کی صورت میں ہو رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حالانکہ حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ یہاں واحد قومیت موجود نہیں ہے اور واحد قومیت جن بنیادوں پر تعمیر ہو سکتی ہے وہ بھی موجود نہیں ہیں۔ (جلد دوم صفحہ ۲۰۰) ایسا جمہوری نظام جب ایک چھوٹی اور ایک بڑی قوم کو ملا کر بنایا جائے گا تو عملاً وہ چھوٹی قوم کو بڑی قوم کا محکوم بنا دیگا۔ اس میں بڑی قوم کو خود اختیاری ملے گی اور چھوٹی قوم کو بے اختیاری (جلد دوم ص۲۰۳)۔ (ان حقائق سے واضح ہو جاتا ہے کہ) واحد قومیت کا مفروضہ اور اس پر جمہوریت کی تعمیر ہی دراصل خرابی کی جڑ اور بِس کی گانٹھ ہے۔ (جلد دوم ۔ ص۲۰۵)۔ (ان تصریحات سے) یہ بات آفتابِ نصف النہار کی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ ہمارے اور (آزادیٔ ہند کی وطن پرستانہ) تحریک کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں۔ ہماری موت اُس کی زندگی ہے اور اس کی موت ہماری زندگی۔ ہمارے اور اس کے درمیان اصول میں، مقاصد میں اور طریق کار میں۔ نہ صرف یہ کہ کسی قسم کا اتحاد نہیں ہے بلکہ درحقیقت کلّی اختلاف ہے۔ ایسا شدید اختلاف کہ کہیں کسی ایک نقطہ پر بھی ہم اور وہ جمع نہیں ہو سکتے۔ (جلد دوم ص۱۹) مسلمانوں کو اپنے نام مسلم پر بڑا فخر ہے۔ خدا کا رکھا ہوا نام اور وہ نام جس سے بڑھ کر عزت و افتخار کا نام آج تک دنیا کی کسی قوم کو نصیب نہیں ہوا۔ (جلد دوم ۔ ص۴۲) "

عزیزانِ من! آپ ان چند اقتباسات پر غور کیجئے۔ اگر میں نے یہ نہ بتایا ہوتا کہ یہ کس شخص کی

تحریریں ہیں تو آپ بلا ادنیٰ تعمق متفقہ طور پر پکار اٹھنے کہ مسلم لیگ کی اسٹیج سے تحریکِ پاکستان کا کوئی بہت بڑا لیڈر تقریر کر رہا ہے۔ جو یہ ثابت کر رہا ہے کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان اپنے مذہب کی بنیاد پر ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی اِس حیثیت کو برقرار رکھنا اور مستحکم کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ اس خطۂ زمین میں مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت قائم ہو۔ کیونکہ آزادی کا اصلی جوہر حکومتِ خود اختیاری سے متمتع ہونا، اور اپنی اجتماعی خواہشات و ضروریات کو پورا کرنے پر آپ قادر ہونا ہے"۔ (حصہ دوم۔ صـ۳۲)

آپ غور کیجئے کہ جو شخص اُس زمانے میں مسلسل دو برس تک اس قسم کے مضامین لکھتا چلا جائے اُسے مسلمانوں میں کس طرح مقبولیت حاصل نہ ہو جاتی، اور کون اس سے دھوکا کھا سکتا؟ —— مودودی صاحب نے اس طرح مسلمانوں میں مقبولیت اور شہرت حاصل کر لی۔

باب دوم

(اصلی رُوپ)

اب اِس داستان کا ایک اور ورق اُلٹیئے اور جو کچھ سامنے آنے والا ہے، حیرت کی نگاہوں سے دیکھئے اور کلیجے پر ہاتھ رکھ کر سنیئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تحریکِ پاکستان اور ہندوستان کی وطنی تحریک کی جنگ انتہائی شدت پر پہنچ رہی تھی، مسلمان، قائدِاعظمؒ کے زیرِقیادت ایک مستحکم قوم کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ انہوں نے پاکستان کا مطالبہ بھی متعین طور پر پیش کر دیا تھا۔ جس کا مظاہرہ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ مارچ ۱۹۴۰ء میں بہانگِ دُہل ہو چکا تھا۔ قوم اس مطالبہ کو لے کر پوری یکجہتی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ نیشنلسٹ علماءؒ اور دوسرے کانگریسی مسلمان لیڈروں کو کوئی پوچھتا تک نہیں تھا، کہ عین اُس وقت مودودی صاحب نے پلٹا کھایا اور یُوں کہیئے کہ اپنے اصلی چہرے کے ساتھ سامنے آ گئے۔ اُنہوں نے اب ایک اور سلسلۂ مضامین شروع کیا جو اُن کے ماہنامہ ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۴۱ء اور مارچ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئے، اور بعد میں جنہیں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم" —— کی صورت میں شائع کیا گیا۔ اِس کتاب کا جو ایڈیشن میرے سامنے ہے اس میں اس ایڈیشن کا نمبر یا سنِ اشاعت درج نہیں، البتہ اس پر یہ لکھا ہے کہ وہ آزمی پریس دہلی میں چھپی تھی، اور چونکہ اس میں جماعتِ اسلامی کے اجتماع منعقدہ اگست ۱۹۴۱ء کی رُوئیداد شامل ہے۔ اس لئے اتنا واضح ہے کہ یہ اگست ۱۹۴۱ء کے بعد شائع ہوئی تھی واضح رہے کہ اِس جنگ میں مخالفین کے مقابلے کے لئے ہتھیار ہمارے پاس دو ہی تھے ایک یہ کہ مسلم لیگ، مسلمانوں کی واحد

نمائندہ جماعت ہے جس کے سربراہ قائدِاعظم محمد علی جناحؒ ہیں اور دوسرا یہ کہ مطالبۂ پاکستان ہمارے دین کا تقاضا ہے۔ یہ خالص اسلامی تحریک ہے۔ یہی وہ دو ہتھیار تھے جن سے ہم تمام مخالفین کو شکست پر شکست دیتے آگے بڑھتے جا رہے تھے کہ عین اُس زمانے میں، مودودی صاحب نے اُس شہرت و مقبولیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، جو اُنہوں نے پاکستانی روپ میں پہلے حاصل کر لی تھی، اس تحریک کی مخالفت شروع کی اور بظاہر بڑے ہی مقدس انداز میں شروع کی۔ اِس کے لئے میں، بنیادی طور پر "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش۔ حصہ سوم" کے اُس ایڈیشن سے اقتباسات پیش کر رہا ہوں، جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ جو اقتباسات سامنے لائے جائیں گے، ان کا حوالہ الگ دیا جائے گا۔ پہلے مسلمان قوم کی حیثیت کو لیجئے۔ مسلم لیگ یا قائدِاعظمؒ کا یہ دعویٰ تھا کہ حصولِ پاکستان، ہندوستان میں بسنے والی مسلمان قوم کا مطالبہ ہے۔

مسلمان قوم کی حیثیت

اس مسلمان قوم کے متعلق مودودی صاحب نے لکھا۔

یہ انبوہِ عظیم، جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ اس کے 999 فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو مسلمان کا نام ملتا چلا آ رہا ہے، اس لئے یہ مسلمان ہیں۔ نہ اُنہوں نے حق کو حق جان کر قبول کیا ہے نہ باطل کو باطل جان کر اُسے ترک کیا ہے۔ اُن کی کثرتِ رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے...... ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے، کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں، حقیقی معنی میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ ان کے اجتماع سے جو کام بھی ہوگا، اسلامی اصول ہی پر ہوگا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔ (جلد سوم۔ ص ۱۳۰)

یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے، وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں، اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ (جلد سوم۔ ص ۱۶۶)

اِن وجوہ سے وہ عظیم الشان تعداد، جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے، اسلامی اغراض کے لئے قریب قریب بالکل بیکار ہو چکی ہے۔ اِس تعداد کے بھروسے پر اگر کچھ کیا جائے گا تو سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ (جلد سوم۔ ص ۵۶)

اگر آپ اِس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا مسلمان نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہ کر سکیں۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوّے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا" ہے۔ (جلد سوم۔ صـ۳۱)

اسلام کو تانبے کے ان سکّوں کا خزانہ مطلوب نہیں جن پر اشرفی کا ٹھپہ لگا یا گیا ہو۔ وہ سکّہ کے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت کرتا ہے کہ ان نقوش کے نیچے خالص سونے کا جوہر بھی ہے یا نہیں۔ ایسا ایک سکّہ ان جعلی اشرفیوں کے ڈھیر سے، اس کے نزدیک، زیادہ قیمتی ہے۔

(جلد سوم۔ صـ۱۶۷)

نہایت معصومیت سے کہہ دیا جاتا ہے کہ فرمایئے! پیدائشی مسلمانوں کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، اُس میں ایک لفظ بھی غلط ہے؟..... کیا اسلامی نقطۂ نگاہ سے اُن کی ٹھیک ٹھیک یہی حالت نہیں۔ اگر مودودی صاحب نے اُن کے صحیح خط و خال واضح کر دیئے تو اس سے کونسا گناہ لازم آ گیا؟

بجا اور درست! لیکن سوال یہ ہے کہ اُس وقت یہ کچھ کہنے کا موقع کونسا تھا اور اس کی ضرورت کیا؟ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ خود مودودی صاحب نے (سیاسی کش مکش کی پہلی دو جلدوں میں) اِس بات پر زور دیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان (جیسے بھی وہ تھے) ایک الگ، منفرد قوم کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کی اِس حیثیت کا باقی رکھنا اور مستحکم کرنا اُن کے مستقبل کے لئے نہایت ضروری تھا۔ اُس وقت علامہ اقبالؒ کے پیغامات اور قائدِاعظمؒ کی مسلسل جدوجہد کے نتیجہ میں وہاں کے مسلمان ایک مستقل قوم کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ اس کا اعتراف خود مودودی صاحب نے بھی کیا ہے۔ اُن کے اپنے قلم سے جماعتِ اسلامی اور تحریکِ پاکستان کے متعلق روزنامہ نوائے وقت (لاہور) کی ۱۴ر اگست ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا ہے۔ اِس میں وہ لکھتے ہیں:۔

یہی وہ زمانہ تھا جس میں مسلم لیگ کانگرس کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک زبردست عوامی قوت کی حیثیت سے قائدِاعظم محمد علی جناحؒ کی قیادت میں اُبھری۔ وطنی قومیت کا طلسم ٹوٹ گیا۔ مسلمان اس کے فتنے سے بچ گئے اور ان کے اندر یہ جذبہ شدت کے ساتھ پیدا ہو گیا کہ ہندوستان میں ان کی قومیت کے امتیازی وجود کو ایک آزاد اور مستقل حیثیت ہونی چاہیئے۔

ہندو کانگریس اور نیشنلسٹ علماء وغیرہ یہ کہتے تھے کہ مسلمان الگ قوم کی حیثیت نہیں رکھتے — مسلم لیگ نے یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان الگ منفرد قوم ہیں۔ ہندوؤں اور نیشنلسٹ مسلمانوں کو اس سے شکست ہوئی۔ عین اُس وقت مودودی صاحب آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بجا اور درست کہ مسلمان، اسلام

کی بنیاد پر ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں کوئی مسلمان ہے بھی؟ یہاں کوئی مسلمان بستا ہی نہیں۔ اور جب یہ لوگ مسلمان ہی نہیں تو ان کے الگ قومیت کے دعوے کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے دیکھا کہ نتیجہ کے اعتبار سے یہ وہی بات ہے جو کانگریسی لیڈر کہتے تھے؛ چنانچہ مودودی صاحب نے برملا کہہ دیا کہ:-

> اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت ہیں، ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ترکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو اِن کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیرمسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟۔ میرے لئے اگر اپنی جوہریت ہی کھو دی تو پھر جوہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کم بخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رل مل جائے۔ (جلد سوم۔ صفحہ)

چلئے۔ قصہ ختم ہوا؛ ذہن کا ذکر کیا یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے ـــــ یہ قوم باقی رہے تو کیا اور ہندوؤں میں جذب ہو جائے تو کیا۔ اس سے کچھ فرق ہی نہیں پڑتا!

یہ تو رہا اُن مسلمانوں کے متعلق، جن کی اکثریت کی بنا پر، مطالبۂ پاکستان پیش کیا جاتا تھا۔ اب آئیے ان کی قیادت (LEADERSHIP) کی طرف۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، اُس وقت کی سیاسی جنگ میں ہمارا مؤثر ترین ہتھیار یہ تھا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اور قائدِاعظمؒ اس کے واحد نمائندہ سربراہ، جو اسلام کے تقاضا کی رو سے جداگانہ مملکت کا مطالبہ پیش کر رہے ہیں۔ اِس قیادت کے متعلق مودودی صاحب نے کیا کیا زہر بکھیرا، اسے غور سے سنیئے۔ انہوں نے کہا:-

> افسوس کہ لیگ کے قائدِاعظمؒ سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔ (جلد سوم۔ صفحہ ۳۷) ایسے لوگوں کو محض اِس لئے مسلمانوں کی قیادت کا اہل قرار دینا کہ وہ مغربی سیاست کے ماہر یا مغربی طرزِ تنظیم کے استادِ فن ہیں اور اپنی قوم کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں؛ سراسر اسلام سے جہالت اور غیراسلامی ذہنیت ہے۔ (جلد سوم۔ صفحہ) اِن لوگوں کی عملی زندگی اور ان کے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔ (جلد سوم۔ صفحہ) اِن میں سے اکثر کے گھروں میں آپ جائیے تو آپ کو نماز کے

مسلم لیگ کی قیادت کے خلاف

وقت کوئی یہ بتانے والا نہ ملے گا کہ سمتِ کعبہ کدھر ہے۔ اور اسبابِ عیش و عشرت سے بھری ہوئی کوٹھیوں میں سے ایک جا نماز بھی فراہم نہ ہو سکے گی۔ سارے لیڈروں کو بٹھا کر اسلام کے بنیادی اور ابتدائی مسائل کے متعلق امتحان لیجئے تو شاید کوئی صاحب دو فی صدی سے زیادہ نمبر نہ لے سکیں گے۔

(جلد سوم۔ ص۱۷۷)

اس مقام پر اس نقطہ کو پیشِ نظر رکھئے کہ اُس وقت ایک آئینی جنگ لڑی جا رہی تھی جس میں ہمارا مؤقف یہ تھا کہ ہندوستان میں بسنے والی مسلمان قوم کا مطالبہ یہ ہے کہ اُن کے لئے ایک خطۂ زمین الگ کر دیا جائے جہاں وہ اپنے نظریات کے مطابق اپنی آزاد حکومت قائم کر سکیں۔ ہندو اور انگریز کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح یہ ثابت ہو جائے کہ یہ مطالبہ مسلمانوں کی اکثریت کا نہیں۔ اس وقت مسلم لیگ نے یہ دعویٰ ہی نہیں کیا تھا کہ جن مسلمانوں کی طرف سے یہ دعویٰ پیش کیا جا رہا ہے، وہ یا ان کے لیڈر، اسلام کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ اُس وقت سوال صرف یہ تھا کہ قانون جن لوگوں کو مسلمان تسلیم کرتا ہے، اُن کی اکثریت کا مطالبہ کیا ہے۔ اور اِس کا خود مودودی صاحب کو بھی اعتراف تھا کہ ہندوستان کے (بقول ان کے) "پیدائشی مسلمانوں" کو قانون، مسلمان تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے سیاسی کش مکش، حصہ اوّل میں لکھا تھا کہ "قانونی حیثیت سے ہر وہ شخص مسلم" ہے جو کلمۂ طیبہ کا زبانی اقرار کرے اور ضروریاتِ دین کا منکر نہ ہو......ہم ایسے شخص کو کافر نہیں کہہ سکتے۔ نہ وہ حقوق دینے سے انکار کر سکتے ہیں جو مجرد اقرارِ اسلام سے اس کو مسلم سوسائٹی میں حاصل ہوتے ہیں"۔ (حصہ اوّل۔ ص۶۵) ان حالات میں وہاں "حقیقی مسلمانوں" اور پیدائشی مسلمانوں کا سوال لے کر بیٹھ جانا، خواہ مخواہ مسئلہ زیرِ بحث کو الجھا دینا اور ذہنی انتشار پیدا کر دینا نہیں تو اور کیا تھا؟ —— پھر یہ بھی سوچئے کہ اگر باقی مسلمان پیدائشی مسلمان تھے تو مودودی صاحب کونسے آسمان سے نازل ہوئے تھے۔ وہ بھی تو اسی لئے مسلمان کہلاتے، اور تسلیم ہوتے چلے آ رہے تھے کہ وہ مسلمانوں کے ہاں پیدا ہوئے تھے۔ یاد رہے کہ ایک نبی کو تو اس کا حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی پہلی دعوت میں کہے کہ صرف وہ مسلم ہے۔ دوسرا کوئی مسلم نہیں۔ غیراز نبی کے لئے اس قسم کی تخصیص کرنا، انتہائی انانیت ہے۔

مودودی صاحب کا اعتراض یہ بھی تھا کہ مسلم لیگی لیڈروں میں سے کسی کو دین کا علم حاصل نہیں! اور ان کے گھروں میں جا نماز تک نہیں ملتی —— لیکن اس سے پہلے وہ دو تین برس تک نیشنلسٹ علماء کی بھی مخالفت کرتے رہے تھے۔ اُنہیں دین کا علم مودودی صاحب سے بھی زیادہ حاصل تھا، اور ان کے گھر جانمازوں سے بھی بھرے پڑے تھے۔ اُن کی مخالفت اس لئے کی جاتی تھی کہ اُن کا سیاسی مسلک اسلام کے خلاف تھا اور مسلم لیگ کا مسلک اسلام کے مطابق تھا —— لیکن اب مسلم لیگیوں کی مخالفت اس لئے کی جا رہی تھی کہ اُن کے گھروں میں جانماز نہیں

ملتی تھی؟ ؎

جرمِ اُو از سجدہ، تقصیرِ ما از دانہ
نہ باو بیچارہ می سازی نہ با ما ساختی؟

مطلب یہ ہے کہ نیشنلسٹ مسلمان بھی باطل پر اور لیگی مسلمان بھی باطل پر ــــ حق پر صرف مودودی صاحب! اللہ تعالیٰ اس قسم کے فریبِ نفس سے ہر ایک کو محفوظ رکھے۔

بہرحال مَیں کہہ یہ رہا تھا کہ مودودی صاحب، جمہور مسلمانوں میں کیڑے ڈالنے کے بعد، اُن کی قیادت کے پیچھے پڑے اور اس میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ اُنہیں کہہ دیا کہ تمہیں اسلام کا نام استعمال کرنے کا بھی حق نہیں۔ سیاسی کش مکش حصہ سوم کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ کہتے تھے:۔

> اگر یہ آپ کی قومیت ہے اور یہ آپ کی کلچر ہے اور یہ آپ کے قومی مقاصد ہیں تو آپ اپنی قوم کا جو نام چاہیں تجویز فرما لیں، اسلام کا نام استعمال کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے......... اس نام کو بدل دینے کی ضرورت صرف اِس لئے نہیں کہ آپ کے یہ نظریات جن پر آپ اپنی قومیت کی بنا رکھ رہے ہیں، اصلاً اسلام کے خلاف ہیں بلکہ اس کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ ان نظریات کے ساتھ آپ جو کچھ کریں گے وہ اسلام کے لئے رسوائی و بدنامی کا موجب ہوگا۔ (جلد سوم۔ ص۴۶)...... جو کچھ یہ لوگ کرنا چاہتے ہیں، شوق سے کریں، ہم اُن کا راستہ روکنے نہیں آتے۔ ہمارا مطالبہ اُن سے صرف یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمان کے نام کو غلط طریقے پر استعمال کرنا چھوڑ دیں۔ (جلد سوم۔ ص۷)

آپ سوچیئے کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کو، مسلمان نہ کہا جاتا اور جس اسلام کی بنیادوں پر الگ مملکت کا دعویٰ کیا جاتا تھا اُس کے متعلق سمجھ لیا جاتا کہ وہ اسلام ہی نہیں تو کیا اِس ساری تحریک کی عمارت، بنیادوں سمیت نیچے نہ آ گرتی۔ یہ تھے وہ نکات، جو مودودی صاحب، ہندوؤں کے کان میں ڈال رہے تھے کہ تم اس بحث میں یہ دلائل پیش کرو۔

مسلم قوم اور اُس کی قیادت کے بعد اب آیئے اس جماعت (یعنی مسلم لیگ) کی طرف، جس کی طرف سے یہ مطالبہ پیش کیا جا رہا تھا۔ مودودی صاحب فرمانے لگے کہ:۔

مسلم لیگ کی مخالفت

> ان لوگوں کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ اُن سب لوگوں کو، جو از روئے پیدائش مسلمان قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنی جماعت کی رکنیت کا بلاوا دیتے ہیں اور جو اس کو قبول کر لے اُسے ابتدائی رکن بنا لیتے ہیں۔ پھر ان ہی ابتدائی ارکان کے ووٹوں سے ذمہ دار کارکن اور عہدے دار منتخب ہوتے ہیں اور ان ہی کی کثرتِ رائے سے تمام معاملات سرانجام دیئے جاتے ہیں۔ (جلد سوم۔ ص۱۲۹)

آپ غور کیجئے کہ ہندو اور انگریز دونوں کو، چپکے چپکے یہ سمجھایا جاتا تھا کہ جن مسلمانوں کی نمائندگی کے بل بوتے پر مسلم لیگ اور اس کی قیادت یہ مطالبہ پیش کر رہی ہے وہ مسلمان ہیں ہی نہیں۔ لہٰذا یہ لوگ مسلمانوں کے نمائندے کہلا کس طرح سکتے ہیں۔

> نہ ان کی جماعت' اسلامی مفہوم کے اعتبار سے جماعت ہے نہ ان کی امارت' اسلامی اصطلاح کی رو سے امارت ہے۔ نہ ان کی اس امارت کو کسی حیثیت سے بھی سمع و طاعت کا حق پہنچتا ہے۔ محض لفظ "مسلمان" سے دھوکہ کھا کر جو لوگ جاہلیت کی پیروی کرنے والوں کی تنظیم کو تنظیم سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس نوعیت کی کوئی تنظیم اسلامی نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہو گی، ان کی کند ذہنی ماتم کی مستحق ہے۔ (جلد سوم۔ صـ۸۲)

اب آیئے قائدِاعظمؒ کی طرف سے پیش کردہ جداگانہ مملکت کے مطالبہ کی جانب۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسے بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں کہ ۱۹۳۰ء سے لے کر —— جب علامہ اقبالؒ نے پہلے پہل مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کا تصوّر پیش کیا —— ۱۹۴۷ء تک، جب یہ مملکت حاصل ہو گئی — (بلکہ اس کے بعد بھی) ہر مقام پر اس کی وضاحت کر دی گئی تھی کہ اس مملکت کا مطالبہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ ہم اس میں اسلامی نظام قائم کر سکیں۔ اب دیکھئے کہ مودودی صاحب، اس مطالبہ کی مخالفت کس طرح کر رہے تھے۔ انہوں نے لکھا:-

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔
> (جلد سوم۔ صـ۹۳)

مملکتِ پاکستان تو ہنوز وجود میں نہیں آئی تھی، مسلمانوں کی جو مملکتیں اُس وقت موجود تھیں، وہ ان کے متعلق بھی کہتے تھے کہ:-

> ایک حقیقی مسلمان ہونے کی حیثیت سے، جب میں دنیا پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر پر اظہارِ مسرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ترکی پر ترک' ایران پر ایرانی اور افغانستان پر افغان حکمران ہیں۔ (جلد سوم۔ صـ۹۲)

غور کیجئے، یہ صاحب اپنے آپ کو حقیقی مسلمان اور باقی سب کو پیدائشی مسلمان قرار دیتے تھے۔ اب آگے چلئے۔ ملک کی تقسیم کے سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے:-

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ تمام روئے زمین ایک ملک ہے۔ انسان نے اس کو ہزاروں حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔
> (جلد سوم۔ صـ۹۴)

اور جس مقصد کے لئے یہ سب کچھ کہا جا رہا تھا، وہ یوں چھلک کر زبان پر آ گیا:-

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپیریلزم سے آزاد کرایا جائے۔ (جلد سوم صفحہ ۹۴)

یہ آزادیٔ وطن کے نعرے اور پنڈت نہرو کے سُروں میں امپیریلزم کی مخالفت' یہ سب ہمارے لئے، بکری کی بولیاں ہیں۔ (جلد سوم صفحہ ۹۹)

مذکورہ بالا اقتباسات کی رو سے مودودی صاحب نے کہا کہ حقیقی مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کے نزدیک اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ مسلمانوں کی ایک الگ آزاد مملکت قائم ہو جائے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتے تھے کہ اس امر کی مسرت تو اس وقت ہو سکتی ہے جب یہ کہا جائے کہ اس مملکت میں اسلامی نظام قائم ہوگا۔ آپ غالباً متعجب ہوں گے کہ جب ۱۹۳۰ء سے برابر یہ پکار ہو رہی تھی کہ ہم جداگانہ مملکت کا مطالبہ ہی اس لئے کر رہے ہیں کہ اس میں اسلامی نظام قائم کیا جا سکے تو پھر مودودی صاحب یہ اُلجھاؤ کس طرح پیدا کر رہے تھے؛ وہ اِس قسم کا اُلجھاؤ ہی پیدا نہیں کر رہے تھے! انہوں نے متعین الفاظ میں کہا تھا کہ:-

مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمعِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے...... جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی، اُن کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہو گی بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت۔ (جلد سوم - ۱۳۲ - ۱۳۱)

یہاں ایک ثانیہ کے لئے رکئے! مودودی صاحب نے یہاں دھڑلے سے کہا ہے کہ لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمعِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔ یہ کچھ فروری، مارچ ۱۹۴۱ء میں کہا گیا تھا۔ یعنی، دوسری باتوں کو چھوڑیئے، مارچ ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان منظور ہونے کے ایک سال بعد۔ اُس اجلاس میں، خود قائداعظمؒ نے جو خطاب ارشاد فرمایا تھا، وہ چھپا ہوا موجود ہے۔ آپ دیکھئے کہ اُس میں، اِس مطالبہ کی بنیاد کو کس طرح احیائے اسلام کا تقاضا قرار دیا گیا تھا۔ یہاں ایک دلچسپ بات سنئے۔ جنوری ۱۹۷۰ء کی بات ہے کہ مسٹر بھٹو نے کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کے دوران مودودی صاحب کی اسی کتاب کے وہ اقتباسات پڑھ کر سنائے جن میں پاکستان کی ——— مخالفت اور قائداعظمؒ کی شان میں گستاخیاں کی گئی تھیں تو

اس کے جواب میں مودودی صاحب نے ایک بیان دیا جس میں کہا کہ:۔

> اس کتاب کے مضامین ۱۹۳۹ء-۴۰ء میں لکھے گئے تھے، جب ہنوز قرار دادِ پاکستان منظور نہیں ہوئی تھی۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ مسلمانوں کی قومی تحریک کو ایک قومی ریاست کی بجائے اسلامی ریاست کے نصب العین کی طرف موڑ دیا جائے۔ (روزنامہ امروز و مشرق مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۷۰ء)

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، یہ مضامین رسالہ ترجمان القرآن کی فروری و مارچ ۱۹۴۱ء کی اشاعتوں میں شائع ہوئے تھے اور پھر سیاسی کشمکش حصہ سوم کی اس جلد میں بھی شامل تھے جو بہرحال اگست ۱۹۴۱ء کے بعد کسی وقت شائع ہوئی تھی۔ لیکن اس بیان میں وہ فرما رہے ہیں کہ یہ مضامین اس وقت کے ہیں جب ہنوز قرار دادِ پاکستان منظور نہیں ہوئی تھی۔ لیکن مودودی صاحب کے اس کھلے ہوئے جھوٹ کی تردید میں ہمیں اپنی طرف سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس سلسلے میں خود مودودی صاحب کا بیان ملاحظہ فرمایئے جو روزنامہ نوائے وقت کی اشاعت بابت ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں وہ کہتے ہیں:۔

> اس تحریک کے آغاز ہی سے عام مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی تمناؤں کا مرکز 'پاکستان' ایک اسلامی مملکت ہوگا جس میں اسلام کا قانون جاری ہوگا اور اسلامی تہذیب زندہ کی جائے گی۔ اسی لئے ان کا نعرہ یہ تھا کہ پاکستان کا مطلب کیا ـــــــ لا الٰہ الا اللہ ـــــــ مسلم لیگ کے لیڈر بھی اپنی تقریروں میں یہی خیال ظاہر کر رہے تھے اور سب سے بڑھ کر، خود قائداعظمؒ مرحوم و مغفور نے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان کا دستور قرآن ہوگا۔

ایک طرف ان کے یہ الفاظ سامنے رکھئے اور دوسری طرف وہ الفاظ کہ "لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ اُن کا آخری مطمعِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے" اور ان دونوں بیانات کی روشنی میں ان کے کیریکٹر کے متعلق آپ خود ہی اندازہ فرما لیں۔ ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی ـــــــ یہیں تک نہیں۔ انہوں نے اپنے اُس خط میں جس کے ساتھ ان کا مذکورہ صدر بیان (۱۴ اگست ۱۹۷۰ء) شائع ہوا ہے، کہا ہے کہ:۔

> قائداعظمؒ مرحوم کے متعلق، مجھے کبھی یہ شبہ نہیں ہوا کہ وہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے معاملے میں مخلص نہ تھے۔

اور اس کے ساتھ ہی تحریک کے زمانے میں ان کا یہ ارشاد کہ:۔

> لیگ کے قائدِ اعظمؒ سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں، جو

اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو۔ اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔ (جلد سوم۔ ص۳۷)

یہ ہیں وہ بزرگوار جو اپنے آپ "حقیقی مسلمان" اور باقی سب کو پیدائشی مسلمان قرار دیتے ہیں۔ اس مقام پر میں اتنا اور عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ (جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے) مودودی صاحب کو پنجاب کی طرف آنے کی دعوت دینے کے "جرم" کا میں بھی مرتکب ہوں۔ لیکن، میں کسی حد تک اس حقیقت کو کفارہ کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں کہ جب مودودی صاحب نے ان خیالات کا اظہار کیا تو سب سے پہلے میں نے ان کی مخالفت کی اور کھلے الفاظ میں مخالفت کی۔ حالانکہ اُس زمانے میں شاید ہی کسی اور نے انہیں پہچانا ہو۔ (ملاحظہ ہو طلوعِ اسلام بابت دسمبر ۱۹۴۰ء)

• اُس زمانے میں اِن سے کہا گیا کہ چلئے! یہ سب صحیح کہ ہم مسلمانوں میں ہزار نقص ہیں۔ مسلم لیگ اور اُس کی قیادت بھی آپ کے نزدیک اسلامی معیار پر پوری نہیں اُترتی۔ لیکن اِس وقت جو جنگ ہو رہی ہے اس میں مطالبہ صرف اتنا ہے کہ مسلمان اکثریت کے علاقوں میں اپنی آزاد مملکت قائم کر لی جائے۔ اگر یہ الگ خطۂ زمین مل گیا تو اس میں اسلامی مملکت قائم کرنے کا امکان تو ہوگا۔ آپ وہاں اسلامی حکومت قائم کر لیجئے گا۔ آپ اس خطۂ زمین کے حاصل کرنے کے راستے میں تو رکاوٹ نہ بنیئے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا۔

> بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی، مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے۔ پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے سے اِس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے، اُس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں۔ اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اُس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔ (جلد سوم۔ ص۱۶۸)

دوسرے مقام پر انہوں نے کہا کہ:۔

> نہ ہندوؤں سے ہمارا کوئی قومی جھگڑا ہے، نہ انگریزوں سے، وطنیت کی بنیاد پر ہماری لڑائی ہے۔ نہ اُن ریاستوں سے ہمارا کوئی دشمنہ ہے جہاں نام نہاد مسلمان خدا بنے بیٹھے ہیں۔ نہ اقلیت کے تحفظ کی ہمیں ضرورت ہے۔ نہ اکثریت کی بنیاد پر قومی حکومت مطلوب ہے۔ ہمارے سامنے تو صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے بندے، اللہ کے سوا کسی کے محکوم نہ ہوں۔ (جلد سوم۔ ص۱۱۰)

اِس کے لئے وہ فرماتے یہ تھے کہ اسلام کو ایک گوشے میں سمٹا دینے کی بجائے صحیح اسلامی خدمت یہ ہے کہ سارے ہندوستان کو دارالاسلام بنا لیا جائے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ صاحب مسلمانوں کے نازک ترین

جذبات کو دلفریب مقدس الفاظ کے ذریعے مشتعل کر کے انہیں مطالبۂ پاکستان سے دستبردار ہو جانے کے لئے کس کس انداز سے ورغلا رہے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ:-

> آج جو لوگ اسلام کے تحفظ کی بس یہی ایک صورت دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر چند گوشہ ہائے عافیت میں پہنچا دیا جائے۔ افسوس ہے کہ وہ اسلام کے اِن امکانات سے ناواقف ہیں۔ (جلد سوم ص۵۹)

عزیزانِ من! آپ غور کیجئے اس زمانے میں وقت کیسا نازک تھا۔ انگریز اور ہندو اور ان کے ساتھ نیشلسٹ مسلمانوں کی تمام قوتیں اِس نکتے پر مرکوز تھیں کہ مسلمانوں کی جداگانہ مملکت قائم نہ ہونے دی جائے۔ قائدِاعظمؒ یہ جو مکھی لڑائی لڑ رہے تھے۔ اور عین اس وقت یہ صاحب اِس دامِ ہمرنگِ زمین کی شکل میں مسلمانوں میں اس مطالبہ کی مخالفت کے لیئے اس قسم کا زہر پھیلا رہے تھے، اور اس کے باوجود مسلسل پچیس سال سے یہ پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ ہم نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت نہیں کی تھی۔

مودودی صاحب کی اسکیم

مودودی صاحب کی "خدماتِ جلیلہ" کے ضمن میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تقسیمِ ہند کی اسکیم خود پیش کی تھی۔ ذرا اِس فریب کی بھی حقیقت سن لیجئے۔ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تابع ہندوستان میں ایک وفاقی حکومت قائم کرنے کا تصوّر دیا گیا تھا۔ مسلم لیگ کے مطالبۂ علیحدگی کے جواب میں انگریز اور ہندوؤں کی طرف سے یہ تجویز بھی پیش کی گئی تھی کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں علیحدہ حکومت قائم کر کے ہندوستان کے مرکز کے ساتھ اس کا وفاق قائم کر دیا جائے۔ قائدِاعظمؒ نے اس تجویز کی مخالفت کی اور شدت سے مخالفت کی۔ عین اس زمانے میں مودودی صاحب نے بھی تقسیم کے کچھ خاکے پیش کئے۔ اُن میں انتہائی خاکہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی قومی ریاستوں کا علیحدہ وفاق ہو اور ہندو ریاستوں کا جداگانہ وفاق۔ اور پھر ان میں کنفیڈریشن پیدا کر لی جائے۔ جس کی رُو سے دفاع، مواصلات، تجارتی تعلقات کے لئے باہمی تعاون کر لیا جائے۔ بالفاظِ دیگر یہ شعبے مشترک ہوں (جلد دوم۔ ص۲۱۴-۲۰۸)
آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت کے مطالبہ کے بالمقابل اس قسم کی کنفیڈریسی سے مطلب کیا تھا؟

جماعتِ اسلامی کی تشکیل

اب تک یہ مخالفت انفرادی حیثیت سے کی جا رہی تھی۔ اِس کے بعد اسے اجتماعی شکل دینے کا منصوبہ بنایا گیا۔ مسلم لیگ میں تو وہ پہلے ہی کیڑے ڈال چکے تھے۔ اِس کے بعد انہوں نے کہا کہ:-

> اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں، اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں، اگر فی الواقعہ اسلام کے معیار پر ان کے نظریات، مقاصد

اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنسِ کاسد نکلیں گی خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا علمائے دین اور مفتیانِ شرعِ مبین۔ دونوں قسم کے راہنما اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہِ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ (جلد سوم۔ ص ۹۵) انسانیت کو اس دردناک انجام سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف ایک صالح نظریہ اور صالح جماعت کا برسرِ کار آنا ہے۔ (جلد سوم۔ ص ۱۹۷) اس کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ یہاں صحیح نظریہ موجود ہے۔ صحیح نظریہ کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔ (جلد سوم۔ ص ۲۰۱)

یعنی ہندوستان کے (بلکہ صفحۂ ارض کے) تمام مسلمان پیدائشی مسلمان ——— حقیقی مسلمان صرف مودودی صاحب۔ اور مسلمانوں کی جماعتیں اور پارٹیاں سب جنسِ کاسد۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ صالح افراد مودودی صاحب کی مرکزیت کے گرد جمع ہو کر ایک صالح جماعت کی تشکیل کریں۔ چنانچہ اس جماعت کو اگست ۱۹۴۱ء میں متشکل کر لیا گیا۔ اس کے متعلق کہا گیا کہ:۔

اس جماعت میں کوئی شخص اس مفروضے پر شامل نہیں کر لیا جائے گا کہ جب وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہے اور اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے تو ضرور مسلمان ہوگا...... جو شخص سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے بعد کلمۂ شہادت کہنے کی جرأت کرے، صرف وہی اس جماعت میں داخل ہو سکتا ہے، خواہ وہ نسلاً غیر مسلم ہو اور ابتداءً یہ شہادت ادا کرے یا پیدائشی مسلمان ہو، اور اب پورے فہم و شعور کے ساتھ اپنے سابق ایمان کی تجدید کرے۔
(جلد سوم۔ ص ۲۱۵-۲۱۴)

اس طرح جماعتِ اسلامی وجود میں لائی گئی تاکہ وہ تحریکِ پاکستان کی مخالفت اجتماعی طور پر کر سکے۔ حالانکہ اس سے پہلے مودودی صاحب اسی کتاب کے حصۂ اوّل میں یہ لکھ چکے تھے کہ:۔

مسلمان قوم تو پہلے ہی سے ایک جمعیت ہے۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت الگ نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا، یہ دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں، بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں، تفرقہ پردازی، اور گروہ بندی ہے۔ (جلد اوّل۔ ص ۵۶)

اب یہ تفرقہ پردازی اور گروہ بندی عین مطابقِ اسلام قرار پا گئی کیونکہ اِس نے اپنا نام جماعت اسلامی لکھ لیا، اور خود مودودی صاحب اِس کے امیر بن گئے۔ اس کے بعد مودودی صاحب نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت اجتماعی طور پر شروع کر دی۔ یہ مخالفت بڑے وسیع پیمانے پر شروع کی گئی۔ جوں جوں تحریکِ پاکستان قوت پکڑتی گئی اُن کی طرف سے اِس کی مخالفت بھی شدت

۴۶-۱۹۴۵ء کے الیکشن

اختیار کرتی گئی۔ تحریکِ پاکستان کی تاریخ میں ۴۶-۱۹۴۵ء کا زمانہ نازک ترین دَور تھا۔ قائدِاعظمؒ اپنے اس دعوے پر ڈٹے ہوئے تھے کہ مسلم لیگ، مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور پاکستان کا مطالبہ اس جماعت کا متفقہ مطالبہ ہے۔ انگریز اور ہندو نے ایک اسکیم مرتب کی اور قائدِاعظمؒ سے کہا کہ ہم ملک میں الیکشن کراتے ہیں۔ بات واضح ہو جائے گی کہ آپ کا دعویٰ صحیح ہے یا غلط۔ اگر الیکشن نے ثابت کر دیا کہ مسلم لیگ واقعی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے تو اس کے مطالبہ کو درخورِ اعتنا سمجھ لیا جائے گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہ الیکشن کس قدر اہمیت رکھتے تھے۔ یہ تحریکِ پاکستان کے لئے فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ چنانچہ کانگریس نے اپنے تمام وسائل بروئے کار لا کر لیگ کی مخالفت میں ملک گیر مہم شروع کر دی اور اِدھر مسلم لیگ نے بھی اس معرکہ میں سر دھڑ کی بازی لگا دی —— عام مسلم لیگی تو ایک طرف، خود قائدِاعظمؒ کی بھی یہ کیفیت تھی کہ ان پر دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ وہ اپنی بےحد مخدوش صحت کے باوجود سارے ملک میں دورے کر رہے تھے اور واضح الفاظ میں بتا رہے تھے کہ لیگ کا مطالبہ کیا ہے۔ مثلاً انہوں نے ۲۴ نومبر ۱۹۴۵ء کو فرنٹیئر مسلم لیگ کانفرنس، پشاور میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:-

> ہمارا مذہب، ہمارا کلچر اور اسلام کے نظریاتِ حیات، آزادی حاصل کرنے کے لئے ہمارے محرکات ہیں۔

انہوں نے فرنٹیئر مسلم اسٹوڈنٹس کے نام اپنے پیغام (مورخہ ۱۸ جون ۱۹۴۵ء) میں کہا کہ:-

> پاکستان کا مطلب صرف آزادی نہیں، اس کا مفہوم اس مسلم آئیڈیالوجی کو محفوظ کرنا ہے جو ایک بیش بہا متاع کی صورت میں ہمیں ورثہ میں ملی ہے۔

قائدِاعظمؒ اور تمام مسلم لیگی رہنما ملک بھر میں ان انتخابات کی اہمیت کا اس طرح چرچا کر رہے تھے۔ انہوں نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء کو پاکستان ڈے کی تقریب پر قوم کے نام اپنے پیغام میں کہا کہ:-

> یاد رکھو! اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو نہ صرف یہ کہ ہم تباہ ہو جائیں گے بلکہ اس برِصغیر میں مسلمانوں اور اسلام کا نام و نشان تک باقی نہیں رہے گا۔

اس کے برعکس مودودی صاحب اس قسم کے فتوے صادر فرما رہے تھے کہ:-

> جو اسمبلیاں یا پارلیمنٹیں موجودہ زمانہ کے جمہوری اصول پر بنی ہیں، ان کی رکنیت حرام ہے اور ان کے لئے ووٹ دینا بھی حرام ہے۔
>
> (رسائل و مسائل۔ حصہ اول ستمبر ۱۹۵۱ء ایڈیشن ص ۴۵)

جب ان سے کہا جاتا کہ بابا! معاملہ ایسا آ پڑا ہے کہ چند ووٹوں کے عوض مسلمانوں کو ایک مملکت حاصل ہو رہی ہے، تو وہ جواب میں کہتے کہ:-

> ووٹ اور الیکشن کے معاملہ میں ہماری پوزیشن صاف صاف ذہن نشین کر لیجئے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو، اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ملک پر پڑتا ہو، بہرحال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہم اُن اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔
>
> (اخبار کوثر۔ مورخہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۵ء۔ بحوالہ "مولانا مودودی۔ دعاوی اور عمل" ص ۸)

وہ تو یوں کہیئے کہ اس قوم کی خوش بختی تھی کہ اس نے مودودی صاحب کے ان فتووں کا کچھ اثر نہ لیا، ورنہ اگر وہ ان الیکشنوں میں بطور امیدوار کھڑے ہوتے اور ووٹ دینے کو شرعاً حرام سمجھ لیتے اور اس طرح مسلم لیگ شکست کھا جاتی تو سوچئے کہ مسلمانوں کا حشر کیا ہوتا؛ للہ الحمد کہ لیگ کو فقیدالمثال کامیابی حاصل ہوئی اور اِسی کامیابی کی بنا پر پاکستان کا مطالبہ منوا لیا گیا۔

جوں جوں پاکستان کی منزل قریب تر آتی گئی مودودی صاحب کی سازش کا نشتر اور گہرائی تک اترتا گیا۔ حکومتِ برطانیہ نے فروری ۱۹۴۷ء میں اعلان کر دیا کہ جون ۱۹۴۸ء تک اختیارات اہلِ ہند کی طرف منتقل کرائے جائیں گے۔ اس پر یہ سوچا گیا کہ وقت بہت کم رہ گیا ہے، اور مسلم اکثریت کے صوبے ان کی سازشوں سے متاثر نہیں ہوئے، اس لئے اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو مطالبۂ پاکستان کے خلاف اکسانا چاہیئے۔ اس مقصد کے لئے جماعتِ اسلامی کے وفود نے ان صوبوں کا رخ کیا۔ چنانچہ

اقلیتی صوبوں میں زہر افشانی

انہوں نے اپریل ۱۹۴۷ء کے اواخر میں ٹانک[1]۔ مدراس۔ اور پٹنہ میں جماعت کے خصوصی اجلاس منعقد کئے اور ان میں اس زہر کو بڑے وسیع پیمانے پر پھیلایا۔ ٹانک[1] کے اجلاس میں جو ۱۸/۱۷ اپریل ۱۹۴۷ء کو منعقد ہوا تھا، مودودی صاحب سے متعین سوال کیا گیا کہ جب مطالبہ، مسلمانوں کے لئے ایک مملکت حاصل کرنے کا ہے تو پھر کونسا امر مانع ہے کہ ہم ان کا ساتھ نہ دیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ:-

> جب آپ ایک تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس، منہ سے ایک

---

[1] ٹانک میں مسلم لیگ کی تحریک کافی زوروں پر تھی۔

مسلمان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دیا جائے۔ جن مسائل اور مصائب کا اِس قدر رونا رویا جا رہا ہے، یہ مسائل اور مصائب سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے، اگر مسلمان اسلام کے فی الواقعہ سچے نمائندے ہوتے۔ اور اگر مسلمان اب بھی سچے مسلمان بن جائیں تو آج ہی یہ سارے مسائل ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں لیکن اگر یہ فی الواقعہ خلوصِ قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لئے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان، پاکستان بن سکتا ہے۔

{ روئداد جماعتِ اسلامی۔ حصہ پنجم۔ شائع کردہ مکتبہ جماعتِ اسلامی۔
ذیلدار پارک۔ اچھرہ لاہور۔ صفحہ ۲۵۔ ایڈیشن کا سال نہیں دیا گیا۔ }

آپ نے دیکھا کہ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو کس طرح بہکایا جا رہا تھا کہ وہ تحریکِ پاکستان کا ساتھ چھوڑ دیں۔ اگلا اجلاس ۲۵ ر اپریل ۱۹۴۷ء کو مدراس میں ہوا۔ اس میں مودودی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ:۔

ہندو اکثریت کے علاقے میں مسلمان عنقریب یہ محسوس کر لیں گے کہ جس قوم پرستی پر انہوں نے اپنے اجتماعی رویہ کی بنیاد رکھی تھی وہ انہیں بیابانِ مرگ میں لاکر چھوڑ گئی ہے اور ان کی قومی جنگ جسے وہ بڑے جوش و خروش سے بغیر سوچے سمجھے لڑ رہے تھے، ایک ایسے نتیجے پر ختم ہوئی ہے جو ان کے لئے تباہی کے سوا اپنے اندر کچھ نہیں رکھتا۔ (ایضاً صفحہ ۱۱)

اِس کے بعد انہوں نے کہا کہ تحریکِ پاکستان کی بجائے اگر مسلمانانِ ہند اس دعوت کو قبول کر لیتے جو وہ دے رہے تھے:۔

—— تو آج ہندوستان کی سیاست کا نقشہ بالکل بدلا ہوا ہوتا، اور وہ چھوٹے چھوٹے پاکستانوں کی جگہ سارے ہندوستان کے پاکستان بن جانے کے امکانات...... ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے...... (یاد رکھیئے) جونہی ہندوستان کی سیاست کا موجودہ دَور ختم ہو کر نیا دَور شروع ہوا، اقلیت کے علاقوں میں مسلمانوں کو اپنی واقعی یاس انگیز پوزیشن کا عام احساس شروع ہو جائے گا۔ (ایضاً صفحہ ۱۲)

یہ تقریریں اس قدر اشتعال انگیز اور نتائج کے اعتبار سے ایسی تباہ کن تھیں، کہ مدراس کے مسلم لیگی مسلمانوں نے ان کی جلسہ گاہ پر ہلہ بول دیا اور انہیں سخت ناکامی کی حالت میں اپنا بوریا بستر سمیٹنا پڑا۔

جس زمانے میں اُدھر مدراس میں اِن کے اجلاس ہو رہے تھے، اِدھر پٹنہ میں بھی اِسی قسم کے جلسے کئے جا رہے تھے۔ اس زمانے میں ہندوؤں نے ملک گیر فسادات شروع کر رکھے تھے اور مسلم اقلیت کے صوبوں کے مسلمان (بالخصوص مسلم لیگی مسلمان) اندوہناک مصائب کا شکار ہو رہے تھے۔ عین اس وقت جماعتِ اسلامی کے

سرکردہ راہنما' امین احسن اصلاحی صاحب پٹنہ میں مسلمانوں سے فرما رہے تھے کہ:۔

آپ کو معلوم ہے کہ جو نازک حالات اِس وقت پیدا ہو گئے ہیں، یہ سرسری اور سطحی نہیں بلکہ ان کے اسباب نہایت گہرے ہیں۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ غنڈوں اور بدمعاشوں کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور دیر یا سویر یہ درست ہو جائیں گے وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ سارے حالات اس قومیت کی تعلیم کا نتیجہ ہیں جس کو پیدا کرنے کے لئے اس ملک کے لیڈروں نے جد و جہد کی ہے .... اس وجہ سے آپ کو صرف موجودہ ہنگاموں اور موجودہ فسادات پر ہی غور نہیں کرنا ہے بلکہ آئندہ کے مفاسد پر بھی غور کرنا ہے اور ایک سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے ماتحت آپ کو اس طرح کام کرنا ہے کہ فساد کی جو فصل ہمارے لیڈروں کے ہاتھوں اِس ملک میں بوئی گئی ہے، وہ نشو و نما نہ پانے پائے اور اس کے پھلنے اور پکنے سے پہلے لوگوں میں اس کے پس بھرے ہونے کا یقین پیدا ہو جائے۔ (ایضاً صٓ۱۴۲)

اِسی اجلاس سے ملک نصراللہ خاں صاحب نے بھی خطاب کیا۔ (ان کی وفات حال ہی میں ہوئی ہے۔) انہوں نے کہا کہ:۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اقامتِ دین کے آغاز سے پہلے زمین کا ایک قطعہ حاصل کر لینا ضروری ہے جہاں دین کو برپا کر سکیں۔ حیرت ہے کہ یہ چیز خاصے سمجھدار اور بظاہر معقول اور عالم دین لوگوں تک کی طرف سے کہی جاتی ہے۔ ایسی باتیں وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جو یا تو سیاست اور فلسفۂ اجتماع سے کلیتاً نابلد ہیں اور محض اِدھر اُدھر سے چند باتیں اور نعرے سن سنا کر سیاسی تحریکوں میں شامل ہو گئے ہیں اور کوئی اور سمجھدار آدمی موجود نہ ہونے کی وجہ سے لیڈری کے درجے کو پہنچ گئے ہیں۔ یا پھر نفس پرستی میں مبتلا اور خدا کے خوف سے آزاد ہونے کی وجہ سے اَن پڑھ اور حقائق و سیاست سے ناواقف عوام کو بے وقوف بناتے ہیں تاکہ وہ ان کے چنگل سے نکلنے نہ پائیں۔ ورنہ موٹی بات ہے کہ حکومت کے قیام کے لئے آپ کو اینٹ اور گارے کی ضرورت نہیں کہ آپ قطعاتِ زمین تاکتے پھریں۔ اس کے لئے آپ کو زمین کی نہیں بلکہ ایک ایسی منضبط اور منظم جماعت کی ضرورت ہے جو آپ کے پیشِ نظر نظریۂ حکومت کو ماننے اور اس کے لئے مرمٹنے والی ہو۔ اگر آپ نے ایسی جماعت پیدا کر لی تو جہاں بھی وہ ہو گی وہیں وہ اس نظریے کی حکومت قائم کر لے گی۔ (ایضاً صٓ۱۵۲)

ہندو نے جب بازی ہرتی دیکھی تھی تو اس نے آخری حربہ یہ استعمال کیا تھا کہ مسلم اقلیت کے صوبوں کی طرف سے

مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کرائی جائے۔ اور یہ تھی وہ جماعت، جو ان کی اس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے

مہاتما گاندھی کی شرکت

اس طرح مصروفِ "جہاد" تھی۔ کیا اس کے بعد بھی یہ سمجھنے میں کوئی شبہ رہ جاتا ہے کہ اِس جماعت کا وجود ایک گہری سازش کا رہینِ منت تھا؛ اور اگر کسی کو اب بھی اس میں کوئی شبہ رہ جاتا ہے تو وہ سُن لے کہ پٹنہ کے اس سیشن میں، اسلامی جماعت کی دعوت پر خود مہاتما گاندھی نے اپنی شام کی پرارتھنا کو ملتوی کرکے شرکت کی تھی۔ اور انہوں نے اصلاحی صاحب کی اِس تقریر کو سننے کے بعد فرمایا تھا کہ "مَیں نے آپ کی تقریر کو بڑے غور سے سنا اور مجھے اِسے سُن کر بہت مسرت ہوئی۔" (ایضاً صـ۱۷۲)

معلوم ابھی ان لوگوں کے منصوبے کیا کیا تھے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی جلد بازی نے ان پر پانی پھیر دیا۔ اس نے جون ۱۹۴۸ء کے بجائے، جون ۱۹۴۷ء ہی میں تقسیمِ ہند کا اعلان کر دیا۔ لیکن ان مخالفین کے ترکش میں ابھی ایک تیر باقی تھا۔ انہوں نے وہ تیر بھی یہ کہہ کر چلا دیا کہ سرحد میں ریفرنڈم کرایا جائے کہ وہ صوبہ' پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتا ہے گا یا ہندوستان کے ساتھ۔ یہ مرحلہ پھر بڑا نازک تھا۔ باؤنڈری کمیشن

سرحد کا ریفرنڈم

نے گورداسپور کا ضلع، جس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، ہندوستان کے ساتھ ملا دیا، تو ہم مسئلہ کشمیر کے سلسلہ میں اس قدر مسلسل مصیبتوں میں الجھ گئے۔ اگر اس ریفرنڈم کے نتیجہ میں صوبۂ سرحد کا الحاق ہندوستان کے ساتھ ہو جاتا تو آپ سوچئے کہ اس کے بعد پاکستان کتنے دنوں تک زندہ رہ سکتا.....؛ اس وقت ایک ایک ووٹ پوری کی پوری مملکت پر بھاری تھا۔ اس کے متعلق مودودی صاحب سے پوچھا گیا تو انہوں نے ارکانِ جماعت کو رائے دینے کی تو اجازت دے دی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ:۔

> رہا یہ سوال کہ کس چیز کے حق میں رائے دیں، تو اِس معاملے میں جماعت کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی کیونکہ جماعت اپنے ارکان کو صرف اُن امور میں پابند کرتی ہے جو تحریکِ اسلامی کے اصول اور مقصد سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ معاملہ نہ اصولی ہے نہ مقصدی۔
>
> (رسائل و مسائل حصہ اوّل صـ۲۴۳۔ ایڈیشن ستمبر ۱۹۵۱ء)

غور فرمائیے کہ ان کے نزدیک صوبۂ سرحد کے ریفرنڈم کا مسئلہ ان امور میں سے تھا ہی نہیں جو تحریکِ اسلامی کے اصول اور مقصد سے تعلق رکھتے ہوں۔ لِلّٰہ الحمد! کہ اِن کے اس قسم کے زہر میں بجھے ہوئے نشتروں کے باوجود ــــ مسلم لیگ کو ریفرنڈم میں کامیابی ہوئی۔

سرحد کے ریفرنڈم کا مسئلہ اس قدر اہم تھا کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد، جماعتِ اسلامی والوں سے جب بھی اس کے متعلق بات کی جاتی تو ان سے کوئی جواب نہ بن پڑتا۔ بالآخر انہوں نے اسی حربہ سے کام لیا جو ان کا مخصوص ہتھیار ہے یعنی سفید جھوٹ۔ چنانچہ اخبار ایشیا نے اپنی ۲۱ ستمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں لکھا کہ:۔

> جب پاکستان سے الحاق کے لئے ریفرنڈم کا وقت آیا تو جماعتِ اسلامی کی پوری

تنظیم مولانا مودودی کی ہدایت پر پاکستان کے حق میں مصروفِ جہاد ہو گئی۔

اِس سلسلے میں ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے۔ اس وقت پاکستان کا اعلان ہو چکا تھا۔ عملی تقسیم میں چند دن باقی تھے۔ مودودی صاحب جس شدت سے پاکستان کی مسلسل مخالفت کرتے چلے آ رہے تھے اور یہاں کی مملکت کو کافرانہ نظام سے بھی بدتر لعنت قرار دے رہے تھے' اس کے پیشِ نظر عام اندازہ یہی تھا کہ وہ ہندوستان ہی میں رہ کر اپنی اس اسکیم پر عمل پیرا ہوں گے جس کی رو سے وہ کہتے تھے کہ سارے ہندوستان کو اسلامی مملکت بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کی سازش کا تقاضا کچھ اور تھا ــــ اور وہ یہ کہ اب پاکستان کے اندر بیٹھ کر اس کی تخریب کے لئے کوشش کی جائے۔ چنانچہ اس ضمن میں انہوں نے ریفرنڈم کے سلسلے میں یہ کہا کہ:۔

> البتہ شخصی حیثیت سے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں خود صوبۂ سرحد کا رہنے والا ہوتا تو استصواب رائے میں میرا ووٹ پاکستان کے حق میں پڑتا۔
> (رسائل و مسائل۔ حصہ اوّل ص ۲۴۳۔ ایڈیشن ستمبر ۱۹۵۱ء)

عزیزانِ من! مودودی صاحب نے جس طرح اور جس قدر تحریکِ پاکستان کی مسلسل اور متواتر مخالفت کی اس کی تفاصیل آپ کے سامنے آ گئیں۔ ان میں میں نے ایک لفظ بھی اپنی طرف سے نہیں کہا۔ تمام تفصیلات ان کی اپنی تحریروں پر مشتمل ہیں۔ ایک طرف انہیں دیکھئے اور دوسری طرف ان کا ۱۴ر اگست ۱۹۷۶ء کا یہ بیان ملاحظہ فرمایئے' جس میں انہوں نے کہا ہے:۔

> یہ خیال کرنا کہ جماعتِ اسلامی کا قیام مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے اور تحریکِ پاکستان کے خلاف ایک دوسری تحریک اٹھانے کے لئے کیا گیا تھا، محض ایک بے جا بدگمانی ہے ...... یہ بدگمانی صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتی تھی جبکہ جماعت نے تحریکِ پاکستان کے خلاف کوئی مہم چلائی ہوتی یا کوئی جلسہ کیا ہوتا یا کوئی قرارداد پاس کی ہوتی یا اس کے اجتماعات میں مخالفانہ تقریریں کی ہوتیں۔ لیکن اگست ۴۱ء سے اگست ۴۷ء تک جماعت کی پوری کاروائیوں میں کسی ایسی چیز کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی۔ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو بس یہ کہ ہم نے تحریکِ پاکستان میں حصہ نہیں لیا .... بہرحال ہم نے جس وقت یہ کام شروع کیا تھا اس وقت بھی اسے برحق سمجھتے تھے اور آج اس سے زیادہ برحق سمجھتے ہیں۔
> (نوائے وقت۔ ۱۴ر اگست ۱۹۷۶ء)

مجھے اس بیان پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ اگست ۱۹۴۷ء تک کی تفاصیل آپ کے سامنے آ چکی ہیں۔ اب یہ دیکھئے کہ اس کے بعد انہوں نے کس انداز سے اپنی مخالفت جاری رکھی اور اب تک جاری رکھے ہوئے ہیں، کیونکہ (ان کے الفاظ میں) وہ اس مخالفت کو آج اس سے بھی زیادہ برحق سمجھتے

ہیں، جس قدر برحق تقسیم سے پہلے سمجھتے تھے۔

باب سوم

(تشکیلِ پاکستان کے بعد)

پاکستان وجود میں آ گیا اور مودودی صاحب اپنی سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت پٹھانکوٹ (بھارت) سے منتقل ہو کر لاہور میں آ براجمان ہوئے۔ یہاں سے ان کی سازشوں کی داستان کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔ ہندوؤں نے تقسیم ہند کو طوعاً و کرہاً مان لیا تھا لیکن انہوں نے دل سے اسے قطعاً تسلیم نہیں کیا تھا۔ اندازہ لگائیے کہ پنڈت جواہر لال نہرو، تقسیم ہند کے فیصلے پر کانگریس کی طرف سے دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ رہے تھے کہ:۔

> ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اِس وقت مسٹر جناحؒ کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔

(PAKISTAN FACES INDIA P. 99)

۳ر جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا اعلان ہوا اور ۱۶ر جون ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے حسبِ ذیل ریزولیوشن پاس کیا۔

> آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آ جائے گی تو ہندوستان کے مسئلے کا حل صحیح صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار پا جائے گا۔

اِس سلسلے میں وہاں کیا سوچا جا رہا تھا، اس کا انکشاف بھارت کے سابق چیف جسٹس مسٹر مہاجن نے یہ کہہ کر کیا تھا کہ "ہندوستان نے دسمبر ۱۹۴۷ء میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ پاکستان پر حملہ کر دیا جائے۔ لیکن بعض داخلی مصالح کے پیشِ نظر اس فیصلے پر عمل درآمد نہ ہو سکا" اِس سے بھی آگے بڑھئے۔ مسٹر گاندھی نے ۲۶ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو اپنی پرارتھنا کے بعد (صوبہ سرحد کا ذکر کرتے ہوئے) اپنے خطاب کے دوران کہا تھا کہ اگرچہ "وہ ہر قسم کے جنگ و جدال کے مخالف رہے ہیں لیکن اگر پاکستان سے انصاف حاصل کرنے کا کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔ اگر پاکستان اپنی ثابت شدہ غلطی پر نظر ڈالنے سے مسلسل انکار کرتا ہے اور اِسے کم کر کے دکھانا چاہتا ہے تو ہندوستانی یونین کی حکومت کو اس کے خلاف جنگ کرنی پڑے گی۔" (نیپ کے متعلق سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ)۔

ہندوستانی ہماری بربادیوں کی یہ اسکیمیں اُس وقت تیار کر رہا تھا جب یہاں حالات یہ تھے کہ نہ فوج کی تقسیم ہوئی تھی نہ اسلحہ کی۔ یہ سب ہندوستان کے قبضے میں تھا۔ حتیٰ کہ پاکستان کے حصے کا نقد روپیہ بھی وہ دبا کر بیٹھ گیا تھا۔ دوسری طرف پناہ گزینوں کے لاکھوں کی تعداد میں، لُٹے پٹے خانماں خراب قافلے خون کے دریا عبور کر کے پاکستان کی طرف چلے آ رہے تھے۔ ایسے نازک وقت میں ہندوستان یہ کچھ سوچ رہا تھا، اور پاکستان کے اندر بیٹھے ہوئے مودودی صاحب اس کی بنیادوں تک کو کھوکھلا کرنے میں مصروف تھے۔ (مثلاً)

حلفِ وفاداری

تشکیلِ مملکت کے بعد مغربی پنجاب کی حکومت نے اپنے ملازمین سے کہا کہ وہ حکومتِ پاکستان کی وفاداری کا حلف لیں۔ بعض سرکاری ملازمین نے، جو جماعتِ اسلامی سے وابستہ تھے امیرِ جماعت سے استصواب کیا اور انہوں نے یہ رائے دی کہ یہ حلف اس وقت تک ناجائز ہے جب تک یہ نظامِ حکومت پورے طور پر اسلامی نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس مشورہ کے مطابق بعض سرکاری ملازموں نے حلفِ وفاداری لینے سے انکار کر دیا اور ان کے خلاف محکمانہ کارروائی ہوئی۔ روزنامہ نوائے وقت کی ۲ ستمبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ:-

> سول سیکریٹریٹ کے ایک اسسٹنٹ کو اِس بنا پر معطل کر دیا گیا ہے کہ اُس نے حکومتِ پاکستان سے وفاداری کا حلف اٹھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس صورت میں پاکستان کا وفادار رہ سکتا ہوں جس صورت میں اس کا نظامِ حکومت شرعی ہو۔ (بحوالہ جماعتِ اسلامی پر ایک نظر۔ صک)

معاملہ یہیں تک ختم نہیں ہوتا۔ اِس جماعت نے پاکستان کی فوج کو برگشتہ کرنے میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اپریل ۱۹۴۸ء کا ذکر ہے کہ اخبارات میں شائع شدہ خبر کے مطابق جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ نے جماعت کے ارکان کے فوج میں بھرتی ہونے کے متعلق کوئی فیصلہ کیا، جس کی روشنی میں اس جماعت کے قیمؒ نے چند ماہ بعد ایک خط کے جواب میں لکھا کہ:-

> موجودہ حکومتِ پاکستان غیر اسلامی ہے اس لئے ہم مسلمانوں کو اس کی فوج یا رینجرز دستوں میں بھرتی ہونے کا مشورہ نہیں دے سکتے۔ (نوائے وقت لاہور۔ مورخہ ۳۱، اکتوبر ۱۹۴۸ء۔ بحوالہ جماعتِ اسلامی پر ایک نظر۔ صفحہ ۵۵)

یعنی ہندوستان میں، پاکستان پر حملہ کرنے کی اسکیمیں تیار ہو رہی تھیں اور پاکستان میں مودودی صاحب اس قسم کے فتوے جاری کر رہے تھے! اُسی زمانے میں جہادِ کشمیر کا مسئلہ ابھرا اور مودودی صاحب نے اس میں شرکت کو شرعاً ناجائز قرار دے دیا۔ یہ داستان عام طور پر معلوم ہے اس لئے میں اس کے متعلق تفصیل سے کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھتا۔

جیسا کہ میں ابھی ابھی بتا چکا ہوں اس زمانے میں پاکستان کی نوزائیدہ مملکت بڑے مہیب خطرات سے دوچار تھی۔ نئے پیش آمدہ حالات میں اندرونی نظم و نسق کا سنبھالنا ہی کچھ معمولی کام نہ تھا کہ اس کے ساتھ پناہ گزینوں کے سیلاب نے سارا سلسلہ درہم برہم کر دیا۔ اُس وقت ملک میں بڑی ابتری پھیل رہی تھی اور حالات

بڑے پریشان کن تھے۔ ایسے حالات میں تباہی سے محفوظ رہنے کا سہارا ایک ہی تھا اور وہ تھا قائدِاعظمؒ کی ذات پر اہلِ پاکستان کا کلی اعتماد۔۔۔ مودودی صاحب کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کا قائدِاعظمؒ کی ذات پر یہ اعتماد باقی نہ رہے، وہ جانتے تھے کہ اگر اس میں تزلزل آ جائے تو پھر یہ عمارت سلامت نہیں رہ سکتی۔ مودودی صاحب کے رسالہ ـــــ ترجمان القرآن ـــــ کا پاکستان میں پہلا پرچہ جون ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اُس میں انہوں نے تقسیم ہند کے عواقب کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا۔

منہ کالا کرنے والی

یہ بحث اُن سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے، جنہوں نے پچھلے رُبع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔ (صفحہ ۴)

اسی پرچہ کی اگست ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں، اس خونچکاں داستان کو دُہرانے کے بعد لکھا:۔

> اس پورے گروہ میں ایک کوئی نہ تھا جو بازی کھو دینے کے بعد سر دے سکتا۔ یہ ساری جماعت بازی گروں سے پٹی پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشہ دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی، جس کے وہ نمائندے بنے ہوئے تھے۔ (ص۴)

مودودی صاحب نے تقسیم سے پہلے قائدِاعظمؒ کے خلاف جو کچھ لکھا تھا، اُسے ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، اور تقسیم کے بعد انہوں نے جن الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے انہیں آپ ابھی ابھی سُن چکے ہیں۔ سوچئے کہ کیا ایسے عظیم قائد کے خلاف اِس سے زیادہ ذلت آمیز اور حقارت انگیز الفاظ کوئی اور بھی ہو سکتے ہیں؟ ایک طرف یہ دیکھئے اور دوسری طرف مودودی صاحب کا وہ خط ملاحظہ فرمائیے جس کے ساتھ انہوں نے اپنا مفصل مقالہ نوائے وقت کی ۱۴/ اگست ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں شائع کرایا ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے:۔

> آپ کی معلومات کے لئے اتنا کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ ہوش سنبھالنے کے بعد جب سے مَیں نے ملکی سیاست میں دلچسپی لینی شروع کی تھی۔ میرے دل میں مسلمانوں کے جن لیڈروں کا احترام سب سے زیادہ تھا، ان میں سے ایک قائدِاعظمؒ مرحوم بھی تھے۔ میں نے ہمیشہ ان کو ایک بااُصول راستباز اور مضبوط سیرت و کردار کا مالک انسان سمجھا اور ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۸ء تک کبھی میرے دل میں ان کے متعلق یہ بدگمانی پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف بھی کوئی بات کہہ سکتے ہیں۔

قائدِاعظمؒ کا کردار تو مودودی صاحب کے سرٹیفکیٹ کا محتاج نہیں، لیکن اس قسم کی تضاد بیانیوں سے خود مودودی صاحب کا جس قسم کا کردار سامنے آتا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں!

بعض حضرات کو اس پر تعجب ہوتا ہے کہ تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد خود قائدِاعظمؒ کی زندگی میں (جبکہ وہ مملکتِ پاکستان کے گورنر جنرل بھی تھے) مودودی صاحب کو یہ کچھ کہنے کی جرأت کس طرح سے ہو گئی؟ اتنا ہی نہیں، جماعتِ اسلامی کے ہمنوا حضرات اکثر کہا کرتے ہیں کہ اگر مودودی صاحب نے مطالبۂ پاکستان یا قائدِاعظمؒ کی مخالفت کی تھی تو تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد انہیں ریڈیو پاکستان لاہور سے سلسلۂ تقاریر براڈکاسٹ کرنے کی اجازت کیسے مل گئی؟ اس میں شبہ نہیں کہ جو لوگ اس جماعت کی تاریخ سے واقف نہیں وہ نہایت آسانی سے اس قسم کے دلائل کے فریب میں آ سکتے ہیں لیکن حقیقت آشنا نگاہیں جب سطح سے نیچے اتر کر گہرائی تک پہنچتی ہیں تو اس میں انہیں بہت کچھ نظر آ جاتا ہے۔ میں نے محترم علی محمدؒ راشدی صاحب کے مقالہ سے جو مختصر سا اقتباس پہلے دیا ہے اس میں انہوں نے کہا ہے کہ "ماسوا دو تین افسروں کے کسی اور سرکاری افسر نے

بیوروکریسی اور مودودی صاحب

اس زمانے میں ہماری کوئی مدد نہیں کی بلکہ ان میں سے اکثر تو پاکستان کے تخیل کا مضحکہ اڑاتے رہتے تھے اور اس ڈر کے مارے کہ انگریز یا ہندو ان سے خفا نہ ہو جائے، وہ دفتر پبلس کے راستے سے گذرتے ہی نہیں تھے۔" (واضح رہے کہ وفتر پبلس وہ مقام تھا جہاں سیٹھ عبداللہ ہارون (مرحوم) رکنِ اسمبلی کی حیثیت سے سرکاری مکان میں قیام پذیر تھے اور وہاں پاکستان کی اسکیم مرتب کرنے کا کام ہوا کرتا تھا۔) اس کے بعد راشدی صاحب نے لکھا ہے:۔

> بعد میں جب پاکستان بن گیا تو اس زمانے کے کئی جفادری افسر ۔۔۔۔ پاکستان کے مرکز اور صوبوں میں بڑے بڑے عہدوں پر قابض ہو گئے اور لوگوں کے سامنے یہ دعوے کرتے رہے کہ وہ شروع سے پاکستان کے لئے کام کرتے رہے تھے۔ حالانکہ ان کے یہ دعوے غلط تھے۔ ان کی ہمدردیاں پاکستان کی طرف اس وقت مڑیں جب ان کو معلوم ہو گیا کہ پاکستان کا وجود میں آنا اب ناگزیر ہے۔ (روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۰ مارچ ۱۹۷۲ء)

یہ بالکل صحیح ہے۔ میں خود مرکزی حکومتِ پاکستان سے وابستہ تھا اور یہ تمام حالات میرے بھی چشم دید ہیں۔ ان افسروں کی کیفیت یہ تھی کہ انگریز اور ہندو کے ڈر سے مسلم لیگ کے تو کسی دفتر کے سامنے سے بھی نہیں گذرتے تھے، لیکن ان کے بنگلوں پر مودودی صاحب کی دعوتیں ہوا کرتی تھیں جو تحریکِ پاکستان کے اس قدر مخالف تھے۔ یہی حضرات یہاں پہنچنے پر حکومت کی مسندوں پر متمکن ہو گئے۔ انہی کے بل بوتے پر تشکیلِ پاکستان کے بعد مودودی صاحب کی جرأتیں اس قدر بیباک ہو گئیں اور انہی کی سازشوں سے ان کی تقریریں بھی ریڈیو پر نشر ہونے لگیں۔ (ریڈیو پر تقریروں کے علاوہ، مودودی صاحب پاکستان کے مختلف شہروں میں بھی اسی قسم کی تقریریں کرتے پھر رہے تھے۔) جاننے والے جانتے ہیں کہ اس قسم کے انتظامات نچلے افسروں کے توسط سے سرانجام پا جاتے ہیں۔ گورنر جنرل (قائدِاعظم) کو نہ اس کی فرصت تھی اور نہ ہی اس کی ضرورت کہ وہ معلوم کرتے پھرتے کہ ریڈیو پر تقریروں کی اجازت کس کس کو مل رہی ہے۔ ویسے بھی وہ بڑے ہی وسیع الظرف واقع ہوئے تھے ۔۔۔ یہ غیر محل نہ ہو گا اگر میں اس مقام پر ایک اور اہم نقطہ بھی سامنے لے آؤں جس سے ہویدا ہو کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد مودودی صاحب کس برتے پر اس ملک میں مسلسل انتشار پھیلاتے چلے آ رہے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں حکومتِ پاکستان نے فیصلہ کیا کہ خارجہ پالیسی میں ان کا رجحان امریکی بلاک کی طرف ہونا

چاہیئے۔ اس مقام پر مودودی صاحب نے لاہور اور کراچی کے پبلک جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے کھلے الفاظ میں کہا کہ:۔

اگر یہ بلاک فی الواقعہ یہ چاہتا ہے کہ کمیونزم کی روک تھام کے لئے اسے مسلم عوام کا دلی تعاون حاصل ہو تو اسے اپنی بنیادی پالیسی میں بنیادی تغیر کرنا پڑے گا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ آئے مسلم بلاک کے حکمرانوں سے ساز باز کرنا ہے یا مسلم ممالک کے عوام کا تعاون حاصل کرنا ہے۔ یہ اس کے سوچنے کا کام ہے کہ اسے کونسی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ اسے حکمرانوں کی ضرورت ہے جو عوام پر سطحی اثر بھی نہیں رکھتے یا عوام کے تعاون کی ضرورت ہے جو طاقت کا اصلی سرچشمہ ہوتے ہیں..... مسلمان ملکوں کے ساتھ آپ کی جو پالیسی اب تک چل آرہی ہے وہ ایسی ہرگز نہیں ہے کہ پاکستان اور دوسرے ممالک کے عوام کا دلی تعاون آپ کو حاصل ہو سکے۔ (اخبار تسنیم۔ مورخہ ۱۶ ر و ۲۰ ر دسمبر ۱۹۵۵ء)

میں اس تقریر پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ یہ سب کچھ اپنی زبان سے آپ کہہ رہی ہے۔ حیرت ہے کہ اس پر حکومت کی طرف سے بھی کوئی نوٹس نہ لیا گیا حالانکہ کسی مملکت کے شہری کا بیرونی طاقت کو اس قسم کی دعوت دینا، اپنی مملکت کے خلاف بغاوت کے مترادف ہے ـــــ انہی دنوں اخبارات میں اس قسم کی خبریں شائع ہوئیں کہ مودودی صاحب چوہدری محمد علی صاحب سے، جو اُن دنوں پاکستان کے وزیرِاعظم تھے، راتوں کو ملاقاتیں کرتے ہیں۔ اس پر ایک مستفسر کے سوال کے جواب میں حسبِ ذیل خط اخبارات میں شائع کیا گیا:۔

لاہور۔ ۲۷ ر دسمبر ۱۹۵۵ء

محترمی و مکرمی! السلام علیکم

آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ چوہدری محمد علی صاحب سے میرے ذاتی تعلقات پندرہ سولہ برس پرانے ہیں اور برادرانہ حد تک ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے بھی وہ میرے ہاں تشریف لاتے تھے اور میں ان کے ہاں جاتا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی وہ ہمیشہ مجھ سے ملتے رہے۔ ان کی سرکاری پوزیشن اور میری سیاسی پوزیشن کبھی ان تعلقات میں مانع نہیں ہوئی۔ اب ان کے وزیرِاعظم بن جانے کے بعد آخر یہ ذاتی دوستی کیوں ختم ہو جائے۔

بعض لوگوں نے از راہِ شرارت میری اور ان کی ملاقات کو "خفیہ ملاقات" قرار دیا ہے اور اکتوبر کی ایک ملاقات کا ذکر اس طرح کیا ہے گویا میرے اور ان کے درمیان کوئی ساز باز ہوا تھا۔ حالانکہ میں جب کبھی کراچی جاتا ہوں، ان سے دو ایک ملاقاتیں ضرور ہوتی ہیں۔ اور چونکہ رات ہی کا وقت میری اور ان کی فرصت کا ہو سکتا ہے اس لئے ملاقات رات ہی کے وقت ہوتی ہے۔ اس ذاتی میل جول کی کوئی سیاسی حیثیت نہیں ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کا ذکر اخبارات میں آئے۔ البتہ جس روز امیر جماعت اسلامی اور وزیرِ اعظم پاکستان کی کوئی بات چیت سیاسی گفت و شنید کی نوعیت کی ہوگی تو انشاء اللہ وہ منظرِعام پر ہوگی۔

افسوس ہے کہ سیاست بازوں کو ہر چیز میں سیاست بازی اور گٹھ جوڑ ہی نظر آتا ہے۔ مگر میں اُن کا ہم جنس نہیں ہوں۔ نہ کسی کی طعن و تشنیع سے اپنی وضع میں تغیر کر سکتا ہوں۔ خاکسار

(بحوالہ تسنیم۔ مورخہ ۶/۱/۵۶) ابوالاعلیٰ

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب پولیس جماعتِ اسلامی کے دفاتر چھاپے مار کر اُن کے بہت سے کاغذات لے گئی تھی۔ اس زمانہ کے وزیرِ اعلیٰ (پنجاب) ڈاکٹر خان صاحب نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنی پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ۔

جماعتِ اسلامی اچھے کام نہیں کر رہی۔ دوسرے ممالک میں ایسی تخریبی کارروائیوں کو کبھی برداشت نہیں کیا جاتا۔ جو لوگ بیرونی ممالک کے سامنے پاکستان کی بھیانک تصویر پیش کریں انہیں کبھی وفادار شہری نہیں کہا جا سکتا۔ ایسی کارروائیاں کرنے والے کبھی پاکستان کے مخلص بہی خواہ نہیں سمجھے جا سکتے۔

(اس کے بعد انہوں نے کہا کہ) حال ہی میں حکومتِ مغربی پاکستان کو ڈاک خانہ کے سنسر کے دوران قابلِ اعتراض مطبوعہ لٹریچر ہاتھ آیا جو مشرقِ وسطیٰ کی بعض سیاسی جماعتوں کے نام بھیجا جا رہا تھا۔ جماعت اسلامی کے دفاتر پر چھاپے اسی بنا پر مارے گئے ہیں۔

(بحوالہ ڈان۔ مورخہ ۱۶/۱/۵۶)

باب چہارم

(اقامتِ دین کے نقاب میں)

جیساکہ میں شروع میں کہہ چکا ہوں، ہندوؤں اور انگریزوں کی سازش کا پہلا گوشہ یہ تھا کہ مملکتِ پاکستان وجود ہی میں نہ آئے۔ اس سلسلہ میں مودودی صاحب نے کیا کردار ادا کیا اسے میں مختصر الفاظ میں پیش کر چکا ہوں۔ ان کی سازش کا دوسرا گوشہ یہ تھا کہ اگر یہ مملکت وجود میں آجائے تو یہ اسلامی مملکت نہ بننے پائے۔ اب یہ دیکھئے کہ اس ضمن میں مودودی صاحب نے کیا اسکیم تیار کی اور اس پر کس طرح عمل پیرا چلے آرہے ہیں۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ ان الفاظ کو سُن کر آپ کے کان کھڑے ہو جائیں گے اور آپ کہیں گے کہ جو شخص اقامتِ دین کا داعی ہے اس کے متعلق یہ کیسے کہا جا سکے گا کہ وہ اس مہم میں مصروفِ سعی و کاوش ہے کہ پاکستان، اسلامی مملکت نہ بننے پائے! میری آپ سے صرف اتنی گذارش ہے کہ جس طرح آپ نے اس داستان کے پہلے حصہ کو غور و خوض سے سنا ہے، اس دوسرے حصہ کو بھی ٹھنڈے دل سے سنئے اور پھر جو نتیجہ آپ کا جی چاہے اخذ کر لیجئے —— اس سلسلے میں سب سے پہلے اس بنیادی حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ کسی مملکت کا قائم رہنا اسی صورت میں ممکن ہے جب مملکت کا ایک ضابطۂ قوانین ہو جو ساری مملکت کے باشندوں پر یکساں طور پر لاگو ہو سکے۔ اسلامی مملکت میں اسلامی قوانین کا اس قسم کا ضابطہ اس مملکت کے قیام اور استحکام کی اولین شرط ہے۔ پاکستان پہنچتے ہی مودودی صاحب نے یہ مطالبہ پیش کرنا شروع کر دیا کہ چونکہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اس لئے یہاں قوانینِ شریعت کا نفاذ ہونا چاہیئے۔ نظر بظاہر یہ مطالبہ بڑا معقول، معصوم، مقدس اور عین مطابقِ اسلام دکھائی دیتا ہے۔ لیکن درحقیقت اس سے ایک بہت بڑے فتنے کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ اگر مودودی صاحب اس فتنہ کو اسلام

کے نام سے پیش نہ کرنے تو یہ کبھی کامیاب نہ ہو سکتا۔ انہوں نے بہت پہلے اپنی اِس چنگاری کو ہوا دیتے ہوئے، کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں نظامِ جاہلیت، مملکت کے اندر گھس آیا تھا، لکھا تھا کہ:

> سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ جاہلیت بے نقاب ہو کر سامنے نہ آئی تھی بلکہ "مسلمان" بن کر آئی تھی۔ کھلے دہریے اور مشرکین و کفار سامنے ہوتے تو شاید مقابلہ آسان ہوتا مگر وہاں تو آگے آگے توحید کا اقرار، رسالت کا اقرار، صوم و صلوٰۃ پر عمل، قرآن و حدیث سے استشہاد تھا اور اُس کے پیچھے جاہلیت اپنا کام کر رہی تھی۔ ایک ہی وجود میں اسلام اور جاہلیت کا اجتماع ایسی سخت پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے کہ اس سے عہدہ برآ ہونا ہمیشہ جاہلیتِ صریحہ کے مقابلہ کی بہ نسبت ہزاروں گنا زیادہ مشکل ثابت ہوا ہے۔ عریاں جاہلیت سے لڑیئے تو لاکھوں مجاہدین سر ہتھیلیوں پر لئے آپ کے ساتھ ہو جائیں گے اور کوئی مسلمان اعلانیہ اس کی حمایت نہ کر سکے گا۔ مگر اس مرکب جاہلیت سے لڑنے جایئے تو منافقین ہی نہیں، بہت سے اصلی مسلمان بھی اس کی حمایت پر کمربستہ ہو جائیں گے۔ (ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۴۰ء و جنوری ۱۹۴۱ء ۔ ص ۳۵)

قوانینِ شریعت نافذ کرو

مودودی صاحب نے یہی ٹیکنیک اختیار کی اور انگریز اور ہندو کے اُسی داعیہ کو اسلام کے نقاب میں پیش کر دیا۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے۔ یہاں آتے ہی حکومت سے ان کا مطالبہ یہ تھا کہ اسلامی قوانین نافذ کرو۔ اِس سے ذہن میں یوں آتا ہے گویا اسلامی قوانین کسی کتاب کے اندر منضبط تھے جسے یا تو حکومتِ پاکستان انڈیا سے اپنے ساتھ لائی تھی اور یا وہ یہاں کسی لائبریری یا ایوانِ حکومت میں رکھی تھی اور حکومت کا فریضہ یہ تھا کہ وہ اُن قوانین کو حکومت کے قانون کی حیثیت سے ملک میں نافذ کر دے۔ یہ تھا وہ تاثر جو یہاں دیا گیا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ انڈیا اور پاکستان تو ایک طرف، دنیا میں کہیں بھی کوئی ضابطۂ قوانین ایسا موجود نہیں تھا جسے تمام فرقوں کے مسلمان متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیتے۔ صورت یہ تھی کہ مسلمانوں کے مختلف فرقے تھے اور ہر فرقے کے پرسنل لاز اپنے اپنے تھے جن میں وہ کسی قسم کا تغیّر و تبدّل جائز قرار نہیں دیتے تھے۔ باقی رہے پبلک لاز تو وہ مختلف سلطنتوں کے وضع کردہ تھے۔ ہندوستان میں یہ قوانین، برطانوی حکومتِ ہند کے مرتب کردہ تھے اور اُس حصۂ ملک میں بھی نافذ تھے جسے اب پاکستان کہا جاتا تھا۔ اِن حالات میں حکومت سے یہ مطالبہ کرنا کہ ملک میں فوراً قوانینِ شریعت نافذ کرو، کتنا بڑا فتنہ درکنار تھا۔ مختلف فرقوں کے اختلافات کی شدت کا یہ عالم ہے کہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ نماز میں آمین، اونچی آواز یا خفی آواز سے کہنے پر مسجدوں میں سر پھٹول ہو جاتی ہے۔ معاملہ عدالتوں تک پہنچتا ہے۔ مسجدوں میں تالے پڑ جاتے ہیں۔ باہر فرقہ وارانہ فساد شروع ہو جاتے ہیں۔ پبلک لاز تو ایک طرف، پرسنل لاز میں باہمی اختلاف کا اندازہ اِس ایک مثال سے لگایئے کہ جب حکومت نے ۱۹۶۲ء میں عائلی قوانین نافذ کئے تو مولانا محمد داؤد غزنوی (مرحوم) نے جو مرکزی جمعیت اہلحدیث کے صدر تھے، کہا کہ اِن میں سے بعض قوانین جزئی ترمیمات کے ساتھ قبول کئے جا سکتے ہیں۔ اُسی جمعیت اہلحدیث کے حلقہ لاہور کے صدر،

مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب نے اس کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ "یہ مولانا غزنوی کا ذاتی خیال ہے جس کی پابندی اہلِ حدیث پر لازم نہیں۔" (روزنامہ کوہستان لاہور۔ مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۶۳ء) اس کے ساتھ ہی جماعتِ اسلامی کے ترجمان اخبار، ایشیاء نے مولانا غزنوی پر سخت تنقید کی اور لکھا:۔

> مولانا جب یہ استدلال کر رہے ہیں تو ہم حیرت کے ساتھ سوچ رہے ہیں کہ ان کے قلم سے مولانا محمد داؤد غزنوی امیرِ مرکزی جمعیت اہلِ حدیث بول رہے ہیں یا منکرینِ سنت کے سرخیل غلام احمد پرویز۔ حکومت کے سربراہ اور امیرِ مملکت کو، وہ کیسے باشد، حضرت عمرؓ کے مقام پر رکھ کر شریعتِ اسلامی کی تعبیر کرنے کا حق دینا، وہ ضال اور مُضِل نظریہ ہے جس نے عہدِ حاضر میں اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ پیدا کر دیا ہے۔
> (ایشیاء ۲۰ راگست ۱۹۶۳ء)

یہ پرسنل لاز میں اختلاف کی ایک مثال ہے۔ جہاں تک پبلک لاز کا تعلق ہے اس اختلاف کی شدت کہیں زیادہ ہو جاتی ہے۔ ۱۹۶۵ء کا ذکر ہے کہ کراچی سے شائع ہونے والے ماہوار مجلہ "بیّنات" نے جس کے نگران مولانا محمد یوسف بنوری ہیں، اور جو حنفی مسلک کا ترجمان ہے، یہ تجویز پیش کی کہ چونکہ پاکستان میں حنفی مسلمانوں کی اکثریت ہے، اس لئے یہاں فقہِ حنفی کے مطابق پبلک لاز نافذ کئے جائیں۔ فرقہ اہلِ حدیث کی طرف سے اس تجویز کی سخت مخالفت ہوئی، حتیٰ کہ ان کے ترجمان مجلہ "الاعتصام" نے لکھا کہ:۔

> فقہِ حنفی کو قانونی حیثیت دے دینا تو بڑی بات ہے، اس مطالبہ کا خیال بھی نہیں کرنا چاہیئے۔

دوسری طرف شیعہ حضرات نے اس کے خلاف سختی سے صدائے احتجاج بلند کی اور کہا کہ جب ہم اس فقہ کو اسلامی ہی تسلیم نہیں کرتے تو اسلامی قانونِ مملکت کی حیثیت سے اس کی اطاعت کیسے کریں گے؟ انہوں نے یہاں تک لکھ دیا کہ:۔

> اگر سوادِ اعظم کے رہنماؤں نے ہماری معروضات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اپنے عمل میں کوئی تبدیلی نہ کی تو ہم اس ملک اور اپنے مستقبل کے بارے میں نئے انداز سے سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے، خواہ ایک ناگوار فرض کی حیثیت سے سہی۔

یہ تمام بحث طلوعِ اسلام۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء میں شائع ہو چکی ہے۔ ان حالات میں عزیزانِ من! آپ سوچئے کہ مودودی صاحب کی طرف سے یہ مطالبہ کہ ملک میں فوراً قوانینِ شریعت نافذ کرو، کیا معنی رکھتا تھا؟ اگر حکومت ان کے دامِ فریب میں اُلجھ کر کسی ایک فرقے کی فقہ کو بھی بطورِ قانونِ مملکت نافذ کر دیتی تو یہاں ایسی سول وار (خانہ جنگی) شروع ہو جاتی جس کے بعد اس مملکت کا نام و نشان تک باقی نہ رہتا۔ انہوں نے سمجھ سے کام لیا اور ایسا کوئی قدم نہ اٹھایا۔ لیکن مودودی صاحب کو اس سے حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ چنانچہ وہ

نفرت انگیزی کی مہم

اُس وقت سے آج تک ہر حکومت کے خلاف یہ کہہ کر نفرت پھیلاتے چلے آ رہے ہیں کہ دیکھئے! یہ ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا لیکن اربابِ اقتدار یہاں اسلامی قوانین نافذ نہیں کر رہے۔ اصل یہ ہے کہ ان کا یہ ارادہ ہی نہیں کہ یہ مملکت اسلامی بن جائے۔ انہوں نے ۱۹۴۸ء میں یہ شوشہ چھوڑا اور ۱۹۷۶ء تک اسے برابر ہوا دیتے اور ملک میں مسلسل خلفشار پھیلاتے چلے آ رہے ہیں، اور نعرہ

ایسا مقدس اور نازک ہے کہ کوئی اس کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتا۔ حتیٰ کہ انہوں نے (مئی ۱۹۷۶ء میں) جماعتِ اسلامی کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی وکلاء کانفرنس میں یہ فرمایا کہ:-

> یہاں معاملہ یہ ہے کہ پاکستان حاصل کرنے کے لئے بڑی کوششیں کی گئیں اور یہ حاصل اس لئے کیا گیا کہ ہم یہاں اسلامی قوانین نافذ کریں گے۔ پاکستان کا مطلب لا الٰہ الا اللہ بیان کیا گیا۔ لاکھوں آدمیوں کی جانیں کٹوا دی گئیں۔ لاکھوں آدمیوں کی عزتیں گنوا دی گئیں اور لاکھوں کی جائیدادیں تباہ کروا دیں۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد جب ملک حاصل ہوا تو اس کام کو چھوڑ دیا گیا جس کے لئے ملک حاصل کیا گیا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے بڑا فراڈ دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتا جو کیا گیا اور اس سے زیادہ دھوکہ بازی کوئی نہیں ہو سکتی کہ ملک حاصل کرتے وقت تو نام اسلام کا لیا جائے مگر پھر ارادہ کر لیا جائے کہ یہاں اسلام کو نافذ نہیں ہونے دیا جائے گا۔ (ایشیا۔ مورخہ ۹ مئی ۱۹۷۶ء)

"طاہر ویکلی" میں یہ الفاظ لکھتے کہ:-

> مطلوبہ سرزمین قائم ہونے کے فوراً بعد ہی یہ ارادہ کر لیا جائے کہ یہاں اسلام قائم نہیں ہوگا۔

طلوعِ اسلام نے اس کے خلاف سختی سے احتجاج کیا اور کہا کہ اور تو اور خود قائدِ اعظمؒ کی شان میں یہ بہت بڑی گستاخی ہے۔ ملک کے بعض دوسرے جرائد نے بھی اس احتجاج کی تائید کی اور مودودی صاحب کو مجبوراً ۱۴ اگست ۱۹۷۶ء والا مقالہ شائع کرنا پڑا جس میں انہوں نے کہا ہے کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس میں قائدِ اعظمؒ شامل نہیں۔ بہرحال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اس سے بتانا یہ مقصود تھا کہ مودودی صاحب اس ایک نعرہ سے جو بظاہر بڑا معصوم نظر آتا ہے، کتنے بڑے فتنے کو پھیلاتے چلے آ رہے ہیں۔

سارے ملک میں صرف طلوعِ اسلام ایسا مجلّہ ہے جو مودودی صاحب کی اس سازش کو پیہم اور مسلسل بے نقاب کرتا چلا آ رہا ہے۔ مودودی صاحب کے اس مطالبہ پر اس نے کہا کہ ایسا ضابطۂ قوانین موجود نہیں جسے ملک میں نافذ کر دیا جائے، اسے مرتب کرنا ہوگا۔ اس پر مودودی صاحب نے ایک اور چال چلی۔ مطالبہ پیش کر دیا کہ "کتاب و سنت" کے مطابق اس قسم کا مجموعۂ قوانین مرتب کیا جائے۔ یہ مطالبہ پہلے سے بھی زیادہ معقول اور مطابقِ اسلام دکھائی دیگا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس میں سنتِ رسول اللہ کا ذکر کر کے امت کے انتہائی نازک جذبات سے بھی کھیلا گیا۔ میرا خیال ہے کہ آپ یقیناً سوچنے لگ گئے ہوں گے کہ اس مطالبہ میں کونسی تخریبی سازش پنہاں ہو سکتی ہے؟ سنت کی بحث بڑی پیچیدہ

بحثِ سنت

اور اصطلاحی سی ہے لیکن میں کوشش کروں گا کہ اسے عام فہم الفاظ میں بیان کروں۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، مسلمانوں کے مختلف فرقے ہیں اور ان کی اپنی اپنی فقہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ ان کی فقہ کا مدار سنتِ رسول اللہ پر ہے۔ اس سے واضح ہے کہ ہر فرقہ کے نزدیک سنت کا الگ الگ تصور اور اس کا الگ الگ مجموعہ ہے اور اسی سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ سنت کی بنیاد پر کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی کہلا سکے۔ مودودی صاحب ۲۵ سال سے اس اصطلاح کو دہراتے چلے آ رہے ہیں لیکن سنتِ رسول اللہ کا کوئی ایسا مجموعہ پیش نہیں

کرسکے جسے تمام فرقے متفقہ طور پر سنتِ رسول اللہ تسلیم کرلیں۔ سنت کا کوئی مجموعہ پیش کرنا؛ تو ایک طرف، انہوں نے سنت کی جو (DEFINITION) پیش کی اور اس کے صحیح ہونے کا جو معیار بتایا اس کی بڑی شدت سے مخالفت ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ احادیث کے صحیح اور غلط ہونے یا سنتِ رسول اللہ کے سنت قرار دیئے جانے کا معیار یہ ہے کہ جس چیز کو "مزاج شناسِ رسولؐ" صحیح قرار دے دے اسے صحیح سمجھا جائے۔ اور، جیساکہ منیرکمیٹی کے سامنے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے (جو اس زمانے میں مودودی صاحب کے دستِ راست تھے) اعتراف کیا تھا، اس جماعت کے نزدیک "مزاج شناسِ رسول" خود مودودی صاحب ہیں۔ اس پر اس زمانے کے جمعیت اہلحدیث کے صدر، مولانا اسمٰعیل (مرحوم) نے لکھا تھا:۔

> اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسولؐ کا مزاج شناس تصوّر کرلے، پھر اُسے اختیار دیدے کہ اصولِ محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کرلے، جسے چاہے رد کردے۔۔۔۔۔۔ تو یہ مضحکہ انگیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم انشاءاللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنتِ رسولؐ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ (جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث ص۶۳)

یہ تمام بحث اُس مقالہ میں دیکھی جا سکتی ہے جو "کتاب و سنت" کے عنوان سے طلوعِ اسلام کی جولائی ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ آپ اس بحث میں پڑیئے ہی نہیں۔ آپ جماعتِ اسلامی کے کسی ذمہ دار کسی سے پوچھئے کہ کیا مودودی صاحب نے آج تک کسی ایسی کتاب کی نشاندہی بھی کی ہے جس میں سنتِ رسول اللہ مرتب شکل میں منضبط ہو اور جسے تمام فرقے مستند سنتِ رسول اللہ تسلیم کرتے ہوں۔ ان کا جواب خود مودودی صاحب کے مطالبہ کی قلعی کھول دے گا۔ بہرحال، صورت یہ ہے کہ مودودی صاحب کی طرف سے آج تک نہ تو سنتِ رسول اللہ کا کوئی متفق علیہ مجموعہ پیش کیا جا سکا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی متفق علیہ تعریف۔ لیکن اس کے باوجود، وہ مسلسل شور مچاتے چلے جاتے ہیں کہ مملکتِ پاکستان کا ضابطۂ قوانین "کتاب و سنت" کے مطابق مرتب کیا جائے اور جب ایسا نہیں کیا جاتا تو وہ حکومت کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کر دیتے ہیں کہ یہ فریب کار ہیں، فراڈیے ہیں۔ اور نہ جانے کیا کیا ہیں ——ان کی اسی غوغا آرائی کا اثر ہے کہ خود آئینِ پاکستان میں یہ شق شامل کر دی گئی ہے اور آئین مرتب کرنے والوں میں سے کسی نے نہیں پوچھا کہ اس اہم شق کا عملی مفہوم کیا ہے؟

اس مقام پر عزیزانِ من: شاید آپ بھی سر پکڑ کر بیٹھ جائیں اور دل میں کہیں کہ بات تو کچھ ایسی ہی نظر آتی ہے کہ جب کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب ہی نہیں کیا جا سکتا تو ظاہر ہے کہ اسلام کی بنیادوں پر کوئی مملکت متشکل ہی نہیں کی جا سکتی؛ لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ اس مسئلہ کو سطحی طور پر دیکھ کر اسلام کے متعلق ایسے مایوس نہ ہو جائیں۔ اصل یہ ہے کہ مودودی صاحب کا یہ جادو اس لئے بھی چل گیا ہے کہ قوم اس قدر پریشانیوں میں اُلجھی ہوئی ہے اور ہر ایک کو اس طرح نفسانفسی

بڑی ہوئی ہے کہ اس قسم کے مسائل پر توجہ دینے کی کسی کو فرصت ہی نہیں۔ کوئی اسے (SERIOUSLY) لے ہی نہیں رہا۔ ورنہ بات کچھ ایسی نہ تھی جو سمجھ میں نہ آسکتی۔ میں شروع میں تفصیلاً عرض کر چکا ہوں کہ علامہ اقبالؒ نے جب پاکستان کا تصوّر پیش کیا تھا تو وہ ان تمام مشکلات سے واقف تھے جو اس سلسلے میں پیش آسکتی تھیں اور اس کا حل انہوں نے اُسی زمانے میں تجویز کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ صحیح ہے کہ ہر فرقہ کی فقہ الگ الگ، احادیث کے مجموعے الگ الگ اور سنت کا تصوّر الگ الگ ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسلام میں ایک ایسی چیز موجود ہے جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہے اور وہ ہے خدا کی کتاب ـــــ قرآنِ مجید ـــــ اسلامی مملکت کے لئے قانون سازی کا اصول یہ ہونا چاہیئے کہ قرآن مجید کے اصول و قوانین اور حدود کو غیر متبدل رکھا جائے۔ ہماری فقہ اور احادیث میں جو کچھ قانون کی حیثیت سے آیا ہے، قرآن کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا جائے۔ جو اس کے خلاف نہ ہوں اور ہمارے زمانے کے تقاضوں کو پورا کر سکیں، انہیں اختیار کر لیا جائے۔ باقی امور کے لئے، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، اسلامی مملکت خود قوانین وضع کرلے۔ قرآن کی حدود ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گی اور اس کی روشنی میں مرتب کردہ قوانین زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلے جا سکیں گے۔ ثبات اور تغیر کے اس امتزاج سے، اسلام، قیامت تک نظامِ مملکت بن سکنے کے قابل رہے گا۔ مودودی صاحب کے ناممکن العمل مطالبوں کے مقابلے میں، مَیں نے علامہ اقبالؒ کا یہ مسلک پیش کیا، اس لئے کہ خود میرے نزدیک بھی یہی مسلک قرآنی منشاء کے مطابق ہے۔ مودودی صاحب کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا اور انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ جس مقصد کے لئے وہ یہ کھیل کھیل رہے ہیں، طلوعِ اسلام اُسے بے نقاب کر دے گا۔ اس کے لئے انہوں نے اپنا وہی مجرب نسخہ استعمال کیا۔ یعنی یہ مشہور کر دیا کہ طلوعِ اسلام منکرِ حدیث ہے، منکرِ شانِ رسالت ہے، منکر سنت ہے، تین نمازوں اور نو روزوں کی تلقین کرتا ہے، اُردو میں نماز پڑھنے کی تجویز کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے ہر شق صریح جھوٹ ہے۔ لیکن انہوں نے گوئبلز کی ٹیکنیک کی رُو سے اس جھوٹ کو اس تکرار و اصرار سے دہرایا ہے کہ سطحی بیں نگاہوں کو یہ سچ بن کر دکھائی دینے لگا ہے۔ اپنے اس پراپیگنڈہ کے لئے انہوں نے ایک اور حربہ بھی استعمال کیا۔ انہوں نے اسٹوڈنٹس کی بے بسری فوج کو (جن کے ساتھ میری ساری ہمدردیاں شامل ہیں کہ ہمارا مستقبل وابستہ ہی ہماری اسی آنے والی نسل کے ساتھ ہے۔) اسلامی جہاد کا نعرہ دے کر اپنے پیچھے لگا لیا۔ مقصد یہ تھا کہ جب تک وہ اسٹوڈنٹ رہیں ملک میں انتشار پھیلاتے رہیں۔ اس کے بعد وہ مختلف شعبوں میں ملازمتیں حاصل کر کے حکومت کی انتظامیہ میں دخیل کار ہو جائیں۔ چنانچہ آج حکومت کے محکموں میں شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں اُن کے پراپیگنڈہ کے یہ آلۂ کار، اختیارات کی کرسیوں پر متمکن نہ ہوں۔ ان کا سب سے بڑا "جہاد" پرویز اور طلوعِ اسلام کے خلاف پراپیگنڈہ ہے، اور وہ اس میں برابر مصروف رہتے ہیں کیونکہ اُنہیں بتایا گیا ہے کہ یہ اسلام کی بہت بڑی خدمت ہے۔

ایک دفعہ مودودی صاحب کے معتقدین میں سے کسی نے ان سے پوچھ لیا کہ طلوعِ اسلام تو حدیث کے متعلق وہی تصوّر سامنے لا رہا ہے جسے علّامہ اقبالؒ نے پیش کیا تھا۔ اگر طلوعِ اسلام اس بنا پہ منکرِ حدیث قرار پاتا ہے تو علّامہ اقبالؒ کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا کہ:-

> اس بارے میں، میں صرف اتنا ہی کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ ہمارے لئے اس مسئلہ کی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں کہ حدیث کے متعلق اقبالؒ مرحوم کا نظریہ کیا تھا اور کیا نہ تھا۔ اگر ہمارے پاس اس معاملہ میں صاف اور واضح نصوص اور خلفائے راشدین سے لے کر آج تک کے تمام علماء اُمت کا متفقہ طرزِ عمل نہ ہوتا تو شاید ہم اس کے محتاج ہوتے کہ حدیث کے متعلق علّامہ اقبالؒ کا نظریہ معلوم کرتے۔ لیکن اِن حجتوں کی موجودگی میں یہ چیز تلاش کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ (ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۶۰ء)

اقبالؒ کے سلسلہ میں تو احادیث کی سند کو اس قدر اہمیت دی جا رہی ہے اور خود اپنے متعلق ارشاد ہے کہ:-

> اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح اور غلط ہونا بجائے خود زیرِ بحث ہوتا ہے۔ آپ (یعنی فریقِ مخالف) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسولؐ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ (رسائل و مسائل حصہ اول صفحہ ۲۹۰ ستمبر ۱۹۵۱ء ایڈیشن)

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، ان کے نزدیک احادیث کے صحیح اور غلط ہونے کی سند "مزاج شناسِ رسولؐ" ہیں۔ یعنی خود مودودی صاحب (جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقامِ حدیث" کا مطالعہ فرمالیں۔) بہرحال، میں کہہ یہ رہا تھا کہ مودودی صاحب "کتاب و سنت" کے مقدس نقاب میں معاشرہ میں انتشار اور ہر حکومت کے خلاف نفرت کے جذبات پھیلاتے چلے گئے اور پھیلاتے چلے جا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی 'وکلاء کانفرنس کی تقریر میں' جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔ یہ بھی کہا کہ

> اِس مقصد کے لئے سرکاری طور پر ایک کمیٹی بٹھا دی جاتی تو چند مہینوں میں اسلامی قانون مدوّن کیا جا سکتا تھا۔ کوئی دقت نہ تھی۔ دقت صرف یہ تھی کہ ان کے اندر خواہش اور ارادہ موجود نہیں تھا۔ اور اب بھی موجود نہیں ہے۔

صدر ایوب کی پیشکش

اور حکومتوں کو تو چھوڑیئے۔ مرحوم صدر ایوب نے ۱۹۶۸ء میں خود یہ تجویز پیش کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ:-

> اپوزیشن کے راہنماؤں کی طرف سے جو اعتراضات موجودہ حکومت پر کئے جا رہے ہیں اُن میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ملک میں اسلامی قوانین کو نافذ نہیں کیا جا رہا۔ یہ ایک جذباتی، پیچیدہ اور نازک مسئلہ ہے۔ اگر اسلام میں مختلف فرقے موجود نہ ہوتے جس طرح خدا اور رسولؐ کی منشا تھی، تو یہ معاملہ آسان ہو جاتا۔ میں نے علماء سے ہمیشہ

> کہا ہے کہ وہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے اسلامی قانون تیار کریں اور اس کی منظوری وکلاء اور جج صاحبان سے حاصل کریں کہ یہ لوگ قانون کے ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ...... اسے اسمبلیوں میں پیش کر کے ان کی منظوری بھی حاصل کریں۔ اگر میں صدر رہا تو آنکھیں بند کر کے اِس قانون پہ دستخط کر دوں گا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ملک میں اسلامی قانون رائج ہو۔ میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کوئی بات نہیں۔ (نوائے وقت۔ ۳۱ ر دسمبر ۱۹۶۸ء)

مودودی صاحب اگر اسلامی قوانین کے مطالبہ میں ذرا بھی دیانتدار ہوتے تو انہیں صدرِ مملکت کی اِس پیشکش پر فوراً لبیک کہنا چاہئیے تھا۔ لیکن اِس سے تو ان کا سارا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ لہذا اِس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ یہ شخص (صدر ایوب) بدنیت ہے اور علماء کے اختلاف کو خواہ مخواہ سپر بنا رہا ہے۔ (نوائے وقت۔ مورخہ ۲۰ ر جنوری ۶۹ء) مودودی صاحب کی اسی قسم کی چہرہ بازیاں تھیں جن سے تنگ آ کر صدر ایوب مرحوم نے اپنی ایک نشری تقریر میں کہا تھا کہ:۔

> اب ایک اوروں سے زیادہ مکار شخص مذہب کا لبادہ اوڑھ کر میدان میں آگیا ہے۔ یہ شخص سیاسی مقاصد کے لئے مذہب کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ (امروز لاہور۔ ۲ ر دسمبر ۱۹۶۳ء)

لیکن عزیزانِ من! اس قسم کی تقاریر اور بیانات کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے اور ان کا اثر بھی ہنگامی۔ اس کے برعکس مودودی صاحب کی پروپیگنڈہ کی مشینری مسلسل اور متواتر مصروفِ عمل چلی آ رہی ہے۔ اور یہ زر و سیم کے اس سیلاب کے بل بوتے پر جس کے منبع کا آج تک کسی کو پتہ نہیں چل سکا کہ کہاں ہے۔ اس کے مقابلے میں طلوعِ اسلام اپنی بے سر و سامانی کے باوجود برابر ان کا تعاقب کئے چلا آ رہا ہے اور اپنی اس پکار کو دہرائے جاتا ہے کہ "کتاب و سنت" کے مطابق کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو مختلف فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پا سکے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس نحیف و زار آواز کا اثر کیا ہوا۔ غالباً آپ پہلی بار یہ سن رہے ہونگے کہ مودودی صاحب کو بالآخر اس کا اعلان اور اعتراف کرنا پڑا کہ:۔

کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے، جو پبلک لاز کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔

ان کا یہ اعتراف، ان کی جماعت کے ترجمان اخبار ایشیاء کی ۲۳ ر اگست ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ جس کا جی چاہے، دیکھ لے۔ طلوعِ اسلام اپنی اس خوش بختی پر جس قدر بھی ناز کرے کم ہے کہ اس کی مسلسل اور پیہم کوششوں کے بعد مودودی صاحب کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ان کا مطالبہ واقعی ناممکن العمل ہے۔ اس کی بنا پر پبلک لاز کا کوئی ایسا مجموعہ مرتب نہیں ہو سکتا، جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔

اِس پر آپ سمجھتے ہوں گے (اور ہر سمجھ دار انسان یہی سمجھے گا) کہ اس کے بعد مودودی صاحب نے یہ مطالبہ ترک کر دیا ہوگا اور طلوعِ اسلام کا پیش کردہ مسلک اختیار کر لیا ہوگا۔ لیکن وہ مودودی صاحب ہی کیا ہوئے، جو حق

کے اعتراف کے بعد اپنا باطل مسلک چھوڑ دیں؟ انہوں نے یہ کچھ ۱۹۴۷ء میں کہا، اور اس کے بعد وہ پھر آجتک اس مطالبہ کو برابر دہراتے چلے آرہے ہیں کہ کتاب و سنت کے مطابق ضابطۂ قوانین مرتب کرکے ملک میں نافذ کیا جائے۔ حتیٰ کہ اسے انہوں نے اپنی جماعت کے منشور میں بھی بدستور شامل کئے رکھا: اور ۱۹۷۳ء کے آئینِ پاکستان میں بھی یہ شق رکھوا دی (آرٹیکل ۲۲۷) یہ ہے وہ مقام عزیزانِ من! جس پر ہم آج کھڑے ہیں۔

آپ کے دل میں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا مودودی صاحب نے کوئی ایسا طریق بھی بتایا جس سے یہ ناممکن العمل مسئلہ ممکن ہو جائے اور پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کی صورت پیدا ہو سکے؟ انہوں نے اس کا عملی حل بتایا ہے، اور وہ حل ان کی اس تقریر میں دیا گیا ہے جو انہوں نے وکلاء کنونشن میں کی تھی۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ:-

اقتدار مجھے دو

> میں واضح طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلامی قانون کا نفاذ اگر ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے ان کو اقتدار سے ہٹایا جائے اور ملک کا اقتدار اُن لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو جو اسلام کو جانتے بھی ہیں، دل سے مانتے بھی ہیں اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ موجود ہیں اور جس روز ان کے ہاتھ میں اقتدار آئے گا اس کے دوسرے روز اسلامی احکام نافذ ہو جائیں گے۔

اُن سے کسی نے نہیں پوچھا کہ جب اسلامی احکام کا ضابطہ آپ کے جھولے میں بنا بنایا موجود ہے اور آپ اسے اقتدار سنبھالنے کے دوسرے ہی روز نافذ کر دینگے، تو آپ نے آجتک اسے چھپائے کیوں رکھا؟ اسے قوم کے سامنے پیش کیوں نہ کر دیا۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ راز TRADE SECRET ہے قیمت وصول کئے بغیر اس راز کو کس طرح افشا کر دیا جائے؟

اور یہ بھی کسی نے نہیں پوچھا کہ جب آپ کہتے ہیں کہ "کتاب و سنت" کی رو سے ایسا ضابطۂ احکام مرتب ہی نہیں ہو سکتا، تو جو ضابطہ آپ کے جھولے میں ہے اسے آپ نے کن بنیادوں پر مرتب کیا ہے؟ میں آپ احباب سے سفارش کرتا کہ آپ کسی طرح مودودی صاحب کو اقتدار دلا دیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مجھے آپ کی جان عزیز ہے۔ اور مودودی صاحب لگی لپٹی بغیر اعلان کر چکے ہیں کہ:-

> جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کرکے ہمارے نظام اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں، مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانینِ اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجبات دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا۔ اور پھر جو کوئی دائرۂ اسلام سے باہر قدم رکھے گا، اسے قتل کر دیا جائے گا۔ (کتابچہ "مرتد کی سزا، اسلامی قانون میں" اگست ۱۹۵۳ء ایڈیشن صفحہ ۷۶)

ظاہر ہے کہ اسلام سے مراد وہی اسلام ہوگا جس کا سرٹیفکیٹ مودودی صاحب عطا فرما دیں!

جنرل یحییٰ خاں

آپ کو معلوم ہے کہ اس کا معیار کیا ہوگا، نہیں معلوم تو سُن لیجئے۔ جماعتِ اسلامی کے اُس زمانے کے قائمقام امیر، میاں طفیل محمد صاحب نے ۸ دسمبر ۱۹۶۹ء کو اپنی جماعت کے کارکنوں کو خطاب کرتے ہوئے، جنرل یحییٰ خاں کے متعلق فرمایا تھا:-

> مجھے قوی امید ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت کا جو سلسلہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کی شہادت سے منقطع

ہوا تھا اس کی بحالی کا آغاز انشاء اللہ حضرت علیؓ (رضی اللہ عنہ) ہی کے عاشقوں میں سے ایک شخص کے ہاتھوں پاکستان کی سرزمین سے ہوگا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ یحییٰ خان صاحب کو عزم و ہمت اور اس اخلاص کے ساتھ پاکستان میں اسلامی جمہوری نظام بحال کرنے کی توفیق عطا فرمائے جس کا انہوں نے بار بار اپنی تقریر میں ذکر فرمایا ہے۔ آمین! (ایشیا۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۶۹ء)

یہ ہوگا ان حضرات کا سرٹیفکیٹ عطا کرنے کا معیار! سچ ہے ——— کند ہم جنس باہم جنس پرواز!

میں کسی کے خلاف کوئی الزام نہیں تراشا کرتا۔ ایک دوست نے لندن سے شائع ہونے والے ہفتہ وار جریدہ "اخبار وطن" مورخہ (۲۶-۱۹) مئی ۱۹۷۶ء کا تراشا بھیجا ہے۔ مضمون کا عنوان ہے "۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کی اندرونی کہانی"۔ اس میں کہا گیا ہے کہ:-

> یحییٰ خان نے انتخابات کے لئے چار کروڑ روپیہ کا خفیہ فنڈ قائم کیا تھا جسے مختلف سیاسی جماعتوں میں تقسیم کیا گیا۔ اس میں سے (۷۵) لاکھ روپیہ جماعت اسلامی کو دیا گیا۔

میں نہ اس خبر کی تردید کرتا ہوں نہ تصدیق۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے تو اس قسم کے سرٹیفکیٹوں کی فیس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

میرے اس خطاب کا عنوان تھا — اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش ——— میں نے جو کچھ آپ احباب کے سامنے پیش کیا ہے اس سے آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ اگر مودودی صاحب کی مخالفت کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے اور یہ سازش رفتہ رفتہ کامیاب ہوتی چلی جائے، تو اس کے بعد یہاں اسلام اور مملکتِ پاکستان کا وجود بھی باقی رہ سکے گا؟ تقسیم ہند کی وجۂ جواز یہ تھی کہ ہم ایک ایسی مملکت قائم کرنا چاہتے تھے جس میں اسلامی قوانین کا نفاذ ہو سکے۔ اور جب دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اسلامی قوانین کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب ہی نہیں ہو سکتا جسے پبلک لاز کی حیثیت سے ملک میں نافذ کیا جا سکے، تو اس سے ہماری اس جداگانہ مملکت کی وجۂ جواز ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد یہاں یہ سوال ابھرے گا کہ اس مملکت کو دنیا کی دوسری مملکتوں کی طرح سیکولر سٹیٹ بنا دیجئے۔ جیسا کہ تقسیم سے پہلے ہندو لیڈروں نے کہا تھا مذہب کی بنیادوں پر مملکتوں کے قیام کا دور ختم ہو چکا ہے۔ ہمارے ہاں کی نئی نسل نے یہ کہنا شروع بھی کر دیا ہے۔ اور جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اب اسلامی نظام کا قیام ناممکن ہے، تو اس سے اسلام کے متعلق خود بخود یہ تاثر قائم ہو جائے گا کہ یہ ایک چلا ہوا کارتوس ہے۔ اسے یوں لئے لئے پھرنے سے فائدہ کیا ہے؟ یہ خیال بھی اب عام ہو رہا ہے۔ اور یہ سب اسی سازش کا صدقہ ہے جسے لے کر مودودی صاحب یہاں تشریف لائے تھے۔

مودودی صاحب کا اسلام

میں یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ مودودی صاحب اسلام کس قسم کا پھیلا رہے ہیں۔ لیکن یہ عنوان بجائے خویش ایک مستقل موضوع ہے اور بڑا تفصیل طلب، اور میرا یہ خطاب پہلے ہی کافی طویل ہو چکا ہے۔ اس لئے میں اس مجلس میں اس موضوع پر تفصیل سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سردست میں اس اسلام کے نمایاں خط و خال پیش کرنے پر اکتفا کروں گا جسے مودودی صاحب نے یہاں عام کر رکھا ہے اور جس کی وجہ سے ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل اسلام سے برگشتہ ہی نہیں متنفر ہو رہی ہے۔ اسلام کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ اس کے اصول خدا کی طرف سے نازل کردہ ہیں اس لئے غیر متبدل اور بے لچک ہیں۔ مودودی صاحب کا پیش کردہ اسلام یہ ہے کہ اسلامی نظام کی دعوت کے آغاز میں بڑے بڑے جاذب اور دلکش اصول پیش کرنے چاہئیں۔ لیکن جب اقتدار حاصل ہو جانے کے بعد ان پر عمل کرنے کا وقت آئے، تو ان میں تبدیلی کر لینی چاہیئے۔ اس کے لئے وہ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) وضعی روایات کے سہارے خود رسول اللہ کی مثال

پیش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کرکے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرقِ مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبانِ مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَیْشٍ۔ امام قریش میں سے ہوں۔

ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں یہ ہدایت، مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ (ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۵۶ء۔ صفحہ ۲۳)

آپ سوچئے عزیزانِ من! کہ وضعی روایات کی آڑ میں اس قسم کے مسلک اور میکیاولی سیاست کے سیکولر نظریہ میں کیا فرق ہے؟ اسلام کا دوسرا بنیادی اصول' راستبازی اور حق گوئی ہے۔ اس سلسلہ میں مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

راستبازی و صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے، بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء۔ صفحہ ۵۴)

اس سے آپ پر یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ خود مودودی صاحب اپنے بیانات میں جس دھڑلے سے کذب بافی سے کام لیتے ہیں اور ان کے متبعین (جماعتِ اسلامی والے) جس دیدہ دلیری سے دوسروں کے خلاف الزام تراشتے ہیں' اس کی وجہ کیا ہے؟

اسی قسم کا تھا مودودی صاحب کا وہ اسلام جس سے تنگ آکر ان کی جماعت کے بعض ممتاز ترین ارکان نے ان کا ساتھ چھوڑا تھا۔ اور ان کے سرخیل' امین احسن اصلاحی صاحب نے کہا تھا کہ میں سولہ سال تک ایک راہ گم کردہ قافلہ کے ساتھ رہ کر اسے بالآخر چھوڑنے پر مجبور ہو رہا ہوں۔ اور یہی ہے وہ اسلام جسے مودودی صاحب بالخصوص طالب علموں میں عام کر رہے ہیں ـــــ جھوٹ بولو۔ اصول شکنی کرو۔ فریب سے کام لو! اسی اصول شکنی کا نتیجہ ہے کہ مودودی صاحب کا اسلام، ان کی مصلحتوں کے تابع آئے دن بدلتا رہتا ہے ـــــ الیکشن میں حصہ لینا قطعاً ناجائز ہے۔ الیکشن لڑنا عین مطابقِ اسلام ہے۔ عورت کا سیاست میں حصہ لینا تو ایک طرف، وہ شرعاً ووٹ بھی نہیں دے سکتی۔ عورت سربراہِ مملکت کے منصب کے لئے بطور امیدوار کھڑی ہو تو اس کی تائید و حمایت شرعی فریضہ ہو جاتا ہے۔ زمین پر ایک انچ کی حدِ ملکیت مقرر کرنا بھی خلافِ اسلام ہے ـــــ زمین کی ملکیت ڈیڑھ سو ایکڑ سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے۔ وغیرہ ذالک۔ ان موضوعات پر طلوعِ اسلام میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

جنسیاتی اسلام

اس کے بعد آپ دوچار مثالیں اُس شعبۂ زندگی کی بھی ملاحظہ فرمالیجئے جسے مودودی صاحب اسلامی قرار دیتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ:۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس ــــ آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اگر اُن کی زندگی میں مودودی صاحب کے فقہی مسائل سامنے آجاتے تو وہ اپنے پہلے مصرعہ میں ان کے نامِ نامی کا بھی اضافہ فرما دیتے، خواہ اِس کے لئے انہیں بحرِ طویل بھی کیوں نہ اختیار کرنی پڑتی۔ میں مودودی صاحب کی اسی فقہ کی دوچار مثالیں آپ کے سامنے پیش کروں گا اور آپ کے ذوقِ سلیم سے صد معذرت کے ساتھ ـــــ

(۱) ان کا ارشاد یہ ہے کہ جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کو سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ وہ انہیں بلا نکاح اور بلا حدِ تعداد اپنے استعمال میں لائیں گے۔ اس کے بعد جب جی چاہے انہیں دوسروں کی طرف منتقل کر دیں گے۔ حتیٰ کہ انہیں فروخت بھی کر سکیں گے۔ اس کی پوری تفصیل ان کی کتاب — تفہیمات حصہ دوم — (اگست ۱۹۵۱ء ایڈیشن صفحات ۲۹۰-۳۲۲) میں "غلامی کا مسئلہ" کے تابع دی گئی ہے۔ پھر انہوں نے اسے اپنی تفسیر تفہیم القرآن کی پہلی جلد میں بھی دہرایا ہے۔ (۱۹۵۱ء ایڈیشن ص۳۴۰)

(۲) وہ اپنی تفسیر، تفہیم القرآن جلد پنجم ص۵۷۱ (طبع اوّل) پر لکھتے ہیں کہ نابالغ لڑکیوں سے نہ صرف نکاح جائز ہے بلکہ شوہر کا ان کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔ (نیز ترجمان القرآن۔ بابت اکتوبر ۱۹۶۹ء)

نابالغ لڑکی کے ساتھ جنسی اختلاط! استغفر اللہ۔

(۳) ان سے دریافت کیا گیا کہ جنت کی حوریں کون ہوں گی۔ جواب دیا کہ:-

> کفار کی لڑکیاں جو کمسنی میں وفات پا گئی ہوں گی، انہیں جنت میں حوریں بنا دیا جائیگا۔ (ایشیا ۱۴ ؍جون ۱۹۶۹ء)

اسی کو انہوں نے تفہیم القرآن، جلد چہارم (طبع اوّل) ص۲۸۵ پر دہرایا ہے اور جلد پنجم (طبع اول) ص۲۷ پر اس پر یہ اضافہ کیا ہے۔

> اہلِ جنت کی بیویاں ان کے ساتھ قصروں (محلات) میں رہیں گی اور ان کی سیر گاہوں میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوں گے جن میں حوریں ان کے لئے لطف و لذت کا سامان فراہم کریں گی۔

یعنی جنتی مومنین کی بیویاں تو گھروں میں رہیں گی لیکن جب وہ باہر پکنک منانے جائیں گے تو یہ حوریں (یعنی کفار کی کم سن بچیاں جنہیں نوخیز لڑکیاں بنا دیا جائے گا) ان کے خیموں میں لطف و لذت کا سامان بہم پہنچائیں گی!

(۴) اِن سے (MASTURBATION) یعنی مشت زنی کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا:-

> اِن دلائل کی بنا پر صحیح مسلک یہی ہے کہ یہ فعل حرام ہے۔ البتہ عقل یہ حکم لگاتی ہے کہ اس کی حرمت زنا اور عملِ قومِ لوط اور وطیِ بہائم کی بہ نسبت کم تر ہے اس لئے اگر کسی شخص کو ان گناہوں میں سے کسی ایک میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو اور اس سے بچنے کے لئے وہ اپنے جوشِ طبع کی تسکین اس ذریعے سے کر لے تو اس کے حق میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ اسے سزا نہ دے۔
>
> (رسائل و مسائل۔ جلد دوم ستمبر ۱۹۶۴ء ایڈیشن۔ ص۲۰۲)

(۵) نکاح کی یہ انوکھی شکل بھی ملاحظہ فرمائیے:-

> فرض کیجئے کہ ایک جہاز سمندر میں ٹوٹ جاتا ہے۔ اور ایک مرد اور ایک عورت کسی تختے پر بہتے ہوئے کسی ایسے سنسان جزیرے میں پہنچ جاتے ہیں جہاں کوئی آبادی موجود نہ ہو۔ وہ ایک ساتھ رہنے پر مجبور ہیں اور شرعی شرائط کے مطابق ان کے درمیان نکاح بھی ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ باہم خود ہی ایجاب و قبول کر کے اُس وقت تک کے لئے عارضی نکاح کر لیں جب تک وہ آبادی میں نہ پہنچ جائیں یا آبادی ان تک نہ پہنچ جائے۔ کم و بیش

ط۔ دشمنانِ اسلام نے ہماری کتب احادیث میں ایسی وضعی روایتیں داخل کر رکھی ہیں جن کی رو سے کہا جاتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر نکاح کے وقت چھ برس اور رخصتی کے وقت نو سال تھی۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ حضرت عائشہؓ کی عمر بوقت نکاح سترہ اور انیس برس کے درمیان تھی۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "طاہرہ کے نام خطوط")۔

ایسی ہی اضطراری صورتیں اب بھی ہو سکتی ہیں۔ متعہ اسی طرح کی اضطراری حالت
کے لئے ہے۔ (ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۵۵ء)

جنسیات کی اضطراری حالتوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے بھی ایک طریق بتایا ہے۔ اور وہ یہ کہ: وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحاً۔ (۲۴/۳۳) وہ ضبطِ نفس سے کام لیں۔ لیکن مودودی صاحب کے نزدیک، جنسی خواہش میں ضبطِ نفس ممکن نہیں۔ اسی لئے وہ کبھی جلق (MASTURBATION) کا طریق تجویز کرتے ہیں۔ کبھی عارضی نکاح کا۔ کبھی کفار کی چھوٹی چھوٹی بچیوں کو لونڈیاں بنا کر جنتیوں کے حوالے کرتے ہیں، اور کبھی جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو سپاہیوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ علم النفس کی رُو سے ایسی ہیجانی کیفیت کو جنسی بد نہادی (SEX PERVERSION) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۶) ایک دلچسپ قانونی نکتہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔ قرآنِ کریم میں زانی مرد اور زانی عورت کے متعلق کہا گیا ہے کہ اُن میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے لگائے جائیں۔ مودودی صاحب اِس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:۔

اگر مجرم مریض ہو اور اس کے صحتیاب ہونے کی امید نہ ہو یا بہت بوڑھا ہو تو سو شاخوں والی ایک ٹہنی یا سو تیلیوں والی ایک جھاڑو لے کر صرف ایک دفعہ مار دینی چاہیئے تاکہ قانون کا تقاضا پورا کر دیا جائے۔
(تفہیم القرآن۔ جلد سوم۔ طبع اول۔ صفحہ ۳۴۱)

(۷) اور آخر میں ایک ایسی بات جس سے اسلام کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن، جو اس وقت دنیا میں موجود ہے، حرفاً حرفاً وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ پر نازل کیا اور رسول اللہ نے اسے اُمت کو دیا۔ اگر اس ایمان میں ذرا سا بھی شبہ پیدا ہو جائے تو مسلمان دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے قرآن مجید کو ایک مسلسل کتاب کی صورت میں مرتب نہیں فرمایا تھا۔ اسے بعد میں مرتب کیا گیا۔ وہ کس طرح؛ اسے دل پر پتھر رکھ کر سنیئے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید درحقیقت سات زبانوں میں نازل ہوا تھا اور رسول اللہ نے بھی قرآنِ کریم کو ان سات زبانوں میں ہی پیش کیا اور اُمت کو سکھایا تھا۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے ان میں سے صرف ایک زبان والے قرآن کو باقی رکھا اور بقایا چھ زبانوں والے نسخوں کو جلا دیا تاکہ امت میں اختلاف پیدا نہ ہو۔ حالانکہ انہیں منسوخ کرنے کا کوئی حکم نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا اور نہ ہی رسولِ اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے سنا گیا۔ (ترجمان القرآن۔ ستمبر ۱۹۷۵ء صفحہ ۳۹۔ نومبر ۱۹۷۵ء صفحہ ۴۳)

اس کے بعد آپ سوچئے کہ اس قرآن مجید کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے جسے ہم اس دعویٰ کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ یہ لفظاً لفظاً وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اور جسے رسول اللہ نے اُمت کو دیا تھا۔ جو کچھ مودودی صاحب نے کہا ہے وہ یکسر جھوٹ ہے۔ افترا ہے۔ اور اسلام کے خلاف ایسی سازش جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ قرآن مجید ایک زبان میں نازل ہوا اور وہی قرآن اُمت کے پاس محفوظ چلا آ رہا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اِس باب میں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ورنہ کہنے کو تو بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ آپ اتنے ہی سے اندازہ فرما لیجئے کہ دنیا کے سامنے جب یہ اسلام پیش کیا جائیگا تو اِس کے متعلق اس کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ آپ کو شاید علم ہوگا کہ مودودی صاحب کی تفسیر کے تعارف کیلئے انٹرکانٹی نینٹل اور میٹروپول جیسے ہوٹلوں میں تقاریب منعقد ہوئیں اور کہا جاتا ہے کہ اب اس کے ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں شائع کرنے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ ہم اس سے زیادہ کیا کر سکتے ہیں کہ بارگاہِ ایزدی میں التجا کریں کہ وہ اسلام کو اس قسم کی سازشوں سے محفوظ رکھے۔ اور آپ کی خدمت میں مَیں یہ گزارش کرونگا کہ آپ اِسے چھوڑ دیجئے کہ پرویز منکرِ حدیث ہے، منکرِ سنت ہے، ملحد ہے یا بے دین ہے۔ آپ صرف یہ دیکھئے کہ جو کچھ مَیں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے اِس کی رُو سے اقامتِ دین کے یہ مدعی جنہیں "اللہ کا شاہکار" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ (ایشیا، ۲۵ راگست ۱۹۷۴ء) پاکستان کے خلاف کس قسم کی سازشوں میں مصروف ہیں ؎

خیر ہیں اہلِ دیر جیسے ہیں! آپ اہلِ حرم کی بات کریں

آخر میں مَیں اتنا اور عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مودودی صاحب یا ان کی تحریک اور جماعت کی مخالفت میں میرا کوئی ذاتی مفاد مضمر نہیں۔ مجھے ہوسِ اقتدار نہیں کہ اقتدار کے پیچھے مَیں کبھی نہیں بھاگا۔ تقسیمِ ہند کے وقت قائداعظمؒ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ جس مملکت کے حصول کیلئے تم نے اتنی جدوجہد کی تھی وہ اب حاصل ہوگئی ہے تم اس میں اپنے لئے جو مقام مناسب سمجھو لے لو۔ میں نے بصد احترام عرض کیا تھا کہ میری کاوشوں کا سب سے بڑا صلہ یہی ہے کہ جس مملکت کے لئے ہم نے جدوجہد کی تھی وہ حاصل ہوگئی۔ اس سے بڑا صلہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ میں دفتر کے جس میز پر یہاں (ہندوستان میں) بیٹھا ہوں، اُسی پر پاکستان جا کر بیٹھ جاؤں گا۔ چنانچہ مَیں اسی میز پر یہاں آکر بیٹھ گیا اور وہیں سے مَیں نے قبل از وقت ریٹائرڈمنٹ لے لی۔ پھر کسی مذہبی فرقہ کی قیادت بھی میرے پیشِ نظر نہیں کہ میرے نزدیک مذہبی فرقہ بندی از روئے قرآن شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اس شرک سے محفوظ رکھے۔ میں عملی سیاست میں بھی حصہ نہیں لیتا کہ اس میدان میں مجھے ان سے کوئی رقابت ہو۔ مَیں نہ پبلک سے چندے مانگتا ہوں، نہ قربانی کی کھالیں اکٹھی کرتا ہوں۔ نہ زکوٰۃ، نہ صدقات اور نہ فطرانے وصول کرتا ہوں کہ مجھے ان سے کوئی معاشی چشمک ہو۔ جس طرح پاکستان کے لئے ایک خطۂ ارض کا حصول، مَیں دین کا تقاضا سمجھتا تھا اسی طرح اِس خطۂ ارض کا استحکام میرے ایمان کا تقاضا ہے کہ اس میں قرآنی نظام کے قیام کا امکان ہے۔ کوئی فرد، تنظیم یا طاقت جو اس خطۂ ارض کو ضعف یا نقصان پہنچانے کے درپے ہو، علیٰ قدرِ استطاعت اس کی مدافعت اور مخالفت بھی اپنا اسلامی فریضہ سمجھتا ہوں۔ مودودی صاحب کی مخالفت میں بھی میرا جذبۂ محرکہ یہی ہے۔ میں نے بہرحال مودودی صاحب کی تحریروں کے اقتباسات آپ کی خدمت میں پیش کر دیئے ہیں۔ ان کے حوالے بھی دیدئیے ہیں — میرا یہ خطاب پمفلٹ کی شکل میں چھپ گیا ہے۔ آپ اسے لے جائیے اور اس کا بغور مطالعہ کیجئے۔ اس کے بعد جس نتیجہ پر بھی آپ پہنچنا چاہیں وہ آپ کا کام ہے۔ ارض و مملکتِ پاکستان میری ذاتی ملکیت تو نہیں کہ اس کی حفاظت کی فکر تنہا مجھ ہی کو ہو۔ یہ اسی طرح آپ کی بھی مملکت ہے جس کے ساتھ آپ کی اور آپ کی آنے والی نسلوں کی، جان۔ مال۔ عزت۔ آبرو اور اسلام کا مستقبل وابستہ ہے۔ آپ خود فیصلہ کر لیں کہ اس باب میں آپ پر کیا فریضہ عائد ہوتا ہے۔ اقبالؒ نے تو خدا سے بھی یہ کہہ دیا تھا کہ ؎

اگر کج رَو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا

میں خدا سے تو نہیں لیکن آپ حضرات سے ضرور یہ کہوں گا۔ والسلام

THE GENESIS AND IDEOLOGY OF PAKISTAN

G. A. PARWEZ

The history of mankind makes tragic reading. Down through the ages, we come across a series of sequences of the rise, growth, decline and fall, not only of nations but even of their civilizations and cultures. No doubt, man has all along shown a remarkable constructive genius, having attained many an awe-inspiring successes, despite occassional set-backs and natural catastrophes. But his constructive genius was always undermined by some inherent weakness underlying his ideals, or his way of life which ultimately brought about a disastrous end to his efforts. Nevertheless, there have been some notable exceptions in the series of sequences when the idea of universal welfare of mankind took practical shape, but the main characteristic in all those civilizations, always remained one of frustration. Man struggled hard to find some satisfactory solution of his problems, but failed. Human intellect, limited as it is, helped him little, because it is not aware of any source of knowledge other than itself. There was only one guide left for mankind in this difficult quest; and that confidently proclaimed its competency to lead them to their goal:

> "*Allah* who has created all the objects in the universe has also undertaken to make them aware of their goal and guide them towards it" (20:50).

The guidance which comes directly from *Allah* is known as "Revelation." It has all along been revealed to mankind through the agency of various *Anbiya*. But, unfortunately, due to the ravages of time and human tamperings with it, the text of the Scriptures, the message delivered by the pre-Islamic *Anbiya*, could not be preserved long in their original form. Eventually, about fourteen centuries ago, the complete and final version of that Guidance was revealed to mankind through *Muhammad* (PBUH), the last of the series of *Anbiya*. This version of the Divine Guidance is embodied exactly in its original form in the Quran.

2. The responsibility of the Nabee, to whom Divine Guidance was

revealed, was not only to communicate his revelation to others, but also to establish a socio-economic order in the light of that Guidance. Our *Rasul-Muhammad* (PBUH)— established this order which fully recognized dignity of man as man, guaranteeing thereby complete equality of all human beings (17:70). The pursuit of individual interest was replaced by the ideal of the good of the humanity at large. Oppression and exploitation were abolished and justice and equity prevailed. The dependence of man upon man and the subjugation of one over another was brought to an end. Every individual was assured the proper satisfaction of his needs. He, thereby, led a full life of satisfaction, peace and harmony. He did not owe obedience to any person or power, except the Divine Laws enshrined in the Quran. Briefly, that Order completely put an end to the rule of man over man, in any form, and with it the evil of capitalism. This Order was called *Deen* in the Quranic terminology.

3. This social order prevailed during the life time of *Muhammad* (PBUH) and for some time thereafter, when the forces of exploitation began to raise their ugly heads again. They scored their first success with the establishment of *Mulukiyyat*— Kingship— sustained by capitalism . To ensure their survival and consolidation, these forces availed themselves of the co-operation of men who appeared in the robes of piety and spoke in the name of God. They posed as the interpreters of God's will and thus distorted principles and tenets of *Deen* which no longer remained a living force in the society and were reduced to a set of soul-less beliefs, lifeless dogmas and formal rituals divorced from reason and realities of life. They framed rules and laws to suit the purpose of monarchy, and sought to keep the common man entangled in the laybrinth of these dogmas and rituals, and the exploiters, religious as well as temporal, were left free to maintain their stranglehold upon the defrauded masses. This was the metamorphosis of *Deen* into *Mazhab*, which word, by the way, does not occur anywhere in the Quran. The Book of *Allah*, however, remained intact, since the responsibility of its preservation has been taken by *Allah* Himself, although it was never allowed to play any part in the practical life of the Muslims.

4. This state of affairs prevailed throughout the Muslim countries for centuries together where *Mazhab* was accepted as true Islam. We should, however, consider ourselves fortunate in as much as a voice was raised

in our time and from our own country, to distinguish between *Deen* and *Mazhab*, and the *Ummah* was called upon to revive true Islam in the light of the Quran. This was the voice of Iqbal, the great thinker, and still greater scholar of the Quran. This, he said was possible only if we had a piece of land in which a State was established purely on the lines indicated by the Quran, thereby wiping out completely the rule of man, in any form, be it capitalism or priestcraft. This scheme of his, he pronounced in his Presidential Address of the All-India Muslim League Session at Allahabad, in 1930. Such a State, he said:

> "Would mean security and peace for India resulting from an internal balance of power, and for Islam an opportunity to rid itself of the stamp that Arabian Imperialism was forced to give it to mobilise its law, its education, its culture, and to bring them into closer contact with its own original spirit and with the spirit of modern times."
>
> *(Speeches and statements of Iqbal-P. 15)*

Two years later, while addressing the nation at the Annual Session of the All India Muslim Conference at Lahore, on 21-3-1932, he said:

> "The possibilities of the faith you represent are not yet exhausted. It can still create a new world where the social rank of man is not determined by his caste or colour, or the amount of the dividend he earns, but by the kind of life he lives; where Capital cannot be allowed to accumulate so as to dominate the real producer of wealth. This superb ideal of your faith, however, needs emancipation from the medieval fancies of theologians and legists. Spiritually, we are living in a prison-house of thoughts and emotions which, during the course of centuries, we have woven round ourselves. And be it further said to the shame of us— men of older generation— that we have failed to equip the younger generation for the economic, political and even religious crisis that the present age is likely to bring. The whole community needs a complete overhauling of its mentality in order that it may again become capable of feeling the urge of fresh desires and ideals." (Ibid P.55)

This point, i.e. to get rid of the "man-made Islam" was so basic and important that he laid emphasis on it time and again. In his famous six (to be more accurate, seven) lectures, he elaborated the theme in the words of (the late) Grand Vizier of Turkey Saeed Haleem Pasha, who had said:

> "During the course of history, the moral and social ideals of Islam have been gradually de-islamised through the influence of local character, and pre-Islamic superstitions of Muslim nations. These ideals today are more Iranian, Turkish or Arabian than Islamic. The pure brow of the principal of Tauheed (obedience to the Book of *Allah* alone) has received more or less, an impress of heathenism and the universal and impersonal character of the ethical ideals of Islam has been lost through a process of localisation. The only alternative open to us then is to tear off from Islam the hard crust which has immobilised an essentially dynamic outlook on life, and to re-discover the original verities of freedom, equality and solidarity with a view to rebuild our moral, social and political ideals out of their original simplicity and universality".
>
> *(Iqbal : Reconstruction of Religious Thought in Islam-pp.148-49)*

This was the purpose to be achieved, for which *Allama* Iqbal had given the idea of acquiring a piece of land to establish therein a State which could be identified as a true Islamic State— a State built on the foundations of Quran. This was to be a unique State amongst various States of the world.

5. One of the fundamental factors which makes Islamic State unique amongst various States of the world, whatever their form of Government, is its principle of law-making. As already stated, according to the Quran, all human beings are equal and worthy of equal respect and dignity. It necessarily follows, therefore, that no man has the right to exploit another man or to use him as a means in furthering his personal interests. If society were organised on this basis, there would be neither rulers nor the ruled: none would be permitted to compel others to obey him. *Allah* alone would be obeyed. Says the Quran:

"It beseemeth not a man that *Allah* should give him the Book of Law, power to judge, and even *Nabuwwah*, and he should say to his fellow beings to obey his orders rather than those of *Allah*……" (3:78).

Quran forbids man to arrogate to himself the right to rule over other man: and yet it does not advocate a lawless, anarchical society. What it does is to lay down the principle that *Allah* alone has the right to rule over them (12:40) and none has the right to any share in it (18:26). Sovereignty belongs to *Allah* alone.

Allah, however is the Abstract, Transcendental Reality. How can we obey Him if we cannot contact Him? The answer is: by observing His Laws as given in His Book. This is why the *Rasul* was asked to declare:

"Shall I seek other than *Allah* for judge, when He it is Who hath revealed unto you this Book fully explained " (6:115).

This book was the criterion to decide whether a State was Islamic or un-Islamic. Says the Quran:

"Whoso do not judge by what *Allah* hath revealed, they are indeed Kafirs" (5:44).

The laws, directives, principles and values given by the Quran are complete, final, eternal and un-alterable. None, not even the entire *Ummah* has the authority to add to, subtract from or make any alteration therein. But it does not prescribe details thereof. With the exception of a very few laws, it demarcates the boundary lines of what is lawful and what is unlawful. These lines no one has the right to transgress: not even the entire community. Within these lines, the Islamic State is free to frame such bye-laws as the needs of the time require. These bye-laws are, of course, subjeci to change and may be revised or even abrogated by the *Ummah* by mutual consultation (42:38), leaving the boundary lines un-touched. This is where an Islamic State differs from the democracy of the West. According to Western democracy, the people have unbridled power to frame any laws, whereas, the consultative machinery of the *Ummah* can frame sub-laws only within the boundary lines framed by the Quran. Iqbal has beautifully narrated this unique feature of the

Islamic State. He says in his lectures:

"The ultimate spiritual basis of all life, as conceived by Islam, is eternal and reveals itself in variety and change. A society based on such a conception of Reality, must reconcile in its life the categories of permanence and change: it must possess eternal principles to regulate its collective life; for, the eternal gives us a foothold in the world of perpetual change. But eternal principles when they are understood to exclude all possibilities of change, which, according to Quran is one of the greatest signs of *Allah*, tend to immobilize what is essentially mobile in its nature".

(Reconstruction of Religious Thought in Islam: Page.140).

Iqbal has touched upon this very subtle, yet most important point with reference to political system of Islam, but it takes us far, far beyond political horizon. The fundamental principle of the reconciliation of the categories of permanence and change is not confined to the process of law-making. It is the very essence of Islam and can be appreciated only when the Quranic concept of human life is thoroughly grasped. There are two concepts of human life— materialistic and Quranic. The materialistic outlook of life treats man as any other animal, whose only function is to develop and enlarge his physical existence. It functions under physical laws and is disintegrated and gets extinct with death. It is subject to perpetual change; every moment millions and millions of cells, which constitute human body, are destroyed and replaced by fresh cells. This process of constant change continues till death overtakes him and he ceases to live. Since, according to this concept of life, there is nothing permanent in human life, it stands in need of no Permanent Values, no un-changeable principles, no immutable boundary lines, and therefore, no necessity for Divine Guidance.

According to Quranic concept of life, on the other hand, human body, no doubt develops, flourishes, and eventually disintegrates, under physical laws, but there is something else in man besides his body, that is, his Self or Personality, which is neither physical in its constitution nor is it subject to physical laws as such. It is endowed to every human child in like measure at his birth, but it is only in an undeveloped form. To develop it to its full maturity, and to give it a perfect and balanced shape

is the goal of all human activities. Every act of his, performed in accordance with Permanent Values, contributes to its development, and whatever is done against these values, retards this process and weakens the Self. An act it should be noted, includes thought, wish and desire, as well. The Self or Personality thus developed easily sustains the shock of death and survives the disintegration and dissolution by physical body, and goes on developing further, passing through more evolutionary stages, which we call the "Hereafter" or the life after death. The fact that, not only the actual deeds of a human being but his thoughts, wishes and desires, as well act upon human personality, is what is called the "law of Retribution" which is as inexorable and immutable as the Laws of Nature.

It is the human personality which takes decisions, but at the present level of existence, its decisions are implemented through physical body. For this purpose, it is essentisl that human body should also develop and be in a position to carry out the commands of the Personality. For its development, the needs and requirements of human body will change from time to time whereas human personality, while developing shall remain un-changed. The renowned Polish Thinker, Nicholas Berdyaev, has beautifully concentrated this in four words , by saying:

> "Personality is changelessness in change".
> *(Slavery and Freedom - p.8)*

The process of the development of human body and Personality can take place only in Islamic Social Order (or *Deen*, as already explained). This order generally called *Islami Nizam* provides to each and every individual means for the development of both. This is generally called "*Nizam-e-Rabubiyyah*". It will be seen that this system differs basically from all other systems.

6. Reverting to the principle of law-making, Iqbal examined critically what had been going on in our past history, and said that:

> "The teaching of the Quran that life is a process of progressive creation necessitates that each generation, guided but unhampered by the work of its predecessors, should be permitted

to solve its own problems"

(Lectures, p. 160)

It follows, therefore, that the general notion that the laws made by our earlier jurists and promulgated in the past are eternal and binding on all future generations, is against the basic teachings of Quran. This was thoroughly explained by Iqbal in his "Sixth Lecture", entitled- The principles of movement in the structure of Islam- in which he says:

"The question which is likely to confront Muslims countries in the near future is whether the Law of Islam is capable of evolution— a question which will require great intellectual effort, and is sure to be answered in the affirmative provided the world of Islam approaches it in the spirit of Omar— the first critical and independent mind in Islam who, at the last moments of the Prophet, had the moral courage to utter these remarkable words:" The book of *Allah* is sufficient for us."

(Lectures, p 154)

7. Iqbal accomplished his task and, handing over the torch to Quaid-e-Azam Muhammad Ali Jinnah, passed away. The Quaid, during his struggle for the achievement of Pakistan, reiterated the main features of the proposed Islamic State, as enunciated by Iqbal. No doubt the British and the Hindus opposed tooth and nail the proposal for the establishment of a separate State for the Muslims, but its main opponents were the so-called " Nationalist Ulemas" who were the custodians of *Mazhab*, as already explained. Plainly speaking, the struggle for Pakistan was, in reality, struggle between *Deen* and *Mazhab*. This struggle was started during the life time of Iqbal himself. For want of adequate space, it is not possible to quote extensively from the speeches and writings of Quaid-e-Azam, on the subject. It would suffice if some of the more important points were cited.

It is generally said, that it was the narrow-mindedness of the Hindus and their maltreatment and fanatical prejudice towards the Muslims which compelled the latter to seek protection in a separate homeland, and thus the demand for Pakistan. This is not only distortion of history but also malicious propaganda. The genesis of Pakistan was explained by Iqbal in

the Presidential Address at Allahabad in 1930. Pakistan Resolution was passed in the Annual Session of the All India Muslim League, at Lahore, in 1940. Qaid-e-Azam said in his Presidential Address:

"It is extremely difficult to appreciate why our Hindu friends fail to understand the real nature of Islam and Hinduism. They are not religions in the strict sense of the word, but are, in fact, different and distinct social orders, and it is a dream that the Hindus and Muslims can ever evolve a common nationality, and this conception of one Indian nation has gone far behind the limits and is the cause of most of your troubles and will lead India to destruction if we fail to revise our notions in time. The Hindus and Muslims belong to two different religious philosophies, Social customs, literatures. They neither intermarry nor interdine together, and indeed, they belong to two different civilizations which are based mainly on conflicting ideas and conceptions. Their aspects of life and of life are different".

(Speeches and writings of Mr. Jinnah VOL-I pp.177-78)

In his speech at the Frontier Muslim League Conference on 21 Nov. 1945 he said:

"We have to fight a double-edged battle, one against the Hindu Congress and the other against British Imperialists, both of them being capitalists. The Muslims demand Pakistan where they could rule according to their own code of life and according to their own cultural growth, traditions and Islamic Laws". (ibid. Vol-II,P.333).

In a message to NWFP Muslim Students Federation, in April 1943, he said:

"You have asked me to give you a message. What message can I give you ? We have got the great message in the Quran for our guidance and enlightenment". (ibid Vol-I,P.516).

In Eid message to the nation in 1945, he said:

"Every Musalman knows that the injunctions of the Quran are not confined to religious and moral duties. "From the Atlantic to the

Ganges", says Gibbon, "the Quran is acknowledged as the fundamental code, not only of theology, but of civil and criminal jurisprudence, and the laws which regulate the actions and the property of mankind are regulated by the immutable sanctions of the Will of God." Everyone , except those who are ignorant, knows that the Quran is the general code of the Musalmans. A religious, social, civil, commercial, military, judicial, criminal penal code; it regulates everything from the ceremonies of religion to those of daily life; from the salvation of the soul to the health of the body; from the rights of all, to those of each individual; from morality to crime, from punishment here to that in the life to come, and our Prophet (PBUH) has enjoined on us that every Musalman should possess a copy of the Quran and be his own priest. Therefore, Islam is not confined to the spiritual tenets and doctrines and rituals and ceremonies. It is a complete code regulating the whole Muslim Society in every deptt. of life, collective and individually". (ibid Vol-II, P-300).

In August, 1941, Quaid-e-Azam went to Hyderabad (Deccan) and there gave an interview to the students of the Usmania University. The replies he gave to the questions asked by the students, explain in a nut-shell the genesis and the ideology of Pakistan in such a comprehensive way that, in my opinion, nothing further would be required to understand these basic foundations. Here are extracts from that interview:

Question: What are the essential features of religion and a religious State ?

Answer: When I hear the word " religion', my mind thinks at once, according to the English Language and the British usage, of private relation between man and God. But I know fully well that according to Islam, the word is not restricted to the English connotation. I am neither a Maulvi nor a Mullah, nor do I claim knowledge of theology. But I have studied in my own way the Holy Quran and Islamic tenets. This magnificient Book is full of guidance respecting all human life, whether spiritual, or economic, political or social, leaving no aspect untouched".

Question: What is the distinctive feature of Islamic State?

Answer: There is a special feature of the Islamic State which must not be overlooked. There, obedience is ...... due to God and God alone, which takes practical shape in the observance of the Quranic principles and commands. In Islam, obedience is due neither to a king, nor to a parliament, nor to any other organisation. It is the Quranic provisions which determine the limits of our freedom and restrictions in political and social spheres. In other words, Islamic State is an agency for enforcement of Quranic principals and injunctions.

In a Broadcast talk to the people of the United States of America on Pakistan, recorded in February 1948 i.e. in his capacity as Governor General of Pakistan, he said:

> "The Constitution of Pakistan has yet to be framed by the Pakistan Constituent Assembly. I do not know what the ultimate shape of this constitution is going to be, but I am sure that it will be of a democratic type, embodying the essential principles of Islam.. Today, they are as applicable in actual life as they were 1,300 years ago. Islam and its idealism has taught us democracy. It has taught equality of man, justice and fairplay to everybody. We are the inheritors of these glorious traditions and are fully alive to our responsibilities and obligations as framer of future constitution of Pakistan. In any case, Pakistan is not going to be a theocratic State— to be ruled by priests with a divine mission".
>
> *(Speeches as Governor-General p.65)*

I have already explained what "democracy embodying the essential principles of Islam" means in practice: the way and means for the implementation of Quranic laws and principles to be framed by the *Ummah* by mutual consultation, within the immutable boundary lines determined by the Quran. This is what an Islamic State is permitted to do; beyond this it has no authority.

8. I have stated before that the Quran prescribes a socio-economic order

which is unique in its nature. I have so far dealt with its social aspect only. So far as its economic side is concerned, it is a vast subject and requires detailed discussion. it will not be doing justice to it if it is touched upon enpassant. I have written exhaustively on the subject and my self-contained book— *Nizam-e-Rububiyyat* — discusses it in detail. Here, I will confine myself only to its basic principles.

The main object of an Islamic State is to provide the individual with full scope of self-development, which means development of his physical body as well as development of his personality. Its basic principles are that the individual is the focus of value and the society exists to enable the individual to develop and express himself to the full extent of his capacity. It lays primary stress on personal worth. A society based on these principles will be composed of free individuals, each enriching his life by working for the enrichment of all life and each moving onwards by helping others to do the same. This society should be judged by the solutions it offers for the social and economic problems that confront all human groups.

According to the Quran, it is incumbent upon the Islamic society to provide for the basic necessities of each and all the members comprising it, and make suitable arrangements for the development of their human potentialities. Therefore, it should extend the same facilities to other human beings and thus make this order universal. A society that fails in this responsibility does not deserve to be called Islamic, for, the society that is established in the name of *Allah* is bound to proclaim:

"We will provide for you and your children" (6:152).

It is paramountly clear from this that no society could discharge this responsibility unless, and until it has the various means of production under its control and the necessary resources at its disposal. It may be reiterated, and should in no case be lost sight of, that this society takes under its control means of production with a view to discharge its huge responsibility of providing necessities of life for all the members of the society. If it fails to do so, it will have no right to touch these resources. It will be a clear act of usurpation in that case.

So far as the members of this society are concerned, the principle underlying the growth and development of their personality is expressed thus: an individual should work hard, earn and produce as much as possible, keep what is basically and essentially necessary for his own upkeep, and hand over the rest to the Islamic State for meting out the necessities of others in need, as is ordained in the Quran:

> "And they ask thee as to what should they give (for the benefit of others)"- Say: "Whatever is surplus to your own requirements" (2:219).

and in this, their attitude should be such as to declare:

> "We desire from you neither reward nor thanks" (76:9).

Here arises the question: What is the incentive motivated by which an individual should work, and continue to work, upto his full capacity, retain for himself only to the extent that fulfills his necessities, and make over the rest to the society, for meting out the necessities of others in need ? Still further :

> "They prefer others before themselves although there be indegence among them" (59:9).

Prof Hawtrey has said that:

> "What differentiates economic systems from one another is the character of the motives they invoke to induce people to work".
> *(Quoted by E.H.Carr, in "The New Society" PP.41-42)*

The motives provided by the Quran are unique, i.e.

> "Human body develops by what the individual concerned takes, while his Personality develops by what he gives"

This constitutes the basic motive for the establishment of the Quranic Economic Order.

There will thus be no capitalism and no land-lordism in an Islamic

State. Quaid-e-Azam made this abundantly clear during his struggle for the achievement of Pakistan. In his Presidential Address delivered at the Annual Session of the All-India Muslim League, Delhi, on April 24,1943,he said:

"Here, I should like to give a warning to the landlords and capitalists who have flourished at our expense by a system which is so vicious, which is so wicked and which makes them so selfish that it is difficult to reason with them. (Tremendous applause). The exploitation of the masses has gone into their blood. They have forgotten the lessons of Islam. Greed and Selfishness have made these people subordinate to the interests of others in order to fatten themselves. It is true we are not in power today. You go anywhere to the country-side. I have visited villages. There are millions and millions of our people who hardly get one meal a day. Is this civilization ? Is this the aim of Pakistan ? (Cries of NO, NO). Do you visualise that millions have been exploited and cannot get one meal a day. If that is the idea of Pakistan, I would not have it. (Cheers) If they are wise they will have to adjust themselves to the new modern conditions of life. If they don't. God help them: we shall not help them". (Hear, hear, renewed cheers and applause).

(Speeches and writings of Jinnah Vol-I, p.554)

****